اشاعتِ خاص

گذشتہ فائلوں کے منتخب مضامین

مُدیر

محمد منظور نعمانی

الفرقان لکھنو انتخاب نمبر

حصہ اول 1974 اپریل، مئی، جون

صفحہ نمبر 1 سے 252

حصہ دوم 1975 اپریل، مئی، جون

صفحہ نمبر 253 سے 455

حصہ سوم 1976 اپریل، مئی، جون

صفحہ نمبر 455 سے آخر

اپریل، مئی، جون ۱۹۷۴ء

ماہنامہ الفرقان لکھنؤ

اشاعت خاص

گزشتہ فائلوں کے منتخب مضامین (حصہ اوّل)

مدیر

محمد منظور نعمانی

چندہ
سالانہ 10/-
ششماہی 6/-

قیمت 5/-

غیر ممالک سے
ایک پونڈ
(بذریعہ بحری ڈاک)

دفتر ماہنامہ الفرقان، کچہری روڈ، لکھنؤ

فہرست مضامین

باب۱۔ ایمان و اعتقاد

باب۲۔ نگہ کی نامسلمانی سے فریاد

باب۳۔ سیرِ قادیانیت

باب۴۔ کاروبارِ شرک و بدعت اور نورِ کتاب و سنّت

باب ۵ - عبرت کی باتیں

باب ۶ - دعوتِ تجدید و اصلاح

(مولوی) محمد منظور نعمانی پرنٹر و پبلشر و ایڈیٹر و پروپرائٹر نے تنویر پریس لکھنؤ میں چھپوا کر دفتر الفرقان، لکھنؤ سے شائع کیا۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نگاہِ اوّلیں

از- محمد منظور نعمانی

الفرقان کی خاص اشاعت جس کا اعلان کیا گیا تھا، اور جس کے آپ منتظر تھے، آپ کے سامنے ہے۔ یہ اس طرح کا خاص نمبر نہیں ہے جس طرح رسائل وجرائد کے خصوصی نمبر کسی خاص موضوع یا شخصیت یا کسی اہم تقریب سے متعلق نکلا کرتے ہیں۔ بلکہ جیسا کہ ناظرین کرام کو معلوم ہے اس کی نوعیت یا اس کا شانِ نزول یہ ہے کہ اب سے قریباً ڈیڑھ سال پہلے جب الفرقان کی عمر کے ۴۰ برس پورے ہونے آئے، تو دل میں یہ خیال پیدا ہوا کہ ۴۰ سال کی اس طویل مدت میں الفرقان میں ایسے بہت سے مضامین شائع ہوئے ہیں جن میں آج بھی وہی افادیت اور آج بھی اُن کی ویسی ہی ضرورت ہے جیسی کہ اُس وقت تھی جب وہ لکھے گئے تھے لیکن اب وہ الفرقان کی قدیم جلدوں میں بس مدفون ہیں، اور ہمارے موجودہ ناظرین میں کم از کم اسّی، نوّے فی صدوہ ہوں گے جن کی نظر سے وہ نہیں گزرے۔ اگر ان مضامین کو الفرقان کے ایک خاص نمبر کی شکل میں شائع کر دیا جائے تو وہ موجودہ ناظرین تک پہنچ بھی جائیں گے اور ان کو ایک طرح کی "حیات بعد الموت" حاصل ہو جائے گی ______ بالآخر چند روز غور وفکر کے بعد یہ فیصلہ کر لیا گیا۔ مگر جب مضامین کے انتخاب کے لیے قدیم جلدوں کی ورق گردانی کی گئی تو اندازہ ہوا کہ ایسے مضامین ایک نمبر میں نہیں سمیٹے جا سکیں گے، بلکہ متعدد نمبر شائع کرنے پڑیں گے۔

اس کے بعد طے کیا گیا کہ اس سلسلہ کے پہلے نمبر میں الفرقان کے صرف اُس ابتدائی ۱۳ سالہ دَور کے مضامین کا انتخاب شائع کیا جائے جبکہ وہ بریلی سے نکلتا تھا ______ یہی وہ پہلا خاص نمبر ہے جو آپ کے سامنے ہے۔

اس کی تیاری کے سلسلہ کا ابتدائی کام اب سے ۵، ۶ مہینے پہلے شروع کر دیا گیا تھا، اور اندازہ تھا کہ ان شاءاللہ مئی میں شائع ہو جائے گا لیکن کاغذ بہت دیر سے اور بہت مشکل سے تھوڑا تھوڑا کر کے مل سکا، اور ضرورت کے بقدر پھر بھی نہ مل سکا، جس کی وجہ سے کئی مضمون جن کی کتابت بھی ہو چکی تھی روک لینے پڑے۔ اگر وہ بھی اس نمبر میں شامل ہو سکتے تو ضخامت ۳ سو صفحات کے قریب ہو جاتی ـــــ لیکن کاغذ نہ مل سکنے کی وجہ سے اب یہ نمبر ۲۴۸ صفحات پر شائع ہو رہا ہے، اور بجائے مئی کے جون میں شائع ہو رہا ہے۔

اِس نمبر کا ایک المیہ اس نمبر کے سلسلہ میں ایک بڑا المیہ یہ پیش آیا کہ الفرقان کے مستقل کاتب جو لکھنؤ کے اچھے کاتبوں میں ہیں اور بڑے شریف طبیعت ہیں، اُن سے امید تھی کہ وہ اس نمبر کی یا اس کے اکثر حصّہ کی کتابت کریں گے، لیکن اللہ تعالیٰ کی مشیت کہ وہ اسی زمانہ میں مریض ہو گئے اور اس پورے عرصہ میں داخلِ ہسپتال رہے (اللہ تعالیٰ صحت و شفا عطا فرمائے) اُن کی اس بیماری کی وجہ سے مختلف دوسرے کاتبوں سے لکھانا پڑا، اور انتہائی افسوس اور قلق ہے کہ زیادہ حصّہ ایک ایسے کاتب صاحب سے لکھانا پڑا جن کا خط بھی الفرقان کے معیار کا نہ تھا، اور پھر غلطیوں کی کثرت اتنی کہ ان کی تصحیح و ترمیم سے چھپائی پر اور بھی زیادہ اثر پڑنا ناگزیر۔ جب اُن کی لکھی ہوئی کاپیاں راقم سطور کے سامنے آئیں تو جس قدر تکلیف ہوئی اُس کا بیان مشکل ہے۔ اگر وقت میں گنجائش ہوتی اور دو چار دوسرے کاتبوں کا وقت مل سکتا تو ان تمام صفحات کی دوبارہ کتابت کرائی جاتی اور اس کی وجہ سے ڈھائی تین سو روپئے کا نقصان خوشی سے برداشت کیا جاتا ـــــ لیکن لکھنؤ میں اور شاید دوسرے مقامات پر بھی اچھے بلکہ اوسط درجہ کے کاتبوں کا بھی قحط ہے، اِسلئے مجبوراً انہی کاپیوں کو چھپوانا پڑا ـــــ اُمید ہے کہ یہ تفصیل معلوم ہو جانے کے بعد ناظرین کرام نمبر کے اس پہلو میں ہم کو معذور قرار دینگے۔

اِس نمبر میں مختلف النوع مضامین ہیں، جنھیں پہلے چھ بابوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ یہ سب وہی ہیں جو الفرقان کے بریلی والے ابتدائی ۱۳ سالہ دَور میں شائع ہوئے تھے۔ ناظرین کرام ان کے مطالعہ کے وقت یہ ملحوظ رکھیں کہ قریب قریب یہ سب مضامین ۲۳، ۲۴ سال پہلے لکھے گئے تھے، اسی بنا پر بعض مضامین ایسے رنگ کے بھی اس مجموعے میں ملیں گے جس کے موجودہ ناظرین الفرقان عادی نہیں ہیں لیکن ان کی مقصدی افادیت کی بنا پر یہی مناسب نظر آیا کہ اس خاص رنگ کے باوجود انھیں شاملِ اشاعت کیا جائے کیونکہ اصل مغز اور مقصد کے اعتبار سے

ان کی آج بھی مسلمانوں کے ایک طبقے کو ضرورت ہے۔

جو مضامین کاغذ کی کمی کے سبب سے کتابت شدہ روک لینے پڑے ہیں، جیسا کہ ابھی اوپر ذکر آیا ہے، تو ان کے بارے میں ممکن ہے کہ ہم یہ فیصلہ کریں کہ آئندہ مہینے جولائی کے شمارے میں وہ سب شائع کر دیئے جائیں۔ اگر ایسا ہوا تو اگلا شمارہ اس نمبر کا ضمیمہ ہوگا۔ اگر ہم نے یہ مناسب نہ سمجھا تو انشاء اللہ آئندہ سال شائع ہونے والے نمبر میں ان کو شامل کر دیا جائے گا۔

کاغذ کے سلسلے میں اپنے ناظرین کو یہ بتا دینے کی ضرورت محسوس ہوتی ہے کہ جس اخباری کاغذ پر الفرقان چھپتا ہے اُس کی قیمت چھ مہینے کے اندر دوگنی ہوگئی ہے۔ چھ مہینے پہلے تک بھی قیمت میں مسلسل اضافہ ہو رہا تھا، مگر وہ معمولی نوعیت کا تھا، لیکن ادھر کے چھ ماہ میں اضافہ کی رفتار یہ رہی ہے کہ اکتوبر ۱۹۷۳ء میں ۱۹ روپئے کچھ پیسے فی ریم کے حساب سے خریدا گیا تھا، اور اپریل ۱۹۷۴ء میں ۳۸ روپیہ فی ریم کے حساب سے ملا ہے، بلیک سے نہیں بلکہ کوٹے سے۔

چھ سات ماہ پہلے الفرقان جن حالات میں تھا، کہ جاری رکھنے یا بند کر دینے کا مسئلہ سامنے آگیا تھا، اور کچھ مخلص دوستوں کی توسیعِ اشاعت کے لیے کوششوں اور کچھ مخصوص اعانتوں سے جاری رکھنے کی صورت پیدا ہو سکی تھی۔ اس کے پیشِ نظر اس نئی ہوشربا گرانی میں خاص نمبر کے وعدے کو پورا کرنے کا مرحلہ تو کسی طرح طے کر لیا گیا ہے، مگر آگے اِس بار کو اٹھانے کے لیے اس کے سوا کوئی صورت نظر نہیں آتی کہ چند صفحے کے اشتہارات کا کوئی انتظام لازماً الفرقان کی ہر اشاعت کے لیے ہو ——

اُمید ہے —— کہ

وہ مخلص احباب

جو اس کے لیے کوئی کوشش کر سکتے ہیں یا خود اشتہار دے سکتے ہیں توجّہ فرمائیں گے۔

یہ نمبر مستقل خریداروں کیلئے اپریل، مئی، جون کی اشاعتوں کے قائمقام ہے۔ آئندہ شمارہ انشاء اللہ جولائی اور اگست کا مشترک شمارہ ہوگا، اور ۳۱ جولائی تک شائع ہو سکے گا۔ منیجر

ایک حادثہ اور اللہ کا کرم

(عتیق الرحمٰن سنبھلی)

الفرقان میں کچھ لکھے ہوئے بلکہ اُس کے سبھی کاموں سے سبکدوشی کو دس ہینے ہو رہے ہیں۔ اِس نمبر میں بھی سارا کام والد ماجد مدظلہٗ کے ہاتھوں انجام پایا۔ کتابت وغیرہ کے انتظام کی خدمت برادر عزیز محمد حسّان سلّمہٗ نے انجام دی۔ لکھنے کیلئے اِس نمبر میں بس "نگاہِ اوّلیں" کے صفحات تھے وہ بھی والد ماجد ہی کے قلم سے ہوئے۔ چند سال سے گرمیوں میں میری صحت کچھ سنبھل جایا کرتی ہے، اِسلئے خاص نمبر کے کام کی زیادتی کی وجہ ضروری تھا کہ ان دنوں میں آکر میں کچھ ہاتھ بٹا لیتا، مگر ایک اور کام آٹھ دس ہینے سے انہی دنوں کے انتظار میں تھا اور وہ تھا، الفرقان کا انگریزی ڈائجسٹ جس کا اشتہار آپ اِس نمبر میں کسی جگہ دیکھیں گے۔ چنانچہ میں کچھ کرنے کے قابل ہوا تو اسی میں لگ گیا۔ ۱۶ رمئی کو اس سے فراغت ہوئی، اور طبیعت ٹھیک ہی رہی تو والد ماجد نے فرمایا کہ اب اِس خاص نمبر کا باقی کام تم سنبھالو، میں تھک بھی گیا ہوں اور ایک سفر بھی کرنا ہے۔ بس اُس دن سے نمبر کا کام میرے ہاتھ میں آیا، جو صرف یہ تھا کہ ترتیب کو آخری اور عملی شکل دیدوں اور طباعت کے مرحلہ کی نگرانی کروں ـــــ مگر ایک حادثہ نے، جس کا ذکر یہاں مقصود ہے، بے گمان یہ ایک صفحہ میرے قلم سے بھی نمبر میں شامل کرا دیا۔ سچ فرمایا ہے عالم الغیب نے وَمَا تَدْرِيْ نَفْسٌ مَّاذَا تَكْسِبُ غَدًا ؕ (اور کوئی نہیں جانتا کہ کل کو اسے کیا کرنا ہوگا)۔

والد ماجد کے جس سفر کا ذکرا بھی کیا گیا، اس کیلئے وہ ۱۹ رمئی کی شب میں لکھنؤ سے روانہ ہوئے۔ امروہہ، سنبھل، سہارنپور، دیوبند اور پھر دہلی ہوتے ہوئے ۲۶ رکو لکھنؤ واپس آجانے کا پروگرام تھا ـــــ مگر ابھی ۲۶ ر نہیں ۲۵ ر تاریخ تھی کہ ناگاہ شام کے ۵ بجے دیوبند سے نائب مہتمم دارالعلوم دیوبند جناب مولانا معراج الحق صاحب کا تار ملا:۔

"فوراً آؤ۔ مولانا کو رکشہ اُلٹ جانے کا حادثہ پیش آگیا ہے"

فوراً آؤ کا مطلب یہ تھا کہ حادثہ سنگین ہے۔ جان نکل گئی، اور پتہ نہیں چند ساعتوں میں کیا کیا عالم دل پہ بیت گئے۔ مگر بس جلد ہی اللہ نے سکون اور اُمیدِ خیر کی توفیق بخشی، اور پھر اُمید وبیم کا ایک متوازن سا حال قائم ہو گیا۔

اسی حال میں عزیزی حسّان سلّمہٗ کو ساتھ لیکر دہرہ ایکسپریس سے جو اُس دن تین گھنٹے لیٹ تھی، رات کے دس بجے دیوبند کا سفر شروع کیا۔ اِس سے پہلے ٹیلیفون کے ذریعہ خبر لینے کی ہر ممکن کوشش کر لی تھی جو ناکام رہی۔ اگلے دن ۱۲ بجے دوپہر کو دھڑکتے ہوئے اور دعا و مناجات میں ڈوبے ہوئے دل کے ساتھ دارالعلوم کے مہمان خانے میں قدم رکھا، تو سارا وجود سراپا حمد و شکر بن گیا کہ وہ ذات زندہ سلامت تھی جس سے ہمارے سارے گھر کی زندگی ہے۔

(باقی ص۲۴۱ پر)

محمد منظور نعمانی

حرفِ آغاز یا افتتاحی دُعا

قمری حساب سے پورے ۴۱ سال اور ۴ مہینے ہوگئے، جب محرم ۱۳۵۳ھ (مارچ ۱۹۳۴ء) میں "الفرقان"، کا پہلا شمارہ بریلی سے شائع ہوا تھا تو اُس کا آغاز و افتتاح اِس دُعا سے کیا گیا تھا۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اے ساری کائنات کے پروردگار تیرا ایک عاجز اور سیہ کار بندہ تیرا کام تیرے ہی جلالت والے نام اور عظمت والے کلام سے شروع کرتا ہے، تو اس کے ارادوں میں برکت عطا فرما اور اُسکے دل کو صدقِ نیت اور اخلاص کی توفیق دے! ـــــ تیرے پاک دین کی حمایت اور میری بساط، یقیناً چھوٹا مُنہ اور بڑی بات ہے، لیکن تیری تائید رفیق ہو جائے تو قطرہ کو دریا اور ذرّہ کو آفتاب بنتے دیر نہیں لگتی ـــــ خداوندا! میں پاپیادہ ہوں اور وادیٔ خاردار، میں نہتا ہوں اور راستہ میں ہزاروں خونخوار درندے میری کشتی شکستہ ہے اور سامنے حوادث کا طوفان، مگر تیری نُصرت ساتھ دے تو بیڑا پار ہے، اور اسی بھروسہ پر تیرے اِس کمزور بندے نے کمرِ ہمت باندھی ہے۔

دریں دریائے بے پایاں، دریں طوفانِ موج افزا
دل افگندیم بسم اللہ مجریہا و مُرسٰہا

تیری مقدس کتاب کا وعدہ ہے: ـــــ

وَلَيَنْصُرَنَّ اللهُ مَن يَّنصُرُهُ	جو کوئی خدا کے دین کی حمایت کیلئے اٹھے گا خدا اُسکی مدد
إِنَّ اللهَ لَقَوِيٌّ عَزِيزٌ ـــــ	کرے گا، یقیناً خدا بڑی قوت والا اور بہت غلبہ والا ہے

کمر کستا ہوں تیرے نام پر تو مجھ کو ہمت دے ٭ جو ہو لغزش تو مجھ کو تھام میرا مہرباں ہو کر
بھروسے پر تری امداد کے بیڑا اُٹھایا ہے ٭ فلک کے بوجھ اُٹھانے پر تُلا ہوں ناتواں ہو کر

(الفرقان بریلی، بابت محرم ۱۳۵۳ھ ص۲)

باب ــــ (۱)

ایمان و اعتقاد

حمد باری تعالیٰ

از رشحات افکار جناب سید انیس الدین احمد صاحب رضوی، امروہوی
ایم اے، ایل ایل بی (علیگ)

اے بلبلِ گلشنِ معانی ❊ کر آکے چمن میں نغمہ خوانی
وہ نغمہ روح، غیر فانی ❊ تفسیرِ حیاتِ جاودانی
ہے گلشنِ حمد تیرے آگے
ہر پھول کو اک چمن بنا دے

ہے اسپِ خیال زیرِ مہمیز ❊ رفتارِ شباب سے کہیں تیز
اور نغمہ کہ جو، نشاط انگیز ❊ ہے بادِ شمیم بھی طرب ریز
رحمت کی بہار رنگ پر ہے
عاصی کا بھی دل اُمنگ پر ہے

رندوں کو ہیں ایک آج اور کل ❊ مستوں میں مچی ہوئی ہے ہلچل
ہر کف میں اُٹھائے جام سلسل ❊ رحمت کے اُٹھے ہیں آج بادل
وہ جھومتا جام آرہا ہے
رحمت کا پیام آرہا ہے

ہے وجد میں روح کیوں ہماری ❊ رگ رگ میں ہے کس کا نور ساری
ہے وردِ زباں ثنائے باری ❊ دل میں بھی خدا خدا ہے جاری
پیدا کیا جس نے لامکاں کو
اور کُن سے بنایا دو جہاں کو

اللہ! وہ نور فی السمٰوات ❊ اللہ! وہ مستجیب دعوات
وہ قاضئ کل امور و حاجات ❊ وہ خالقِ حسن خیر و برکات

ہیں مسجد و مندر و کلیسا
اُس کے ہی جمال سے مُجلّا!

عشاق کے حالِ زار میں ہے ❊ اُن کے دلِ بیقرار میں ہے
بیتابی و اضطرار میں ہے ❊ طولِ شبِ انتظار میں ہے

شیریں کو جو زندگی عطا کی
فرہاد کے تیشہ کی بنا کی

شاہوں کے قصورِ مرمریں میں ❊ مفلوک کے کلبۂ حزیں میں
ہے اُس کا ہی شوق ہر جبیں میں ❊ ہے اُسکی چمک ہر اک نگیں میں

والشمس اذا ضحیٰ میں ہے وہ
واللیل اذا سجیٰ میں ہے وہ

موجود ہے حرفِ آرزو میں ❊ پنہاں ہے اُمید و جستجو، میں
آفاق میں، اس کی گفتگو میں ❊ گلزار میں اُس کے رنگ و بو میں

مقصودِ ہر آرزو وہی ہے
اور مطمحِ جُستجو وہی ہے

ہے نور میں، نار میں، نمودار ❊ ہر پھُول میں، خار میں نمودار
ہوش اور خمار میں نمودار ❊ عجز اور وقار میں نمودار

ہر چیز، ہر ایک بات وہ ہے
القصّہ، یہ کائنات وہ ہے

(الفرقان، ماہ محرّم ۱۳۵۵ھ)

نعتِ سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم

از حضرت مولانا مولوی محمد اسعد اللہ صاحب اسعد استاذ مظاہر علوم سہارنپور

مجھے کیا علم کیا تم ہو خدا جانے کہ کیا تم ہو ؛ بس اتنا جانتا ہوں محترم بعد از خدا تم ہو

کسی کی آرزو کچھ ہو ! کسی کا مدعا کچھ ہو ؛ ہماری آرزو تم ہو، ہمارا مدعا تم ہو

زمانہ جانتا ہے صاحب لولاک لما تم ہو ؛ جہاں کی ابتدا تم ہو، جہاں کی انتہا تم ہو

نہ یہ قدرت زباں میں ہے، نہ یہ طاقت بیاں میں ہے ؛ خدا جانے تو جانے ! کوئی کیا جانے کہ کیا تم ہو

رسالت کو شرف ہے ذاتِ اقدس کے تعلق سے ؛ نبوّت ناز کرتی ہے کہ ختم الانبیا تم ہو

کہاں ممکن تمہاری نعت حضرت مختصر یہ ہے ؛ دو عالم مل کے جو کچھ بھی کہیں اُس سے سوا تم ہو

گروہِ رازدانِ "نظمِ فطرت" پر نہیں مخفی ؛ یہ سب ہنگامۂ دُنیا خبر ہے، مبتدا تم ہو

نہیں شرمندۂ اظہار، اوصافِ گرامی قدر ؛ بتاؤں کیا کہ کیا تم ہو، سناؤں کیا کہ کیا تم ہو

فصاحت کو تحیّر ہے، بلاغت کو پریشانی ؛ کہ لفظوں سے بہت بالا جنابِ مصطفےٰ تم ہو

گنہ گارانِ اُمّت کا سہارا ذاتِ والا ہے ؛ خوشا قسمت کہ حضرت شافعِ روزِ جزا تم ہو

یہ ربطِ باہمی اُمّت کو وجہ صد تفاخر ہے ؛ تمہارا ہے خدا محبوب ! محبوبِ خدا تم ہو

تمہارے واسطے اسعدؔ کہیں بہتر ہے شاہی سے
کہ اک اَدنیٰ غلامِ بارگاہِ مصطفےٰ تم ہو

(الفرقان، ذی الحجہ ۱۳۵۶ھ)

محمد منظور نعمانی

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خصائص و امتیازات

یہ ایک ایمانی حقیقت ہے کہ نفس منصب رسالت کے لحاظ سے انبیاء علیہم السلام میں کوئی فرق نہیں اور قرآن مجید کا فیصلہ ہے کہ ان میں تفریق شان ایمانی کے خلاف ہے لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ أَحَدٍ مِّن رُّسُلِهِ" لیکن بایں ہمہ قرآن حکیم ہی سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ حق تعالیٰ نے اپنے آخری پیغمبر حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو کچھ خصائص اور امتیازات سے بھی نوازا ہے جن میں کوئی دوسرا نبی و رسول آپ کا شریک نہیں۔ پھر یہ خصائص و امتیازات صرف سطحی اور محض خیالی نہیں۔ بلکہ ان کو نظام دینی میں اساسی حیثیت حاصل ہے۔ اور جب تک کوئی شخص اس امتیازی شان کو ملحوظ رکھ کر آپ پر ایمان نہ لائے یہ نہیں کہا جا سکتا کہ رسالت محمدی پر اس کا ایمان کامل ہو گیا۔ اسی لیے قرآن حکیم نے جہاں انبیاء علیہم السلام کی دعوت کی وحدت اور نفس منصب نبوت میں ان کی برابر کی شرکت پر زور دیا ہے۔ وہیں خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کی اُن خصوصیات کو بھی واشگاف کر کے بیان فرمایا ہے جن سے آپ کی شان امتیازی اور دوسروں پر فوقیت ظاہر ہوتی ہے۔ یہاں ان ہی میں سے چند خصائص طیبہ کا ذکر کرنا منظور ہے۔ واللہ ولی التوفیق!

جامعیت کمالات حق تعالیٰ نے سورہ انعام کے نویں رکوع میں ایک خاص ترتیب کے ساتھ مندرجہ ذیل اٹھارہ پیغمبروں کا ذکر فرمایا ہے۔

سیدنا حضرت ابراہیم[1]، سیدنا اسحاق[2]، سیدنا یعقوب[3]، سیدنا نوح[4]، سیدنا داؤد[5]، سیدنا سلیمان[6]، سیدنا ایوب[7]، سیدنا یوسف[8]، سیدنا موسیٰ[9]، سیدنا ہارون[10]، سیدنا زکریا[11]، سیدنا یحییٰ[12]، سیدنا عیسیٰ[13]، سیدنا الیاس[14]، سیدنا اسمٰعیل[15]، سیدنا الیسع[16]، سیدنا یونس[17]، سیدنا لوط[18] (علی نبینا وعلیہم الصلوٰۃ والسلام)

ان تمام انبیاء علیہم السلام کا ذکر فرمانے کے بعد ارشاد ہے "اولئك الذين هدى الله فبهداهم اقتده" (یعنی سب اللہ کے وہ مقبول بندے ہیں جن کو اللہ نے اپنی ہدایت بخشی اور ٹھیک راہ پر چلایا۔ پس اے رسول آپ بھی ان کی اس ہدایت الٰہیہ کی پیروی کیجئے)

اس آیت کے سرسری مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اس میں خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کو حضرات مذکورین کی اقتداء اور پیروی کا حکم دیا گیا ہے۔ لیکن غور کرنے اور دوسری آیات کو پیش نظر رکھنے سے واضح طور پر معلوم ہوتا ہے کہ فی الحقیقت یہاں حضور کو تمام مقدسین مذکورین کے اوصاف کمالیہ اور ملکات عالیہ اپنے اندر جمع کرنے کا امر فرمایا گیا ہے۔ اور حضور کی شان جامعیت کی طرف ایک لطیف اشارہ فرمایا گیا ہے۔

اور واقعہ بھی یوں ہی ہے۔ کہ جس قدر کمالات و ملکات دوسرے انبیاء علیہم السلام کو متفرق طور پر عطا فرمائے گئے تھے وہ سب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اندر جمع کر دیئے گئے۔

علامہ علی بن محمد خازنؒ تفسیر لباب التاویل میں اسی آیت پر کلام کرتے ہوئے فرماتے ہیں

احتج العلماء بهذه الآية على ان رسول الله صلى الله عليه وسلم افضل من جميع الانبياء عليهم الصلوٰة والسلام وبيانه ان جميع خصال الكمال وصفات الشرف كانت متفرقة فيهم فكان نوح صاحب الاحتمال على اذى قومه وكان ابراهيم صاحب كرم وبذل مجاهدة فى الله عزوجل وكان اسحٰق ويعقوب من اصحاب الصبر على البلاء والمحن وكان داؤد عليه السلام وسليمان من اصحاب الشكر على النعمة قال الله فيهم اعملوا آل داود شكرا وكان ايوب صاحب صبر على البلاء قال الله فيه انا وجدناه صابرا نعم العبد انه اواب وكان يوسف قد جمع بين الحالتين يعني الصبر والشكر وكان موسیٰ صاحب الشريعة الظاهرة

اس آیت سے علماء امت نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے افضل الانبیاء ہونے پر استدلال کیا ہے۔ اور اس استدلال کی تقریر یہ ہے کہ تمام اوصاف کمالیہ و خصائل جلیلہ انبیاء سابقین علیہم السلام میں متفرق طور پر پائے جاتے تھے۔ مثلاً نوح علیہ السلام کا خصوصی وصف یہ تھا کہ انھوں نے مدت مدید تک اپنی ناہنجار اور کفر شعار قوم کی ایذا رسانیوں کا تحمل کیا اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کی امتیازی شان اللہ کے راستے میں بے پناہ قربانی اور بے انتہا کریم النفسی تھی اور سیدنا اسحاق و یعقوب کا خاص کمال صبر علی المصائب تھا۔ اور سیدنا داؤد و سلیمان ارباب شکر میں سے تھے چنانچہ حق تعالیٰ نے انکے حق میں فرمایا ہے اعملوا آل داؤد

والمعجزات الباهرة وكان زكريا ويحيى وعيسى والياس من اصحاب الزهد في الدنيا وكان اسمٰعيل صاحب صدق وكان يونس صاحب تضرع واخبات ثم ان الله تعالى امر نبيه صلى الله عليه وسلم ان يقتدي بهم وجمع له جميع الخصائل المحمودة المتفرقة فيهم۔ (تفسیر خازن ج ۲ ص ۱۲۹)

شکر، اور سیدنا ایوب صابرین کے لیے قدوہ تھے جیسا کہ حق تعالیٰ کا ارشاد ہے انا وجدناہ صابرا نعم العبد انہ اواب اور سیدنا یوسف میں صبر و شکر دونوں ہی وصف بدرجۂ کمال موجود تھے اور موسیٰ علیہ السلام مستقل شریعت اور روشن معجزات رکھتے تھے اور زکریا و یحییٰ اور الیاس و عیسیٰ علیہم السلام ارباب زہد اور متاع دنیا کو ناکش تھے، اور سیدنا اسمٰعیل پیرو صدق الوعدی اور حضرت یونس تضرع اور خاکساری کا نمونہ تھے الحاصل یہ اوصاف کمالیہ اور ملکات عالیہ انبیائے سابقین کو متفرق طور پر عطا ہوئے تھے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اس بات کا حکم ملا کہ ان خصائل خیر میں ان تمام مقدسین کی اقتدا کرو۔

چنانچہ آپ نے ایسا ہی کیا، اور حق تعالیٰ نے یہ تمام خصائل حمیدہ اور شمائل لطیفہ جو تمام انبیاء سابقین میں منتشر اور متفرق طور پر پائے جاتے تھے آپ کے اندر تمام و کمال جمع فرما دیئے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی شان جامعیت و اکملیت پر علامہ خازن بغدادی علیہ الرحمۃ کی یہ تقریر اگرچہ مختصر ہے تاہم اس باب میں ارباب فکر کی راہ نمائی کے لیے کافی ہے۔ علامہ ممدوح کی اس تقریر کی روشنی میں جو شخص آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات اور دیگر انبیاء علیہم السلام کی زندگیوں کا غائر نظر سے مطالعہ کرے گا تو وہ ضرور اس نتیجے پر پہونچے گا کہ جو انسانی کمالات اور روحانی ملکات تمام انبیاء علیہم السلام کو متفرق طور پر عطا ہوئے تھے۔ وہ سب بکیفیت مجموعی خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کے اندر موجود تھے۔ اور بے ساختہ اس کا دل پکار اٹھے گا ؎

اے کہ بر تخت سیادت ز ازل جا داری
آنچہ خوباں ہمہ دارند تو تنہا داری

۲۔ اکمال دین

جس طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات تمام انبیاء علیہم السلام کے کمالات کو جامع ہے اسی طرح آپ کا دین بھی تمام ادیان سابقہ کی خوبیوں پر حاوی اور آپ کی تعلیم بھی مکمل ترین تعلیم ہے زمانہ قدیم کے انبیاء و رسل اور عام رہنمایان اقوام کی تعلیمات کا جو حصہ اس وقت دنیا میں موجود ہے۔ آپ اس سب کو دیکھ جائیے کہیں بھی آپ کو ایسا مکمل لائحہ عمل نہیں ملے گا۔ جو ہر زمانے اور ہر مزاج کے انسانوں کی تمام

ضروریات کا پورا پورا حل پیش کر سکے۔

انبیاء سابقین میں، بڑی تعداد تو ان حضرات کی ہے جن کی تعلیم کا آج نام ونشان بھی دنیا میں موجود نہیں اور نہ کوئی امت آج ان کی پیروی کی مدعی ہے۔ اور جن حضرات کی تعلیم کسی درجہ میں موجود ہے وہ چند ہی شخصیتیں ہیں۔ آپ ان میں سے سب سے پہلے حضرت موسیٰ کی کتاب تورات پر ایک نظر ڈالیے کیوں کہ شریعت موسوی کا مدار اسی پر ہے اس میں آپ کو انبیاء سابقین کی تاریخ ملے گی۔ بالخصوص خاندان بنی اسرائیل کا ذکر زیادہ ملے گا۔ کچھ احکام ملیں گے جن میں قہر وجلال کی شان نمایاں ہوگی۔ کیوں کہ بنی اسرائیل کی اس وقت کی حالت کا تقاضا یہی تھا اور ان کی سرکشی اور تمردی کا علاج اسی سے ہو سکتا تھا۔

—— لیکن مناجات، اسرار قلب، معرفت آلہی، وصول الی اللہ، تبتل و توکل، تزکیہ باطن احسان واخلاص اور ان جیسے دوسرے دینی حقائق کا ذکر اس میں تلاش کے بعد بھی کم ملے گا — اور جس قدر ملے گا وہ بھی ایک بااستعداد روح کی تشفی کے لیے ناکافی ہوگا۔

—— اسی طرح داؤد علیہ السلام کی کتاب زبور کو دیکھئے اس میں حمد وثنا اور مناجات ہی کا نمونہ ملے گا۔ پھر اناجیل کا مطالعہ کیجئے ہمیں حضرت مسیح کی کسی قدر سوانح حیات اور آپ کے نصائح اور سبق آموز امثال ملیں گی اور جو تھوڑے بہت احکام نظر آئیں گے وہ سراسر زہد اور لین پر مبنی ہوں گے۔ جن پر کسی مستقل تمدن کی بنیاد نہیں رکھی جا سکتی اور نہ عام حالات میں ان پر عمل ہی کیا جا سکتا ہے۔

...... بلکہ انجیل میں خود حضرت مسیح کا یہ اعتراف موجود ہے کہ میں تم کو مکمل تعلیم نہ دے سکا اور ساری صداقت وسچائی نہیں سکھا سکا، کیوں کہ تمہارے ذہن ابھی اس کے تحمل کی استعداد نہیں ہے۔ اور تعلیم دین کی تکمیل کا یہ کام میں آنے والے پیغمبر کے لیے چھوڑ کر جا رہا ہوں۔ اس موقع پر انجیل یوحنا کے اردو ترجمہ کے الفاظ یہ ہیں ——

مجھے تم سے بہت سی باتیں کہنی ہیں۔ مگر ابھی تم ان کے تحمل کی طاقت نہیں رکھتے جب وہ یعنی روح حق آئے گا تو تم کو سچائی کا پورا راستہ بتائے گا۔

—— چنانچہ اسی، صاف صریح اور سچی پیشین گوئی کے مطابق خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم (جو حقیقی معنی میں روح حق ہیں) تشریف لائے اور آپ نے ان سربستہ حقائق اور معارف

کو بھی دنیا کے سامنے رکھ دیا جن کو اب تک کسی مرسل نے واشگاف کر کے نہیں بیان کیا تھا۔

اور قرآن نے گواہی دی کہ :۔

وَيُعَلِّمُكُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَيُعَلِّمُكُمْ مَا لَمْ تَكُونُوا تَعْلَمُونَ ،	ہمارا رسول تم کو کتاب و حکمت کی تعلیم دیتا ہے اور وہ باتیں بتاتا ہے جن کو اب تک تم نہیں جانتے تھے۔

بہرحال مسیح کی پیشگوئی کے مطابق اس روح حق کا نزول ہوا اور اس نے ان حقائق و معارف کو دنیا کے سامنے کھول دیا جو اب تک سربستہ آتے تھے ۔۔ اور زمین اور رسل کے بھیجنے والے نے یہ اعلان فرما دیا۔

اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ وَرَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا ...	اے فرزندان آدم ہم نے تمہارے لئے تمہارے دین کو آج مکمل کر دیا اور اپنی نعمت تم پر تمام کر دی اور ہمیشہ کے لئے تمہارے واسطے دین اسلام کو پسند کیا۔

ذی الحجہ ۱۰ھ کی نویں تاریخ تھی اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم قریباً ایک لاکھ قدوسیوں کے ساتھ عرفات کے میدان میں مراسم حج ادا فرما رہے تھے کہ تکمیل دین کی یہ زندہ جاوید نوید پہنچی اور اسی وقت عرفات کی بلند ترین پہاڑی (کوہ رحمت) پر چڑھ کر آپ نے امت کو یہ مژدہ جانفزا سنایا اور اس مقدس ترین مجمع کو شاہد بنا کر جس سے بہتر مجمع کبھی چشم فلک نے بھی نہ دیکھا تھا خدا کی طرف سے اعلان کر دیا گیا کہ ہدایت جس حقیقت کا نام ہے اور دین حق کا اطلاق جس چیز پر ہوتا ہے وہ بتمام و کمال محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ تم تک پہونچا دی گئی اور جو قانون حیات پہلے انبیاء کے واسطے سے تھوڑا تھوڑا کر کے تم کو بتایا جا رہا تھا۔ اب وہ اتمام کو پہونچ گیا۔ در معرفت الٰہی اور علم حق کا جو نصاب اب تک ناتکمل تھا وہ آج مکمل کر دیا گیا اور اب اس سلسلہ کی کوئی چیز ایسی باقی نہیں رہی جس کی تعلیم کے لیے کسی اور نبی و رسول کے آنے کی حاجت باقی ہو۔

...... اور ہم صرف جوش عقیدت سے نہیں بلکہ پوری بصیرت سے کہتے ہیں کہ زمانۂ سابق کے انبیاء اللہ پیشواؤں کی تعلیم کا جو ذخیرہ اس وقت دنیا میں موجود ہے ان سب میں حق و صداقت علم و معرفت خیر و صلاح حسن اخلاق، و حسن معاملت کے جتنے پاکیزہ نمونے آپ کو مل سکتے ہیں وہ سب حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم میں کچھ مزید محاسن کے ساتھ موجود ہیں اور اسی کے ساتھ علم حق، عمل صالح اور اصول خیر کا ایک وافر حصہ یہاں ایسا بھی ملتا ہے جس سے دنیا کے دفاتر اور صحائف خالی ہیں اور بجز تعلیم محمدی کے کسی دوسری جگہ اس کا نام و نشان بھی نہیں۔ بلکہ ہم

تو کہتے ہیں کہ انسان کی ہدایت اور اس کی صلاح و فلاح کے سلسلے میں زیادہ سے زیادہ غور و فکر اور تلاش و جستجو کے بعد جو کوئی صحیح بات انسان نکال سکتا ہے وہ ضرور اسلام میں موجود ہے اور گویا اب کوئی ایسی بات باقی نہیں رہی جس کا تعلق بنی آدم کی اصلاح و تربیت سے ہو اور وہ اسلام سے باہر ہو۔ الحاصل اسلام جمیع ابواب خیرات و برکات کو حاوی ہے اور انسان کی اعلیٰ سے اعلیٰ ترقیات کے لیے مکمل قانون اور کامیاب ترین لائحہ عمل ہے۔ اور اب اس پر کسی اضافہ کا امکان ہی نہیں۔

نسخ شرائع سابقہ

اور اسی لیے شرائع سابقہ یعنی پچھلے انبیاء کے لائے ہوئے قوانین اب ناقابل عمل اور منسوخ قرار دے دیئے گئے کہ اصولاً کامل کے بعد ناقص کی ضرورت نہیں رہتی ہے نیز انبیاء گذشتہ کی تعلیمات اور ان کے قوانین کا اکثر حصہ تحریف و نسیان کی نذر ہو چکا تھا جس کی وجہ سے اب ان کا صحیح اتباع ممکن نہیں رہا۔ اس لیے یہ بھی اعلان کر دیا گیا کہ اب نجات صرف اسی قانون کے اتباع سے ہو سکتی ہے جو ہمارے پیغمبر (محمد صلی اللہ علیہ وسلم) لیکر آئے ہیں اور جو لوگ انبیاء سابقین میں سے کسی کے ماننے والے ہیں۔ اب ان کے لیے بھی ضروری ہے کہ وہ اسی آخری اور مکمل قانون کا اتباع کریں اس کے سوا اب ان کیلئے کوئی ذریعہ نجات نہیں۔ چنانچہ ارشاد ہے۔

يَا أَهْلَ الْكِتَابِ قَدْ جَاءَكُمْ رَسُولُنَا يُبَيِّنُ لَكُمْ كَثِيرًا مِمَّا كُنْتُمْ تُخْفُونَ مِنَ الْكِتَابِ وَيَعْفُو عَنْ كَثِيرٍ قَدْ جَاءَكُمْ مِنَ اللَّهِ نُورٌ وَكِتَابٌ مُبِينٌ يَهْدِي بِهِ اللَّهُ مَنِ اتَّبَعَ رِضْوَانَهُ سُبُلَ السَّلَامِ وَيُخْرِجُهُمْ مِنَ الظُّلُمَاتِ إِلَى النُّورِ بِإِذْنِهِ وَيَهْدِيهِمْ إِلَى صِرَاطٍ مُسْتَقِيمٍ۔

اے اہل کتاب تمہارے پاس ہمارا رسول آگیا ہے جو تم سے بہت سی وہ باتیں بیان کرے گا جن کو تم اپنی کتاب میں سے چھپاتے تھے نیز وہ بہت سی باتوں سے درگذر بھی کرے گا (دیکھو) تمہارے پاس اللہ کی طرف سے نور اور کھول کر بیان کرنے والی کتاب پہنچ گئی جس کے ذریعے اللہ ان لوگوں کو جو اس کی رضامندی کا اتباع کرنا چاہیں سلامتی کی راستوں کی طرف ہدایت بخشے گا اور تاریکیوں سے نکال کر روشنی میں لے آئے گا اور صراط مستقیم کی طرف ان کی رہنمائی کرے گا۔

* * *

دوسری جگہ ارشاد ہے۔

الَّذِينَ يَتَّبِعُونَ الرَّسُولَ النَّبِيَّ الْأُمِّيَّ

اہل کتاب میں سے جنت کے مستحق صرف وہ ہیں

الَّذِی یَجِدُوْنَہٗ مَکْتُوْبًا عِنْدَھُمْ فِی التَّوْرٰىةِ وَالْاِنْجِیْلِ یَاْمُرُھُمْ بِالْمَعْرُوْفِ وَیَنْھٰھُمْ عَنِ الْمُنْکَرِ وَیُحِلُّ لَھُمُ الطَّیِّبٰتِ وَیُحَرِّمُ عَلَیْھِمُ الْخَبٰٓئِثَ وَیَضَعُ عَنْھُمْ اِصْرَھُمْ وَالْاَغْلٰلَ الَّتِیْ کَانَتْ عَلَیْھِمْ فَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا بِہٖ وَعَزَّرُوْہُ وَنَصَرُوْہُ وَاتَّبَعُوا النُّوْرَ الَّذِیْ اُنْزِلَ مَعَہٗ اُولٰٓئِكَ ھُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ٥

جو پیرے اس فرستادہ نبی اُمّی کی پیروی کرتے ہیں جس کو وہ توراۃ وانجیل میں لکھا ہوا پاتے ہیں وہ ان کو اچھائی کا حکم دیتا ہے اور برائی سے روکتا ہے۔ پاکیزہ چیزوں کو ان کے واسطے حلال کرتا ہے اور ناپاک چیزوں کو ان کے واسطے حرام کرتا اور ان پر سے بوجھ اور ان بندشوں کو دور کرتا ہے جو ان پر مسلط کر دی گئیں تھیں۔ بس جو لوگ اس پر ایمان لائے اور اس کی حمایت و اعانت کی اور اُس نور کا اتباع کیا جو اس کے ساتھ نازل کیا گیا ہے۔ سو وہی فلاح پانے والے ہیں۔"

——— ان آیات میں اس کی تصریح فرما دی گئی ہے کہ اب فلاح اور نجات صرف شریعت محمدیہ میں ہے اور اس سے باہر کسی شخص کو نجات کا راستہ نہیں مل سکتا اور پہلی شریعتوں کا اتباع اب انسان کی فلاح کے لیے کافی نہیں اور اسکی علت بھی ظاہر کر دی گئی کہ تمام محمدی تعلیمات سالقہ کے لحاظ سے کامل بلکہ اکمل ہے۔ اس میں اصولاً ہر اچھائی کا حکم اور ہر برائی کی ممانعت موجود ہے تمام طیب اور پاک چیزوں کی حلت اور خبیث اور گندی چیزوں کی حرمت کا اعلان ہے اور جو سخت احکام بعض مصالح کے لیے عارضی طور پر بنی آدم کے کسی طبقہ پر نافذ کر دیے گئے تھے اس شریعت میں ان کو ساقط کر دیا گیا ہے۔ بہرحال چونکہ یہ شریعت ہر حیثیت سے جامع مکمل اور معتدل ہے اس لیے اب تمام انسانوں کے لیے یہی راہ نجات ہے اور پچھلے تمام قوانین جو وقتی مصالح کے لحاظ سے ناممکل بھیجے گئے تھے اب وہ منسوخ اور ناقابل عمل ہیں اب خدا کی مرضی یہی ہے کہ اس کی سلطنت میں یہی آخری اور مکمل قانون نافذ ہو ———

ھُوَ الَّذِیْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَہٗ بِالْھُدٰی وَدِیْنِ الْحَقِّ لِیُظْھِرَہٗ عَلَی الدِّیْنِ کُلِّہٖ

وہی اللہ ہے جس نے بھیجا ہے اپنے اس مقدس رسول کو کامل ہدایت اور دین حق لے کر تاکہ وہ اس کو غالب کر دے سب ادیان پر۔

عمومِ دعوت | اور اسی واسطے آپ کی بعثت کسی خاص طبقے، کسی خاص زم کسی خاص ..

ملک اور خاص علاقہ سے مخصوص نہیں، بلکہ آپ کے بھیجنے والے کا اعلان ہے۔

وَمَا اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا كَآفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا — اور اے رسول ہم نے تم کو تمام ہی لوگوں کے لیے اور سارے انسانوں کے لیے بشیر و نذیر بنا کر بھیجا ہے۔ (سبا ع ۳)

حالانکہ آپ سے پہلے جو پیغمبر آئے ان میں سے کسی نے یہ دعویٰ نہیں کیا۔ بلکہ اس کے برعکس ان کا اعلان تھا کہ ہمارا حلقۂ دعوت محدود ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام خدا کے جلیل القدر پیغمبر اور اسرائیلی سلسلۂ نبوت میں امتیازی شان کے مالک ہیں۔ ان کی شریعت بھی ایک قانونی اور بلاشبہ بہت سی دوسری شریعتوں کے لحاظ سے مکمل شریعت ہے۔ حتیٰ کہ امت عیسوی کا عملدرآمد بھی اسی پر ہے اس کے باوجود انھوں نے تصریح فرمائی کہ میری یہ شریعت صرف خاندان بنی اسرائیل کے لیے ہے چنانچہ توراۃ کی پانچویں اور آخری کتاب استثنا میں ہے

"موسیٰ نے ہم کو ایک شریعت فرمائی..... جو کہ یعقوب کی جماعت کی میراث ہو۔" (باب ۳۳) حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے تو اس سے بھی زیادہ صاف الفاظ میں اعلان فرمایا کہ "میں اسرائیل کے گھرانے کی کھوئی بھیڑوں کے سوا اور کسی کے پاس نہیں بھیجا گیا (۲۴/۱۵ متی) اور جب حضرت مسیح نے اپنے بارہ شاگردوں کو منادی کے لیے روانہ کیا تو ان کو صاف صریح الفاظ میں ہدایت کر دی کہ :-

غیر قوموں میں نہ جانا اور سامریوں کے کسی شہر میں داخل نہ ہونا (۱۰/۵)

اسی طرح دیگر انبیاء بلکہ تمام اقوام کے مذہبی رہنماؤں اور پیشواؤں کی تعلیمات پر نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے کبھی اپنی تعلیم کی ہمہ گیری کا دعویٰ نہیں کیا اور ان کی تبلیغی سرگرمیاں کسی خاص حد تک محدود رہیں۔ اور چاہئے بھی یہی تھا کیونکہ ان کے پاس جو لائحہ عمل تھا اس میں عالمگیر ہونے کی صلاحیت ہی نہ تھی اور نہ وہ یکساں طور پر بنی آدم کے تمام طبقوں کے لیے قابل عمل تھا۔

بہرحال طبقۂ انبیاء و مصلحین میں صرف ایک ذات حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی کی ہے جنھوں نے خدا کے حکم سے دعویٰ کیا ہے کہ میری دعوت تمام نوع انسانی کے لیے اور میرا لایا ہوا قانون تمام بنی آدم کے لیے ہے۔ (قرآن کہتا ہے)

قُلْ يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ اِنِّىْ رَسُوْلُ — اے محمد! کہو کہ اے لوگو! میں تم سب کی

اللہ الیکم جمیعا الذی لہ ملک السموت والارض لا الہ الا ھو یحی ویمیت فامنوا باللہ ورسولہ النبی الامی الذی یؤمن باللہ وکلمتہ واتبعوہ لعلکم تھتدون .....

(سورہ اعراف رکوع ۲۰)

طرف بھیجا ہوا اللہ کا پیغمبر ہوں جو زمین و آسمان کا واحد مالک ہے۔ جس کے سوا کوئی معبود نہیں۔ جو زندہ کرنے والا اور موت دینے والا ہے۔ پس ایمان لے آؤ اللہ پر اور اس کے فرستادہ نبی اُمّی پر جو اللہ اور اس کے کلمات پر ایمان رکھتا ہے اور اس کی پیروی کرو تاکہ تم کو ہدایت نصیب ہو۔

—— اس آیت میں اعلان فرما دیا گیا کہ تمام بنی آدم کیلیے اب نجات کا ایک ہی راستہ اور ہدایت کی ایک ہی راہ ہے اور وہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا اتباع اور آپ کے احکام کی پابندی ہے اس کے سوا اب کوئی راستہ ایسا نہیں جس پر چل کر انسان نجات حاصل کر سکے اور اسی واسطے ایک موقع پر خود حضور نے ارشاد فرمایا۔۔۔

لو کان موسیٰ حیًا ما وسعہ الا اتباعی۔

اگر موسیٰ پیغمبر بھی اس دور میں زندہ ہوتے تو ان کو بھی بجز میرے قانون کی پیروی کے چارہ نہ تھا۔

محفوظیت شریعت

اور چوں کہ یہ دین (یعنی شریعت محمدی) مکمل قانون اور تعلیم بنی آدم کے لیے واجب العمل تھا اس لیے ضروری ہوا کہ وہ ہر قسم کی تحریف و تبدیل سے ابد الآباد تک کے لیے محفوظ کر دیا جائے چنانچہ خود اس کے نازل کرنے والے نے اس کی ضمانت بھی کر لی اور اعلان فرما دیا۔

انا نحن نزلنا الذکر وانا لہ لحافظون۔ (الحجر ۱)

ہم نے اس قرآن (مجموعہ قانون الٰہی) کو اتارا ہے اور ہم ہی ہمیشہ بالضرور اس کی حفاظت کریں گے۔

اس حفاظت الٰہیہ کی امتیازی شان کا اندازہ اس وقت ہو سکتا ہے جب کہ آپ کتب قدیمہ اور شرائع ماضیہ کی تاریخ پر ایک نظر ڈالیں اور دیکھیں کہ زمانہ کی دست برد نے ان کو کس درجے مسخ کر دیا ہے کہ آج اصل و نقل میں امتیاز کرنا بھی نہ صرف دشوار بلکہ محال ہو گیا ہے۔ قرآن کا ارشاد ہے۔

وان من امۃ الا خلا فیھا نذیر۔

کوئی امت ایسی نہیں ہوئی ہے جس میں خدا کی طرف سے کوئی نذیر نہ آیا ہو۔

نیز ارشاد ہے۔ ولکل قوم ھاد۔

ہر قوم کے لیے ہادی اور رہنما آئے ہیں۔۔۔

ان جیسی قرآنی نصوص سے معلوم ہوتا ہے کہ قرون ماضیہ میں ہزاروں ہادی اور رسول آچکے

ہیں اور بعض روایات میں ان کی تعداد ایک لاکھ سے بھی اوپر بتایا گیا ہے۔ لیکن ان میں سے جن بزرگوں کے نام آج کی دنیا کو معلوم ہیں وہ انگلیوں پر شمار کئے جا سکتے ہیں پھر جن کے نام بھی معلوم ہیں ان میں سے اکثر کے حالات اور ان کی تعلیمات کے آثار دنیا سے بالکل محو ہو چکے ہیں۔ اور جن کی تعلیم کا کوئی حصہ آج پایا بھی جاتا ہے تو اس پر مسخ اور تحریف کے اتنے پردے پڑ چکے ہیں کہ اصلیت کا پتہ لگانا قطعاً ناممکن ہو گیا ہے اور خود اس تعلیم کی پیروی کرنے والے بھی اس سے عاجز ہیں کہ جس کو وہ اپنے پیغمبر کی تعلیم کہہ رہے ہیں، اس کی کوئی نقلی سند بھی اپنے اس پیغمبر اور بانی سے پیش کر سکیں۔

اگرچہ مضمون کسی قدر طویل ہو جائے گا۔ لیکن مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس موقع پر مشہور اقوام کی ان مذہبی کتابوں پر تاریخی حیثیت سے کچھ کلام کیا جائے۔ جن پر ان مذاہب کی بنیاد ہے تا کہ اسلامی شریعت اور دوسری امتوں کے قوانین کا فرق ہر شخص برائی العین دیکھ لے۔

توراۃ | قرآن اور بائبل دونوں کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ موسیٰ علیہ السلام جب کوہ طور سے الواح توراۃ لے کر واپس آئے اور آپ نے اپنی قوم کو گوسالہ پرستی میں مبتلا دیکھا تو فرط غضب سے وہ لوحیں زمین پر ڈال دیں جو اسی وقت ٹوٹ پھوٹ گئیں اس کے بعد خود موسیٰ علیہ السلام نے اس کو پھر لکھوایا اور وہ سب عہد کے صندوق میں رکھ دی گئیں۔ (دستثنا باب ۲۵)

بس یہی توراۃ کا ایک نسخہ تھا جس کے متعلق خیال کیا جاتا ہے کہ وہ داؤد علیہ السلام کے عہد تک عہد کے صندوق میں محفوظ رہا ——— لیکن سلاطین اول باب ۸ سے معلوم ہوتا ہے کہ جب عہد کا صندوق ہیکل سلیمانی میں لایا گیا تو اس میں سے پتھر کی شکستہ لوحوں کے سوا کچھ بھی نہ نکلا گویا توراۃ کا وہ نسخہ بھی اس وقت غائب تھا اس کے بعد سلیمان علیہ السلام نے کسی طرح توراۃ کو پھر مرتب کرایا اور اسکو عہد کے صندوق میں بند کرا کے ہیکل میں محفوظ کر دیا جب ۵۸۶ قبل مسیح میں بخت نصر نے ہیکل کو برباد کیا تو اس نسخۂ توراۃ کو بھی اس نے تلف کر دیا اس وقت دنیا میں توراۃ کا کوئی نسخہ بھی نہیں رہا ——— اس واقعہ کے تقریباً ۱۵۰ برس بعد حضرت عزیر نے اپنے حافظہ اور چند رفقاء کی امداد سے پھر توراۃ کو لکھا۔ پھر ولادت مسیح سے تقریباً پونے دو سو برس پہلے انطاکیہ کے یونانی بادشاہ انٹیوکس نے یہودیوں کے مذہب اور ان کی پولیٹکل حیثیت کو مٹانے کے لیے یروشلم پر متعدد حملے کئے مقدس ہیکل کو بے حرمت کیا اور ان کے جو مذہبی صحیفے بھی ہاتھ آسکے ان کو ڈھونڈ ڈھونڈ کر جلا ڈالا اور اس پر بس نہیں کیا۔ بلکہ حکم عام دے دیا کہ جس کے پاس توراۃ یا اس سلسلے کی کسی دوسری مقدس کتاب

کا کوئی بھی نسخہ نکلے یا جو کوئی شخص شریعت یہود کی کوئی رسم ادا کرے اس کو قتل کیا جائے چنانچہ
اس کی تعمیل کی گئی اور نہ صرف ایک دفعہ بلکہ ہر مہینے تفتیش ہوتی اور ڈھونڈ ڈھونڈ کے ایسے
لوگوں کو قتل کیا جاتا جن کے پاس کسی مقدس صحیفے کا کوئی نسخہ برآمد ہوتا۔

الغرض اس انقلاب سے توراۃ بلکہ عہد عتیق کے سارے مجموعے کو دنیا سے پھر ناپید کر دیا۔ کہا
جاتا ہے کہ ایک بوڑھا کاہن اس موقع پر اپنے تین فرزندوں کو لے کر یروشلم سے شہر مودن کو بھاگ
گیا تھا۔ اس کے ایک لڑکے مقابیس نے ۱۶۵ء قبل مسیح میں پھر کسی طرح ایک نسخہ
توراۃ کے نام سے مرتب کر کے ہیکل میں رکھا اور اسی کو توراۃ مان لیا گیا۔

یہاں تک جو واقعات مذکور ہوئے وہ حضرت مسیح سے پہلے کے ہیں۔ لیکن ان ہی
واقعات پر یہ سلسلہ ختم نہیں ہوا بلکہ زمانہ مابعد میں بھی توراۃ اور دیگر کتب مقدسہ بنی اسرائیل
پر ایسے حوادث گذرے کہ دشمنوں نے ان کے ناپید کرنے کی پوری کوشش کی اور وہ بڑی حد تک
اس میں کامیاب بھی ہوئے۔ ان حالات میں کس طرح کوئی دعویٰ کر سکتا ہے کہ موجودہ
توراۃ وہی ہے جو موسیٰ علیہ السلام نے حضرت یوشع کے حوالہ کی تھی۔

انجیل اب ذرا انجیل کی تاریخ پر بھی نظر ڈالیے۔ فی زمانہ چار کتابیں جو عیسائیوں
میں انجیل کے نام سے مشہور ہیں اور ان چار شخصوں کی طرف منسوب ہیں جنھوں نے ان کو جمع
یا اور ترتیب دیا۔
انجیل متی[۱] ۔ انجیل مرقس[۲] ۔ انجیل لوقا[۳] ۔ انجیل یوحنا[۴]۔ لیکن ان چاروں
انجیلوں کے متعلق یہ مسلم ہے کہ ان میں کوئی بھی ایسی نہیں ہے جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی موجودگی
میں یا ان کی نگرانی میں لکھی گئی ہو۔ بلکہ یہ سب بعد میں مختلف زبانوں میں لکھی گئی ہیں۔
ان میں متی کی انجیل سب سے پہلے عبرانی زبان میں لکھی گئی تھی۔ لیکن اس کا اصل عبرانی
نسخہ آج دنیا سے بالکل ناپید ہے۔ قدیم سے قدیم نسخہ یونانی کا پایا جاتا ہے جس کے متعلق کوئی پادری
نہیں بتلا سکتا کہ یہ ترجمہ کب اور کس نے کیا؟ اور یہ کہ صحیح ہے یا غلط؟ بلکہ اس میں ایسی چیزیں
موجود ہیں جن کے ہوتے ہوئے اس کو متی کی تالیف بھی نہیں کہا جا سکتا۔ بلکہ خیال ہوتا ہے کہ وہ بعد
میں ملحق کر دی گئی ہیں۔ اسی واسطے انجیل کے شارح فاضل نورٹن نے اس کے پہلے اور دوسرے
باب کو بجا بلکہ لوقا کے تسلیم نہیں کیا بلکہ اقرار کیا ہے کہ یہ دونوں باب اصل مصنف (متی) کے لکھے
ہوئے نہیں ہیں۔ (کتاب الاسناد صفحہ ۵۲)

دوسری انجیل مجموعہ عہد جدید میں لوقا کی ہے اس شخص نے خود مسیح کو دیکھا بھی نہیں بلکہ یہ اس پولس کا شاگرد ہے جو مسیح کی زندگی بھر ان کے مشن کی مخالفت کرتا رہا۔
اس لیے ظاہر ہے کہ محققین کی نظر میں اس کی مرتب کردہ انجیل کو بھی کوئی خاص وقعت حاصل نہیں ہو سکتی۔ اس کے متعلق بھی وہی شارح انجیل فاضل نورٹن لکھتا ہے۔

"جن اعجازی باتوں کو لوقا نے لکھا ہے ان میں جھوٹی روایتیں بھی شامل ہو گئی ہیں۔ اور اس کے لکھنے والے نے شاعرانہ مبالغے سے اندراج کیا ہے۔ اور اس زمانے میں سچ کو جھوٹ سے تمیز کرنا مشکل ہے" (کتاب الاسناد)

غور کیجئے جس کتاب میں سچ کو جھوٹ سے تمیز کرنا مشکل ہو گیا ہو کیا وہ بھی کسی درجہ میں محفوظ کہی جا سکتی ہے۔ تیسری انجیل مرقس کی تالیف کردہ ہے۔ یہ شخص بھی خود مسیح کا شاگرد نہیں۔ بلکہ پیٹر حواری کا شاگرد ہے۔ اس کی انجیل کے مضامین لوقا سے بہت مختلف ہیں اور صحیح و غلط کی تمیز کا کوئی معیار نہیں۔

چوتھی انجیل یوحنا کی ہے کہا جاتا ہے کہ اس شخص کو براہ راست مسیح سے فیض حاصل کرنے کا موقع ملا تھا۔ لیکن یہ بھی مسلم ہے کہ اس کی انجیل سنہ تالیف کے لحاظ سے سب سے آخری ہے اور اس کی انجیل اور باقی تینوں انجیلوں کے مضامین میں بھی کافی اختلاف ہے

بہر حال چاروں انجیلوں میں سے کوئی ایک بھی ایسی نہیں جس کو یقینی طور پر مسیح کی انجیل کہا جا سکے۔ پھر ان کے باہمی تضاد نے ان کو اور بھی ناقابل اعتبار کر دیا ہو نیز پادری فرنچ جیسے مصنفین نے ان میں تحریف کا بھی اقرار کیا ہے۔ اور تسلیم کیا ہے کہ ان میں چھوٹی موٹی ہزاروں غلطیاں موجود ہیں۔ بھلا جس کتاب کا یہ حال ہو کیا اس کی محفوظیت کا کسی کو گمان بھی ہو سکتا ہے۔؟

(وید) اس کتاب کو زمانہ قدیم سے ہندوستان میں خدائی کتاب سمجھا گیا ہے اور فی زمانہ آریہ سماج اور سناتن دھرمی ہندوؤں کے دونوں ہی مذہبی گروہ اس کی عظمت و تقدس کے معتقد ہیں مگر اس کے باوجود اس کے مصداق میں شدید اختلاف ہے آریہ سماج صرف منتر بھاگ کو ایشوری گیان مانتے ہیں اور سناتن دھرم برہمن بھاگ کو بھی اس میں شامل کرتے ہیں۔

واضح رہے کہ برہمن بھاگ ضخامت اور مقدار کے لحاظ سے منتر بھاگ کے قریباً دو چند ہے گویا قدیم حامیان وید سناتن دھرم جس کو وید مانتے ہیں آریہ سماج اس کے دو تہائی حصے کا منکر ہو کر صرف ایک تہائی کو ایشوری گیان مانتا ہے اور سناتن دھرم آریہ سماج کے وید سے تین گ

وید تسلیم کیے ہیں۔

پھر اس میں بھی ان کو سخت اختلاف ہے کہ ان ویدوں کا ظہور اس دنیا میں کس ذریعے سے ہوا۔ سناتن دھرم برہما کو ویدوں کا ظاہر کرنے والا کہتے ہیں۔ اور آریہ سماج اگنی، وایو، آدتیہ، انگرا، چار رشیوں کو۔ پھر دونوں میں سے کسی کے پاس کوئی سند ایسی نہیں جس سے وہ اپنے دعوے کو ثابت کر سکے اور معلوم ہو سکے کہ واقعی یہ وہی وید ہیں جو برہما یا چار رشیوں کے ذریعے سے آئے تھے ایسی حالت میں ان کی محفوظیت کا ادعا بھی ایک خیال خام ہو گا۔

سطور بالا سے ناظرین نے بخوبی سمجھ لیا ہو گا بلکہ حفاظت الٰہیہ نے ان کتابوں میں سے کسی کا بھی ساتھ نہیں دیا۔ اور نہ صرف یہ کہ ان کتابوں کی حفاظت نہیں کی گئی بلکہ ان زبانوں کو بھی قدرت کے زبردست ہاتھوں نے مٹا دیا جن میں کبھی یہ کتابیں نازل ہوئی تھیں، یا لکھی گئی تھیں، جیسے توراۃ نازل ہوئی کالدی، جو حضرت مسیح کی زبان تھی اور سنسکرت قدیم وید کی بھاشا، آج دنیا کے کسی حصے میں کسی ملک میں، کسی صوبے میں بھی بطور زبان مستعمل نہیں۔ فی الحقیقت یہ قدرت کی طرف سے اس چیز کی زبردست گواہی ہے کہ اب ان کتابوں کا دور ختم ہو گیا جو ان زبانوں میں نازل ہوئی تھیں اور اب دنیا ان کتابوں سے مستغنی کر دی گئی۔

قرآن اور شریعتِ اسلام

لیکن اب اس کے مقابل ذرا قرآن کا حال بھی دیکھئے کہ اس کے نازل کرنے والے قادر و توانا نے کس طرح، اس کے لفظ لفظ بلکہ نقطہ نقطہ اور شوشہ شوشہ کی حفاظت کی ہے کہ کسی شکی اور وہمی طبیعت کے لیے بھی تردد کی گنجائش نہیں۔ اگر حق تعالیٰ کی زبردست قدرت اس کی حفاظت کی کفیل اور ضامن نہ ہوتی تو ایک ایسی کتاب میں ہزاروں غلطیوں کا ہو جانا چنداں مستبعد نہ تھا جس کا لانے والا امی، اور ما کنت تدری ما الکتاب کا مخاطب تھا۔

یہ صرف وہ انا لہ لحافظون ہی کا کرشمہ ہے کہ آج تیرہ سو برس گذر جانے کے بعد بھی اس رتی کی لاف ہوئی اس کتاب کا ایک ایک حرف بلکہ زیر زبر بھی اسی طرح محفوظ ہے جس طرح کہ اس وقت نازل ہوا تھا۔

دنیا کے اس دور میں بھی لاکھوں سے زیادہ اس کے حفاظ موجود ہیں اور ہزاروں سے زیادہ ایسے اہل علم بھی پائے جاتے ہیں جو برجستہ بتلا سکتے ہیں کہ فلاں حرف قرآن پاک میں اتنی جگہ آیا ہے۔ اور فلاں حرف اتنی جگہ۔ اور اگر آج کوئی بڑے سے بڑا دشمن اسلام

ذات ہے اس میں ایک حرف بھی کم و بیش کرنا چاہے تو اس میں کامیاب نہیں ہو سکتی جیسا کہ ارشاد ملّاعلی کا اعلان ہے۔

لایاتیہ الباطل من بین یدیہ و لا من خلفہ تنزیل من حکیم حمید؟	اس قرآن میں نہ آگے سے باطل داخل ہو سکے گا نہ پیچھے سے یہ تو اللہ کی طرف سے نازل فرمایا گیا ہے جو حکیم اور قابل حمد ہے۔

امام بیہقی یحیٰی ابن اکثم سے راوی ہیں کہ:۔

ایک یہودی امون رشید کے دربار میں آیا اور بہت عمدہ گفتگو کی جس کی وجہ سے مامون رشید کے دل میں اس کی وقعت قائم ہو گئی اور مامون نے از راہ محبت و خلوص اس کو دین حق (اسلام) کی دعوت دی لیکن وہ اس وقت اسلام نہ لایا اور چلا گیا۔ پھر اگلے سال مسلمان ہو کر آیا۔ ہارون نے پوچھا کہ کیا چیز تمھارے اسلام کا باعث ہوئی اس نے عرض کیا کہ جب میں آپ کے یہاں سے لوٹ کر گیا تو میں نے ادیان کو جانچا اور یہ طریقہ اختیار کیا کہ پہلے میں نے توراۃ کے تین نسخے لکھے جن میں اپنی طرف سے کچھ کمی و زیادتی بھی کر دی اور میں اس کو لے کر کلیسا میں گیا اور وہاں کے لوگوں نے ان کو ہاتھوں ہاتھ خرید لیا۔

پھر میں نے انجیل کے بھی تین نسخے لکھے اور ان میں بھی اپنی طرف سے کچھ گھٹا بڑھا دیا اور ان کو لے کر میں گرجا گھر پہنچا۔ پادریوں نے وہ تینوں نسخے مجھ سے بے تکلف خرید لیے۔

پھر اسی طرح میں نے قرآن کے بھی تین نسخے تیار کئے اور ان میں بھی کچھ کمی بیشی کر دی اور میں ان کو لے کر کتب فروشوں میں پہونچا انھوں نے ورق گردانی کر کے ان کو بخوبی دیکھا بھالا اور جب میری کارستانی کا حال معلوم ہوا تو پھینک دیا اور کسی نے نہیں خریدا تب میں نے سمجھ لیا کہ بس یہی ایک کتاب تبدیل و تحریف سے محفوظ ہے۔ اور اس آزمائش کے بعد میں نے اسلام قبول کر لیا۔[1]

اس قسم کے واقعات تاریخ میں اور بھی ملتے ہیں کہ امتحان کرنے والوں نے اس طرح، قرآن حکیم اور دوسری کتابوں کا امتحان کیا اور اس امتحان میں صرف قرآن حکیم ہی کامیاب ہو سکا۔

آج دنیا بھر کی کتابوں میں صرف قرآن ہی ایک ایسی کتاب ہے جس کے دنیا میں آنے

---

[1] زرقانی ج ۵ صفحہ ۲۸۳) ۱۲

کے وقت سے کہ اب تک علی التسلسل لاتعداد حفاظ موجود رہے اور آج بھی مسلمانوں کی کوئی آبادی ایسی نہ ملے گی جس میں بکثرت حفاظ قرآن موجود نہ ہوں اگر خدانخواستہ تمام مذہبی کتابیں یعنی رسائل دنیا سے فنا کر دیئے جائیں تو صرف ایک قرآن مجید ہی ہوگا جس کے بے شمار نسخے ان لاعدد میں امانت دار سینوں سے باہر نکل کر اہل دنیا کی رہنمائی کر سکیں گے۔

قرآن مجید کی اس محفوظیت سے آج فضلا یورپ بھی واقف ہیں، سر ولیم میور سابق گورنر صوبہ متحدہ اپنی کتاب "LIFE OF MOHAMMED" (لائف آف محمد) کے دیباچہ میں قرآن مجید کے متعلق لکھتے ہیں۔

جہاں تک ہماری معلومات ہیں۔ دنیا بھر میں ایک بھی ایسی کتاب نہیں جو اس (قرآن مجید) کی طرح بارہ صدیوں تک ہر قسم کی تحریف سے پاک رہی ہو۔

بہرحال ان تمام کتابوں میں جن پر کسی قوم کے مذہب کی بنیاد ہے صرف ایک قرآن ہی ایسی کتاب ہے جو اپنی اصلی حالت میں ان ہی الفاظ کے ساتھ موجود اور محفوظ ہے جن الفاظ میں اس کے لانے والے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو اب سے ساڑھے تیرہ سو برس پہلے دنیا کے سامنے پیش کیا تھا اور نہ صرف قرآن بلکہ آپ کی ساری تعلیم، بلکہ آپ کی ساری سیرت بھی اس طرح محفوظ کر دی گئی ہے کہ ہر صاحب نظر کامل تعین اور اذعان کے ساتھ آپ کی تعلیم کی تعمیل اور آپ کی سیرت مقدسہ کی پیروی کر سکتا ہے۔

ابتدائے عالم سے آج تک پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے علاوہ تاریخ کسی ایک ایسے رہنما اور بانی مذہب کی مثال نہیں پیش کر سکتی۔ جس کے اقوال و افعال عادات و احوال اس طرح اہتمام کے ساتھ منضبط کئے گئے ہوں اور پھر اسی طرح قرناً بعد قرن حفاظت کے ساتھ منقول ہوتے رہے ہوں اور پھر ساتھ ہی اطمینان عام کیلئے ان کے ناقلین کے احوال کی بھی پوری طرح جانچ پڑتال کی گئی ہو اور ہر راوی کے کیریکٹر اس کے حافظہ اس کے ذہن اس کے تلامذہ و اساتذہ کے احوال بھی مدون کئے گئے ہوں۔

فی الحقیقت اس سلسلے میں جو کچھ مسلمانوں کے ہاتھوں سے ہوا اور انھوں نے جن طریقوں سے اپنے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم اور آپ کی سیرت کی حفاظت کی وہ محض قدرت الٰہیہ کا ایک کرشمہ تھا اور امت مسلمہ اس کے لیے بمنزلہ ایک اعجاز مسر کے تھی۔

اللہ اللہ! حضور کو اس دنیا سے رخصت ہوئے آج تیرہ سو چھیالیس ۱۳۴۶ برس کا عرصہ ہو گیا مگر آپ کی تعلیم اور آپ کے حالات زندگی اس تفصیل اور تنقیح کے ساتھ محفوظ ہیں کہ

آج بھی دنیا میں آپ کو اتنے ہی قریب سے دیکھا جا سکتا ہے جتنے قریب سے کہ آپ کے عہد مقدس کے لوگ دیکھ سکتے تھے فرق ہے تو صرف یہ کہ آج آپ کا جسد اطہر اس دنیا میں موجود نہیں ہے۔ لیکن اطاعت اور اتباع کے لیے جس تعلیم اور اسوۂ حسنہ کے معلوم ہونے کی ضرورت ہے وہ احادیث اور سیر کی مستند کتابوں میں اپنی اصلی حالت میں محفوظ ہے۔

الغرض رسولوں اور پیشواؤں میں سے اگر کسی کا اتباع یقینی بنیاد پر کیا جا سکتا ہے تو وہ صرف حضرت محمدؐ کی ذات بابرکات ہے کیونکہ صرف آپ ہی کی لائی ہوئی کتاب اور آپ ہی کی بتائی ہوئی شریعت اپنی اصلی حالت میں محفوظ ہے۔

صلی اللہ تعالیٰ علیہ وعلیٰ آلہ واصحابہ وسلم وبارک وعظم وشرف وکرم

ختم نبوت اور چونکہ آپ کا دین مکمل ہے آپ کی دعوت عام اور آپ کی شریعت ابد تک کے لیے محفوظ ہے اس لیے آپ پر ہی سلسلۂ نبوت ختم کر دیا گیا۔ کیوں کہ کسی نبی کی بعثت کے تین ہی سبب ہو سکتے ہیں ایک یہ کہ قوم کو ہدایت الٰہیہ ابھی پہنچی ہی نہ ہو۔ اور وہ بکلی قوم ھاد کے قانون عام کے مطابق کسی نبی یا رسول کے ذریعہ اس کے پاس پیغام ہدایت بھیجا جائے دوسرے یہ کہ پہلے نبی تو آئے مگر ان کی ہدایت اور تعلیم کے آثار محفوظ نہیں رہے مٹ گئے یا تحریف و نسیان کی نذر ہو گئے جس کی وجہ سے اب لوگوں کے لیے ان کی اطاعت اور پیروی ناممکن ہو گئی تیسرے یہ کہ پہلے آنے والے نبیوں کی تعلیم مکمل نہ تھی اور زمانہ کے احوال نے اس میں مزید اضافے کی ضرورت پیدا کر دی۔

بس یہی وہ تین سبب ہیں جن کے ماتحت دنیا میں انبیاء علیہم السلام مبعوث ہوئے اور ان کے سوا عقلاً کوئی چوتھا سبب انبیاء کی بعثت کا نہیں نکلتا اور رسالت محمدی نے ہمیشہ کے لیے ان تینوں سببوں کا خاتمہ کر دیا اس لیے بعثت انبیاء کا سلسلہ بند ہو گیا چونکہ آپ کی دعوت عام تھی اور آپ کی بعثت تمام عالم کی طرف ہوئی اس لیے اب کوئی قوم اور نسل انسانی کا کوئی طبقہ ایسا نہیں رہا جس کے پاس ہدایت الٰہی نہ پہنچی ہو اور اس بنا پر اس کے لیے نبی کا آنا ضروری ہو، اور چوں کہ آپ کی لائی ہوئی کتاب اور آپ کی بتلائی ہوئی شریعت کو ہمیشہ کے لئے محفوظ کر دیا گیا ہے اور اب اس میں تحریف و ضیاع کا کوئی خطرہ نہیں رہا اس لیے دوسرے سبب کی بنا پر بھی اب قیامت تک کسی نبی اور رسول کی ضرورت نہیں۔ اور چونکہ آپ کا دین مکمل ہے اور آپ کی شریعت میں ان تمام انسانی ضروریات کا حل موجود ہے جو کسی وقت انسان کو پیش آ سکتی ہیں۔ اس لیے اب اس پر کوئی اضافہ ہونا بھی متصور

اب نہ کسی کے لئے کسی اور رسول کی آمد کی ضرورت ہو۔
اسی لئے کتاب الٰہی میں اعلان کر دیا گیا۔

ما کان محمد ابا احد من رجالکم ولکن رسول اللہ	محمدؐ تمھارے مردوں میں سے کسی کے باپ تو نہیں
وخاتم النبیین وکان اللہ بکل شئی علیما	مگر وہ اللہ کے رسول اور سب نبیوں کے خاتم ہیں
(احزاب)	اور اللہ ہر چیز کو خوب جاننے والا ہے۔

انقطاع سلسلۂ نبوت کا یہ اعلان صرف قرآن ہی نے کیا اور اس سے پہلے جو صحیفے خدا کی طرف سے نازل ہوئے یا جو پیغمبر آتے رہے انھوں نے کبھی اس قسم کا اعلان نہیں کیا بلکہ وہ برابر بعد میں آنے والے پیغمبروں کی بشارت دیتے رہے۔

موسیٰ علیہ السلام سے ان کے خداوند خدا نے کہا۔ "اور میں ان کے (بنی اسرائیل) کے لئے ان کے بھائیوں میں سے تجھ سا ایک نبی برپا کروں گا اور اپنا کلام اس کے منہ میں ڈالوں گا اور جو کچھ میں اسے فرماؤں گا وہ سب ان سے کہے گا۔ (تورات۔ استثناء ۱۸)

اور ملاکی نبی کی کتاب باب سوم میں فرمایا گیا۔

"دیکھو میں اپنے رسول کو بھیجوں گا اور وہ میرے آگے میری راہ کو درست کریگا۔
(ملاکی باب ۳)

اور حضرت مسیح نے اپنے حواریوں سے کہا۔

"لیکن وہ فارقلیط یعنی روح القدس جسے باپ میرے نام سے بھیجے گا وہی تمھیں سب باتیں سکھائے گا ..... اور اب میں نے تم سے اس کے ہونے سے پہلے کہہ دیا ہے تاکہ جب وہ وقوع میں آئے تو تم ایمان لاؤ اس کے بعد میں تم سے بہت کلام نہ کرونگا کیونکہ اس جہان کا سردار آتا ہے اور مجھ میں اس کی کوئی چیز نہیں۔
(انجیل یوحنا۔ باب ۱۴)

بہرحال انبیاء سابقین نے ہمیشہ اسی طرح بعد میں آنے والے پیغمبروں کی بشارت دی اور کسی نے یہ اعلان نہیں کیا کہ بس میں ہی اس سلسلہ کی آخری کڑی ہوں۔ یہ اعلان صرف قرآن اور صاحب قرآن صلی اللہ علیہ وسلم ہی نے کیا۔ اور آپ ہی پر انبیاء و رسل کا یہ سلسلہ ہمیشہ کے لئے ختم ہو گیا۔

یا رب صل وسلم دائماً ابداً علیٰ حبیبک خیر الخلق کلھم

اِسلام اور پیغمبرِ اِسلام

مسٹر راجگوپال آچاریہ[1] کی ایک تقریر

گورنمنٹ محمڈن کالج مدراس میں سر محمد عثمان صاحب کے زیر صدارت سیرت کا ایک جلسہ ہوا جس میں صوبہ مدراس کے وزیر اعلیٰ مسٹر راجگوپال اچاریہ نے بھی ایک لمبی تقریر کی جس کا ترجمہ بعض اردو اخبارات میں بھی شائع ہو چکا ہے ـــــ اس تقریر کے مطالعہ سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ ان گئے گزرے حالات میں بھی محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے الٰہی پیغام کے لئے کتنی فضا بلکہ کیسی پیاس موجود ہے اور اس پیغام حیات کو دوسروں تک پہنچانے کے بارے میں اس امانت کے حامل ہم مسلمانوں سے کیسی غفلت اور کس قدر کوتاہی ہو رہی ہے ـــــ وزیر موصوف نے اسلام کے بارے میں اظہار خیال کرتے ہوئے فرمایا۔

"بے شک اگر دنیا میں کسی مذہب نے انتہائی فراخ دلی سے کام لیا ہے تو وہ اسلام ہے"

اسلام کی باطنی قوت اور اپنے ماننے والوں کے دلوں پر اس کی زبردست گرفت کا اعتراف آپ نے ان الفاظ میں فرمایا۔

"یہ نہایت مسرت بخش امر ہے کہ اب بھی میں یہ دیکھتا ہوں کہ موجودہ تعلیم یافتہ مسلمان اپنی عبادت بعینہ اس طرح کرتے ہیں جیسے کہ ان کے مذہبی پیشرو کرتے تھے اور یہ چیز بے شک اعتقاد میں حسن اور ایمان میں استقامت پیدا کرتی ہے جب کبھی بھی میں ان تمام چیزوں کا خیال کرتا ہوں تو میں یہ کہے بغیر نہیں رہ پاتا کہ اسلام میں کوئی ایسی چیز ضرور پوشیدہ ہے جس کی وجہ سے اہل اسلام آج تک اس پر قائم ہیں جس کا ہندو مت میں فقدان ہے بلکہ وہاں تو بجائے اس کے کوئی ایسی چیز ہے جس نے انھیں ان اصول و قواعد کی پابندی کے بجائے ان کے چھوڑنے کی طرف مائل کر دیا ہے اس ضمن میں میں یہ کہنے پر مجبور

---

[1] یہ وہی راجگوپال اچاری ہیں جو ایک زمانہ میں ہندوستان کے گورنر جنرل تھے۔

ہوں کہ اسلام میں ایک قوت غیبی موجود ہے جس نے باوجود موجودہ تعلیم و تہذیب کے انھیں اپنی روش پر برقرار رکھا ہے۔

آپ نے داعی اسلام حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت اور آپ کی تعلیمات کے مطالعہ کی طرف حاضرین کو توجہ دلاتے ہوئے فرمایا

آپ تمام اصحاب کو رسول اللہ کی زندگی اور ان کی محبت اور عفو و درگزر کی پرزور سفارشی تعلیمات کا غور و مطالعہ کرنا چاہیئے جنھیں انھوں نے وہاں پھیلایا جہاں کے لئے ان چیزوں کا نام بھی بالکل غیر مانوس تھا اور ان ذریعوں کو معلوم کرنا چاہیئے جو انھوں نے اپنے گردو پیش والوں کے لئے اختیار کئے تھے جس کی وجہ سے وہ ایک بالکل نئی، مفید اور صداقت پر مبنی تہذیب کو نہایت آسانی اور تیزی کے ساتھ ہر طرف پھیلانے میں کامیاب ہوئے جس کا اثر نوع انسانی نے بہت تیزی کے ساتھ قبول کیا اور جس سے آج تک وہ برابر مستفید ہو رہی ہے۔ پیغام اسلام اور تعلیمات محمدی میں ایک خاص چیز غور طلب ہے کہ مذہب کا پیغمبر لایا تھا جس کی وجہ سے تمام جاہلیت کو بہت قلیل عرصہ میں ان تمام خصوصیات سے مالامال کر دیا گیا جن کی اسے اشد ضرورت تھی اور جن کے نہ ہونے کی وجہ سے دنیا بہت پیچھے پڑی ہوئی تھی۔ اپنے اظہار خیال کی اس اعتراف کے ساتھ ہے کہ ـــــ میں نے جہاں تک ممکن تھا اسلام اور محمد کی زندگی کا مطالعہ نہایت شوق و عظمت کے جذبہ کے ساتھ کیا لیکن پھر بھی میں اس کا یقین رکھتا ہوں کہ وہ ایک ایسا محیط ہے جس کا عبور میرے امکان سے باہر ہے۔

وزیر موصوف نے اپنی تقریر میں پیغام محمدی کے حامل ہم مسلمانوں بالخصوص علماء اسلام کے لئے جو سب سے زیادہ قابل عبرت لیکن بالکل مبنی برحقیقت بات کہی ہے وہ یہ ہے۔

میرا یہ خیال ہے کہ ہندوستان کے اکثر حلقوں میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی صحیح تفہیم نہیں ہوئی، اس سلسلہ میں ابھی بہت کچھ کام کیا جا سکتا ہے جو ایک کار خیر ہوگا۔ اس کا بیڑا اٹھانے کے بعد یہ بخوبی معلوم ہو جائے گا کہ میرا یہ خیال کہ محمد صلعم کی صحیح تفہیم اکثر حلقوں میں مفقود ہے، بالکل صحیح ہے ـــــ اس کے لئے کہ ناقص معلومات اور خواب ذہنیت دور کر دیا جائے۔ تلوار کی ضرورت نہیں بلکہ ان کے سامنے واضح کر کے ہر ہر حقیقت کو بیان کرنا چاہیئے۔ برے خیالات قائم کر لینے اور برے برتاؤ سے پیش آنے سے کچھ نہیں ہوتا۔ سمجھنے اور سمجھانے اور ہر چیز کی گہرائیوں کو

سمجھانے سے داعیوں کی اصلاح ہوتی ہے ـــــ

ایک چیز کا ایک ہی ملک میں جب غلط مفہوم بھی لیا جا سکتا ہے تو یکھو اگر ممکن ہو کہ دور دراز کے ممالک کے وقت اور حالات کا صحیح اندازہ ہو سکے اور بعض حقیقت سے بعید چیزوں کا بھی یقین نہ کر لیا جائے ـــــ اس موجودہ مخالفت کا سبب مقامات کا بعد دفات کا اختلاف اور ہم خیال پڑوسیوں کا فقدان ہے ـــــ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تقریباً چودہ سو سال قبل دنیا میں موجود تھے اور وہ بھی ہندوستان سے ایک بالکل مختلف نوعیت کے ملک میں، اس لئے ان کی عرب کی زندگی کے حالات ان لوگوں کی سمجھ میں اچھی طرح نہیں آسکتے جو اس ماحول میں نہ خود رہ چکے ہوں اور نہ جن کے اسلاف رہے، بلکہ اس کے برعکس انھوں نے ہندوستان میں ترقی معکوس کے زمانہ میں پرورش پائی ہے اس لئے یہی ایک صورت باقی رہجاتی ہے کہ اول تو دوسروں کی غلط فہمیوں کو برداشت کرنے کی عادت ڈالی جائے اور ان میں تعلیم کے ذریعے ان چیزوں کو نکالنے کی کوشش کی جائے۔

یہ ہے ہمارے لئے ایک "بڑے اقتدار" کے مالک اور ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ غیرمسلم کی تذکیر، فَهَلْ مِنْ مُّدَّكِرٍ ؟

ذیر موصوف کو خیالات کی اس منزل تک کس چیز نے پہنچایا اور مسلمان داعی اسلام کی تفہیم کے لئے ہم کو کون سا طریقہ اختیار کرنا چاہیے جو خالص "اندھیر نگری" میں رہنے والوں کو روشنی سے قریب کر سکے۔ اس کو بھی خود موصوف ہی کے لفظوں میں سنیے۔

میں اپنے دائرۂ احباب میں بہت سے اچھے مسلمان پاتا ہوں جن کے ساتھ رہ کر میں اپنی زندگی کو ان قدیم مسلمانوں کی صحبت کے مشابہ سمجھنے لگا ہوں جن کے متعلق مجھے مطالعہ کے ذریعے کچھ علم ہوا ہے آج سے ۸۰ سال پہلے جب میں جیل خانہ میں تھا اس وقت بھی بہت سے نہایت اچھے عقائد کے مسلمان دوست تھے جنھوں نے اس سلسلے میں میری بہت زیادہ مدد کی۔ کوشش و محنت کر کے قرآن مجید کے نہایت اچھے ترجمے اور دیگر تعلیمات سے لئے ہم پہنچائیں جنھیں میں کبھی بھول نہیں سکتا۔

(ماخوذ از پیام حیدرآباد دکن ۱۹ ذوالحجہ ۱۳۵۷ھ)

(الفرقان جمادی الاخریٰ ۱۳۵۸ھ)

محمد منظور نعمانی

ربیع الاول اور مسلمانوں کا طرز عمل

هُوَ الَّذِي أَرْسَلَ رَسُولَهُ بِالْهُدَىٰ وَدِينِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهُ عَلَى الدِّينِ كُلِّهِ ۚ وَكَفَىٰ بِاللَّهِ شَهِيدًا

اب سے تقریباً چودہ سو برس پہلے جب کہ کائنات انسانی بحر ظلمات میں غرق تھی۔ اور روحانیت شیطنت سے مغلوب ہو رہی تھی۔ خلاق عالم نے اپنے آخری نبی اور محبوب ترین رسول حضرت محمد بن عبداللہ روحی و قلبی فداہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کو اس بنا پر بھیجا تاکہ آپ نور ہدایت سے ظلمات ضلالت کو شکست دیں۔ اور حق کو باطل پر غالب کر دیں۔ ہمارے ملی باپ، سب پر شاہ ہوں آپ تشریف لائے اور آتے ہی باذن اللہ دنیا کا رخ پلٹ دیا۔ بندوں کا ٹوٹا ہوا رشتہ خدا سے جوڑا اور جو غم نصیب حضیض ذلت میں گر چکے تھے۔ ان کو وہاں سے اٹھا کر اوج رفعت پر پہنچایا، مشرکوں کو موحد بنایا اور کافروں کو مومن، بت پرستوں کو خدا پرست کیا اور بت سازوں کو بت شکن، رہزنوں کو رہنمائی سکھائی۔ اور غلاموں کو آقائی ۔۔ ، چور چوکی دار بن گئے اور ظالم غمخوار ۔۔۔ اور جو دنیا بھر کے آوارہ تھے وہی سب سے زیادہ متمدن ہو گئے اور جن کا قومی شیرازہ بالکل منتشر ہو چکا تھا وہ کامل طور پر منظم کر دیئے گئے ۔۔ روحانیت کے فرشتے شیطنت پر غالب آ گئے۔ کفر و شرک، بدعت و ضلالت اور ہر قسم کی گمراہیوں کو زبردست شکست ہوئی۔ تعدا رنج و بدبختی کا موسم بدل گیا۔ ظلم و عدوان اور فساد و طغیان کا زور ختم ہو گیا، حق و صداقت، اور خیر و سعادت نے عالمگیر فتح پائی اور زمین پر امن و عدالت کی ایک ایسی بادشاہت قائم ہو گئی ۔۔۔

جس وقت عالم انسانی کے اس محسن اعظم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے اس عالم

آپ دنیا میں اپنا پہلا قدم رکھا تھا وہ ربیع الاوّل ہی کا مہینہ تھا اور پھر جب آپکا سن شریف چالیس برس کا ہوا تو اسی مہینے میں اصلاح عالم کا کام آپ کے سپرد ہوا۔ پس اس لحاظ سے کہا جاسکتا ہے کہ ربیع الاوّل ہی اس رحمت عامہ کے ظہور کا مبدا اور روحانی خیر و برکات کے ظہور کا منبع ہے اور یہی وجہ ہے کہ جب یہ ماہ مبارک آتا ہے تو مسلمانوں کے قلوب میں (حتیٰ کہ ان دنوں میں بھی جو دوسرے موسموں میں بالکل غافل رہتے ہیں) اس وجود مقدس کی یاد تازہ ہوجاتی ہے اور طرح طرح سے خوشیوں اور مسرتوں کا اظہار کیا جاتا ہے۔

لقاء الٰہی کی یاد سے خوش ہونا بری چیز نہیں بلکہ حدود شریعت سے تجاوز نہ ہو تو ایک درجہ میں محمود ہے۔ ۔ ۔ ۔ ۔ لیکن آج مجھے عرض کرنا یہ ہے کہ ۔

آپ جشن کی ان گھڑیوں اور شادمانی کی ان ساعتوں میں اس قابل ماتم حقیقت کو کیوں بھول جاتے ہیں کہ اس مقدس و مسعود وجود نے اس مبارک مہینے میں نزول اجلال فرما کر آپ کو جو کچھ دیا تھا۔ آج آپ اپنی شامت اعمال سے سب کچھ کھو چکے ہیں۔

ربیع الاوّل اگر آپ کیلئے خوشیوں کا موسم اور مسرتوں کا پیغام ہے تو صرف اس لیے کہ اس مہینے میں دنیا کی خزاں ضلالت کو بہار ہدایت نے آخری شکست دی تھی اور اسی مہینے میں وہ ہادیٔ اعظم صلی اللہ علیہ وسلم رونق افروز عالم ہوئے تھے جنہوں نے تم پر روحانیت کے دروازے کھول دیئے اور وہ سب ہی نعمتیں تم کو دلادیں جن سے تم محروم تھے۔ پھر اگر آج تم ان کی لائی ہوئی شریعت سے دور اور ان کی دلائی ہوئی نعمتوں سے محروم و مہجور ہوتے جارہے ہو تو کیا وجہ ہے کہ گذشتہ بہار کی خوشی تو مناتے ہو لیکن خزاں کی موجودہ پامالیوں پر نہیں روتے۔

تم ربیع الاوّل میں آنے والے کے عشق و محبت کا دعویٰ رکھتے ہو اور اس کی یاد کے لیے مجلسیں منعقد کرتے ہو لیکن یہ نہیں سوچتے کہ تمہاری زبان جس کی یاد کا دعویٰ کر رہی ہے اس کی فراموشی کیلئے تمہارا ہر عمل گواہ ہے اور جس کی تعظیم و تکریم کا تم کو بڑا ادعا ہے تمہاری گمراہ زندگی بلکہ تمہارے وجود سے اس کی عزت کو بٹہ لگ رہا ہے۔

اگر تمہارے اس دعویٔ عشق و محبت اور ادعائے احترام و عظمت میں کوئی صداقت ہوتی اور تم کو درحقیقت ان سے غلامی کا ادنیٰ سا تعلق ہوتا تو تمہاری دینی حالت ہرگز اس قدر تباہ نہ ہوتی کہ تم ان کی لائی ہوئی شریعت سے ایسے بے گانہ ہوتے تم نماز کے عادی ہوتے اور زکوٰۃ پر عامل، تقویٰ تمہارا شعار ہوتا اور اتباع سنت تمہارا طرۂ امتیاز، تم حرام و حلال

میں فرق کرتے بلکہ مواقع شبہات سے بھی بچتے۔ تمھاری زندگی نمونہ ہوتی صحابہ کرام کا اور تمھارا ہر عمل مرقع ہوتا اسلام کا۔

پس جب کہ تمھارا یہ حال نہیں ہے اور تم اپنے دلوں سے پوچھو وہاں سے بھی یہی جواب ملے گا کہ ہاں نہیں ہے تو پھر یقین کرو کہ ربیع الاوّل کے موقع پر تمھاری یہ عشق و محبت کی نمائش محض فریب نفس ہے جس میں تم خود مبتلا ہو سکتے ہو۔ یا تمھارے ظاہر بیں دوست و احباب۔ مگر خدائے علیم و خبیر تمھارے اس فریب میں نہیں آ سکتا۔ اور اس کے رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کو تم ان خالی از حقیقت مظاہروں سے دھوکا دے سکتے ہو۔

اسی لیے میں تم سے کہتا ہوں اور اللہ کی قسم محض تمھاری خیر خواہی کیلئے کہتا ہوں کہ تم اپنی ان رسمی مجلسوں کی آرائش سے پہلے اپنے اجڑے ہوئے دل کی خبر لو اور قندیلوں کے روشن کرنے کے بجائے اپنے قلوب کو نور ایمان سے منور کرنے کی فکر کرو۔

تم اغیار کی تقلید میں نقلی پھولوں کے گلدستے بناتے ہو مگر تمھاری حسنات کا جو گلشن اجڑ رہا ہے اس کی حفاظت اور شادابی کا کوئی انتظام نہیں کرتے۔ تم ربیع الاول کی برکتوں اور رحمتوں کا تصور کر کے مسرت کے ترانے گاتے ہو لیکن اپنی اس بربادی پر ماتم نہیں کرتے کہ تمھارا خدا تم سے روٹھا ہوا ہے اس نے تمھاری بد اعمالیوں سے ناراض ہو کر اپنی دی ہوئی نعمتیں تم سے چھین لیں ہیں تم آقا سے غلام ، حاکم سے محکوم غنی سے مفلس اور دولت مند سے بے زر بلکہ بے گھر ہو چکے ہو۔ تمھارے ایمان کا چراغ ٹمٹا رہا ہے اور تمھارے اعمالِ صالحہ کا پھول مرجھا رہا ہے۔ اور غضب بالائے غضب یہ ہو کہ تم غافل ہو۔

پس کیا اس محرومی اور مغضوبی کی حالت میں بھی تم کو حق پہونچتا ہے کہ ربیع الاول میں آنے والے دین و دنیا کی نعمتیں لانے والے رحمۃ للعالمین (صلی اللہ علیہ وسلم) کی آمد کی یادگار میں خوشیاں مناؤ بقول علامہ ابوالکلام آزاد۔

"کیا موت اور ہلاکی کو اس کا حق پہونچتا ہے کہ زندگی اور روح کا اپنے کو ساتھی بنائے ؟" کیا ایک مردہ لاش پر دنیا کی عقلیں نہ ہنسیں گی اگر وہ زندوں کی طرح زندگی کو یاد کرے گی ؟ ہاں یہ سچ ہے کہ آفتاب کی روشنی کے اندر دنیا کے لیے بڑی ہی خوشی ہے لیکن اندھے کو کب زیب دیتا ہے کہ وہ آفتاب کے نکلنے پر آنکھوں والوں کی طرح خوشیاں منائے۔"

پس اسے غفلت شعاران ملت! تمہاری غفلت پر صد فغاں و حسرت اور تمہاری سرشاریوں پر صد ہزار نالہ و بکا اگر تم اس ماہ مبارک کی اصلی عزت و حقیقت سے بےخبر ہو اور صرف زبانوں کے ترانوں اور بیرار کی آرائشوں اور روشنی کی قندیلوں ہی میں اس کے مقصد یادگاری کو گم کردو تم کو معلوم ہونا چاہیئے کہ یہ ماہ مبارک امۃ المسلمۃ کی بنیاد کا پہلا دن ہے۔ خداوندی بادشاہت کے قیام کا اولین اعلان ہے، خلافت ارضی و وراثت الٰہی کی بخشش کا سب سے پہلا مہینہ ہے۔ پس اس کے آنے کی خوشی اور اس کا تذکرہ و یاد کی لذت یہ اس شخص کی روح پر حرام ہے جو اپنے ایمان اور عمل کے اندر اس پیغام الٰہی کی تعمیل و اطاعت اور اسوۂ حسنہ کی تاسی و پیروی کیلئے کوئی نمونہ نہیں رکھتا۔

فبشر عبادی الذین یستمعون القول فیتبعون احسنہ اولٰئک الذین هداهم اللہ واولٰئک هم اولوا الالباب ط

(الفرقان ربیع الاول ۱۳۵۳ھ)

از مولانا سید مناظر احسن صاحب گیلانی سابق صدر شعبۂ دینیات
(عثمانیہ یونیورسٹی — دکن)

پہلے بھی اور پچھلے دنوں میں بھی بعض خاص مخاطبوں سے متاثر ہو کر کچھ لوگوں نے عربی زبان کے جن الفاظ سے حق تعالیٰ کے جن معلومات کو ادا فرمانا چاہا تھا انھوں نے ان الفاظ کو تو تسلیم کر لیا، لیکن جب معنی کے سمجھنے کا وقت آیا تو انھوں نے خدا کے معلومات کو خدا ہی کے سپرد کر کے خود اپنے یا اپنے جیسے انسانوں کے بافیدہ تخیلات پر اصرار کرنا ضروری خیال کیا — پرانے زمانہ میں اخوان الصفا کے مصنفین نے اور ہمارے ملک میں علی گڑھ کے سید صاحب نے اپنی تفسیر میں پادریوں کے اس حیثیت نقرہ سے متاثر ہو کر کہ "قرآن کی جنت حیوانی جنت ہے" خصوصیت سے اسی فقرہ میں جیسی اس لئے اور زیادہ پیدا ہو گئی کہ پادریوں کے دائرے سے نکل کر علم و حکمت کے مدعیوں نے بھی ادعائے بے تعصبی کے ساتھ اسی کا ڈھنڈورا پیٹنا شروع کر دیا تو محکومیت کے گھاؤ سے جن کے سینے مجروح تھے پادر سے گزر کر جب انھوں نے دیکھا کہ دکاتر کی زبانوں پر بھی یہی فقرہ جاری ہے۔ یہ بیچارے تلملا اٹھے۔ گھبرا کر —

"مجھے تفسیر بھی آتی ہے اپنا مدعا کہیئے"

مرعوبیت کے اختناقی دوروں میں ان مبتلا ہونے والوں کی زبان و قلم سے جس قسم کا اول فول نکلتا رہا اسی کو اپنی کتابوں میں لکھتے چلے گئے۔ ان بندگان خدا نے ایک لمحہ کے لئے اس کی زحمت گوارہ نہ کی کہ آخر "غیب" جس کی "ذات" ہی کے متعلق۔ فلسفہ، شک میں مبتلا ہے اور سائنس جسے اپنے حدود بحث سے خارج سمجھتی ہے پھر اس کے "صفات" کے متعلق ان علوم کی رہنمائی میں کیا بحث ہو سکتی ہے لیکن صرف یہ اتفاق کہ جس ملک کے باشندوں

نے قرآن کی جنت کے متعلق یہ فقرہ تصنیف کیا تھا اسی ملک کے ہاتھ میں آج کل "عقل و علوم" کا جھنڈا ہے۔ ان مسکینوں نے سمجھ لیا اور محض اسی اتفاقی واقعہ کی بنیاد پر سمجھ لیا کہ ہو نہ ہو قرآن کی جنت پر ان کا یہ اعتراض بھی سائنس ہی کا کوئی مسئلہ یا فلسفہ ہی کا کوئی نظریہ ہے۔

حالانکہ واقعہ کی کل نوعیت یہ تھی کہ صدوقی فرقہ (جس کے متعلق انجیل میں ہے کہ قیامت کے منکر تھے) اس فرقے کے ایک شخص یہودی نے حضرت مسیح علیہ السلام سے مشہور استہزائی سوال جنت کے متعلق کیا تھا یعنی سات شوہروں سے یکے بعد دیگرے ان کے مرنے کے بعد شادی کرنے والی عورت ـــ

"قیامت میں ان ساتوں میں سے کس کی بیوی ہوگی ـــ؟"

کہا جاتا ہے کہ اسی سوال کے جواب میں حضرت مسیح علیہ السلام نے فرمایا تھا ـــ

"قیامت میں شادی بیاہ نہ ہوگی بلکہ لوگ آسمان پر فرشتوں کے مانند ہوں گے۔ (متی باب ۲۲)

لے دے کے انجیل کا یہی فقرہ ہے جس کی بناء پر عیسائی سمجھتے ہیں کہ مرنے کے بعد انسان انسان باقی نہیں رہتا بلکہ جیسا کہ بعض مذاہب میں خیال ہے کہ آدمی مرنے کے بعد کبھی گھوڑا اور کبھی چوہا وغیرہ ہو جاتا ہے۔ اسی طرح عیسائیوں کے نزدیک مرنے کے بعد آدمی فرشتہ ہو جاتا ہے۔ گویا سارے مجاہدات اور ساری قربانیوں کا آدمی کو قدرت کی طرف سے یہ صلہ ملتا ہے کہ انسانیت اور اس کے سارے احساسات چھین لئے جاتے ہیں یہ سزا بصورت جزا ممکن ہے کہ عیسائیوں کی فطرت کے مطابق ہو لیکن جو واقعی انسان ہیں۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ اس جزا کو آخر کس طرح برداشت کر سکتے ہیں۔ بالکلیہ سلب ہو جانا تو بڑی بات ہے، آج اگر کسی کے انسانی احساسات میں کسی قسم کی کمی واقع ہوتی ہے تو ڈاکٹروں حکیموں کے دروازوں کی وہ خاک اڑا دیتا ہے ـــ افریقہ سے بندر منگائے جاتے ہیں اور آدمی کے انسانی احساسات کو زندہ کرنے کے لئے بندروں کے غدود سے کام لیا جاتا ہے۔ کروڑ روپیے کی دوائیں انسانی احساسات کی بیداری کے لئے خرچ ہو رہی ہیں جن کے برباد اور ضائع کرنے کے عیسائی عمر بھر نیکیاں کرتے رہتے ہیں۔ اس عیسائی یا سزائی جنت کا نام "روحانی جنت" رکھا گیا ہے اور ہمارے "بدھو میاں" اس خالص عیسائی عقیدے کو سائنس کا کوئی اہم مسئلہ قرار دے کر قرآن کے الفاظ کو ان کے معانی سے ادھیڑ ادھیڑ کر دنیا کے سامنے اس

دعوے کے ساتھ پیش کر رہے ہیں کہ ہم کبھی آخرت کے متعلق ان ہی چیزوں پر ایمان لاتے ہیں جن پر ہمارے حکام کا ایمان ہے اور ان چیزوں کا انکار کرتے ہیں جن سے ہمارے آقاؤں کو انکار ہے۔"

علاوہ انجیل کے اس بیان کے چونکہ "عورت ہی یہودی اور عیسائی مذاہب میں جنت سے نکلنے کی وجہ ہے اور دنیا کی ساری مصیبتوں دگندگیوں، شرارتوں کا سرچشمہ ہے اسی لئے بڑے بڑے پوپوں نے اپنی ماؤں بہنوں کو مجسم شیطان "عرف گناہ" مطلق نجاست اور گندگی، قرار دیا ہے۔ ظاہر ہے کہ جنت جو قرب الٰہی کا مقام ہے اس کی تقدیس کے لئے عورت کا وجود چونکہ ناپاک داغ تھا اس لئے قرآنی جنت کا جو عنصر سب سے زیادہ عیسائیوں اور عیسائی مزاجوں پر گراں بلکہ اب تو قریب قریب انگارہ کی شکل اختیار کر چکا ہے، وہ حور عین هم و ازواجهم وغیرہ کے بیانات جس میں مردوں کے ساتھ جنت میں عورتوں کو بھی فی ظلال علی الارائک متکئون (چھاؤں میں چھپر کھٹوں پر تکیہ لگائے کی شکل میں پیش کیا گیا ہے۔ بلکہ مردوبیٹوں کی جنت کو اسلام میں عورت ماں کے قدموں کے نیچے ڈال دیا گیا ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ مذہب و مذہبی علم و عمل جو انسانیت کو ارتقاء دتنزل سے بحث کرنے والا نظام ہے جیسا کہ ہر شئی کی ایک غایت اور غرض ہوتی ہے اسی طرح اس کی غرض وغایت کو متعین کرتے ہوئے اسلام کہتا ہے کہ جو انسان ہے وہ مذہبی عقائد و اعمال کی راہ سے نہ خدا بنتا ہے اور نہ گھوڑا۔ نہ ہاتھی۔ نہ فرشتہ اور نہ شیطان بلکہ انسان ہرحال انسان ہی باقی رہتا ہے البتہ ناتکمل انسان مکمل اور اس کی ناتشنی یافتہ فطرت تشنی کی انتہائی منزلوں تک ارتقاء کرتی ہوئی چلی جاتی ہے اسی لئے قرآن انسان سے انسانی احساسات کے چھین جانے کا نام جنت نہیں رکھتا، بلکہ وہ کہتا ہے کہ آدمی کی آنکھ جو کچھ دیکھنا چاہتی ہے وہی دکھایا جائے گا۔ کان جو کچھ سننا چاہتے ہیں وہی سنایا جائے گا، زبان جو کچھ چاہتی ہے اس کی تکمیل کی جائے گی۔ الغرض انسان جو درصل چند احساسات اور خواہشوں کا مجموعہ ہے اس کی تکمیل کی جائے گی اور اس حد تک کی جائے گی جس کی انتہا ہی یا انفرادی نظیر دنیا کے موجودہ نظام میں پائی نہیں جاتی یہی وجہ ہے کہ ذات کی حد تک عالم آخرت کے دونوں ممالک (الجنۃ و النار) کے متعلق قرآن مجید نے

تفصیل کے ساتھ ان کے موسم، آب وہوا، دریا، پہاڑ، نباتات، حیوانات سب کا ذکر کیا ہے اور اس لئے ہم ان ممالک میں بھی ان ساری چیزوں کو مانتے ہیں۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ جو لوگ اس دنیا میں ان چیزوں کو اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں، ہاتھوں سے چھو رہے ہیں۔ ان مسکینوں کی عقل پر کیا آفت آئی ہے کہ جب دوسری دنیاؤں میں انھیں چیزوں کے ہونے کی خبر دی جاتی ہے تو عیسائیت زدہ فطرتوں میں بلا وجہ انقباض پیدا ہوتا ہے۔ معلوم کا انکار کرتے ہیں اور مجہول پر ایمان لانا چاہتے ہیں لیکن جب ذات سے آگے بڑھ کر ان ہی چیزوں کی صفات کی قرآن تفصیل شروع کرتا ہے مثلاً جنت کی برتنوں کی تیاری ایسے عنصر سے ہوگی جس کی تعبیر قرآن نے (قواریر من فضۃ) (شیشے چاندی) سے کی ہے یا وہاں کے نہروں کے پانی کو غیر آسن (نہ سڑنے والا) قرار دیتا ہے۔ وہی دودھ جو یہاں تھنوں سے نکل نکل کر بہہ رہا ہے، نہروں میں بہے گا۔ یا وہی شکر جو یہاں پھولوں کے رس سے شہد کی صورت میں تیار ہوتی ہے، مکھی کے معدے میں نہیں بلکہ جنت کی فضاؤں میں تیار ہوگی یا وہاں کے میوہ دار درختوں کے پھل، فصلوں اور موسموں کی قید سے آزاد ہوں گے۔ وہ غیر ممنون (نہ ختم ہونے والے ہوں گے) نہ گھٹنے والے ہوں گے۔

اسی طرح کھانے کے ساتھ قضاء حاجت پینے کے ساتھ پیشاب کی ضرورت یا پسینے کی کراہت، شباب کے ساتھ بڑھاپا، صحت کے ساتھ مرض، زندگی کے ساتھ موت۔ الغرض دنیا کی ہر مسرت کے پھول کے ساتھ جو کلفت کا کانٹا چھپا ہوا ہے۔ جب کہا گیا کہ انسانی زندگی جنت والی کے ان میل دل سے پاک ہوگی۔ اسی طرح جہنم کی ناری فضا کو بجائے روشن ہونے کے دھوئیں کی چھاؤں جیسی سیاہ اس کی غذاؤں کو (لا یسمن ولا یغنی من جوع - نہ فربہی پیدا ہو نہ بھوک کی تکلیف سے رہائی ہو) اس آگ میں بجائے کوئلہ اور راکھ ہونے کے احساسات کو تیز کرنے کے لئے تر و تازہ کھالیں آدمی میں پیدا ہوں گی اور جہنمی نباتات ہیں اس کی حرارت سے بالیدگی اور شادابی پیدا ہوگی وغیرہ وغیرہ۔ تفصیلی امور تو یہی لوگ جو معلوم کو چھوڑ کر، روحانی جنت کے مجہول تخیلوں کی طرف بھاگے جا رہے تھے یکایک پلٹ پڑتے ہیں اور چونکہ اس دنیا میں کوئی چیز ان صفات کے ساتھ موجود نہ ہو کر ان کے یا ان کے تحقیقی اساتذہ کے علم میں نہیں آئی ہے اس لئے چیخ اٹھتے ہیں کہ ہم ایسی باتوں کا ایمان لاسکتے ہیں یا لائیں گے جو ہمیں پہلے سے معلوم ہوں "ان ذہنی آوارہ گردیوں"

---

[1] یہاں مولانا گیلانی رحمہ نے حاشیہ میں ان آیات کی طرف اشارات کئے تھے جن میں جنت، جہنم کے موسم اور آب وہوا وغیرہ کی طرف اشارات ہیں لیکن یہ حاشیہ کاتب کے سہو قلم سے "صدق" میں نقل ہونے سے چھوٹ گیا تھا۔ ۱۲

کا آخر کوئی علاج ہے حالانکہ سیدھی بات یہ تھی کہ حق تعالیٰ نے عربی زبان کے جن الفاظ سے جو علم ہمیں عطا کرنا چاہا ہے ہم ان سے اپنی معلومات میں اضافہ بھی کرتے۔ یعنی جب ہم سے کہا گیا تھا کہ آخرت کے ممالک میں بھی نباتات وجمادات دریا پہاڑ وغیرہ ہیں تو جو چیزیں ہم دیکھ رہے ہیں ان ہی چیزوں کے ماننے میں ہمیں آخر عذر کی کیا وجہ ہو سکتی ہے۔ یہ خیال کہ یہاں تو یہ چیزیں ہو سکتی ہیں اور وہاں نہیں ہو سکتیں ــ یہ یہاں اور وہاں کا فرق کرنا عجیب ہے۔ ایک ایسا آدمی جو اس دنیا میں چند سال ہوئے آیا اور چند ہی سال بعد چلا جائے گا۔ وہ یہاں اور وہاں کی تقسیم آخر کس بنیاد پر کر رہا ہے اور یہاں جو کچھ ہو سکتا ہے وہاں نہیں ہو سکتا آخر اس قسم کی مضحک منطق کی بنا کیا ہے؟ بہر حال جو کچھ دکھایا جا رہا ہے جب وہی منوایا جاتا تھا تو ماننے کے لئے اس سے زیادہ آسان مطالبہ اور کیا ہو سکتا تھا۔ لیکن چیزوں کی ذات وہی بیان کی گئی تھی جو یہاں ہے پھر اسی کے صفات ویسے بیان کئے جا رہے ہیں جنھیں نہ کسی کی آنکھوں نے دیکھا اور نہ کانوں نے سنا، نہ کسی دل پر اس کا خطرہ ہوا مثلاً ایسا شیشہ جو چاندی سے بنا ہو یا ایسا عنصر جس میں شیشے کی شفافیت اور چاندی کی چمک تو ہو لیکن چاندی کی کثافت اور شیشے کی بے ثباتی کا عیب نہ ہو تو اپنے علم کے اضافے سے محض اس بنیاد پر انکار نہ کرنا چاہیئے کہ جو چیز آج نہیں معلوم ہوئی ہے وہ کبھی نہیں ہو سکتی۔ جو درخت یورپ میں بارآور نہیں ہو سکتا وہ ہندوستان میں بھی نہیں پھل سکتا۔ آخر یہ بھی کوئی منطق ہے۔ قرآن میں ان ہی صفاتی عجائبات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا کہ لا تعلم نفس ما اخفی لهم من قرة اعین یعنی نہیں جانتا کوئی جو چھپائی گئی ہے اس کی آنکھوں کی ٹھنڈک ــ بلکہ میں تو خیال کرتا ہوں کہ جنت کے ہر لمحہ میں جن عجیب صفات کا ظہور ہوگا وہ اپنے پہلے لمحہ سے مختلف ہوگا آیات قرآنی کلما رزقوا منها من ثمرة رزقا قالوا هذا الذی رزقنا من قبل (جب دیئے جائیں گے پھل ان جنتیوں کو تو کہیں گے یہ وہی ہے جو ہمیں پہلے دیا گیا تھا یعنی ذات تو ان پھلوں کی وہی ہوگی جو انھیں دنیا میں یا جنت میں پہلے ملی تھی مثلاً وہ آم ہی ہوگا یا سیب ہی ہوگا وغیرہ لیکن صفاتی طور پر اُتوا به متشابها (دیئے جائیں گے وہ ملتے جلتے) یعنی واقع میں یہ دوسرے پھل وہی نہیں ہوں گے جو انھیں پہلے ملے ہوں گے بلکہ صرف صورت میں مشابہت ہوگی اور صفاتاً مثلاً مزہ میں، بو میں اور دوسری کیفیتوں میں ایسا فرق ہوگا جسے نہ کسی نے دیکھا تھا اور نہ سنا تھا نہ سوچا تھا اور یہ سلسلہ ہمارے تمام بیرونی واندرونی احساسات میں جاری رہے گا یعنی ذاتی طور پر جسمانی

اور روحانی دونوں قسموں کا قائل نہیں ہوں۔ بلکہ خالق کا وجود، مخلوق کا وجود، محض ان دو قسموں کا قائل ہوں، لیکن جو نہ روح کو جانتے ہیں اور نہ جسم کو سمجھ سکتے ہیں کہ دنیا میں وہ کیا ہے ـــ عرض ہے یا جوہر، خارجی حقیقت ہے یا ذہنی احساس اُن بیچاروں کی رعایت سے کہہ دیا ہوں کہ جسمانی اور روحانی ہر قسم کے انسانی مطالبات کی تکمیل اسی لامحدود طریقہ سے ہوگی۔ مرحوم شاعر اسلام رحمہ اللہ نے۔

تپش است زندگانی تپش است جاودانی

میں اسی طرف اشارہ فرمایا اور میں نے اپنے اس خط میں جو یہ اشارہ کیا تھا کہ جنت سے تحویل کا کوئی خواہشمند نہ ہوگا۔ یہ دراصل سورہ کہف کی آخری آیتوں کا ماحصل ہے جس میں اہل ایمان کے لئے فردوس کی مہمان نوازی کا ذکر فرمانے کے بعد حق تعالیٰ نے فرمایا ہے لایبغون عنھا حولا۔ اہل فردوس، اس فردوس سے باہر نکلنا نہ چاہیں گے، اس کے بعد قرآن کی مشہور آیت کلمات رب کے متعلق ہے۔

قل، لوکان البحر مدادا لکلمات ربی لنفد البحر قبل ان تنفد کلمات ربی ولوجئنا بمثلہ مددا (کہف)	بول۔ اگر سمندر بن خدا کے کلمات کے لئے روشنائی بن جائیں تو سمندر ختم ہو جائے گا۔ قبل اس کے کہ خدا کے کلمات ختم ہوں اگرچہ ہم اسی سمندر جیسا کسی اور سمندر کا اضافہ کریں۔

مدت تک میری سمجھ میں ”کلمات رب“ کی اس لامحدودیت کا تعلق جنت سے نہ نکلنے کی خواہش کے ساتھ سمجھ میں نہیں آتا تھا۔ لیکن اچانک معلوم ہوا کہ پرانی چیزوں سے آدمی میں تھک جانے یا اکتا جانے کا جو جذبہ پایا جاتا ہے اسی کو پیش نظر رکھ کر بتایا ہے کہ جنت میں جب صفاتی عجائبات کا ظہور ”کلمات رب“ کے ذریعے سے ہر دن بلکہ ہر دقیقہ بلکہ ہر لمحہ میں نوبہ نو تازہ بتازہ طریقہ سے ہوتا رہے گا تو پھر جنت کی زندگی سے اکتا جانے کی کیا وجہ ہو سکتی ہے؟ حدیثوں میں اسی اجمال کی تفصیل مختلف تعبیروں کے ذریعے سے کی گئی ہے جس کی تفصیل کا یہ موقع نہیں ہے۔ آدمی میں نئی نئی چیزوں کے دیکھنے کا جو بے پناہ جذبہ پایا جاتا ہے اسی بنیاد پر کتنے ایسے ہیں جو امزہ دا تا رب سب کو لات مار کر دنیا کی سیر کے لئے نکل پڑتے ہیں لیکن چونکہ اپنے اس فطری جذبہ کا استعمال انھوں نے غلط طریقہ سے کیا اس لئے گھوم گھما کر جب گھر آتے ہیں، وہ لوگ پوچھتے ہیں کہ تم نے اپنی سیاحت کے دوران کن نئی چیزوں کو دیکھا؟

تو ہم نے دیکھا ہے کہ اکثر وہ گھبرا جاتے ہیں۔ آخر وہی دن، وہی رات وہی ستارے وہی آفتاب وہی زمین وہی آسمان۔ جہاں کہیں آدمی جائے ان کے سوا اور کیا دیکھے گا۔ دنیا میں چار آنکھوں والے آدمی یا تین ٹانگوں والی مرغیاں کہاں نظر آئیں گی مجبور ہو کر ان جہاں دیدوں کو عموماً دروغ بیانی سے کام لینا پڑتا ہے ۔ دو ایک نئی چیز کے ذکر کے بعد ان کے سفرناموں کی اکثر چیز کرر ہوتی ہے ، حال میں ایک سیاح سے جو سائیکل پر ہندوستان کا دورہ فرما رہے ہیں، گیلانی میں ملاقات ہوئی کلکتہ سے دلی تک ان کی معلومات میں صرف یہ اضافہ ہوا تھا کہ چلتے ہوئے انھوں نے دریائے سون کے شمالی پل کو کوئلور کے قریب کی محرابوں کو گنا تھا اور واپسی میں ڈہری اون سون کے پل کے دروازوں کو شمار کرکے اپنے نوٹ بک میں درج کرکے اپنے سفر کی قیمت وصول کی تھی ان کے ۔۔ اس بیچارے کے پاس اور کوئی نئی بات نہیں تھی۔ مئی اور جون کے اس مہینے میں سائیکل پر اس طرح مارے مارے پھرنا صحیح جذبہ کے غلط استعمال کا کتنا اچھا خمیازہ ہے ، حالانکہ :۔

دل من مسافر من که خداش یار بادا ۔ (اقبال)

کتنے عجیب عالم اور کتنے غریب ممالک کا سفر آدمی کے سامنے ہے، چاہے تو آرام و آسائش کے ساتھ اس سفر کو لذت اندوز ہو سکتا ہے اور چاہے تو اپنے اس سفر کو صرف دکھ درد تکلیف و مصیبت کی دوزخ بنا سکتا ہے ۔ پورا پروگرام، منزلوں کی تفصیل ہر موڑ پر تنبیہی کلمات لگا دئے گئے ہیں ، جس کا جی چاہے ان ہلاکت ناموں سے نفع اٹھائے اور جس کا جی چاہے اس کو ٹھکرا کر قدرت اور قدرت کے قوانین کی ٹھوکر کھاتا پھرے سفر سے گریز تو ممکن نہیں ہے جس نے آج سے چالیس پینتالیس سال پہلے مجھے اچانک قدرتی قوانین کے اس نظام میں لا کھڑا کیا ہے۔ وہی یوں ہی ایک نظام سے دوسرے نظام میں منتقل کرتا ہوا چلا جائے گا جس طرح اس دنیا میں آنے سے ہم اپنے آپ کو روک نہیں سکتے تھے ۔ آئندہ بھی ہم اپنے کو کہیں جانے سے کس طرح روک سکتے ہیں ۔

الغرض وہ لوگ سخت گمراہ اور احمق ہیں جو یورپ کے سائنس نما عیسائیت فروش متاثر ہو کر مجاز و استعارہ کی چادر اوڑھ کر (الجنة والناس) کے متعلق قرآنی الفاظ کی لفظی تصدیق کے ساتھ معانی کی تکذیب پر مصر ہیں ۔ العیاذ باللہ ان میں سے بعضوں کا اصرار تو اس حد تک بڑھ گیا کہ ہماری زبان تو قرآن جنت پر صرف بیان جنت کا فقرہ چسپ

کیا تھا لیکن رقص کرنے والوں نے تو اس سے بھی آگے قدم بڑھایا اور خاک بہ دہنش زندیں یہ چکا اور گھونگھروں کے لہنگوں سے بہ تران کی نگاہوں میں وہی جنت نظر آئی جس کی دید کی تمنا میں تیرہ سو سال سے مسلمان ان کے اکابر و اعاظم اس دنیا سے سفر کر رہے ہیں۔ بادشاہ اگر دن کو رات کہے تو ماہ و پرویں کے دیکھنے کا بھی غلغلہ بلند کر دینا چاہیئے محکومیت کے زمانہ کی ان پیداواروں میں اس کی کتنی اچھی مثال پائی جاتی ہے۔

مجاز و استعارہ کا لطیفہ بھی خوب تراشا گیا۔ اس آڑ میں جس لفظ سے جو چاہیئے آپ اس کے وضعی معنی کو پوچھ کر جس مطلب کو چاہیئے گوند لگا کر چپکا دیجئے۔ جوتہ کے معنی ٹوپی کے لیجئے اور روٹی سے مراد اگالدان۔ اگالدان سے اونٹ مراد لیجئے۔ رحم کرے اللہ حضرت امام غزالی پر۔ زمانہ میں سچ فرمایا ہے کہ مجاز و استعارہ کی اتنی بھرمار کہ مخاطب اس سے مغالطہ میں مبتلا ہو جائے ـــ در اصل دروغ بیانی اور جھوٹ ہی کی ایک شکل ہے" تعالى الله عن ذالك علوًا كبيرًا

(ماخوذ از صدق لکھنؤ) شائع شدہ الفرقان بابت جمادی الآخری سنہ ۱۳۵۸ھ

باب —— (۲)

نگہ کی نامسلمانی سے فریاد!

اِسلامی تہذیب کیا ہے؟ اور کہاں ہے؟

جناب مولوی سید طفیل احمد صاحب بی اے، علیگ

اسلامی تہذیب کیا ہے؟ مختصر طور پر اس سوال کا جواب یہ ہو سکتا ہے کہ "اسلامی تہذیب نام ہے بانیٔ اسلام کے نقش قدم پر چلنے کا" حقیقت یہ ہے کہ ہر قوم کی تہذیب اس قوم کے مذہبی رہنماؤں اور پیشواؤں کے اعمال و اقوال اور ان کے طرز معاشرت کی بنا پر قائم ہوتی ہے مگر اس بارے میں مسلمان کا مسئلہ ایک بڑی حد تک دوسری قوموں سے جدا ہے مسلمانوں کے پیغمبر کی تعلیمات، احکام، سیرت، آثار اور روزمرہ کی معاشرت کے حالات جس صحت و احتیاط کے ساتھ محفوظ کئے گئے ہیں اس طرح کسی دوسرے مذہبی پیشوا کی زندگی کے حالات یا احکام محفوظ نہیں ہیں، اس لئے آج ہر قوم کے لئے یہ تقریباً ناممکن ہے کہ وہ اپنے مذہبی رہنما کے نقش قدم پر چلنے میں کامیاب ہو سکے ـــــ کیونکہ یہ نقش اس قدر دھندلے اور مٹے ہوئے ہیں کہ صاف طور پر نظر نہیں آتے۔

یہ واقعہ ہے کہ دنیا کی تاریخ میں یہ فخر صرف مسلمانوں ہی کے حصہ میں آیا ہے کہ انھوں نے نہ صرف بانیٔ اسلام کے ارشادات کا ایک ایک لفظ محفوظ رکھا بلکہ اس سے بڑھ کر یہ اہتمام بھی کیا کہ آپ کی روزمرہ کی معاشرت اور معمولات زندگی کی تمام جزئیات کو بھی صحیح ترین تاریخی معیار پر مستند ذرائع اور سلسلۂ روایت کے ساتھ ترتیب دیا اسی مجموعہ اقوال و افعال کا نام شریعت اسلامیہ کی اصطلاح میں "حدیث" ہے اور اسی کو "سنت"

ـه یہ مضمون مولوی طفیل احمد صاحب کا ہے ہماری نئی نسل کے کم لوگ واقف ہوں گے یہ بڑے مخلص دردمند صاحب فکر بزرگ تھے آزادی کی جنگ میں مسلمانوں کی شرکت کے خاص حامیوں میں تھے اب سے ۳۰، ۴۰ سال پہلے اس موضوع پر ان کی کتاب "روشن مستقبل" کی ملک میں دھوم تھی۔ ۱۲

بھی کہتے ہیں۔ اس کا مرتبہ قرآن مجید کے بعد تسلیم کیا گیا ہے۔ یہ مجموعہ احادیث رسول اللہ کے ارشادات اور آپ کے روزمرہ کے اعمال زندگی کا صحیح ترین مرقع ہے جو نہایت معتبر سلسلۂ روایت کے ساتھ مسلمانوں کے پاس محفوظا موجود ہے۔ اس سلسلۂ روایت کی چھان بین کرنے میں علمائے حدیث نے اتنی محنت و کوشش کی ہے کہ دنیا کے کسی نہایت مشہور و مسلمہ تاریخی واقعہ کے متعلق بھی ایسی چھان بین نہیں کی گئی ـــــ اس میں کوئی شک نہیں کہ دوسری قوموں نے بھی اپنے رہنماؤں کی زندگی کے مرقعے دنیا کے سامنے پیش کئے ہیں مگر بدقسمتی سے وہ اتنے دھندلے اور بے رنگ ہیں کہ ان میں ان مذہبی رہنماؤں کی تصویریں صاف طور پر نظر نہیں آتیں اور ان کی روزمرہ کی زندگی کے اعمال و معمولات کا صحیح طور پر کچھ پتہ نہیں چلتا۔ اس پر مزید کوتاہی یہ ہے کہ ان کی تعلیم بھی کسی صحیح سلسلۂ روایت کے ساتھ محفوظ نہیں ہے۔ حضرت مسیح ہوں یا گوتم بدھ، رامچندر ہوں یا کرشن مہاراج سب کی زندگی تاریکی میں ہے اور ان کے جو حالات کہیں کہیں ملتے ہیں ان کی حیثیت ایک افسانہ سے زیادہ نہیں ہے۔

جو لوگ اسلامی تعلیمات سے باخبر ہیں وہ جانتے ہیں کہ احادیث یعنی سنت نبوی کا مرتبہ آسمانی کتاب کے بعد سب سے زیادہ بلند تسلیم کیا گیا ہے۔ گویا مذہب اسلام کا مدار کتاب (قرآن مجید) اور سنت (حدیث) پر ہے اور اس لئے یہی دو چیزیں اسلامی تہذیب کا سرچشمہ ہیں اور پیغمبر اسلام انسانی پیکر میں اس سرچشمہ کا مکمل نمونہ۔ خدا نے قرآن مجید میں صراحتہً رسول کی پیروی کا حکم دیا ہے اور یہ بتایا ہے کہ رسول اللہ جو کچھ فرماتے ہیں وہ اپنی خواہش نفس کی بناء پر نہیں بلکہ احکام الٰہی کی بنا پر فرماتے ہیں۔ وَمَا يَنطِقُ عَنِ الْهَوَىٰ إِنْ هُوَ إِلَّا وَحْيٌ يُوحَىٰ (وہ اپنے دل سے باتیں بنا کر نہیں کہتے ہیں بلکہ یہ تو وحی ہے جو ان پر خدا کی طرف سے نازل ہوتی ہے) اسی طرح ایک اور موقع پر آپ کی زندگی کے متعلق ارشاد ہوتا ہے۔ لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللَّهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ۔ (تمہارے سامنے رسول کی زندگی ایک بہترین نمونہ ہے)

یہ حقیقت ہے کہ دنیا کے دوسرے مذہبوں کی طرح اسلام صرف چند عقائد مخصوصہ کا نام نہیں ہے بلکہ وہ زندگی کا ایک مکمل ضابطہ یا بالفاظ دیگر مکمل تہذیب بھی ہے ـــــ صحابۂ کرام جو رسول اللہ صلعم کے اولین پیرو تھے اس حقیقت کو خوب اچھی طرح سمجھتے تھے چنانچہ وہ اتباع سنت کا سب سے زیادہ اہتمام کرتے تھے اور ان کی یہ پیروی زندگی کے ہر شعبہ میں تھی یعنی رسول اللہ کا چلنا پھرنا، سونا جاگنا، کھانا پینا، اٹھنا بیٹھنا سب چیزیں ان کے لئے

پیروی کے قابل تھیں، اس کے بعد تمام علما کا یہ مسلک رہا ہے کہ مسلمانوں کو ان کی روزمرہ زندگی میں رسول اللہ کی پیروی کی ترغیب دینا نیز اسلام کے ہر دور میں جو مصلح اور ہر صدی میں جو مجدد پیدا ہوئے ان سب کے وعظ و تبلیغ کا اولین مقصد بھی یہی احیائے سنت تھا خود رسول اللہ کا ارشاد گرامی ہے کہ:- عَلَيْكُمْ بِسُنَّتِي تم پر میرے طور طریق کی پابندی ضروری ہے گویا اس طرح آپ نے مسلمانوں کو اپنے طریقۂ حیات کی پیروی کرنے کی تاکید فرمائی ہے۔ اسی بنا پر وہ تمام مصلح و مجدد جو اپنے اپنے زمانہ میں ہوئے مسلمانوں کو اتباع سنت کی تاکید کرتے رہے۔ ہندوستان میں حضرت مجدد الف ثانیؒ نے یہ خدمت بڑے اہتمام کے ساتھ انجام دی تھی کیونکہ اس زمانہ میں اس کی بڑی سخت ضرورت لاحق ہو گئی تھی، کیونکہ ہندوستان کے مسلمان دوسری قوموں کے اختلاط سے صحیح راستہ سے ہٹ گئے تھے اور شریعت سے بہت دور ہو گئے تھے۔

———لیکن جیسے جیسے زمانۂ نبوت سے دوری ہوتی گئی، مسلمانوں میں غیر اسلامی رسوم و رواج داخل ہوتے گئے۔ ہندوستان کے آخری مسلمان بادشاہوں یعنی مغلوں کے تمدن کو دیکھا جائے تو اس میں بمقابلہ زمانہ سابق کے کافی تبدیلی نظر آئے گی اس خاندان کے بادشاہوں اور درباریوں کی تصویریں اس وقت بکثرت موجود ہیں جن میں صورت اور لباس کے اعتبار سے مسلم و غیر مسلم میں کوئی خاص فرق نہیں معلوم ہوتا اسی طرح شاہی محل میں بکثرت غیر مسلموں کے طریقے اور رسمیں اختیار کر لی گئی تھیں جب یہ چیز حد سے زیادہ بڑھ گئی تو مسلمان عالموں نے ان کا قلع قمع کرنے میں جد و جہد کی اور نہ صرف شہروں .... میں بلکہ دیہات تک میں گھوم پھر کر سنت نبوی اور تہذیب اسلامی کو زندہ کیا، اگر دہلی میں شاہ عبدالرحیم کا خاندان اس خدمت کو انجام دے رہا تھا تو بنگال کے دیہات میں مولوی شریعت اللہ وسیع پیمانہ پر مسلمانوں کو نہ صرف پابند صوم و صلوٰۃ بلکہ انھیں مسلمان صورت بھی بنا رہے تھے۔ مولوی شریعت اللہ اٹھارویں صدی کے آخر میں مکہ معظمہ جا کر سالہا سال تک وہاں رہے اور ۱۸۲۰ء میں ہندوستان واپس آ کر اسلامی معاشرت و تہذیب کے پھیلانے میں مصروف ہو گئے۔ مولوی شریعت اللہ کے بعد حضرت سید احمد صاحب رائے بریلوی ۱۸۲۱ء میں حج کو گئے اور دو سال بعد وہاں سے ہندوستان آ کر اسلامی تہذیب و معاشرت کی اشاعت و تبلیغ کے کام میں مصروف ہو گئے۔ ان دونوں حضرات کے اثر سے نہ صرف شہروں میں بلکہ دیہات تک میں مسلمانوں نے اسلام کی حقیقی تہذیب کو زندہ کیا۔ لیکن بدقسمتی سے حکام وقت نے انھیں مذہبی مجنون اور وہابی قرار دے کر ان پر بغاوت کے مقدمات چلائے۔ بنگال کے ہندو زمینداروں نے حکومت کا یہ رخ دیکھ کر مسلمان رعایا پر جن کے مسلمان ہونے کی شناخت داڑھی قرار دی گئی تھی فی کس ڈھائی روپیہ ٹیکس لگایا اور جب ان لوگوں نے عدول حکمی کی تو حکومت کی مدد سے

انھیں فوج کی گولیوں کا نشانہ بنایا باوجود ان مظالم کے مسلمانوں کا ایک طبقہ اپنی قدیم طرز معاشرت اور تہذیب پر قائم رہا۔ اگرچہ ۱۸۵۷ء کے ہنگامہ میں ایسے بدنصیب مسلمانوں اور مسلمانوں کے عالموں کی تعداد کم نہ تھی جنھوں نے انگریزوں کا ساتھ دیا مگر مزاحمت کرانے والوں کی تعداد بھی کچھ کم نہ تھی قدرتاً اس قسم کے برگزیدہ لوگ حکومت کے نزدیک مشتبہ سمجھے گئے اور انھیں جانی اور مالی نقصانات اٹھانا پڑے۔ اسی قسم کے مشتبہ علما کے ایک طبقے نے اپنی مذہبی تہذیب کو قائم رکھنے کے لئے جب دیوبند میں ایک مدرسہ قائم کیا تو حکومت ان سے اور زیادہ مشکوک ہوگئی، اسی طرح جب لکھنؤ میں ندوۃ العلماء کی بنیاد قائم ہوئی تو اس پر سرکاری نگرانی قائم کی گئی۔ اسی کے ساتھ انگریزوں کے ایک نمک خوار اور خیر خواہ طبقے نے جو انگریزی لباس و معاشرت کو اپنی اور اپنی قوم کی ترقی کا واحد ذریعہ سمجھتا تھا مذہبی جماعت پر اخبارات و رسائل کے ذریعے حملے کئے، ان کے جبہ اور عمامہ پر ان کے طریق رہائش اور شباہت و برخاست پر جو سنت نبوی کے مشابہ تھے پھبتیاں اڑائیں۔ جہاد کو جو مذہبی حفاظت کا ذریعہ ہے صرف قلمی جہاد میں محدود کیا اور ان طریقوں سے غیر ملکی حکومت کے محبوب بن کر بڑے بڑے عہدے اور خطابات حاصل کئے اور خوب خوب ترقیاں کیں۔

اسی نہج کے لوگوں کی نسبت نواب صدر یار جنگ بہادر نے مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے ایک جلسہ منعقدہ اٹاوہ میں فرمایا تھا کہ جب ڈپٹی کلکٹری لینے کا وقت ہوتا ہے تو یہ انگریز صورت اصحاب مسلمان بن جاتے ہیں۔ لیکن جب نماز کا وقت آتا ہے تو غائب ہو جاتے ہیں۔ ان اصحاب نے اسلامی معاشرت تہذیب پر قائم رہنے والوں اور سنت نبوی پر چلنے والوں کی تحقیر اور تذلیل کرنے میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی ان غریبوں کے متعلق حکومت سے یہ رپورٹیں کی گئیں کہ یہ حکومت سے تعلق رکھتے ہیں اور اس طرح ان پر سرکاری نگرانی قائم کرائی گئی۔ انگریزی صورت و سیرت پر جان دینے والا طبقہ جو کالجوں اور یونیورسٹیوں سے نکل رہا تھا اس کی طرف سے کہا گیا کہ ان ملاؤں کی وجہ سے مسلمانوں کی خیر خواہی سلطنت پر حرف آتا ہے۔ یہ مسجد کے مینڈھے ہیں۔ غرضکہ اس جماعت پر دو طرفہ مار رہی لیکن باوجود ان تمام مصائب کے "اسلامی تہذیب" کی جو کچھ محافظت کی انھوں نے ہی کی۔ تمام دنیوی فائدوں پر لات مار کر دینی علوم پڑھتے۔ سخت افلاس اور عسرت کی زندگی بسر کی لیکن حکومت وقت کے آگے اپنی زبان اور تہذیب کی حفاظت کے لئے گداگری کا دامن کبھی نہ پھیلایا۔ مگر اب اس قسم کے اہل دل حضرات پر پہلے سے کہیں زیادہ سخت وقت آیا ہے یعنی انگریزی صورت اور انگریزی تمدن اختیار کرنے والے اور انگریزی زبان میں نہ صرف لکھنے اور بولنے والے بلکہ اسی زبان میں سوچنے

فخر کرنے والے اصحاب اپنے کو مسلمانوں کی تہذیب کا محافظ قرار دے رہے ہیں اور سنت نبوی کو قائم و برقرار رکھنے کے لئے قربانیاں کرنے والے طبقہ کو اسلام اور مسلمانوں کا دشمن قرار دیا جا رہا ہے۔ العظمۃ للہ!

ایک اور مصیبت ہے اور وہ یہ کہ بدنصیبی سے ہمارے برادران وطن میں بھی تنگ نظر افراد کی ایک ایسی جماعت کچھ دنوں سے پیدا ہوگئی ہے جو اسلامی تہذیب سے خواہ مخواہ بیزار ہے اور اس کا نام و نشان بھی باقی رکھنا نہیں چاہتی۔ اس لئے بحیثیت ایک مستقل اور شاندار تاریخ رکھنے والی قوم کے مسلمانوں کے لئے یہ ضروری ہوگیا ہے کہ وہ اسلامی تہذیب و روایات کو زندہ رکھنے کی جان توڑ کوشش کریں اور اپنی اسلامی و قومی تہذیب کو دشمنوں کے نرغے سے (جنھوں نے اپنی کوتاہ اندیشی سے اپنی قدیم زبان اور تہذیب کو تمام ملک میں پھیلانے کا تہیہ کر لیا ہے) بچانے کی جدوجہد کریں مگر یہ کام وہ اصحاب کیا کر سکتے ہیں جو خود سات سمندر پار کے رہنے والوں کی تہذیب میں ڈوبے ہوئے ہیں اور جو اپنے سیاسی جلسوں کی تقریروں میں سنت نبوی کی پیروی کرنے والوں کی طاقت توڑ دینے پر فخر کرتے ہیں درآنحالیکہ آج انہی کی بدولت "اسلامی تہذیب" کے کچھ آثار باقی ہیں۔

لیکن اگر واقعی خدا نے ہمارے "انگریزیت زدہ" نوجوانوں کے دل پھیر دیئے ہیں اور اب وہ سچے دل سے اسلامی تہذیب کے دلدادہ ہو گئے ہیں اور دیگر اقوام کے مقابلے میں اس کی حفاظت کرنا اور اسے قوم میں پھیلانا چاہتے ہیں تو انھیں چاہئے کہ سب سے پہلے خود اس تہذیب کو اختیار کر کے خود کو ایک نمونہ بنائیں ورنہ خیالی باتیں بنانے سے کیا حاصل ؟ —

گر یہ نہیں تو بابا پھر سب کہانیاں ہیں

اصلاح کا پہلا قدم گھر سے شروع ہونا چاہئے لیڈر کے لئے ضروری ہے کہ جو کچھ اس کی زبان سے نکلے وہی اس کی رفتار و کردار سے ظاہر ہو لیکن افسوس ہے کہ آج مسلم کلچر کے تحفظ کے دعویداروں میں اکثریت ایسے لوگوں کی نہیں ہے کاش یہ صورت حالات بدل سکتی۔

(الفرقان جلد ۲ نمبر ۲)

ایمان کا سودا

(از- مولانا عبدالماجد صاحب دریابادی)

ذکر قرونِ اولیٰ کا نہیں، قرونِ آخر کا نہیں، زمانہ ہجرت کی پہلی صدی کا نہیں۔ تیرھویں صدی کا ہے اور انیسویں صدی عیسوی کا، اور مقام حجاز کی ارضِ مقدس نہیں، لکھنؤ بدعت زدہ لکھنؤ کی سرزمین ہے۔ دینی اور روحانی ہی نہیں، دنیوی و مادی اقتدار بھی مسلمانوں کے ہاتھ سے رخصت ہو چکا ہے اور وہ جو اودھ کی ایک بڑے نام کی "اسلامی سلطنت" گزشتہ عظمت و اقبال کی نوحہ خواں بچی کھچی، کٹی پٹی باقی رہ گئی تھی وہ بھی "صاحب" کے قبضے میں جا چکی ہے۔

اک شمع رہ گئی تھی سو وہ بھی خموش ہے

زمانہ ۶۳-۱۸۶۲ء کا ہے یعنی۔ تاریخ اودھ کے مشہور ہنگامہ ۱۸۵۷ء کو فرو ہوئے ابھی پانچ ہی چھ سال ہوئے ہیں۔ ہر دل میں اقبالِ فرنگ کا نقش بیٹھا ہوا، ہر زبان سرکار عظمت مدار کی عظمت کا کلمہ پڑھتی ہوئی، فرنگی محل کے ایک گوشے میں فقر و فاقہ کے بوریہ پر ایک صاحب بیٹھے نظر آرہے ہیں۔ نام محمد یوسف بن مفتی محمد اصغر۔ کسی زمانہ میں عالم صاحب افتاء تھے ہنگامہ میں گھر بار کچھ اس طرح لٹا کہ مفتی صاحب زر و مال سے ہر طرح فارغ البال ہو گئے۔ دل میں داعیہ حج کا تھا۔ وقت وہ آگیا کہ نہ حج فرض رہا نہ زکوٰۃ۔ اب صبر و تسلیم کی منزلیں ہیں اور یہ خانہ نشین، گوشہ گزین مولانا۔

ایک روز کیا ہوتا ہے کہ ایک صاحب بہادر حکومت انگریزی کے بہت بڑے با اختیار عہدہ دار صوبہ کے فنانشل جوڈیشل کمشنر (اس اودھ کے چیف کمشنر کے بعد سب سے بڑا عہدے دار یہی تھا) پتہ پوچھتے پوچھتے فرنگی محل پہنچتے ہیں اور بعد اجازت مولانا کی خدمت میں حاضر ہوتے

ہیں۔ "بعد اجازت" کا لفظ یاد رکھئے پرانے وقت کا یہ مولوی ملا نا ملازمت کی تلاش میں نہیں نکلتا، عہدہ و منصب خود اسے تلاش کرتا ہوا اُس تک پہنچتا ہو اور پھٹے حالوں مولانا جب تک اجازت نہیں دے لیتے انگریز بہادر کی ہمت سامنے آنے کی نہیں ہوتی — روایت ساری کی ساری ایک چشم دید راوی، فرنگی محل ہی کے خاندان کے ایک نوجوان کی دیکھی ہوئی اور بڑھاپے میں بیان کی ہوئی۔ اور راوی بھی کون؟ کوئی گمنام مجہول نہیں۔ مولوی شرافت اللہ مرحوم پنشنر ڈپٹی کلکٹر ابھی تو ان کے دیکھنے والے اور ملنے والے سیکڑوں کی تعداد میں موجود ہیں، انھوں نے اپنے صاحبزادے مفتی عنایت اللہ مرحوم (صدر مدرسہ عالیہ نظامیہ) سے بیان کیا اور انھوں نے اپنے تذکرۂ علمائے فرنگی محل" صفحہ ۲۰۔ ۲۱ میں اسے درج کر دیا — ان کی وفات تو ابھی کل کی بات ہے۔

سامنا "صاحب" کا ہوا، وقت وہ تھا کہ انگریز کا بچہ بچہ حاکم وقت تھا اور پھر یہ انگریز تو ددا صوبہ کا تقریباً سب سے بڑا افسر تھا، شکستہ حال، غربت زدہ مولوی بوسیدہ چٹائی پر بیٹھا ہوا کچھ لکھنے میں مشغول تھا، کہاں کا ڈرائنگ روم اور کہاں کے کوچ اور صوفے حاکم وقت حاکم صوبہ کو اجازت ایک ٹوٹے ہوئے مونڈھے پر بیٹھنے کی ملی۔ آنے والے نے کچھ سوالات کیے شریعت کے معاملات قانونی (نکاح وطلاق) سے متعلق جوابات مفصل ملے اب سوال ہوا کہ جناب کی بسر اوقات کی کیا صورت ہو؟ جواب ملا کہ اسباب ظاہر تو کچھ نہیں۔ بسر عسرت سے ہوتی ہے۔

فاقہ زدہ مولوی نوکری پر نہیں گر رہا ہے۔ سند یں اور درخواستیں نہیں پیش کر رہا دستار تول کے دفتار سے بیٹھ پر نہیں اٹھائے ہوئے ہو۔ نوکری خود اس خوددار مولوی پر گر رہی ہو سوال وجواب آگے سنیئے۔

"تو میں آپ کو سرکاری ملازمت دلا دوں گا —"

"لیکن میں نے تو مدتوں فتوے احکام شریعت کے دیئے ہیں۔ خدا سے شرم آتی ہو کہ اب احکام خلاف شرع صادر کروں۔ انگریز کی ملازمت میں یہ ہونا لازمی ہے۔"

انگریز افسر نوکری دینے اور عہدہ بخشنے ہی آیا تھا، رخصت ہوا، چلتے چلاتے یہ الفاظ کہتا ہوا۔

"جی نہیں، آپ کے لئے ایسا انتظام کر دیا جائے گا کہ نہ آپ کو احکام صادر کرنا پڑیں، اور نہ کوئی امر خلاف شریعت آپ سے متعلق کیا جائے۔"

دوسری صبح کا طلوع ہوا، تو انگریز افسر پھر موجود۔ اور آج ایک مسلمان منشی بھی ہمراہ۔ مفتی فرنگی محل کے لیے عہدہ رجسٹراری کا تجویز ہوا۔ اس رجسٹراری کو آج کی سب رجسٹراری پر قیاس نہ کیجیے گا انگریزی عہد میں شروع ایک معزز ترین عہدہ تھا کبھی۔ یہ خدمت کلکٹر سے لے لی جاتی اور کہیں ڈسٹرکٹ جج سے مشاہرہ، چھ سات۔ سو ماہوار سے بھی اوپر تھا رقم کا خیال فرمایا آپ نے؟ دس بیس پچاس نہیں، کہ وہ بھی ایک ملائے مسجد کے لیے بہت تھے، بلکہ چھ سات سو! اور وہ بھی اس زمانے کے! گویا آج کی شرح کے تناسب سے کوئی ڈھائی ہزار کا مشاہرہ[۱]!

کہ آگ لینے کو جائیں پیمبری مل جائے!

اور یہ تو آگ لانے کے لیے اپنی جگہ سے ہلے تک نہ تھے! جاہ و دولت کی پیمبری خود ہی چل کر ان کے پاس آگئی تھی ——— ملائے مسجدی اب بھی فرط مسرت سے بے خود نہیں ہو جاتا۔ صاحب کے قدموں سے لپٹ نہیں جاتا مدح و توصیف کے قصیدے نذر گزارنے کی فکر نہیں کرتا۔ سکون و وقار کے ساتھ پوچھتا ہے کہ یہ رجسٹری ہے کیا چیز؟ صاحب سمجھاتے ہیں۔ اور کہتے ہیں کہ۔

آپ کو زحمت کچھ بھی نہ ہوگی، نہ کہیں آنا جانا، نہ کاغذات کا لکھنا پڑھنا آپ کی کچہری، آپ کے مکان میں رہے گی ایک کمرہ ان منشی کو دے دیجیے، یہ اپنا کام کرتے رہیں گے چار بجے کاغذات آپ کے سامنے پیش کر دیا کریں گے۔ آپ کا کام صرف دستخط کر دینا ہوگا۔

ایسی بے مشقت نوکری آج تک کسی کو کہیں ملی ہوگی۔

فرنگی محلی کی فرنگی ملازمت کا پہلا دن شروع ہوا۔ منشی نے دن میں کام کیا۔ سہ پہر کو کاغذات مفتی صاحب کے پاس دستخط کے لیے پیش کیے آپ نے دستاویزوں کو پڑھنا چاہا۔ منشی نے کہا کہ اس زحمت کی کیا ضرورت ہے کاغذات میرے دیکھے ہوئے جانچے ہوئے ہیں۔ آپ صرف دستخط فرما دیجیے۔ ارشاد ہوا کہ یہ کیوں کر ممکن ہے۔ دستخط تو بمنزلہ میری شہادت کے ہیں۔ بغیر پڑھے شہادت کیسے دے دوں؟ رجسٹر کھلا اور آپ نے کاغذات پڑھنے شروع کیے۔ اتفاق دیکھیے کہ پہلی ہی دستاویز سودی قرضے سے متعلق تھی! ——— آگے کیا گذری اسے خود راوی ہی کی زبان سے سنیے:۔

چہرہ مبارک غصے سے سرخ ہو گیا۔ رجسٹر اٹھا کر دور پھینک دیا۔ منشی سے کہا ابھی نکل جاؤ۔

---

[۱] ہمارے اس زمانہ (۱۹۷۹ء) کی شرح تناسب کے لحاظ سے قریباً ۲۵، ۳۰ ہزار۔ (الفرقان)

اور فوراً نکال دیا۔

منشی غریب روتا ہوا اور فریاد سے کے صاحب کے پاس پہونچا دوسرے دن صاحب خود دارد ہوئے منشی کو ساتھ لیے ہوئے اب پھر روایت کے الفاظ راوی ہی سے سنیے :۔

آپ نے صورت دیکھتے ہی اس کو بھی ڈانٹنا شروع کیا اور فرمایا کہ کافر سے سوا اس کے اور کیا امید ہو سکتی ہے۔ میری ہی غلطی تھی جو کافر کے کہنے میں آگیا اور زار و قطار رونا شروع کیا

پھر فرمایا کہ یہ منشی

"سودی دستاویز پر میرے دستخط کرا رہا تھا، جو گویا میری شہادت ہے۔ حدیث شریف میں سود کے متعلق لکھنے والے اور گواہ سب پر لعنت آئی ہے ابھی تھوڑے زمانے تک تو میرے دستخط خدا و رسول کے احکام پر ہوتے تھے اب میرے دستخط سودی دستاویز پر ہوں گے۔

انگریز حاکم نے ایک بار پھر معافی مانگی، تلافی کر دینا چاہی اور کہا کہ بے شک مجھ سے غلطی ہوئی اب میں ایسی صورت رکھوں گا کہ نہ بھی زحمت نہ رہے اور کسی امر خلاف شریعت کی صورت نہ پیش آئے گا اور عہدہ پر برقرار رہنے پر بے حد اصرار کیا ...... لیکن جو زبان ایک بار انکار پر کھل چکی تھی پھر کسی ترغیب اور کسی ترکیب سے نہ پلٹی۔ اور آپ عمر بھر فرنگیت کے سایہ سے بھی بچے رہے۔

عمر کا بڑا حصہ سُلّم و شرح سلّم ملا حسن، شمس بازغہ طبیعیات شفا وغیرہ خرافات معقولات کی حاشیہ نویسی میں گزارا تھا۔ شاید اسی تقویٰ و استقامت ایمانی کی برکت تھی کہ چند سال بعد جب مدرسہ جمیہ سے تعلق کے بعد نوبت حج کے جانے کی آئی تو ماہ رمضان مبارک مکہ معظمہ میں گزار کر میں قرب حج میں وفات مدینۂ منورہ میں پائی اور جنت البقیع میں صدہا، ہزارہا پاکوں اور پاکبازوں کے جوار میں جگہ پائی۔ اور فرنگی محل کے مشہور و معروف عالم و عارف مولانا عبد الحیؒ نے اپنے قلم سے یہ شہادت اپنی "تمام قاموس الفقہ" میں دی کہ کان جامعاً للفروع والاصول حاوِیاً للمعقول والمنقول صاحب الریاضات والمجاهدات منبع البرکات والفیوضات حسن الصورة

مسلمانوں کی موجودہ قومی سیرت کے بعض کمزور پہلو

(از مولانا سید ابوالحسن علی ندوی)

(مولانا کا یہ مقالہ تقسیم ہند سے قبل کی سیاسی اور انتخابی کشمکش کے موقع پر الفرقان محرم ۱۳۶۵ھ میں شائع ہوا تھا۔ زمانہ بدل گیا، حالات کی بساط یکسر الٹ گئی لیکن سوائے اس کے کہ مسلمانانِ ہند کی قومی سیرت کی جن کمزوریوں کا تعلق انگریزی اقتدار سے تھا ان میں ایک گونہ فرق آگیا باقی جن کمزوریوں سے مولانا نے بحث کی ہے وہ اپنی ہو بہو شکل میں آج بھی موجود ہیں اور ان کے لحاظ سے اس مقالے میں کسی بھی تغیر و تبدل کی ضرورت نہیں اور اس لئے جتنا موزوں اور مفید یہ مقالہ اپنی پہلی اشاعت کے وقت تھا اتنا ہی آج بھی ہے ——— مدیر)

مسلمانوں پر تنقید کرنا اور ان کے کمزور پہلوؤں کو نمایاں کرنا کسی مسلمان کے لیے قطعاً کوئی خوش گوار کام نہیں ہے۔ اور اس کے لیے کوئی شخص بآسانی سے تیار نہیں ہو سکتا۔ لیکن دنیا کے سب ضروری کام خوش گوار نہیں ہوتے۔ ایک ایسی جماعت کی کمزوریاں کو خاموشی سے دیکھتے رہنا جس سے نہ صرف اس کی اپنی قسمت بلکہ دنیا کی قسمت بھی وابستہ ہو اور جو انجیل کی زبان میں زمین کا نمک ہو جس کی نمکینی کے ضائع ہو جانے کے بعد پھر زمین کو کوئی چیز نمکین نہیں کر سکتی۔ ایک ایسا ناخوش گوار کام ہے، جس کے مقابلے میں دنیا کی ہر ناگواری، ہر تلخی، ہر طرح کی روحانی اذیت اور ہر قسم کی ذہنی کوفت ہیچ ہے اور اس کے مقابلے میں رنج یا دوسروں کی یہ ناخوشگواری کوئی حقیقت نہیں رکھتی۔

مسلمانوں کی کسی قوم یا ملک کا سلطنت و اقتدار سے محروم ہو جانا یا مسلمانوں کا عالمگیر سیاسی زوال بہت بڑا حادثہ ہے جس پر جتنا ماتم کیا جائے وہ کم ہے اس کے جو اخلاقی اور ذہنی نتائج ہوتے ہیں وہ بھی اب کچھ پوشیدہ نہیں رہے۔ لیکن اس سے بدرجہا المناک حادثہ یہ ہے کہ مسلمانوں کی ایک بڑی جماعت کی ذہنیت یا نفسیت کسی ایسے سانچے میں ڈھلنے لگے جو صحیح اسلامی تعلیم و تربیت کا سانچہ

ہوتیں ہے اور بعض انفرادی عیوب ونقائص یا منکر خدا اور منکر آخرت قوموں کے صفات وخصائص مسلمانوں کی سیرت کا جزء بننے لگیں اور قومی کیرکٹر کی صورت اختیار کرنے لگیں۔ تحریف دین کی اصطلاح تو پہلے سے موجود ہے اور اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ عملی کوتاہیوں اور ذاتی انحراف سے بڑھ کر کوئی جماعت اصل دین، اس کی کتابوں اور اس کی تعلیمات میں ترمیم وتنسیخ اور رد وبدل شروع کردے اس کے نتائج انحراف سے کہیں بڑھ کر خطرناک اور وسیع ہوتے ہیں اور اس کا علاج اور اس صورت حال کی اصلاح تقریباً محال ہوتی ہے۔ اس لیے کہ اس تحریف سے اس قوم کے ذہن میں حقائق بدل جاتے ہیں۔ گناہ عین صواب اور بعض اوقات کار ثواب بن جاتا ہے اور ان کو دین کی اصل وحقیقت سے ہٹ جانے یا دور پڑ جانے کا احساس ہی نہیں ہوتا۔ بلکہ وہ جو کچھ کرتے ہیں، وہی عین دین معلوم ہوتا ہے یہودیوں اور عیسائیوں میں مذہبی طور پر یہی صورت پیش آئی۔ جب اس تحریف دین کے مقابلے میں، اس ذہنی واخلاقی تبدیلی کو جو ہندوستان کے مسلمانوں میں نظر آرہی ہے تحریف مسلمین سے تعبیر کروں گا۔ مسلمانوں میں عملی کوتاہیاں کم وبیش ہمیشہ پائی گئیں۔ اور انسانوں کی کسی جماعت کا ان سے یکسر پاک ہونا بہت مستبعد ہے۔ لیکن یہ انحراف تھا مسلمان اس کو غلط سمجھتے رہے اور اسلامی ذہن وضمیر ہمیشہ اس کے خلاف احتجاج کرتا رہا۔ اور کبھی مسلمانوں نے اس پر فخر نہیں کیا۔ لیکن اب جو کچھ نظر آرہا ہے اس کو انحراف کہنا مشکل ہے۔ اور وہ اس سے کچھ زیادہ وسیع اور عمیق اور اس سے مختلف شکل رکھتا ہے۔ یہ مسئلہ مسلمانوں کے تمام تعلیمی، سیاسی اور اقتصادی مسائل سے زیادہ اہم اور قابل توجہ ہے قومی کیرکٹر ہر قوم کی زندگی میں اس کی قومی دولتوں سے کہیں بڑھ کر بیش قیمت ہوتا ہے بالخصوص مسلمانوں کی اسلامی سیرت بڑی سے بڑی اسلامی سلطنت اور بڑے سے بڑے قومی ادارہ اور زیادہ سے زیادہ تیز ترقی اور اقتصادی خوش حالی سے زیادہ قیمت رکھتی ہے۔ کسی بڑی سے بڑی قیمت اور عظیم سے عظیم بدل پر بھی اس کے نقصان یا زوال کو گوارا نہیں کیا جاسکتا اگر اس پر زوال آگیا یا اس میں کچھ غلط تبدیلی واقع ہوگئی تو بڑی سے بڑی مادی کامیابی اور فتح سے اس کا کفارہ نہیں ہوسکتا۔ یہ تبدیلی مختلف تاریخی وسیاسی وتعلیمی وتہذیبی اسباب، بعض مؤثر اور اشتعال انگیز حالات اور واقعات اور زیادہ تر غفلت کی کمزوری سے صدیوں میں پیش آتی ہے۔ لیکن جب بدقسمتی سے تبدیلی واقع ہوجاتی ہو تو صدیوں تک اس کا اثر قائم رہتا ہے اور اس کے اجتماعی نتائج اس قوم کے تمام افراد کو برداشت کرنے پڑتے ہیں — خواہ انفرادی طور پر بعض افراد کتنے ہی ایک سیرت ہوں۔

اس موقع پر چند نمایاں کمزور پہلوؤں کا ذکر کیا جاتا ہے جو دینی و اخلاقی حیثیت سے زیادہ اہمیت رکھتے ہیں۔ اور جن کو اصل اسلامی سیرت اور اخلاقی تعلیمات سے زیادہ بُعد اور تعارض ہے۔

اصول و اخلاق پر مصالح و منافع کی ترجیح

(۱) ایک نہایت اہم اور گہری اور انقلاب انگیز تبدیلی جو مسلمانوں کی ذہنیت و نفسیات میں اس پچاس سال کے اندر اندر واقع ہوئی ہے وہ یہ ہے کہ آخرت پر ایمان عملاً کمزور ہوتا چلا جا رہا ہے اور اس کے نتیجے کے طور پر یا مستقلاً اصول اور صداقت کے مقابلے میں منافع و مصالح آجل کے مقابلہ میں عاجل کو ترجیح دینے کا مرض پیدا ہو گیا ہے۔ اس سے مسلمان ایک با اصول، بلند اخلاق، پختہ سیرت جماعت کے بلند مقام سے گر کر ایک بے اصول ناقابل اعتبار ابن الوقت اور مصلحت پرست قوم کی ادنیٰ سطح پر آتے جا رہے ہیں جس کے سامنے کوئی اخلاقی معیار نہیں ہے بلکہ صرف منافع و مصالح اور اغراض و مقاصد ہیں۔ یہ تبدیلی اس وقت شروع ہوئی جب ہندوستان میں اور تقریباً تمام اسلامی ممالک میں (جو کسی طرح یورپ کے زیر اثر آئے) مسلمانوں کو مغربی تہذیب، مغربی فلسفہ، اخلاق اور مغربی معیاروں کے قبول کرنے کی دعوت دی گئی۔ مغربی اخلاق، فلسفہ علوم اور سیاست کا ہر طالب علم اور اس زمانے کا ہر واقف آدمی جانتا ہے کہ یورپ کا سارا نظام زندگی تمام تر مادہ پرستی اور مصلحت جوئی پر مبنی ہے۔ افادیت اور مصلحت بینی اس نظام زندگی کے ریشہ ریشہ میں سرایت کر چکی ہے سارا یورپ اس وقت سے جب سے اس نے کلیسا کے اقتدار سے اپنے کو آزاد کرایا۔ صرف ایک ہی عملی مذہب رکھتا ہے (جس کے خلاف کسی گوشہ میں بھی عملاً کوئی بغاوت نہیں) اور وہ مذہب مادہ پرستی ہے۔ مسلم ممالک میں اس نظام کے غلبہ کا طبعی نتیجہ یہ ہے کہ آخرت کی اہمیت کم ہوتے ہوتے بعض ملکوں میں (جہاں یہ نظام اپنی پوری قوت کے ساتھ مستولی ہے) معدوم ہو گئی ہے دنیاوی ترقی اور مادی فوائد و منافع منتہائے نظر بن گئے ہیں اصولی و اخلاقی معیار منافع و فوائد کے مقابلے میں اپنی اہمیت بالکل کھو چکے ہیں۔ مسلمانوں میں اس دعوت کے علمبرداروں نے ترقی (یعنی دنیاوی ترقی) پر اتنا زور دیا اور اس شد و مد اور بلند آہنگی سے مادی ترقی کی دعوت دی کہ بالارادہ یا بلا ارادہ آخرت اور امور آخرت کی اہمیت کم ہو گئی۔ بلکہ بعض اوقات انھوں نے اس نظام اور ان افکار کی تصویب و تحسین کی جس میں دنیا کے مقابلے میں آخرت کی اہمیت زیادہ تسلیم کی گئی تھی۔ اور مسلمانوں کو دنیا

پرست اور آخرت سے غافل ہونے سے روکنے کی کوشش کی گئی تھی ان جملوں اور ان تحریروں اور تحریکوں کا مذاق اڑایا گیا اور ان کی ہجو کی گئی جن میں دنیا کو متاع قلیل اور متاع غرور کہا گیا تھا دنیا پرست اور مادہ پرست اور منکر آخرت قوموں اور ملکوں (غالباً صحیح تر ایک قوم اور ملک) کو مسلمان نوجوانوں کے سامنے ایک بلند نمونہ اور معیار کامل کے طور پر پیش کیا گیا جو ہر تنقید سے بالاتر تھا۔ پھر جو نظام تعلیم قائم کیا گیا اس میں انکار آخرت کی روح بسی ہوئی تھی اس کی اساس اخلاق کے مقابلے میں ظاہری منافع کی ترجیح پر رکھی گئی تھی۔ اس میں شرافت اور اخلاق کے مقابلے میں خواہش نفس اور لذت کا عنصر غالب تھا وہ تمام تر ایسی قوم اور ایسی تہذیب کے ذہن کی پیداوار تھا جو سرتاپا منکر آخرت تھی دراصل یہ کسی مجرد نظام تعلیم کی قبولیت کی دعوت نہ تھی اور نہ ایسا ممکن ہے بلکہ یہ ایک پوری تہذیب تمدن و معاشرت اور اخلاق و فلسفہ اجتماع کی دعوت تھی۔

پھر اس سے بڑھ کر یہ ہوا کہ انھوں نے مسلمانوں کو صاف صاف ہوا کے رخ پر چلنے اور دریا کے بہتے ہوئے دھارے پر کشتی چھوڑ دینے کی دعوت دی اور صاف صاف کہا کہ۔

"چلو تم ادھر کو ہوا ہو جدھر کی"

"زمانہ با تو نہ سازد تو با زمانہ بساز"

اس دعوت میں مسلمانوں کی بہترین قابلیتیں صرف ہوئیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمانوں کی نظروں میں اصول و اخلاق کی اہمیت بتدریج گھٹتی چلی گئی اور بڑی تعداد میں ایک ایسا طبقہ پیدا ہو گیا جس کے نزدیک اخلاق و مصالح میں کوئی تقابل نہ تھا اور ہر موقع پر مصالح کو اصول پر ترجیح حاصل تھی وہ ہر وقت بڑے سے بڑے مذہبی اصول، شرعی حکم اخلاقی تعلیم کو ایک شخصی منفعت یا قومی مصلحت پر قربان کرنے کے لیے تیار رہتا تھا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ایک خاص قسم کی محدود معاشی ترقی کے ساتھ ایک عام اخلاقی انحطاط اور بے اصولی پھیلی۔ بیسویں صدی کے اس نصف اول میں ہندوستان میں ہمیں مسلمانوں کے کیرکٹر میں پہلے کے مقابلے میں نمایاں اور محسوس انحطاط نظر آ رہا ہے جو ہر سوچنے سمجھنے والے مسلمان کے لیے حد درجہ تشویش ناک ہے اب ایک اصول اور مذہبی اعتقاد کے مقابلے میں ذاتی ترقی یا شخصی فوائد کے قربانی کی مثالیں کم سے کم تر نظر آتی ہیں۔ وہ بھی زمانہ گذشتہ کی یادگاریں ہیں جو برابر روبزوال ہیں۔ اب تمام مسائل زندگی پر ایک تعلیم یافتہ مسلمان کا طرز فکر اور زاویۂ نگاہ خالص مادہ پرستانہ اور تاجرانہ ہے۔ وہ یہ دیکھتا ہے کہ اس کام میں اس کے لیے کتنی مالی منفعت ہے یا اس کو کس قدر جاہ و اعزاز حاصل ہوگا اس بات سے قطع نظر کرتے ہوئے کہ وہ شرعاً اس

کے لیے جائز اور اخلاقاً مستحسن ہے یا نہیں بلکہ اس کا اپنا ضمیر بھی اس سے مطمئن ہے یا نہیں۔ یہ سوالات مسلمانوں کے دماغوں سے ایک عرصہ سے بالکل نکلتے جا رہے ہیں یا ان کی اہمیت کم ہو گئی ہے اور ان کی بنا پر کسی مسلمان کو کسی عہدہ یا منفعت یا اعزاز کے قبول کرنے میں قلب و ضمیر کی رکاوٹ کم سے کم پیش آتی ہے خواہ وہ شریعت میں مطلقاً حرام اور اخلاقاً مذموم و معیوب ہو اور اس کا ضمیر ایک لمحہ کے لیے بھی اس سے مطمئن نہ ہو۔ بلکہ اب اس کو ایک قومی خدمت سمجھا جاتا ہے اور اسی نقطۂ نظر سے اس کو دیکھا جاتا ہے۔ کیوں کہ یہ تسلیم کر لیا گیا ہے کہ جو زر بھی کسی جائز یا ناجائز طریقہ پر کسی فرد کی جیب میں آتا ہے اور اس کے بچوں اور متعلقین کی خوش حالی کا سبب بنتا ہے وہ گویا قومی فنڈ میں جمع ہوتا ہے اس لیے کہ سب مسلمان ہیں اور ایک مسلمان کی خوش حالی یا چند افراد کی خوش حالی خواہ وہ کسی قدر دولت اور احکام مذہبی کی صریح مخالفت کے بعد ہی میسّر ہوئی خوشحالی کے مرادف ہے۔

اس ذہنیت و سیرت اور اس عام اخلاقی انحطاط اور کیرکٹر کی کمزوری کا اثر مسلمانوں کی زندگی کے تمام شعبوں پر پڑ رہا ہے اور افسوسناک بات یہ ہے کہ اس میں کسی قسم کا عیب نظر نہیں آتا بلکہ اس پر بحث کی گنجائش بھی بہت کم رہ گئی ہے اس کا نتیجہ وہ عام بے اصولی تناقض اور اخلاقی کمزوریاں ہیں، جن کی مثالیں ہمیں ہر جگہ ملتی ہیں۔ ہمارے مسلمان اخبار و رسائل میں (ما شاء اللہ) ہر قسم کا خلاف تہذیب اشتہار شائع کرایا جا سکتا ہے اگر اس کی قیمت ادا کر دی جائے۔ ان رسائل میں ہر قسم کے مخرب اخلاق، حیا سوز و عریاں مضمون و افسانے و اشعار شائع ہو سکتے ہیں وہ بے حیائی اور اخلاقی بے نظمی کی ہر تحریک کے لیے وہ آلہ بن سکتے ہیں۔ بدتر سے بدتر فواحش کی اشاعت ان کے ذریعے سے کی جا سکتی ہے۔ اگر ان کو اس راستے سے اپنے رسالے کی کامیابی اور مقبولیت کا ایک فی صدی بھی امکان نظر آئے تو ایسی صورت میں وہ اس کی ہرگز پروا نہ کریں گے کہ ان کی اس حرکت سے خلق خدا کی اخلاقی ابتری اور انحطاط کا ۹۹ فی صدی امکان ہے یہ بھی ممکن ہے کہ ان اخبارات و رسائل کے مالک، اڈیٹر ذاتی طور پر شریف مسلمان ہوں اور وہ اصولاً ان چیزوں کو درست نہ سمجھتے ہوں۔ لیکن اگر آپ اس مسئلے پر ان سے گفتگو کریں گے تو وہ صاف کہہ دیں گے کہ تجارت و صحافت میں اصول مذہب اور اخلاق کی پابندی نہیں کی جا سکتی۔

اخبارات کسی اصول اور صحیح مسلک کی ترجمانی اور صحیح خیالات و افکار کی اشاعت کے

بجائے اپنے قارئین — اور عوام کے خیالات و خواہشات کی ترجمانی کو اصل صحافت سمجھتے ہیں۔ وہ عوام کی ناراضی اور بد دلی کو ایک منٹ کے لیے بھی برداشت نہیں کر سکتے اور ان کی خوشی اور اپنے اخبارات کی مقبولیت و اشاعت کے لیے ہر قسم کی بے اصولی ہر طرح کے تناقض اور ہر درجہ کے استدلال کو گوارا کرتے ہیں۔ مسلمانوں کے مذاق سلیم فکر صحیح اور اخلاق قومی پر یہ اخبارات بڑی طاقت کے ساتھ اثر انداز ہیں اور مسلمانوں کے افکار و خیالات میں جو عام بے دلیلی و تناقض، عام ذہنی انتشار اور اشتعال پذیری پائی جاتی ہے۔ اس میں میرے نزدیک ان اخبارات کا بڑا حصہ ہے۔

مسلمان اہل علم اور اہل قلم کو آپ ہر کام پر لگا سکتے ہیں اگر اس کا خاطر خواہ معاوضہ آپ ان کو ادا کریں۔ ان سے خود ان کے خیالات و افکار کے خلاف سب کچھ لکھوا سکتے ہیں۔ لکھوا سکتے ہیں اور شائع کروا سکتے ہیں، اگر اس کی قیمت ادا کر سکیں بڑے بڑے سنجیدہ اور ذی علم اہل قلم و اخبار نویس پر جوش اسلامی نظمیں لکھنے والے شاعروں سے ایسے پروپیگنڈے کے کام لیے جا سکتے ہیں جس سے وہ خود بھی متفق نہیں ہیں۔ اگر آپ ان سے اس بارے میں استفسار کریں گے تو وہ آپ کو جواب دیں گے کہ اس میں کونسا مذہبی یا قومی نقصان یا شرعی گناہ ہے؟ یہ تو ایک بزنس ہے ایک شخص ہم کو معاوضہ دیتا ہے اور ہم اس کے بدلے میں اس کو ایک تقریر یا مضمون تیار کر دیتے ہیں؟ گویا ضمیر فروشی بھی ایک شرعی تجارت اور تعاونوا علی الاثم والعدوان (گناہ اور زیادتی پر مدد کرنا) خود کوئی گناہ نہیں۔ حالانکہ یہ دماغی و ذہنی بیوپار اس بیسوا عورت کے گناہ سے بدتر ہے۔ جو اپنا جسم کرایہ پر چلاتی ہے۔

جب سے مسلمانوں پر مغربی طرز کی تربیت کا غلبہ ہوا ہے وہ ہر چیز کو قومی ترقی اور قومی مفاد کے نقطۂ نظر سے دیکھنے لگے ہیں اور جن چیزوں کا ارتکاب وہ ذاتی سربلندی اور شخصی منفعت کے لئے کرتے تھے اب اس کو قومی مفاد کے لئے ضروری سمجھنے لگے ہیں۔ مثلاً اب ان کیلئے ضروری ہو گیا ہے کہ تمام محکموں اور شعبوں میں ان کا متناسب قائم رہے۔ خواہ وہ آبکاری کا محکمہ ہو یا جاسوسی کا سودی کاروبار کے نظام ہوں یا سبیل الشیطان لڑنے والے نظام۔ غضب یہ ہے کہ وہ کام بھی جن کی حرمت مسلمانوں کے قرآن کی نص قطعی سے ثابت ہوتا ہے اور جس پر قرآن کی یہ آیتیں شاہد ہیں۔

إِنَّ الَّذِينَ تَوَفَّاهُمُ الْمَلَائِكَةُ ظَالِمِي
أَنفُسِهِمْ قَالُوا فِيمَ كُنتُمْ ۖ قَالُوا
كُنَّا مُسْتَضْعَفِينَ فِي الْأَرْضِ ۚ قَالُوا

جو لوگ جن لوگوں کی فرشتے اس حال میں جان نکالتے
ہیں کہ وہ اپنا برا کرتے ہوں ان سے فرشتے کہتے تھے کہ
کس حال میں تھے وہ کہتے ہیں کہ ہم ملک میں بے بس تھے

أَلَمْ تَكُنْ أَرْضُ اللّٰهِ وَاسِعَةً فَتُهَاجِرُوا فِيهَا فَأُولٰئِكَ مَأْوَاهُمْ جَهَنَّمُ وَسَاءَتْ مَصِيرًا۔ (النساء)	وہ کہتے ہیں کہ ہم اس ملک میں بے بس تھے فرشتے کہتے ہیں کیا خدا کی زمین وسیع نہ تھی جہاں تم ہجرت کر کے چلے جاتے سو یہ وہ لوگ ہیں جن کا ٹھکانا جہنم ہے اور وہ بری جگہ ہے لوٹنے کی۔
اَلَّذِينَ آمَنُوا يُقَاتِلُونَ فِي سَبِيلِ اللّٰهِ وَالَّذِينَ كَفَرُوا يُقَاتِلُونَ فِي سَبِيلِ الطَّاغُوتِ فَقَاتِلُوا أَوْلِيَاءَ الشَّيْطَانِ إِنَّ كَيْدَ الشَّيْطَانِ كَانَ ضَعِيفًا۔ (النساء)	جو لوگ ایمان دار ہیں وہ جہاد کرتے ہیں اللہ کی راہ میں اور جو لوگ کافر ہیں وہ لڑتے ہیں شیطان کی راہ میں سو تم لڑو شیطان کے ساتھیوں سے درحقیقت شیطان کا فریب کمزور ہے۔

اس کو آئینی خاد اور مسلمانوں کے تناسب اور ان کے قومی تفرق کو برقرار کو رکھنے کے لیے جائز قرار دیا گیا اور بعض مسلمانوں ہی کی کوشش سے اس میں غیر معمولی کامیابی ہوئی اور ہو رہی ہے۔

ان تمام مثالوں سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ موجودہ ہندوستانی مسلمانوں کے نزدیک اصول و صداقت پر مفاد و مصالح مقدم ہیں۔ اخلاقی معیار اور اخلاقی حقیقتیں ان کی نگاہ میں وقیع نہیں۔ اصل چیز وہ منافع اور اغراض ہیں جن کا حصول اپنی ذات خاندان یا قوم کے لئے ضروری یا فائدہ مند سمجھا جاتا ہو یہ ذہنی کیفیت اور سیرت ایک ایسی ملت کیلئے جو پیغمبروں کی تعلیمات اور اصولوں کی حامل اور امین ہو اور اخلاق و سیرت کو دنیا میں تمام دنیا کے لئے نمونہ و شاہد ہے۔

وَكَذٰلِكَ جَعَلْنَاكُمْ أُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُونُوا شُهَدَاءَ عَلَى النَّاسِ	اور اسی طرح کیا ہم نے تم کو امت معتدل تاکہ تم گواہ ہو لوگوں پر۔

حد درجہ نامناسب اور غیر مطابق ہے۔ اگرچہ ایک قوم خالص مقوم کے لیے بالکل مناسب اور عین مطابق ہے۔ اور اس کا مسلمانوں کو فیصلہ کرنا چاہیے کہ ان کی صحیح پوزیشن کیا ہے۔

یہ ذہنیت و سیرت ہمارے علم میں کم سے کم ہندوستان میں اس پچیس تیس برس کے عرصے میں نمایاں ہوئی ہے اور اس کو بڑا فروغ اس مغربی قوم پرستی اور موجودہ سیاسی جوش اور دنامی جذبے نے دیا ہے جو ان پچھلے برسوں میں مسلمانوں میں پیدا ہوا ہے ورنہ مسلمانوں کی پوری تاریخ اس بات کی شاہد ہے کہ انھوں نے اصول و اخلاق پر بڑے بڑے مصالح و منافع

کو ہمیشہ قربان کیا اور ایک اخلاقی اصول یا دینی حکم کی حفاظت کے لیے انھوں نے عظیم الشان سیاسی یا معاشی فوائد کو ٹھکرا دیا۔

حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے جبلہ کے معاملے میں ٹھیک یہی طرزِ عمل اختیار کیا تھا جسے ایک خالص قوم پرست کے نقطۂ نظر سے ایک بڑی سیاسی غلطی کہنا چاہیے صرف ایک شرعی حکم (قصاص) اور دینی اصول (مساوات) کے قائم رکھنے کی خاطر ان کو جبلہ جیسے بااثر والیٔ ریاست اور غسان جیسے طاقتور قبیلہ کی امداد سے دست بردار ہونا پڑا مگر انھوں نے اس کے لیے اصول میں کوئی تبدیلی نہیں کی اس کا نتیجہ یہ ہے کہ جبلہ سے ہزار درجہ بڑھ کر طاقتور فرماں روا اسلام کے حلقہ بگوش ہوئے غسان سے ہزار درجے بڑی ریاستیں اسلام کے اثر میں آئیں اور شریعت اسلامی میں کوئی تحریف نہیں ہو سکی۔

حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے کسی سیاسی مصلحت کی خاطر ادنیٰ درجہ کی بھی بے اصولی اور اخلاقی معیار سے انحراف قبول نہیں کیا اور اس کے لیے وہ تمام مشکلات قبول کیں جو ان کو اپنی خلافت میں پیش آئیں۔ مگر نظام خلافت میں کوئی تحریف نہیں ہونے دی۔

حضرت حسین رضی اللہ عنہ کو کوئی سیاسی مصلحت اور قومی مفاد ایک بیٹے نظام حکومت سے ترائن کرنے پر آمادہ نہ کر سکا جو ان کے نزدیک غلط اور ان کے اعتقاد و اصول کے خلاف تھا۔

ابھی نصف صدی پہلے جب مغربی تہذیب اور مغربی افکار ہندوستان میں مقبول نہیں ہوئے تھے ہندوستان مسلمانوں کا کیرکٹر اتنا مضبوط تھا کہ اعلیٰ قسم کے دینداروں کے علاوہ متوسط درجہ کے با اصول اور وضعدار شرفا بھی جھوٹ بولنا اپنے ضمیر اور اعتقاد کے خلاف کوئی کام کرنا یا کچھ کہنا کفر سے کم نہیں سمجھتے تھے۔ اور مرجانے کو اس پر ترجیح دیتے تھے بدایوں کے ایک بزرگ (جناب مولوی رضی اللہ صاحب) ۱۸۵۷ء کے ہنگامے میں ماخوذ تھے۔ کلکٹر یا جج ان کا شاگرد تھا اس نے ہزار کوشش کی کہ ایک مرتبہ مولوی صاحب اپنی زبان سے جرم کا انکار کر دیں تو ان کو صاف بری کر دے گا۔ لیکن انھوں نے آخر وقت تک جھوٹ بولنے اور اپنے ضمیر و اعتقاد کے خلاف کچھ کہنے سے انکار کیا اور سزائے موت قبول کی۔

مولانا محبوب علی صاحب دہلوی نے ۱۸۵۷ء کے ہنگامے میں عام علماء کے مسلک سے کچھ اختلاف کیا بعد میں انگریزوں نے ۹ گاؤں صلہ میں دینے چاہے مگر انھوں نے صاف انکار کر دیا اور کہا کہ یہ میرا اجتہاد تھا میں نے کسی مصلحت سے اختلاف نہیں کیا تھا۔

یہ سینکڑوں ملکہ ہزاروں میں سے دو مثالیں تھیں شریف خاندانوں اور شرفا کی بستیوں میں جاکر پوچھیے تو اس قسم کی بہت سی مثالیں آپ پائیں گے۔

سیرت کی صلابت، اخلاق کی استقامت اور اصول کی پابندی کی ان مثالوں کا مقابلہ اس زمانے کی بے اصولیوں اور اخلاقی کمزوریوں، ضمیر فروشیوں اور مسلک و خیالات کی نیرنگیوں سے کیجئے تو آپ کو اس قومی انحطاط اور اخلاقی زوال کا اندازہ ہوگا جو مسلمان قوم میں نظر آرہا ہے۔ اور روز بروز سرعت کے ساتھ بڑھ رہا ہے۔ یہ مسلمانوں کی زندگی کا وہ تاریک پہلو ہے جس کو دیکھ کر ایک حساس مسلمان کا دل خون ہوتا ہے۔ اور وہ اس تلخ نوائی پر مجبور ہو جاتا ہے جو اس کے لیے اور پڑھنے والوں کے لیے کوئی خوشگوار چیز نہیں۔

اخلاق و سیرت اس امت کے نظام جسم میں قلب کا درجہ رکھتے ہیں۔ لوگ تنومند و فربہ جسم کو دیکھ کر اس جسم کی صحت و طاقت کا حکم لگا دیتے ہیں اور یہ نہیں دیکھتے کہ قلب کس قدر کمزور اور ماؤف ہے، اور کس طرح بتدریج اس کی حرکت بند ہو رہی ہے۔ مسلمانوں کی ترقی کا اندازہ مردم شماری کے اعداد، ان کے قومی جوش، ظاہری تنظیم اور سرکاری عہدوں کے حساب سے لگانا بالکل غلط ہے۔ ایک با اصول دنیا کے لیے ایک پیغام رکھنے والی اور اخلاق و سیرت میں دنیا کی تمام قوموں کے لیے معیار بننے والی امت کی پیمائش کا ہرگز یہ صحیح پیمانہ نہیں، ضرورت ہے کہ دیکھا جائے کہ وہ اخلاق و اوصاف جو زندگی کے صحیح عناصر ہیں اور جن سے اس امت کا تشخص و امتیاز ہے وہ روبہ انحطاط ہیں یا روبہ ترقی اور اس کا اندازہ سرکاری کاغذات سے نہیں ہو سکتا۔ بلکہ مسلمانوں کی عام زندگی اور ان کے اقوال و افعال سے ہو سکتا ہے۔ بقول اکبر مرحوم ؎

نقشوں کو تم نہ جانچو لوگوں سے مل کے دیکھو
کیا چیز جی رہی ہے کیا چیز مر رہی ہے

عالمگیر اور اصولی پیغمبر سے غفلت

(۲) قدیم ترین زمانے سے دنیا میں دو متقابل دعوتیں پائی جاتی ہیں، ایک پیروی نفس اور انسان کی مکمل آزادی اور غیر ذمہ داری کی دعوت (اگرچہ اس میں صدہا قسم کی غلطیاں شامل ہیں) دوسرے انسان کی عبدیت، اس کی خدا کے سامنے ذمہ داری و جوابدہی اور وحی و تعلیمات پیغمبر

کی پیروی کی دعوت، پہلی دعوت کا نام اسلام کی وسیع اصطلاح میں جاہلیت اور دوسری دعوت
خود اسلام کی ہے۔ ان دونوں دعوتوں کی دنیا کی مختلف جماعتیں اور قومیں اپنے اپنے وقت میں
علمبردار رہیں۔ ساڑھے تیرہ سو برس سے دوسری دعوت (اسلام) کی امامت قیامت تک
کے لیے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پیروؤں کے نام لکھ دی گئی اور پہلی دعوت کی قیادت
وقتاً فوقتاً دنیا کی مختلف قومیں اور تہذیبیں کرتی رہیں۔ یہاں تک کہ تقریباً دو سو برس سے
تقدیر الٰہی نے اس کی قیادت و امامت کا فیصلہ یورپ کی عیسائی قوموں کے حق میں کیا اس
وقت سے مسیحی لیکن در اصل مادی، یورپ نے جاہلیت کی عالمگیر نمائندگی اور ایسی طاقت و اکمل
کے ساتھ اس کی قیادت کی کہ اس سے صدیوں پہلے سے ہمارے علم میں کسی قوم نے نہیں کی تھی طبعی طور
پر زندگی کے ہر شعبے اور تمدن دنیا کے تقریباً ہر میدان میں ان دونوں مقابل دعوتوں اور قوموں
کے نمائندوں میں بڑے معرکوں کا تصادم پیش آیا لیکن مختلف علمی ذہنی اور سیاسی اسباب کی بنا پر جن کی وضاحت بہت
تفصیل طلب ہے دوسری دعوت (اسلام) کے نمائندوں نے بعض اپنی کمزوریوں کی بنا پر یورپ کے مقابلہ میں شکست کھائی
ان کے اصلی وطن کے سرسبز اور اہم ممالک ان کے ہاتھوں سے نکل کر یورپین قوموں کے قبضے میں چلے گئے ان کا عالمگیر
سیاسی اقتدار ختم ہو گیا سمندروں اور خشکی پر سے ان کا تفوق اٹھ گیا ان کی بین الاقوامی ساکھ جاتی رہی دنیا
کے ہر حصہ میں اور خود اپنے ممالک میں بدترین قسم کی غلامی اور قومی ذلت کا سامنا کرنا پڑا
پھر رفتہ رفتہ ان کے دماغ بھی مفتوح اور غلام ہونے لگے مغربی تہذیب نے اسلامی تہذیب
پر حملہ کیا مسلمانوں کے قومی اوصاف اور اخلاقی محاسن جو ان کی سلطنتوں اور شاداب
ملکوں سے زیادہ بیش قیمت تھے ایک ایک کر کے مٹانے شروع کیے اور ان کی جگہ بدترین
انسانی عیوب اور اخلاقی کمزوریاں، جو بت پرست یونان و روم اور تاریک یورپ سے ورثہ میں
اس کے حصہ میں آئی تھیں ان پر مسلط کر دیں پھر انہوں نے مفتوحوں کے دین و ایمان پر حملے
شروع کیے ان کی دینی تعلیمات اور ان کے اصول و احکام شریعت کا استہزا کیا ان کو سیاسی
تثلیث پرست اور بعض اوقات ملحد بنانے کی کوشش کی اور ان میں خود بڑی تعداد
میں ایک ایسی با اثر جماعت پیدا کر دی جو ان کے دین و مذہب سے باغی تھی اور جو اندر اندر
ان کی جڑوں کو کھوکھلا کرنے کی کوشش میں تھی غرض فاتح نے مفتوح کو ہر طرح سے
غیر منظم اور ناتوان کر دیا اور اس کے ہر سرمایہ اور ملکیت کو تاوان جنگ یا مال غنیمت
میں وصول کرنے کی کوشش کی۔ فاتح نے اپنی ذہانت اور دور بینی سے اس حقیقت

پورے طور پر ادراک کیا کہ اس زمین کے اور مسلسل وقفے سے بڑھ کر اس کا کوئی حریف نہیں اس لیے یا تو اس نے اس حریف کا سر کچلنے کی کوشش کی اور جہاں اس سے یہ نہ ہو سکا وہاں اس نے اس حریف کو اپنا مستقل مطیع اور بادرجہ مجبوری بے ضرر خادم بنانے کی کوشش کی۔

یورپ کی قوموں کے مقابلے میں مسلمانوں کی اس مکمل شکست، اس مغلوبیت و ذلت اور اس نقصان عظیم کا جو ان کو پہنچا، طبعی و نفسیاتی اثر کیا ہونا چاہیئے تھا؟ ہر صحیح الفطرت، انسان کہے گا کہ مسلمانوں کے دل میں یورپ کی قوموں کی طرف سے سخت عناد اور جذبۂ انتقام پیدا ہونا چاہیئے تھا اور ان کو بھی ان قوموں کو اپنا مستقل حریف، حقیقی مدمقابل اور عالمگیر دشمن سمجھنا چاہیئے تھا، اور اس کی کوشش کرنی چاہیئے تھی کہ وہ مقابل دعوت کی عالمگیر نمائندگی کی طاقت سے محروم ہو جائے اور اس کا اقتدار اس حد تک ختم ہو جائے کہ اس کی تحریک و دعوت میں کوئی کشش اور کمزور انسانوں کے لیے کوئی کشمکش باقی نہ رہے اور دنیا میں دو دعوتیں برابر کی باقی نہ رہیں۔ بلکہ صرف ایک دعوت رہے اور وہ دعوت الی اللہ ـــ

حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّيَكُوْنَ الدِّيْنُ كُلُّهٗ لِلّٰهِ۔

یہاں تک کہ فتنہ (کفارہ کا غلبہ) باقی نہ رہے اور دین خالص اللہ کا ہو جائے۔

ان کی دعا یہ ہونا چاہیئے تھی۔

رَبَّنَآ اِنَّكَ اٰتَيْتَ فِرْعَوْنَ وَمَلَاَهٗ زِيْنَةً وَّاَمْوَالًا فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا رَبَّنَا لِيُضِلُّوْا عَنْ سَبِيْلِكَ رَبَّنَا اطْمِسْ عَلٰٓى اَمْوَالِهِمْ وَاشْدُدْ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ فَلَا يُؤْمِنُوْا حَتّٰى يَرَوُا الْعَذَابَ الْاَلِيْمَ۔

اے ہمارے پروردگار تو نے فرعون اور اسکے سرداروں کو آرائش اور دولتیں بخش رکھی ہیں اے ہمارے پروردگار اس کا نتیجہ یہ ہی کہ وہ تیرے راستے سے لوگوں کو بھٹکائیں۔ اے ہمارے پروردگار ان کی دولتوں کو نیست و نابود کر دے اور ان کے دلوں کو سخت کر دے کہ وہ اس وقت تک ایمان نہ لائیں جب تک کہ دردناک عذاب نہ دیکھ لیں۔

ان کو دنیا کے ہر حصہ میں یورپین تہذیب اور یورپین طاقت کو اس نظر سے دیکھنا چاہیئے تھا کہ وہ دنیا میں جاہلیت کی علمبردار ہے اور اس کی قوت کی وجہ سے دعوت الٰہی کو فروغ نہیں ہوتا ان کی نگاہ میں دنیا کا سب سے اہم مسئلہ یہی عالمگیر مسئلہ ہونا چاہیے تھا اور ہر مسئلہ اسی

مرکزی مسئلہ کا جز ہونا چاہیئے ان کو ہر ملک میں اپنے کو دعوت اسلام کا عالمگیر نمائندہ سمجھنا چاہیئے تھا اور ہر ملکی قومی سیاسی مسئلہ پر اسی نقطۂ نظر سے غور کرنا چاہیئے تھا اور وہی طرزِ عمل اختیار کرنا چاہیے تھا جو اس عالمگیر دعوت کے نمائندوں کے شایانِ شان ہے ان کو کوئی ایسا موقف اختیار نہیں کرنا چاہیے تھا جس سے اس عالمگیر حریف اور اس جاہلی تحریک و دعوت کو کسی قسم کی تقویت و امداد حاصل ہو، خواہ محدود ملکی مسائل اور وطنی و قومی مصالح کا تقاضہ کچھ ہو۔ ان کو کوئی ایسا طرزِ عمل اختیار نہیں کرنا چاہیئے تھا جس سے اس نظام کی طرف ان کا میلان اور اس کے علمبرداروں کے ساتھ ان کا اتحاد اور محبت ظاہر ہو۔

وَلَا تَرْكَنُوٓا إِلَى الَّذِينَ ظَلَمُوا فَتَمَسَّكُمُ النَّارُ وَمَا لَكُم مِّن دُونِ اللَّهِ مِنْ أَوْلِيَاءَ ثُمَّ لَا تُنصَرُونَ

اور ان لوگوں کی طرف مت جھکو جنھوں نے ظلم کیا ہے ورنہ تم کو بھی آگ لگ جائے گی اور اللہ کے مقابلے میں تمھارا کوئی مددگار نہ ہوگا، اور کسی طرف سے تمھیں مدد نہ مل سکے گی

لیکن کس قدر حیرت و تأسف کا مقام ہے (وہ تأسف و تحیر جو بقول حضرت علیؓ قلب کو مردہ و دماغ کو معطل اور غموں اور فکروں کو بڑھا دیتا ہے) کہ یہ عظیم الشان حقیقت مسلمانوں کی نگاہوں سے بالکل اوجھل ہو گئی ہے یہ مسئلہ اپنی اس مرکزیت اور عمومیت کے ساتھ ان کے ذہن سے صاف نکل گیا ہے۔ اپنی اور اپنے تاریخی اور مستقل عالمگیر حریف کی یہ صحیح پوزیشن ان کی نظر سے بالکل مخفی ہے دو سو برس کی خونچکاں تاریخ جو فتح و شکست اور واقعات و حوادث کا مرقع ہے ان کے حافظہ سے بالکل محو ہو گئی۔ وہ اس حقیقت کو واقعی بھول گئے ہیں کہ وہ اور مغربی قومیں دو مقابل دعوتوں دو متضاد نظام حیات اور دو متضاد تہذیبوں کے علمبردار ہیں اور اس طرح ایک ترازو کے دو پلوں کی طرح ہیں کہ جس قدر ایک نیچا ہوگا دوسرا اونچا ہوگا۔ ان میں سے ہر دعوت کے علمبرداروں کا وجود ان کا فروغ اور ان کی طاقت دوسری دعوت کے علمبرداروں کے لیے ایک مستقل خطرہ اور ایک مسلسل خطرہ اور ایک مستمر کشمکش ہے۔ اس امر واقعی کا اہلِ مغرب کو پورا شعور ہے۔ افسوس کہ مسلمانوں کو اس کا احساس نہیں، اس حقیقت کو قرآن حکیم نے کس صراحت و بلاغت کے ساتھ بیان کیا ہے۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَتَّخِذُوا عَدُوِّي وَعَدُوَّكُمْ أَوْلِيَاءَ تُلْقُونَ إِلَيْهِم بِالْمَوَدَّةِ وَقَدْ كَفَرُوا بِمَا جَاءَكُم

اے ایمان لانیوالو تم میرے دشمنوں اور اپنے دشمنوں کو دوست مت بناؤ، تم انکی طرف محبت کا پیغام بھیجتے ہو اور اظہار کرتے ہو حالانکہ تمھارے پاس جو دین حق آچکا

مِّنَ الْحَقِّ ۚ يُخْرِجُونَ الرَّسُولَ وَإِيَّاكُمْ أَنْ تُؤْمِنُوا بِاللَّهِ رَبِّكُمْ إِنْ كُنْتُمْ خَرَجْتُمْ جِهَادًا فِي سَبِيلِي وَابْتِغَاءَ مَرْضَاتِي ۚ تُسِرُّونَ إِلَيْهِمْ بِالْمَوَدَّةِ وَأَنَا أَعْلَمُ بِمَا أَخْفَيْتُمْ وَمَا أَعْلَنْتُمْ ۚ وَمَنْ يَفْعَلْهُ مِنْكُمْ فَقَدْ ضَلَّ سَوَاءَ السَّبِيلِ ۝ إِنْ يَثْقَفُوكُمْ يَكُونُوا لَكُمْ أَعْدَاءً وَيَبْسُطُوا إِلَيْكُمْ أَيْدِيَهُمْ وَأَلْسِنَتَهُمْ بِالسُّوءِ وَوَدُّوا لَوْ تَكْفُرُونَ ۝

(ممتحنہ - ۱)

اس کے وہ منکر ہیں اور رسول اور تم کو اس بنا پر کہ تم اپنے پروردگار اللہ پر ایمان لائے ہو جلاوطن کر دیا اگر تم میرے راستے پر جہاد کرنے کی غرض سے اور میری رضامندی کی طلب میں نکلے ہو تو ان سے تمھیں دوستی نہ رکھنی چاہئے تم ان سے چپکے چپکے دوستی کی باتیں کرتے ہو حالانکہ مجھے ان سب چیزوں کا اچھی طرح علم ہے جو تم چھپا کر کرتے ہو اور جو ظاہر کرتے ہو اور جو شخص تم میں سے ایسا کریگا وہ راہ راست سے بھٹکے گا۔ اگر ان کو تم پر دسترس ہو جائے تو وہ کھل کر تمھارے دشمن ہو جائیں اور تمھاری طرف برائی کے ساتھ دست درازی اور زبان درازی کرنے لگیں وہ اس بات کے خواہشمند ہیں کہ تم کافر ہو جاؤ۔

اس موقع پر ایک مسلمان کا کیا طرز عمل ہونا چاہئے اور اس کے ایمان اور غیرت دینی کا کیا تقاضا ہے؟ اس کے لیے حضرت ابراہیمؑ اور ان کے متبعین کا نمونہ پیش کیا گیا ہے ایک ہی آیت کے بعد کہا گیا ہے۔

قَدْ كَانَتْ لَكُمْ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ فِي إِبْرَاهِيمَ وَالَّذِينَ مَعَهُ إِذْ قَالُوا لِقَوْمِهِمْ إِنَّا بُرَآءُ مِنْكُمْ وَمِمَّا تَعْبُدُونَ مِنْ دُونِ اللَّهِ كَفَرْنَا بِكُمْ وَبَدَا بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمُ الْعَدَاوَةُ وَالْبَغْضَاءُ أَبَدًا حَتَّى تُؤْمِنُوا بِاللَّهِ وَحْدَهُ

تمھارے لیے ابراہیم اور جو لوگ ان کے ساتھ تھے ان میں عمدہ نمونہ ہے۔ جب انھوں نے اپنی قوم سے کہہ دیا کہ ہم تم سے اور جن کو تم پوجتے ہو بیزار ہیں ہم تمھارے منکر ہیں اور ہم میں تم میں عداوت اور بغض ظاہر ہو گیا جب تک تم اللہ واحد پر ایمان نہ لاؤ۔

کتنی عجیب بات ہے کہ اہل کفر کو تو اس فرق و اختلاف کا احساس ہو اور اپنے دین و مسلک کے لیے محبت و غیرت زیادہ ہو اور وہ اپنے مخالفین سے کبھی اتحاد و موالات کے لیے تیار نہ ہوں مگر اہل ایمان ذراسی مصلحت سے ان کے ساتھ موالات کرنے لگیں اس فرق کو بھی قرآن نے بیان کیا ہے۔

هَا أَنْتُمْ أُولَاءِ تُحِبُّونَهُمْ وَلَا

ہاں تم لوگ ایسے ہو کہ ان سے محبت کرتے ہو مگر وہ تم سے

يُحِبُّونَكُمْ ‏ — قطعاً محبت نہیں رکھتے۔

وَلَنْ تَرْضَىٰ عَنكَ الْيَهُودُ وَلَا النَّصَارَىٰ حَتَّىٰ تَتَّبِعَ مِلَّتَهُمْ (البقرۃ) — تم سے یہودی اور عیسائی اس وقت تک راضی نہیں ہو سکتے جب تک تم انکے مذہب کے بالکل پیرو نہ ہو جاؤ۔

اس تفصیل و وضاحت کے ساتھ نہ سہی لیکن اجمالی طور پر مسلمانوں کے دلوں میں اب سے کچھ مدت پہلے تک بے دین لا مذہب یورپ اور اس کے حیوانی تہذیب و نظام کے لیے نفرت موجود تھی۔ کافر فرنگی، نفرت و حقارت کے لیے ضرب المثل تھا لیکن ہم کو اس حقیقت کا برملا اظہار کرنا چاہئے کہ ان چالیس برس کے عرصے میں مغربی تعلیم و تہذیب نے بتدریج اس نفرت کو کم کرنا شروع کر دیا۔ یہاں تک کہ نفرت کے بجائے رغبت پیدا کر دی اس تبدیلی کی پوری ایک تاریخ ہے پہلے اس نے مسلمانوں میں احساس کمتری پیدا کیا، مغرب کا بالعموم تفوق ذہن پر قائم کیا۔ اس کا پورا نظام نہایت خوشنما اور آراستہ کر کے دکھایا۔ پھر اس کی محبت کو قلب و دماغ کی گہرائیوں میں اس طرح اتار دیا کہ تعلیم یافتہ مسلمان کے لیے اس سے انحراف مشکل ہو گیا۔ یہاں تک کہ سیاسی طور پر اگر اس کو اس سے اختلاف بھی ہوا تو ذہنی اور تہذیبی حیثیت سے اس کا رابطہ اس سے قائم رہتا ہے۔ رفتہ رفتہ مسلمان کی ذہنیت اتنی تبدیل ہو گئی کہ اس کو دنیا میں اگر کوئی حلیف اور سرپرست نظر آتا ہے تو صرف یورپین طاقت! اس نے اس حقیقت سے آنکھیں بند کر لیں جو روز روشن کی طرح ہے کہ اس کا اصلی اور عالمگیر حریف جس سے پہلی صدی ہجری سے اس چودھویں صدی ہجری تک مسلسل معرکہ آرائی رہی اور جو دنیا کی قیادت اور اس کی تعمیر میں اس کا اصلی رقیب اور مزاحم ہے وہ یورپ ہے۔ اس نے اس نکتہ کو بالکل نہیں سمجھا کہ جب تک یورپ کا سیاسی اقتدار دنیا میں قائم ہے۔ اس وقت تک دین کی دعوت پورے طور پر سرسبز نہیں ہو سکتی اور اس میں وہ طاقت جذب و کشش نہیں پیدا ہو سکتی۔ جس کی وہ مستحق ہے۔ جب تک یورپ تنہا دنیا کے لیے مقتدا اور پیشوا ہے اس وقت تک انسانی محاسن و فضائل اور اسلام کے معیار اخلاق کو فروغ نہیں ہو سکتا اس لیے اسلام کی اور بالتبع انسانیت کی عین مصلحت یہ ہے کہ یورپ کو منصب قیادت سے معزول کرنے کی کوشش کی جائے اور چونکہ مسلمان ہی دنیا کے اخلاق اور صلاح و فساد کے ذمہ دار ہیں اور وہی دنیا کے محتسب ہیں اس لیے یورپ کو اس منصب سے ہٹانا تنہا ان ہی کا فریضہ ہے اور یہ مسلمانوں ہی کا منصب ہے کہ یورپ کو رہنمائی و سرداری کے مقام سے ہٹا کر دنیا کی زمام قیادت خود سنبھالیں۔

لیکن افسوس ہے کہ مسلمان ان مسائل پر اس نقطۂ نظر سے غور ہی نہیں کرتے اور انکو اپنی صحیح حیثیت یاد ہی نہیں وہ یورپ کو پورے طور پر بے نقاب ہونے کے بعد بھی پہچان نہیں سکے ان کی نظر اب بھی محدود اور کوتاہ ہے اور وہ قومی مصلحتوں اور محدود جغرافی مسائل میں اس عالم گیر ضرورت کو بھولے ہوئے ہیں ــ اور وہ بہترین فرصت ضائع کر رہے ہیں جو تاریخ میں صدیوں میں پیش آتی ہے۔

بے عملی و بزدلی

(۲) مسلمانوں پر اس وقت ایک نظر ڈالنے سے ایک عام ذہنی و نفسی کیفیت نظر آتی ہے۔ جسے پورے طور پر الفاظ میں ادا کرنا مشکل معلوم ہوتا ہے لیکن شائد قریب تر الفاظ یہ ہوں کہ "کچھ کیے بغیر سب کچھ پا جانے کی خواہش" گویا استعارہ کی زبان میں مسلمان بیٹھے بیٹھے شطرنج کی ایسی چال چلنا چاہتے ہیں کہ دفعتاً بازی مارلیں اس میں شک نہیں کہ مسلمان سیاست میں دیر میں آئے۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ انھوں نے سیاست کا مفہوم محض انجمن آرائی تجاویز کی منظوری اظہار رائے اور زیادہ سے زیادہ اظہار ناراضگی سمجھا۔ جس سیاست کی بنیاد آج سے ۳۰۔ ۴۰ سال پہلے پڑی تھی اس کا رواج اور خمیر تمام تر یہی تھا۔ بلکہ درحقیقت یورپ میں بھی اس وقت (جب انتخاب اور جمہوری زندگی کا آغاز تھا) سیاست کا مفہوم اس سے کچھ زیادہ نہ تھا۔ مگر اس کے بعد سے تمام دنیا کے حالات بہت عجلت کے ساتھ بدل گئے، اب سیاست، نام جدوجہد اور ایثار و قربانی کا ہے۔ مگر مسلمانوں میں تبدیلی بہت دیر میں واقع ہوتی ہے اور عجیب بات ہے کہ ان کا سب سے زیادہ بدلنے والا طبقہ سب سے کم بدلنے والا ہے۔ اور سب سے زیادہ متحرک اور ترقی پسند جماعت سب سے زیادہ جامد اور ساکن واقع ہوئی ہے چنانچہ تحریک خلافت کے چند سالوں کو مستثنیٰ کرکے مسلمانوں کی پوری سیاسی تاریخ محض جلسوں تقریروں، تحاریر بیانات، وفود اور یادداشتیاں (میمورنڈم) کی روداد ہے انھوں نے مغربی سیاست کا جو سبق یاد رکھا ہے وہ صرف یہ کہ سیاست نام ہے دماغی ذہانت قانونی قابلیت سیاسی حاضر دماغی اور حسن تقریر کا۔ لیکن وہ بھول گئے ہیں کہ یہ مجلسی (پارلیمنٹری) سیاست کے لیے تو مفید ہے مگر خارجی اور عملی سیاست اور انقلابی جدوجہد کچھ اور چاہتی ہے اور کبھی کبھی اس کی ضرورت بھی پیش آتی ہے۔

اس تربیت کا نتیجہ یہ ہے کہ مسلمانوں میں اتنی ذہنی پستی پیدا ہوگئی ہے کہ وہ شماتت (دشمن کی مصیبت پر خوشی) پر اتر آتے ہیں۔ تو بعض حد تک گردش زمانہ کا انتظار ان کا شیوہ

ہو گیا ہے۔ اخلاقی طاقت اتنی کمزور ہو گئی ہے کہ وہ دوسروں کی جرأت وجانبازی اور ایثار و قربانی کا اعتراف بھی نہیں کر سکتے اور اس کے ماننے کے لیے بھی تیار نہیں کہ کوئی قوم کسی صحیح یا غلط مقصد کے لیے کوئی قربانی کر رہی ہے چہ جائے کہ ان میں اس سے اپنے صحیح اور بلند مقصد کے لیے جدوجہد اور قربانی کا جذبہ پیدا ہو۔

یہ صورت حال بھی تشویش کی باعث ہے اس کا سبب یہ ہے کہ مسلمانوں پر اپنی کمزوری اور ناتوانی کا احساس اتنا طاری کر دیا گیا ہے کہ وہ اپنے کو کسی جدوجہد اور قربانی کا اہل نہیں سمجھتے اور کسی قسم کے خطرات کے لیے قطعاً تیار نہیں۔ انھوں نے یقین کر لیا ہے کہ مسلمان خربوزے کی طرح ہیں۔ جس کے لیے ہر حال میں خطرہ ہی خطرہ ہے۔ اس لیے نہ وہ چھری پر گرنے کو تیار ہیں اور نہ چھری کو اپنے اوپر گرنے دینا چاہتے ہیں نیز ان کو دوسری طاقت پر اعتماد کرنے کا ایسا عادی کر دیا گیا ہے۔ کہ وہ خدا پر بھروسہ کرنے اور اعتماد علی النفس کی دولت سے محروم ہوتے جارہے ہیں یہ صورت حال وقتی اور عارضی نہیں ہے۔ اندیشہ ہے کہ کہیں ان حالات میں مسلمانوں کی مجاہدانہ روح اور ان کا جذبہ سرفروشی ایک مدت طویل کے لیے سرد نہ ہو جائے اور وہ توکل علی اللہ اور پھر اعتماد علی النفس کے جوہر سے محروم نہ ہو جائیں۔ یہ مسلمانوں کا اتنا بڑا نقصان ہے کہ اس کی تلافی آسانی سے ممکن نہ ہو گی۔

مسلمانوں کو اپنے آپ سے مایوسی اور اعتماد علی الغیر، اپنی کمزوری کا ضرورت سے زیادہ احساس اور دوسروں کی طاقت کا ضرورت سے زائد اندازہ، اور اقلیت واکثریت کے مسائل سے شب وروز کا یہ انہماک، انگریزی تعلیم و تہذیب اور مغربی سیاست کا نتیجہ ہے جو مسلمانوں کو ایک جامد قوم دیکھنے کی عادی ہے اور جو اعداد کے طلسم سے کسی طرح نکل نہیں سکتی اور جو ایمان و توکل کی دولت سے محروم ہے اس زہر کا تریاق قرآن و حدیث کی اشاعت ہے۔ جب تک مسلمان کی سیاست قرآن و حدیث پر مبنی تھی اور اس کے دماغ و دل اور روح پر ان کا اثر تھا۔ اس میں اتنا عزم و توکل اور خدا کے وعدوں پر اتنا بھروسہ تھا کہ اس سے خارق عادت واقعات صادر ہوتے تھے۔ محمد بن قاسم فاتح سندھ اور طارق بن زیاد فاتح اندلس کے واقعات کے یاد دلانے کی ضرورت نہیں۔ قرآن کی آیت ہے۔

لَا تَهِنُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا وَاَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ -	نہ سست پڑو اور نہ غمگین ہو تمہیں بالا و برتر ہو اگر تم مومن ہو۔

اور:—

کَمْ مِّنْ فِئَةٍ قَلِیْلَةٍ غَلَبَتْ فِئَةً کَثِیْرَةً بِاِذْنِ اللّٰہِ وَاللّٰہُ مَعَ الصّٰبِرِیْنَ — کتنی ہی چھوٹی جماعتیں اللہ کے حکم سے بڑی جماعتوں پر غالب آگئیں اور اللہ صابروں کے ساتھ ہے۔

جن لوگوں کے سامنے رہتی تھیں اور ان کا اس پر ایمان تھا انھوں نے مٹھی بھر جماعتوں سے ملکوں کو فتح کرلیا اور وہاں کی تہذیب، زبان و معاشرت کو بالکل بدل دیا۔ آج بھی صرف قرآن و حدیث کی اشاعت ہی مسلمانوں میں اعتماد اور غلبہ کی طاقت پیدا کرسکتی ہے۔

صحابہ کرام اور مجاہدینِ اسلام کے حالات و واقعات کی اشاعت بھی اس نقطۂ نظر سے بہت ضروری ہے خصوصاً ماضی قریب کے عالی ہمت مجاہدین کے سوانح و حالات مثلاً حضرت سید احمد شہید۔ مولانا اسمٰعیل شہید۔ شیخ سنوسیؒ، محمد بن عبدالکریم ریفی نے قریب تر ماضی میں نہایت قلیل طاقت اور ذخائر کی بہت تھوڑی تعداد کے ساتھ بڑی سلطنتوں کا مقابلہ کیا۔ اور ایمان کی طاقت اور عزم و توکل کا اعلیٰ مظاہرہ کیا جو لوگ سیاسی تحریکوں سے ہٹ کر مسلمانوں میں تعمیری اور تعلیمی کام کررہے ہیں ان کو اس ضرورت کی طرف جلد متوجہ ہونا چاہیے کہ یہ مسلمانوں کی کسی سیاسی خدمت سے کم اہم کام نہیں ہے، بلکہ یہ مسلمانوں کی سیاست کی صحیح بنا ہے اور اسی پر ان کے مستقبل کی تعمیر ہوگی۔

غیر مشروط اطاعت

(۴) مسلمانوں کا ایک بہت بڑا جوہر جس نے کسی غلط چیز کو عام طور پر مسلمانوں پر مسلط ہونے سے روکا اور قیادت کی کسی کمزوری سے یا شخصی رائے اور فیصلہ کی غلطی کی وجہ سے ان کو ہلاک ہونے سے محفوظ رکھا وہ ان کی آزادئ رائے اور آزادئ ضمیر کا جوہر یا غلط چیز سے انکار کر دینے کی طاقت اور شریعت کا یہ زریں اصول تھا کہ۔

لا طاعۃ لمخلوق فی معصیۃ الخالق — خدا کی نافرمانی میں کسی مخلوق کی اطاعت صحیح نہیں۔

اسی کا مظاہرہ تھا کہ حضرت عمرؓ کو برسر منبر ایک بڑھیا اور عرب کا ایک بدو ٹوک دیتا تھا اور اس کے سامنے وہ سر جھکا دیتے تھے اور اسی کا نتیجہ تھا کہ مسلمانوں کی شخصی سلطنت کے بڑے سے بڑے دورِ استبداد و جبر میں بھی مسلمانوں کی آزادئ رائے کبھی سلب نہیں ہوئی اور بادشاہوں کے غلط فیصلوں اور خلفاء کی غلطیوں کے خلاف علمائے وقت نے ہمیشہ آواز بلند کی جس سے

دین و شریعت اور مسلمانوں کے عام مزاج و طبائع میں تحریف نہیں ہو سکی۔ حضرت عبداللہ بن عمر سعید بن المسیب، حسن بصری سعید بن جبیر امام مالک، امام ابوحنیفہ، امام احمد بن حنبل کے واقعات تاریخ اسلام میں روشن رہیں گے۔

اسلام میں مطلق و غیر مشروط اطاعت صرف اللہ و رسول کی ہے۔ باقی کسی انسان کی اطاعت غیر محدود اور غیر مشروط نہیں ہے۔ بلکہ اس کی اطاعت اس وقت تک ہے جب تک وہ اللہ و رسول کی اطاعت کرتا ہے کسی خلاف شریعت فیصلہ اور کسی ایسے حکم کی تعمیل میں جس سے دین و امت کو یقینی طور پر نقصان پہنچتا ہو اطاعت جائز نہیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مرتبہ مجاہدین کی ایک جماعت پر ایک صحابی کو سردار بنایا اور لوگوں کو اس کی اطاعت تعمیل حکم کی تاکید کی۔ راستہ میں سردار کو اپنے ساتھیوں سے کچھ شکایت پیدا ہو گئی۔ اس نے لوگوں کو حکم دیا کہ لکڑیاں جمع کرو، پھر اس میں آگ لگائی اور الاؤ دہکا دیا۔ پھر لوگوں سے کہا کہ تمہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے میری اطاعت و تعمیل حکم کی تاکید نہیں کی تھی؟ لوگوں نے اقرار کیا اس نے کہا تو پھر میرا حکم ہے کہ اس آگ میں کود پڑو۔ لوگوں نے اس سے انکار کر دیا اور کہا کہ خودکشی حرام ہے، اور فعل حرام میں آپ کی اطاعت ہمارے لیے ضروری نہیں۔ اس نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے شکایت کی آپ نے لوگوں کے کام کی تصویب فرمائی اور فرمایا کہ اگر یہ لوگ اس آگ میں کود جاتے تو ہمیشہ اسی میں رہتے۔ لیکن اب چند سالوں سے مسلمانوں میں سیاسی شخصیت پرستی اس درجے کو پہنچ گئی ہے کہ وہ اپنے قائدوں کے احکام اور فیصلوں کی کسی قسم کی تنقید کے لیے تیار نہیں اور ہر غلط اور صحیح حکم کی تعمیل اور اس کی توجیہ و تاویل اپنا اسلامی فریضہ سمجھنے لگے ہیں۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ قائد کے احکام کی تعمیل بھی ضروری ہے اور مسلمانوں میں رائے و اختلافات کی آزادی بعض دور میں بے اعتدالی، اور نوضویت (انارکی) یا خارجیت کی حد تک پہنچ گئی ہے لیکن جب کسی قائد مسائل اسلامیہ میں اسلامی بصیرت اور رسوخ نہ رکھتا ہو اور سیاست اسلامی میں تقویٰ و تدین کے ساتھ تفقہ و اجتہاد کی قابلیت اس کو حاصل نہ ہو اس وقت اپنے کو کالمیت فی ید الغسال (مردہ بدست زندہ) کے طور پر اس کے حوالے کر دینا صحیح نہیں ہے۔ اور بڑے عظیم دینی و سیاسی خطرات کا باعث ہے۔

ابتذال و اشتعال

(۵) یہ چند گزارشات پہلو ہیں جو ہم کو اس وقت کم سے کم ہندوستان کے مسلمانوں کی قومی سطح پر نمایاں نظر آتے ہیں اور جو سیاسی جماعتوں اور مسلکوں کی حمایت یا مخالفت کے جذبہ سے بالکل علیحدہ ہو کر پیش کئے گئے ہیں ان کا محرک اسلامی احساس اور درد دلی کے سوا کچھ نہیں۔ اسلامی جرائد و رسائل سے گزارش ہے کہ وہ اس مضمون کو بجنسہٖ یا اختصار کے ساتھ شائع کرکے ایک بڑی اسلامی خدمت انجام دیں یا ان مقاصد و معروضات کو (خواہ کچھ تنقید اور اختلاف کے ساتھ) اپنے طور پر اپنے الفاظ و مضامین میں پیش کریں۔

صحیح تعلیم اور اخلاقی و ذہنی سیاسی تربیت کی کمی اور خود غرض جاہ طلب رہنماؤں کی ناعاقبت اندیشی اور بے ضرورت اشتعال انگیزی کی وجہ سے نیز صحافت و سیاست و ادب کی پستی اور سوقیانہ طرز تحریر کی وجہ سے ایک عرصے سے ابتذال و اشتعال ہندوستانی مسلمانوں کا عام مزاج بن گیا ہے۔ حالات کی معمولی سی تبدیلی اور خفیف سی ناراضگی کے موقع پر دماغی توازن کھو دینا اور ضبط و اعتدال اور انصاف کا دامن ہاتھ سے چھوڑ دینا اور ہر اختلاف میں مخالفت کی عامیانہ اور ادنیٰ سطح پر اتر آنا۔ اور اختلاف رائے رکھنے والوں کی مذمت اور ہجو میں کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھنا اور لغت کا وہ سارا ذخیرہ جس کو میر جعفر زٹلی اور سودا نے بھی ہاتھ نہیں لگایا بے تکلف استعمال کر دینا ایک قومی شعار بن گیا ہے ان آخری پیغمبر رسول میں کتاب و شریعت اور اسوۂ رسول رکھنے والے مسلمانوں نے جو ولا یجرمنکم شنآن قوم علیٰ ان لا تعدلوا اعدلوا ھو اقرب للتقویٰ (لوگوں کی دشمنی تمھیں اس پر آمادہ نہ کرنے پائے کہ تم انصاف کا دامن ہاتھ سے چھوڑ دو انصاف کرو وہ خدا ترسی کے زیادہ قریب ہے۔) اور ولا تنابزوا بالالقاب (اور ایک دوسرے کو برے لقب سے نہ پکارو) کے مخاطب تھے۔ ابتذال و اشتعال اور باہمی اہانت و تذلیل کا وہ نمونہ پیش کیا ہے جو تمام عیوب و نقائص کے باوجود یورپ کے جاہل اور منکر خدا قوموں اور ہندوستان کے خدا ناشناس اور آخرت فراموش ہندوؤں میں نہیں مل سکتا۔

جیسا کہ عرض کیا گیا اس کا ایک سبب صحیح تعلیم کی کمی اور اخلاقی و ذہنی و سیاسی تربیت کا افسوسناک فقدان ہے۔ جو لوگ سیاسی تلاطم اور طغیانیوں کی وجہ سے سطح پر آگئے ہیں۔

ان میں سے اکثر تعلیم یافتہ مشتغل مزاج اور دینی تعلیمات سے محروم ہیں۔ قوم بھی عرصہ دراز سے دینی تعلیم اور اخلاقی تربیت سے محروم چلی آرہی ہے اس کا نتیجہ یہ ہے کہ اس بارے میں مزاجِ اسلام کا پورا توازن ہے اور متاع کارواں کے ساتھ کارواں کے دل سے احساسِ زیاں بھی رخصت ہو رہا ہے۔

آج ہندوستانی مسلمانوں کی زندگی میں سیاست و قومیت کی جو اہمیت اور ان کے قلب و دماغ اور اعصاب پر سیاسی حالات و اختلافات کا جو اثر ہے اس سے زیادہ گزشتہ دور میں مسلمانوں کی زندگی اور ان کے قلب و دماغ پر دینی مسائل و اختلاف کا اثر رہ چکا ہے سیاسی مسلکوں اور جماعتوں نے ان کی زندگی اور دلچسپیوں میں ابھی اتنی وسیع جگہ نہیں گھیری اور اتنی سنجیدگی اور گہرائی نہیں حاصل کی جتنی اس دور کے بعض معرکۃ الآرا مسائل کو حاصل رہ چکی ہے۔ علمی و درسی حلقے انھیں مباحث و مناظروں سے گرم تھے۔ گھروں میں یہی چرچے تھے۔ مجلسوں میں یہی تذکرے۔ لیکن اس وقت کا پورا علمی ذخیرہ ہمارے سامنے ہے اور وہ شہادت دیتا ہے کہ انھوں نے کبھی ضبط و اعتدال کا اور ثقاہت و وقار کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑا اور رکاکت و ابتذال کی اس سطح پر نہیں آئے جس سطح پر اس وقت کے بلند پایہ اہلِ سیاست آچکے ہیں۔

اس سلسلے میں سیاسی رہنماؤں پر بڑی ذمہ داری ہے ان میں سے ایک جماعت قومی جوش اور کسی سیاسی مسلک و خیال کی حمایت میں اور ایک جماعت محض اپنے ذاتی اغراض و جاہ و اعزاز کے لیے اپنی حریف جماعت یا قیادت کو نیچا دکھانے کے لیے بڑی بے دردی کے ساتھ عوام کے جذبات اور ملک کی صحافت کو استعمال کرتی ہے۔ اور قوم کے اعصاب کو بے جان ڈوریوں کی طرح کھینچتی اور ڈھیلا کرتی رہتی ہے۔ موقع بے موقع اشتعال و ہیجان پیدا کر کے عوام کے ہاتھوں اپنے مخالفوں کی تذلیل و اہانت کرا کے اخبار نویسوں کے قلم سے اور مقرروں کی زبان سے ہجو و طنز کے مبتذل اور اشتعال انگیز الفاظ استعمال کرا کے قومی مزاج و مذاق کے بگاڑ کا سامان کرتی ہے۔ اور ناعاقبت اندیش قوم کے فرزندوں کے ہاتھوں میں گویا دھاردار اور خطرناک اوزار دیتی ہے جن کے متعلق یہ کبھی اطمینان نہیں کیا جا سکتا کہ وہ کب اور کس موقع پر ان کو استعمال کریں گے یہ حضرات وقتی جوش میں اس بات کو بالکل بھول جاتے ہیں کہ دوسرے وقت جب یہ عوام (جن کا ہمیشہ راضی رکھنا بہت مشکل ہے) ان سے ناراض ہو جائیں گے تو یہ سارے حربے اور الفاظ کا یہ سارا ذخیرہ ان کے خلاف صرف کریں گے۔

ان حضرات سے اس قومی جوش میں دو بڑی مہلک غلطیاں ہوتی ہیں ایک یہ کہ میں اختلاف

رائے کی گنجائش ختم کر دینا چاہتے ہیں۔ اور بجبر و بزور قوت ایسے مسائل میں جن پر کفر و ایمان، ہلاکت و نجات کا انحصار نہیں ایک نقطہ پر لے آنا چاہتے ہیں یہ فسطائیت اور خارجی ذہنیت دینی حیثیت سے بھی ایک فتنہ ہے۔ اور اس لحاظ سے بھی ایک خطرہ ہے کہ اس سے امت سے فکری استقلال اور اجتہاد و تنقید کی قوت سلب ہوتی ہے اور ملت پر ایک ذہنی جمود اور بے شعور تقلید کی فضا طاری ہو جاتی ہے۔ ایسے جبری اور غیر طبعی وحدت خیال کی صورت میں اگر غلطی ہو جائے تو پھر قوم کی کشتی کو ڈوبنے سے کوئی بچا نہیں سکتا۔ کہ صرف ایک ناخدا ہوتا ہے اور وہ دوسرے اشخاص جو ناخدائی کی صلاحیت رکھتے ہیں دست و پا بستہ اور پنبہ بدہن ہوتے ہیں، جو نہ بول سکتے ہیں نہ ہاتھ پاؤں چلا سکتے ہیں۔ امت مسلمہ کی راہ یقیناً نہ انتشار و نوضویت (انارکزم) کی راہ ہے نہ جبریت و فسطائیت (فیسزم) کی راہ۔

دوسری خطرناک غلطی یہ ہو رہی ہے کہ عوام کو غلط فہمی ہوتی جا رہی ہے کہ ان کی رائے اور خواہش اصل اور معیار ہے اور خواص اور اہل علم و اہل دین کو بھی اسی کے مطابق چلنا چاہیے وہ رہنماؤں، علماء اور اہل فکر کو اپنی رائے اور خواہشات کے مطابق چلانا چاہتے ہیں اور جو اس میں ذرا بھی تامل کرے اس کے لیے وہ بڑی سے بڑی سزا تجویز کرتے ہیں جو قرون وسطیٰ کا محکمہ احتساب (انکویزیشن) اپنے نزدیک ملاحدہ اور آزاد خیالوں کو دیا کرتا تھا۔ یہ عوام چاہے ناچار مقتدی تو بن جاتے ہیں، مگر مولانا محمد علی مرحوم کے بقول مقتدی بن کر نماز خود پڑھانا چاہتے ہیں اس غلط روی کی وجہ سے قومی و مذہبی زندگی میں جو ابتری و بے نظمی اور انتشار پیدا ہو گا اس کا تصور کرنا کچھ مشکل نہیں۔

سب سے بڑی ذمہ داری صحافت پر ہے صحافت قوم کی سب سے بڑی امانت ہے جس کے لیے بڑی خدا ترسی اور تربیت و اہلیت اور فنی قابلیت شرط ہے۔ گذشتہ دور میں مصاحبوں اور ندیموں اور مشیروں اور وزیروں شاعروں اور بذلہ سنجوں اور ہمدم و دمساز رفیقوں اور دوستوں کو مزاجوں میں وہ رسوخ اور دل و دماغ پر وہ دسترس حاصل نہیں تھی جو اس وقت اخبار نویسوں کو قوم کے مزاج اور مذاق پر حاصل ہے شاعری، ادب و خطابت، وعظ و احتساب کی ساری طاقتیں صحافت کی طرف منتقل ہو گئی ہیں۔ اگر یہ صحیح ہاتھوں میں ہے تو پوری قوم کے مزاج اور مذاق کی اصلاح تصورات کی تصحیح اور اخلاقی تربیت اور ذہنی ترقی کے لیے اس سے زیادہ موثر و مفید اور اس سے زیادہ وسیع اور عمومی راستہ نہیں اور اگر غلط ہاتھوں میں ہے تو

راس زہر کا تریاق نہیں۔

بدقسمتی سے بہت سے لوگوں نے صحافت کا پیشہ اختیار کر لیا ہے جن میں نہ دینی و اخلاقی اہلیت ہے نہ ذہنی استعداد، اصول و کردار کے لحاظ سے قطعاً غیر ذمہ دار، فن کے لحاظ سے خام نوشق اور ناآزمودہ کار۔ زبان و ادب کا معاملہ اہل زبان کے لیے بھی اتنا آسان نہیں جتنا سمجھا جا رہا ہے۔ محض الفاظ کی نشست ادب و صحافت نہیں، مناسب الفاظ کو مناسب محل پر استعمال کرنا اور الفاظ کا انتخاب بڑی مشق اور زبان کی قدرت کا طالب ہے۔ ہر زبان میں الفاظ کیلئے بھی مدارج اور گویا درجہ حرارت و برودت ہے۔ بعض الفاظ روز آنہ اور ہر موقع پر استعمال ہو سکتے ہیں۔ بعض الفاظ کے صحیح استعمال کی برسوں میں نوبت آتی مشکل ہے وہ ایسے مواقع کے لیے وضع ہوئے ہیں جو شاذ و نادر پیش آتے ہیں اور ایسا اثر پیدا کرتے ہیں۔ جو اہم نتائج پیدا کرتا ہے۔ عام اور معتدل حالات کیلئے علٰحدہ الفاظ ہیں۔ غیر معمولی اور انتہائی صورت حال کے لیے علٰحدہ الفاظ ہیں۔ نوشق اخبار نویس یا مشتعل مزاج ادیب پہلے ہی موقع پر وہ آخری اور انتہائی الفاظ استعمال کر دیتا ہے جس کو واضعین لغت نے خاص مواقع کے لیے وضع کیا تھا۔ اور ایک ایسی غلط اور غیر واقعی فضا پیدا کر دیتا ہے جس کا وہ شخص یا صورت حال ہرگز مستحق نہیں جس کے لیے یہ الفاظ استعمال ہوئے ہیں۔ معمولی غلطی یا معمولی اختلاف کے موقع پر بیزاری اور لعنت کے آخری الفاظ ۔ ح کے موقع پر عقیدت و عظمت کے وہ القاب جو پیشواؤں اور اولیا امت کے متعلق استعمال ہوتے ہیں یا سیاسی مسلک سے معمولی اختلاف رکھنے والوں کے لئے وہ الفاظ و کلمات جو یزید اور شمر کے لیے بھی اس امت کے محتاط لوگوں نے استعمال نہیں کئے۔ ان اخبارات کا دن رات کا کھیل ہے۔ جس کا نتیجہ یہ ہے کہ الفاظ اہمیت اور قوت کھوتے جا رہے ہیں۔ اور کم علم ناظرین کا خزانہ معلومات ایسے ہی الفاظ سے بھرتا جا رہا ہے اور وہ اپنی تقریروں تحریروں اور زبانی گفتگو میں ان کو بے تکلف استعمال کرتے ہیں اور روز آنہ زندگی میں ابتذال و اشتعال کا عنصر بڑھتا جاتا ہے۔ اس غیر ذمہ دار غیر ثقہ اور ناقص صحافت کی وجہ سے بہت بڑی مقدار میں آنکھوں کے راستہ لاکھوں مسلمان ناظرین کے ذہن و دماغ میں پھر قلب میں اور مزاج و مذاق میں روزانہ اور صبح و شام ایسا زہر پہنچ رہا ہے جس کا کوئی تریاق نہیں ہوتا گنتی کے چند اخبارات و رسائل اس زہر کا تریاق بہم پہنچاتے ہیں تو قوم کی بد مذاقی

بتذال پسندی اور تفریح طلبی کی وجہ سے ان کو وہ مقبولیت و شہرت حاصل نہیں جسکے وہ مستحق ہیں — یہ مسموم اد صحافت قلب و نظر کو رفتہ رفتہ ایسا ماؤف کر دیتی ہے کہ کسی سنجیدہ متین اور صحیح چیز کو وہ پسند نہیں کر سکتے اور اس کے قبول کرنے اور ہضم کرنے سے وہ مستقل طور پر معذور ہو جاتی ہے بعض اخبارات و رسائل کو اس بارہ میں کمال حاصل ہے کہ کچھ مدت تک ان کو پڑھتے رہنے سے دماغ میں ایک خاص قسم کی ایسی کجی پیدا ہو جاتی ہے کہ کسی صحیح اور متوازن چیز کے نفوذ کرنے کی صلاحیت باقی نہیں رہتی۔ اور سیدھا سادہ اخبار بین دنیا کہ واقعات کو اشخاص کو اور دینی مسائل و احکام کو اخبار نویس ہی کی نظر سے دیکھنے لگتا ہے۔

ادبی رسائل کا حال ان اخبارات سے بدتر ہے۔ چند سنجیدہ علمی و ادبی رسائل کو چھوڑ کر سستے قسم کے کثیر الاشاعت رسائل جو نوجوانوں کے اخلاق اور زندگیوں کو اس سے زیادہ تباہ کر رہے ہیں جتنا طاعون اور وبائی امراض کسی ملک یا بستی میں پھیل کر انسانی نفوس کو تباہ کرتے ہیں۔ یا چنگیز و ہلاکو اپنے مفتوحہ ممالک میں تباہی و ہلاکت پھیلاتے تھے۔ دنیا نے شاید کبھی ایسا مجرمانہ اور ذلیل تجارت کا تجربہ نہیں کیا ہوگا جیسا کہ اس کاغذی تجارت کا ہو رہا ہے۔ جس کی قیمت قوم کو ماہوار یا ہفتہ وار نوجوانوں کے اخلاق، جذبات اور صحت و زندگی سے ادا کرنی پڑتی ہے۔

بد اخلاقی، بد ذوقی، عریانی و بے حیائی اور فسق و معصیت کے جراثیم گھر گھر پھیلے ہوئے ہیں۔ کوئی شہر قصبہ حتی کہ دیہات پہاڑوں کی چوٹیاں اور جلتی ہوئی لگا ڈیاں ان سے محفوظ نہیں بے حیائی کی اشاعت، حیوانی خواہشات و برہنگی کا جوش اور جنون پیدا کرنے اور فسق و فجور کو خوشنما اور دلپذیر بنانے اور سنجیدگی و معقولیت و شرافت اور اخلاق کو بے وقعت اور قابل مضحکہ قرار دینے میں ان رسائل نے جو کامیابی حاصل کی ہے وہ آج تک کسی تحریک و قوت کو حاصل نہیں ہوئی۔ اگر قوم میں اخلاقی شعور ہوتا، تو وہ ان نامہ سیاہ سوداگروں سے وہ سخت سے سخت محاسبہ کرتی جو سب سے بڑے قومی مجرموں سے کیا جانا چاہیے۔ لیکن وہ الٹی ان کی سرپرستی یا اپنی غفلت سے ان سے چشم پوشی کر رہی ہے اگر کچھ عرصے تک یہی حال رہا تو قوم اخلاق کی اس سطح پر پہونچ جائے گی جس پر فرانس اور یورپ کی بعض دوسری قومیں پہونچ گئی ہیں اور پھر اسلام کی،

سیاسیات حاضرہ میں دین کا اصلی مقام

مولانا محمد منظور نعمانی

کئی مہینے ہوئے ہمارے ایک بزرگ نے مسلم لیگ کے موجودہ سیاسی نظریہ کی حمایت میں ایک بیان دیتے ہوئے فرمایا تھا کہ سب سے بڑا اور اشتعال انگیز جھوٹ جو اس وقت بولا جا رہا ہے یہ ہے کہ مسلمانوں کی مستقل قومیت سے انکار کیا جا رہا ہے۔

لیکن فی الحقیقت اس سے بھی بڑا اور بہت بڑا جھوٹ اور فریب یہ ہے کہ موجودہ انتخابی کشمکش اور سیاسی تنازعہ کو اسلام و کفر کی جنگ یا دین و لادینی کا معرکہ قرار دیا جا رہا ہے در حقیقت یہ اختلاف اپنی اصل و بنیاد کے لحاظ سے خالص قومی نقطۂ نظر رکھنے والے اور اسی نقطۂ نظر سے سوچنے والے ہمارے لیڈروں کے دو سیاسی نظریوں کا اختلاف ہے۔ اس میں کسی جانب سے بھی دین و مذہب کو گھسیٹنا اور دین اور اسلام کو فریق قرار دے کر اس کے نام پر مسلمانوں سے اپلیں کرنا علاوہ جھوٹ اور فریب ہونے کے اسلام پر ایک طرح کا ظلم بھی ہے۔ اسلام اللہ کا مقدس دین ہے وہ اس سے بالاتر ہے کہ ایسے گھٹیا مقاصد کے لئے فریق جنگ ... پھر کیسی ستم ظریفی ہے کہ جو لوگ اس سیاسی معرکہ میں قائد اور کمانڈر ہیں وہ خود دین اور دینیات کو اگرچہ کوئی اہمیت اور وقعت نہیں دیتے مگر ان کے زیر کمان لڑنے والے پھر بھی اس جنگ کو اسلام و کفر کی جنگ قرار دیتے ہیں اور دین کے نام کی دہائیاں دے رہے ہیں۔ پنجاب کے میرے ایک دوست جو ہر طرح ثقہ اور قابل اعتماد ہیں اور دنیوی جاہ و منصب کے لحاظ سے بھی بہت بلند ہیں اور سیاسی مسلک کے لحاظ مسلم لیگی یا مسلم لیگ سے قریب تر ہیں خود انھوں نے راقم سطور سے اپنا یہ واقعہ بیان کیا کہ مسلم لیگ کے ایک لیڈر اعظم سے انھوں ایک ملاقات میں نماز کے لئے کہا اور نماز کی ضرورت اور دینی اہمیت ان پر واضح کی ... سب کچھ سننے کے بعد ان لیڈر اعظم صاحب نے کسی قدر برافروختہ ہو کر انگریزی میں فرمایا

"کیا وقت کا تقاضا ان باتوں کے لئے ہے"۔۔۔ اس جواب کے بعد بھی ہمارے ان مبلغ دوست نے بطرز احسن اپنی تبلیغ جاری رکھی اور ان کو بتلایا کہ اسلام میں نماز کی اہمیت تمام دوسری چیزوں سے زیادہ ہے اور آپ چونکہ اس وقت قوم کے سب سے بڑے لیڈر ہیں اس لئے قوم بھی یہ چاہتی ہے کہ آپ نماز پڑھیں۔"

ان لیڈر اعظم نے یہ سب سننے کے بعد ایک خاص انداز سے فرمایا۔۔۔"کیا مصطفیٰ کمال نماز پڑھتا تھا۔۔۔" یہ بھی واضح رہے کہ گفتگو کرنے والے ہمارے یہ دوست کوئی مولوی ملا نہیں بلکہ اونچے درجے کے جدید تعلیم یافتہ اور عالی منصب شخص ہیں مگر ساتھ ہی بڑے پکے اور خدا پرست مسلمان بھی ہیں۔ اس واقعہ سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ ہمارے جو سیاسی لیڈر یہ انتخابی جنگ لڑ رہے ہیں بلکہ جن کے لیے ہدایت وقیادت یہ سارا ہنگامہ ہو رہا ہے ان کی نظروں میں دین کی کیا قدر وقیمت ہے پھر دین کی یہ نا قدری یکطرفہ ہی نہیں ہے بلکہ دوسری طرف بھی اس طرح کی افسوسناک اور عبرتناک مثالیں ملتی ہیں۔۔۔ ایک صحبت کا ذکر ہے کسی ذکر کرنے والے نے صوبہ سرحد کے دو مشہور مسلمان کانگرسی لیڈروں کی لامذہبی اور ان کے لادینی خیالات کا ذکر کیا، مجلس میں ایک کانگرسی مسلمان بھی موجود تھے جو خود عامی قسم کے دیندار ہی نہیں ہیں بلکہ دین کے جاننے والے اور دینی شغل رکھنے والے ایک مولوی صاحب ہیں، انھوں نے اپنے ہم خیال ان سرحدی لیڈروں کی لادینی کو تسلیم کرتے ہوئے برجستہ کہا۔۔۔"بھئی جو کچھ بھی ہو ملک کے بہادر سپاہی ہیں اور بزدل عبادت گذار سے بہادر سپاہی ہی اچھا ہوتا ہے۔۔" اگر اس نقرہ کا تجزیہ کیا جائے تو حاصل یہی نکلے گا کہ دینداری اور عبادت گذاری تو دوم دسوم درجہ کی چیز ہے، اصل چیز ہے ملکی سیاست اور اس کے لیے قربانی کچھ ہے وہ لادینیت کے ساتھ ہی ملی جلی ہو۔۔۔"

واقعہ یہ ہے کہ موجودہ سیاست میں جو یورپ سے آئی ہوئی ہے "دین" اسی طرح نظر انداز کیا ہوا ہے۔ موجودہ سیاسی کشمکش کے بارہ میں بس زیادہ سے زیادہ جو کہا جا سکتا ہے۔ وہ یہی ہے کہ ایک طرف کچھ دیندار مسلمان بھی ہیں۔ کسی طرف بہت کم اور صرف پچھلی صفوں میں ہیں اور کسی طرف کچھ زیادہ اور اگلی صفوں میں بھی نمایاں۔۔۔ باقی رہا "دین" اور "اسلام" سو اس کو تو خواہ مخواہ ہی گھسیٹا جا رہا ہے جو بلا شبہ بڑے غلط اور ظالمانہ طریقے سے گھسیٹا جا رہا ہے۔

مجھے تو یقین ہے کہ قیامت کے دن جب "دین" مستغیث (مدعی) ہوگا کہ وہ اپنے ظالموں

کے خلاف عدالت الہیہ میں دعویٰ اور استغاثہ کرے تو ہمارے زمانہ کے ان چالاک لیڈروں کے خلاف اس کا دعویٰ بڑا سنگین ہوگا جو اسلام اور اس کی ہدایت و تعلیمات سے اپنا ذاتی تعلق بھی نہ رکھنے کے باوجود محض انتخابی مقاصد کے لیے اس کا نام استعمال کر رہے ہیں اور اس سراسر غیر دینی الکشن جنگ میں اس کو فریق بنائے پھر رہے ہیں۔

بقیہ مضمون صفحہ ۔ ۵۴

کاسمہ لطیف السیرۃ فی خلقۃ
(سعایہ فی کشف ما فی شرح الوقایۃ جلد اول مقدمہ ۴)

آج کا نوجوان مسلمان فرنگی ڈگری کا بھوکا اپنے ماضی بعید کی نہیں ماضی قریب کی اس سچی حکایت کو سن رہا ہے؟ اور اس پر یقین کرے گا؟ (ماخوذ از "صدق")
(الفرقان رجب ۱۳۶۲ھ)

محمد منظور نعمانی

قول و عمل کا تضاد

مسلمانوں کی زندگی میں نفاق اور قول و عمل کے تضاد کی عجیب و غریب مضحکہ خیز یا تکلیف دہ مثالیں آئے دن سامنے آتی رہتی ہیں اور اتنی کثرت سے آتی ہیں کہ اگر مسلمانوں کی اجتماعی زندگی سے تعلق رکھنے والا کوئی شخص روزمرہ کے صرف اپنے ہی اس سلسلہ کے تجربات اور مشاہدات کی ڈائری لکھے تو ہر مہینے کی ڈائری ایک پوری کتاب بن سکتی ہے۔ ذرا غور تو کیجئے۔

دین سے بے بہرہ اور دینی احکام کے کھلے باغی بلکہ اپنی پرائیویٹ صحبتوں میں دینی شعائر تک کا مذاق بنانے والے ہمارے قومی لیڈروں کا اسلام ہی کے نام پر لوگوں کو اپنی طرف بلانا اور اسلام کے درد سے ایسی بیقراری اور بے چینی اپنی تقریروں اور تحریروں میں ظاہر کرنا جتنی کہ قرن اول کے مسلمانوں نے بھی نہ کی ہوگی کیا یہ نفاق اور قول و عمل کے تضاد کی ایسی مثال نہیں ہے جس کا تماشا آج کل دیکھ ایک دن میں کئی کئی دفعہ ہم نہ دیکھ لیتے ہوں۔

علیٰ ہذا اسلام اور مسلمانوں کے ساتھ غیروں کے واقعی یا فرضی معاندانہ طرز عمل پر کانفرنسوں کے اسٹیجوں پر یا اخباروں کے کالموں میں خوب رونا رلانا مگر خود اپنی اولاد کو قرآن اور نماز تک سے دور رکھنا —— اسی طرح اسلام کی بہتری اور سربلندی کو مقصد قرار دے کر جلسے کرنا اور فرض نمازوں کا وقت آنے پر بھی سامعین اور مقررین سبھوں کا نماز کے لئے نہ اٹھنا۔ ایسے ہی "اللہ اکبر" اور "اسلام زندہ باد" کے نعرے لگاتے ہوئے ہمارے قومی جلوسوں کا ٹھیک نمازوں کے اوقات میں مسجدوں کے سامنے سے بالکل غیر مسلموں کی طرح نمازوں سے بے پرواہ ہو کر گذرتے چلے جانا۔ اسی طرح قرآن مجید کی حدود کو اپنے عمل سے توڑتے ہوئے اور شعبۂ زندگی میں علی الاعلان قرآنی احکام کو پامال کرتے ہوئے قرآنی حکومت یا حکومت الٰہیہ کو اپنا نصب العین بتانا اور اس پر دھواں دھار تقریریں کرنا اور زوردار مضامین لکھنا کیا سب نفاق اور تضاد عمل کے وہ نمونے نہیں ہیں جو روزمرہ ہماری نظروں کے سامنے

ڈراتے رہتے ہوں۔

علیٰ ہذا اپنی حیثیت پارٹی کے کسی دین سے بیگانہ اور دینی احکام وہدایات کو پامال کرنے والے کسی لیڈر کی کج خیالیوں اور بداعمالیوں کے خلاف خوب گرجنا خوب برسنا اور مسلمانوں کی رائے کو اس کے خلاف کرنے کے لیے اس کی ایک ایک چیز کو خوب اچھالنا ـــــ لیکن بالکل انھیں صفات کے جو لیڈر اپنی پارٹی میں ہوں ان کی گمراہیوں اور بداعمالیوں کے متعلق کبھی ایک حرف بھی زبان پر نہ لانا گویا یہ وہ دوغلا پن اور طرز عمل کا وہ افسوسناک تضاد نہیں ہے جس میں بہت سے اچھے اچھے بھی عام طور سے مبتلا ہیں۔

اسی طرح ربیع الاول کے مہینے میں شہروں کے آوارہ عناصر کا اپنے ایک ایک عمل اور ایک ایک ادا میں اسوۂ نبوی اور ہدایاتِ محمدی سے بغاوت کرتے ہوئے سیرتی جلوس کی شکل میں سیرۃ النبیؐ کے ساتھ اپنے عشق ومحبت اور وابستگی کے مظاہرے کرنا اور پھر ان مظاہروں میں بھی اسلامی تعلیمات اور نبوی ہدایات کو پامال کرنا۔ اگر یہ سب نفاق نہیں تو کیا ہے۔

لیکن کل، (۲۱ فروری ۱۹۷۴ء) یہاں بریلی ہی میں بازار سے گزرتے ہوئے اس طرح کے نفاق اور تضادِ عمل کی جو مثال دیکھی، واقعہ یہ ہے کہ ابتک کی سیکڑوں ہزاروں دیکھی ہوئی مثالوں میں، وہ میرے لیے سب سے زیادہ تکلیف دہ ہوئی۔ سرِ بازار ایک سینما کے پھاٹک پر سرخ رنگ کا لمبا چوڑا ایک خوبصورت بورڈ آویزاں دیکھا جس پر جلی قلم سے لکھا ہوا تھا ←

ﷺ محمد کی محمد سے وفا تو نے تو ہم تیرے ہیں یہ جہاں چیز ہے کیا لوح و قلم تیرے ہیں
سینما انب، جگت سینما بریلی

سینما کی طرف سے سینما کے پھاٹک پر یہ بورڈ اس طرح آویزاں دیکھ کر جتنی تکلیف ہوئی یاد نہیں آتا کہ نفاق اور تضادِ عمل کے کسی اور نمونے سے کبھی اتنی تکلیف دل کو ہوئی ہو۔ معلوم نہیں عجائبات کی اس دنیا میں ابھی کیا کیا اور دیکھنا مقدر رہے۔

اوپر کی سطریں لکھ کر ختم کی جا چکی تھیں اور کتابت کے لیے بھی دی جا چکی تھیں کہ بریلی ہی کا چھپا ہوا ایک اشتہار پر سرِ نظر پڑا اس میں لکھا ہوا ہے۔ (باقی صفحہ ۸۶ پر)

محمد منظور نعمانی

الیکشن کے طوفان پر ایک نظر

الیکشن کا طوفان اپنی ساری ہنگامہ خیزیوں کے ساتھ کسی نہ کسی طرح گزر گیا۔ بحران جنون کے ان ایام میں جن کو سوچنے سمجھنے کی کوئی فرصت نہیں ملی کاش وہ اب ہی غور کریں کہ اس ہنگامہ میں ہماری سیاسی پارٹیوں نے کس قدر بیدردی اور بے فکری کے ساتھ شرافت اور دیانت کو ذبح کیا ہے اور کتنی ناخدا ترسانہ جسارت کے ساتھ اسلام کے پورے اخلاقی نظام کو اپنے پاؤں سے روندا ہے۔

اپنی اپنی پارٹیوں اور اپنے اپنے امیدواروں کے حق میں اور فریق مخالف کے خلاف اس قدر بے پناہ اور بے باکانہ جھوٹ بولا گیا اور جھوٹ لکھا گیا کہ اس آسمان کے نیچے اور اس زمین کے اوپر شاید کسی جاہلی دور میں بھی اتنا بے حساب جھوٹ کسی کافر و مشرک قوم نے نہ بولا ہوگا۔

اچھوں اچھوں پر ایسے ایسے ناپاک اور محض بے بنیاد بہتان لگائے گئے اور ایک دوسرے کا وقار گرانے اور رسوا کرنے کی ایسی ایسی ذلیل کوششیں کی گئیں کہ انسانیت پناہ مانگ گئی۔ ناروا طنز و عیب چینی غیبت و بدگوئی گالم گلوچ اور فتنہ و فساد کی اتنی گرم بازاری رہی کہ اس سے پہلے غالباً کبھی بھی ان شیطانی حرکات کا ظہور اتنے وسیع پیمانہ پر اس دنیا میں نہ ہوا ہوگا۔

سادہ لوح اور جاہل عوام کے جذبات میں خاص پرفریب پروپیگنڈے کے ذریعے ایسا ہیجان پیدا کیا گیا کہ بھائی بھائی کا دشمن ہوگیا اور عوام اپنے مقتداؤں اور رہنماؤں کی پگڑیاں اچھالنا اور داڑھیاں نوچنا کار ثواب سمجھنے لگے۔

موقع بہ موقع لاکھوں روپے کی رشوتیں چلیں اور دینداروں کے جن فرزندوں دولت کا کوئی حصہ کبھی راہ خدا میں کبھی نہ نکلا اور کسی دن بھی غریبوں مسکینوں

کے کام نہ آیا۔ انھوں نے اس الکشن میں روپئے کا وہ سیلاب بہایا اور دریادلی کا وہ نمونہ پیش کیا کہ حاتم کی روح بھی شرما گئی۔

بےجا کمزوروں اور زیردستوں کو ڈرا ڈرا اور دھمکا دھمکا کے ان کے بھی ووٹ حاصل کئے گئے، اور جہاں ظلم و جبر کے بغیر کام بنتا نظر نہ آیا وہاں اس سے بھی نہ چوکا گیا۔

غرض اللہ کو ناخوش اور شیطان کو خوش کرنے کے اس مسلم قوم نے اپنی اس لڑائی میں سارے ہی جتن کئے، اور کون ایسا بے بصیرت ہوگا جو ان باتوں سے انکار کی جرأت کر سکے یا یہی کہہ سکے کہ صرف فلاں ہی پارٹی نے یہ سب کچھ کیا ہے اور ہماری پارٹی والوں کا دامن ان سب نجاستوں سے پاک صاف رہا ہے۔

بیشک ہمارا یہ دعویٰ نہیں کہ الکشن میں حصہ لینے والے تمام ہی لوگوں نے یہ سب کچھ کیا اور ہم یہ بھی باور کر سکتے ہیں کہ الیکشن میں حصہ لینے والی ہر پارٹی ہی میں کچھ حضرات ایسے بھی ہوں گے جو ان چیزوں کی قباحت کو ہم سے بھی زیادہ محسوس کرتے ہوں گے اور یہ سب کچھ ان کی منشا اور مرضی کے خلاف ہوا ہوگا۔ لیکن اگر وہ اپنی الکشنی فوج اور اپنے کارکنوں کے اعمال کی کچھ تفصیلی واقفیت رکھتے ہوں گے تو بلاشبہ وہ بھی اس یقین میں ہمارے شریک ہوں گے کہ ان کے کارندے بھی ان تمام ناپاکیوں میں ملوث ہوئے ہیں اور یہ سارے شیطانی حربے انھوں نے بھی خوب خوب استعمال کئے ہیں۔

غرض الیکشن کیا تھا بدتمیزی، خدا فراموشی اور معصیت کوشی کا ایک سیلاب تھا اور شرافت

---

[1] یہاں یہ ظاہر کر دینا شاید بے نفعانی ہو جائے کہ الیکشن میں حصہ لینے والی جماعتوں میں جہاں تک ہمیں معلوم ہو سکا ہے صرف جمعیۃ العلماء نے اپنے کارکنوں کی اخلاقی روک تھام کے لئے مولانا احتشام الحسن صاحب کا مضمون جو الفرقان کی گزشتہ سے پیوستہ اشاعت میں کچھ حذف و اختصار کے ساتھ شائع ہوا تھا مستقل رسالہ کی صورت میں پورا چھپوا کر اپنے الکشن لٹریچر کے ساتھ تقسیم کیا تھا لیکن یہ بھی واقعہ ہے جیسا کہ ہمیں معلوم ہوا کہ کارکنان جمعیت کی اس کوشش اور خواہش کے باوجود جمعیتی کارکنوں کا طرز عمل بھی دین و اخلاق کے نکتہ نظر سے دوسروں سے کچھ زیادہ ممتاز نہیں رہا۔"

و اخلاق کے مسلمات سے بغاوت کی ایک آندھی تھی جو "ظلمات بعضہا فوق بعض"
کا مصداق تھی۔

الیکشن کا ہنگامہ اگرچہ ختم ہو چکا لیکن خصوصاً ہمارے نوجوانوں کے ذہنوں پر اس نے جو مستقل اثرات چھوڑے ہیں اور قومی سیاست کی راہ میں حسب ضرورت "دین و اخلاق کی پامالی" کے یکسر ملی اصول کو جو مسلّمہ پالیسی کی حیثیت حاصل ہو گئی ہے حقیقت یہ ہے کہ دین کے درد مندوں اور دین و اخلاق کی قدر و اہمیت پہچاننے والوں کے لئے وہ وقت کا نہایت اہم اور قابل غور مسئلہ ہے۔

لاہور کے ایک دوست جو اگرچہ جدید تعلیم یافتہ طبقہ ہی کے ایک فرد ہیں اور وہاں کے ایک کالج سے تعلق رکھتے ہیں۔ لیکن ساتھ ہی بڑے پختہ مسلمان بھی ہیں اپنے ایک تازہ گرامی نامے میں الیکشن ہی کے اثرات کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

ہمارے کالجوں کے نوجوان دین سے بیزار ہو گئے۔ پہلے حال یہ تھا کہ ان کو نماز کے لئے کہا جاتا تو وہ شرمندہ ضرور ہو جاتے تھے لیکن اب الٹی اہانت کرتے ہیں انکے دلوں میں اب یہ عقیدہ راسخ ہو گیا ہے کہ قوم کی خدمت کرنے والا خواہ وہ کیسا ہی پکا بے شرع کیوں نہ ہو علمائے ربانی سے کہیں افضل ہے۔

اس سلسلہ میں ایک عبرت آموز واقعہ بھی قابل ذکر ہے ایک صالح نوجوان جو دو سال اپنی دینی تعلیم کی تکمیل کے بعد) ایک یونیورسٹی کے اعلیٰ درجات میں تعلیم حاصل کر رہے ہیں۔ راوی ہیں کہ ایک دن یونیورسٹی کی مسجد میں ظہر کی نماز کے لیے پہنچا تو کچھ طلبا کو دیکھا کہ مسجد کے صحن میں بیٹھے ہوئے قرآن شریف کی بعض خاص آیتیں (جنھیں الکشن پروپیگنڈے میں انھیں استعمال کرنا تھا) اور ان کا ترجمہ اور مطلب رٹ رہے ہیں۔ جماعت کا وقت آیا۔ اقامت کہی گئی اور جماعت شروع ہو کر ختم ہو گئی۔ مگر یہ طالب علم اسی طرح صحن مسجد میں پوری دیدہ دلیری کے ساتھ اپنے کام میں لگے رہے اور جھوٹوں بھی نماز میں شریک نہیں ہوئے جب میں نماز سے فارغ ہو کر مسجد سے باہر جانے لگا تو ان میں سے بعض نے ایک آیت کے متعلق مجھ سے کچھ پوچھنا چاہا میں نے بہت غصے سے کہا "تم کو شرم نہیں آتی تمہارے سامنے نماز ہوتی رہی اور تم لوگ نماز میں شریک نہیں ہوئے" پوچھنے والے اس طالب علم نے پوری جسارت کے ساتھ جواب دیا کہ ہم جس کام میں لگے ہوئے ہیں وہ اس وقت نماز سے بھی

زیادہ ضروری ہے۔

اگرچہ یہ واقعہ بہت ہی زیادہ قابل افسوس اور عبرت آموز ہے لیکن جس فضا میں یہ بیچارے رہتے ہیں اور جس طرح ان کا ذہنی نشو و نما ہوتا ہے اس کے پیش نظر کچھ زیادہ تعجب کی بات بھی نہیں لیکن ہم جیسوں کے لیے اس سے بھی زیادہ افسوسناک اور قابل فکر چیز یہ ہے کہ ہمارے خالص دینی مدرسوں کے پڑھے ہوئے بعض فضلا نے بھی اس الکشن میں دین اور دینی روایات کو پس پشت ڈالنے میں اپنے حلقہ کے ان غیر زدوں کی پوری پوری تقلید کی، بلکہ بعض نیز رفتاروں نے تو ان سے بھی بازی لے جانے کی کوشش کی، انا للہ! معلوم نہیں ہمارے یہ برادر اپنے مقام اور اپنے منصب کو کب پہچانیں گے۔

غیر مسلموں پر رونے سے کیا فائدہ۔ دین کے سب درد مندوں کے لیے سوچنے کی بات ہے کہ اب ان حالات میں ہمارے فرائض کیا ہیں؟ — کاش جتنی کوششیں ہم نے اس الکشن میں کی ہیں محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی امت کو ان گندگیوں سے پاک و صاف کرنے کے لیے ہم اتنی ہی کوششوں کا عزم کریں۔ (الفرقان صفر ۱۳۶۵ھ)

قول و عمل کا تضاد صفحہ ۸۲ کا بقیہ

فلاں صاحب کو ووٹ دیجیے ——— کیوں؟

اس لیے کہ وہ خدا پرست ہیں ——— ملک پرست ہیں ——— قوم پرست ہیں

اس اشتہار کا مضمون غالباً کسی مسلمان ہی کا لکھا ہوا ہے۔ اول تو اس بھلے آدمی سے کوئی پوچھے کہ خدا کی پرستش کے ساتھ ساتھ ملک اور قوم کی پرستش کا کیا جوڑ ہے؟ پھر جن صاحب کے لیے یہ لکھا گیا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ وہ اور تو سب کچھ ہوں گے لیکن ان کو خدا پرست کہنا خود اس لفظ کے ساتھ اور ان کے ساتھ بہت ہی بیہودہ مذاق کرنا ہے۔ اور غضب یہ ہے کہ اس اشتہار میں اپیل کرنے والے حضرات کے جو نام لکھے گئے ہیں۔ ان میں سے پہلا نام حضرت مولانا حسین احمد صاحب کا ہے۔ حالانکہ یقیناً ان کے فرشتوں کو بھی خبر نہ ہوگی کہ ان کے نام سے کس کے متعلق کیا کہا جا رہا ہے۔ اف! الاماں!! الحذر!!!

(الفرقان صفر ۱۳۶۵ھ)

باب —— (۳)

سیرِ قادیانیت

مرزا قادیانی اور اُن کا دعوائے مسیحیت

(از جناب مولانا محمد چراغ صاحب گوجرانوالہ)

دنیا کے جھوٹے مدعیانِ نبوت و مہدویت میں سے کسی کے دعاوی کی فہرست اسقدر طویل نہیں ہے جیقدر مرزا قادیانی کے دعاوی کی۔ اگرچہ بعض دعووں میں لاہوری اور قادیانی پارٹیوں میں اختلاف ہے جیسے دعویٰ نبوت۔ یا بعض دعاوی۔ یہ دونوں جماعتوں کو جُزیہ ہیں۔ جیسے مرزا صاحب کا یہ دعویٰ کہ ؎

کرم خاکی ہوں مرے پیارے نہ آدم زاد ہوں
ہوں بشر کی جائے نفرت اور انسانوں کی عار — نصرۃ الحق

لیکن مسیح موعود ہونے کا دعویٰ مرزا صاحب کا وہ دعویٰ ہے جس پر دونوں جماعتیں متفق ہیں۔ اور اسی واسطے دونوں جماعتیں مرزا صاحب کو "مسیح موعود" کے لقب سے یاد کرتی ہیں، غرض مرزا صاحب کا یہی دعویٰ دونوں جماعتوں کا اجماعی عقیدہ ہے۔ حالانکہ یہی دعویٰ مرزا صاحب کی خبط الحواسی اور لغو گوئی کا خصوصی منظر رہا ہے۔ اور جس بوکھلاہٹ کا ظہور آپ سے اس معاملہ میں ہوا ہے اُس کی نظیر دیوانوں اور پاگلوں کے سوا شاید ہی کسی دوسرے کے کلام میں مل سکے۔

آج کی صحبت میں ہم مرزا صاحب کے دعوائے مسیحیت کے متعلق مندرجہ ذیل دو چیزوں پر روشنی ڈالنا چاہتے ہیں۔ اوّل یہ کہ خود مرزا صاحب کا دعویٰ "مسیح موعود" ہونے کا ہے بھی یا نہیں؟ دوم یہ کہ اس دعوے میں مرزا صاحب سے کسقدر خبط الحواسی اور بوکھلاہٹ ظاہر ہوئی؟

امر اوّل

اگرچہ مرزا صاحب کے ناسمجھ اور بیوقوف معتقدین ان کو "مسیح موعود" کے لقب سے یاد

کرتے ہیں لیکن واقعہ یہ ہے کہ خود مرزا صاحب کا دعویٰ مسیح موعود ہونے کا نہیں۔ بلکہ وہ اپنے کو صرف "مثیل مسیح موعود" کہتے ہیں جس کی تصریح خود مرزا صاحب نے اپنی کتاب ازالہ اوہام طبع اول صفحہ ۱۹ پر ان الفاظ میں کی ہے :-

"اے برادران دین ! وعلمائے شرع متین ، آپ صاحبان میری ان معروضات کو متوجہ ہو کر سنیں کہ اس عاجز نے جو مثیل موعود ہونے کا دعویٰ کیا ہے جس کو کم فہم لوگ مسیح موعود خیال کر بیٹھے ہیں۔"

عبارت کا مطلب بالکل صاف ہے جو کسی توضیح کا محتاج نہیں کہ مرزا صاحب کا دعویٰ مثیل مسیح موعود ہونے کا ہے اور بس۔ پھر یہ مثیلیت بھی ایسی عام ہے کہ اس کو محض اپنی ہی ذات تک محدود نہیں کرتے بلکہ فرماتے ہیں کہ مثیل مسیح ہونا مجھ ہی پر ختم نہیں بلکہ میرے نزدیک آئندہ زمانوں میں میرے جیسے ہزاروں مثیل مسیح ہو سکتے ہیں۔ ثبوت کے لیے حوالجات ذیل ملاحظہ ہوں۔

(۱) "میں نے صرف "مثیل مسیح" ہونے کا دعویٰ کیا ہے اور میرا یہ بھی دعویٰ نہیں کہ صرف مثیل ہونا میرے پر ہی ختم ہو گیا ہے۔ بلکہ میرے نزدیک ممکن ہے کہ آئندہ زمانوں میں میرے جیسے اور دس ہزار بھی مثیل مسیح آجائیں...... پس اس بیان کی رو سے ممکن اور بالکل ممکن ہے کہ کسی زمانہ میں کوئی ایسا مسیح بھی آجاوے جس پر حدیثوں کے بعض ظاہری الفاظ صادق آسکیں کیونکہ یہ عاجز دنیا کی حکومت اور بادشاہت کے ساتھ نہیں آیا۔" (ازالہ اوہام طبع اول صفحہ ۱۹۸)

(۲) "بالآخر ہم یہ بھی ظاہر کرنا .... چاہتے ہیں کہ ہمیں اس سے انکار نہیں کہ ہمارے بعد کوئی اور بھی مسیح کا مثیل بن کر آوے کیونکہ نبیوں کے مثیل ہمیشہ دنیا میں ہوتے رہتے ہیں۔ بلکہ خدا تعالیٰ نے ایک قطعی اور یقینی پیشین گوئی میں میرے پر ظاہر کیا ہے کہ میری ہی ذریت سے ایک شخص پیدا ہوگا جس کو کئی باتوں میں مسیح سے مشابہت ہوگی وہ آسمان سے اترے گا۔" (ازالہ اوہام طبع اول صفحہ ۱۵۵-۱۵۶)

(۳) "اس عاجز کی طرف سے بھی یہ دعویٰ نہیں ہے کہ مسیحیت کا میرے وجود پر ہی خاتمہ ہے، اور آئندہ کوئی مسیح نہیں آئے گا۔ بلکہ میں مانتا ہوں اور بار بار کہتا ہوں کہ ایک کیا دس ہزار سے بھی زیادہ مسیح آسکتا ہے۔ اور ممکن ہے کہ ظاہری جلال و اقبال کے ساتھ بھی آوے اور ممکن ہے کہ اول وہ دمشق میں ہی نازل ہو۔" (ازالہ اوہام صفحہ ۲۹۴-۲۹۵، طبع اول)

(۴) "ممکن ہے کہ کوئی مثیل مسیح ایسا بھی ہو جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے روضہ کے پاس مدفون ہو" — (ازالہ اوہام صفحہ ۴۷۰ طبع اول)

ناظرین کرام بسطور بالا سے بخوبی واضح ہو گیا ہوگا کہ مرزا صاحب کا دعویٰ صرف مثیل مسیح ہونے کا ہے اور یہ مثلیت صرف مرزا صاحب کے ساتھ مخصوص نہیں۔ اب مرزا صاحب کا وہ اقرار ملاحظہ فرمائیے جس میں صاف انھوں نے اصلی مسیح موعود کی تشریف آوری کو تسلیم کیا ہے اور انھیں کو احادیث کا مصداق قرار دیا ہے۔ اپنی کتاب ازالہ اوہام میں تحریر فرماتے ہیں کہ:-

"ممکن ہے کہ میرے بعد کوئی اور مسیح بن مریم بھی آوے اور بعض احادیث کی رو سے وہ موعود بھی ہو اور کوئی ایسا دجال بھی آوے جو مسلمانوں میں فتنہ ڈالے"

(ازالہ اوہام صفحہ ۲۶۱ طبع اول)

"ہاں اس بات سے اس وقت انکار نہیں ہوا اور نہ اب انکار ہے کہ شاید پیشین گوئیوں کے ظاہری معنوں کے لحاظ سے کوئی اور مسیح موعود بھی آئندہ کسی وقت پیدا ہو"

(ازالہ اوہام صفحہ ۲۶۱ طبع اول)

المختصر عبارات محولہ بالا سے صاف ظاہر ہو گیا کہ مرزا صاحب مسیح موعود نہیں بلکہ مثیل مسیح ہیں اور یہ مثلیت مرزا صاحب کی خصوصیت سے بھی نہیں ہزاروں مثیل مسیح آ سکتے ہیں۔ نیز یہ کہ اصلی مسیح موعود جن کا ذکر احادیث نبویہ میں ہے[1] اور جن کی علامات آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے اقوال مبارکہ میں متعین فرما دی ہیں، اُن کا ظہور آئندہ زمانہ میں ہوگا۔ بہرحال مرزا صاحب آخر مسیح موعود نہیں ہیں اور یہی امر اول ثابت کرنا تھا۔ فثبت المراد۔

---

[1] اگرچہ مرزا صاحب کا خیال بلکہ ظنی اور یقینی الہام ہو کہ اس عہدہ پر ان کا کوئی صاحبزادہ بلند اقبال مامور ہوگا جیسا کہ مرسومہ نمبر ۲ میں مذکور ہے۔ نیز ایک دوسری جگہ فرماتے ہیں کہ "اس مسیح کو بھی یاد رکھو جو اس عاجز کی ذریت میں ہے جس کا نام ابن مریم بھی رکھا گیا ہے" (ازالہ اوہام صفحہ ۲۲ طبع اول)

مگر معلوم نہیں کہ مرزا صاحب کی اولاد میں سے کوئی اس عہدہ پر ابھی فائز ہوا یا نہیں؟۔ جواب میں اثبات ہو یا بہر دو صورت قادیانی حضرات اس معمہ کو بھی حل کر دیں جو مرزا صاحب نے اعجاز احمدی کے صفحہ پر لکھا ہے "انا اذا ودعنا الدنیا فلا مسیح بعدنا الی یوم القیامة" یعنی میرے (مرزا کے) بعد قیامت تک کوئی مسیح نہیں ہو دونوں الہاموں میں تطبیق دینے والے کو مواجبہ انعام۔ منہ غفرلہ

امر دوم

یوں تو مرزا صاحب کے تمام ہی دعووں میں تہافت و تناقض پایا جاتا ہے۔ لیکن خصوصیت کے ساتھ دعوائے مسیحیت میں انھوں نے جسقدر رنگ بدلے ہیں وہ آپ کی خبط الحواسی کا عجیب و غریب نمونہ ہیں۔ ملاحظہ فرمائیے۔

پہلا دور مرزا صاحب کا اقرار کہ مسیح موعود میں ہی ہوں، اپنی مشہور کتاب براہین احمدیہ میں تحریر فرماتے ہیں کہ:۔

"پھر اس کے بعد الہام ہوا کہ یا عیسٰی إنی متوفیک ...... اس جگہ عیسٰی کے نام سے بھی یہی عاجز مراد ہے۔" (براہین احمدیہ صفحہ ۵۵۶ حاشیہ درحاشیہ ۳ طبع اول)

عبارت واضح ہے جس کا ماحصل یہ ہے کہ مرزا غلام احمد قادیانی ہی مسیح موعود ہیں۔

دوسرا دور وہ ہے جس میں مرزا صاحب نے اپنے آپ کو مسیح موعود نہیں سمجھا حتیٰ یہ کہ زمانۂ دراز تک وحی الٰہی سے بھی غافل اور بے خبر رہے۔ اصل عبارت یوں ہے:۔

"پھر میں قریباً بارہ برس تک جو ایک زمانۂ دراز ہے بالکل اس سے بے خبر اور غافل رہا کہ خدا نے مجھے بڑی شد و مد سے "براہین میں مسیح موعود قرار دیا ہے۔" (اعجاز احمدی صفحہ ۷)

گویا براہین احمدیہ کے بعد بارہ برس تک مرزا صاحب نے مسیح موعود ہونے کا دعویٰ نہیں کیا کیونکہ اس زمانہ میں وحی خداوندی ہی کو سمجھ نہیں سکے تو دعویٰ کس طرح کیا جا سکتا تھا۔ بہر حال یہ دوسرا دور وہ ہوا جس میں مرزا صاحب مسیح موعود ہونے سے انکار کیا کرتے تھے۔

تیسرا دور کتاب فتح الاسلام کی تصنیف کا زمانہ ہے جس میں مرزا صاحب کا یہ دعویٰ ہے کہ یہ عاجز (مرزا قادیانی) مسیح موعود ہے، چنانچہ اپنی کتاب میں تحریر فرماتے ہیں کہ:۔

"اسی فطرتی مشابہت کی وجہ سے مسیح کے نام پر یہ عاجز بھیجا گیا تا صلیبی اعتقاد کو پاش پاش کر دیا جائے سو میں صلیب کو توڑنے اور خنزیروں کے قتل کے لیے بھیجا گیا ہوں میں آسمان سے اترا ہوں۔" (فتح الاسلام حاشیہ صفحہ ۱۷)

اسی چیز کو مرزا صاحب ایک دوسری جگہ یوں لکھتے ہیں کہ:۔

"ہم نے جو رسالہ فتح الاسلام اور توضیح مرام میں اپنے اس کشفی والہامی امر کو شائع کیا ہے کہ مسیح موعود سے مراد یہی عاجز ہے۔ میں نے سنا ہے کہ بعض ہمارے علماء اس پر بہت

افروختہ ہوئے ہیں۔"　　(ازالۂ اوہام صفحہ ۱۳۹ طبع اول)

ان دونوں عبارتوں کا مفہوم صریح یہ ہے کہ مرزا صاحب مسیح موعود ہیں، بلکہ اس دعویٰ پر بعض اپنے علماء کی افروختگی کو بنظر تعجب دیکھتے ہیں۔

چوتھا دور وہ ہے جس میں مرزا صاحب نے مسیح موعود ہونے سے پھر انکار کیا اور صرف مثیلیت کا دعویٰ کیا، یہاں تک کہ جس نے مرزا صاحب کو مسیح موعود سمجھا اُن کو "کم فہم" کا لقب دیا گیا۔ عبارت امر اول میں گزر چکی ہے تاہم ناظرین کی سہولت کے لیے پھر درج کی جاتی ہے۔

"اے برادرانِ دین وعلمائے شرع متین آپ صاحبان میری ان معروضات کو متوجہ ہو کر سنیں کہ اس عاجز نے جو مثیل موعود ہونے کا دعویٰ کیا ہے جس کو کم فہم لوگ مسیح موعود خیال کر بیٹھے ہیں۔"

(ازالۂ اوہام صفحہ ۱۹۰ طبع اول)

اس سلسلہ میں دیگر عبارات امر اوّل کے ذیل میں سپردِ قلم کی جا چکی ہیں جن کا صاف مطلب یہ ہے کہ مرزا صاحب مسیح موعود نہیں، بلکہ صرف مثیل مسیح موعود ہیں جن کو ناسمجھ اور بیوقوف لوگ "مسیح موعود" خیال کر بیٹھے ہیں۔ اصلی مسیح موعود تو کوئی اور شخص ہے جو آئندہ پیدا ہوگا۔ غرض اس مسئلہ میں مرزا صاحب کا عجیب حال رہا حتیٰ کہ ایک ہی کتاب میں کبھی اقرار کیا کبھی انکار کیا چنانچہ ازالۂ اوہام صفحہ ۱۳۹ میں خود ہی اقرار کیا کہ میں مسیح موعود ہوں۔ اور اس سلسلہ میں اپنے علماء کی افروختگی کو بنظر تعجب دیکھا۔ اور حتیٰ کہ اسی ازالۂ اوہام صفحہ ۱۵۵ تک اپنے اسی دعوے پر قائم ہیں چنانچہ تحریر فرماتے ہیں کہ:۔

"اگر یہ عاجز مسیح موعود نہیں تو پھر آپ لوگ مسیح موعود کو آسمان سے اُتار کر دکھلا دیں۔"

(ازالۂ اوہام صفحہ ۱۸۵)

اور اب صفحہ ۱۹۰ پر اپنے سابقہ دعاوی کی نہایت دلیری کے ساتھ تردید بھی کر دی۔ آفریں باد بریں ہمت مردانہ تو!

پانچواں دور پھر مسیح موعود ہونے کا دعویٰ ہے اور لطف یہ کہ اسی ازالۂ اوہام میں اور صفحہ ۱۹۰ کے بعد ہے چنانچہ فرماتے ہیں۔

"واضح ہو کہ وہ مسیح موعود جس کا آنا انجیل اور احادیث صحیحہ کی رو سے ضروری طور پر قرار پا چکا تھا وہ تو اپنے وقت پر اپنے نشانوں کے ساتھ آ گیا اور آج وہ وعدہ پورا ہو گیا۔"

(ازالۂ اوہام صفحہ ۴۶۲ طبع اول)

اپنے اس دعوے کو مرزا صاحب نے اسی ازالۂ اوہام کے صفحہ ۶۶۵ پر "مسیح موعود ہونے کا ثبوت" کے عنوان سے بھی نہایت شرح وبسط کے ساتھ بیان فرمایا ہے۔ یہ دونوں مضامین صفحہ ۱۹۰ کے بعد کے

ہیں۔ لہٰذا یہ پانچواں دورِ اقرارِ مسیحیت کا ہوا۔ اور شاید اسی پر آخر تک قائم رہے۔

خلاصہ کلام یہ ہے کہ مرزا صاحب کے اس دعوئ مسیحیت میں پانچ مختلف دور گزرے کبھی اقرار کبھی انکار کبھی پھر اقرار کبھی پھر انکار اور کبھی پھر اقرار۔ ناظرینِ کرام! خود ہی بتلائیں کہ یہ خبط الحواسی نہیں تو اور کیا ہے اور ان متعارض اقوال میں کس کا اعتبار کیا جائے؟

مرزا جی کو اپنی مسیحیت کا سالہا سال تک پتہ نہ چلنا یہ بھی بہ اقرار خود اُن کے جھوٹے ہونے کی پختہ دلیل ہے اور اس پر مولوی محمد علی صاحب لاہوری مرزائی کی مُہرِ تصدیق بھی ثبت ہے ثبوت ملاحظہ ہو۔

اوّل تو مرزا صاحب نے خود ہی اعجاز احمدی ص۷ میں لکھا کہ بارہ برس تک براہین احمدیہ کے بعد مجھے کوئی خبر نہ ہوئی کہ خدا نے مجھے براہین احمدیہ میں بڑی شد و مد سے مسیح موعود قرار دیا ہے اور براہین میں خدا کی کھلی کھلی وحی روز روشن کی طرح مسیح موعود بنا رہی لیکن میں اس سے بے خبر اور غافل رہا اور اسی اعجاز احمدی کے ص۲۴ و ص۲۶ پر لکھتے ہیں کہ نبی اور رسول اور محدث کو کسی اور امر میں الہام کے سمجھنے میں غلطی ہو جائے تو ممکن ہے لیکن اس کو اپنے دعوے کے سمجھنے میں کبھی غلطی نہیں ہو سکتی پس مرزا صاحب کو اپنے دعوے مسیح موعود کے سمجھنے میں جو غلطی لگی رہی اور وہ بھی بارہ برس تک۔ یہ اُن کے اقراری کذاب و مفتری ہونے کی نہایت قوی دلیل ہے۔ اعجاز احمدی ص۷ و ص۲۴ و ص۲۶ کی وہ اصل عبارتیں بالترتیب ملاحظہ ہوں۔

> اعجاز احمدی ص۷ "تاہم یہ الہام جو براہین احمدیہ میں کھلے کھلے طور پر درج تھا خدا کی حکمت عملی نے میری نظر سے پوشیدہ رکھا اور اسی وجہ سے باوجودیکہ میں براہین احمدیہ میں صاف اور روشن طور پر مسیح موعود ٹھیرایا گیا تھا مگر پھر بھی میں نے بوجہ اس ذہول کے جو میرے دل پر ڈالا گیا حضرت عیسیٰ کی آمدِ ثانی کا عقیدہ براہین احمدیہ میں لکھ دیا...... پھر میں قریباً بارہ برس تک جو ایک زمانہ دراز ہے بالکل اس سے بے خبر اور غافل رہا کہ خدا نے مجھے بڑی شد و مد سے براہین احمدیہ میں مسیح موعود قرار دیا ہے۔"
>
> اعجاز احمدی ص۲۴ "اور بعض کا خیال یہ ہے کہ اگر کسی الہام کے سمجھنے میں غلطی ہو جائے تو امان اٹھ جاتا ہے اور شک پڑ جاتا ہے کہ شاید اس نبی یا رسول یا محدث نے اپنے دعوے میں بھی دھوکا کھایا ہو۔ یہ خیال سراسر فضول ہے۔"
>
> اعجاز احمدی ص۲۶ "ایسا ہی نبیوں اور رسولوں کو اُن کے دعوے کے متعلق اور اُن تعلیموں کے متعلق بہت نزدیک سے دکھایا جاتا ہے اور آنکھیں اس قدر تواتر ہوتا ہے جس میں کچھ شبہ باقی نہیں رہتا۔"

ان حوالوں سے میرے گزشتہ مضمون کا ثبوت ہوگیا کہ مرزا جی کو اپنے مسیح موعود ہونے کا سالہا سال تک پتہ نہ چلا۔ حالانکہ اُن کو خدا کی کھلی کھلی وحی روشن طریق سے اور بڑی شد و مد سے مسیح موعود قرار دے رہی تھی اور مرزا صاحب نے خود قاعدہ مقرر کیا تھا کہ محدث یا نبی یا رسول کو اپنے دعوے کے سمجھنے میں کبھی غلطی نہیں ہو سکتی۔ مگر خود اسی کتاب میں مرزا جی نے تسلیم کیا کہ مجھے غلطی لگی رہی۔

اب سنیئے مولوی محمد علی لاہوری مرزائی کا فتویٰ وہ اپنے ٹریکٹ "النبوۃ فی الاسلام" کے صلا پہ لکھتے ہیں:-

"تم اس عہدہ دار کو کیا کہو گے جس کو اس کے افسروں نے ایک عہدہ پر مامور کر کے بھیجا اور پندرہ سال تک یہ سمجھا ہی نہیں کہ میرا عہدہ کیا ہے۔ ایک تھانہ میں سب انسپکٹر کو بھیجا اور وہ خیال کرتا رہا کہ میں کانسٹبل ہوں، کیا ایسے شخص کو مجنوں کہو گے یا کچھ اور۔"

مولوی محمد علی مرزائی کے اس فتوے کے مطابق مرزا صاحب مجنون اور پاگل ہوئے جن کو بارہ سال تک پتہ نہ چلا اور وہ یہ نہ سمجھے کہ میں مسیح موعود ہوں اور اپنے مسیح موعود ہونے سے برابر انکار کرتے رہے۔ ہم بھی مسٹر محمد علی صاحب کی اس رائے سے اتفاق کرتے ہیں فی الحقیقت مرزا صاحب کو مالیخولیا بھی تھا جیسا کہ انھوں نے خود بھی اپنی بعض تصانیف میں لکھا ہے۔ اس کے بعد اس بحث کا ایک گوشہ رہ جاتا ہے اور وہ دعوائے مسیحیت کا ابطال خود مرزائی لٹریچر سے۔ انشاء اللہ کسی قریبی صحبت میں یہ بحث بھی ہدیۂ ناظرین کی جائے گی۔ (الفرقان ماہ ذی الحجہ ۱۳۵۵ھ)

ص... اکثر تصنیف ...

تصانیف آج تک لاجواب ہیں مثلاً اظہار الحق۔ ازالۃ الشکوک، ازالۃ الاوہام، اعجاز عیسوی وغیرہ۔ اور ان ہی کتابوں کے مرزا صاحب خوشہ چین بھی ہیں، پھر بھی ان کے بالمقابل مرزا صاحب نے عشر عشیر بھی کام نہیں کیا۔

بہر حال مرزا صاحب اس علامت سے بھی محروم ہیں اور بقول خود دجال و کذاب ٹھیرتے ہیں کیونکہ جس کام کے لیے آئے تھے وہ کام کر کے نہیں گئے اور اسی کو انھوں نے اپنے صدق و کذب کا آخری معیار ٹھیرایا تھا۔ مدعی لاکھ پہ بھاری ہے گواہی تیری۔ میں نے اختصار کا لحاظ رکھتے ہوئے چھ نمبر لکھے ہیں اگر مرزائی صاحبان "ہل من مزید" کہیں تو ابھی اس جنس کا کافی ذخیرہ باقی ہے۔ اور خدا توفیق دے تو ہدایت کے لیے یہی کافی ہے۔ اور محرومان ازلی کے حق میں ارشاد خداوندی ہے وما تغنی الآیات والنذر عن قوم لا یؤمنون ؎

تہی دستان قسمت را چہ سود از رہبر کامل ۔۔۔ کہ خضر از آب حیواں تشنہ می آرد سکندر را

(الفرقان محرم الحرام ۱۳۵۶ھ)

مرزائی مسیحیت کا ابطال

خود مرزا صاحب کے قلم سے

از جناب مولانا محمد چراغ صاحب گجرانوالہ

دعوائے مسیحیت میں مرزا صاحب سے جس خبط الحواسی اور تحیر العقول بوکھلاہٹ کا ظہور ہوا اس کا ذکر میں اپنے پہلے مضمون مندرجہ الفرقان جلد ۳۰ نمبر ۱۲ میں کر چکا ہوں اور اسی کے آخر میں میں نے وعدہ کیا تھا کہ آئندہ صحبت میں مرزائی مسیحیت کا ابطال خود مرزائی لٹریچر سے پیش کیا جائیگا آج اسی وعدے کے ایفاء کا ارادہ ہے اور بعون اللہ تعالیٰ اس وقت مجھے یہ ثابت کرنا ہے کہ قطع نظر ان علامات کے جو ہمارے اسلامی لٹریچر میں مسیح موعود کے لیے بیان کی گئی ہیں وہ خود علامات بھی مرزا صاحب میں مفقود ہیں جن کو خود مرزا صاحب ہی نے بڑے زور شور سے "مسیح موعود" کی علامات ٹھہرایا ہے۔ ذرا غور سے ملاحظہ فرمائیے۔

(۱) احادیث صحیحہ میں وارد ہوا ہے کہ مسیح موعود اپنی آمد ثانیہ کے وقت حج کریں گے اور خود مرزا صاحب نے بھی اس کو تسلیم کیا ہے چنانچہ فرماتے ہیں۔

> "ہمارا حج تو اس وقت ہوگا جب دجال بھی کفر و دجل سے باز آ کر طواف بیت اللہ کرے گا کیونکہ بموجب حدیث صحیح کے وہی وقت مسیح موعود کے حج کا ہوگا ...... آخر ایک گروہ دجال کا ایمان لا کر حج کرے گا۔ سو جب دجال کو ایمان اور حج کے خیال پیدا ہوں گے وہی دن ہمارے حج کے بھی ہوں گے۔" (ایام الصلح صفحہ ۱۶۸، ۱۶۹)

اس عبارت میں مرزا صاحب نے تسلیم کیا ہے کہ حدیث صحیح کی رو سے مسیح موعود کا حج کرنا ثابت ہے اور وہ حج کرے گا۔ لیکن دنیا جانتی ہے کہ مرزا صاحب نے اخیر دم تک حج نہ کیا اور ان میں مسیح موعود کی یہ مسلّمہ علامت نہ پائی گئی۔ اس سے یہ بھی ثابت ہوا کہ مرزا جی نے ابھی تک دجال اور اس کی دجالیت کو بھی فنا نہ کیا۔ اور مسیح موعود کی یہ دوسری علامت بھی جو احادیث صحیحہ سے ثابت

تھی وہ بھی نہ پائی گئی کیونکہ اگر دجال اپنی دجالیت سے باز آگیا ہوتا یا فنا ہوگیا ہوتا تو مرزا صاحب ضرور حج کرتے کیونکہ اُن کا خود اقرار تھا کہ میں حج اُس وقت کروں گا جب دجال مسلمان ہوگا۔

(۴) مرزا جی نے اپنی متعدد کتابوں میں مسیح موعود کی ایک یہ علامت بھی لکھی ہے کہ اُس کے زمانہ میں تمام مذاہب باطلہ دُنیا سے مٹ جائیں گے اور صرف ایک مذہب اسلام ہی رہ جائے گا۔ ملاحظہ ہو۔

"شہادۃ القرآن صفحہ ۱۶ ——— فنفخ فی الصور فجمعناھم جمعاً ...... تب ہم تمام فرقوں کو ایک ہی مذہب پر جمع کر دیں گے ...... اور ایسے زمانہ میں صور پھونک کر تمام قوموں کو دین واحد پر جمع کیا جاوے گا ...... اور ایک آسمانی مصلح آئے گا جس کا نام مسیح موعود ہے۔"

انجام آتھم صفحہ ۳۰۷ — وقد اتی زمان تھلک فیہ الاباطیل ولا یبقی الزور والظلام ولغنی کلھا الا الاسلام

"وہ زمانہ آگیا ہے کہ اس میں باطل ہلاک ہوجائے گا اور جھوٹ نہ رہے گا اور بجز اسلام تمام کی تمام ملتیں نیست و نابود ہو جاویں گی۔"

چشمۂ معرفت صفحہ ۸۳ حاشیہ۔ ونفخ فی الصور فجمعناھم جمعاً۔ یعنی ہم آخری زمانہ میں ہر ایک قوم کو آزادی دیں گے تا اپنے مذہب کی خوبی دوسری قوم کے سامنے پیش کرے ...... ایک مدت تک ایسا ہوتا رہے گا۔ پھر قرنا میں ایک آواز پھونک دی جائے گی تب ہم تمام قوموں کو ایک قوم بنا دیں گے اور ایک ہی مذہب پر جمع کر دیں گے"

بعینہ یہی مضمون چشمۂ معرفت صفحہ ۷۶ و صفحہ ۳۳ میں بھی ہے اور یہی مضمون کچھ زیادہ وضاحت کے ساتھ عبارت عربی میں مرزا جی کے رسالہ "الفرق فی آدم والمسیح الموعود" صفحہ ۵ ملحقہ الہامیہ میں ہے۔

مندرجہ بالا تینوں حوالجات سے ثابت ہوا کہ "مسیح موعود" کی علامت یہ ہے کہ اُس کے زمانہ میں تمام مذاہب باطلہ مٹ کر نیست و نابود ہو جاویں گے اور ساری دُنیا کا مذہب مذہب اسلام ہی ہوگا لیکن دُنیا گواہ ہے کہ مرزا کے زمانہ میں بلکہ اس کے مرنے کے بعد تک یہ علامت پوری نہ ہوئی بلکہ معاملہ دگرگوں ہے۔ مذاہب باطلہ کی تعداد روز بروز بڑھتی جا رہی ہے اور آئے دن اسلام پر دشمنوں کے حملے ہوتے رہتے ہیں۔

(۳) مرزا صاحب نے مسیح موعود کی ایک یہ علامت بھی لکھی ہے کہ اس کا زمانہ امن، صلح و اتحاد کا زمانہ ہوگا۔ ملاحظہ ہو۔ ما الفرق فی آدم و المسیح الموعود ص۱ ملحقہ خطبہ الہامیہ

"و یضع اللہ الحرب و تقع الامنۃ	خدا تعالیٰ جنگ کو مٹا دے گا اور زمین میں
علی الارض و تنزل السکینۃ و الصلح	امن و امان واقع ہوگا۔ اور دلوں میں طمانیت
فی جذر القلوب۔"	اور صلح نازل ہوگی۔

لیکن مشاہدہ بالکل اس کے خلاف ہے۔ جنگ کا خاتمہ تو نہیں ہوا۔ بلکہ مرزا صاحب کی آمد کے بعد ہی وہ تباہ کن جنگ عظیم ہوئی جس کی نظیر زمانہ سابقہ میں نہیں ملتی اور اسمیں اسلامی سلطنت ترکیہ کو غیر معمولی نقصان پہنچا اور اس وقت سے اب تک امن سلامتی جیسی کچھ بھی ہے وہ بھی ظاہر ہے کہ ایک دن کے لیے بھی اقوام عالم ایک دوسرے سے مطمئن نہیں ہوئیں۔ بہرحال مرزا صاحب کی بیان کردہ یہ علامت بھی پوری نہ ہوئی۔

(۴) مرزا صاحب نے اپنی متعدد تصانیف میں مسیح موعود کی ایک یہ بھی علامت لکھی ہے کہ اس کے زمانہ میں مکہ اور مدینہ منورہ کے درمیان ریل جاری ہو جاوے گی۔ حوالجات ملاحظہ ہوں۔

○ اربعین ۲ ص۳۲ حاشیہ۔ "دیکھی مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ کے لوگوں کے لیے ایک بھاری نشان ظاہر ہوا ہے۔ ..... حدیث یترک القلاص فلا یسعی علیہا۔ اس کی گواہ ہے پس یہ کس قدر بھاری پیشین گوئی ہے جو مسیح کے زمانہ کے لیے اور مسیح موعود کے ظہور کے لیے بطور علامت تھی، ریل کی تیاری سے پوری ہوگئی۔"

یہی مضمون ضمیمہ تحفہ گولڑویہ ص۱۲ و تحفہ گولڑویہ صفحہ ۱۰۱ و ۱۰۲ و ۱۰۳ و ۱۲۰ میں بھی موجود ہے کہ مسیح موعود کی علامت یہ تھی کہ مرکز اسلام میں یعنی مکہ اور مدینہ منورہ میں ریل جاری ہوگی۔

لیکن دنیا جانتی ہے کہ مکہ مکرمہ اور مدینہ منورہ کے درمیان نہ ریل مرزا کے زمانہ میں جاری ہوئی اور نہ آج تک جاری ہو سکی۔ البتہ جن دنوں میں مرزا نے پیشین گوئی کی تھی ان دنوں میں ریل کی تیاری ہو رہی تھی اور ہندوستان وغیرہ سے اس کے لیے چندے بھی کیے گئے تھے (الحکم ج۱۲ ص۲ کالم ۳، ۲۶ جنوری ۱۹۰۸ء میں چندوں کا ذکر ہے)

مگر مرزا جی کی پیشین گوئی کا یہ اثر ہوا کہ وہ تیار ہوتے ہوتے بھی رک گئی اور خدا کی شان آج تک معرض وجود میں نہ آ سکی۔ خدا کو یہی منظور تھا کہ مرزا کو جھوٹا اور رسوا کیا جائے۔

(۵) مرزا صاحب نے مسیح موعود کی ایک خاص علامت یہ بھی لکھی ہے کہ آخری زمانہ کا مسیح موعود

اور مہدی معہود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرح کسی انسان کا شاگرد نہ ہوگا بلکہ وہ براہ راست خدا تعالیٰ سے تعلیم حاصل کرے گا بخلاف حضرت موسیٰ اور حضرت عیسیٰ کے کہ وہ انسانوں کے شاگرد تھے اور بنیا نوع انسان کے سامنے زانوئے تلمذ طے کرتے رہے اصل عبارت ملاحظہ ہو، فرماتے ہیں۔

"ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اور نبیوں کی طرح ظاہری علم کسی استاد سے نہیں پڑھا تھا مگر حضرت عیسیٰ اور حضرت موسیٰ کمتبوں میں بیٹھتے تھے اور حضرت عیسیٰ نے ایک یہودی استاد سے تمام توریت پڑھی تھی۔ .... سو آنے والے کا نام جو مہدی رکھا گیا سو اس میں یہ اشارہ ہے کہ وہ آنے والا علم دین خدا ہی سے حاصل کرے گا اور قرآن و حدیث میں وہ کسی کا شاگرد نہ ہوگا ...... سو میں حلفاً کہہ سکتا ہوں کہ میرا حال یہی ہے۔ کوئی ثابت نہیں کر سکتا کہ میں نے کسی انسان سے قرآن یا حدیث یا تفسیر کا ایک سبق بھی پڑھا ہے۔"

(ایام الصلح صفحہ ۱۴۷)

یہ مرزا جی کا حلفیہ بیان ہے کہ میں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرح کسی انسان کی شاگردی نہیں کی اور قرآن یا حدیث یا تفسیر کا ایک سبق بھی کسی انسان نہیں پڑھا۔

لیکن میں ثابت کرتا ہوں کہ مرزا صاحب اپنے اس حلفیہ بیان میں بالکل جھوٹے ہیں اور اُن میں یہ علامت بھی مفقود ہے کیونکہ اُن کو انسانوں کے سامنے زانوئے تلمذ طے کرنا پڑا ہے اور لطف یہ کہ اُن کے اُستادوں میں ایک صاحب گل علی صاحب شیعہ مذہب کے بھی ہیں۔ ایک اُستاد مرزا جی کے فضل احمد صاحب ہیں ایک فضل الٰہی صاحب ہیں۔ ایک مرزا غلام مرتضیٰ (والد مرزا غلام احمد قادیانی) ہیں نیز یہ خود مرزا صاحب ہی کے اقرار سے ثابت ہے کہ انھوں نے قرآن میں بھی انسانوں کی شاگردی کی ہے۔ اور اُن کا یہ حلف ایسا ہی جھوٹا ہے جیسا کہ دعوائے مسیحیت، ملاحظہ فرمائیے۔ (کتاب البریہ صفحہ ۱۴۹ در حاشیہ آنت الحجتیز)

"میری تعلیم اس طرح پر ہوئی کہ جب میں چھ سات سال کا تھا تو ایک فارسی خواں معلم (مولوی فضل الٰہی) میرے لیے نوکر رکھا گیا جنھوں نے قرآن شریف اور چند فارسی کی کتابیں مجھے پڑھائیں۔"

اس سے معلوم ہوا کہ مرزا جی نے قرآن مجید مولوی فضل الٰہی سے پڑھا تھا۔ پس معلوم ہوا کہ ایام الصلح میں جو علامت مقرر کی تھی وہ مرزا جی میں موجود نہ ہوئی۔ علاوہ ازیں یہ بھی ثابت ہو گیا کہ حلف کر کے با قدر سریح جھوٹ بولا۔

(۶) مرزا صاحب نے اپنی مسیحیت کا ایک یہ بھی نشان مقرر کیا تھا کہ مجھے صلیبی فتنہ کو مٹانا ہے

اور عیسائیت کا ستون توڑ دینا ہے۔ ملاحظہ ہو فرماتے ہیں۔

"باوجود ان تمام علامتوں کے طالب حق کے لیے میں یہ بات پیش کرتا ہوں کہ میرا کام جس کام کے لیے میں اس میدان میں کھڑا ہوا ہوں یہی ہے کہ میں عیسیٰ پرستی کے ستون کو توڑ دوں اور بجائے تثلیث کے توحید کو پھیلاؤں اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی جلالت اور عظمت اور شان کو دنیا پر ظاہر کردوں۔ پس اگر مجھ سے کروڑ نشان بھی ظاہر ہوں اور یہ علت غائی مجھ سے نہ ظاہر ہو تو میں جھوٹا ہوں پس دنیا مجھ سے کیوں دشمنی کرتی ہے وہ میرے انجام کو کیوں نہیں دیکھتی۔ اگر میں نے اسلام کی حمایت میں وہ کام کر دکھایا جو مسیح موعود مہدی معہود کو کرنا چاہیے تھا تو پھر میں سچا ہوں اور اگر کچھ نہ ہوا اور میں مر گیا تو پھر سب گواہ رہیں کہ میں جھوٹا ہوں"

(اخبار بدر جلد ۲ ص ۴ کالم ۳ ۱۹ جولائی ۱۹۰۶ء)

اس سے صاف ظاہر ہوا کہ مرزا جی کی سچائی کی علامت یہ ہے کہ دنیا سے عیسائیت کو مٹا دیں اور یہی ان کے زعم میں کسر صلیب ہے۔ اگر وہ عیسائیت کو نہ مٹا سکے اور کروڑ نشان بھی وہ دکھاتے رہے تو وہ جھوٹے اور کذاب اور مفتری علی اللہ ٹھہریں گے اور ان کے باقی نشانات بے قدر ہوں گے۔ اب میں یہ بھی مرزا صاحب ہی سے تعیین کرا دوں کہ غلبۂ عیسائیت کیا ہے اور اس کے مقابلہ میں غلبۂ اسلام کیا ہوگا۔ اسی اخبار بدر نمبر ۵۱ جلد ۲ صفحہ ۸ کالم ۲، ۲۰ دسمبر ۱۹۰۶ء میں فرماتے ہیں۔

"میں یقیناً کہہ سکتا ہوں اور یہ بالکل صحیح بات ہے کہ ہر طبقہ کے مسلمان عیسائی ہو چکے ہیں۔ اور ایک لاکھ سے بھی ان کی تعداد زیادہ ہوگی۔"

اخبار مذکور کو ص ۹ کالم ۱ "اب جبکہ عیسائی مذہب کا غلبہ ہو گیا اور ہر طبقہ کے مسلمان اس گروہ میں داخل ہو چکے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے وعدہ فرمایا ہے کہ اسلام کو اپنے وعدہ کے مطابق غالب کرے"

اس جگہ یہ وضاحت ہو گئی کہ عیسائیت کا غلبہ یہ ہے کہ لوگ اسلام وغیرہ مذاہب کو چھوڑ کر عیسائیت میں داخل ہو رہے ہیں اور عیسائیت کی تعداد و مردم شماری روز بروز ترقی پر ہے تو اس کے بالمقابل اسلام کا غلبہ عیسائیت پر یہ ہوگا کہ عیسائیت سے کٹ کر لوگ اسلام میں داخل ہوتے جاویں اور عیسائیت کی تعداد کم ہوتی جاوے۔

لیکن افسوس کہ مرزا صاحب میں یہ نشان بھی نہیں پایا گیا اور اس علامت سے تو اور بھی زیادہ مرزا صاحب عاری ہیں جس قدر فرعون ایمان سے حالانکہ اس پر مرزا صاحب نے بڑا زور و شور ظاہر کیا تھا۔ اب میں مرزا صاحب کے اقرار سے ہی ثابت کرتا ہوں کہ جوں جوں مرزا صاحب مسیحیت کے منازل طے کرتے رہے توں توں عیسائیت کی مردم شماری بڑھتی گئی۔ ملاحظہ ہو خود ہی فرماتے ہیں۔

"ابھی کلکتہ میں جو پادری ہیکر صاحب نے اندازہ کرسٹان شدہ آدمیوں کا بیان کیا ہے اس سے ایک نہایت قابل افسوس بات ظاہر ہوتی ہے پادری صاحب فرماتے ہیں جو پچاس سال سے پہلے تمام ہندوستان میں کرشان شدہ لوگوں کی تعداد صرف ستائیس ہزار تھی۔ اس پچاس سال میں یہ کارروائی ہوئی جو ۲۷ ہزار سے ۵ لاکھ تک شمار عیسائیوں کا پہنچ گیا ہے ——

انا للہ وانا الیہ راجعون" (براہین احمدیہ صفحہ ۲۴۲ مطبع لاہور)

یہ تعداد اس وقت کی ہے جس وقت مرزا صاحب ابھی ابتدائی مراحل طے کر رہے تھے اور مسیحیت کے منتہے جا رہے تھے اس کے بعد کی حالت دیکھئے۔ نزول مسیح صفحہ ۲۹ پر فرماتے ہیں۔

"کیونکہ ۱۹ لاکھ مرتد عیسائی پنجاب اور ہندوستان میں ظاہر ہو گیا"

یہ ۱۹ لاکھ کی تعداد اس وقت کی ہے جب مرزا صاحب کا دعویٰ مسیحیت زوروں پر تھا۔ اب خیال فرمائیے کہ جوں جوں مسیحیت میں ترقی ہوتی گئی توں توں عیسائیت ترقی کرتی جاوے گی: پچھلے پچاس سال میں تو ۵ لاکھ ہوئے تھے لیکن جھوٹے "مسیح موعود" کے آنے کے بعد چند سالوں میں پانچ لاکھ سے مرزا جی کے اقرار کے مطابق انیس ۱۹ لاکھ ہو گئے۔ اور ملفوظات احمدیہ حصہ اول صفحہ ۲۷۴ پر فرماتے ہیں۔

"دیکھو اس قدر لوگ جو عیسائی ہو گئے ہیں جن کی تعداد ۲۰ لاکھ تک پہونچی ہے میں نے ایک بشپ کے لیکچر کا خلاصہ پڑھا تھا اس نے بیان کیا کہ ہم ۲۰ لاکھ عیسائی کر چکے ہیں۔"

ملفوظات احمدیہ حصہ اول صفحہ ۲۶۵ میں بھی بعینہ یہی مضمون ہے۔ اور ریویو آف ریلیجنز بابت ماہ نومبر و دسمبر ۱۹۰۳ء صفحہ ۴۲۵ میں مرزا صاحب نے لکھا ہے کہ "۲۹ لاکھ لوگ عیسائی ہو کر مرتد ہو گئے ہیں"۔ یہ ۲۹ لاکھ مرتدین کی مردم شماری مرزا صاحب ہی کے قلم سے ۱۹۰۳ء کی ہے۔ ابھی ۱۹۰۸ء تک (جو مرزا صاحب کے اس جہاں سے کوچ کرنے کا سال ہے) تب تک خدا جانے کتنی ترقی عیسائیت میں ہوئی ہوگی اور پھر ان کے مرنے کے بعد خدا جانے کیا ترقی ہوئی اب ۱۹۲۷ء کی مردم شماری کو اسی پر قیاس فرمالیجئے۔

مرزا صاحب نے اپنی کسر صلیب کی اور احیاء اسلام کا غلبہ دکھایا کہ عیسائیت دن بدن ترقی کر رہی ہے۔ اگر مرزا جی اور ان کی امت یہ جواب دیں کہ غلبہ سے مراد دلائل کا غلبہ ہے تو اول تو وہ باطل ہے جیسے کہ میں نے اخبار بدر نمبر ۱۵ جلد ۲ صفحہ ۹۵ سے ثابت کر دیا ہے کہ غلبہ سے مراد تعداد کا اضافہ ہے علاوہ بریں اگر دلائل کا غلبہ مراد ہے تو کیا قرآن مجید نے عیسائیت کے ستونوں کو نہ توڑا تھا اور دیگر بزرگان حضرت مولانا رحمت اللہ صاحب مہاجر مکی رحمۃ اللہ علیہ نے عیسائیت کی تردید میں کوئی کمی کی تھی جن

(باقی صفحہ ۹۴ پر)

باب — (۴)

کاروبارِ شرک وبدعت

اور

نورِ کتاب وسنّت

ماہ محرم میں مسلمانوں کی بے راہ روی

آہ! خیر امت مشرکوں کے نقش قدم پر

(از جناب مولوی محمد فضیل صاحب مدرس مصباح الاسلام بریلی)

در محرم اینچہ بردیں میرود از جور و ظلم
کس ندیدہ درجہاں جز کشتگانِ کربلا

الحمدللہ! ہم آخرالامم ہیں اور خیرالامم، ہمارے خالق و مالک عزاسمہٗ نے اپنے مقدس صحیفہ میں ہمارا یہ منصب خود ہی یہ بیان فرمایا کنتم خیر امۃ اخرجت للناس تامرون بالمعروف وتنہون عن المنکر وتومنون باللہ (تم بہترین امت ہو، تم عام انسانی دنیا کی اصلاح و رہنمائی کے لئے ہی پردۂ وجود پر لائے گئے ہو۔ تمہارا کام یہ ہے کہ بھلائی کے احکام جاری کرواؤ اور برائی سے روکو اور "ایمان باللہ" کو اپنا شعار بلکہ اپنی پوری زندگی کا محور بنائے رکھو) گویا۔ امت مسلمہ سے الہٰی مطالبہ صرف یہی نہیں ہے کہ وہ خود صالح مومن اور "عامل بالمعروف" بنے بلکہ اس سے مطالبہ یہ بھی ہے کہ وہ اپنا اچھا اثر دوسروں پر بھی ڈالے، دنیا بھر کے بنی نوع انسان کو برائیوں سے نکالنے اور بھلائیوں کی طرف لانے کی کوشش کرے بالفاظ دیگر ہم کو صرف "خیر لازم" نہیں بلکہ "خیر متعدی" ہونا چاہیئے۔ جس راہ سے ہم گزریں اپنی نیکی اور نیک چلنی کے آثار چھوڑ کر گزریں اور جن قوموں میں ہم رہیں بسیں ان کو جاہلیت کی تاریکی سے نکال کر دین فطرت پر لانے کے لئے ہر ممکن جد وجہد کرتے رہیں۔ بس یہ ہونا چاہیئے انسانوں میں ہمارا طغرائے امتیاز۔

لیکن آہ! کہ معاملہ اس کے بالکل برعکس ہو رہا ہے بجائے اس کے کہ ہم دوسروں پر اچھے اثرات ڈالتے اور لوگ ہماری ساعی جمیلہ اور ہمارے چال چلن سے متاثر ہو کے کفر چھوڑ کر شعائر اسلام اختیار کرتے، الٹے ہم دوسروں سے متاثر ہو رہے ہیں اور زندگی کے کسی ایک شعبہ میں نہیں بلکہ حق یہ ہے کہ شاید کوئی شعبہ ہی ہماری زندگی کا ایسا ہو جس میں ہم شعوری

ر پر دوسروں کے قدم بہ قدم نہ چل رہے ہوں اور ان کے جاہلی مراسم سے ہم نے اس میں کوئی
نہ لیا ہو۔

اس وقت دنیا بھر کے مسلمانوں سے ہماری بحث نہیں اگرچہ حال سب جگہ کچھ قریب
یب سا ہی ہے تاہم ہمارے سامنے اس وقت ہندوستانی مسلمانوں کے اعمال اور ان کے
ے ہوئے احوال ہیں۔

اگر آپ تھوڑا سا بھی غور کریں گے تو یقیناً اس نتیجہ پر پہنچیں گے کہ یہاں کے عوام مسلمانوں
پوری زندگی غیروں سے (بالخصوص برادران وطن ہندوؤں سے) متاثر ہوئی ہے، اور
ت یہ ہوگئی ہے کہ ؎ تن ہمہ داغ داغ شد پنبہ کجا کجا نہم۔

بیاہ شادی بلکہ ولادت کی چھٹی چلّہ ہی سے لے کر موت کے تیجے، دسویں اور برسی تک وہ
سی رسم ہے جس کے متعلق تحقیق سے یہ معلوم نہ ہو چکا ہو کہ اس کی اصل برادران ہنود کے
ں سے آئی ہے۔

پھر زندگی کے انفرادی معاملات کے علاوہ اگر آپ غور فرمائیں گے تو اجتماعی امور اور
سائٹی کے دستور میں بھی اس قبیل کی بہت سی چیزیں آپ کو ملیں گی جن کا نسب نامہ کسی غیر مسلم
م ہی میں مل سکے گا۔ گریہ داستان تو بہت طویل ہے جو کسی بڑی فرصت ہی میں سنائی جا سکتی
ے اور اگر آپ خود بھی اس نظر سے مسلمانان ہند کے طرق زندگی اور ان کے مراسم حیات کا تجزیہ
یں گے تو آپ ہی اس تفصیل کو دریافت کر سکیں گے۔ آج تو ہم مسلمانوں کی اس گمراہی اور بے راہ
ی ... کے صرف ایک ہی شعبے کے متعلق چند کلمات عرض کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں جس
لق ماہ محرم الحرام سے ہے۔

ہندوستانی مسلمانوں نے جس طرح اور بہت سی بلکہ بے گنتی چیزوں میں غیر مسلموں کی نقالی
ہے اسی طرح ان کے میلوں ٹھیلوں اور قومی تہواروں کی نقل اتارنے کی بھی پوری کوشش کی ہے
ر یقیناً اس کوشش میں انھوں نے کوئی کمی نہیں کی۔

اسلام اور پیغمبر اسلام نے مسلمانوں کے لئے سال میں صرف دو دن (یوم الفطر اور یوم الاضحی)
ید اور جشن کے لئے مقرر کئے تھے اور ان کا نہایت پاکیزہ اور ستھرا پروگرام بھی خود ہی بتلا دیا تھا۔
ان دونوں دنوں میں جشن بس اس طرح منایا جائے گا کہ اپنے کو صاف ستھرا کر کے اللہ کی عبادت
ی جائے گی، اس کی عظمت و کبریائی اور حمد و ثنا کا غلغلہ بلند کیا جائے گا اور صدقہ و قربانی سے اللہ کے

حکم کی تعمیل کے ساتھ غرباء ضعفاء اور مساکین و فقراء کی مدد کی جائے گی ان دو دنوں کے علاوہ اور کوئی یوم "جشن" اور کوئی تہوار مسلمانوں کے لئے ان کے خدا و رسول نے مقرر نہیں کیا تھا۔

مگر "ہندوستانی مسلمانوں" نے اپنے برادران وطن کو دیکھا کہ ان کے یہاں لاتعداد تہوار ہیں اور مختلف قسم کے ہیں تو انھوں نے اس سلسلہ سے شاید اپنی کمزوری محسوس کی اور ان کے سے ہی تہوار خود اپنے لیے بھی ایجاد کر لئے۔

ہندی مسلمانوں کے جس قدر خود ایجاد تہوار ہیں آپ ان سب کی "تاریخ پیدائش" کا کھوج لگائیں گے تو معلوم ہوگا کہ یہ سب کسی نہ کسی غیر مسلم قوم کی نقالی میں ایجاد کیے گئے ہیں۔ اور اکثر بیشتر تو ہندوؤں ہی سے لئے گئے ہیں۔ اس وقت اور تہواروں سے ہماری بحث نہیں البتہ عشرہ محرم میں تعزیہ داری کی شکل میں جو سوانگ ہندوستان کے مختلف حصوں میں رچایا جاتا ہے صرف اسی کی طرف ہم آپ کی توجہ مبذول کرانا چاہتے ہیں۔

ہندوؤں کی مذہبی تاریخ میں راون اور رام کی جنگ ایک خاص حیثیت رکھتی ہے ہر سال رام لیلا منا کر اس کی یاد تازہ کرتے ہیں۔ (غرض راون اور رام کے درمیان جو معرکہ ہزارہا برس پہلے ہوا تھا یا ہونا بیان کیا جاتا ہے) رام لیلا اسی کی تمثالی یادگار ہے ــــ ہندی مسلمانوں کے یہاں اس قسم کی کوئی چیز نہ تھی انھوں نے اس "کمی" کو اس طرح پورا کیا کہ عشرہ محرم میں معرکہ کربلا کی تمثالی یادگار منانی شروع کر دی ــــ اگر آپ کے علاقہ میں بھی تعزیہ داری اسی طرح اور اتنی ہی دھوم دھام سے منائی جاتی ہو جتنی کہ ہمارے نواح میں تو آپ کو خود بھی اندازہ ہوگا کہ یہ علم اور دُلدُل اور تابوت اور کربلا اور ڈھول دھمکے تاشے باجے رام لیلا کی کیسی نقل ہے۔

اس تعزیہ داری کی قباحتیں اور اس کا خلاف دین و ایمان ہونا اتنا ظاہر ہے کہ کسی درجہ کے سمجھدار مسلمان کے لئے بھی اس کے بیان کرنے کی ضرورت نہیں ــــ ذرا کوئی بتائے تو اس تعزیہ داری کا کونسا جز اور کون سا حصہ وہ ہے جو صریحاً تعلیم اسلام اور روح ایمان کے خلاف نہیں ــــ بخدا اگر قرون اولیٰ نہیں بلکہ قرون وسطےٰ کا بھی کوئی مسلمان عشرہ محرم میں ہمارے علاقہ میں آجائے اور یہاں بریلی، بدایوں اور گرد و نواح کے مسلمانوں کے وہ مجنونانہ تماشے دیکھے جو وہ دین و مذہب کے نام پر اس عشرہ میں کرتے ہیں تو ہرگز یقین نہ کرے کہ یہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے منسوب ہونے والی اور ان کا کلمہ پڑھنے والی امت ہے

قسم کے ساتھ بھی کوئی یہ بتلائے کہ یہ تعزیہ دار لوگ "مسلمان" اور "دینِ محمدؐ" پر ہیں تو وہ یہی کہے گا۔

ہرگزم باورنمے آید ز روئے اعتقاد
ایں ہمہ کردن و دینِ پیمبر داشتن

قرآن پاک میں ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی قوم کے بعض نومسلموں کا (جن کے دلوں میں حقیقت ایمان اچھی طرح راسخ نہیں ہوئی تھی) گزر ایک بت پرست جماعت پر ہوا انھوں نے دیکھا کہ وہ لوگ اپنے بتوں کو پوج رہے ہیں اور ان پر جھکے پڑے ہیں (اور ان کے ہاتھ اس قسم کے کسی خانہ ساز "الٰہ" سے خالی تھے) تو فوراً انھوں نے حضرت موسیٰ کے حضور میں درخواست پیش کردی

اجعل لنا الٰها کما لهم اٰلهة — اے موسیٰ جیسے خدا ان لوگوں کے پاس ہیں ہمارے لئے بھی ایسا ہی ایک خدا بنا دیجئے۔

ٹھیک یہی حالت اب ہے بلکہ روی کا منظر شہادت ان تعزیہ داروں نے عشرۂ محرم کی تعزیہ داری کے ذریعہ کیا ہے بلکہ قوم موسیٰ کے ان نومسلموں نے تو خواہشات کو شکل میں حضرت موسیٰ کے حضور میں پیش کیا تھا۔ ا ت کے ان تعزیہ دار مسلمانوں نے تو کسی سے پوچھے گچھے ان تمام سوانگوں کی نقل عشرۂ محرم میں شروع کردی جو برادران وطن رام لیلا میں کرتے ہیں۔ سچ فرمایا تھا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے۔

لترکبن سنن من کان قبلکم شبراً بشبر و ذراعاً بذراع — تم ضرور اگلی گمراہ امتوں کے قدم بقدم چل کے رہوگے اور وہ سارے کرتوت کروگے جو انھوں نے کیے۔

پھر کتنے افسوس اور رنج و قلق کا مقام ہے کہ یہ سب کچھ دین و مذہب کے نام پر اور سیدنا حضرت حسین شہید کربلاؓ کی محبت کے دعوے کے ساتھ کیا جاتا ہے اگر تعزیہ داری کے کسی حامی میں ایمانی شعور اور اسلامی حس کا کوئی درجہ باقی ہے تو ہم اس سے صرف اتنا عرض کریں گے کہ خدا کے واسطے اپنی ان حرکتوں سے غیروں کی نظروں میں "اللہ کے دین" اور محمد رسول اللہ کی تعلیم کو رسوا نہ کرو، غیر مسلم چونکہ اسلام سے متعلق صحیح معلومات نہیں رکھتے اس لئے وہ تمھارے ان افعال کو (جو تم دین و مذہب ہی کے نام سے کرتے ہو) اسلام سمجھتے ہیں اور پھر ایسے اسلام کو (جو اپنے اندر رام لیلا کا پورا سوانگ رکھتا ہو) وہ کسی طرح بھی اپنے دھرم سے بہتر نہیں کہہ سکتے

یہ جنس تو خود ان کے یہاں موجود ہے اور تم سے زیادہ مقدار میں۔

یقین کرو! کہ تعزیہ داری اور اس کے سلسلے میں عشرۂ محرم میں جو کچھ غیر اسلامی مظاہرے تم کرتے ہو بخدا یہ سب "اسلام" پر تمہارا ظلم ہے اور سخت ظلم ـــــ اللہ اور رسول اس سے ناراض ہوتے ہیں اور بے حد ناراض خود سیدنا امام حسین رضی اللہ عنہ کی روح پاک کو ان حرکتوں سے اذیت ہوتی ہے اور سخت ترین اذیت ـــ اگر تم کسی اور کا لحاظ نہیں کر سکتے تو کم از کم سیدنا حسینؓ ہی کا لحاظ کرو۔

اے آنکہ ز خدا نیامدت شرم و حے
از روح حسین بن علی کن شرمے

(الفرقان ذلقعدہ ۱۳۶۱ھ)

دو گمراہیاں

حیلہ اسقاط اور عبد النبی و عبد الرسول جیسے ناموں کا حکم

اب سے کچھ دنوں پہلے انسوٹ ضلع بڑودچ (گجرات) سے دو سوال بغرض استفتاء آئے تھے ان کا جو جواب لکھا گیا تھا بغرض تعمیم فائدہ اس کو الفرقان میں شائع کیا جاتا ہے۔ "مدیر"

سوالِ اوّل

ہمارے یہاں حیلۂ میت نکالا جاتا ہے جس کی صورت یہ ہوتی ہے کہ میت کا جنازہ مکان کے باہر رکھ کر ایک من دو سیر گیہوں اور ایک قرآن شریف مکان سے لایا جاتا ہے۔ بعد میں گاؤں کے قاضی صاحب گاؤں کے فقیر کو بلا کر اس کو اس طرح کہتے ہیں کہ "اس میت نے بلوغت کے بعد جتنے گناہ کئے ہوں خدا کے واسطے اپنے ذمہ لیتا ہے۔؟ تو وہ فقیر ان گناہوں کو اپنے ذمہ لے لیتا ہے۔ بعد میں وہ گیہوں اور قرآن شریف کا ہدیہ سوا روپیہ فقیر اور ملا جی آپس میں تقسیم کر لیتے ہیں اب سوال یہ ہے کہ اس قسم کا حیلہ کرنا شرعاً جائز ہے یا نہیں؟ اور کرنے والا کیسا ہے۔

جواب

لا الٰہ الا اللہ ولا حول ولا قوۃ الا باللہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سچ فرمایا تھا بدء الاسلام غریباً وسیعود غریباً۔ یعنی اسلام اپنے ابتدائی آغاز میں بھی دنیا کے لیے اجنبی غیر معروف اور نامانوس تھا اور بعد میں بھی وہ ایسا ہی اوپرا اور نامعروف ہو کر رہ جائے گا۔ اسلام کی غربت اور نامعروفی اور اس کی اجنبیت و نامانوسی اس سے زیادہ اور کیا ہوگی کہ خود اسی کے نام لیوا اسی کے نام پر اور اسی کا کام کہہ کر ایسی ایسی خرافات کرتے ہیں جس سے کفر و کافری بھی شرمائے

قرآن شریف نے اگلی امتوں کے گمراہوں کے متعلق فرمایا ہے۔ (اتخذوا دینھم لعبا ولھوا) یعنی انھوں نے اپنے دین کو کھیل کھلونا بنا رکھا ہے۔ دین خدا کے ساتھ اس سے بڑھکر اور کیا کھیل بازی اور گستاخی ہو سکتی ہے کہ اس کے قانون جزا و سزا کے ساتھ یہ لعب اور یہ مسخرہ روا رکھا جائے۔

اگر شرعی اوامر ونواہی، خدائی مطالبات اور الٰہی فرائض کی بس اتنی ہی حقیقت ہے کہ مرنے کے پیچھے سوا روپیہ کے خرید کردہ ایک نسخہ قرآن اور ایک من بارہ سیر گیہوں کی ادائیگی ان سے فارغ الذمہ کر دیتی ہے تو سارا دین بلکہ وحی پیغمبری کا سارا سلسلہ معاذ اللہ ایک کھیل تماشہ سے زیادہ وقعت نہیں رکھتا۔ قرآن پاک تو جابجا صاف کہتا ہے۔ (لا تجزی نفس عن نفس شیئا ولا یؤخذ منھا عدل) اور (لا یقبل منھا عدل) یعنی کوئی شخص کسی شخص کی طرف سے بدلہ نہیں دے سکتا اور نہ کسی نفس کی طرف سے معاوضہ لیا جائے گا نیز وہ پوری وضاحت اور صراحت کیساتھ یہ بھی اعلان کرتا ہے۔

لَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰی (نجم) — کوئی شخص کسی دوسرے کے گناہوں کا بوجھ اپنے اوپر نہیں لے سکتا۔

پس جو لوگ گناہوں کی خرید و فروخت کا یہ کاروبار کرتے ہیں اور اس عقیدے کے ساتھ کرتے ہیں کہ اس طرح مرنے والے کے گناہ اس قرآن یا فقیر پر لدھ جاتے ہیں اور مرنے والا بے گناہ ہو جاتا ہے وہ نہ صرف عاصی اور گنہگار ہی ہیں بلکہ قرآن پاک کی ان واضح نصوص کے منکر بھی ہیں معاذ اللہ۔

درحقیقت یہ نظریہ کہ کوئی کسی کے گناہوں کا بوجھ اٹھا سکتا۔ کسی معاملہ یا معاہدہ کی بنا پر ایک کے گناہ دوسرا اپنے ذمہ لے سکتا ہے) بعض کافروں کا تھا جسکی قرآن پاک نے نہایت صراحت اور پورے زور کے ساتھ تردید اور تکذیب کی ہے اور بتایا ہے کہ اسطرح جو لوگ دوسروں کے گناہ اپنے ذمے لیتے ہیں۔ وہ دوسروں کا بوجھ تو کچھ بھی ہلکا نہیں کر سکتے البتہ اپنی اس حرکت اور جرأت بیجا کی وجہ سے اپنے گناہوں میں اضافہ کر لیتے ہیں۔ سورہ عنکبوت میں ہے۔

وقال الذین کفروا للذین آمنوا اتبعوا سبیلنا ولنحمل خطایاکم وما ھم بحاملین من خطایاھم من شیء انھم لکاذبون (عنکبوت)

اور کافروں نے مسلمانوں سے کہا تم ہمارا کہنا مانو اور ہماری راہ چلو تمہارے سارے گناہ ہم اپنے سر لیتے ہیں حالانکہ یہ لوگ ان کے گناہوں میں سے ذرا بھی نہیں لے سکتے۔ وہ بالکل جھوٹ بولتے ہیں

أَلَا لَهُمْ وَأَثْقَالًا مَعَ أَثْقَالِهِمْ وَلَيُسْأَلُنَّ يَوْمَ الْقِيَامَةِ عَمَّا كَانُوا يَفْتَرُونَ ۔ (سورۂ عنکبوت)

ہاں! ان پر اپنے گناہوں کے ساتھ اور گناہوں کا بوجھ بھی لدے گا۔ اور قیامت کے دن ان سے اس افترا پردازی کی ضرور باز پرس ہوگی ——!

افسوس یہ شدید اور کافرانہ گمراہی "امت مسلمہ" میں بھی در آگئی یہاں تک کہ ایک مسلمان کو اس بارے میں یہ استفتا کرنے کی ضرورت پیش آرہی ہے۔ کہ یہ حیلہ شرعاً جائز ہے یا نہیں؟ —— اور اس کا کرنے والا کیسا ہے۔ حالانکہ ایک مسلمان کو اگر ضرورت ہو سکتی ہے تو یہ پوچھنے کی ہو سکتی تھی کہ اس فعل اور اس کے فاعلوں پر خدا کی کتنی لعنت ہوتی ہے۔

(سوالِ دوم)

"عبدالنبی، اور عبد الرسول" نام رکھنا کیسا ہے؟ بعض لوگ وَأَنكِحُوا الْأَيَامَىٰ مِنكُمْ وَالصَّالِحِينَ مِنْ عِبَادِكُمْ وَإِمَائِكُمْ میں "مِنْ عِبَادِكُمْ" کے لفظ سے ان ناموں کے جواز کیلئے استدلال کرتے ہیں۔ اس مسئلہ پر ذرا مفصل روشنی ڈالی جائے؟

(جواب)

"اسلام" دین التوحید ہے" اور اس کے ان خصائص میں سے جن کی وجہ سے اس کو دوسرے ادیان پر فوقیت حاصل ہے ایک اہم ترین خصوصیت یہ ہے کہ اس نے توحید کے استحکام کے لیے صرف شرک اور مظاہرِ شرک ہی کے استیصال پر اکتفا نہیں کیا ہے بلکہ جو چیز اور جو کام کسی طرح بھی شرک کا سبب بن سکتے تھے یا جن امور میں شرک کا کوئی شائبہ اور واہمہ بھی ہو سکتا تھا، اس نے ان پر بھی کڑی بندش عائد کر دی۔ جس شخص نے قرآن و حدیث کا بصیرت کے ساتھ مطالعہ کیا ہوگا اس کے علم میں اسلام کی وہ تمام بندشیں تفصیل کے ساتھ ہوں گی جو ایسی چیزوں پر عائد کی گئی ہیں جن کے کسی طرح مُنجر الی الشرک ہونے کا شبہ ہو سکتا تھا۔ مثلاً آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے "ماشاء اللہ و شاء محمد" کہنے سے بھی صحابہ کو منع فرمایا" اور حیاتِ مبارکہ میں اپنی ذات مقدسہ کو اور بعد وفات اپنی قبر منور کے لیے تعظیماً سجدہ کرنا بھی حرام قرار دیا بلکہ اپنے لیے قیام تعظیمی سے بھی صحابہ کو منع فرمایا۔

علیٰ ھذا دفع امراض کے لیے کانسی پیتل کے کڑے پہننے، گلے میں ایسے فلیتے ڈالنے، منکا لٹکانے اور تانت باندھنے کا مشرکین میں جو رواج تھا، امت کو شائبہ شرک سے بچانے کے لیے ان چیزوں سے بھی آپ نے ممانعت فرما دی ——

اسی طرح آفتاب پرستوں کی ظاہری اور صوری مشابہت بلکہ آفتاب پرستی کے شبہ اور شائبہ سے بھی اپنی امت کو بچانے کے لیے طلوع و غروب و زوال کے وقت نماز ادا کرنے سے بھی منع فرمایا۔ قبروں کو پختہ بنانے، ان پر عمارتیں بنوانے اور ان پر چراغاں کرنے سے امت کو روک دیا اور اس بارہ میں نہایت سخت احکام نافذ کئے، یہ سب اس لیے کہ انہی راہوں سے امت میں شرک گھس سکتا یا کم از کم شرک کا شائبہ آسکتا تھا۔ ـــــــ"

جس شخص نے اسلام کے مزاج کو کچھ بھی سمجھا ہے اور ان احکام کی روح اور علم پر کچھ بھی غور کیا ہے تو وہ ایک لمحہ کے لیے بھی اس میں شک نہیں کر سکتا کہ "عبدالنبی"، "عبدالرسول"، "عبدالمصطفیٰ" جیسے نام رکھنا اسلام کی روح کے خلاف جنگ اور اسلامی توحید کے تقاضے کے قطعاً منافی ہے اور کم سے کم مولوی "ملا" کا "دلیلوں اور تاویلوں" سے اس کا جواز "ثابت" کرنے کا "جاہلانہ" استحسان نکالنا افسوسناک اور بے جا ہے۔ اور ان گمراہیوں سے ایک گمراہی ہے جن کے امت مسلمہ میں پھیلنے کی پیش گوئی خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے اس ارشاد میں فرمائی تھی ـ

لتتبعن سنن من كان قبلكم شبرًا بشبر وذراعًا بذراع (بخاری)

تم ضرور بالضرور اگلے گمراہوں کے طور و طریقوں کی قدم بقدم پیروی کرو گے۔

کون نہیں جانتا کہ مشرکین عرب عبد وُد، عبدالعزیٰ، اور عبدالشمس قسم کے نام رکھتے تھے، مشرک ہندو بھی اپنے بچوں کے نام گنگا داس، جمنا داس، لچھمن داس وغیرہ رکھتے ہیں (اور داس کے معنیٰ قریب قریب وہی ہیں جو "عبد" کے ہیں) عیسائیوں میں عبدالمسیح بہت رواج یافتہ اور مقبول نام ہے پس جو لوگ عبدالنبی اور عبدالرسول جیسے نام رکھتے ہیں وہ عملاً ان جاہلان شرک کی پیروی کر رہے ہیں ـــــــ یہ مانا کہ عبد کے معنیٰ مملوک غلام کے بھی ہیں اور کبھی اس سے محض خادم بھی مراد ہوتا ہے اور اسی سبب سے اس قسم کے نام رکھنے کی وجہ سے ہم کسی کو مشرک "بالمعنی المصطلح" اور خارج از اسلام نہیں کہہ سکتے۔ لیکن ایسے نام میں شرک اور شائبہ شرک اور تتبع طریق مشرکین سے اس کو خالی بھی نہیں کہا جاسکتا۔ اور اس لئے اس کے عدم جواز میں شبہ نہیں کیا جاسکتا جو دین ماشاء اللہ و شئت، اور ماشاء اللہ و شاء محمد جیسی تعبیرات کو برداشت نہیں کر سکتا وہ عبدالنبی و عبدالرسول و عبدالمصطفیٰ جیسے ناموں کو کیونکر برداشت کر سکتا ہے اور جس پیغمبر نے غلاموں اور باندیوں کیلئے عبدی و امتی کے لفظ سے خطاب کرنے سے لوگوں کو منع فرمایا حالانکہ ان میں مشکل ہی سے کسی

معنی شرک کا وہم ہو سکتا ہے۔) اس پیغمبر کی لائی ہوئی شریعت میں اس قسم کے نام رکھنے کی کس طرح گنجائش ہو سکتی ہے جس میں امکان وہم شرک سے گذر کر "ایہام شرک" اور پھر ایک "رسم کافری" کا اتباع بھی ہو۔

ہاں تو جس شخص نے روح شریعت کو کچھ بھی پہچانا ہے اس کو اس میں شبہ نہیں ہو سکتا کہ اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے کوئی شخص ایسا نام رکھتا تو آپ ضرور اس کو منع فرماتے جس طرح کہ "ما شاء اللہ و شئت" اور "ما شاء اللہ و شاء محمد" سے منع فرمایا — بلکہ اس کے بارے میں آپ کی مخالفت اشد ہوتی۔ کیوں کہ بہ نسبت اس کلمہ کے شرکیہ معنی کا ایہام ان ناموں میں بدرجہا زیادہ ہے۔ کیوں کہ ناموں میں عبدیت کی نسبت اپنے "معبود" ہی کی طرف تمام ملتوں کے عرف میں شائع ذائع ہے اور عبد بمعنی مملوک یا بمعنی خادم کے استعمال کا رواج کسی قوم اور کسی ملت کے ناموں میں معلوم نہیں۔

یہیں سے یہ بھی معلوم ہو سکتا ہے کہ ناموں کے جواز کے لیے آیت کریمہ "وانکحوا الایامی منکم والصالحین من عبادکم" سے سند پکڑنا کیسی شدید جہالت ہے عام محاورات اور تعبیرات میں زبان عرب کے اندر غلاموں کے لیے "عبد" کا استعمال شائع ذائع ہے اور واقع لیے سوا تعین معنی شرکیہ کا وہم بھی کسی کو نہیں ہو سکتا۔ بخلاف عبد النبی اور عبد الرسول جیسے ناموں کے کیونکہ ناموں میں عبد بمعنی غلام یا بمعنی خادم کا استعمال متعارف نہیں ہے اس لیے وہاں شرک کا ایہام فرد ہے اور اس فرق سے انکار کوئی جاہل معاندہی کر سکتا ہے۔

خیر یہ تو اصولی بحث تھی اور ایسے مسائل میں غور و بحث کا صحیح طریقہ بھی یہی ہے۔ لیکن چوں کہ اس قسم کے شرکیہ نام رکھنے کی بدعت اب سے پہلے مسلمانوں میں آچکی تھی اس لیے اُن علمائے کرام کی تصنیفوں اور فتووں میں بھی ان ناموں کے حرام وناجائز ہونے کی تصریح حسن اتفاق سے موجود ہے جن کو یہ گمراہ اور شرک نواز "مدعیان اسلام" بھی معتبر و مستند مانتے ہیں — چند تصریحات ملاحظہ ہوں —

شیخ علی قاری حنفی "مرقاۃ شرح مشکوٰۃ" میں زیر حدیث "احب اسمائکم عند اللہ عبد اللہ وعبد الرحمٰن" ارقام فرماتے ہیں۔

وَلَا یجوز نحو عبد الحارث وَلَا عبد الحارث اور ایسے ہی عبد النبی جیسے ناموں کا

عبد النبی ولا عبرة بما شاع بین الناس۔ (مشکوٰۃ)

رکھنا جائز نہیں ہے اور لوگوں میں جو یہ بات پھیل گئی ہے اس کا کوئی اعتبار نہیں۔

اور یہی علی قاری شرح فقہ اکبر میں فرماتے ہیں۔

واما ما اشتهر من التسمیة بعبد النبی فظاهره کفر الا ان اراد بالعبد المملوك۔

اور یہ جو عبد النبی نام رکھنا شائع ہو گیا ہے تو اس کا ظاہر تو کفر ہے مگر یہ کہ عبد سے مملوک مراد ہو۔

واضح رہے کہ یہ استثنا حکم کفر سے ہے ورنہ عدم جواز ہر صورت ہے جیسا کہ پہلی عبارت ظاہر ہے۔ اور ابن حجر مکی شافعی منہاج کی شرح میں فرماتے ہیں۔

ویحرم ملك الملوك لان ذالك لیس لغیر الله وکذا عبد النبی وعبد الکعبه او الدار او علی او الحسن لایهام التشریك (شرح منہاج)

اور ملک الملوک ۔ لقب یا نام اختیار کرنا حرام ہے کیونکہ یہ شان سوائے خدا کے کسی کی نہیں ہے۔ اور ایسے ہی عبد النبی اور عبد الکعبہ اور عبد الدار اور عبد علی، عبد الحسن یہ نام بھی حرام ہیں ایہام شرک کی وجہ سے۔

اور حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ "حجۃ اللہ البالغہ" میں بعض خاص قسم کے مشرکین کی یہ عادت وحالت بیان کرنے کے بعد کہ وہ عبد المسیح اور عبد العزّیٰ جیسے نام رکھتے ہیں فرماتے ہیں ـــــ۔

وهذا مرض جمهور الیهود و النصاری والمشرکین وبعض الغلاة من منافقی دین محمد صلی الله علیه وسلم فی یومنا هذا ـــ

اور یہ عام یہود ونصاریٰ اور تمام مشرکین کی بیماری ہے اور ہمارے زمانے کے غالی لوگ (جن کو دین محمدی کا منافق کہنا چاہئے وہ بھی) اس میں گرفتار ہیں۔

اور یہی شاہ صاحب قدس سرہ اپنے ترجمہ قرآن (فتح الرحمٰن) میں آیت فلما اٰتٰهما صالحًا جعلا له شرکاء پر فائدہ لکھتے ہوئے رقم فرماتے ہیں۔

وازیں جا دانستہ شد کہ شرک در تسمیہ نوعے است از شرک چناں کہ اہل زمان غلام فلاں و عبد فلاں نام نہند واللہ اعلم۔

اور یہاں ہی سے یہ معلوم ہو گیا کہ ناموں میں شرک بھی شرک کی ایک قسم ہے جیسا کہ ہمارے زمانے کے لوگ غلام فلاں اور عبد فلاں نام رکھتے ہیں۔

اور حضرت شاہ عبد العزیز محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ تفسیر فتح العزیز میں زیر آیت الا تجعلوا للہ اندادا، وجوہ شرک بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

—— از انجملہ آنکہ کسانیکہ در نام نہادن خود را بندہ فلاں و عبد فلاں میگویند و ایں شرک در تسمیہ است ——" | اور ان ہی میں سے وہ لوگ بھی ہیں جو اپنے نام رکھنے میں بندہ فلاں، عبد فلاں کہتے ہیں یہ "شرک فی التسمیہ" ہے۔

اور اصل یہ ہے کہ جس کے دل میں اسلام کی توحید رچ چکی ہو اور اصل توحید کا رنگ جس پر چڑھ چکا ہو وہ کسی حال میں اللہ کے سوا کسی اور کی "عبدیت" پر برائے نام بھی راضی نہیں ہو سکتا۔ صبغۃ اللہ ومن احسن من اللہ صبغۃ ونحن لہ عابدون ۝

جو لوگ ان امراض میں عملاً گرفتار ہیں یا جو علم فروشی اپنی "منطقی تاویلوں" یا تشقیقوں سے ایسی گمراہیوں کے جواز کیلئے راہیں نکال کر لوگوں کی گمراہیوں میں اپنے بدتر از جہل علم سے مدد کرتے رہتے ہیں۔ درحقیقت وہ ظالم اس امانتِ الٰہیہ کے اصل ذوق ہی سے محروم ہیں جس کا نام توحید ہے۔
اَلَا لَعْنَةُ اللهِ عَلَى الظّٰلِمِيْنَ الَّذِيْنَ يَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللهِ وَيَبْغُوْنَهَا عِوَجًا
وَثَبَّتَنَا اللهُ عَلَى الصِّرَاطِ الْمُسْتَقِيْمِ

عقیدۂ علمِ غیب

قرآن و حدیث اور ارشاداتِ صحابہؓ کی روشنی میں

۱۳۵۲ھ میں آگرہ کے ایک صاحب نے مدیر الفرقان سے چند سوالات کئے تھے اور الفرقان کے ذریعہ ان کا جواب چاہا تھا ان میں پہلا سوال یہ تھا کہ :-

"رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو "علم غیب" تھا یا نہیں؟ براہ کرم مدلل قرآن و حدیث سے اس کا جواب دیجئے۔"

اس سوال کا مندرجہ ذیل جواب جمادی الاخری ۱۳۵۲ھ کے الفرقان میں شائع ہوا تھا۔

الجواب

بعون اللہ الملک الوھاب وھو الملھم للصدق والصواب

سوال میں علم غیب کا لفظ مبہم ہے، اس کے بہت سے معانی ہوسکتے ہیں اور ہر صورت میں جواب جداگانہ ہوگا جس کی مختصر تفصیل یہ ہے کہ اگر علم غیب سے بغیر خدا کی وحی و الہام اور بدون اس کی عطا کے غیب کا علم مراد ہے تو جواب یہ ہے کہ کسی مخلوق کو بھی ایسا علم غیب نہیں ہے جو ایک ذرہ کا بھی ایسا علم کسی نبی یا فرشتہ یا ولی کے لئے ثابت کرے وہ کافر اور مشرک ہے۔ یہ تمام امت کا اجماعی مسئلہ ہے۔ اس میں کسی کا اختلاف نہیں۔ خود مدعیان علم غیب کے رأس و رئیس جناب مولوی احمد رضا خاں صاحب

اپنے رسالہ "الدولۃ المکیۃ" اور "خالص الاعتقاد" میں تصریح فرماتے ہیں۔

فالاول (ای العلم الذاتی) مختص بالمولیٰ سبحانہ وتعالیٰ لایمکن لغیرہ ومن اثبت شیئاً منہ ولو ادنیٰ من ادنیٰ من ذرۃ لاحد من العالمین فقد کفر واشرک وباد وھلک۔ (الدولۃ المکیۃ ص)	علم ذاتی اللہ عزوجل سے خاص ہے اس کے غیر کے لیے محال ہو جو اس میں سے کوئی چیز اگرچہ ایک ذرہ سے کمتر سے کمتر غیر خدا کے لیے مانے وہ یقیناً کافر و مشرک ہے (اور برباد ہوا اور ہلاک ہو گیا) (خالص الاعتقاد ص)

(ب) اور اگر علم غیب سے بلا استثناء تمام غیوب کا علم عطائی مراد ہے تو جواب یہ ہے کہ یہ بھی کسی مخلوق کو حاصل نہیں، قرآن کریم کی بہت سی آیات کریمہ اور آنحضرت صلعم کی صحیح احادیث اس پر ناطق ہیں مگر چوں کہ یہ مسئلہ بھی ہمارے اور بریلوی حضرات کے درمیان متفق علیہ ہے اس لیے ہم اس پر بھی دلائل پیش کرنے کی ضرورت نہیں سمجھتے ۔ علاوہ بریں یہ کہ چوتھی صورت میں جو دلائل پیش کیے جائیں گے وہی اس کے لیے بھی کافی ہوں گے۔

(ج) اور اگر علم غیب سے مطلق غیب کا علم مراد ہے (یعنی یہ کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو کچھ غیب کی اطلاع دی) تو یہ صحیح ہے بیشک خداوند عالم نے اپنے حبیب اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو عالم غیب کی بہت سی باتوں کا علم عطا فرمایا جس پر قرآن و حدیث شاہد ہے لیکن اس کو علم غیب سے تعبیر کرنا درست نہیں۔ کیوں کہ اس میں ایک امر باطل کا ایہام ہے، خود فاضل بریلوی "الدولۃ المکیۃ" صفحہ ۱۶ اسی اطلاق علم غیب کی بحث میں علامہ ابن المنیر المالکی سے نقل فرماتے ہیں۔

کم من معتقد لا یطلق القول بہ خشیۃ ایھام غیرہ مما لا یجوز اعتقادہ۔	کتنی ہی چیزیں ہیں کہ عقیدے میں داخل ہیں مگر ان کا اطلاق نہیں کیا جا سکتا بخوف اس کے کہ وہ کسی دوسری ایسی چیز کی طرف موہم ہو جائیں جس کا اعتقاد جائز نہ ہو۔

البتہ یوں کہہ سکتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے حضور کو غیب پر اطلاع دی۔

علامہ سید محمود آلوسی مفتی بغداد اپنی تفسیر "روح المعانی" میں ارقام فرماتے ہیں۔

سلہ مولوی احمد رضا خاں صاحب "خالص الاعتقاد" صفحہ ۲۳ پر تحریر فرماتے ہیں "اور ہم عطائے الٰہی سے بھی بعض علم ہی ملنا مانتے ہیں نہ کہ جمیع" ۱۲ منہ۔

وَلا اری حسنا قول القائل انه علیه الصلوٰۃ والسلام یعلم الغیب واستحسن ان یقال بدله انه صلعم اطلعه اللہ تعالیٰ علی الغیب او علمه سبحانه ایاه او نحو ذالک۔	اور میں کسی کہنے والے کے اس قول کو اچھا نہیں سمجھتا۔ "کہ حضور علم غیب رکھتے تھے" اور اس کو اچھا سمجھتا ہوں کہ اس کے بدلے یوں کہا جائے کہ حضور صلعم کو اللہ تعالیٰ نے غیب کی اطلاع دی یا یوں کہا جائے کہ حضور صلعم کو اللہ تعالیٰ نے غیب کی باتیں بتلائیں یا اسی کے مثل۔

(ح) اور اگر علم غیب سے آجکل کے اہل بدعت کے عقیدے کے مطابق جمیع ماکان و مایکون کا علم مراد ہوتا ہے تو وہ بھی باطل ہے جیسا کہ بہت سی آیات قرآنیہ اور صدہا احادیث نبویہ اس پر شاہد ہیں، یہ عاجز اس مسئلہ کی پوری تفصیل اپنے رسالہ "بوارق الغیب" میں کر چکا ہے اس وقت صرف پانچ آیتیں اور علیٰ ہذا پانچ ہی حدیثیں پیش کی جاتی ہیں۔

پہلی آیت | له غیب السمٰوات والارض ابصر به واسمع ٥	صرف اسی کو ہے آسمان و زمین کے کل غیب کا علم وہ کتنا بصیر اور کس قدر سمیع ہے۔

اس آیت کا مفاد یہ ہے کہ آسمان اور زمین کے غیب کا علم کلی[1] صرف خدا کو ہے چنانچہ تفسیر خازن میں اس آیت کریمہ کی تفسیر یں فرماتے ہیں۔

یعنی انه تعالیٰ لا یخفی علیه شئی من احوالھما فانه العالم وحدہ به صفحہ $\frac{169}{4}$	یعنی اللہ تعالیٰ پر آسمان و زمین کے حالات میں سے کوئی چیز بھی مخفی نہیں بس وہی تنہا ان کا جاننے والا ہے

نیز تفسیر مدارک التنزیل صفحہ $\frac{9}{3}$ ج اور تفسیر ابی السعود صفحہ $\frac{58}{6}$ ج اور تفسیر جلالین وغیرہ میں مختلف الفاظ میں تقریباً یہی مطلب ادا کیا گیا ہے۔

دوسری آیت | وللہ غیب السمٰوات ۱۹	آسمانوں اور زمین کے غیب کا علم صرف اللہ

[1] مفسرین نے علم کلی کی نفی غالباً غیب کی اضافت سے نکالی ہے کیوں کہ الف لام کی طرح اضافت بھی استغراق کی مفید ہو جاتی ہے (جیسا کہ مطول اور اس کے حواشی میں مذکور ہے) اور عقلی قرینہ تو بالکل ظاہر ہے کیوں کہ زمین و آسمان کی بعض مخفی چیزوں کی اطلاع تو دوسروں کو بھی ہے لہٰذا اس لئے "غیب السمٰوات والارض" کے علم کلی کا اختصاص اللہ تعالیٰ کے ساتھ درست ہو سکتا ہے۔ ۱۲ منہ

والارض۔ وھو (....) ہی کو ہے۔

اس آیت میں بھی آسمان و زمین کے غیب کا علم کلی اللہ تعالیٰ کے ساتھ خاص بتایا گیا ہے۔ تفسیر بیضاوی میں اس آیت کے ذیل میں ہے۔

وللہ غیب السموات والارض مختص بہ لایخفی علیہ خافیۃ فیہما — (آسمانوں اور زمین کے غیب کا علم صرف اللہ ہی کو ہے اسی کے ساتھ خاص ہے اور زمین و آسمان کی کوئی پوشیدہ چیز اس پر مخفی نہیں ——

اسی مضمون کو علامہ علی بن محمد خازن نے تفسیر لباب التاویل کے صفحہ ۲۱۲ ج ۲ پر اور علامہ نسفی حنفی نے تفسیر مدارک التنزیل صفحہ ۱۹۱ ج ۲ پر اور خطیب شربینی نے تفسیر سراج منیر کے صفحہ ۲۵۵ ج ۲ (اور علامہ) معین بن صفی نے تفسیر جامع البیان صفحہ ۱۸۵ ج ۱ پر مختلف الفاظ میں ادا کیا ہے۔

تنبیہ واضح رہے کہ ان دونوں آیتوں میں غیب مطلق کا ذکر نہیں ہے کہ ماکان وما یکون کو اس کا ایک محض حصہ قرار دے دیا جائے بلکہ یہاں صرف آسمان و زمین کے غیب کا ذکر ہے اور اسی کے علم کلی کو اللہ تعالیٰ کے ساتھ مخصوص بتایا گیا ہے اور وہ یقیناً ماکان وما یکون میں داخل ہے۔ (فتأملوا)

تیسری آیت | ورسلاً قد قصصناھم علیک من قبل ورسلاً لم نقصصھم علیک (سورۃ النساء) — (اور بہت سے ایسے) رسول بھیجے ہم نے کہ ان کو ہم نے آپ سے پہلے بیان کر دیا ہے اور بہت سے ایسے رسول کہ ہم نے ان کو آپ سے بیان نہیں کیا۔

اس آیت کریمہ سے معلوم ہوا کہ خدا کے بعض رسول ایسے ہیں جن کا ذکر رسول خدا صلعم سے نہیں کیا گیا اور ظاہر ہے کہ وہ بھی ماکان وما یکون میں داخل ہیں۔

اور حضرت علی کرم اللہ وجہہ رضی اللہ عنہ سے اسی آیت کے ذیل میں مروی ہے ——

بعث اللہ نبیاً من الحبش وھو ممن لم نقصص علیٰ محمد صلعم (اخرجہ الطبرانی فی الاوسط وابن مردویہ) — اللہ تعالیٰ نے (قوم) حبش میں سے ایک نبی کو مبعوث کیا تھا اور وہ ان میں سے ہیں جن کا بیان رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے نہیں کیا گیا۔

اور اسی لیے کتب عقائد میں تصریح فرمائی گئی ہے کہ انبیاء علیہم السلام کا کوئی خاص عدد مقرر

نہ کیا جائے۔

چنانچہ عقائد اہلسنت کی درسی کتاب شرح عقائد نسفی کے صفحہ ۱۰۱ پر ہے۔

الاولیٰ ان لایقتصر علی عدد فی التسمیة فقد قال الله تعالیٰ منهم من قصصنا علیك ومنهم من لم نقصص علیك ولایؤمن فی ذکر العدد ان یدخل فیهم من لیس منهم... او یخرج منهم من هو فیهم... یعنی ان خبر الواحد... لایفید الا الظن ولاعبرة بالظن فی باب الاعتقادیات خصوصاً اذا کان القول بموجبه یفضی الی مخالفة ظاهر الکتاب وهو ان بعض الانبیاء لم یذکر للنبی علیه الصلوٰة والسلام انتهیٰ

(شرح عقائد نسفی مطبوعہ مجتبائی ص۱۰۱)

بہتر یہ ہے کہ انبیاء علیہم السلام کے بارے میں اقتصار نہ کیا جائے کسی عدد پر نام لینے میں اسلئے کہ اللہ تعالیٰ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے فرماتا ہے کہ ان میں سے بعض کو ہم نے تم سے بیان کر دیا اور بعض کو بیان نہیں کیا اور کسی عدد کے ذکر کرنے میں خوف ہے کہ بعض انبیاء علیہم السلام خارج ہو جائیں یا غیر نبی سلسلہ انبیاء میں داخل ہو جائیں......

مطلب یہ ہے کہ خبر واحد اگر صحیح بھی ہو تو محض ظن کی مفید ہوتی ہے اور اعتقادیات میں ظن معتبر نہیں بالخصوص جبکہ اسکے مضمون کا قائل ہونا ظاہر کتاب اللہ کی مخالفت تک پہونچاتا ہو اور وہ (ظاہر قرآن مجید یہ ہے) کہ بعض انبیاء علیہم السلام کا ذکر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے نہیں کیا گیا۔

چوتھی آیت | وما یعلم جنود ربك الا هو (مدثر)

اور تمھارے پروردگار کے لشکروں (کی تعداد) کو اس کے سوا کوئی نہیں جانتا۔

بقرینہ سیاق وسباق عام مفسرین نے "جنود" سے ملائکۃ الله کو مراد لیا ہے اس بنا پر آیت کا مطلب یہ ہوا کہ اللہ تعالیٰ کے فرشتوں کی تعداد کو اس کے سوا کوئی نہیں جانتا۔ اور ظاہر ہے کہ فرشتے بھی "ماکان وما یکون" میں داخل ہیں۔

عماد المفسرین حافظ الحدیث امام ابن کثیر اس آیت کی تفسیر میں فرماتے ہیں۔

(۱) ما یعلم عددهم وکثرتهم الا هو تعالیٰ۔ صفحہ ۱۱ ج۱۰

یعنی ان کے عدد اور ان کی کثرت کو خدا کے سوا کوئی نہیں جانتا۔

اور تفسیر خازن میں اسی آیت کے ذیل میں ہے۔

المعنی ان الخزنة تسعة عشر ولهم اعوان و جنود من الملائكة لا يعلم عددهم الا الله تعالىٰ خلقوا لتعذيب اهل النار

صفحہ ۱۲۸ ج ۷

اس آیت کا مطلب یہ ہے کہ اگرچہ جہنم کے خازن انیس ۱۹ ہی ہیں۔ لیکن ان کے بہت سے مددگار ہیں اور فرشتوں کے بہت سے لشکر ہیں جن کی تعداد کو خدا کے سوا کوئی نہیں جانتا وہ جہنمیوں کے عذاب کے لیے ہی پیدا کیے گئے ہیں۔

اور تفسیر معالم التنزیل میں حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما کے تلمیذ (شاگرد) حضرت عطاء سے بعینہٖ یہی مضمون منقول ہے۔

پانچویں آیت | يسئلونك عن الساعة ايان مرسٰها قل انما علمها عند ربي لا يجليها لوقتها الا هو ثقلت في السمٰوٰت والارض لا تاتيكم الا بغتة يسئلونك كانك حفي عنها قل انما علمها عند الله ولكن اكثر الناس لا يعلمون ٥

(اعراف رکوع ۲۳)

(اے ہمارے رسول) لوگ آپ سے سوال کرتے ہیں قیامت کے متعلق کہ کب آئے گی فرما دیجئے کہ بس اس کا علم میرے رب ہی کو ہے نہیں ظاہر کرے گا اس کو اس کے وقت پر مگر اللہ تعالیٰ۔ —— بھاری ہے وہ آسمانوں اور زمینوں میں —— وہ اچانک بے خبری ہی میں آئے گی وہ آپ سے سوال کرتے ہیں گویا کہ آپ اس کو جانتے ہیں۔ کہہ دیجئے کہ اس کا علم اللہ ہی کو ہے۔ لیکن بہت سے لوگ اس حقیقت سے ناواقف ہیں۔

اس آیت کریمہ کے آخری کلمات کی تفسیر کرتے ہوئے سید المفسرین حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں:

قال ابن عباس رضی اللہ سال الناس محمدا صلى الله عليه وسلم عن الساعة مسألة سوال قوم كانهم يرون ان محمدا صلى الله عليه وسلم حفي بهم فاوحى الله اليه انما علمها عنده استأثر بعلمها فلم يطلع عليها ملكا ولا رسولا۔ (تفسیر ابن جریر صفحہ ۹۴ ج ۹)

جب لوگوں نے حضور سے قیامت کے متعلق سوال کیا تو ان لوگوں کا سوال ایسا کہ وہ گویا حضور کو اپنے پر مہربان سمجھتے ہیں۔ پس اللہ تعالیٰ نے وحی بھیجی کہ اس کا علم بس اللہ ہی کو ہے اس نے اپنے لیے خاص کر لیا ہے نہ کسی فرشتے کو دیا ہے نہ کسی نبی علیہ السلام کو

اور حضرت قتادہؓ فرماتے ہیں۔

لعمری لقد اخفاھا اللہ من الملائکۃ المقربین ومن الانبیاء والمرسلین۔

(واخرجہ عبد الرزاق وابن المنذر وابن ابی حاتم)

میری جان کے مالک کی قسم! قیامت کو چھپایا ہے اللہ تعالیٰ نے مقرب فرشتوں اور نبیوں اور رسولوں سے۔

اگر صحابہ وتابعین وائمہ مفسرین کے اس قسم کے اقوال کا استیعاب کیا جائے تو سیکڑوں کی تعداد میں نقل کئے جا سکتے ہیں۔ لیکن نہ اس وقت اس کی حاجت اور نہ مجھے اتنی فرصت۔ اگر خدا کی توفیق سے "بوارق الغیب" چھپ گئی[1] تو یہ بحث پوری تفصیل کے ساتھ منظر عام پر آجائے گا۔

اس کے بعد حسب وعدہ چند حدیثیں نقل کی جاتی ہیں۔

پہلی حدیث | صحیح مسلم اور سنن اربعہ میں روایت ہے۔

عن جابرؓ انہ جاء عبد فبایع النبی صلی اللہ علیہ وسلم علی الھجرۃ ولم یشعر انہ عبد فجاء سیدہ یریدہ فقال لہ صلی اللہ علیہ وسلم بعنیہ فاشتراہ بعبدین اسودین ثم لم یبایع احداً حتی یسئل اعبدٌ ھو؟

(جمع الفوائد صفحہ ۲۴۹/۱)

حضرت جابر سے مروی ہے کہ ایک غلام آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور ہجرت پر بیعت کی اور آپ کو یہ علم نہ تھا کہ وہ غلام ہے۔ اس کے بعد اس کا آقا اس کو لینے کے لیے آیا تو حضور نے اس سے فرمایا کہ تم اس کو ہمارے ہاتھ فروخت کردو۔ چنانچہ آپ نے اس کو دو حبشی غلام دے کر خرید لیا۔ پھر اس کے بعد آپ نے کسی کو بیعت نہیں کیا یہاں تک کہ آپ دریافت فرما لیتے تھے کہ وہ غلام تو نہیں ہے۔

اس روایت سے صرف اسی قدر معلوم نہیں ہوا کہ اس خاص معاملہ میں آنحضرت کو اس شخص کی غلامی کی اطلاع نہ تھی۔ بلکہ یہ بھی پتہ چلا کہ آئندہ زندگی میں بھی حضور ہر اس شخص سے جو ہجرت کی بیعت کرنے کے لیے حاضر ہوتا دریافت فرما لیا کرتے تھے کہ وہ غلام تو نہیں ہے؟

غرض اس روایت سے حضور کی ایک مستقل اور مستمر حالت معلوم ہوئی۔

دوسری حدیث | صحاح ستہ میں بالفاظ مختلفہ حضرت ام سلمہؓ سے مروی ہے کہ رسول خدا صلی

---

[1] بوارق الغیب دو حصوں میں چھپ گئی تھی لیکن دونوں حصے مدت سے نایاب ہیں۔ ناظم الفرقان

اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

انما انا بشرٌ وانّہ یاتینی الخصم فلعل بعضکم ان یکون ابلغ من بعض فاحسب انّہ صادق فاقضی لہ فمن قضیت لہ بحق مسلم فانما ھی قطعۃ من نار فلیحملھا او یذرھا۔

(جمع الفوائد صفحہ ۲۶۰ ج ۱)

بیشک میں ایک بشر ہی ہوں اور میرے پاس مقدمات کے سلسلے میں) فریق (اپنے مقدمے کی پیروی کے لیے) آتے ہیں (تو ایسی صورت میں ممکن ہے) کہ شاید تم میں کوئی (چھا بولنے والا (تیز طرار) ہو جس کی لسانی کی وجہ سے) میں سمجھ لوں کہ وہ سچا ہے اور میں اسی کے حق میں فیصلہ دے دوں (حالانکہ وہ اس کا حق دار نہ تھا، پس (اس طرح نادانستگی سے) میں جس کو کسی دوسرے مسلمان کا حق دلوا دوں تو وہ اس کے لیے جائز نہیں ہو جاتا بلکہ وہ جہنم ہی کا ٹکڑا ہے پس خواہ وہ اسے اٹھائے یا چھوڑ دے۔

اگر آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کو جمیع ما کان و ما یکون کا علم ہوتا تو اس کا امکان ہی نہ تھا کہ آپ کسی جھوٹے کو اس کی لسانی اور چرب زبانی کی وجہ سے سچا سمجھ لیتے۔

تیسری حدیث | صحیح بخاری اور صحیح مسلم میں حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے۔

(قالت) قال لی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم انی لاعلم اذا کنتِ عنی راضیۃ واذا کنتِ علیّ غضبیٰ فقلت من این تعرف ذالک؟
قال اما اذا کنتِ عنی راضیۃ فانک تقولین لا و رب محمد۔ واذا کنتِ غضبیٰ قلتِ لا و رب ابراھیم۔ قلت اجل واللہ یا رسول اللہ ما اھجر الا اسمک

(جمع الفوائد صفحہ ۲۲۹ ج ۱)

فرماتی ہیں کہ مجھ سے ایک دفعہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا میں خوب جان لیتا ہوں جب تم مجھ سے راضی ہوتی ہو۔ اور جب تم غصے میں ہوتی ہو (حضرت صدیقہ کہتی ہیں) میں نے عرض کیا آپ کیوں کر پہچانتے ہیں؟ آپ نے فرمایا جب تم مجھ سے راضی ہوتی ہو (تو قسم کھاتے وقت کہتی ہو) رب محمد کی قسم اور جب تم غصے میں ہوتی ہو تو کہتی ہو رب ابراہیم کی قسم۔ میں نے عرض کیا ہاں خدا کی قسم یا رسول اللہ میں اس وقت صرف بظاہر آپ کا نام چھوڑ دیتی ہوں

رضا، غضب وغیرہ کیفیات کو ان ظاہری علامات سے پہچاننا بھی تصور ہو سکتا ہے جبکہ حضور کے لیے جمیع ما کان وما یکون کا علم تسلیم نہ کیا جائے نیز حضرت عائشہ صدیقہؓ کا یہ سوال "من این تعرف ذالک" "آپ میری خوشی وناخوشی کو کہاں سے معلوم کرتے ہیں" صاف تبلا رہا ہے کہ حضرت صدیقہ بھی حضور کو جمیع ما کان وما یکون کا عالم نہیں سمجھتی تھیں۔

چوتھی حدیث۔ سنن ابن داؤد وجامع ترمذی میں حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول خدا صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

لایبلغنی احد عن احد من اصحابی شیئًا فانی احب أن اخرج الیکم وانا سلیم الصدر۔

کوئی شخص میرے کسی صحابی کی طرف سے کوئی چیز مجھ تک نہ پہنچائے میں چاہتا ہوں کہ میں تمہارے پاس اس حال میں آؤں کہ میرا سینہ (تمہاری طرف سے) صاف ہو۔

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ حضور کو اپنے اصحاب کے پرائیوٹ حالات کی اطلاع عام طور پر لوگوں کے ذکر کرنے سے ہوتی تھی، ورنہ اگر آپ کو جمیع ما کان وما یکون کا علم ہوتا تو کسی کے بیان کرنے یا نہ کرنے سے کوئی فرق نہ پڑتا۔

پانچویں حدیث۔ صحاح ستہ اور دیگر کتب احادیث میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اخیر مرض کی جو حدیث حضرت عائشہ سے مروی ہے اس میں ہے کہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر مرض زیادہ سخت ہوا

لمّا ثقل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فقال أصلّی الناس؟ قلنا لا، هم ینتظرونك یارسول اللہ قال ضعوا لی ماءً فی المخضب ففعلنا فاغتسل ثم ذهب لینوء فأغمی علیه ثم افاق فقال أصلّی الناس؟ قلنا لا، هم ینتظرونك قال ضعوا لی ماء فی المخضب فاغتسل ثم ذهب لینوء فاغمی علیه ثم افاق فقال أصلّی الناس؟ قلنا لا، هم ینتظرونك قال ضعوا لی

تو ایک دن آپ نے دریافت فرمایا کیا لوگ نماز پڑھ چکے (یعنی کیا مسجد میں جماعت ہو گئی؟) عرض کیا گیا ابھی نہیں، وہ سب حضور کے منتظر ہیں۔ ارشاد ہوا کہ میرے لیے ٹب میں پانی رکھو چنانچہ ہم نے ایسا ہی کیا اور پانی رکھ دیا گیا۔ حضور نے غسل فرمایا پھر آپ کھڑے ہونے لگے تو آپ پر بے ہوشی طاری ہو گئی کچھ دیر کے بعد افاقہ ہوا تو دریافت فرمایا۔ کیا لوگوں نے نماز پڑھ لی۔ عرض کیا گیا نہیں، وہ حضور کے انتظار میں ہیں۔ ارشاد ہوا میرے لیے ٹب میں پانی رکھو۔

چنانچہ پانی حاضر کر دیا گیا حضرت نے غسل فرمایا اور اٹھنے لگے پھر بیہوشی طاری ہو گئی۔ کچھ دیر بعد افاقہ ہوا تو پھر دریافت فرمایا کیا لوگوں نے نماز پڑھ لی عرض کیا گیا نہیں، وہ حضور کے منتظر ہیں، پھر وہی ارشاد ہوا کہ میرے لیے ٹب میں پانی رکھو چنانچہ پھر حاضر کر دیا گیا۔ حضور نے غسل فرمایا اور اٹھنے لگے پھر بیہوشی طاری ہو گئی۔ کچھ دیر بعد افاقہ ہوا تو دریافت فرمایا کیا لوگوں نے نماز پڑھ لی؟ عرض کیا گیا نہیں وہ حضور کے انتظار میں ہیں! اور لوگ مسجد میں جمع ہوئے تھے اور عشاء کی نماز کے لیے حضور کا انتظار کر رہے تھے۔ بالآخر آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابوبکر کو حکم بھیجا کہ لوگوں کو نماز پڑھا دو۔ (انتہی)*

ماءً فی المخضب فاغتسل ثم ذهب لينوء فاغمی عليه ثم افاق فقال اصلی الناس؟ قلنا: لا، هم ينتظرونك والناس عكوف فی المسجد ينتظرونه صلی الله عليه وسلم لصلوٰة العشاء الآخرة قالت فارسل صلی الله عليه وسلم الی ابی بكر ان يصلی بالناس۔

یہ حضور کے آخری زمانے ہی کی نہیں بلکہ آخری وقت کی حدیث ہے اگر اس وقت تک بھی حضور کو جمیع ما کان وما یکون کا علم ہوتا تو نہ آپ کو بار بار یہ دریافت فرمانے کی ضرورت پیش آتی کہ کیا لوگ نماز پڑھ چکے اور نہ بار بار آپ غسل فرما کر اٹھنے کا ارادہ فرماتے کیوں کہ اس صورت میں آپ کو معلوم ہو جانا چاہیئے تھا۔ کہ ارادہ پورا ہونے والا نہیں۔ الغرض بار بار حضور کا جماعت کے متعلق دریافت فرمانا اور بار بار تشریف آوری کا ارادہ فرمانا اس امر کی نہایت واضح اور روشن دلیل ہے کہ اس وقت تک بھی حضور کو جمیع ما کان وما یکون کا علم نہ تھا۔

قرآن و حدیث کی ان تصریحات کے بعد اگرچہ ایک ایمان والے کے لیے کوئی گنجائش باقی نہیں رہتی تاہم تکمیلاً للفائدہ ہم یہ بھی بتلا دینا چاہتے ہیں کہ اہلبیت رسالت اور صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین بھی رسول خدا صلے اللہ علیہ وسلم کو عالم جمیع ما کان وما یکون نہیں سمجھتے تھے اور ظاہر ہو کہ سب سے زیادہ آنحضرت کے رتبہ کے پہچاننے والے اور دل و جان سے زیادہ حضور سے محبت

رکھنے والے تھے۔

ازواج مطہرات کی شہادت

حدیث ۲ سے معلوم ہو چکا ہے کہ حضرت عائشہ صدیقہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کو جمیع ما کان وما یکون کا عالم نہیں سمجھتی تھیں اور ہم نے اسی حدیث کی تشریح کے ضمن میں اس پر تنبیہ بھی کی تھی اب اسی سلسلے میں ایک آیت اور ملاحظہ ہو۔

(۱) سورۂ تحریم میں آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی زندگی کا ایک خاص واقعہ ذکر گیا گیا ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ:۔

حضور نے اپنی بعض ازواج (یعنی حضرت حفصہؓ) سے ایک راز کی بات کہی (اور ان کو رازداری کی تاکید بھی کر دی۔) لیکن بتقاضائے بشریت ان سے لغزش ہوئی اور) انھوں نے اس کا (حضرت عائشہؓ سے) تذکرہ کر دیا اللہ تعالیٰ نے اس کی اطلاع رسول خدا صلے اللہ علیہ وسلم کو دی حضور نے حفصہؓ سے فرمایا کہ مجھے ایسا معلوم ہوا ہے کہ تم نے اور لوگوں سے اس کا تذکرہ کر دیا تو حضرت حفصہؓ نے عرض کیا۔

مَنْ اَنْبَاَكَ هٰذَا؟ آپ کو کس نے یہ خبر دی۔؟

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔

نَبَّاَنِیَ الْعَلِیْمُ الْخَبِیْرُ! مجھے اس علیم و خبیر نے خبر دی ہے!

حضرت حفصہ کے اس سوال سے کہ آپ کو کس نے خبر دی " صاف معلوم ہوتا ہے کہ وہ حضور کو جمیع ما کان و ما یکون نہیں سمجھتی تھیں ورنہ اس سوال کے کیا معنی۔

جلیل القدر صحابہؓ کی شہادت

ایک بار رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی معاملہ کی وجہ سے ازواج مطہرات سے ناراض ہو کر کچھ دنوں کے لیے یکسوئی اختیار فرمالی جس کی وجہ سے لوگوں میں بعض پریشان کن افواہیں پھیل گئیں، حضرت فاروق اعظم تحقیق حالات کے ارادہ سے خدمت اقدس میں حاضر ہوئے

تو دیکھا کہ حضور بالائی حجرے میں رونق افروز ہیں اور آپ کے غلام رباح دروازے پر بیٹھے ہو[ئے]
ہیں۔ حضرت فاروق اعظمؓ نے رباح کو پکار کر کہا کہ میرے لیے حضور سے اجازت مانگو میں حا[ضر]
ہونا چاہتا ہوں۔ رباح نے اندر کو (غالباً حضور کی طرف) دیکھا اور پھر حضرت عمر پر نظر ڈالی او[ر]
خاموش ہو رہے۔ دوسری مرتبہ پھر حضرت عمر نے وہی کہا اور رباح نے پھر اسی طرح خاموش نظروں [سے]
جواب دیا (حضرت عمر فرماتے ہیں کہ) پھر میں نے اپنی آواز کو بلند کر کے کہا "اے رباح"!

میرے لیے رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم سے حاضری
کی اجازت چاہو، میرا خیال ہے کہ حضور کو یہ گمان ہو گیا
ہے کہ میں (اپنی لڑکی) حفصہ کی وجہ سے آیا ہوں، خدا
کی قسم اگر حضور مجھکو اس کی گردن مارنے کا حکم
دیں تو میں اس کی گردن مار دوں گا۔

یا رباح! استأذن لی عندك على
رسول الله صلى الله عليه وسلم فانى اظن
رسول الله صلى الله عليه وسلم ظن
جئت من اجل حفصة ... الخ

(اخرجہ عبد بن حُمَید و مسلم و ابن مردویہ)

حضرت عمر فرماتے ہیں کہ میں نے کہا، اور میری آواز زیادہ بلند ہو گئی تو رباح نے اشارہ کیا
اوپر چڑھ آؤ (یعنی اجازت ہو گئی)

اس روایت میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا یہ فقرہ "میرا خیال ہے کہ حضور کو ایسا
ہوا ہے کہ میں حفصہ کی وجہ سے آیا ہوں" صاف بتلا رہا ہے کہ حضرت فاروق اعظم آنحضر[ت]
صلے اللہ علیہ وسلم کو جمیع ما کان و ما یکون کا عالم نہیں سمجھتے تھے۔ ورنہ اس خیال کے کیا معنی ہو[ں]

(۳) حضرت علی رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے آزاد کردہ
حضرت زید بن حارثہ مکہ مکرمہ گئے اور وہاں سے سید الشہداء حضرت امیر حمزہؓ کی صاحبزاد[ی]
اپنے ہمراہ لے آئے یہاں پہنچنے کے بعد اس لڑکی کی پرورش میں نزاع ہوا حضرت علی کے
بھائی حضرت جعفرؓ نے کہا کہ میں اس کی تربیت کا زیادہ مستحق ہوں اس لیے کہ وہ میرے [چچا کی]
لڑکی ہے اور میرے گھر میں اس کی خالہ ہے اور خالہ ماں کی جگہ ہوتی ہے۔ حضرت علیؓ فرماتے
تھے کہ میں زیادہ حقدار ہوں بوجہ اس کے کہ وہ میرے چچا کی لڑکی ہے اور میرے گھر میں رسول خد[ا صلی]
اللہ علیہ وسلم کی صاحبزادی ہیں اور وہ زیادہ مستحق ہیں۔ حضرت علیؓ فرماتے ہیں کہ
میں نے یہ بات خوب بلند آواز سے کہی تاکہ رسول خدا فانی لارفع صوتی لیسمع رسول [الله]

صلی اللہ علیہ وسلم باہر تشریف لانے سے پہلے استحقاق کی دلیل سن لیں۔

صلی اللہ علیہ وسلم حجتی قبل ان یخرج۔

اور حضرت زیدؓ نے کہا کہ مجھے اس کی تربیت کا حق سب سے زیادہ پہونچتا ہے کیوں کہ میں نے اس کے لیے اتنا طویل سفر کیا اور اس کو لے کر آیا یہ باتیں ہو چکیں تو حضور تشریف لے آئے اور آپ نے تینوں کے دلائل سن کر حضرت جعفرؓ کے حق میں فیصلہ کر دیا۔

اس روایت میں حضرت علیؓ کے یہ الفاظ کہ "میں نے اس لیے اپنی آواز زیادہ بلند کر دی کہ حضور تشریف لانے سے پہلے میرے دلائل سن لیں" صاف بتلا رہے ہیں کہ حضرت علیؓ حضور کو عالم جمیع ما کان وما یکون نہیں سمجھتے تھے۔ اور اسی لیے ان کو آواز بلند کرنی پڑی۔

نیز حضرت علیؓ کا ایک نہایت صاف اور صریح ارشاد بحوالہ طبرانی و ابن مردویہ پہلی آیت کے ذیل میں بھی نقل کیا جا چکا ہے۔

(۴) حضرت عبد الرحمٰن بن عوف رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ ایک بار رسول خدا صلے اللہ علیہ وسلم مسجد نبوی سے نکلے تو میں حضور کے پیچھے ہو لیا اور آپ کے پیچھے پیچھے چلنے لگا اور حضور کو میری خبر نہ تھی۔

فاتیتہ امشی ورآءہ ولا یشعر بی الی آخر الحدیث رواہ ابن النجار - کنز العمال

(۵) حضرت عبد اللہ ابن عباس غزوہ تبوک کے ذکر میں فرماتے ہیں کہ جب حضور کے کوچ کرنے کا وقت قریب آگیا تو منافقوں نے کثرت سے (ساتھ نہ جانے کی) رخصت چاہی اور خدا کی قسمیں کھا کھا کر اپنے جھوٹے عذر پیش کیے۔

پس رسول خدا صلے اللہ علیہ وسلم ان کو رخصت دینے لگے اور آپ کو خبر نہ تھی کہ ان کے دلوں میں کیا ہے۔

فجعل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یأذن لہم ولا یدری ما فی انفسہم (رواہ ابن جریر وابن عساکر، کنز العمال)

اس روایت میں حضرت ابن عباسؓ نے تصریح فرمائی ہے کہ رسول خدا صلے اللہ علیہ وسلم کو ان منافقوں کے دلوں کا حال معلوم نہ تھا۔

نیز انہی حضرت عبد اللہ ابن عباسؓ کا ایک نہایت صاف صریح ارشاد بحوالہ ابن جریر وغیرہ

ہم پانچویں آیت کے ذیل میں ابھی نقل کر چکے ہیں۔

یہاں تک پانچ آیات اور پانچ احادیث اور صحابہ کرامؓ کی پانچ شہادتیں ہوئیں۔ پھر اس کے ذیل میں ائمہ تفسیر اور دیگر مصنفین کے جو اقوال ضمناً آگئے ہیں وہ ان کے علاوہ ہیں۔

ہمارے نزدیک ایک ایمان والے کے لیے یہ ثبوت کافی سے زائد ہے کیوں کہ نہ اب مسائل کے فیصلہ کے لیے حضرت جبریلؑ تشریف لائیں گے نہ خدا کی طرف سے اب کوئی نیا صحیفہ اترے گا اور نہ آسمان ہی سے اب کوئی آواز آئے گی۔ خدا کی خوشنودی حاصل کرنے کا واحد ذریعہ اب صرف کتاب و سنت کا اتباع ہے فبای حدیث بعدہٗ یومنون۔

آخر میں مکرر عرض کیا جاتا ہے کہ یہاں فتویٰ کی حیثیت کو ملحوظ رکھتے ہوئے بقدر ضرورت پر اکتفا کیا گیا ہے ورنہ بعون اللہ تعالیٰ یہ عاجز اس پر قادر ہے کہ قرآن و حدیث اور ارشادات سلف سے اس قسم کے سیکڑوں بلکہ بحمد اللہ ہزاروں شواہد پیش کر سکے۔

خاتمہ پر ہم یہ بھی عرض کر دینا ضروری سمجھتے ہیں کہ ہمارا اختلاف صرف اہل بدعت کے خانہ ساز علم جمیع ما کان و ما یکون سے ہے اور یہاں تک جو بحث کی گئی وہ صرف اسی کے متعلق تھی ورنہ کوئی اس پر محمول کرے کہ معاذ اللہ ہم کو رسول خدا صلے اللہ علیہ وسلم کے علم شریف کی تنقیص مقصود ہے انتہائی بے ایمانی اور اعلیٰ درجہ کی شقاوت ہے۔ ہمارا ایمان ہے کہ اللہ تعالیٰ کے بعد کمال علمی میں رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم ہی کا درجہ ہے۔ ع

"بعد از خدا بزرگ توئی قصہ مختصر"

اللہ تعالیٰ نے جو علوم و معارف آپ کو عطا فرمائے وہ بحیثیت مجموعی کسی دوسرے رسول اور مقرب فرشتوں کو بھی حاصل نہیں۔ آپ وہ ہیں جن کے متعلق خدا کی مقدس کتاب نے شہادت دی۔

وعلمك مالم تكن تعلم وكان فضل الله عليك عظيما

اللہ تعالیٰ نے آپ کو وہ علوم سکھائے جو آپ کو حاصل نہ تھے اور اللہ کا آپ پر بڑا فضل ہے۔

اور آپ ہی وہ ہیں جن کے متعلق کتاب الٰہی کا بیان ہے۔

فَاَوْحٰی اِلٰی عَبْدِہٖ مَآ اَوْحٰی — خدا نے اپنے بندے کے دل میں ڈال دیا جو ڈال دیا

آپ ہی معارف الٰہیہ کے آخری معلم ہیں اور علوم ربانیہ کے آخری مبلغ ہیں ہم آپ کے علوم کو علوم الٰہیہ سے وہی نسبت ہے جو ایک مخلوق کو خالق سے ہو سکتی ہے۔ نیز آپ کے علم کی اس غیر معمولی بلکہ بے نظیر وسعت کی وجہ سے آپ کو جمیع ماکان و مایکون کا عالم بھی نہیں کہا جا سکتا کیونکہ ماکان و مایکون کی بعض جزئیات کا علم نہ ہونا بالنصوص قرآن و حدیث سے ثابت ہے اس سے اختلاف کرنا محبت نہیں بلکہ بغاوت ہے جس کا انجام دنیا میں حرمان اور آخرت میں خسران ہے۔

رسول خدا (روحی وقلبی فداہ) صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے۔

لا تطرونی کما اطرت النصاریٰ	تم مجھ کو حد سے نہ بڑھاؤ جس طرح نصاریٰ نے عیسیٰ بن مریم
عیسیٰ بن مریم انما انا عبد اللّٰہ و	کو بڑھایا میں اللہ کا بندہ ہوں اور اس کا رسول ہوں
رسولہ فقولوا عبد اللّٰہ ورسولہٗ	مجھے خدا کا بندہ اور اس کا رسول کہو۔

۲
ممتاز ہوائی بندوقیں
• ٹکسٹول ماڈل ۳۵
• ٹکسٹول ماڈل ۲۷
بغیر لائسنس
★ شکار کے لئے ★ کھیتوں اور باغوں کی رکھوالی کے لئے
★ نشانہ بازی کی تربیت کے لئے ★ حفاظت کے لئے
★ تحفہ اور انعام کے لئے
چند اہم خصوصیات
▲ ٹھوس اسٹیل سے بنی ہوئی نال اور پُرزے
▲ نال میں جرمن گروونگ
▲ طاقت ور اسپرنگ
▲ دیکھنے میں خوبصورت
▲ چلنے میں پائدار
▲ قیمت نہایت مناسب
یاد رکھیں یہ EBCO (ابکو) کا مال ہے
جس کی مانگ ۱۹۶۰ء سے بھارت کے
کونے کونے میں برابر بڑھ رہی ہے۔
تفصیل کے لئے لکھیے:۔
EBCO Industries
LUCKNOW-1
PHONE: 28602

دفن کے بعد قبر پر اذان

اور اس طرح کی تمام بدعات کے بارے میں اصولی بحث

۱۳۵۶ھ میں ایک صاحب نے "دفن کے بعد قبر پر اذان" کے بارہ میں مدیر الفرقان سے سوال کیا تھا اور مفصل و مدلل جواب کی فرمائش کی تھی۔ اس کا جواب بہت بسط و تفصیل کے ساتھ دیا گیا تھا اس کے ابتدائی تمہیدی حصے میں "بدعت" سے متعلق جو اصولی بحث کی گئی تھی وہ اس طرح کی تمام بدعات کے لئے فیصلہ کن اور ان شاء اللہ ہر صاحب ایمان اور حق کے طالب کے لئے اطمینان بخش ہے ——— ذیل میں اس جواب کا وہی ابتدائی حصہ درج کیا جا رہا ہے۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم　　　　حامداً ومصلیاً ومسلماً

اذان قبر کے متعلق اصل حکم شرعی لکھنے سے پہلے چند تمہیدی مقدمات عرض کئے جاتے ہیں جو خاص اسی مسئلے میں نہیں بلکہ تمام بدعات کا حکم معلوم کرنے میں کار آمد ہوں گے

(۱) دین الٰہی - رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں مکمل ہو چکا اور حجۃ الوداع کے موقع پر تمام امت کو رسول اللہ کے ذریعے سے یہ مژدہ سنا دیا گیا کہ الیوم اکملت لکم دینکم (آج ہم نے تمہارا دین بالکل مکمل کر دیا)

اس اعلان الہٰی کا منشا یہی ہے کہ اب دین میں کسی ترمیم اور اضافے کی ضرورت نہیں رہی اور نہ قیامت تک ضرورت ہوگی۔ انسانی ہدایت کے لیے جن احکام کی ضرورت تھی وہ سب آتار دیے گئے اور نجات کا قانون ہمیشہ کے لیے مکمل کر دیا گیا۔ اور اس پر عمل کر لینا انسان کی نجات اور فلاح و بہبودی کے لیے قطعی کافی ہے اب جو شخص دین میں کسی ایسی چیز کا اضافہ کرتا ہے جس کی تعلیم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم کو نہیں دی تو در پردہ گویا وہ یہ دعویٰ کر رہا ہے کہ دین نامکمل تھا اور میری اس ترمیم کا محتاج تھا۔ یا وہ اس کا مدعی ہے کہ معاذ اللہ حضور نے تبلیغ رسالت میں خیانت کی اور یہ چیز جو داخل دین تھی وہ ہم کو نہیں پہونچائی اور اب میں اس کو لوگوں کو بتاتا ہوں۔ بہرحال جو چیز پہلے سے داخل دین نہ ہو۔ وہ آج بھی دین میں سے نہیں ہو سکتی۔ اور جس چیز کا موجب قرب الہٰی ہونا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم کو نہیں بتلایا وہ آج بھی باعث تقرب و ذریعہ رضائے خداوندی نہیں ہو سکتی۔ صحیحین (بخاری و مسلم) اور دیگر کتب حدیث میں حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔

"من احدث فی امرنا ھذا ما لیس منه فھو رد"	جس نے ہمارے دین میں وہ بات نکالی جو اس میں نہیں ہے۔ وہ مردود ہے۔

اور صحیح مسلم کی ایک اور روایت میں ہے۔

من عمل عملاً لیس علیه امرنا فھو رد	جس نے کوئی ایسا عمل کیا جسکے متعلق میرا کوئی حکم نہ تھا وہ مردود ہے۔

اور امام دار الہجرت حضرت مالک بن انس فرماتے ہیں۔

ومن ابتدع فی الاسلام بدعة یراھا حسنة فقد زعم ان محمدا صلی اللہ علیه وسلم خان الرسالة لان اللہ یقول الیوم اکملت لکم دینکم فما لم یکن یومئذ دینا فلا یکون الیوم دینا۔ (الاعتصام ص۲۸)	جس نے اسلام میں کوئی بدعت نکالی اور اس کو وہ اچھا سمجھتا ہے تو گویا اس نے گمان کیا کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے پیغامبری میں خیانت کی۔ کیوں کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ آج ہم نے تمھارے واسطے تمھارا دین مکمل کر دیا۔ پس جو چیز اس دن داخل دین نہ تھی آج بھی داخل نہیں ہو سکتی

(۲) جس طرح شریعت میں نئی ایجادات کا دروازہ بند ہے۔ اسی طرح کسی کو یہ بھی حق نہیں کہ شریعت کے بتلائے ہوئے ان امور خیر کے لیے جن کے واسطے شارع نے کیفیات مخصوصہ اور حدود و اوقات کی تعیین نہیں کی ہے۔ ان کے لیے اپنی طرف سے کوئی خاص ہیئت و نوعیت یا کوئی مخصوص وقت مقرر کرکے اور ان کے ساتھ امر شرعی کا سا معاملہ کرے علیٰ ہذا کسی کو یہ بھی حق نہیں ہے کہ شریعت نے جس عمل خیر کیلئے کوئی خاص وقت یا موقع مقرر کردیا ہو کوئی شخص اس کے علاوہ دوسرے اوقات یا دوسرے مواقع میں بھی اس کو اسی طرح جاری کرے کہ حدود اللہ سے تعدی اور قانون شریعت سے ایک گونہ سرتابی ہوگی ۔۔ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ آپ کا گزر ذاکرین کی ایک جماعت پر ہوا جن میں ایک شخص کہتا تھا۔ خدا کی رحمت اس شخص پر جو آتنی بار سبحان اللہ کہے، خدا کی رحمت اس شخص پر جو آتنی دفعہ الحمد للہ کہے۔ چنانچہ حاضرین اس کے مطابق کہتے تھے آپ نے جب دیکھا تو ان سے مخاطب ہوکر نہایت جلال کے انداز میں فرمایا۔

لقد هديتم لما لم يهتد له نبيكم وانكم لتمسكون بذنب ضلالة (رواه ابن وضاح كما في الاعتصام)

"ہا! تم کو وہ ہدایت مل گئی ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی نہیں ملی تھی۔ درحقیقت تم گمراہی کی دم پکڑے ہوئے ہو۔"

حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کا مطلب اس سے صرف یہ تھا کہ اگرچہ تحمید و تسبیح کی بہت کچھ فضیلتیں وارد ہوئی ہیں اور وہ محبوب ترین ذکر ہے۔ لیکن اس کا یہ خاص طرز و طریقہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا بتلایا ہوا نہیں ہے ۔۔ بلکہ بھٹا را خود ایجاد ہے لہٰذا گمراہی ہے۔

۔۔ اور امام ابو اسحٰق شاطبی رحمتہ اللہ علیہ بدعات کے بیان میں، فرماتے ہیں۔:

ومنها التزام الكيفيات والهيئات المعينة كالذكر بهيئة الاجتماع على صوت واحد ..... ومنها التزام العبادات المعينة في اوقات معينة لم يوجد لها ذالك التعيين

اور ان ہی بدعات میں سے کیفیات مخصوصہ اور ہیئات معینہ کا التزام ہے۔ جیسے کہ ہیئت اجتماع کے ساتھ ایک آواز پر ذکر کرنا اور انہی بدعات میں سے خاص اوقات کے اندر ایسی عبادات معینہ کا التزام کرلینا

فی الشریعۃ" (الاعتصام ج ۱ ص۳) جن کو جن کے لیے شریعت نے اوقات مقرر نہیں کئے ہیں۔

(۲) عبادات میں جس طرح کمی کرنا جرم ہے اسی طرح اپنی طرف سے زیادتی بھی ظلم ہے اور اس کے لیے وہی دلائل کافی ہیں جو پہلے مقدمے کے ثبوت میں نقل کئے گئے ہیں۔ علاوہ بریں حضرت علیؓ کے اس اثر سے یہ اصول صاف طور سے مفہوم ہوتا ہے جس کو صاحب مجمع البحرین نے نقل کیا ہے۔

ان رجلا یوم العید اراد ان یصلی قبل صلوٰۃ العید فنهاه علی رضی اللہ عنہ فقال الرجل یا امیر المومنین انی اعلم ان اللہ لا یعذب علی الصلوٰۃ فقال علی وانی اعلم ان اللہ تعالیٰ لا یثیب علی فعل حتی یفعله رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم او یحث علیہ فیکون صلوتک عبثا والعبث حرام فلعله تعالیٰ یعذبک به لمخالفتک لرسوله صلی اللہ علیہ وسلم (حکاہ صاحب المنار فی تعلیقاته کما فی الجنۃ)

ایک شخص نے عید کے دن نماز عید سے قبل نفل نماز پڑھنی چاہی تو حضرت علیؓ نے اس کو منع فرمایا اس نے عرض کیا اے امیر المومنین میں سمجھتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ مجھے نماز پڑھنے پر سزا نہ دے گا حضرت علیؓ نے فرمایا اور میں بالیقین جانتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ کسی فعل پر ثواب نہ دے گا جب تک کہ اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو کیا نہ ہو یا اس کی ترغیب نہ دی ہو اور روگاہ عید سے قبل نفل نماز حضورؐ سے قولاً یا فعلاً ثابت نہیں ہے پس تیری یہ نماز فعل عبث ہوگی، اور فعل عبث حرام ہے تو شاید اللہ تعالیٰ تجھ کو اپنے رسول کی مخالفت کی وجہ سے عذاب دے۔

اور سنن ابی داؤد باب فی الصف علی الجنازۃ، کی مالک بن ہبیرہ والی حدیث کے حاشیہ میں ملا علی قاری کی مرقاۃ شرح مشکوٰۃ سے منقول ہے۔

ولا یدعو للمیت بعد صلوٰۃ الجنازۃ لانه یشبه الزیادۃ فی صلوٰۃ الجنازۃ۔

اور نماز جنازہ کے بعد میت کے لیے دعا نہ کریں۔ کیونکہ یہ نماز جنازہ میں زیادتی کے مانند ہوگا۔

اور حضرت شیخ عبد الحق صاحب دہلوی رحمۃ اللہ علیہ لمعات شرح مشکوٰۃ میں ارقام فرماتے ہیں۔

فالزیادۃ فی مثله نقصان فی الحقیقۃ

ان جیسی چیزوں میں زیادتی فی الحقیقت کمی

کمالا یزاد فی الاذان بعد التھلیل محمد رسول اللہ و امثال ذالک کثیرۃ۔

ہے جس طرح کہ اذان میں آخری کلمہ لا الٰہ الا اللہ کے بعد محمد رسول اللہ نہیں بڑھایا جاتا اور اسکی مثالیں بکثرت ہیں۔

(۳) جب کبھی کسی گمراہ سے گمراہ فرقہ یا فرد نے بھی کوئی بد سے بدتر بدعت دین کے نام پر ایجاد کی ہے تو اس نے اس میں محاسن اور خوبیوں کا ضرور دعویٰ کیا ہے اور اس کی ترویج کے لیے خدا اور مذہب ہی کے نام پر کچھ دلائل بھی تراشے ہیں اور ضرور ایسا پیرایہ بیان اختیار کیا ہے جس سے سادہ لوحوں کو مغالطہ میں مبتلا کیا جاسکے چنانچہ مشرکین نے بت پرستی جیسی قبیح ترین بدعت کو بھی جائز اور مستحسن ثابت کرنے کے لیے کہا تھا۔

ما نعبدھم الا لیقربونا الی اللہ زلفا

ہم اپنے دیوتاؤں کی عبادت صرف اس لیے کرتے ہیں کہ یہ ہم کو خدا سے قریب تر کردیں ـــــ

نیز انہوں نے ملت ابراہیمی میں ایک بدترین بدعت یہ ایجاد کی تھی کہ خانہ کعبہ کا طواف مادر زاد برہنہ ہوکر کرتے تھے اور اس شرمناک فعل کی توجیہہ اس طرح کرتے تھے کہ جب کپڑے پہن کر تو ہم روزمرہ گناہ کرتے ہیں پھر ان ہی کپڑوں میں خانہ خدا کا طواف کیوں کریں، ہم تو اس حال میں طواف کریں گے جس حال میں اللہ نے ہم کو پیدا کیا تھا۔

اور قرآن عزیز کہتا ہے۔

و اذا قیل لھم انفقوا مما رزقکم اللہ قال الذین کفروا للذین آمنوا أنطعم من لو یشاء اللہ اطعمہ

جب ان سے کہا جاتا ہے کہ جو دولت خدا نے تم کو دی ہے اس میں سے کچھ اللہ کے راستے میں بھی خرچ کرو اور فقرا اور مساکین کو دو تو وہ کفار ایمان والوں سے کہتے ہیں کیا ہم ان بھوکوں کو کھلائیں جن کو خدا نے ہی کھلانا نہیں چاہا اگر خدا چاہتا تو ان کو کھلا دیتا ـــــ

اب دیکھیے کہ ان بدکرداروں کو خدا کی راہ میں کچھ دینا نہ تھا۔ لیکن از راہ شیطنت اس نہ دینے پر بھی بدعت حسنہ کا لفافہ چڑھا دیا اور اپنے اسبد ترین اور غیر انسانی فعل کو " رضا بالقضاء " جیسے اعلیٰ وصف کے ماتحت پیش کیا۔ خیر یہ حال تو مدر

جاہلیت کے کفار و مشرکین کا تھا۔ لیکن ملت اسلامیہ کا دعویٰ کرنے والے بھی جس مبتدع کو آپ دیکھیں گے اس کا یہی حال پائیں گے وہ اپنی بدعت میں بے شمار مصالح تلاش کرے گا اور اس کے لیے شرعی دلائل بھی پیش کرنے کی کوشش کرے گا۔ امام ابو اسحاق شاطبی رحمۃ اللہ علیہ نے بالکل صحیح ارشاد فرمایا ہے۔

انك لاتجد مبتدعا ممن ينسب الى الملة الا وهو يستشهد على بدعته بدليل شرعى (اعتصام صفحہ ۱۰۲)	تم کسی ایسے مبتدع کو نہیں پاؤ گے جو ملت سے وابستگی کا مدعی ہو مگر یہ کہ وہ اپنی بدعت پر کسی دلیل شرعی سے ضرور استشہاد کرتا ہوگا

۴ — اور یہ حقیقت بھی ناقابل انکار ہے کہ بہت سی بدعات میں مصلحت اور منفعت کا بھی کوئی نہ کوئی پہلو ہوتا ہے اور وہی لوگوں کے لیے مغالطہ کا باعث ہوا جاتا ہے اور اسی کی وجہ سے اس کو امر خیر یا بالفاظ دیگر بدعت حسنہ سمجھ لیا جاتا ہے۔ حالانکہ یہ ضروری نہیں کہ جس چیز میں کوئی مصلحت یا منفعت ہو وہ ہمیشہ اچھی (ہو) یا جائز بھی ہو۔ قرآن مجید میں ——— قمار اور شراب کے متعلق تصریح ہے کہ ان میں لوگوں کے لیے کچھ منفعتیں بھی ہیں۔ لیکن بایں ہمہ چونکہ شریعت کی نظر میں مضرت کا پہلو غالب ہے اس لیے دونوں حرام قطعی ہیں

۵ کسی عمل کا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وصحابہ کرام کے زمانے میں بالکلیہ متروک ہونا حالانکہ اس کے دواعی واسباب جو آج موجود ہیں وہ اس وقت بھی موجود تھے ——— اس کی دلیل ہے کہ وہ امر غیر مشروع ہے بالخصوص جب کہ اس کا تعلق باب عبادات سے ہے

امیر المومنین حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا وہ فرمان اس کے ثبوت کے لیے کافی ہے جو تیسرے مقدمے کے ذیل میں مجمع البحرین کے حوالے سے نقل کیا گیا اور حضرت عبد اللہ بن مسعود کا جو اثر دوسرے مقدمے کے ذیل مذکور ہوا وہ بھی اس کی نہایت واضح دلیل ہے۔

اور انکی ایک روایت میں جس کو صاحب مجالس الابرار نے نقل کیا ہے اس طرح وارد ہوا ہے کہ آپ نے ان لوگوں سے جو ایک خاص ہیئت اور کیفیت کے ساتھ مسجد میں اجتماعی طور پر ذکر کرتے تھے ارشاد فرمایا

انا عبد الله بن مسعود فو الذی	میں رسول اللہ کا مشہور خادم عبد اللہ بن مسعود

لا الہ غیرہ لقد جئتم ببدعة ظلماء او لقد فقتم علی اصحاب محمد علیہ السلام علماً

(مجالس ابرار مجلس الثامن عشر ص۱۲۳)

ہوں جو اللہ وحدہٗ لا شریک کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ تم نے یہ نہایت تاریک بدعت کی ہے یا تم علم میں اصحاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بڑھ گئے ہو کہ ایسے اعمال ایجاد کرتے ہو جن کا علم بھی اصحاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو نہ تھا۔

اس روایت کو نقل کرنے کے بعد صاحب مجالس الابرار فرماتے ہیں کہ۔

هكذا يقال بكل من اتى العبادات البدنية المحضة بصفة لم تكن فى زمن الصحابة

ہر اس شخص سے ایسے ہی کہنا چاہیئے جو خالص بدنی عبادات میں کوئی ایسی صفت پیدا کرے جو صحابہؓ کے زمانے میں نہ تھی ـــــ

اور حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں۔

كل عبادة لم يتعبدها اصحاب رسول الله صلى الله عليه وسلم فلا تعبدوها ـــــ

ہر وہ عبادت جس کو صحابہ کرام نہیں کرتے تم بھی نہ کرو..... الخ

اور حضرت ابن مسعود فرماتے ہیں

اتبعوا آثارنا ولا تبتدعوا فقد كفيتم

(الاعتصام ص۵۴)

ہمارے نقوش قدم کی پیروی کرو اور اپنی طرف سے ایجادیں نہ کرو کیونکہ تم کفایت کئے گئے ہو۔

بہرحال یہ بالکل ناقابل انکار حقیقت ہے کہ جو عبادت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام سے ثابت نہیں وہ ناشروع اور بدعت ہے اور اس اصل سے فقہائے حنفیہ نے بھی بکثرت کام لیا ہے۔ چنانچہ صاحب ہدایہ رحمۃ اللہ علیہ فصل الاوقات التی یکرہ فیہا الصلوٰۃ میں ارشاد فرماتے ہیں۔

يكره ان يتنفل بعد طلوع الفجر باكثر من ركعتى الفجر لانه عليه السلام لم يزد عليها مع حرصه على الصلوة ـ

صبح صادق کے بعد فجر کی دو سنتوں کے علاوہ نفل پڑھنا مکروہ ہے کیوں کہ حضور نے ان دو رکعتوں سے زیادہ نہیں پڑھیں حالانکہ آپ نماز کے بہت حریص تھے ـــــ

اور اسی ہدایہ باب العید میں ہے۔

لا يتنفل فى المصلى قبل العيد لانه

عیدگاہ میں قبل از نماز عید بالکل نفل نہ پڑھے۔

عليه السلام لم يفعل مع حرصه على الصلوٰة

کیوں کہ حضور نے باوجود نماز پر بے حد حریص ہونے کے کسی نہیں پڑھے۔

اور باب صلوٰۃ الکسوف میں لکھتے ہیں۔

وليس في الكسوف خطبة لانه لم ينقل

کسوف میں خطبہ نہیں ہے کیوں کہ حضور سے منقول نہیں ۔

اور علامہ حلبی نے کبیری شرح منیۃ المصلی میں صلوٰۃ الرغائب اور صلوٰۃ البرأۃ کو نامشروع ثابت کرتے ہوئے لکھا ہے ۔

ومنها ان الصحابة والتابعين ومن بعدهم من الائمة المجتهدين لم ينقل عنهم هاتان الصلوٰتان فلو كانتا مشروعتين لما فاتتا عن السلف .

اور ایک وجہ ان کے نامشروع ہونے کی یہ بھی ہے کہ صحابہ و تابعین اور ان کے بعد کے ائمہ مجتہدین سے یہ دونوں نمازیں منقول نہیں ہیں اگر یہ دونوں مشروع ہوتیں تو ان اسلاف امت سے فوت نہ ہوتیں ۔

اور فتاوی عالمگیری کتاب الکراہیۃ میں ہے۔

قراءة الكافرون الى الآخر مع الجمع مكروهة لانها بدعة لم ينقل ذالك عن الصحابة والتابعين

سورہ کافرون سے آخر تک جمع ہو کر پڑھنا مکروہ ہے کیوں کہ وہ بدعت ہے اور صحابہ و تابعین سے منقول نہیں ——

ان تمام عبارات سے یہ چیز بالکل واضح ہوتی ہے کہ جو عبادت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہؓ سے ثابت نہ ہو اور بعد میں ایجاد کی جائے وہ بدعت اور نامشروع ہے ۔

ان مقدمات کے ذہن نشین کر لینے کے بعد اذان قبر بلکہ اس قسم کی تمام بدعات کا مسئلہ خود بخود حل ہو جاتا ہے۔ کیوں کہ یہ چیز بالکل ظاہر ہے کہ وہ دین جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے امت کے سامنے پیش کیا تھا۔ جس میں میت کی تجہیز و تکفین، نماز جنازہ، طریقہ دفن، دعا بعد الدفن، وغیرہ کی تعلیم بھی موجود ہے اس میں قبر پر اذان دینے کا حکم کسی ضعیف سے ضعیف روایت میں بھی وارد نہیں ہوا، نیز صحابہ و تابعین اور حتی کہ بعد کے ائمہ مجتہدین نے بھی کبھی اس پر عمل نہیں کیا کیا معاذ اللہ اس رحیم و کریم پیغمبر (فداہ امی وابی) نے جو "بلغ ما انزل الیک من ربک" کا مامور اور "حریص علیکم بالمؤمنین رؤف رحیم" کا مصداق تھا اذان قبر کے بتلانے میں بخل کیا اور اس

اذان کے جواب سے فائدہ سے فاضل بریلوی مولوی احمد رضا خاں صاحب نے لکھے ہیں ان سب سے اپنے اصحاب اور اہلبیت تک کو محروم رکھا اور صحابہ و تابعین کی نظر بھی یہاں تک نہ پہونچی اور کیا ائمہ مجتہدین نے بھی اس کو نہ سمجھا ؂

رندِ خدا کہ عارفِ ہر ایک نکتہ ہست
دریغم کہ بادہ فروش از کجا شنید

بہرحال یہ حقیقت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اس اذان کا حکم نہیں دیا صحابہ و تابعین نے کبھی اس پر عمل کیا نہ ائمہ مجتہدین نے اور فقہائے معتبرین نے اس کو اپنی کتابوں میں لکھا لہٰذا یہ ایک عبادت ہے جو بعد میں ایجاد کی گئی پس وہ بدعت ضلالت اور ... فی الدین ہے اور اس پر عمل کرنے والے اور اس کو رواج دینے والے شریعت کے مجرم اور سنت کے باغی ہیں اور امیر المومنین حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ فقیہ امت حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ و صاحب الاسرار حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہم اجمعین کے جو ارشادات مقدسہ ذیل میں مذکور ہیں وہ اس کے لیے شاہد عدل ہیں۔

نیز اذان ایک خاص عبادت ہے اور اس کے لیے شریعت مقدسہ نے مخصوص مواقع مقرر کیے ہیں ان سے تجاوز حدود اللہ سے تعدی اور معصیت ہے کیوں کہ ہم کو حق نہیں ہے کہ کسی خاص عبادت کے لیے ہم کوئی ایسا موقع یا وقت مقرر کر دیں جو شریعت نے اس کے لیے مقرر نہیں کیا ورنہ اگر ایسی رسمیں جائز ہوتیں تو ائمہ مجتہدین عیدین کی نماز کے لیے اذان و اقامت کے اضافے کو بدعت نہ قرار دیتے کیوں کہ اس کے لیے تو اذان تجر" سے بہت زیادہ اور بہت اچھے وجوہ پیش کیے جا سکتے ہیں۔ بایں ہمہ ہم دیکھتے ہیں کہ اس بارے میں تمام فقہا متفق ہیں امام ابو اسحاق شاطبی غرناطی رحمۃ اللہ تعالیٰ بدعات کے بیان میں لکھتے ہیں۔

ومن ذالک الاذان والاقامۃ فی العیدین فقد نقل ابن عبدالبر اتفاق الفقہاء علی ان لااذان ولااقامۃ فیہما۔ (الاعتصام ج ۲ ص ۱۲)	اور اسی قبیل سے ہے اذان و اقامت عیدین جس میں ابن عبدالبر مالکی نے تمام فقہاء کا اس پر اجماع نقل کیا ہے کہ عیدین میں اذان ہے نہ اقامت۔

الغرض اذان اعلی القبر ۴ اس وجہ سے کہ وہ دین میں ایک قسم کا اضافہ ہے نیز اس وجہ سے کہ وہ ایک ایسی عبادت ہے جس کا حکم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی نہیں دیا نہ صحابہ

کرام نے اس کو کیا نیز اس وجہ سے کہ اس میں حدود واللہ سے تعدی ہے وہ بدعت، ضلالت اور قانون شریعت سے بغاوت ہے۔

یہاں تک جو بحث کی گئی وہ درحقیقت اصولی تھی مزید اطمینان کے لیے فقہ کی بعض متداول کتابوں سے بھی چند تصریحات نقل کی جاتی ہیں۔ علامہ ابن عابدین شامی رد المحتار میں لکھتے ہیں۔

وفی الاقتصار علی ماذکر من الوارد اشارۃ الی انہ لایسن الاذان عند ادخال المیت فی قبرہ کما ھو المعتاد الآن وقد صرح ابن حجر فی فتاواہ بانہ بدعۃ (شامی $\frac{659}{ج ۱}$)

اور اس میں اس طرف اشارہ ہے کہ میت کو دفن کرتے وقت اذان (جیسا کہ آج کل عادت ہو گئی ہے) مسنون نہیں ہے۔ اور ابن حجر نے اپنے فتاویٰ میں تصریح کی ہے کہ وہ بدعت ہے۔

اور درالبحار میں ہے۔

من البدع التی شاعت فی الھند الاذان علی القبر بعد الدفن

ان بدعات میں سے جو (بعض) بلاد ہند میں شائع ہو گئی ہیں۔ دفن کے بعد قبر پر اذان دینا بھی ہے۔

اور ترشیح شرح تنقیح محمود البلخی میں بھی اس اذان کے متعلق لکھا ہے "لیس بشیئٍ" کہ وہ کوئی چیز نہیں۔ اور امام ابن ہمام اپنی بے نظیر تالیف "فتح القدیر شرح ہدایہ" کتاب الجنائز میں ارشاد فرماتے ہیں۔

ویکرہ عند القبر کل مالم یعھد من السنۃ والمعھود منھا لیس الازیارتھا والدعا عندھا قائما۔

اور قبر کے پاس ہر وہ چیز مکروہ ہے جو سنت سے ثابت نہ ہو اور ثابت من السنۃ صرف قبروں کی زیارت ہے اور ان کے پاس کھڑے ہو کر دعا کرنا ہے۔

اور بعینہٖ یہی عبارت بحرالرائق $\frac{196}{ج ۲}$ اور رد المحتار $\frac{626}{ج ۱}$ اور فتاویٰ ہندیہ $\frac{107}{ج ۱}$ پر بھی ہے اس سے بھی صراحتہً معلوم ہوتا ہے کہ اذان قبر بلکہ اس قسم کی تمام وہ رسوم جو سنت سے ثابت نہیں قبر کے پاس مکروہ ہیں۔

نوٹ: یہ مضمون الفرقان بابتہ جمادی الاولیٰ و جمادی الاخریٰ ۱۳۵۲ھ میں شائع ہوا تھا یہاں صرف ابتدائی حصہ درج کیا گیا ہے اس کے آگے پورے ۲۰ صفحے میں فاضل بریلوی مولوی احمد رضا خاں صاحب کے ان دلائل پر تفصیلی بحث کی گئی تھی جو انہوں نے "قبر پر اذان" کے ثبوت میں اپنے رسالہ "ایذان الاجر" میں لکھے ہیں وہ ان شاء اللہ آئندہ سال کی خصوصی اشاعت میں ناظرین کرام ملاحظہ فرمائیں گے۔

ایک بدعت کے خلاف عدالت دیوانی بریلی کا فیصلہ

رضاخانی تثویب ناجائز اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی آیات و ارشادات کے قطعی خلاف ہے

اللہ بخشے ہماری بریلی کے بڑے مولوی صاحب اور مجدد صاحب کو جن کی مجددانہ ایجادوں اور کفری فتووں کی بدولت بریلی کو مرکز بدعات، اور کفر گڑھ کہا جانے لگا، آپ کو دو چیزوں سے خاص طور پر شغف تھا، ایک تکفیر مسلمین اور دوسرے احداث فی الدین، پہلے شوق کا تو یہ اثر ہوا کہ آپ نے اپنے ہم مشرب ہم مسلک چند نفر کے علاوہ سب ہی مسلمانوں کو کفر کے گھاٹ اتار دیا اور دنیا میں اشتہاری ڈھنڈورا پیٹ دیا کہ "دیوبندی علماء کافر، جو ان کے کفر میں شک لائے وہ بھی کافر، پھر جو اس کو کافر نہ کہے وہ بھی کافر" ندوۃ العلماء والے کافر، جو ان کو کافر نہ کہے وہ بھی کافر، پھر جو اس کو کافر کو کافر نہ سمجھے وہ بھی ایسا ہی کافر" اور تو اور مولانا عبدالباری صاحب فرنگی محلی بھی کافر، مولوی عبدالماجد صاحب بدایونی، مولانا عبدالقدیر صاحب بدایونی بھی کافر، اور جو ان کے عقائد کفریہ (عند البریلویہ) پر مطلع ہو کر ان کو کافر نہ مانے وہ بھی کافر، حاصل یہ ہوا کہ جو شخص دوسرے دینیات کے ساتھ ان علماء اسلام کے کفر پر بھی یقین رکھے وہ تو مسلمان ہے، باقی سب کافر، اب قارئین کرام خود ہی حساب لگالیں کہ ہندوستان میں کتنے ایسے خرد باختہ ہیں جو ان تمام بزرگان دین کو کافر اور خارج از اسلام سمجھتے ہوں لیں ہی تو ہمارے بڑے مولوی صاحب اور ان کی ذریت کے نزدیک مسلمان اور جنتی ہیں اور باقی سب کافر اور جہنمی (العیاذ باللہ تیری پناہ)

ہمارے بڑے مولوی صاحب کا یہ پہلا اور بڑا شاہکار تھا۔ اور آپ کا دوسرا خاص کارنامہ جو آپ کے دوسرے شوق کا نتیجہ ہے۔ یہ ہے کہ آپ نے بہت سی ایسی باتیں دین میں نکالیں جن کا زمانہ رسالتمآب صلی اللہ علیہ وسلم اور عہد صحابہؓ و تابعینؒ و ائمہ مجتہدین میں کہیں نام و نشان بھی نہ تھا، اور اپنی مجددانہ حیثیت سے ان کو اتنی اہمیت دی کہ ان کو شعار دین بنا ڈالا اور مسلمانوں کو قیامت تک لڑنے جھگڑنے اور

جو اپنے ادراک کے لیے بہت کافی سامان فراہم کر دیا۔

آپ کی ان ہی ایجاد چیزوں میں سے ایک وہ تثویب (رضاخانی صلوٰۃ) بھی ہے جو بریلی کی بعض اُن مساجد میں رائج ہے جو رضاخانیوں کے زیر اثر و اقتدار ہیں۔ اس تثویب میں بظاہر تو بصیغۂ خطاب باواز بلند حضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر درود و سلام پڑھا جاتا ہے لیکن مقصد اللہ بخش و مولا بخش وغیرہ محلہ کے نمازیوں کو پکارنا ہوتا ہے گویا یوں سمجھئے کہ مولانا حامد رضا خاں صاحب کی مسجد میں موذن اذان اور جماعت کے درمیان جب تثویب (صلوٰۃ) پکارتا ہے تو اس کی زبان پر تو یہ الفاظ ہوتے ہیں۔

الصَّلوٰۃُ والسَّلَامُ عَلَيْكَ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ ۔ اے خدا کے رسول آپ پر درود و سلام ہو۔

اور اس پکارنے والے کا مقصد اس صلوٰۃ سے یہ ہوتا ہے کہ

حضرت حجۃ الاسلام (مولانا حامد رضا خاں صاحب) تشریف لے آئے اور صاحبزادہ صاحب آپ بھی تشریف لے آئیے اور دوسرے نمازیو! تم بھی آ جاؤ۔

اب ناظرین خود ہی فیصلہ کر لیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی روح پاک اس لغویت سے کس قدر خوش ہوتی ہوگی کہ زبانی پکارا تو جاتا ہے حضور ؐ کو اور فی الحقیقت بلانا مقصود ہوتا ہے مولانا حامد رضا خاں صاحب اور اُن کے صاحبزادہ صاحب کو اور دوسرے اہل محلہ کو (استغفر اللہ و لا حول و لا قوۃ الا باللہ)

بہر حال اس وقت اس فعل کی شرعی اور عقلی حیثیت سے ہم کو بحث کرنا نہیں بلکہ ہمیں صرف یہ بتلانا تھا کہ ہماری بریلی کے بڑے مولوی صاحب نے جہاں (اذان علی القبر وغیرہ) اور بہت سی نئی باتیں دین میں ایجاد کیں اُن ہی میں سے ایک یہ صلوٰۃ بھی ہے جو بعض اُن مساجد میں کچھ عرصے سے رائج ہو گئی ہے جو اُن کے زیر اثر و اقتدار ہیں لیکن کچھ دنوں سے مولوی صاحب موصوف کی ذریت نے یہ پروگرام بنایا کہ دوسری مساجد میں بھی اس کو رائج کیا جائے۔ اسی سلسلہ میں اپنے بعض سادہ لوح دام افتادوں کے ذریعہ محلہ فراشی ٹولہ کی ایک مسجد میں بھی اس کو شروع کرا دیا۔ اس مسجد کے عام نمازی بحمد اللہ صحیح الخیال مسلمان اور سلف کے پکے مقلد ہیں نیز اس کے متولی ایک نیک نفس اور راسخ العقیدہ تعلیم یافتہ مسلمان حافظ عبد الجلیل

ع کوئی صاحب اذان پر شبہ نہ کریں کہ اسمیں "حیّ علی الصلوٰۃ" "حیّ علی الفلاح" کے الفاظ موجود ہیں جو دعوت الی الصلوٰۃ کے لیے صریح ہیں اور اس کے ماقبل میں تکبیر و شہادتین تمہید و تیمّن و تبرک کے لیے ہیں۔ اور آخر میں تکبیر و تہلیل تمہ اور خاتمہ بالخیر کے لیے علاوہ ازیں وہ منصوص ہے اور اس کی تعلیم وحی الٰہی سے دی ہے ۱۲

صاحب ہیں۔ ان حضرات نے ان سادہ لوحوں کو بہت سمجھایا کہ بھائی ہمارا ساڑھے تیرہ سو برس پرانا اسلام ہی ہماری نجات کے لیے کافی ہے اور ہم کو اس قسم کی نئی باتوں کی ضرورت نہیں مسجد میں ہمارے اجتماع کے لیے وہ اذان کافی ہے جس کی تعلیم خدا کے آخری رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے دی۔ اب کسی نئے اعلان اعلام کے ایجاد کرنے کا ہم کو اور تم کو اختیار نہیں۔ اور ہم اپنی مساجد میں بس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہ کرام کی سنتوں کو دیکھنا چاہتے ہیں۔ زید و عمرو کی ایجادات کو نہیں لہٰذا تم اس مسجد میں تثویب نہ پکارو لیکن وہ لوگ جو جہانت کر اس کام کے لیے مقرر کیے گئے تھے باز نہ آئے اور لڑنے بھڑنے کو آمادہ ہو گئے یہاں تک کہ ان لوگوں نے خود ہی معاملہ عدالت فوجداری میں پہونچایا اور مسجد کے متولی حافظ عبد الجلیل صاحب وغیرہ چند معززین اہل سنت کے خلاف استغاثہ دائر کر دیا۔ ان حضرات نے اپنی صفائی میں مولوی حامد رضا خانصاحب اور مولوی مصطفےٰ رضا خانصاحب کو بطور گواہ طلب کیا۔ مولوی صاحبان صورت دجو سب، کچھ کر سکتے ہیں مسلمانوں پر کفر کے فتوے دے سکتے ہیں، ان کو مشرکار کر بگڑ اور مینڈھوں کی طرح لڑا بھی سکتے ہیں۔ مگر عدالت میں کلمۂ حق نہیں کہہ سکتے۔) کئی ماہ روپوش رہے اور حاضر عدالت نہ ہوئے اور جب دیکھا کہ مریدوں کا دعویٰ اُلٹا ہمارے گلے کا ہار بن گیا تو خود ہی دعویٰ واپس کرا دیا اور اس طرح عدالت فوجداری کی کارروائی ختم ہوئی۔

اس کے بعد معاملہ عدالت دیوانی میں پہونچا اور طویل عرصہ کی کارروائی کے بعد مولوی محمد خلیل الدین صاحب بی۔ اے ایل ایل بی اڈیشنل منصف بریلی کے اجلاس سے ۹ مئی ۱۹۳۶ء کو اس کا فیصلہ ہوا۔ یہ فیصلہ طویل ہے اور چند تنقیحات پر حاوی ہے۔ ہم قارئین الفرقان کی اطلاع کے لیے صرف تنقیح نمبر۳ یہاں درج کرتے ہیں جسمیں فاضل منصف نے اس تثویب (رضاخانی صلاۃ) ..... پر نہایت قابلیت سے قابل تحسین بحث کی ہے۔

نقل تنقیح نمبر۳ فیصلہ مقدمہ نمبری ۴۲۸ سنہ ۱۹۳۵ء

حافظ عبد الجلیل وغیرہ، مدعیان بنام امداد اللہ خاں وغیرہ مدعا علیہم

باجلاس مولوی محمد خلیل الدین صاحب بی اے ایل ایل بی اڈیشنل منصف بریلی

تنقیح نمبر۳) ابتداءً منصف صاحب شہر بریلی نے تنقیح ہذا بالفاظ ایک اتفاقی تنقیح قائم کی تھی

ابتداءً یہ مقدمہ منصف صاحب شہر بریلی کی عدالت میں گیا تھا بعد میں وہاں سے منتقل ہو کر اڈیشنل منصف صاحب کے یہاں گیا اور

کیونکہ مدعا علیہم کا یہ بیان ہے کہ اس مسجد میں صلوٰۃ ہمیشہ پکاری جاتی رہی ہے۔ میں نے تنقیح کو اس طور سے ترمیم کردیا ہے کہ اب وہ قانونی تنقیح ہوگئی ہے کیونکہ میری رائے میں اس امر کا مقدمہ پر کوئی اثر نہیں ہے کہ صلوٰۃ ہمیشہ پکاری جاتی تھی یا نہیں۔ ہر مسجد جائے دوقف ہے اور ہر مسلمان کو مسجد میں جاکر نماز پڑھنے کا حق حاصل ہے لیکن انتظام مسجد ہمیشہ متولی کے ہاتھ میں رہتا ہے اور ہر مسلمان کو یہ حق حاصل نہیں ہے کہ بلا استمداد عدالت انتظام مسجد میں مخل ہوسکے اگر اس قسم کی مداخلت جائز ہو تو کسی قسم کا انتظام قائم نہیں رہ سکتا اور انتہائی بدانتظامی ناگزیر ہوجائے گی۔ اگر کوئی متولی اپنے فرائض بطریق مناسب انجام نہیں دیتا تو اس میں شک نہیں کہ ہر مسلمان کو اس کے معزول کرا دینے کا حق حاصل ہے لیکن جب تک وہ برطرف نہ ہوجائے کسی شخص کو اس کے انتظام میں مداخلت کا اختیار نہیں ہوسکتا۔

اس مقدمہ میں بطور امر واقعہ کے یہ تسلیم کرچکا ہوں کہ سالہا سال سے حافظ عبدالجلیل خاں بحیثیت متولی مسجد کا کام کرتے رہے ہیں۔ اہل محلہ نے ان کو مقرر کیا تھا اور ان کا تقرر بھی اس وجہ سے جائز ہو کہ اس محلہ کا رواج یہی ہے کہ اہل محلہ متولی مقرر کردیتے ہیں جیسا کہ خود مدعا علیہم کے گواہ ستارن بیگ کو بھی تسلیم ہے جو متولی ہونے کا مدعی ہے لنظر بریں واقعات مدعا علیہم کو انتظام مسجد میں مداخلت کا موقع نہیں دیا جاسکتا۔ اس میں شک نہیں کہ وہ مسجد میں آسکتے ہیں اور نماز پڑھ سکتے ہیں۔ اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آیا صلوٰۃ "نماز کا جزو" ہے یا اس کا تعلق انتظام مسجد سے ہے اول الذکر صورت میں مدعا علیہم کو بلا لحاظ اس امر کے کہ اس مسجد میں کبھی صلوٰۃ پکاری گئی یا نہیں پکاری گئی صلوٰۃ کہنے کا حق حاصل ہوگا۔ لیکن دوسری صورت میں مدعا علیہم کو صلوٰۃ پکارنے کا کوئی حق نہ ہوگا کیونکہ جب تک عبدالجلیل خاں مدعی نمبرا متولی ہیں اس وقت تک مدعا علیہم کو کوئی اختیار مداخلت کا حاصل نہیں ہوسکتا۔ اب میں "صلوٰۃ" کی نوعیت تجویز کرنے کی طرف متوجہ ہوتا ہوں۔

صلوٰۃ کو فقہ میں تثویب کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے جس کے معنی اعلام بعد اعلام کے ہیں اذان نماز کے لیے اعلان اول ہے اور یہ اعلان مقررہ الفاظ میں ...... بلند آواز کے ساتھ عام مسلمانوں کی اطلاع کے لیے کیا جاتا ہے کہ نماز تیار ہے۔ اس اعلان کے کچھ دیر کے بعد جماعت کی نماز ہوتی ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں ...... اذان ہوتے ہی نمازی مسجد میں جمع ہوجایا کرتے تھے لیکن جوں جوں زمانہ گزرتا گیا لوگوں کی دلچسپی دینی امور میں رفتہ رفتہ کم ہوتی گئی اور سلطان صلاح الدین بن المظفر بن الیب کے حکم سے سنہ ۷۹۱ھ میں دوسرے اعلان موسوم تثویب کا اجراء ہوا (ملاحظہ ہو اردو ترجمہ در مختار صفحہ ۱۸۱) مدعا علیہم نے بھی اپنے بیان تحریری میں ایسا ہی بیان کیا ہے کہ تثویب کو علمائے متاخرین نے اس وجہ سے رواج دیا تھا کہ اذان

سننے کے بعد تساہل کی وجہ سے لوگ مسجد میں جمع نہیں ہوتے تھے۔ تثویب کے لیے کوئی مقررہ الفاظ نہیں ہیں بلکہ الفاظ تثویب میں زمانہ اور مقام اور دیگر واقعات کی بنا پر فرق ہو جاتا ہے۔ مولوی **احمد رضا خاں** بریلوی نے (جن کے مدعا علیہم پیرو ہیں) اپنی کتاب العطایا النبویہ فی الفتاوی الرضویہ کے ص۴۵۲ پر تثویب کا بیان اس طرح کیا ہے کہ صلوٰۃ بمنزلہ اس کے ہے کہ گویا کسی شخص سے یہ کہا جائے کہ اذان ہو چکی ہے یا جماعت تیار ہے یا امام آگیا ہے۔ ان سب جملوں کے ذریعہ سے افراد سے تخاطب مقصود ہوتا ہے اور اس نیت سے کہے جاتے ہیں کہ مخاطب کو جماعت کے تیار ہونے کی اور اس میں شرکت کرنے کی اطلاع ہو جائے۔

صلوٰۃ کہنا بھی ایک قسم کی اطلاع ہے جو عامۃ المسلمین کو اس امر کی بابت دی جاتی ہے کہ جماعت تیار ہے۔ مدعا علیہم بھی اس کو فرض نہیں سمجھتے۔ اور وکیل مدعا علیہم نے دوران بحث میں یہ تسلیم کیا ہے کہ صلوٰۃ صرف مستحب ہے جس کے لغوی معنی بہتر یا مستحسن کے ہوتے ہیں اب ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ آیا صلوٰۃ کہنا مستحسن ہے یا مستحب؟ ہر مسلمان کے عقیدۂ راسخ کے بموجب وہ امر مستحسن ہے جس کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے خود کیا ہو یا حکم دیا ہو بمقابلہ اس امر کے کہ جس کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے نہ کیا ہو نہ کہا ہو۔ مدعا علیہم مجھ کو اس امر کی تائید میں کوئی سند نہ دکھا سکے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے سوائے نماز فجر کے کسی اور نماز کے وقت صلوٰۃ کہنے یا اعلان ثانی کی اجازت دی ہو۔ اذان مقررہ الفاظ میں ادا کی جاتی ہے۔ ایک مرتبہ ایسا اتفاق ہوا کہ جب حضرت بلال رضی اللہ عنہ نے نماز فجر کے وقت اذان کہی تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم استراحت فرما رہے تھے۔ حضرت بلال آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حجرے کے دروازے تک گئے اور فرمایا الصلوٰۃ خیر من النوم یعنی نماز خواب سے بہتر ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اس جملے سے بہت خوش ہوئے اور اس بات کی اجازت فرما دی کہ نماز فجر کی اذان میں اس فقرہ کا اضافہ کر دیا جائے۔ دیگر اوقات نماز کی اذانوں کے متعلق آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے تثویب کی صاف صاف ممانعت فرمائی ہے اور اس کی سند میں یہ حدیث ہے لا تثوبن فی شیئ من الصلوٰۃ الا فی الصلوٰۃ الفجر یعنی بجز نماز فجر کے اور کسی نماز کے وقت تثویب نہ کہو۔ یہ حدیث ترمذی بیان صلوٰۃ ص۲۷ سے منقول ہے اور ہر مسلمان جانتا ہے کہ ترمذی حدیث کی انتہائی مستند کتابوں میں سے ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس امر کو

عہ مولوی احمد رضا خاں صاحب کے اس بیان سے ہمارے اس دعوے کی پوری تصدیق ہو گئی کہ "الصلوٰۃ والسلام علیک یا رسول اللہ" پکارنے والے کا مقصد یہی ہوتا ہے کہ وہ تخفیق آجاؤ مولا بخش آجاؤ جماعت تیار ہو ۱۲ منہ

بہت ضروری اور بہت اہم قرار دیا ہے، ہر مسلمان کو اذان سنتے ہی فوراً مسجد میں پہنچ جانا چاہیے اور تثویب یا اعلان ثانی کی اجازت نہیں دی ہے بلکہ یہ فرمایا ہے کہ اگر بچے اور بوڑھے اندھے ہونے کا خوف نہ ہو تو میں ان مسلمانوں کے مکانات میں آگ لگا دوں جو اذان سننے کے بعد فوراً مسجد میں نہیں آتے اس کے معنی یہی ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب سے کوئی اجازت اعلان ثانی یا تثویب کی نہیں ہے۔

۷۸۱ھ میں سلطان صلاح الدین نے ایک بادشاہ اگر یہ کے ذریعہ صلاۃ کو جاری کیا تھا۔ مولوی احمد رضا خاں صاحب خود اپنی تصنیف مذکورہ بالا کے صفحہ ۱۲ پر فرماتے ہیں کہ ہر مقام کے واقعات پر لحاظ کرنا چاہیے اور اگر مسلمان نماز کے لیے اذان ہونے سے جمع ہو جاتے ہیں تو اس صورت میں تثویب ہرگز نہیں پکارنا چاہیے کیونکہ اس کا یہ اثر ہوگا کہ لوگوں کی اذان کے بعد مسجد میں جمع ہونے کی نیک عادت ان سے چھوٹ جائے گی۔

تثویب کسی طریقے سے مذہباً ضروری نہیں ہے اور خود مدعا علیہم اس کو بدعت تسلیم کرتے ہیں، اگرچہ وہ اس کو بدعت حسنہ یعنی ایسی بدعت کہتے ہیں جو حسن ہو مگر بدعت ہر صورت میں بدعت ہی رہے گی اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا صریح فرمان بدعت کے متعلق کُلُّ بِدْعَةٍ ضَلَالَةٌ ہے یعنی ہر بدعت ضلالت ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بدعتوں کی تقسیم بدعت حسنہ یا بدعت سیئہ میں نہیں فرمائی ہے ان جملہ دستاویزوں کے دیکھنے کے بعد یہ ثابت ہو گیا ہے کہ اذان اور جماعت کے درمیان اعلان ثانی یا تثویب مذہباً جائز نہیں ہے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ہدایات و ارشادات کے قطعی خلاف ہے، مدعا علیہم کو کوئی حق نہیں ہے کہ وہ اس کو جاری کریں۔ مدعیان اور جملہ وہ مسلمان جو ان کے ہم خیال ہیں تثویب یا اذان اور نماز کے درمیان اعلان ثانی کے روکنے پر یقیناً حق بجانب ہیں۔ ان کو الفاظ تثویب پر جو اس مسجد میں کہے جاتے ہیں کوئی اعتراض نہیں ہے بلکہ ان کا قول یہ ہے کہ ان الفاظ کا استعمال بے محل ہے۔

یہ امر بدیہی ہے کہ تثویب کے اضافے سے اذان کی اہمیت کم ہو جائے گی لوگ رفتہ رفتہ اعلان اول سے بے پرواہ ہو جائیں گے، سننے کے عادی ہو جائیں گے اور اعلان ثانی کے منتظر رہا کریں گے۔ ممکن ہے کہ کچھ مدت بعد اعلان ثالث یا اعلان رابع کی بھی ضرورت پیش آئے گی۔

مدعا علیہم کے فاضل وکیل نے اپنی بحث کے آغاز میں کہا کہ ہر مسلمان کو کسی مسجد میں جا کر اپنے طریقہ مخصوص سے نماز پڑھنے کا حق حاصل ہے اور کسی شخص کو مزاحمت کا حق نہیں ہے۔ یہ بات بالکل

صحیح ہے لیکن اس سے یہ نتیجہ نہیں نکلتا کہ تثویب نماز کا جزو ہو اور خود مدعا علیہم کے عقیدے کے مطابق تثویب لازمی نہیں ہے بلکہ اس کی ضرورت زمانہ کی حالت اور ہر جگہ کے واقعات پر منحصر ہے میری رائے میں تثویب کا تعلق انتظامِ مسجد سے ہے جو متولی یا منتظم مسجد کے اختیار کلی میں ہے۔ لہٰذا میں تجویز کرتا ہوں کہ مدعا علیہم اذان اور نماز کے درمیان تثویب کہنے کے مستحق نہیں ہیں۔

تنقیح زیر مدعا علیہم کے خلاف فیصلہ کی جاتی ہے اور بسلسلہ تنقیح بالا مدعا علیہم کو بذریعہ حکم امتناعی ممانعت کی جاتی ہے کہ وہ اذان اور جماعت کے درمیان صلوٰۃ کہنے سے باز رہیں۔ (نقل مطابق اصل)

الفرقان ــــ اور اس کی
خاص اشاعت
کے لئے ــ
بے شمار دعائیں
اور
نیک خواہشات
ماڈرن ہاؤس ایجنسی
فون نمبر: ۳۲۴۳۸۹
اسٹیٹ ایجنٹس اینڈ بلڈنگ کنٹریکٹرس
۲۵۵ ـ عبدالرحمٰن اسٹریٹ بمبئی ۳

تیجہ

محمد منظور نعمانی

باسمہ تعالیٰ حامداً و مصلیاً

علامہ ابو اسحاق شاطبی رحمۃ اللہ علیہ اپنی بے نظیر کتاب "الاعتصام" میں بدعات کے متعلق فرماتے ہیں۔

ومنها التزام العبادات المعينة في اوقات معينة لم يوجد لها ذلك التعيين في الشريعة۔	اور انہی بدعات میں سے خاص خاص عبادات کا التزام کر لینا ہے مخصوص اوقات میں دراں حالیکہ تعیین شریعت میں وارد نہیں ہوئی ہے۔

اور ظاہر ہے کہ اگر تیجہ دوسری تمام خرابیوں سے خالی بھی ہو تو اس میں یہ غیر شرعی تعیین ضرور پائی جاتی ہے۔ پس تحقیقی نظر میں اس کے عدم جواز کے لیے اتنا ہی کافی ہے چہ جائیکہ اس میں اور بہت سی صریح قباحتیں بھی ہوتی ہیں جن میں سے چند یہ ہیں —

(۱) اکثر و بیشتر میت کے ترکے ہی میں سے تیجے کے مصارف اٹھائے جاتے ہیں۔ حالانکہ وارثین میں نابالغ اور یتیم بھی ہوتے ہیں۔ اور کبھی کبھی بعض ورثہ غیر حاضر بھی ہو جاتے ہیں۔ اور اس وجہ سے ان کی اجازت شامل نہیں ہوتی اور ظاہر ہے کہ اس صورت میں یہ فعل صرف بدعت بلکہ حرام قطعی ہوگا۔

(۲) کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ میت کے پس ماندگان کے پاس تیجے کے لیے پیسے موجود نہیں ہوتے۔ اور وہ رسم و رواج سے مجبور ہو کر قرض لیتے ہیں۔ اور غضب بالائے غضب یہ کہ اگر غیر سودی قرضہ نہیں ملتا۔ (جیسا کہ آجکل کا عام حال ہے) تو سودی قرض لے کر ہی اس رسم کو پورا کرتے ہیں۔ حالانکہ احادیث صحیحہ میں سود

لینے والے کی طرح سود دینے والے پر بھی لعنت وارد ہوئی ہے۔ پس ایسی صورت میں بھی یہ تیجہ حرام قطعی ہوگا۔

(۳) جو لوگ ان تیجہ کرنیوالے عوام کے احوال و افکار سے واقفیت رکھتے ہیں ان کو یہ بھی اندازہ ہوگا کہ اس میں للّٰہیت و اخلاص کا حصہ بہت کم ہوتا ہے اصل، محرک نام و نمود اور برادری کے رسم و رواج کی پابندی کا خیال ہوتا ہے اور یہ بجائے خود معصیت شدیدہ ہے اسی قسم کی رسوم کے متعلق، علامہ شامی رد المختار، میں فرماتے ہیں۔

واطال ذلک فی المعراج وقال وهذه الافعال کلها للسمعة والرياء فيحترز عنها لانهم لايريدون بها وجه الله۔

اور معراج الدرایہ میں اس پر طویل کلام کیا ہے اور کہا ہے کہ یہ تمام کام نام و نمود کے لیے کئے جاتے ہیں لہٰذا ان سے بچنا چاہئے۔ کیوں کہ ان میں للّٰہیت نہیں ہوتی۔

(۴) تیجے دسویں، وغیرہ میں عموماً اعزاء و اقارب کی بھی دعوت ہوتی ہے۔ بالخصوص خاندان کے قریبی رشتہ داروں کو تو ضرور ہی کھانا کھلایا جاتا ہے اور یہ بنص حدیث، ممنوع ہے مسند امام احمد و سنن ابن ماجہ میں بسند صحیح حضرت جریر بن عبد اللہ بجلی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے۔

کنا نعد الاجتماع الی اهل المیت وصنعهم الطعام من النیاحة۔

ہم لوگ عہد صحابہؓ میں اہل میت کے یہاں جڑنے اور ان کے کھانا تیار کرنے کو نوحہ میں شمار کرتے تھے۔ (جو سخت منع ہے)

اور اصول حدیث، میں مقرر ہو چکا ہے کہ کسی صحابی کا اس طرح بیان کرنا کہ صحابہ کرام عہد نبوی میں یوں کیا کرتے تھے یا یہ کہا کرتے تھے اس چیز کے حکم رسول ہونے پر دال ہے۔ اسی حدیث کے مطابق فقہاء حنفیہ نے بھی غمی کی دعوتوں کو ناجائز لکھا ہے امام ابن ہمام فتح القدیر شرح ہدایہ میں ارقام فرماتے ہیں ؎

بکره اتخاذ الضيافة من الطعام من اهل المیت لانه مشروع فی السرور

اور اہل میت کا کھانے کی دعوت کرنا مکروہ ہے کیوں کہ ضیافت تو شادی

لانی الشرور وھی بدعۃ مستقبحۃ

وخوشی کے مواقع پر مشروع ہے نہ کہ غمی میں اور وہ بہت بری بدعت ہے۔

فتاویٰ قاضی خان میں ہے۔
یکرہ اتخاذ الضیافۃ فی ایام المصیبۃ لانہا ایام تأسف الخ

غمی کے دنوں میں دعوت کرنا مکروہ ہے کیونکہ وہ تو رنج کے دن ہیں۔۔۔۔ الخ

فتاویٰ سراجیہ میں ہے۔
لایباح اتخاذ الضیافۃ عند ثلاثۃ ایام فی المصیبۃ۔

غمی میں تیسرے دن کی دعوت کرنا جائز نہیں ہے۔

فتاویٰ بزازیہ میں ہے۔
لایباح اتخاذ الطعام فی الیوم الاول والثالث وبعد الاسبوع ونقل الطعام الی القبر فی المواسم واتخاذ الدعوۃ لقراءۃ القرآن وجمع الصلحاء والقراء للختم او لقراءۃ سورۃ الانعام والاخلاص

اور مکروہ ہے کھانا تیار کرنا پہلے دن اور تیسرے دن اور ہفتے کے بعد کھانا قبر پر لے جانا خاص تقریبوں اور رسم کے دنوں میں نیز مکروہ ہے قرأت قرآن کے لیے دعوت اور صلحاء اور قراء کو ختم کے واسطے یا سورۂ انعام یا سورۂ اخلاص پڑھنے کے واسطے جوڑنا۔

جامع الرموز میں ہے۔
ویکرہ اتخاذ الضیافۃ فی ھذہ الایام وکذا اکلہا کما فی خیرۃ الفتاویٰ۔

اور مکروہ ہے ان خاص دنوں میں ضیافت کرنا اور ایسے ہی اس کا کھانا بھی جیسا کہ خیرۃ الفتاویٰ میں مرقوم ہے۔

کشف الغطاء میں ہے۔
آنچہ متعارف شدہ از پختن اہل مصیبت طعام را در سوم و قسمت نمودن آں میان اہل تعزیت و اقران غیر مباح و مشروع است و تصریح کردہ بر آں در خزانہ چہ

یہ جو رائج ہو گیا ہے اہل مصیبت کا موت کے تیسرے دن کھانا تیار کرانا اور اہل تعزیت اور اپنے میل جول والوں میں تقسیم کرنا ناجائز اور غیر مشروع ہے۔

شریعت دعوت نزد سرور است نہ نزد شرور۔

اور خزانہ میں اس کی تصریح کی ہے کیوں کہ دعوت کی مشروعیت خوشی میں ہے نہ کہ غمی میں

اور حضرت شیخ عبد الحق صاحب محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ شرح سفر السعادۃ میں فرماتے ہیں۔

وعادت نبود کہ برائے میت در غیر وقت نماز جمع شوند، قرآن خوانند وختمات خوانند نہ بر سر گور نہ غیر آں وایں مجموعہ بدعت است ومکروہ ہم، تعزیت اہل میت و تسلیہ نمودن سنت و مستحب است۔ اما ایں اجتماع مخصوص روز سوم وارتکاب تکلفات دیگر وصرف اموال بے وصیت از حق یتامیٰ بدعت است وحرام۔

اور قرون اولیٰ میں عادت نہ تھی کہ میت کے ایصال ثواب کے لیے وقت نماز کے علاوہ کسی دوسرے وقت قبر پر یا کہیں اور جمع ہوتے اور قرآن پڑھتے یا کوئی ختم پڑھتے ——— اور یہ مجموعہ مکروہ اور بدعت ہے۔ ہاں اہل میت کی تعزیت اور ان کو تسلی دینا سنت و مستحب ہے۔ لیکن یہ تیسرے دن کا خاص اجتماع اور دوسرے تکلفات کرنا اور بلا وصیت کے یتامیٰ کے حق میں سے خرچ کرنا بدعت وحرام ہے۔

اور یہی شیخ عبد الحق دہلوی علیہ الرحمہ جامع البرکات میں فرماتے ہیں۔

وآنچہ مردم روزگار از تکلفات کنند سوم روز از فرش انداختن وخیمہ زدن وطیبہا قسمت کردن وامثال آں ہمہ بدعت شنیع ونامشروع است۔

اور ہمارے زمانے کے آدمی تیسرے دن جو تکلفات کرتے ہیں۔ یعنی فرش بچھانا اور خیمہ لگانا اور خوشبوئیں تقسیم کرنا وغیرہ وغیرہ یہ سب بدعت شنیع اور ناجائز ہے۔

حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ مقالۃ الوصیۃ میں فرماتے ہیں

دیگر از عادات مردم اسراف است در ماتمہا وسوم وچہلم وششماہی وفاتحہ سالینہ ایں ہمہ را در عرب اول وجود نہ بود۔

ہم لوگوں کی عادتوں میں غمی کے مواقع پر اور تیجہ چالیسویں چھ ماہی اور برسی میں اسراف کرنا بھی داخل ہو گیا ہے۔ ان تمام چیزوں کا عرب اول میں کوئی وجود نہ تھا۔

حضرت قاضی ثناء اللہ پانی پتی رحمۃ اللہ علیہ اپنے وصیت نامہ میں فرماتے ہیں۔

بعد مردن من رسوم دنیوی مثل دہم و بستم وششماہی و برسی ہیچ نکنند۔

میرے مرنے کے بعد دنیوی رسوم مثلاً تیجہ، دسواں، بیسواں، چھ ماہی و برسی کچھ نہ کریں۔

اور حضرت خواجہ محمد معصوم نقشبندی قدس سرہ العزیز گیارھویں مکتوب میں تحریر فرماتے ہیں۔

سوال ششم آنکہ طعام بروح میت بروز سوم و دہم و گل دادن روز سوم از کجاست
مخدوما طعام دادن للہ تعالیٰ بے رسم و ریا و ثواب آن بمیت گزرانیدن بسیار خوب است و عبادت بزرگ، اما تعیین وقت، اصل معتمد علیہ ظاہر نمیشود و روز سوم گل دادن بمردان بدعت است۔

چھٹا سوال یہ ہے کہ تیجے اور دسویں کے دن میت کی روح کو کھانا پہونچانا اور پھول تقسیم کرنا کہاں سے ثابت ہے؟ میرے مخدوم محض اللہ کے لئے کھانا کھلانا اور بلا پابندی رسم و رواج اور بلا دکھاوے کے اس کا ثواب میت کو پہونچانا بہت اچھا ہے اور بڑے ثواب کی بات ہے۔ لیکن تعیین وقت کی کوئی قابل اعتماد دلیل نہیں ہے اور تیجے کے دن مردوں میں پھول کی تقسیم بدعت سیئہ ہے۔

ان اکابر امت کی ان تمام عبارات سے صاف ظاہر ہے کہ مروجہ تیجہ بدعت شنیعہ اور غیر مشروع ہے۔

واضح رہے کہ ہمارا یہ جواب رواج یافتہ تیجے کے متعلق ہے۔ لیکن بلا رسمی و رواجی پابندیوں کے اگر محض لوجہ اللہ صدقہ وغیرہ کیا جائے اور اس کا ثواب اموات کو پہونچایا جائے تو کوئی مضائقہ نہیں بلکہ فعل حسن اور اموات کے لیے فائدہ مند ہے شرح عقائد نسفی میں ہے

وفی دعاء الاحیاء للاموات وصدقتہم عنہم نفع لہم۔

زندوں کا مردوں کے لیے دعا کرنا اور ان کی طرف سے صدقہ کرنا ان کے لیے نفع بخش ہے۔

ھذا آخر الجواب ویتوب اللہ علی من تاب والیہ المرجع والمآب۔

بہترین چائے کے لئے
یہ ٹریڈ مارک ہمیشہ یاد رکھئے
AA
TRADE MARK
ہمارے یہاں
نیل گری سے لے کر آسام تک کے تمام مشہور و معروف باغات
کی چائے نہایت مناسب اور واجبی نرخ پر فراہم کیجاتی ہے
تجربہ شرط ہے
عباس علاؤالدین اینڈ کمپنی
چائے کے تھوک اور خوردہ بیوپاری
۴۴۔ حاجی بلڈنگ۔ نل بازار، بمبئی ۳
فون نمبر 332220
تار کا پتہ CUPKETTLE

آج کے عرسوں کی قوالی
شریعت محمدی کی روشنی میں

سنہ ۱۳۵۶ھ میں ایک سوال نامہ ملتان سے مدیر الفرقان کے پاس آیا تھا۔ اس میں پہلا سوال یہ تھا کہ۔

"قوالی مع مزامیر جو آج کے صوفیوں میں مروج ہیں، اس کا کیا حکم ہے؟"
کیا ان کا یا اگلے صوفیا کا سننا جواز کی دلیل ہو سکتا ہے۔؟

اس سوال کا مندرجہ ذیل جواب جمادی الاولیٰ سنہ ۱۳۵۶ھ کے الفرقان میں شائع ہوا تھا۔

الجواب

اقول وباللہ التوفیق۔ قوالی مع مزامیر جس طرح کہ آجکل کے ہوا پرست متصوفہ میں رائج ہے قطعاً حرام ہے۔ جس کی حلت کے لیے کوئی گنجائش نہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں۔ ان اللہ بعثنی رحمۃ للعالمین وامرنی ان امحق المزامیر والکنارات، (رواہ احمد) اللہ نے مجھے سارے عالم کے لیے رحمت بنا کر بھیجا ہے اور مجھے حکم فرمایا ہے کہ مزامیر اور رباب میں آگ لگا دوں۔

"اور مسند احمد ہی کی ایک دوسری روایت میں جس کو صاحب مشکوٰۃ نے بھی باب الخمر میں نقل کیا ہے۔ یہ الفاظ مزید آئے ہیں۔۔۔۔"

ان اللہ بعثنی رحمۃ للعالمین وھدی للعالمین وامرنی ربی بمحق المعازف والمزامیر (الحدیث)	اللہ تعالیٰ نے مجھے تمام عالم کے لیے سامان رحمت اور باعث ہدایت بنا کر بھیجا ہے اور مجھ کو حکم دیا ہے کہ باجوں گاجوں کو مٹا دوں ۔۔۔ الخ

اور سنن ابی داؤد وغیرہ میں حضرت نافع سے مروی ہے کہ ایک دفعہ میں حضرت عبداللہ

بن عمر رضی اللہ عنہ کے ہمراہ جا رہا تھا کہ ایک طرف سے باجے کی آواز آئی تو آپ نے اپنے کانوں میں انگلیاں دے لیں اور راستہ سے ہٹ گئے۔ پھر مجھ سے پوچھا کیا ابھی وہ آواز آرہی ہے۔ میں نے عرض کیا نہیں تو آپ نے انگلیاں کانوں میں سے نکال لیں اور ارشاد فرمایا کہ :-

کنت مع النبی صلی اللہ علیہ وسلم فسمع مثل هذا فصنع مثل هذا۔

میں ایک دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تھا تو آپ نے ایسی ہی آواز سنی تو آپ نے ایسا ہی کیا جیسا کہ اس وقت میں نے کیا۔

ان احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ باجے گاجے شریعت میں کس قدر سخت حرام اور اللہ اور اس کے رسول کو کتنے مبغوض ہیں عقل میں نہیں آتا کہ ان نصوص صریحہ کے ہوتے ہوئے کوئی گمراہ اور حامل اسلام کے ساتھ معازف و مزامیر (باجوں گاجوں) کے جواز کا قائل بھی ہوگا۔ لیکن ہونا ایسا ہی تھا کیونکہ صادق و مصدوق صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا تھا

لتکونن من امتی قوم یستحلون الحریر والخمر والمعازف رواہ البخاری تعلیقاً

میری امت میں ایک وہ گمراہ جماعت بھی ہوگی جو ریشم شراب اور باجوں کو حلال جانے گی۔

لیکن ان باغیان دین کو حق اسکے قہر اور اس کی شدید گرفت کا منتظر رہنا چاہیئے۔ ان کے حق میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے۔

یخسف اللہ بہم الارض ویجعل منہم القردة والخنازیر

خدا کا ان پر سخت عذاب ہوگا۔ ان کو زمین میں دھنسا دیا جائے گا اور ان کو بندر اور سور بنا دیا جائے گا۔

اور مسند ابن ابی الدنیا میں مروی ہے کہ حضور نے ارشاد فرمایا۔

یمسخ قوم من هذه الامة فی آخر الزمان قردة وخنازیر قالوا یا رسول اللہ الیس یشهدون ان لا الہ الا اللہ وان محمداً رسول اللہ قال بلی ویصومون ویحجون ویصلون

زمانہ آخر میں اس امت میں سے ایک گروہ بندروں اور سوروں کی شکل میں مسخ کر دیا جائے گا بعض صحابہ نے عرض کیا۔ یا رسول اللہ! کیا وہ اللہ کی وحدانیت اور آپ کی رسالت کی شہادت نہ دیتے ہوں گے۔ ارشاد فرمایا

قیل فما بالھم ؟ قال اتخذوا المعازف والقینات

کیوں نہیں بلکہ وہ روزے بھی رکھتے ہوں گے حج بھی کرتے ہوں گے، نماز بھی پڑھتے ہوں گے عرض کیا گیا پھر کیوں مسخ کیے جائیں گے۔ ارشاد فرمایا باجوں اور گانے والی عورتوں کو رکھیں گے۔

کیا ان احادیث کے ہوتے ہوئے بھی معازف اور مزامیر کی حرمت میں کوئی شبہ ہو سکتا ہے؟ ان صریح حدیثوں اور شدید وعیدوں کے بعد فقہی عبارات کے نقل کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ورنہ سیکڑوں عبارات کتب فقہ سے بھی نقل کی جا سکتی ہیں۔ بلکہ اکثر فقہاء حنفیہ تو مطلق غناہی کو حرام کہتے ہیں خواہ وہ مزامیر سے بھی خالی ہو۔ تاتارخانیہ میں ہے۔

ان کان السماع غنا فھو حرام لان التغنی واستماع الغناء حرام

اگر سماع بصورت غنا ہو تو وہ حرام ہے۔ کیوں کہ تغنی اور اس کا سننا حرام ہے۔ (مبسوط میں ہے)

اور مبسوط میں ہے۔

الملاھی والتغنی کلھا حرام

آلات لہو اور تغنی سب حرام ہیں۔

اور محیط میں ہے۔

التغنی والتصفیق بھا واستماعھا کلھا حرام

غنا اور اس میں تالیاں بجانا اور اس کا سننا سب حرام ہے۔

اور امام ربانی مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ کے مکتوبات میں ہے کہ۔

حکی عن ابی نصیر الدبوسی عن القاضی ظھیر الدین الخوارزمی من سمع الغنا من المتغنی وغیرہ اویری فعلا من الحرام فیحسن ذالک باعتقاد او بغیر اعتقاد لیصیر مرتدا فی الحال۔

ابو نصیر دبوسی سے منقول ہے کہ وہ قاضی ظہیر الدین خوارزمی سے ناقل ہیں کہ جو شخص گوئیے وغیرہ سے گانا سنے یا کوئی فعل حرام دیکھے اور اعتقاد کے ساتھ یا بلا اعتقاد ہی اس کی تحسین کرے اسی وقت مرتد ہو جائے گا۔

الغرض فقہاء احنفیہ کے نزدیک متعارف قوالی اگر مزامیر سے خالی ہو۔ جب بھی حرام ہے اور اس کو تقرب الٰہی کا ذریعہ سمجھنا اور بھی زیادہ وبال ہے اور یہ سمجھنا کہ عام امت کے لیے اگرچہ علم ظاہر اور شریعت میں حرام ہے۔ مگر خاص صوفیوں کے لیے علم باطن اور طریقت میں حلال ہے محض زندقہ اور ملحدانہ وسوسہ ہے۔ صوفی صافی علامہ محمد برکی رومی طریقہ محمدیہ میں لکھتے ہیں۔

مایدعیه بعض المتصوفة فی زماننا اذا انکر علیهم بعض امورهم المخالفة للشرع ان حرمة ذالک فی العلم الظاهر وانا من اصحاب العلم الباطن وانه حلال فیه وانکم تاخذون من الکتاب وانا ناخذ من صاحب الکتاب محمد علیه الصلوٰة والسلام کله الحاد اذلا یخفی ما فیه من الازدراء بالشریعة المحمدیة فالواجب علی کل من سمع هذا المقال الانکار علی قائله والحکم ببطلان مقاله بلا تلعثم وتردد ولا توقف والا فهو من جملتهم۔

ہمارے زمانے کے بعض مدعیانِ تصوف کا یہ وطیرہ ہے کہ جب ان کے خلافِ شریعت کاموں کو رد کیا جاتا ہے تو وہ کہہ دیتے ہیں کہ اس کی حرمت صرف علم ظاہر میں ہے اور ہم اصحاب علم باطن میں سے ہیں اور یہ چیز اس میں حلال ہے۔ اور تم ظاہر پرست لوگ تو احکامِ شریعت کو کتاب سے نکالتے ہو اور ہم براہ راست صاحب کتاب صلی اللہ علیہ وسلم سے علوم کر لیتے ہیں۔ سو یہ محض بد دینی اور خالص گمراہی ہے کیوں کہ اس میں شریعت محمدی کا استخفاف ہے پس جو شخص کسی سے یہ بات سنے اس پر ضروری ہے کہ اس کا رد کرے اور بلاشک و تردد اس کے باطل ہونے کا یقین رکھے ورنہ وہ بھی ان کے زمرہ میں داخل ہوگا۔

واضح رہے کہ شریعت و طریقت، کی یہ تفریق اور علم ظاہر و باطن کی یہ اصطلاح صرف بعد کے گمراہ صوفیوں کی ایجاد ہے۔ ورنہ اکابر صوفیاء کا دامن تقدس اس سے پاک ہے۔ ان حضرات نے صاف صاف تصریحیں فرمائی ہیں کہ شریعت محمدیؐ اور کتاب و سنت کے سوا سلوک کا کوئی راستہ نہیں۔ جن خوش نصیبوں کو ان حضرات کی کتابیں دیکھنے کی توفیق ہوئی ہے ان پر یہ تصریحات مخفی نہ ہوں گی۔ اور خدا نے توفیق دی تو آئندہ کسی فرصت میں ہم وہ تصریحات ناظرین الفرقان کی خدمت میں بھی پیش کریں گے، رہا یہ سوال کہ بعض ان حضرات جن کا شمار اولیاء اللہ میں ہے ان کے متعلق مشہور ہے کہ ان کے یہاں مجلس سماع ہوتی تھی اور بعض کے متعلق یہ بھی مشہور ہے کہ وہ گانا مع مزامیر کے سنتے تھے تو اس کا جواب یہ ہے کہ ان میں سے اکثر حکایتیں بے اصل ہیں، بعد کے بندگان ہوا و ہوس نے اپنی نفس پرستی پر پردہ ڈالنے اور اس کو جائز ثابت کرنے کے لیے یہ افسانے گڑھے ہیں، اور اگر بعض

کسی سے ثابت بھی ہو کہ انھوں نے بحالت ہوش و صحت حواس مع مزامیر کے گانا سنا تو یہ کہا جائے گا کہ انھوں نے گناہ کیا اور اگر وہ فی الحقیقت خدا رسیدہ تھے تو انھوں نے اس سے توبہ کرلی ہوگی ورنہ ان کی ولایت کا خیال بھی گمراہی ہے۔ قرآن عزیز میں تصریح ہے کہ اللہ کے ولی صرف متقی ہیں ـــــ

الا ان اولیاء اللہ لاخوف علیھم ولا ھم یحزنون الذین آمنوا وکانوا یتقون۔

خبردار اللہ کے دیوں کو نہ خوف ہوگا اور نہ غم اور وہ وہی لوگ ہیں جو ایمان لائے اور انھوں نے تقویٰ اختیار کیا

بہرحال اگر کسی ایسی ہستی سے جو عام طور پر بزرگ سمجھی جاتی ہو۔ کوئی گناہ دانستہ یا نادانستہ طور پر صادر ہو جائے تو وہ ہمارے لیے وجہ جواز نہیں بن سکتا۔ حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ اسی مسئلہ کے متعلق پر کلام کرتے ہوئے ارقام فرماتے ہیں ـ

دعمل صوفیہ درحلت وحرمت سند نیست ہمیں بس نیست کہ ما ایشاں را معذور داریم وملامت نکنیم وامر ایشاں را بحق سبحانہ تعالیٰ مفوض داریم اینجا قول امام ابو حنیفہؒ یا امام ابو یوسفؒ وامام محمدؒ معتبر است نہ عمل ابوبکر شبلی وابوالحسن نوری ـــــ"

امید ہے کہ یہ مختصر تحریر اس مسئلہ میں اطمینان کے لیے کافی ہوگی ـــ "

درد و محبت کے جویا اور یقین کے طالبوں کے لئے کچھ انمول تحفے

سوانح حضرت مولانا عبدالقادر رائے پوری

از مولانا سید ابو الحسن علی ندوی

حضرت مولانا رائے پوری رحمۃ اللہ علیہ اس عہد آخر کے اولیاء کاملین کا نمونہ، شریعت و طریقت کے جامع، احسان و تقوے کے امام اور تربیت و تزکیۂ نفس کے رموز سے آشنا۔ ان کے فیض صحبت سے لاکھوں مسلمانوں کو فائدہ پہونچا۔ اپنے حلقۂ اثر کی وسعت عمومیت اور مختلف طبقوں اور متنوع حلقوں کی نمائندگی اور عصر حاضر کے رجحانات اور تقاضوں کی واقفیت کے اعتبار سے وہ اپنے معاصرین میں ممتاز تھے اور اولیاء متقدمین کی یادگار اس کتاب میں حضرت مولانا رائے پوری کی سیرت و شخصیت، ان کے نمایاں کردار و صفات اور تربیت بہ چشم زندہ جاوید بلکہ سامنے آگئی ہے۔ • عمدہ کاغذ

سائز ۲۲×۱۸ • صفحات ۴۳۲ • قیمت مجلد ۵۰-/۷

سوانح حضرت مولانا محمد یوسف کاندھلوی

تالیف مولانا محمد ثانی حسنی۔ مقدمہ: مولانا سید ابو الحسن علی ندوی

داعی الی اللہ حضرت مولانا محمد یوسف صاحبؒ کی ایک ایسی مکمل اور مستند سوانح جس میں کاندھلہ اور جھنجھانہ کے خاندانوں کے حالات خصوصاً مولانا محمد الیاس صاحبؒ کا ذکر خیر نیز تبلیغی جماعتوں کے مجاہدانہ کارناموں کی سرگذشت ہے۔

حضرت شیخ الحدیث کے تفصیلی حالات زندگی حضرت مولانا سید ابو الحسن علی ندوی کے قلم سے

پوری کتاب مولانا علی میاں کے زیر نگرانی لکھی گئی ہے۔ اور مولانا کی نظر ثانی کے بعد شائع کی گئی ہے۔

• خوبصورت رنگین جلد

• خوبصورت گرد پوش • اعلیٰ کاغذ و طباعت

• قیمت صرف پندرہ ۱۵ روپے

تذکرہ حضرت مولانا شاہ فضل الرحمن صاحب

(گنج مرادآبادی)

از مولانا سید ابو الحسن علی ندوی

چودھویں صدی ہجری کے مشہور و معروف بزرگ، عالم حضرت مولانا فضل الرحمن گنج مرادآبادی کی سوانح حیات، حالات، ارشادات اور ملفوظات دل پر اپنا اثر کئے بغیر نہیں رہتے، صاف معلوم ہوتا ہے کہ تصوف، شریعت سے علاحدہ کوئی چیز نہیں بلکہ عین شریعت کی روح ہے۔

مولانا موصوف کے متعلق مولانا تھانویؒ، مولانا مونگیریؒ مولانا سید عبدالحیؒ کے اثرات بھی اس کتاب میں شامل ہیں

قیمت مجلد، چار روپے صرف

صدر یار جنگ

نواب صدر یار جنگ مولانا حبیب الرحمن خاں صاحب شروانی ملی تحریک کے ایک نمائندہ فرد اور ملت کا قیمتی سرمایہ تھے۔ وہ ایک جید عالم دین حضرت مولانا فضل الرحمن گنج مرادآبادی کے مسترشد، سلطنت آصفیہ حیدرآباد کے صدر الصدور، ایک خاندانی رئیس اور ساتھ ہی مشرقی تہذیب و تمدن کا نمونہ اور اردو کے ایک صاحب طرز ادیب تھے۔

یہ سوانح ملی تاریخ کی ایک اہم کڑی اور ایک قومی ضرورت کی تکمیل ہے۔

قیمت مجلد صرف بارہ ۱۲ روپے

ان کے علاوہ ہر قسم کے مترجم و غیر مترجم قرآن شریف اور درسی و غیر درسی دینی، علمی، ادبی اور اصلاحی کتابوں کے لئے ہم سے رجوع کیجئے

ناشر: مکتبہ دار العلوم، ندوۃ العلماء لکھنؤ

مشائخ چشتیہ اور سماعِ مزامیر

از جناب مولانا نسیم احمد فریدی صاحب امروہی

بزرگانِ دین کے نام سے جو گمراہیاں اہلِ ہویٰ و ہوس نے پھیلائی ہیں ان میں سے ایک سماعِ مزامیر کا مسئلہ بھی ہے اور ہم نے بارہا حیرت کے ساتھ بعض اربابِ ہوس سے یہ سنا ہے کہ "اکابرِ طریقت" ہمیشہ سے اس کے قائل بلکہ عامل ہیں ——— پھر ان میں سے جنہیں حیا کا کچھ عنصر باقی ہے وہ علی الاطلاق تمام مشائخ طریقت کے متعلق تو نہیں کہتے اور گو یا حضرات سہروردیہ، قادریہ، نقشبندیہ کے متعلق تسلیم کرتے ہیں کہ وہ حرمت مزامیر کے قائل تھے، ہاں مشائخ چشتیہ قدس اللہ اسرارہم کے متعلق عام عشاقِ مزامیر کا یہی دعویٰ ہے کہ وہ اس کے مجوز بلکہ اس پر عامل بھی رہے ہیں، اور گذشتہ صدی سے یہ صور کچھ اس قدر بلند آہنگی سے پھونکا جا رہا ہے کہ بہت سے نیک بخت لوگ بھی اس فریب میں آگئے اور عام طبقے کے نزدیک بھی گویا یہ ایک ناقابلِ انکار اور مسلّم حقیقت بن گئی اپنا وہ بحدا پروپیگنڈہ میں بھی کیا طاقت ہے!

حالانکہ اگر یہ عشاقِ مزامیر مشائخ چشتیہ کی سوانح حیات کا مطالعہ کریں تو انہیں کبھی یہ توہین آمیز جرأت نہ ہو کہ وہ حضرت خواجہ معین الدین اجمیری حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ حضرت بابا فرید الدین گنج شکر حضرت خواجہ نظام الدین اولیاءؒ حضرت خواجہ نصیر الدین چراغ دہلوی قدس اللہ اسرارہم کے مقدس دامنوں پر مزامیر کا داغ لگانے کی ناپاک اور جہل آمیز کوشش کریں۔ میں اپنے دعوے کے اثبات میں سیر الاولیاء اور رسالہ اصول السماع کے چند اقتباسات پیش کرتا ہوں یہ ملحوظ رہے کہ یہ دونوں کتابیں حضرت سلطان المشائخ کے دو مریدوں کی لکھی ہوئی ہیں۔ اور ان کا معتبر ہونا ہر چشتی و نظامی کے نزدیک مسلّم ہے خصوصاً اوّل الذکر کتاب تو حالات سلطان المشائخ میں اوّل نمبر

کی کتاب مانی گئی ہے۔ کیوں کہ اس کے مصنف مولانا سید محمد مبارک علوی کرمانی نے بہت سے چشم دید واقعات اور معتبر ذرائع سے سنے ہوئے ملفوظات اس کتاب میں جمع کئے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ گانے بجانے کو جائز بتانے والوں اور قرآن و حدیث کے مطالب کو اپنے مقاصد خسیسہ کے قالب میں ڈھالنے والوں کو ان حوالوں کے سامنے اپنے ہتھیار ڈال دینے پڑتے ہیں اور انکار کئے نہیں بنتی یہ دوسری بات ہے کہ دانستہ طور پر قوالی مروجہ کی حمایت میں ایڑی چوٹی کا زور صرف کر دیں اور مصالح دنیوی کے پیش نظر موسیقیت و مزامیر کو فروغ دینے کو اسم خصت طریقت قرار دیں ——

(۱) سیر الاولیاء مطبوعہ مطبع محب ہند دہلی کے صفحہ ۵۲۰ پر جو فارسی عبارت ہے اس کا ترجمہ عام فہم پیش کیا جاتا ہے۔ "اس مجلس میں ایک شخص نے حضرت سلطان المشائخ (حضرت نظام الدین اولیاء دہلوی) سے عرض کیا کہ حال ہی میں حضرت کے بعض حاضر باش درویشوں نے چنگ و رباب اور مزامیر کے مجمع میں رقص کیا ہے۔ حضرت نے ارشاد فرمایا کہ انھوں نے اچھا نہیں کیا جو چیز خلاف شرع ہے وہ بری ہے اس کے بعد ایک شخص نے عرض کیا کہ جب یہ درویش گانے بجانے کی محفل سے باہر آئے ان سے لوگوں نے دریافت کیا کہ تم نے یہ کیا کیا؟ ان درویشوں نے جواب دیا کہ ہم اس قدر مستغرق سماع تھے کہ ہمیں خبر ہی نہ تھی کہ یہاں باجے ہیں یا نہیں۔ جب حضرت نے یہ بات سنی تو ارشاد فرمایا کہ یہ جواب کوئی حیثیت نہیں رکھتا یہ بہانہ تو ہر گناہ میں چل سکتا ہے۔" [۱]

(۲) ایک اور مجلس میں حضرت سلطان المشائخ سے ایک شخص نے عرض کیا کہ اس وقت فلاں مقام پر آپ کے متعلقین نے ایک محفل منعقد کی ہے۔ جس میں مزامیر اور محرمات موجود ہیں۔ حضرت سلطان المشائخ نے فرمایا کہ میں نے منع کر دیا ہے کہ مزامیر اور محرمات سماع میں نہ ہوں۔ ان لوگوں نے اچھا نہیں کیا۔ نیز فرمایا کہ امام نماز پڑھا رہا ہو اور اس کے مقتدیوں میں علاوہ مردوں کے عورتیں بھی ہوں۔ اگر امام کو سہو واقع ہو جائے تو مردوں میں سے کسی مرد کو سبحان اللہ کہہ کر امام کو سہو پر مطلع کرنا چاہیئے لیکن اگر کوئی

---

[۱] یہ عبارت فوائد الفواد ملفوظات سلطان المشائخ میں بھی موجود ہے۔

عورت سہو پر واقف ہو وہ کس طرح امام کو آگاہ کرے؟ وہ سبحان اللہ نہ کہے تاکہ اس کی آواز غیر محرم نہ سن پائیں تو کیا کرے؟ اس کو چاہئے کہ ہاتھ کی پشت کو ہتھیلی پر مارے ہتھیلی کو ہتھیلی پر نہ مارے کہ یہ لہو کے مشابہ ہے اس درجہ لہو سے پرہیز ثابت ہو پس سماع میں مزامیر بدرجہ اولیٰ منع ہوگا۔

تالیوں کو حضرت نظام الدین اولیاءؒ کی طرف منسوب کرنیوالے اور مزامیر کو مشائخ چشت کے مسلک میں واجب ضروری اور لازم بتانے والے اس بصیرت افروز تقریر کو سیر الاولیاء مطبوعہ مطبع محب ہند صـ۵۲۲ و ۵۲۳ پر انصاف کی آنکھوں سے دیکھیں —

(۳) سیر الاولیاء صـ۴۹۱ پر ہے سلطان المشائخؒ نے فرمایا چار باتوں کا لحاظ رکھا جائے تو سماع مباح ہے۔

(۱) مُسمِع (۲) مُستمِع (۳) مسموع (۴) آلہ سماع۔

مُسمِع یعنی سنانے والا جوان یا معمر شخص ہو بے ریش لڑکا یا عورت نہ ہو۔ مستمع (یعنی) سننے والا یاد حق سے خالی نہ ہو۔ مسموع یعنی اشعار فحش اور بیہودہ نہ ہوں آلہ سماع مزامیر ہے جیسے چنگ و رباب یہ آلات بھی سماع میں نہ ہوں اگر یہ باتیں سماع میں پائی جائیں تو سماع حلال ہے یہ مطلق سماع صوت موزوں سے تعلق رکھتا ہے۔ وہ کیوں کر حرام ہو جائے گا۔ یہ بھی فرمایا کرتے تھے کہ نفس سماع علی الاطلاق نہ حلال ہے نہ حرام عوارض سے اس کا حکم بدلتا رہتا ہے[1]

(۴) حضرت سلطان المشائخؒ کے خلیفہ مولانا فخر الدین صاحب زرادیؒ نے عربی زبان میں ایک رسالہ اصول السماع لکھا ہے (مطبوعہ رسالوں کے علاوہ اس کا ایک قلمی نسخہ بخط احمد حسن جمالی، نظامی دہلوی کتب خانہ دیوبند میں موجود ہے) اس میں مصنف ذکر کرنے باوجود

---

[1] چنگ و رباب ہی پر مزامیر کا انحصار نہیں بلکہ عرف میں قوالی کے تمام آلات طرب مزامیر کہتے ہیں جیسا کہ غیاث اللغات میں مزامیر کی تحقیق کے بعد لکھا ہے "در عرف جمیع ساز مطربان را گویند" لہٰذا ہارمونیم سارنگی، طبلہ ڈھولک اور قیامت تک جو آلات قوالوں کے بجانے کے لیے ایجاد ہوں گے وہ مزامیر کے تحت میں داخل ہوں گے۔

مزامیر کی اباحت پر زور دینے کے اس حقیقت کا بھی اظہار کر دیا ہے کہ مشائخ چشت کا دامن تہمت مزامیر سے پاک ہے۔ چنانچہ فرماتے ہیں۔

"واما سماع مشائخنا رضی الله تعالیٰ عنهم فبری عن هذه التهمة وهو مجرد صوت القوال مع الاشعار المشعرة من صنعة كمال الله تعالیٰ۔

یعنی ہمارے مشائخ رحمۃ اللہ علیہم اجمعین کا سماع تہمت مزامیر سے پاک تھا ان کا سماع مجرد صوت کے ساتھ عارفانہ اشعار کا ہوتا تھا۔" اتنی صریح و معتبر عبارتوں کی موجودگی میں خدا معلوم ان مجوزین مزامیر کو خلاف شریعت امور کا انتساب بزرگوں کے ساتھ کرنے میں کیوں شرم محسوس نہیں ہوتی۔

(۵) رقص کے متعلق صاحب رسالہ اصول السماع فرماتے ہیں۔

وهو فعل السفهاء والمتصنعين، عند غلبة الهوى، وهو حرام بالاتفاق

یعنی رقص کرنا احمقوں اور مکاروں کا فعل ہے جو کہ غلبہ ہوائے نفسانی کے وقت سرزد ہوتا ہے اور بالاتفاق حرام ہے جس کسی کو اس عبارت میں شک ہو وہ رسالہ مذکور میں رقص کی بحث دیکھے۔ اس جگہ یہ بیان کر دینا بھی مناسب معلوم ہوتا ہے کہ مشائخ چشت کے ملفوظات و سوانح میں جہاں کہیں وجد و رقص کا ذکر آتا ہے وہاں مروجہ رقص مراد نہیں۔ بلکہ حقیقت میں وہ ایک خاص کیفیت ہوتی تھی۔ جس کو ریا و تصنع سے کوئی تعلق نہ تھا۔ غلبۂ حال کی بنا پر وجد و کیف کی حالت طاری ہوتی تھی۔ جس سے بے اختیارانہ قیام و قعود کے افعال سرزد ہو جاتے ہیں۔ غالباً اسی کو وجد و رقص سے تعبیر کر دیا جاتا ہے۔

لہٰذا وجد و رقص کو زمانۂ موجودہ کے وجد و رقص پر قیاس نہ کیا جائے ؂

کار پاکاں را قیاس از خود مگیر

مزامیر کی مدد اور آلات لہو کی اعانت سے جو کیفیت پیدا کی جاتی ہے اس کو تواجد سے تعبیر کیا جائے تو بہتر ہے۔ اور یہ حقیقت اہل نظر پر پوشیدہ نہیں ہے کہ وجد و تواجد میں زمین و آسمان کا فصل ہے۔ حضرت مولانا ضیاء بخشی رحمۃ اللہ علیہ اپنی کتاب سلک السلوک کی سلک پنجاہم میں فرماتے ہیں۔

وجد قلب پر بلا تکلف عارض ہوتا ہے۔ اہل معرفت کا قول ہے کہ وجد دل کا وہ راز ہے جس پر سوائے خدائے علیم کے کوئی واقف نہیں ہوتا۔ اسی سلک میں تحریر فرماتے ہیں۔

بیان کیا جاتا ہے کہ ایک بزرگ وعظ فرما رہے تھے۔ ایک شخص کو اس وعظ کو سن کر وجد آیا اور اس نے اپنا پیراہن چاک کر ڈالا۔ جب اس حالت سے افاقہ ہوا تو ان بزرگ نے فرمایا کہ وجد میں تو دل چاک کر دیا کرتے ہیں نہ کہ دامن ۔ ۔ ۔ الخ۔ سالک مجسم میں فرماتے ہیں۔

وجد وہ حال ہے جو انسان سے بلا تکلف ظاہر ہو بخلاف تواجد کے کہ اس میں تکلف ہوتا ہے والمختصر وجد و تواجد میں بہت بڑا فرق ہے۔

عالم ربانی، صوفی حقانی حضرت شیخ عبد الحق صاحب محدث دہلوی قدس سرہٗ العزیز کتاب "المکاتیب والرسائل الی ارباب الکمال والفضائل" مطبوعہ مجتبائی دہلی کے رسالہ سادستہ ص۳۶ پر تحریر فرماتے ہیں۔ جس کا اردو ترجمہ حسب ذیل ہے۔

"اول تو حب وجود میں سے شیخ محی الدین ابن عربیؒ سماع غنا کے انتہائی منکر ہیں اور فرماتے ہیں کہ نغمہ کا اثر بالذات روح حیوانی پر ہوتا ہے حرکت بدن اور رقص کا ظہور روح حیوانی کے سبب ہوتا ہے۔ روح انسانی تاثیر نغمہ سے منزہ ہے حضرت شیخ اکبرؒ یہ بھی فرماتے ہیں کہ سماع غنا اور اس کی تاثیر دین خالص میں سے نہیں ہے جس کی طرف آیہ "الا للّٰہ الدین الخالص" میں اشارہ ہے۔ اس کے علاوہ بھی سماع غنا کے انکار میں حضرت شیخ اکبر نے بہت کچھ فرمایا ہے[1]

حضرت شیخ دہلوی کتاب مذکور کے ص۳۷ پر فرماتے ہیں "یہ بات یقین کو پہنچ گئی کہ اکابر مشائخ چشتیہ نے (فقط) سماع (نہ کہ مزامیر) سنا ہے۔ لیکن وہ بھی احتیاط شرائط اور آداب کے ساتھ وہ اکثر خلوت میں سماع سنتے تھے تاکہ اغیار اور نامحرموں کی شرکت سے مجلس خالی رہے۔

ص۳۸ پر تحریر فرماتے ہیں "حضرت سلطان المشائخ شیخ نظام الدین اولیاء قدس سرہٗ کی مجلس میں نہ مزامیر ہوتا تھا نہ تالیاں بجتی تھیں۔ ان چیزوں سے حضرت اپنے

---

[1] نوٹ:۔ شیخ اکبر رحمۃ اللہ علیہ کا مرتبہ قائلین وحدۃ الوجود اور صوفیائے محققین کے نزدیک جو کچھ ہے وہ محتاج بیان نہیں ہے۔ اب دیکھنا ہے کہ قوالی نامہ کے مصنف اس محقق منکر غنا کے متعلق کیا فرماتے ہیں۔

متوسلین کو منع فرماتے تھے۔ آپ فرمایا کرتے تھے کہ دائرہ شرع سے کسی شخص کو باہر نہ ہونا چاہئے رسائل فقہیہ میں مذکور ہے کہ سماع میں تو اختلاف ہو بھی لیکن مزامیر کا سننا بالاتفاق حرام ہے۔ ایک مرتبہ امیر حسن دہلوی علیہ الرحمۃ نے حضرت کی خدمت میں عرض کیا کہ جس وقت کوئی آواز سنائی دیتی ہے تو دنیا و مافیہا اس وقت فراموش ہو جاتی ہے۔ تمام چیزوں سے دل سرد ہو جاتا ہے۔ اور یاد حق کے سوا دل میں کچھ باقی نہیں رہتا۔ لیکن یہ حالت نماز میں حاصل نہیں ہوتی حضرت نے جواباً ارشاد فرمایا کہ کوشش کرو تا کہ یہ حالت نماز میں حاصل ہو جائے جب حضرت سلطان المشائخ مجلس سماع میں حاضر ہوتے تھے آپ پر گریہ وزاری ظاہر ہوتی تھی۔

اس کے بعد حضرت شیخ محقق دہلوی فرماتے ہیں "کہ حضرت کے رقص (مروجہ) اور تواجد (وجد اختیاری) کا کوئی ثبوت نقل نظر سے نہیں گزرا۔

ص۲۹ پر ارقام فرماتے ہیں "مریدان سلسلۂ شیخ نصیر الدین محمود قدس سرہٗ سماع مزامیر کے حد درجہ اجتناب و احتراز کرتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ ہمارے شیخ نے فرمایا ہے کہ جو شخص مزامیر سنے گا وہ ہماری بیعت اور مریدی سے باہر ہو جائے گا۔ واللہ اعلم بالصواب" معلوم نہیں کہ چودھویں صدی ہجری میں بھی سلسلۂ نظامیہ محمودیہ کے اندر یہ خصوصیت باقی ہے یا نہیں؟

ص۳۱ پر ارشاد فرماتے ہیں "حدیث لسحت خیۃ المعوی... الخ خود محدثین اور محققین مشائخ کے نزدیک موضوع اور بے اعتبار ہے حدیث جاریتین کے متعلق فرماتے ہیں کہ وہ دو لڑکیاں تھیں اور اوس و خزرج کے درمیان جو بعض وقائع گذرے ہیں۔ اس کو بغیر تصنع و بغیر قواعد موسیقی کے پڑھ رہی تھیں "مگا نیوالی"......................... نہ تھیں۔ چنانچہ صحیح بخاری میں آیا ہے کانتا تغنیان لیستا بمغنیتین زیادہ سے زیادہ اس سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ غنائے مطلق حرام نہیں لیکن "اجتماعہائے خاص (مجلس مزامیر) کیفیت مخصوص کے ساتھ کہاں سے ثابت ہو گئے؟ "اس سے کچھ آگے فرماتے ہیں

ان کا یہ کہنا کہ ہمارے مشائخ نے سماع سنا ہے، محض بہانہ اور حیلہ ہے اگر یہ لوگ مشائخ کے معتقد ہیں تو یہ کیا کہ مشائخ کے تمام طریقوں میں صرف سماع کو پسند کر لیا اور تمام باتوں کو بالائے طاق رکھ دیا یہ لوگ ہونا گندہ نکونامے چند کے مصداق ہیں خدا کی قسم ان لوگوں کو مشائخ سے نسبت نہ مشائخ کی ان پر عنایت۔ مشائخ تو اہل حق

اور ارباب صدق ہیں۔ وہ اہل بطلان و کذب سے کب راضی ہوتے ہیں؟ ان (نام نہاد صوفیاء) کی بنا کار سوائے نفسانیت اور تعصب کے کچھ نہیں یہاں تک کہ اگر یہ کسی فقیہ یا متشرع انسان کو دیکھتے ہیں تو اس کی مخالفت میں اور زیادہ (معاصی کا) ارتکاب کرتے ہیں، گویا کہ جماعت فقہاء سے دشمنی رکھتے ہیں اور ان کا دین فقہا کے دین سے جدا ہے۔"

(کتاب المکاتب والرسائل۔ از شیخ عبدالحق دہلوی رحمہ)

آخر میں سیر اولیاء کے باب نہم کا کچھ اقتباس بطور ترجمہ ہدیہ ناظرین کرتا ہوں یہ واضح رہے کہ یہ باب علامہ کرمانی رحمہ مرید حضرت سلطان المشائخ رحمہ نے اپنے زمانے کے اہل سماع کے متعلق ان کی اصلاح کی غرض سے لکھا ہے اور ناصحانہ طرز میں محض سماع کی غرض و غایت بیان فرما کر قواعد سماع کے پابند رہنے کی تلقین فرمائی ہے۔

انھیں یہ کیا خبر تھی کہ کسی زمانے میں ایسے ایسے مدعیان تصوف ہارمونیم اور سارنگی کو سماع کا جزو لاینفک قرار دیں گے اور ان میں سے بعض "قوالی نامہ" لکھ کر تمام مشائخ چشتیہ کی طرف سماع مزامیر کی نسبت کر دیں گے، حتیٰ کہ قرآن حدیث میں باجوں کے جواز کو تلاش کریں گے۔ اچھا اب علامہ کرمانی کی بصیرت افروز تقریر سنیئے فرماتے ہیں۔

اہل سماع کی (ایک) لغزش یہ ہے کہ دن رات سماع کو کہ وہ در اصل مردان خدا کی کسوٹی اور مجاہدین الٰہی کا معرکہ گاہ ہے طریقۂ گمراہی بنا کر یا کوبی کرے اور اپنا شور و شغب آسمان تک پہنچائے اور اس ذریعہ سے اپنے آپ کو مشہور کرے اور نیک منفعل کے گریۂ درد انگیز اور نعرہ شوق حق آمیز اور ان کے شور و رقص کو پریشان کرے، رقاصوں کی طرح ناچ دکھا کر دیکھنے والوں کو ہنسائے اور اس طریقے سے حاصل کردہ شہرت کو اپنی رندی اور حلوے مانڈے کا ذریعہ بنائے ؎

سماع اے برادر بگویم کہ چیست | اگر مستمع را بدانم کہ کیست
اگر برج معنی پرد طیر او | فرشتہ فرو ماند از سیر او
اگر مرد لہو است و بازی و لاغ | قوی تر شود دیوش اندر دماغ

یہ مکار شخص اپنے مشائخ کے طریقے کو چھوڑ کر خواہشات نفس کے راستے پر گامزن ہوتا ہے اور ان ناپسندیدہ حرکات سے چاہتا ہے کہ کوئی مقام حاصل کرے، خدا

کی قسم یہ اپنے مقصد میں ہرگز ہرگز کامیاب نہیں ہو سکتا ایک بزرگ نے سچ فرمایا ہے ؎

ترسم نہ رسی بکعبہ اے اعرابی
کایں راہ کہ تو میروی بترکستان است

خدا کے واسطے ہمارے مشائخؒ کے طور و طریقہ اور اعمال و اخلاق پر جن کا سیر اولیاء میں ذکر ہو چکا ہے) نظر غائر ڈالو کہ انہوں نے ابتدا سے انتہا تک کیا کیا مجاہدات و ریاضات شاقہ برداشت کئے ہیں اور رضائے باری تعالیٰ حاصل کرنے کیلئے مشغولی باطن کے باعث اپنے آپ کو بالکل فنا کر دیا باایں ہمہ کوئی بشر ان کی ریاضتوں اور مجاہدوں پر مطلع نہ ہونے پایا۔ جبکہ ان کی جان پر آ بنتی تھی اور ریاضت کی وجہ سے ہلاکت کا اندیشہ ہوتا تھا اسوقت یہ مقدس حضرات سماع میں مشغول ہو کر بحر معرفت میں شناوری فرماتے تھے۔ (از سیر الاولیاء)

بزرگان دین رحمہم اللہ تعالیٰ کی ارواح طیبہ کو مزامیر و غیرہ ۔ اخذ تیموں سے کس قدر تکلیف پہونچتی ہے اس کا اندازہ مندرجہ ذیل واقعہ سے کچھ ہو سکتا ہے جس کو حضرت شیخ عبدالحق صاحب محدث دہلوی نے اخبار الاخیار میں حضرت میر سید ابراہیم ابن معین عبدالقادر ایرجی رحمۃ اللہ علیہ کے تذکرہ میں لکھا ہے۔

(ترجمہ اردو) کہتے ہیں کہ انہوں نے (میر سید ابراہیمؒ نے) حضرت شیخ نظام الدین قدس سرہٗ سے عالم رؤیا میں خرقہ پایا ہے اور وہ مجلس سماع میں حاضر نہیں ہوتے تھے ——— سنا گیا ہے کہ شیخ رکن الدین بن شیخ عبدالقدوس گنگوہیؒ فرماتے ہیں کہ ایک دن میں نے ان کی خدمت میں عرض کیا کہ آج حضرت خواجہ قطب الدین قدس سرہٗ العزیز کا عرس ہے اگر چاہیں تو تشریف لے چلیں ——— آپنے فرمایا تم جاؤ اور ان کی قبر کی زیارت سے مشرف ہو اور ان کی روحانیت کی جانب متوجہ ہو کر دیکھو) کہ کیا فرماتے ہیں بس میں جو زیارت کے لیے گیا اور ان کی قبر کے مقابل بیٹھا اور ان کی روحانیت کی جانب متوجہ ہوا مجلس سماع گرم تھی ——— تو اہل اور صوفی جوش و خروش میں بیٹھے تھے اس اثناء میں حضرت خواجہ صاحبؒ فرماتے ہیں کہ ان بدبختوں نے ہمارا دماغ اڑا دیا اور ہمارے وقت میں خلل ڈال دیا ——— لبعدہٗ میں سید ابراہیم علیہ الرحمۃ کی خدمت میں حاضر ہوا آپ ہنسے اور فرمایا کہ اب (اس حالت میں) معذور سمجھو گے یا نہیں؟ میں نے عرض کیا کہ واقعی وہی بات ہے جو آپ فرماتے ہیں، حو

وصداقت آپ ہی کی جانب ہے۔

عرض آخر مجھے مشائخ چشتیہ رحمہم اللہ تعالیٰ اجمعین کے طرز عمل کی روشنی میں مسئلہ سماع مزامیر کو حل کرنا تھا الحمد للہ کہ میں دیانت اور نیک نیتی کے ساتھ اس مقصد میں ایک حد تک کامیاب ہوگیا مزامیر پسند مزاجوں میں صلاحیت موجود ہے تو یہی بہت کچھ ہے ورنہ آیات قرآنیہ، احادیث نبویہ اور فقہ حنفی کے پیش کرنے سے بھی اثر نہ ہوگا۔

چوں مختلط شد اعتدال مزاج　　　نہ عزیمت اثر کند نہ علاج

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین

(الفرقان بابت جمادی الاخریٰ ۱۳۷۹ھ)

رسم و ملت

(از جناب ابوالاسرار رمزی اٹاوی)

(۱)

ہو گئے ہیں سخت اتنے دنیوی رسم و رواج ۔۔۔ حکم و قانون الٰہی سے بھی بالاتر ہیں آج
رسم کی خاطر از جاتے ہیں سلطانوں کے تاج ۔۔۔ رسم سے برباد ہوتے ہیں شہنشاہوں کے راج

رسم ہے کفر و بغاوت حکم قدرت کے خلاف ۔۔۔ رسم ہے انکار حق پیغمبروں سے انحراف
رسم ہے زندہ جنازہ مذہبی احکام کا ۔۔۔ رسم سے اٹھتا ہے خاکہ ملت اسلام کا
رسم ہے اک مستقل لعنت زمانے کے لئے ۔۔۔ اپنا مطلب اور کام اپنا بنانے کے لئے
دین منشائے خدا ہے دین راہ مستقیم ۔۔۔ دین میں ہے رستگاری دین میں فوز عظیم

رسم ہے ناپاک بدعت مذہب و دین عجم
دین فطرت میں ہے مضمر رازِ معراج امم

گر تجھے ناموس و دین مصطفےٰ کا پاس ہو ۔۔۔ کچھ تجھے اپنی مذلت کا اگر احساس ہے
رسم کے بندے یہ طرز کافرانہ چھوڑ دے ۔۔۔ چھوڑ دے رسم و رواج حشر کا زیور دے
زندگی تیری شکنجے میں دبائی جائے گی ۔۔۔ سود کے خونخوار پنجے میں دبائی جائے گی
اجنبی ہاتھوں سے یہ اعضا مروڑے جائیں گے ۔۔۔ خون کے قطرات رگ رگ سے نچوڑے جائیں گے

رنج میں تبدیل ہو جائے گا یہ جشن فضول
اور انگاروں پہ تڑپیں گے ان ارمانوں کے پھول

(۲)

ساز و سامان و ہجوم و اہتمام رنگ و بو ۔۔۔ دعوت شیر و شکر کے گرم چرچے کو بہ کو
یہ ترانے شادیانے یہ مزین محفلیں ۔۔۔ ان سے آتی ہے مجھے افلاس مستقبل کی بو

لے گیا تھا مدتوں سے جب وہ زیبا پیرہن ۔ یہ کھلا راز فغاں وہ اجرائے ہائے ہو

رسم سے جلتا ہے حسرت خانۂ اسراف میں ۔ روشنی کے دیولوں میں مردِ مومن کا لہو
سود خواروں کے قدم پر مردِ مومن کی جبیں ۔ آج پامال ہے دینِ ہاشمی کی آبرو
اے کہ تو پیمانہ بردارِ رسولِ پاک ہے ۔ توڑ دے رسموں کے شیشے اور رواجوں کے سبو

شبنم بے مایہ کی اس ہیچ مقداری پہ بھی ۔ پھول کر لیتا ہے اس کے ایک قطرے سے وضو
غیر کا تیری طرح شرمندۂ منت نہیں ۔ بے خودی سے وہ تبسم آشنا و سرخرو

تو الجھ کر رہ گیا رسم و رواجِ دہر میں ۔ جائے گا کس منھ سے غافل اب خدا کے روبرو
وہ نشیمن کیا ہوا؟ طرزِ نشیمن کیا ہوئی ۔ بجلیاں جس کے لئے رہتی تھیں صرفِ جستجو

آہ تیرے دل سے وہ سوزِ یقیں جاتا رہا
عشقِ ملت کا شرارِ دل نشیں جاتا رہا

توڑ یہ زنجیرِ باطل قید سے آزاد ہو
اپنی ملت کی بہشتِ سادہ میں آباد ہو
یہ رواج و رسم ہے شیطان کی جادوگری
اور مذہب ہو سرود و نغمۂ پیغمبری

(الفرقان ذیقعدہ سنہ ۱۳۹۰ھ)

مجاہدِ توحید و سُنّت

شاہ اسماعیل شہید رحمۃ اللہ علیہ

(از جناب مولانا انور صابری دیوبندی)

وہ قائدِ جلیل وہ سردار مسلمیں — لرزاں ہے جس کے نام سے پنجاب کی زمیں
جس کی نگاہ واقفِ رمزِ جہاد تھی — کی اختیار جس نے روِ تاجدارِ دیں
سمجھے تھے جس نے سورۂ انفال کے نکات — جس کی مثال محفلِ کونین میں نہیں
جس نے اکھاڑ کر شجرِ شرک ہند سے — توحید کا بلند کیا پرچمِ حسیں
یلغارِ بے پناہ سے جس کی خدا گواہ — درگاہِ حق میں ہو گئی خم کفر کی جبیں
باطل کی موت آئی جدھر کو نکل گیا — اس دہلوی زعیم کا خیلِ مجاہدیں
بزمِ عدو میں حشر بپا ہوا — جس سمت اٹھ گئی نگہِ قہر و خشمگیں
جس کے عمل کے آج بھی ملتے ہیں تذکرے — تاریخ کی بساطِ کہن پر کہیں کہیں

جس کو پیامِ زندگیِ جاوداں ملا
جس کو فرازِ قوم کا نام و نشاں ملا
آنکھوں سے اپنے پردۂ غفلت اتار کر
انورؔ اسی پہ قلب و جگر کو نثار کر

شہید اعظم

(از جناب مولانا سعید احمد صاحب اکبرآبادی ایم اے، فاضل دیوبند)

حضرت عالمگیر رحمۃ اللہ علیہ کے بعد ہندوستان کی اسلامی حکومت پر زوال و انحطاط کی جو موت طاری ہوگئی تھی اور جس نے آخرام سات سمندر پار کی ایک اجنبی و بیگانہ حکومت کے قیام کی شکل میں ظہور کیا اس کا صحیح احساس رکھنے والے علما میں حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ کا نام نامی ہمیں سب سے سرعنوان نظر آتا ہے۔ حضرت شاہ صاحب کی تصنیفات سے پتہ چلتا ہے کہ وہ اسلامی حکومت کے فنا پذیر ہونے پر حد درجہ متاسف ہیں اور ساتھ ہی یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ وہ مسلمانوں کی ذہنیت میں انقلاب عظیم پیدا کر کے ان کو ایک جدید اور زبردست تبدیلی کے لئے آمادہ کرنا چاہتے ہیں۔ حضرت شاہ صاحب نے جس انقلاب آفریں خیالات کی داغ بیل ڈالی تھی وہ اگرچہ خود اس کی تکمیل نہ کر سکے اور نہ اس سلسلے میں انھوں نے کوئی عملی سرگرمی ہی دکھائی لیکن یہ کہنا بالکل صحیح ہے کہ آپ کے نظریات و فکریات کا مکمل عملی نمونہ آپ کے بعد حضرت مولانا شاہ اسمٰعیل صاحب قدس سرہ تھے۔ حضرت شاہ صاحب نے مسلمانوں کی صلاح و فلاح کے لئے تصنیف و تالیف اور ارشاد و ہدایت کے ذریعہ جن افکار و آراء کی اشاعت کی تھی حضرت شہید رحمۃ اللہ علیہ نے آپ کے بعد ان کو عملاً کر دکھایا۔

علمائے اسلام کی عام اصطلاح کے مطابق مصلحین امت دو طرح کے ہوتے ہیں ایک ارباب عزیمت اور دوسرے ارباب رخصت یا خاص حضرت شاہ ولی اللہ کی اصطلاح کے مطابق یوں کہئے کہ بعض مصلحین حنفار ہوتے ہیں اور بعض مرفقین۔ حنفار سے مراد یہ ہے کہ اس قسم کے حضرات اعلاء کلمۃ اللہ کے لئے ہر آن سر بکف اور جاں بدست ہوتے ہیں۔ سچائی کے اظہار میں اور صداقت کے برملا اعتراف میں ان کو کسی ظالم و جابر حکومت کا خوف اور دار و رسن کا ڈر، لوگوں کے طعن و تشنیع کا اندیشہ ایک لمحہ کے لئے بھی متردد اور مذبذب نہیں

کرتا۔ یہ شمشیر برہنہ ہوتے ہیں جو صدق وحق کی پاسبانی اور حفاظت اور باطل کا سر کچلنے کے لئے ہر آن آمادۂ عمل رہتے ہیں ان کا ظاہر باطن سے زیادہ صادق اور اجلا اور ان کا باطن آئینہ جلی سے زیادہ شفاف ہوتا ہے۔ یہ لوگ اذعان و یقین کے پیکر اتم ہوتے ہیں شک و تردد کا ان کے پاس گذر تک نہیں ہوتا۔ بعنوان دیگر یوں سمجھیئے کہ ان کی راہ کانٹوں کی راہ ہوتی ہے۔ ان کو جن وادیوں میں چلنے کی تمنا ہوتی ہے وہ شہدا ءِ حق کے خون سے سراسر رنگین اور معرکۂ حق و باطل کے کارزار پیہم سے سر بسر گرم ہوتی ہیں۔ یہاں ان کو سربکف اور کفن بردوش آنا پڑتا ہے ــــ نہیں میں نے غلطی کی شہدا ءِ حق کو کفن کی ضرورت ہی کیا ہے ان کے لئے ان کا زخموں سے چور چور جسم اور خون کے سرخ دھبوں سے بھرا ہوا جامہ سب سے بہترین کفن ہوتا ہے۔ الغرض یہ ارباب صدق و شہود عزیمت و مجاہدہ کے مرتبۂ علیا میں ہوتے ہیں ان کی زندگی کا ایک ایک لمحہ شوق شہادت و جانفروشی سے پر ہوتا ہے ان کے برخلاف دوسرے قسم کے وہ حضرات ہیں جن کو رفیقین کہا جاتا ہے یہ حضرات علم و عمل کے صحیح نمونہ ہوتے ہیں لیکن اول گروہ کی بہ نسبت ان میں "مصلحت اندیشی" اور رفق و لین زیادہ ہوتی ہے۔ یہ حضرات مدرسوں میں بیٹھ بیٹھ کر خانقاہوں میں مریدوں کے حلقے قائم کر کر کے اور مسند وعظ پر جلوہ افروز ہو کر عقائد صحیحہ کا اظہار کرتے ہیں اور ساتھ ہی لوگوں کو اعلاء کلمۃ اللہ کے لئے جان دے دینے پر آمادہ و مستعد بھی کرتے ہیں لیکن ان کی طبائع کی افتاد کچھ ایسی ہوتی ہے کہ تشنگان جام شہادت کی طرح خود آگے بڑھ کر "شمشیر قاتل" کو بوسہ نہیں دیتے۔ کوئی شبہ نہیں کہ ان کے اعمال درست اور صحیح، ان کے مواعظ شنیدنی اور لائق پذیرائی اور ان کے ملفوظات عامیہ لائق عمل ہوتے ہیں۔ ان کے دم سے محراب و منبر کی زینت ہوتی ہے ان کا وجود مدرسہ و مسجد کے لئے سرمایۂ نازش و افتخار ہوتا ہے لیکن یہ حضرات ارباب دار و رسن اور اصحاب قید و محن نہیں ہوتے۔ ــ

ان کا قلم مسلمانوں کی ذہنی و عملی اصلاح کے لئے ہمہ اوقات مصروف عمل رہتا ہے لیکن ان کے ہاتھ تلوار کی گرفت سے ناآشنا ہوتے ہیں۔ مسلمانوں کی اصلاح کے لئے کوئی شبہ نہیں کہ دونوں طبقات از بس مفید اور ضروری ہیں لیکن کیا کوئی کہہ سکتا ہے کہ عملی سرگرمی و وارفتگی کے اعتبار سے دونوں ایک ہیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر تمام صحابہ ہی جان فدا کرتے تھے لیکن "صدیق" کا معزز خطاب تو صرف اس کو ہی ملے گا

جس نے اپنا تمام اثاثہ بیت جناب رسالت پناہ کے قدموں پر لاکے رکھ دیا اور جب ان سے پوچھا گیا کہ تم نے یہ کیا کیا؟ تو فرمایا مجھ کو اللہ اور اس کا رسول ہی کافی ہیں۔

ان دونوں محترم شخصیات عظیمین کے خصائص و صفات کو پیش نظر رکھ کر جب ہم حضرت مولانا اسمٰعیل صاحب شہیدؒ کے حالات زندگی اور ان کے مجاہدانہ و خسروشانہ کارناموں پر غور کرتے ہیں تو صاف معلوم ہوتا ہے کہ حضرت شہیدؒ متقین میں سے نہیں بلکہ حنفاء میں سے تھے ارباب ہمت میں سے نہیں بلکہ ارباب عزیمت میں سے اور ان میں بھی مقام رفیع و ممتاز پر فائز تھے اور جب ہم ان حالات کا جائزہ لیتے ہیں جو اس وقت مسلمانوں کی سلطنت کے زوال، ہندوؤں کے ساتھ ایک عرصہ سے ہمسایانہ تعلقات رکھنے اور ان کے ساتھ رہنے سہنے اور مسلمانوں میں صحیح علم دین و مذہب کے فقدان کے باعث پیدا ہو گئے تھے تو ہم کو تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ حضرت اقدس کی ذات خدا کی طرف سے بھیجی ہوئی ایک شمع ہدایت تھی جو وعظ و ارشاد کی مجلسوں میں مثل شب چراغ کی طرح جگمگاتی تھی اور پھر اگر حق و باطل میں معرکۂ کارزار گرم ہو جاتا تو یہ وہاں شمشیر بے نیام ہو کر چمکتی تھی رعد کی طرح گرجتی برق کی طرح کڑکتی تھی اور اس کی چمک و گرج سے باطل کی آنکھیں خیرہ اور اس کے کان بہرے ہو جاتے تھے، پھر وہ کبھی سیلاب کی طرح امنڈتی تھی۔ طوفان کی طرح آگے بڑھتی تھی باد تند کے تیز جھونکوں کی مانند چلتی تھی اور اپنی رو میں کذب و دروغ کے خس و خاشاک کو بہائے جانا چاہتی تھی۔ حضرت موصوف نے جس بدنصیب عہد میں پرورش پائی وہ ہر اعتبار سے مسلمانوں کے لئے بدنصیبی اور تیرہ بختی کا دور تھا ....

.... سیاسی اعتبار سے مسلمانوں کی قدیم پر عظمت و شوکت حکومت کا خاتمہ ہو رہا تھا اور ان کا [illegible] دوسروں کے زیر نگیں آجانے والا تھا۔ مذہبی و دینی اعتبار سے حال یہ تھا کہ بدعت و شرک کا دور دورہ تھا۔ رسوم قبیحہ کا عام چرچا تھا بڑے پیر کی گیارھویں اور چھوٹے پیر کی فاتحہ کو جزو ایمان سمجھا جاتا تھا سیوم و دہم بستم و چہلم کا گھر گھر دستور تھا تعزیہ داری بڑے زور و شور سے ہوتی تھی۔ محرم کو عید سے بڑھ کر منایا جاتا تھا مسلمان امام حسین کے فقیر بن کر سبز کپڑے پہنتے تھے اور خدا جانے کیا کیا سوانگ بھرتے اور رچاتے تھے۔ ایک طرف تو ان کی بدعت پرستی کا عام حال یہ تھا اور دوسری جانب ہندوؤں کے ساتھ عام اختلاط کے باعث ان میں بہت سے ہندوانہ عقائد و اعمال پیدا ہو گئے تھے عقد بیوگان ان کے نزدیک بے انتہا قابل شرم بات تھی۔ لڑکیوں کو عموماً ترکہ و میراث سے محروم رکھا جاتا تھا اور شادی بیاہ کے موقعوں پر خصوصاً کثرت

سے چند دانہ رسومات قبیحہ بجالائی جاتی تھیں جن کا اب اگر ذکر بھی کیا جائے تو شرم وحیا کو فرط ندامت سے گردن جھکا لینی پڑتی ہے۔ حضرت مولانا اسمٰعیل صاحب نے احساس وشعور کی آنکھ کھولی تو انھوں نے دیکھا کہ وہ قوم جو دنیا میں امر بالمعروف ونہی عن المنکر کے لئے آئی تھی اور جس کو عالم کی گمراہ قوموں کے لئے سرتا سر خورشید صداقت اور سراپا پیام ہدایت بنا کر بھیجا گیا تھا نوع بہ نوع کی گمراہیوں میں مبتلا ہے اور جس قوم کو وَاَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ کا منصب گرامی سپرد کیا گیا تھا۔ اس پر نلاکت وادبار کی موت طاری ہے اس منظر ہیبت ناک کو دیکھ کر ان کا دل بھر آیا اور انھوں نے اپنی زندگی کا ایک ایک لمحہ خدمت اسلام کے لئے وقف کر دیا۔ شاہ شہید حضرت مولانا مولوی عبد الغنی صاحب کے صاحبزادے اور حضرت مولانا شاہ ولی اللہ صاحب کے پوتے تھے اور دہلی کے ایک ایسے معزز خانوادہ سے تعلق رکھتے تھے جس کا احترام بادشاہ وقت بھی کرتا تھا اس بنا پر ظاہر ہے کہ آپ کا عہد طفولیت ناز ونعمت میں بسر ہوا ہوگا لیکن حضرت شہید نے خدمت اسلام کا عہد وپیمان کر کے ہر تکلیف واذیت کو لبیک بہ طیب خاطر کہا اور راحت وآسائش کو بالائے طاق رکھ دیا ——

افسوس ہے کہ میں اس مختصر مضمون میں حضرت شہید کی ان دینی خدمات اور آپ کے مجاہدانہ کارناموں کا اجمالاً بھی ذکر نہیں کر سکتا۔ بس اتنا ہی عرض کرتا ہوں کہ آپ بیک وقت ایک جلیل القدر عالم بھی تھے اور دین الٰہی کے زبردست مبلغ بھی، نہایت کامیاب واعظ بھی تھے اور اعلیٰ درجہ کے مفتی بھی، مناظر بھی تھے اور مجاہد بھی، متکلم بھی تھے اور مصنف بھی، ماہر اسرار شریعت بھی تھے اور واقف رموز حقیقت بھی، اسی کے ساتھ ایک کامیاب جنرل بھی تھے اور ایک بہادر سپاہی بھی پھر اسی میدان میں دوسرے وقت گھوڑے کے سائیس بھی تھے اور عام مجاہدین کے خادم بھی۔ آپ کے سوانح نگار کا بیان ہے کہ حضرت شاہ شہیدؒ اپنے اور اپنے ساتھیوں کے لئے خود ہی آٹا پیستے تھے گھوڑوں کے لئے خود ہی دانہ دلتے اور ہاتھ سے گھاس کھود کر لاتے تھے۔

بیشک بیشک آپ خدا شناس تھے، خدا رسیدہ تھے ان اکابر اسلام اور ان رجال اللہ میں سے تھے جن پر اسلام کو فخر ہے اور جو مسلمانوں کے لئے مایۂ ناز صد نازش ہیں مگر آہ کتنی حسرت کا مقام ہے اور افسوس کی جگہ ہے کہ آج مسلمانان ہندوستان ہی میں ایک مخصوص جماعت ایسی بھی ہے جو اس مرد راہ خدا اور مجاہد فی سبیل اللہ سے بغض رکھتی ہے اور آپ کے علمی وعملی کمالات پر غلط بیانیوں کا پردہ ڈالنا چاہتی ہے۔

فی الحقیقت یہ چیز بھی آپ کو حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ سے وراثت میں ملی ہے جس طرح مسلمان کہلانے والوں میں ایک بدنصیب جماعت آپ کے جد اعلیٰ سیدنا عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ کو گالیاں دینا ثواب سمجھتی ہے۔ اسی طرح ایک دوسری محروم البصیرت ٹولی آپ کے نسبی و روحانی فرزند حضرت مولانا شاہ اسمٰعیل (فاروقیؒ) کو گالیاں دینے میں اپنی نجات کا اعتقاد رکھتی ہے آپ کو معلوم ہے یہ کون جماعت ہے؟ یہ وہی جماعت ہے جس کے بڑے سے بڑے رکن مرتے مرتے اپنے دائم آقاؤ مریدوں کو اپنی فاتحہ کے متعلق اس قسم کی وصیت کر کے جاتے ہیں کہ ہفتہ میں دو تین بار ان اشیاء میں سے کچھ بھیج دیا کرو۔

دودھ کا برف خانہ ساز اگرچہ بھینس کے دودھ کا ہو مرغ کی بریانی، مرغ پلاؤ، بکری کے شامی کباب پراٹھے اور بالائی فیرنی اودری کی پھریری دال مع ادرک و لوازم گوشت بھری کچوریاں سیب کا پانی سوڈے کی بوتل، دودھ کا برف۔ [1]

ایسے عیش پرست اور شکم پرور لوگ اگر حضرت شہیدؒ کے مجاہدانہ کارناموں کو قدر کی نگاہ سے نہ دیکھیں تو معذور ہیں کہ ان کا مسلک اور طریق کار اور ہے اور حضرت شہیدؒ اور آپ کے متوسلین کا اور۔

عیش پرودہ تنعم نبرد راہ بہ عشق
عاشقی پیشۂ رندان بلاکش باشد

مگر یاد رہے کہ اسلام فاتحہ کی مرغ بریانی اور فیرنی و بالائی وغیرہ کا نام نہیں ہے اور نہ حلوہ اور سوکھے حلوے مانڈے اور گوشت بھری کچوریاں ہی کا اسلام سے کوئی تعلق ہے بلکہ اسلام الٰہی سچے جذبات کا نام ہے جو حضرت شہیدؒ کی روح میں کار فرما تھے پس اگر کوئی چاہتا ہے کہ سچا اسلام اختیار کرے اور اس صراط مستقیم پر چلے جو ابوبکرؓ و عثمانؓ و عمرؓ و علیؓ ابوحنیفہ و مالک و احمد و شافعی کی پسندیدہ و اختیار کردہ تھی۔ اور اسے پڑھ سکے یہ کہ جو کتاب و سنت کی قائم کردہ ہے تو اس کو چاہیئے کہ وہ حضرت شاہ اسمٰعیل شہیدؒ کے نقش قدم پر چلے کہ وہ بھی اسی راہ پر گامزن تھے۔ لیکن جو شخص اس سنگلاخ راہ پر چلنے کی ہمت نہیں رکھتا اور اس سے کترا کر چلنا چاہتا ہے تو اس کے لیے شیطانی راہیں کھلی ہوئی ہیں۔

واللہ یہدی من یشاء الیٰ صراط مستقیم۔

---

[1] یہ مولوی احمد رضا خاں صاحب کی وصیت ہے جو ان کے مطبوعہ وصیت نامہ میں انہی الفاظ میں درج ہے۔

شہید کے مرقد پر

☆

کسی شہید کے مرقد پہ ایک حاجت مند
چمن کے کچھ گل تازہ چڑھانے آیا تھا
چھڑک کے عرقِ گلاب اور لگا کے عطرِ حنا
وہ تشنگیِ عقیدت بجھانے آیا تھا
دلِ ستم زدہ و اشکبار آنکھوں سے
فسانۂ غمِ ہستی سنانے آیا تھا

چلا پلٹ کے تو روحِ شہید کہنے لگی
کہ بے خبر مجھے تو کیوں ستانے آیا تھا
یہ عطر و پھول چڑھانے تھے مہ جبینوں کو
میں نازنیں ہوں جو مجھ کو سنگھانے آیا تھا

جلانا ہی تھا تو شمشیرِ تیز دم لاتا
تو میری روح کو بزدل بنانے آیا تھا

●

باب ——— (۵)

عبرت کی باتیں

محمد منظور نعمانی

میلاد کی ترقی کا ایک اور زینہ
بریلی میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت

علامہ ابوعبداللہ ابن الحاج رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے زمانے کی ایک رائج شدہ بدعت کے متعلق اپنی مشہور کتاب "مدخل" میں لکھا ہے۔

لا اصل له في الشرع ولاجل ذلك اختلف فيه عوائد اهل الاقاليم فلو كان من الشرع ما اختلف فيه عوائدهم	شریعت میں اس کی کوئی اصل نہیں اور اسی وجہ سے مختلف ملکوں کی عادتیں اس کے متعلق جداگانہ ہیں۔ اگر وہ کوئی شرعی امر ہوتا تو اس میں یہ اختلاف نہ ہوتا۔

علامہ ممدوح کی یہ بات آب زر سے لکھنے کے لائق ہے۔ درحقیقت جو چیز مشروع نہ ہو بلکہ ایجاد بندہ ہو اس میں کبھی یکرنگی نہیں ہوسکتی۔ مروجہ رسمی میلاد کے طریقوں کا اختلاف بھی اسی بنیاد پر مبنی ہے کہ اس کی بہت سی صورتیں تو ناظرین کرام کو محترمی جناب مولانا حکیم عبدالشکور صاحب مرزاپوری کے مضمون "تاریخ میلاد" سے معلوم ہوچکی ہیں۔ آج ہم خاص بریلی کے ایک نئے قسم کے ترقی یافتہ میلاد کی آپ کو غائبانہ سیر کراتے ہیں جس میں سرکار دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم کی ضیافت بھی کی جاتی ہے۔

اس میلاد کا پوسٹر اس وقت ہمارے سامنے ہے اور سنتے ہیں کہ یہ میلاد شریف ہر سال اسی طور پر ہوتا ہے۔ اس پوسٹر میں پہلے تو اس میلاد نبوی یا دعوت مصطفوی صلی اللہ علیہ وسلم کے کچھ آداب لکھے ہیں جن میں سے چند یہ ہیں۔

(۱) ذاکرین (یعنی میلاد خواں حضرات) جو سچے پکے پابند عقیدۂ اہلسنت ہوں مشک وگلاب

سے کلیاں کر کے باوضو باادب ممبر اقدس پر بیٹھیں جس کے سامنے مسند مقدس یعنی نشست گاہ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم سجا بنا کر لگائی جائے اور روبرو سامان دعوت اقدس شریف چنا جائے۔

(۲) سڑکیں صاف و شفاف چھڑکاؤ شدہ، نالیاں ستھری دھلی ہوئی ہونی چاہئیں۔

(۳) اہلسنت کا عقیدہ ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ وسلم جو ہر وقت، و ہر جگہ حاضر و ناظر ہیں ادب تعظیم کی منعقد شدہ میلاد اقدس شریف میں ضرور بالضرور تشریف لاتے ہیں۔ ایسی صورت میں ذکر ولادت اقدس شریف بصیغۂ غائب پڑھنا .... ان کی موجودگی میں سخت بے ادبی ہے .... الخ

ان کے علاوہ اور بھی بہت سے انہی جیسے آداب لکھے ہیں۔ بعد ازاں محفل ولادت یا مجلس دعوت کے انعقاد کا اعلان اس طرح کیا گیا ہے:

" دعوت مصطفوی شریف صلی اللہ علیہ وسلم "

خانقاہ مصطفائی شریف واقع "قاضی ٹولہ" بریلی شریف میں بحضور شہنشاہ انبیا علیہ وعلیہم الصلوٰۃ والثناء کی دعوت مقدس ہو حسب شرائط طبع شدہ آداب میلاد اقدس شریف پڑھا جائے گا۔ سرکار اعظم مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم مع صحابۂ کرام حسنین عظام غوث پاک و فضل رحمٰن و احمد رضا رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین تشریف اقدس شریف لائیں گے اور اپنے دیدار اقدس شریف سے اہل باطن کو مستفیض فرمائیں گے۔ قیام اقدس اور سلام مقدس شریف سے ان کا استقبال شریف کیا جائے گا پھر ختم آیت شریف کے بعد سامان دعوت مبارک حضوری میں پیش کیا جائے گا۔ لہٰذا برادران اہلسنت سے التماس ہے کہ حسب قاعدہ ادب و تعظیم حاضری دیکر حسب مراتب فیوض و برکات سے مستفیض ہوں... الخ

ایماندار مسلمان! ڈرامے کے ان شوقینوں اور عشق رسالت کے ان مسخرے مدعیوں کی اس حرکت کو دیکھیں اور امت کی گمراہی اور ملت کی لاچاری کا ماتم کریں کاش یہ گمراہ اپنا یہ شوق کسی اور کے ساتھ پورا کرتے۔

معاذ اللہ! خدا کی پناہ! آقائے دوجہاں صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات اقدس اور یہ تمسخر یہ کھیل!

بازی بازی بار یش بابا ہم بازی

ان عرسوں میں کیا ہوتا ہے ؟

آسماں را حق بود گر خوں ببارد بر زمیں

یہاں ضلع بریلی میں ایک گاؤں سینتھل ہے جہاں بڑے دھوم دھام سے ہر سال کسی بزرگ ۔۔۔ چراغ علی شاہ کا عرس ہوتا ہے جو آٹھ دس روز تک رہتا ہے۔ اس نواح میں اس عرس اور میلہ ہی کی وجہ سے اس گاؤں سینتھل کی خاص شہرت ہے۔ اس سال بھی شوال کے عشرۂ اخیرہ میں یہ عرس شریف ہوا ہے۔ اس کے لیے جو اشتہار سجادہ نشین صاحب کی طرف سے شائع ہوا تھا وہ اس قابل ہے کہ ہر صاحب ایمان کی عبرت کی نگاہ سے دیکھے ۔۔۔ اس اشتہار میں پہلے تو چار شعر ان صاحب عرس چراغ علی شاہ صاحب کی شان میں لکھے گئے ہیں اس کے بعد یہ مضمون ہے۔

"والا ہمت سرتاج صوفیہ باذدار ہو صورت سیرت مقبول بارگاہ ایزدی فرزند نبی دلبند علی حضرت چراغ علی شاہ کا عرس شریف بتاریخ ۲۰ تا ۲۷ شوال ۱۳۶۱ھ مطابق ۳۰ اکتوبر تا ۷ نومبر ۱۹۴۲ء منعقد ہوگا ۔ کدھر ہیں بادہ وحدت کے سرمست آئیں راہ حقیقت میں قدم بڑھائیں اور مشائخ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے فیوضات سے مالا مال ہوں ۔۔۔ اس سال خاص طور سے بیرونجات مثل لکھنؤ، دہلی، لکھیم پور، رامپور، ہردوئی، بدایوں، علی گڑھ وغیرہ وغیرہ قرب و جوار ضلع بریلی کی طوائفیں چودھرائن نے بلوائی ہیں ۔۔۔ ناچ ۲۴ تا ۲۶ شوال ہوگا چادریں ۲۷ شوال بوقت ۴½ بجے چڑھیں گی اور ۲۸ شوال کی صبح کو میلہ ختم ہو جائے گا۔" (اشتہار عرس شریف سینتھل مطبوعہ ڈیلی گزٹ اخبار پریس بریلی)

دیکھی آپ نے ان مجاوران دیکان حیا کی ڈھٹائی اور بے غیرتی! اور معلوم ہو گیا آپکو ان ہی عرسیوں کی زبان سے کہ کیا ہوتا ہے ان عرسوں میں اولیاء کرام کے نام پر بلکہ خود اللہ و رسول اور اسلام کے نام پر۔

اور آہ اکون تبلائے اور سمجھائے ان غریب مسلموں کو جو دین و مذہب کے نام پر ہونیوالی ان شیطانی خرافات کو اسلامی چیز سمجھتے ہیں ۔۔۔ اگر آج اقتدار اسلام کا ہوتا اور حکومت اللہ و رسول کے قانون کی ہوتی تو اسلام کے پاک دامن پر داغ لگانیوالے ان ہوس پرستوں اور طوائف بازوں کو عبرتناک سزائیں دی جاتیں اور پھر اس کی قلمرو میں کہیں یہ مذہبی بدمعاشی نہ ہو سکتی لیکن جبکہ تخت اقتدار پر قبضہ شیطان کا ہو تو مکمل آزادی ہے اس کے چیلوں کو جو چاہیں کریں اور جس طرح چاہیں اپنے کھیل کھیلیں ۔۔۔ ہمارے لیے اس وقت بجز اس کے کیا ہے کہ اس صورت حال سے عبرت حاصل کریں اور اپنے دینی فرائض کو سمجھیں ۔۔۔۔ (شائع شدہ رمضان ۱۳۶۱ھ)

بغیر مرد عورت کے سفر کا نتیجہ اور غیر مسلم جج کا فیصلہ

۱۵ر مئی ۱۹۷۶ء کے صدق میں انگریزی اخبار لیڈر کے حوالے سے ایک مقدمہ کی روداد ان الفاظ میں نقل کی گئی ہے ۔

"میں مس ...... عمر ۲۳ سال ، نا کتخدا ، لکھنؤ لیڈی کنیرڈ اسپتال میں نرس ہوں ۔ بنارس سے لکھنؤ انٹر کلاس میں سفر کر رہی تھی ۹ بجے شب کو مغل پور سے اپ ایکسپریس میں سوار ہوئی سونپور پہنچتے پہنچتے نیند آنے لگی انٹر کلاس کے زنانہ ڈبے میں اکیلی تھی سونپور سے بارہ بجے شب کے قریب گاڑی چلی ہی تھی کہ میری آنکھ کھل گئی اور میں نے دیکھا کہ ایک مرد میرے ڈبے میں گھس آیا ہے اور میری برتھ کی بنچ پر بیٹھا ہوا مجھے گھور رہا ہے میں نے اس کی قصد و نیت کا اندازہ کر کے خطرہ کی زنجیر کو کھینچنا چاہا لیکن قبل اس کے کہیں وہاں تک پہنچوں ملزم نے جست کر کے مجھے دبوچ لیا ۔ میں بے بس ہو گئی ۔ اور میرا چیخنا چلانا ، ہاتھ پیر چلانا ، اور لاتیں مارنا سب بیکار رہا ۔ ملزم میری عصمت برباد کرنے کے بعد میرے مال کی طرف بڑھا اور میں پھر خطرے کی زنجیر کی طرف بڑھی ملزم نے مجھے پاخانے میں ڈھکیل دیا اور باہر سے دروازہ بند کر لیا ۔ اور گاڑی رکتے ہی میرا مال و اسباب لے کر چمپت ہو گیا ۔"

" یہ بیان استغاثہ ایک تعلیم یافتہ " بی خاتون نے ایک ملزم کے خلاف عدالت میں دیا سشن جج ایک ہندو آئی سی ایس نے ، جیوری کی رائے سے اتفاق کر کے جرم بالکل ثابت پایا ، مجرم کو دس سال قید سخت کی سزا مع ایک بھاری جرمانے کے دی ۔ اور فیصلہ میں لکھا کہ

ملزم ایک خطرناک شخص ہے جو ہر اس عورت کے لیے خطرہ کا باعث بن سکتا ہے جو بغیر مرد کو ساتھ لیے سفر کر رہی ہے ۔ (لیڈر ۲۷ر اپریل ۱۹۳۶ء)

غور کر کے پڑھیے ! عورت بھولی بھالی پردہ نشین نہیں باہر نکلنے والی دنیا کا ہر طرح کا تجربہ رکھنے والی ہے ۔ ان پڑھ نہیں ۔ تعلیم سے سنا ہے ۔ ایسی کمسن نہیں ۔ اچھی خاصی سن دار ہے ۔ اس پر بھی وقت پڑ جانے پر نہ اپنی عصمت بچا سکی ہے نہ مال و زیور اور عدالت جو فیصلہ کرتی ہے اس میں صاف حوالہ کی ذمہ داری عورت کے تنہا سفر کرنے پر عائد کرتی ہے کیا فرق ہے غیر مسلم جج کے اس فیصلہ میں اور شریعت اسلامی

(ماخوذ از ...)

وہ ——— اور ہم ——— ببیں تفاوت رہ از کجاست تا بہ کجا

نازک خیال شاعروں اور ادب لطیف سے دلچسپی لینے والے جس طرح مسلمانوں میں ہیں اسی طرح ہندوں میں بھی ہیں۔ لیکن دونوں میں ایک عبرت آموز فرق ہے اور وہ یہ کہ ہندو شاعری کے ساتھ ہندو بھی رہا جا سکتا ہے۔ اور مسلمان، شاعری اور ادب لطیف کی لطافت کو نامکمل سمجھتا ہے۔ جب تک کہ اپنے مذہب کے خلاف جنگ کر کے اپنی بدمستی کا مظاہرہ نہ کرے۔ یہی وجہ ہے کہ ہندو شاعر اور اہل قلم اپنے کلام میں کبھی دھوتی اور چوٹی یا بندت کے تشقہ کا مذاق نہیں اڑاتا۔ وہ اپنے ادب لطیف کا کمال دکھلاتے وقت کبھی سورگ، نشنا اپسرا ذور، دغیرہ کو اپنے تمسخر کا تختہ مشق نہیں بناتا۔ مگر ہمارے شاعر اور ہمارے ادب لطیف کے پرستار جب تک "مولوی" کی لمبی ڈاڑھی اور تراشیدہ لبوں سے نہ کھیل لیں اور پیٹ بھر کر ان کا مذاق نہ اڑا لیں۔ اور ننگے ہو کر جنت وحور و قصور پر پھبتیاں نہ کس لیں اور دوسروں سے بھی ان پر پھبتے نہ لگو لیں۔ ان کی شاعری میں جان ہی نہیں آتی، اور ان کے ادب لطیف میں لطافت ہی نہیں پیدا ہوتی ——— جو لوگ اپنے ان نازک خیالوں کی نظم و نثر کی رودادیں، دیکھتے رہتے ہیں۔ ان کے سامنے تو اس بدتمیزی کے مظاہرے روز مرہ آتے رہتے ہیں۔ لیکن جن کو اس کا موقع نہیں ملتا وہ ہلکا سا نمونہ ذیل میں ملاحظہ فرما لیں ——— کوئی صاحب ہیں مہدی علی خان وہ ایک مشہور "اسلامی" ادبی رسالہ ہمایوں میں "میں نے دیکھا" کے عنوان سے اپنی ادبیت و لطافت کا مظاہرہ اس طرح فرماتے ہیں۔..

"میں نے دیکھا تصور میں ——— لمبی لمبی ڈاڑھیوں والے مولویوں ——— جنت کے مرغزاروں میں ——— خوفزدہ حوروں کے پیچھے ——— خوشی سے چھلانگیں لگاتے کود سکتے، شور مچاتے"

(ہمایوں ۵۴/۲ء): ماخوذ از زمزم لاہور با ختصار)

"اس کے مقابلہ میں ذرا "دوسروں" کا حال دیکھئے ——— پنجاب کے مسلم وغیر مسلم اخبارات میں یہ خبر شائع ہوئی ہے کہ انبالہ کے سکھوں نے ایک جلسہ کر کے گورنمنٹ سے مطالبہ کیا ہے کہ :-

(باقی صفحہ ۱۸۸ پر)

محمد منظور نعمانی

بریلوی ذہنیت کا تازہ شاہکار

حال ہی میں نہایت عجیب و غریب اور تقریباً پانچسو صفحہ کی ایک ضخیم کتاب "بریلی شریف" ہی کے ایک پریس سے چھپ کر نکلی ہے جس کا نام ہے "تجانب اھل السنۃ عن اھل الفتنۃ" اس پر بحیثیت مصنف نام تو پڑا ہوا ہے کسی نامعروف شخص محمد طیب صدیقی دانا پوری کا لیکن خارجی ذرائع سے معلوم ہوا ہے کہ فی الحقیقت یہ تصنیف لطیف ہے "بریلوی مسلک" کے مشہور نقیب مولوی حشمت علی صاحب کی، جو اپنی تکفیری اور تفریقی سرگرمیوں میں اپنے ہم مسلک مولوی صاحبان میں بھی خاص امتیاز رکھتے ہیں (اور غالباً ان کی اسی خصوصیت کی وجہ سے اس کتاب میں ان کو مظہر اعلیٰحضرت بھی لکھا گیا ہے) اور اگر کسی کے طرز تحریر لب و لہجہ اور خصوصیات کلام کی معرفت کی بنیاد پر اس بارہ میں قیاس سے کام لیا جا سکے تو پھر کوئی شبہ نہیں کہ اس کی سطر سطر شاہد ہے اس امر کی کہ یہ پشتارہ انہی نرالے بزرگوار کا تیار کیا ہوا ہے۔

بہرحال اس کا مصنف خواہ کوئی ہو یہ کتاب ہے بڑی عجیب و غریب بلکہ ایک مستقل عجائب خانہ اور دیدۂ عبرت رکھنے والوں کے لئے مرقع عبرت اور یقیناً اس کی مستحق ہے کہ اس کو "بریلوی مشن کی انسائیکلوپیڈیا" اور بریلوی ذہنیت کا شاہکار کہا جا سکے۔

عجائبات کے اس پشتارہ اور لغویات کے اس پٹارہ کو پوری طرح دیکھنے کے لئے تو ہم اپنے اوقات میں گنجائش نکال نہ سکے اس لئے صرف ایک دو نشستوں میں جستہ جستہ اور وہ بھی محض سرسری نظر ہم نے اس پر ڈالی ہے، اسی سرسری ورق گردانی میں صفحہ ۹۰ و ۹۱ پر ایک تحقیق انیق "یا انکشاف جدید" ایسا نظر پڑا جس کو ناظرین تک نہ پہنچانا شاید بار ظلم ہو۔

دیکھئے تو اسلامی ہند کی تمام مذہبی، سیاسی اور ملی جماعتوں انجمنوں اور کمیٹیوں کی غایت و غرض کیسی عجیب اور عمیق اس کتاب میں بیان کی گئی ہے۔ کیا بریلوی محققوں کے سوا کسی اور کے دماغ کی رسائی

تنی گہری باتوں تک ہو سکتی ہے ــــ؟
لیجئے آپ بھی سنئے اور سر دھنئے!
سرسید احمد خاں کا کچھ ذکر کر کے صفحہ ۹۰ پر قمطراز ہیں :-

"اسی نیچر کے اذناب و متبعین و مقلدین و معتقدین و مرتدین نیاچرہ ہیں جو مسلمانوں کے دین و ایمان اور ان کے دینوی سر و سامان پر ڈاکے ڈالنے کے لئے ہمیشہ نئی نئی کمیٹیاں نئی نئی پارٹیاں گڑھتے رہتے ہیں اور کبھی بندگان زر اور بدنام کنندۂ نکونامے چند نام کے مولویوں کو اپنے کفری مقاصد کی ترویج و اشاعت کے لئے اپنا آلۂ کار بنا لیتے ہیں، مسلم ایجوکیشنل کانفرنس و ندوۃ العلماء و خدام کعبہ و خلافت کمیٹی و جمعیۃ العلماء ہند و خدام الحرمین و اتحاد ملت و مجلس احرار و مسلم لیگ و اتحاد کانفرنس و مسلم آزاد کانفرنس و نوجوان کانفرنس و نمازی فوج و جمعیت تبلیغ الاسلام انبالہ و سیرت کمیٹی پٹی ضلع لاہور و امارت شرعیہ بہار شریف و آل پارٹیز کانفرنس وغیرہ کمیٹیاں اسی مقصد کے لئے انھیں کفرۂ نیاچرہ نے اپنی نیچریت و دہریت پھیلانے اور بھولے بھالے مسلمانوں کو دین سے آزاد اور دینوی سر و سامان سے بھی تہی دست بنانے کے لئے وقتاً فوقتاً خود اپنے ہاتھوں سے یا دوسرے بد دینوں بد مذہبوں کو اپنا شریک کار بنا کر یا بعض جاہلوں سادہ لوح بیوقوفوں یا چند دین فروش دنیا خر ملاؤں کو اپنے دام فریب میں پھانس کر انھیں اپنا آلۂ کار بنا کر گڑھی ہیں، پھر جب ان ملحدوں نے دیکھا کہ بہت سے غرباء اہل اسلام ان کمیٹیوں کی طرف متوجہ نہیں ہوتے وہ بیچارے دن بھر محنت و مزدوری کر کے رات کو اپنے گھر آ کر بیوی بچوں کا پیٹ پالنے کے بعد نماز روزہ و میلاد شریف و گیارھویں شریف و سوم و چہلم و عرس وغیرہ اعمال اسلامیہ[1] میں نہایت خاموشی کے ساتھ مشغول ہیں اُن کو ان نیچری کانفرنسوں کی طرف مطلقاً کبھی توجہ نہیں ہوتی ان میں سے جو لوگ اپنے نفس کی شامت اور شیطان کی شرارت کے سبب کسی حکم شرعی کی کبھی خلاف ورزی بھی کرتے ہیں تو تمرد و سرکشی نہیں کرتے اپنے خلاف شرع اعمال کو گناہ سمجھتے اور اپنے آپ کو گنا ہگار تصور کرتے ہیں، اپنی خطاؤں پر ڈھٹائی نہیں کرتے

---

[1] یہاں محرم کی تعزیہ داری اور علم داری کا ذکر بھی کیوں نہ کیا؟ آخر گیارھویں شریف و سوم و چہلم و عرس تک جب اعمال اسلامیہ میں سے ہیں تو تعزیہ داری نے کیا خطا کی ہے؟ م

بلکہ شرمندہ و نادم ہوتے ہیں، لیکن اعتقاد کی رو سے تو یہ سب تمام لوگ عمداً اسی ساڑھے تیرہ سو برس سے زیادہ قدیم اور سچے مذہب اہل سنت کے معتقدین اسی کو حق مانتے اور اس کے سوا تمام مذہبوں کو باطل جانتے ہیں اور نیچری لامذہبوں کو اپنی ہنگامہ آرائیوں کے لئے ایسے ہی بھولے بھالے سنی مسلمانوں، دین پاک کے نام پر جی جان سے قربان ہونے والوں کی ضرورت تھی تو ان بے ایمانوں نے ان عوام مسلمین کے پھانسنے کے لئے اصلاح قوم کے نام سے قومی عصبیت کو آڑ بنا کر کپڑا بننے والوں کی مومن کانفرنس جمعیۃ المومنین، جمعیۃ الانصار روئی دھنکنے والوں کی جمعیۃ المنصور، کپڑا سینے والوں کی جمعیۃ الادریسیہ، قصابوں کی جمعیۃ القریش سبزی فروشوں کی جمعیۃ الراعین پٹھانوں کی افغان کانفرنس سیدوں کی سید کانفرنس مسلم کھتریوں کی مسلم کھتری کانفرنس عباسیوں کی جمعیت آل عباس کنبوہ ہندوں کی آل انڈیا کنبوہ کانفرنس، پنجابیوں کی آل انڈیا پنجابی کانفرنس وغیرہ کمیٹیاں خود گڑھیں یا اپنے خدام اتحادوں سے گڑھوائیں تاکہ غریب و بیچارے مسلمانوں کو قومی جکڑ بندیوں میں جکڑ کر قومی ترقی، قومی اصلاح و فلاح کا سبز باغ دکھا کر ان کو گمراہ کیا جا سکے۔ صفحہ ۹۰ و ۹۱۔

آپ سمجھے! ان ساری مذہبی، سیاسی اور قومی جماعتوں اور انجمنوں کا شجرۂ نسب کس غصے میں سرسید احمد خاں سے ملا کر ان کو جہنم رسید کیا جا رہا ہے اور کس جرم کی پاداش میں ان سب کو اس طرح کوسا کاٹا جا رہا ہے؟ غالباً صرف اس لئے کہ ان تحریکوں اور انجمنوں سے کچھ اور ہوا ہو یا نہ ہوا ہو یہ نتیجہ تو ان کا ضرور ہوا کہ مولوی حشمت علی صاحب جیسے بزرگواروں کا کاروبار مدھم پڑ گیا اور جو خدا نے اس گئے گزرے وقت میں بھی بیچارے کپڑا بننے یا سینے والوں یا روئی دھنکنے والوں جیسے غریب طبقے کے لوگوں سے مل جایا کرتے تھے یا میلاد شریف، گیارھویں شریف، بارھویں شریف وغیرہ "اعمال اسلامیہ" کے حیلے سے سال کے سال اور مہینے کے مہینے جو کچھ ہاتھ آ جایا کرتا تھا یا سوم چہلم اور عرسوں کے بہانے جو دو چار وقت اچھے گزر جایا کرتے تھے ان قومی انجمنوں "جمعیۃ المومنین، جمعیۃ الانصار" "جمعیۃ القریش اور جمعیۃ المنصور" وغیرہ کی کوششوں نے ان رہی سہی "فتوحات" کا دروازہ بھی بند کرا دیا۔

اب آپ ہی انصاف سے کہیے کہ اگر ان سب انجمنوں، جمعیتوں اور کمیٹیوں کو وہابی

نیچری اور کافر بنا کر گردن زدنی نہ قرار دیا جائے تو اور کیا کیا جائے۔؟

اس کتاب کی ایک عجیب و غریب خصوصیت یہ بھی ہے کہ اس میں "وہابیوں" "دیوبندیوں"، "ندویوں" وغیرہم کی طرح "مسلم لیگیوں" اور "احراریوں" کو بھی کافر مرتد بنایا گیا ہے ـــ نیز مولانا حالی اور ڈاکٹر اقبال مرحوم کا کفر و ارتداد بھی بڑے زور و شور کے ساتھ ثابت کیا گیا ہے۔

کاغذ کی اس ہوشربا گرانی کے زمانہ میں پانچسو صفحہ کی ضخیم کتاب کیسے مقدس اور کتنے اہم و ضروری مقصد کے لئے لکھی اور شائع کی گئی ہے؟

کیا کسی اور ملت میں بھی نظر آسکتی ہیں کسی کو یہ حماقتیں اور شرارتیں؟

ان فی ذالک لعبرۃ لاولی الابصار

(الفرقان محرم ۱۳۶۲ھ)

بقیہ مضمون صفحہ ۱۸۴

"ان تمام سکھوں کو سرکاری ملازمت سے علٰحدہ کر دیا جائے جو ملازم ہوتے وقت سکھ تھے مگر اب انھوں نے سکر بال کٹوانے شروع کر دیئے ہیں۔ یعنی جو سکھ اصولوں کے پابند نہیں رہے۔ (آریہ گزٹ ۱۸ جون ۱۹۳۹ء)

واضح رہے کہ سر پر بال رکھنا سکھوں کا قومی نشان ہے۔ ان کے مذہب کوئی تاکیدی حکم نہیں ہے۔ پھر کیا "خیراست" کے لیے "سکھوں کے اس فیصلے کوئی سبق نہیں۔؟

(الفرقان جمادی الاولی ۱۳۵۸ھ)

بقیہ مضمون ـــ صفحہ ۱۸۳

کے اس فرسودہ اور دقیانوسی حکم میں کہ بغیر مرد کے عورت کے لیے سفر کرنا حرام ہے۔
(الفرقان جمادی الاولی ۱۳۶۲ھ)

باب —— (۶)

دعوتِ تجدید واصلاح

دین کا ایک مظلوم شعبہ
تصوف و احسان

از محمد منظور نعمانی

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جس "دین حق" کے ساتھ مبعوث ہوئے تھے اور جس کی طرف آپ دنیا کو دعوت دیتے تھے اس کا اولین اور کامل ترین نمونہ خود آپ کی مقدس ذات تھی، اس لیے آپ کا طریقۂ زندگی ہی وہ "دین حق" اور وہ "صراط مستقیم" ہے جس پر چل کر بندہ اللہ تعالےٰ کی رضا اور رحمت کا مستحق بلکہ اس کا محبوب بھی بن جاتا ہے۔ اسی واسطے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک سے اعلان کرایا گیا ہے۔

قُلْ إِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّونَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُونِي يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوبَكُمْ ط

کہہ دو اگر تم لوگ اللہ کو چاہتے ہو تو میری پیروی کرو (یعنی میرے طریقۂ زندگی کو اختیار کرو)، اللہ تم کو چاہنے لگے گا۔ اور تمہارے گناہ معاف کر دے گا۔

اور سورۂ احزاب میں فرمایا گیا،

لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللّٰهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ لِمَنْ كَانَ يَرْجُو اللّٰهَ وَالْيَوْمَ الْآخِرَ وَذَكَرَ اللّٰهَ كَثِيرًا ہ

تمہارے واسطے اللہ کے رسول میں اقتدا کے لیے بہترین نمونہ ہے۔ اللہ کے لیے جو اللہ کی اور یوم آخر کی امید رکھتے ہوں اور اللہ کو زیادہ یاد کرتے ہوں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لائے ہوئے اس طریقۂ زندگی اور اسوۂ حسنہ کو اگر ابتدائی طور پر تقسیم کیا جائے تو اس کے مندرجہ ذیل تین شعبے کیے جا سکتے ہیں۔

(۱) شعبۂ ایمانیات

یعنی اللہ کی ذات و صفات، وحی و رسالت، ملائکہ، قیامت، حشر و نشر اور جنت و دوزخ جیسی غیر محسوس اور غیر مشہود حقیقتوں کے بارے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جو خبریں دی ہیں آپ کو خدا کا سچا رسول اور صادق نمائندہ مانتے ہوئے ان سب کی پوری تصدیق کرنا الغرض

اس شعبہ میں تمام ان غیبی حقیقتوں پر ایمان لانا داخل ہے جن پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خود یقین رکھتے تھے اور جن کی آپ نے خبر دی ـــــ یہ اسلام کا ایمانی اور اعتقادی شعبہ ہے اور ترتیب و اہمیت کے لحاظ سے اس کو اولیت حاصل ہے اور انسان کے افکار و خیالات کی تطہیر و تصحیح اس کا خاص موضوع ہے اور ہماری عقل و فکر پر دین کے اس شعبہ کی حکومت ہے۔

(۲) شعبۂ اعمال صالحہ:۔

یہاں اس سے ہماری مراد دین کا وہ تمام تر عملی حصہ ہے جو جوارح سے تعلق رکھتا ہے جس میں اسلامی عبادات (بشمول ہجرت و جہاد و امر بالمعروف و نہی عن المنکر وغیرہ) اور معاملات، معاشرت اور اخلاق و آداب غرض دین کے تمام عملی ابواب داخل ہیں۔ ان ابواب میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جو ہدایات دیں اور جو عملی نمونہ پیش فرمایا اس سب کا تعلق دین کے اسی شعبہ سے ہے اور ہم اس کو دین کا پورا قالب اور مکمل عملی نظام کہہ سکتے ہیں۔ اور ہماری پوری عملی زندگی دین کے اسی شعبہ کے زیر حکومت ہے۔

(۳) شعبۂ کیفیات باطنہ و ملکات روحانیہ

جس طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اعتقادات حقہ اور اعمال صالحہ کے ابواب میں اپنی تعلیم و تلقین اور اپنے عملی نمونہ سے امت کی رہنمائی فرمائی ہے، اسی طرح آپ نے باطنی و روحانی کیفیات کے متعلق بھی نہایت اہم ہدایات دی ہیں۔ اور ان کیفیات و احوال کا نہایت اعلیٰ معیاری و مثالی نمونہ امت کے لیے چھوڑا ہے۔

بہر حال ایمانیات اور اعمال صالحہ کی طرح آپ کی لائی ہوئی یہ باطنی و روحانی کیفیات بھی دین کا ایک مستقل اور اہم شعبہ ہیں۔ اور مشہور حدیث جبرئیل[1] میں پہلے شعبہ کو ایمان سے دوسرے کو اسلام سے اور تیسرے کو احسان سے تعبیر کیا گیا ہے اور آخر میں ان تینوں شعبوں کے مجموعہ کو دین کہا گیا ہے (انہ جبرئیل جاء لیعلمکم دینکم (بخاری و مسلم)

---

[1] قریباً تمام کتب حدیث میں متعدد صحابہ کرام سے ایک نہایت اہم حدیث مروی ہے جو نہایت جامعیت کے ساتھ پورے دین پر حاوی ہے اور اسی لئے اس کو "ام السنة" کہا جاتا ہے۔ جس طرح کہ سورۂ فاتحہ کو "ام الکتاب" کہا جاتا ہے عرف علماء میں یہ حدیث "حدیث جبرئیل" کے نام سے مشہور ہے۔ اس کا مضمون یہ ہے کہ ـــــ ایک روز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم صحابہ کے مجمع میں بیٹھے ہوئے تھے۔ اسی مجلس میں حضرت جبرئیل ایک اجنبی زوار کی (بقیہ دوسرے صفحہ)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات مقدس تو ان تینوں شعبوں کو یکساں طور پر جامع تھی اور قریب قریب ایسی ہی جامعیت اکابر صحابہ بالخصوص حضرات خلفاء راشدین کو بھی حاصل تھی لیکن بعد کے قرنوں میں زیادہ تر ایسا ہوتا رہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اکثر وارثین و نائبین اگرچہ ذاتی طور پر کم و بیش ان تینوں شعبوں کے حامل اور جامع ہوتے تھے لیکن اپنی اپنی صلاحیت و استعداد اور اپنے اپنے ذوق یا ماحول کے تقاضے کے مطابق انھوں نے کسی ایک شعبہ کی خدمت سے اپنا خاص تعلق رکھا اور بیشک بعد کے ان قرنوں میں دین کے کاموں کا پھیلاؤ جس درجہ بڑھ گیا تھا اور جو حالات پیدا ہو گئے تھے ان میں ایسا ہونا ناگزیر بھی تھا ــــ اس صورت ایجاد اس تقسیم عمل نے خواص امت میں فقہاء، ائمہ عقائد اور صوفیا کے طبقے پیدا کئے۔

پس جس طرح ائمہ عقائد و ائمہ فقہ نے خصوصیت کے ساتھ دین کے پہلے دونوں شعبوں کی خدمت و حفاظت اور تنقیح و تفصیل کی اور علی ہٰذا جس طرح ائمہ محدثین نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث کی حفاظت اور نقل و روایت کی خدمت کو سرانجام دیا۔ اور اس لیے یہ تمام حضرات اپنے اپنے دائرے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نیابت و نمائندگی کرنے والے اور امت کے بہت بڑے محسن ہیں اسی طرح حضرات صوفیاء کرام نے دین کے تیسرے اہم شعبہ (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی لائی ہوئی باطنی و روحانی کیفیات) کی خدمت و حفاظت اور اس باب میں آنحضرت کی نمائندگی و نیابت کی ہے۔ اور اس لیے امت پر ان کا بھی بہت بڑا احسان ہے اور امت اس شعبہ میں یقیناً ان کی ممنون اور محتاج ہے۔

پس سلوک و تصوف کی غرض و غایت اور صوفیاء کرام کی مساعی کا اصل نصب العین اور خانقاہوں کا موضوع، در اصل دین کا یہی تیسرا شعبہ ہے ــــ یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی

(بقیہ صفحہ گذشتہ) صورت میں آئے کہ حضور نے بھی اس وقت ان کو نہیں پہچانا۔ اور آنحضرت سے انھوں نے پہلا سوال یہ کیا کہ ایمان کیا ہے؟ آپ نے جواب دیا کہ اللہ پر اور اس کے فرشتوں پر اور اس کی کتابوں پر اور اس کے رسولوں پر اور یوم آخرت پر اور تقدیر الٰہی پر ایمان لانا، پھر انھوں نے سوال کیا کہ اسلام کیا ہے؟ اس کے جواب میں آپ نے اسلام کے ارکان پنجگانہ (شہادت اور نماز، زکوٰۃ، روزہ، حج) کا ذکر فرمایا، پھر تیسرا سوال انھوں نے کیا، احسان کیا ہے؟ آپ نے جواب دیا کہ احسان اس کیفیت کا نام ہے کہ تم اللہ کی بندگی اس طرح کرو اور اس سے ایسے ڈرو گویا تم اس کو دیکھ رہے ہو۔ (و فی روایۃ ان تخشی اللہ کانک تراہ) حدیث کے آخر میں ہے کہ جب یہ سائل مجلس سے چلے گئے تو حضور پر منکشف ہوا کہ یہ جبرئیل تھے اور آپ نے صحابہ کرام سے فرمایا کہ یہ جبرئیل امین تھے اور اس سوال و جواب کے ذریعہ تمہیں دین سکھانے آئے تھے ۱۲

لائی ہوئی باطنی و روحانی کیفیات کی تحصیل اور پھر اس سلسلے میں دوسروں کی رہنمائی اور تنقیل رسائی ان حضرات کا امتیازی شغل اور مخصوص دائرہ عمل ہے۔

لیکن چونکہ یہ باطنی و روحانی کیفیات صرف کتابیں یا مقالے پڑھنے سے یا صرف تقریریں اور گفتگوئیں سننے سے حاصل نہیں ہوتیں (بلکہ سچ یہ ہے کہ ان عام ذرائع سے تو ان کا صحیح ادراک بھی نہیں ہوتا) اور ان کیفیات کے کسی حامل اور وارث کی صحبت و خدمت میں رہ کر مشاہدۂ آثار ہی کی راہ سے ان کی کچھ معرفت ہوتی ہے اور پھر ان کے حصول کے متعلق بھی عام سنت اللہ چونکہ یہی ہے کہ ان کے حاملین کی صحبت و رفاقت اور ارشاد و تربیت ہی اس کا عام ذریعہ ہے (اور اس کے بغیر ان کا حصول اگرچہ عقلاً ناممکن نہ ہو لیکن متعذر اور عادتاً شاذ ضرور ہے) اس لیے ایسے لوگ اس خاص شعبہ سے عموماً محروم اور اس کی پوری معرفت سے بھی قاصر ہی رہتے ہیں جن کو اللہ کے کسی صاحب احسان اور صاحب قلب بندہ کی صحبت و رفاقت کی توفیق نہ ملی ہو۔

ہمارے اس زمانے میں جہاں اور بہت سی نئی چیزیں اور نئے حالات پیدا ہوئے ہیں، انہی میں سے ایک یہ بھی ہے کہ وسائل نشر و اشاعت کی وسعت اور کتابوں کی کثرت نے بہت بڑی تعداد میں ایسے لوگ پیدا کئے ہیں، جو "دین" کو بھی صرف کتابوں اور رسالوں کے صفحات اور اخبارات کے کالموں سے حاصل کرتے ہیں۔ (اور یہ چیز فی نفسہٖ کچھ بری نہیں بلکہ اچھی ہی ہے کہ اس طرح دینی افادہ اور استفادہ کا دائرہ بحمد اللہ بہت وسیع ہوگیا) لیکن چونکہ ان بیچاروں کو دین کی کسی ایسی بالاتر نمونہ کے دیکھنے کا کبھی اتفاق نہیں ہوتا جو خصوصیت سے اس تیسرے شعبہ کا حامل ہو اور جس کو دیکھ کر یہ لوگ اپنے علم کو نارسیدہ اور اپنی دینی معرفت کو ناتمام کچھ سکیں اس لیے بسا اوقات یہ غریب اس زعم میں مبتلا ہو جاتے ہیں کہ جو کچھ ہمارے پاس ہے اور لٹریچر کی راہ سے ہم نے جانا بوجھا ہے بس یہی مکمل دین ہے اور اس سے آگے اب کچھ بھی باقی نہیں ہے۔ اور چونکہ آج کل کا عام پسند دینی لٹریچر بھی زیادہ تر ایسے ہی اہل علم و اصحاب قلم کا تیار کیا ہوا ہوتا ہے جو خود بیچارے اسی زعم کے گرفتار ہوتے ہیں۔ اس لیے اپنے ناظرین کو اس غلط فہمی سے نکالنے کے بجائے وہ اس کو اور زیادہ اس پر جما دیتا ہے اور بالآخر یہی زعم ان بیچاروں کو دین کے اس تیسرے روحانی شعبہ سے (جو اصل روح ایمان ہے) ہمیشہ کے محروم کر دیتا ہے۔

اور اس سے زیادہ رنج و افسوس کی بات یہ ہے کہ اس محرومی میں ہمارے خالص دینی

مدارس کے پڑھے ہوئے بہت سے وہ فضلاء بھی اسی طبقے کے شریک حال ہیں، جو کسی وجہ سے اس شعبہ سے ناآشنا ہونے کے باوجود اس زعم میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ اور اس لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی لائی ہوئی باطنی و روحانی کیفیات کی طلب و تحصیل کا کوئی داعیہ ان کے دلوں میں کبھی پیدا ہی نہیں ہو

دین کے اس خالص لطیف ترین اور بلند ترین شعبہ سے ہمارے زمانے کے لوگوں کی اس بیگانگی اور بُعد کا ایک عمومی سبب یورپ سے آئی ہوئی وہ مادیت اور ظاہریت و سطحیت بھی ہے جو مسیحی کلیسا کی غیر معتدل اور مسخ شدہ روحانیت کے رد عمل نے پیدا کی تھی۔ یورپین اقتدار کے پیچھے لگے ہوئے دوسرے ظاہری و باطنی ملعون اثرات کی طرح اس کی یہ ذہنیت بھی ہمارے اندر پوری طرح سرایت کر گئی ہے اور واقعہ یہ ہے کہ اس نے ہمارے اکثر عوام و خواص کو اتنا متاثر کر دیا کہ دین کے اس روحانی شعبہ سے فطری طور پر بھی جو مناسبت ہماری روحوں کو ہونی چاہیے تھی، وہ بھی نہیں رہی ہے بلکہ نوبت یہاں تک پہنچ چکی ہے کہ ہمارے اس دور کے بہت سے لکھے پڑھے اہل علم و نظر والے بھی اس سلسلے کی چیزوں پر چٹخارے لے لے کے طعن و طنز کرتے ہیں اور اسی کو اسلام کی خدمت سمجھتے ہیں [۱]۔

---

[۱] یہ دیکھ کر اور زیادہ تعجب اور دکھ ہوتا ہے کہ بہت سے وہ حضرات بھی اس عام روش پر جا رہے ہیں جو حضرت مجدد الف ثانی، حضرت شاہ ولی اللہ اور امیر المومنین حضرت سید احمد شہید کو اپنے اپنے دور کا مجدد اعظم سمجھتے ہیں حالانکہ جس کسی نے حضرت مجدد کے مکتوبات، حضرت شاہ ولی اللہ کی تصانیف اور حضرت سید شہید کے مجموعہ ملفوظات (صراط مستقیم مرتبہ شاہ اسمٰعیل شہید) کا مطالعہ کیا ہے اس پر یہ حقیقت مخفی نہیں ہو سکتی کہ یہ سب حضرات سلوک و تصوف صرف حامل ہی نہیں بلکہ اس کے علمبردار اور اصحاب سلاسل اکابر ہیں اور اپنی تعلیم اور اپنے تعامل میں ان حضرات نے دین کے اس شعبہ کو خاص اور غیر معمولی اہمیت دی ہے۔ اور جو لوگ اس سے بے بہرہ ہوں ان کو دین کے بے نصیب تک لکھا ہے۔ پس ایک طرف ان حضرات کو "مجدد اعظم" کہنا اور دوسری طرف ان کی سب سے بڑی اور نمایاں خصوصیت (سلوک و تصوف) پر عامیانہ انداز میں زبان طعن دراز کرنا اور جو لوگ اللہ کی بخشی ہوئی اپنی بصیرت کی روشنی میں انہی حضرات کی طرح اس شعبہ کی اہمیت کو سمجھتے ہوں اور اس کی تحصیل و تکمیل میں انہی حضرات کے طریقہ کار کی پیروی پر آج بھی یقین رکھتے ہوں اور اس لیے اس چودھویں صدی میں بھی گیارہویں، بارہویں، تیرہویں صدی کے ان مجددین ہی کی رہنمائی میں بالکل انہی کے نقش قدم پر چل رہے ہوں ان پر خانقاہیت، پیری مریدی کی پھبتیاں کسنا۔ دینی ذمہ داریوں کے عدم احساس کے علاوہ علمی سنجیدگی کے مقام سے بھی گری ہوئی بات ہے

دین کے اس شعبہ کی غربت اور اہل زمانہ کی اس سے بے خبری اور بیگانگی کا اندازہ اس واقعہ سے کیا جاسکتا ہے کہ محترم رفیق مولانا سید ابو الحسن علی کی "سیرت سید احمد شہید" جب پہلی مرتبہ چھپی تو ایک مشہور و باخبر صاحب علم نے خود مجھ سے کہا کہ (انھوں نے (مولانا علی نے) یہ ٹھیک نہیں کیا کہ سید صاحب کے تصوف کے پہلو کو بھی اس کتاب میں اتنا نمایاں کر کے دکھایا اور صراط مستقیم کی تفصیل کی تفصیل اس میں نقل کر دی، آج کل کے لوگ اس سے اچھا اثر نہیں لیں گے بلکہ سید صاحب کی شخصیت اور کتاب کا وزن ان کی نظر سے گر جائے گا۔ تم انھیں مشورہ دینا کہ آئندہ اڈیشن میں وہ اس حصہ کو کتاب سے نکال دیں۔"

در اصل ان صاحب نے یہ جو کچھ کہا ابناء زمانہ کی ذہنیت کے لحاظ سے صحیح کہا تھا۔ آج کل کے بیشتر پڑھے لکھوں کا حال یہی ہے کہ وہ دین کے اس شعبہ کو ایسا ہی حقیر اور بے وقعت سمجھتے ہیں۔ یقیناً "مقام محمدی" سے بے خبری اور نا آشنائی کی یہ انتہا ہے۔

دین کا یہ شعبہ یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی لائی ہوئی وہ روحانی کیفیات اور قلبی کمالات جو سلوک و تصوف کا اہم موضوع ہیں اور جن کی تحصیل اور نشو و نما تمام خانقاہی مشاغل کی خاص غرض و غایت ہے۔ ان کا وجود دین میں کیا ہے اور کتاب و سنت سے ان کا کیا مقام متعین ہوتا ہے۔ اور ان کے بغیر آدمی کس دولت عظمیٰ سے محروم اور ذائقہ ایمانی سے کیسا بے نصیب رہتا ہے۔ ۔ ان سوالات کا جواب جس حد تک کہ کتابوں کے مطالعہ سے حاصل کیا جاسکتا ہے اس کے لیے ابتدا میں سے شیخ ابو طالب مکی کی قوت القلوب اور بعد کے اکابر عرفاء میں سے حضرت مجدد الف ثانی کے مکتوبات اور حضرت سید احمد شہید کی صراط مستقیم کا مطالعہ بھی بہ سلیم الطبع گرے تو ان شاء اللہ کافی ہو سکتا ہے۔

(الفرقان صفر ۱۳۶۶ھ)

شہر بمبئی میں
خالص گھی سے تیار کردہ
ہر قسم کی مٹھائیاں
افلاطون اور حلوے
برفی
سوہن حلوہ
گوند پاک
سالم پاک وغیرہ
ملنے کا واحد قابل اعتماد مرکز
اس کے علاوہ
سورتی اور روے کی نان خطائیاں
ہر وقت تیار ملیں گے
زم زم سویٹ میٹ مارٹ
فون نمبر: 331422
متصل منارہ مسجد محمد علی روڈ بمبئی ۳

محمد منظور نعمانی

مسلمانوں کی دینی حالت اور ہمارے فرائض

اگر آپ نے اپنی مسلمان قوم کی دینی حالت کا صحیح اندازہ کرنے کے لئے اب تک کوئی کوشش نہیں کی ہے تو کم از کم ایک دن اس مقصد کے لئے ضرور قربان کیجئے اور پنسل اور نوٹ بک ہاتھ میں لے کے صبح کو گھر سے نکل جائیے اور دروازہ دروازہ پھرنے کے بجائے صرف چند ایسے مقامات پر چلے جائیے جہاں مسلمانوں کے مختلف طبقات کے جتھے کے جتھے آپ کو مل سکیں۔ مثلاً سب سے پہلے علی الصبح گوشت کی مارکیٹ میں جائیے اور وہاں کے گوشت بیچنے والے اور گوشت خریدنے والے خالص مسلمانوں کی دینی حالت کا ایک اندازہ لگا کے نوٹ بک میں درج کر لیجئے ـــــ پھر ترکاری بازار میں پہنچ کے سبزی فروش مسلمانوں کی حالت کا جائزہ لیجئے ـــــ پھر کسی اور ایسے ہی بازار میں جائیے جہاں زیادہ تر آپ کے مسلمان بھائیوں ہی کی دکانیں ہوں اور وہاں کے مسلمان دکانداروں اور مسلمان گاہکوں کی عام دینی حالت کا اندازہ کیجئے ـــــ پھر ریلوے اسٹیشن پر پہنچئے اور وہاں کے مسلمان قلیوں اور تانگے چلانے والے مسلمانوں سے باتیں کر کے ان کی دینی حالت کا اندازہ لگائیے ـــــ پھر مسلمان دھوبیوں، گھوسیوں بھشتیوں جیسے پسماندہ طبقوں کی بستیوں میں جائیے اور ان کی اور ان کے بال بچوں کی دینی حالت کا مطالعہ کیجئے ـــــ پھر کچہری پر پہنچئے اور مسلمان مقدمہ بازوں، گواہی یا دلالی کا پیشہ کرنے والوں سے مل کر دیکھئے، نیز مسلمان وکیلوں، مختاروں اور عدالت کی کرسیوں پر بیٹھنے والے مسلمان حاکموں کے احوال کا مشاہدہ کیجئے! اسی طرح کسی تھانہ میں پہنچ کے مسلمان تھانیدار صاحب اور مسلمان محرروں، کانسٹبلوں کی حالت ذرا دیکھئے۔

پھر کسی اسلامیہ کالج یا اسلامیہ اسکول میں چلے جائیے اور وہاں کے مسلمان پروفیسروں ماسٹروں اور طالب علموں کی دینی حالت پر ایک نظر ڈالیے ـــــ پھر اگر حسن اتفاق سے اسی دن آپ کے شہر میں مسلمانوں کا کوئی قومی اجتماع ہو، کوئی سیاسی کانفرنس ہو رہی ہو تو

وہاں جمع ہونے والے مسلمانوں کی قومی سیاست کے نقیبوں اور اسلام کی نمائندگی کے مدعیوں پر سرسری نظر ڈالیے —— پھر کسی مسلمان اخبار کے دفتر میں بھی چلے جائیے اور وہاں کے اداراتی دشمات اور کلرکوں، کاتبوں اور دوسرے ملازمین کی دینداری اور دین سے آشنائی کا اندازہ کیجئے —— پھر مسلمانوں کے کسی محلے کی مسجد میں بھی جائیے اور اندازہ لگائیے کہ محلہ کی کئے ہزار کی آبادی میں سے کتنے عادی نماز کے لیے مسجد میں آتے ہیں۔؟ پھر آنے والوں میں کتنے پرانے وقتوں کے بوڑھے ہیں اور کتنے اس زمانے کے جوان، کتنے تعلیم یافتہ اور آسودہ حال سفید پوش ہیں اور کتنے غیر تعلیم یافتہ" غریب اور میلے کچیلے، گرد آلود؟"

اور اگر آپ کی بستی میں کوئی ٹوٹا پھوٹا عربی مدرسہ ہو تو جاکے ذرا اس کی بھی زیارت کیجئے! اور دیکھیے کہ اس میں آپ کے شہر کے کتنے طالب علم ہیں —— اور پھر ان میں کوئی ایک بھی کسی معزز گھرانے یا کسی نمایاں خاندان کا ہے۔؟ نیز وہاں کے پڑھنے پڑھانے والوں سے بھی مل کے اور باتیں کرکے اس کا اندازہ لگائیے کہ ان کی اکثریت میں بھی حقیقی دینی روح کی کس قدر کمی ہے اور خالص دینی ہی نقطہ نظر سے ان کے بھی اکثر افراد کی ذہنی اور عملی حالت کتنی پست اور کس قدر مایوس کن ہے۔

پھر شہر سے نکل کر قریب کے کسی ایسے گاؤں میں بھی ہو آئیے جہاں مسلمان زیادہ تعداد میں آباد ہوں۔ اور ان کی زندگی کا مطالعہ کرکے دیہاتی مسلمانوں کے متعلق معلومات حاصل کیجئے۔

جس دن آپ اتنی سی محنت کرکے حساب لگائیں گے اس دن آپ کو معلوم ہوگا کہ موجودہ مسلمان قوم میں ایک فی صدی بھی ایسے لوگ نہیں ہیں جو دین سے آشنا اور خدا رسول کے شناسا ہوں۔ اور جن کی زندگی کو اوسط درجہ کی بھی اسلامی زندگی کہا جا سکے۔

آہ! اسلام کا اقرار کرنے والوں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے نسبت رکھنے والوں کی اتنی بڑی تعداد جب کہ محض اپنی جہالت اور غفلت کی وجہ سے دین سے اس قدر دور پڑی ہوئی ہے اور اللہ و رسول سے اس قدر بیگانہ ہو چکی ہے تو اہل دین کا اپنے ان بھائیوں کی اصلاح سے بے فکر رہ کر جینا اور چین و اطمینان کے ساتھ اپنے دوسرے مشاغل میں مشغول رہنا۔ یقیناً بڑی فرض ناشناسی ہے۔

تمام مسلمانوں کی خیر خواہی اور نصیحت اور نیکی اور تقویٰ کے کاموں میں باہم تعاون کو اسلام نے

ہر مسلمان کا فریضہ قرار دیا ہے اور جب امت کے ۹۹ فی صدی کے قریب افراد جہالت و غفلت کے سمندر میں اس طرح غرق ہو رہے ہوں اور اسلام سے ان کا تعلق صرف برائے نام رہ گیا ہو تو ایسی حالت میں بھی اگر ہم "دعوت الی الخیر، تواصی بالحق" اور "تعاون علی البر والتقویٰ" کا فریضہ ادا نہ کریں اور جہالت و غفلت کی وادیوں میں بھٹکتے ہوئے اپنے ان بھائیوں کی خبر نہ لیں اور ان کو اللہ و رسول سے آشنا اور اسلام سے وابستہ کرنے کے لئے امکانی جد و جہد نہ کریں تو یقیناً ہم بڑے مجرم اور بڑے بے درد ہیں[1]۔

بیشک ارسطو اور ابن سینا کے جانشینوں یعنی پیشہ ور طبیبوں اور ڈاکٹروں کے لئے عرف عام میں بالکل زیبا ہے کہ جب تک مریض یا مریض کے والی وارث خود علاج کی خواہش نہ کریں اطباء اور ڈاکٹر از خود کوئی پیش قدمی نہ کریں۔ لیکن انبیاء علیہم السلام کے وارثوں اور دولت دین کے امینوں کے لئے ہرگز جائز نہیں ہے کہ وہ جاہلوں و غافلوں کی دینی صلاح و تربیت سے بے نیاز اور بے پروا ہو کر اس خیال سے بیٹھے رہیں کہ جب کوئی طالب بن کر آئے گا اور اصلاح چاہے گا تو ہم اس کو راستہ بتا دیں گے۔ اگر کچھ حضرات ایسا سمجھے ہوئے ہیں تو یقیناً ان کی رائے قابل نظر ثانی ہے ــــ حاملان دین کے لئے انبیاء علیہم السلام کا اسوۂ حسنہ ہی قابل تقلید نمونہ ہے اور کون نہیں جانتا کہ وہ حضرات از خود غافلوں اور جاہلوں کے پاس پہنچتے تھے اور جس طرح بھی بن پڑتا تھا ان کی اصلاح و ہدایت کی کوششیں کرتے تھے۔

قرآن پاک میں حضرت نوح کے اس بیان کو ذرا غور سے پڑھیے۔

رَبِّ إِنِّي دَعَوْتُ قَوْمِي لَيْلًا وَنَهَارًا فَلَمْ يَزِدْهُمْ دُعَائِي — اے میرے پروردگار! میں نے اپنی اس قوم کو رات دن تیری طرف بلایا، لیکن جتنا میں نے بلایا یہ

---

[1] بالخصوص جب کہ یہ بھی واقعہ ہے کہ مسلمانوں کی یہی بڑی تعداد اور اس کی یہ غیر اسلامی زندگی ہی غیروں کے لئے اسلام کو سمجھنے میں سب سے بڑی رکاوٹ بنی ہوئی ہے اور لِتَكُونُوا شُهَدَاءَ عَلَى النَّاسِ کا مقصد کلی طور پر فوت ہو رہا ہے ہر حال یہ بالکل بدیہی بات ہے کہ جب تک خود "مسلمان قوم" اسلام کا زندہ نمونہ نہیں بنے گی غیروں کے سامنے اسلام کو پیش کرنے کی ہر کوشش بے نتیجہ رہے گی۔

الاأسراراً ۔ ثم اني كلما دعوتهم لتغفر لهم جعلوا اصابعهم في آذانهم واستغشوا ثيابهم واصروا واستكبروا استكبارا ۔ ثم اني دعوتهم جهاراً ۔ ثم اني اعلنت لهم واسررت لهم اسراراً ۔ (سورۂ نوح ع ۱)

لئے ہی اور زیادہ بھاگے اور جب بھی میں نے انھیں دعوت دی تیری مغفرت کے لئے تو انھوں نے انگلیاں دے دیں اپنے کانوں میں اور ڈال لئے اوپر سے کپڑے اور اڑ گئے اپنی جہالت اور گمراہی پر اور دماغ چڑھائے انھوں نے غرور سے (غداوند!) اس کے بعد بھی میں نے انہیں بلایا اپنی پوری آواز سے پھر میں نے ان کو علانیہ اور خفیہ ہر طرح ہی سمجھایا ۔

حضرت نوح کے علاوہ اور بھی جن جن انبیا اور رسل کی تبلیغ و دعوت کا ذکر قرآن مجید میں کیا گیا ہے یہ چیز ان حضرات کے احوال میں بالکل مشترک ہے کہ جاہلوں اور غافلوں کی اصلاح و ہدایت کے لئے وہ خود بے چین رہتے تھے اور لوگوں کے آنے کے منتظر نہیں رہتے تھے ۔۔۔۔ امام غزالی اپنے وقت کے اہل دین کو، دین سے ناواقف عوام کی تعلیم و تربیت کے اسی فریضہ کی طرف متوجہ فرماتے ہوئے "احیاء العلوم" میں ایک جگہ لکھتے ہیں ۔

ولا ينبغي ان يصبر الى ان يسئل عنه بل ينبغي ان يتصدى لدعوة الناس الى نفسه فانهم ورثة الانبياء والانبياء ما تركوا الناس على جهلهم بل كانوا ينادونهم في مجامعهم ويدورون على ابواب دورهم في الابتداء ويطلبون واحداً واحداً فيرشدونهم فان مرضى القلوب لا يعرفون مرضهم ۔۔۔ (احیاء العلوم جلد ۴ باب دواء التوبہ)

اور جائز نہیں ہے کہ دین کے جاننے والے اس کے انتظار میں بیٹھے رہیں کہ کوئی آکر ان سے پوچھے تو بتلائیں ۔ بلکہ ان کو چاہئے کہ خود لوگوں کو اپنی طرف بلائیں (اور داعی اور طالب بنیں) کیونکہ وہ انبیاء علیہم السلام کے وارث ہیں اور حضرات انبیاءؑ نے لوگوں کو ان کی جہالت پر نہیں چھوڑے رکھا بلکہ وہ ان کو ان کے مجمعوں میں جا جاکر دعوت دیتے تھے اور ابتداء میں انکے دروازوں پر خود جاتے تھے اور ایک ایک کو ڈھونڈتے تھے اور انھیں ہدایت کا درس دیتے تھے ۔ یہ اس واسطے ضروری ہے کہ دلوں کے بیمار اپنی بیماری سے خود واقف نہیں ہوتے ہیں ۔

ممکن ہے ہماری اس گزارش اور امام غزالی کے اس ارشاد پر کسی صاحب کو یہ شبہ ہو کہ انبیاء علیہم السلام کا یہ طرز عمل تو "کافروں" کے ساتھ تھا کہ اپنی دعوت لے کر ان کے پاس خود پہنچتے تھے اور ان کی اصلاح و ہدایت کے لیے اس طرح پھر پھر کر کوشش کرتے تھے اور تم مسلمانوں کی اصلاح و ہدایت کے لیے اسی طرح کام کرنے کی دعوت دیتے ہو حالانکہ انبیاء علیہم السلام ایمان لانے والوں کے پیچھے پیچھے اور ان کے گھروں پر اس طرح سے نہیں پھرا کرتے تھے۔ بلکہ مومنین خود آ کر دین کی تعلیم و تربیت ان سے حاصل کرتے تھے۔

بہرحال جن حضرات کے دل میں یہ کھٹک پیدا ہو وہ اگر مزید غور و فکر سے کام لیں تو اس حقیقت کا سمجھنا ان کے لیے مشکل نہ ہوگا کہ انبیاء علیہم السلام کا اصل کام خدا فراموش انسانوں اور اللہ کے بھٹکے ہوئے بندوں کو اللہ تعالیٰ سے وابستہ کرنے اور اس کی بندگی کے راستہ پر لگانے کی کوشش کرنا ہوتا ہے۔ لیکن ان کے زمانہ میں یہ حالت چونکہ صرف "کافروں" کی ہوتی ہے اس لیے یہ حضرات اپنی دعوت لے کر انہیں میں پھرتے ہیں اور انہیں کی مجلسوں اور انہیں کے مجمعوں میں جاتے ہیں۔ اور پھر اس دعوت کو قبول کر کے جو لوگ ایمان لے آتے ہیں۔ چونکہ ان کا ایمان شعوری ہوتا ہے اور وہ اس کی قدر و اہمیت کو جانتے ہیں اس لئے ایمان لاتے ہی وہ خود تعلیم و تربیت کے طلبگار اور فکرمند بن جاتے ہیں اور بجائے اس کے کہ انبیاء علیہم السلام ان کو دین کی باتیں بتانے کے لئے ان کے گھروں پر جائیں وہ خود دین کی ضروری تعلیم حاصل کرنے کے لئے بالکل اس طرح پھرنے لگتے ہیں جس طرح کوئی پیاسا پانی کی تلاش میں سرگرداں ہوتا ہے ـــــ لیکن بدقسمتی سے فی زماننا "مسلمان" کہلانے والوں کی اکثریت کی حالت غفلت و خدافراموشی کے لحاظ سے جیسی کچھ ہے وہ ہمارے آپ کے سامنے ہے۔ دین کی قدر و اہمیت کا احساس اور دین کی تعلیم و تربیت کی طلب ان کے اندر بالکل مفقود ہے اس لئے ان کو خدا سے آشنا کرنے اور کم از کم دین کی بنیادی باتوں سے ان کو واقف کر کے برائے نام اسلامی نسبت کے بجائے حقیقی دین اسلام سے ان کو وابستہ کرنے کی کوئی صورت اس کے سوا نہیں ہے کہ ابتداءً دین کی دعوت لے کر خود ان میں پھرا جائے اور خود ان کے پاس پہنچ پہنچ کے اسلام کی بنیادی باتیں ان کو سمجھائی جائیں اور دین کی قدر و طلب ان میں پیدا کرنے کی کوشش کی جائے۔

جن اہل علم و اہل دین حضرات کا یہ خیال ہے کہ ہمارا فرض اس سے زیادہ کچھ نہیں ہے کہ جو کوئی اصلاح اور تعلیم و تربیت کا طالب بن کر ہمارے پاس آئے ہم اس کی تعلیم و اصلاح کے لئے اپنی خدمات پیش کر دیں اور جو کوئی دینی مسئلہ پوچھے تو اپنے علم کے مطابق اس کو بتلا دیں۔ ان حضرات کے مغالطہ کی وجہ غالباً یہ ہے کہ اصلاح اور تعلیم و تربیت کے مختلف درجات کی اہمیت اور ذمہ داری میں جو فرق ہے انھوں نے اس مسئلہ پر غور کرتے وقت اس کا لحاظ نہیں فرمایا ہے۔

ورنہ یہ حقیقت بالکل واضح ہے کہ جو جاہل و غافل مسلمان دین کی بنیادی باتوں سے بھی آشنا نہیں ہیں اور ان میں دین سیکھنے اور دیندار بننے کی کوئی طلب بھی نہیں ہے، سو ان کی اتنے درجہ کی اصلاح اور اتنی تعلیم و تربیت کی کوشش جتنی کہ ان کے مسلمان ہونے کے لئے ضروری ہو یقیناً اہم فرائض میں سے ہے جس سے کسی وقت بھی استغنا جائز نہیں —— البتہ اس کے بعد اصلاح اور تعلیم و تربیت کے جو تکمیلی درجے ہیں مثلاً علوم دین میں کمال اور درجۂ فضیلت حاصل کرنا، یا مثلاً حضرات صوفیہ کے طرز پر تزکیۂ نفس اور تزکیۂ اخلاق کی تکمیل کرنا سو یہ درجے بیشک ایسے ہیں کہ نہ تو ہر مسلمان کے لئے ان کی تحصیل فرض عین ہے اور نہ ہر ایک کو ان کی تحصیل کی دعوت دینے اور اس کے لئے کوشش کرنے کے ہم مکلف ہیں۔ لہٰذا اس کام کے لئے یہ طریقہ بالکل صحیح ہے کہ جو طالب بن کر آئے اس کی خدمت سے دریغ نہ کیا جاوے اور ہر ایک کو پکڑ پکڑ کے لانے کی کوشش نہ کی جائے۔ یہ وہی کام ہے جس کا تکفل ہمارے مدرسے اور ہماری خانقاہیں کئے ہوئے ہیں اور وہاں کا طریق کار یہی ہے جو اپنے دائرہ میں بالکل صحیح ہے —— لیکن ہماری اس گزارش اور ہماری دعوت کا جو موضوع ہے (جس کی طرف ان سطور کے ذریعہ اہل دین کو متوجہ کرنا مقصود ہے) وہ مدارس اور خانقاہوں میں انجام پانے والا یہ تکمیلی کام نہیں ہے بلکہ وہ برائے نام قسم کے جاہل و غافل مسلمانوں میں حقیقی ایمان اور دینی شعور پھیلانے اور خدا ترسی اور فکر عاقبت ان میں پیدا کرنے اور دین کی ضروری ضروری باتیں ان کو سکھلانے کا بنیادی کام ہے۔

اور چونکہ فی زمانہ کوئی ایسا ہمہ گیر دینی ادارہ موجود نہیں ہے جو کما حقہٗ اس کام کی کفالت کر رہا ہو اور ضرورت کے مطابق اس خدمت کو انجام دے رہا ہو (بلکہ واقعہ یہ ہے کہ جو افراد اور جو بعض جماعتیں اس سلسلے میں کچھ کر بھی رہی ہیں وہ عالم اسلامی کی موجودہ ضرورت کے لحاظ

سے ہزارواں حصہ بھی نہیں ہیں اس لئے حسب موقع اور حسب وسعت اس خدمت کی انجام دہی علماء اہل دین کا فرض ہے اور ہم سب ہی کے ذمہ ہے کہ اپنے اپنے علاقہ کے، دین سے غافل مسلمانوں کی خبر لیں، اور ضروری درجہ کی ان کی اصلاح اور تعلیم و تربیت کا کوئی بندوبست کریں ورنہ سخت بازپرس کا خطرہ ہے۔

حدیث کے مشہور جامع دفتر "کنز العمال" میں عوام کی دینی تعلیم و تربیت سے غفلت کرنے والوں کے حق میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک نہایت عتاب آمیز خطبہ روایت کیا گیا ہے جس کا خلاصہ یہ ہے۔

> ایک دن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم خطبہ کے واسطے منبر پر کھڑے ہوئے اور غضب و جلال کے انداز میں خطاب کرتے ہوئے فرمایا — کیا بات ہے کہ کچھ لوگ خود تو دین کا علم رکھتے ہیں لیکن ان کے اردگرد رہنے والے قبائل علم دین سے محروم ہیں سو وہ لوگ اپنے ناواقف اور بے علم پڑوسیوں میں علم دین پھیلانے کی کوشش کیوں نہیں کرتے ؟ اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے ذریعہ ان کی اصلاح کیوں نہیں کرتے۔
> اور ایسے ہی ہیں ان بے علم لوگوں سے بھی کہتا ہوں جن کے پڑوس میں دین کے

ل جو حضرات دین ہی کی دوسری اہم خدمات میں مشغول ہیں مثلاً تدریس، تصنیف اور تزکیہ و ارشاد وغیرہ (اللہ تعالیٰ ان کی ان خدمات کو بابرکت اور امت کے لئے زیادہ سے زیادہ نافع بنائے اور قبول فرمائے) وہ بھی اس سلسلہ میں اتنا تو کر ہی سکتے ہیں کہ اپنے اہل عقیدت اور زیر اثر لوگوں کو اس کام کی طرف متوجہ فرمائیں اور خود ان کے کام کی سرپرستی اور نگرانی فرمائیں یا رہنمائی اور نگرانی کا کام بھی کسی اور اہل کے سپرد کر دیں — جاہل و غافل عوام میں دین کے اس بنیادی اور ابتدائی کام کے لئے کسی خاص درجے کے علم اور ہمت کی ضرورت نہیں ہے۔ ہاں اہل علم اور اصحاب فہم کی رہنمائی اور نگرانی ضروری ہے — اس کام کے کرنے کا طریقہ جو تجربہ میں بھی آچکا ہے وہ بہت سہل اور سادہ ہے۔ ضرورت صرف اس کی ہے کہ اہل دین اس کو عمومی طور پر اپنائیں۔ بقول حضرت مولانا محمد الیاس رحمۃ اللہ علیہ "جتنے کروڑوں میں کام کرنے کی ضرورت ہے کم از کم اتنے لاکھ تو کام کے لئے اٹھ کھڑے ہوں" آج دین "غریب" ہے اور دین مایان داؤں کو اس کی پکار ہے من انصاری الی اللہ !

جاننے والے موجود ہیں کہ اپنے علم والے پڑوسیوں سے دین سیکھنے کی کوشش کیوں نہیں کرتے (راوی کا بیان ہے کہ حضور نے ان دونوں گروہوں کو تین دفعہ اس طرح مخاطب فرمایا اور پھر ارشاد فرمایا) یا تو یہ دونوں طبقے اپنے اپنے طرز عمل کو بدلیں (یعنی دین کے جاننے والے اور سمجھنے والے اپنے نہ جاننے والے پڑوسیوں کو سکھائیں اور نہ جاننے والے لوگ اپنے علم والے پڑوسیوں سے دین کی تعلیم و تربیت حاصل کریں) ورنہ میں اس دنیا ہی میں ان کو سخت سزا دلواؤں گا۔

آگے اس حدیث میں یہ مضمون ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا خاص اشارہ اس پر عتاب خطاب میں اشعریین کی طرف تھا، یہ لوگ عام طور سے دین کے جاننے والے اور دین کی سمجھ بوجھ رکھنے والے تھے لیکن ان کے اردگرد چشموں پر اور جنگلوں میں جو لوگ رہتے تھے وہ دین کے علم و فہم سے عاری تھے ـــــ جب ان اشعریوں کو حضرت کے اس عتاب کا علم ہوا تو انھوں نے خدمت اقدس میں حاضر ہو کر عرض کیا کہ دوسرے لوگ اگر اپنی بدبختی سے دین کا علم حاصل نہیں کرتے ہیں تو کیا ان کی ذمہ داری بھی ہم پر ہے؟ حضرت نے ارشاد فرمایا - ہاں! جاننے والے اپنے ماحول کے نہ جاننے والوں کو سکھلانے اور ان میں علم دین پھیلانے کی کوشش کرنے کی ذمہ داری اور نہ جاننے والے سیکھنے اور تعلیم حاصل کرنے کے ذمہ دار ہیں اور دونوں گروہوں میں سے جو بھی اپنے فریضہ میں کوتاہی کرے گا وہ مستوجب سزا ہو گا۔

پھر ان اشعریوں نے ان بے علم قبائل کی تعلیم و تربیت کے لئے ایک سال کی مہلت مانگی تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو یہ مہلت دیدی اور آخر میں آپ نے یہ آیت پڑھ کر سنائی۔

لُعِنَ الَّذِينَ كَفَرُوا مِن بَنِي إِسْرَائِيلَ عَلَىٰ لِسَانِ دَاوُودَ وَعِيسَى ابْنِ مَرْيَمَ ۚ ذَٰلِكَ بِمَا عَصَوا وَّكَانُوا يَعْتَدُونَ ۝ كَانُوا لَا يَتَنَاهَوْنَ عَن مُّنكَرٍ فَعَلُوهُ ۚ لَبِئْسَ مَا كَانُوا يَفْعَلُونَ ۝ (مائدہ ع ۱۱)

لے اس آیت کا حاصل مطلب یہ ہے کہ بنی اسرائیل پران کی نافرمانیوں اور زیادتیوں کی وجہ سے اللہ کے پیغمبر داؤد اور عیسیٰ بن مریم کی زبانوں سے لعنت ہوئی، ان کا ایک بڑا جرم یہ تھا کہ ان میں جو برائیاں رواج پا رہی تھیں وہ آپس میں ان کی روک تھام کی کوشش نہیں کرتے تھے۔

امام احمد بن حنبل کے رسالہ الصلوٰۃ وما یلزم فیہا میں (جو علامہ حافظ ابن قیم کے رسالہ کتاب الصلوٰۃ واحکام تارکہا کے ساتھ مصر میں چھپ چکا ہے) ایک حدیث نظر سے گزری جس کا مضمون یہ تھا کہ۔

قیامت میں ایک شخص اپنے پڑوسی کے خلاف اللہ تعالیٰ کی عدالت میں دعویٰ کریگا کہ اس نے میرے ساتھ خیانت کی ـــــ وہ جواب میں کہے گا یا رب وعزتک ما خنتہ فی اھلہ ولا مالہ، (قسم اللہ کی میں نے کبھی اس کے اہل کے بارہ میں خیانت کی اور نہ مال میں) مدعی کہے گا بیشک اس نے میرے اہل یا مال میں تو خیانت نہیں کی، لیکن میں اپنی غفلت وشامت سے گناہ کرتا تھا اور یہ شخص دیکھنے کے باوجود مجھے برائی سے روکنے کی کوشش نہیں کرتا تھا[1]

ناواقف عوام کو دین کی تبلیغ تعلیم وتذکیر، تواصی بالحق اور امر بالمعروف ونہی عن المنکر کی تاکید کے بارہ میں جو آیات اور احادیث کثیرہ عام طور سے معلوم اور مشہور ہیں[2]۔ ان کے علاوہ یہ دو حدیثیں بھی اس مدعا کی کس قدر واضح دلیلیں ہیں کہ ہر جگہ کے دیندار اور دین کا علم رکھنے والوں کے فرائض میں سے ہے کہ کم از کم اپنے ماحول کے ان مسلمانوں کی اصلاح اور ضروری درجہ کی دینی تعلیم وتربیت کی فکر اور کوشش کریں جو دین کی بنیادی باتوں سے بھی ناواقف ہیں اور جو محض جہالت وغفلت ہی کی وجہ سے خدا فراموشانہ زندگی گزار رہے ہیں۔

جتنا جتنا اس مسئلہ پر غور کیا جاتا ہے حیرت بڑھتی ہے کہ اس تنبیہ[illegible] سے ہم لوگ کیسے غافل ہیں ـــــ اور اپنے کو مسلمان کہنے والے اللہ کے ان ہزاروں بندوں کے متعلق ہم قیامت میں کیا جواب دے سکیں گے جو ہمارے قریب وجوار میں رہتے ہیں اور اپنی جہالت

---

[1] چونکہ اصل کتاب اس وقت پیش نظر نہیں ہے اس لئے نہ تو حدیث کا متن ہی نقل کیا جا سکا ہے اور نہ بعینہٖ لفظی ترجمہ بلکہ حافظہ میں جو مضمون تھا اپنے لفظوں میں اس کو ادا کر دیا ہے۔ انشاء اللہ کوئی معنوی فرق نہ ہوگا۔

[2] جن کا ایک اچھا خاصہ ذخیرہ مخدومنا حضرت مولانا محمد زکریا مدظلہ شیخ الحدیث سہارنپور کے رسالہ "فضائل تبلیغ" میں بھی جمع ہو گیا ہے۔

ادھر ہماری مجرمانہ غفلت کی وجہ سے ہی اللہ سے اور اس کے دین سے قطعاً بے تعلق ہو کر جی رہے اور خدا فراموشی ہی میں عمریں گنوا گنوا کے مر رہے ہیں ۔

جس دینی دعوت، اور اصلاح وتبلیغ کے جس سلسلہ کا ذکر ان صفحات میں بار بار ہوتا رہتا ہے،[1] درحقیقت وہ اسی فریضہ کی ادائیگی کی کوشش ہے اور اس کا خاص موضوع عمومی تعلیم وتربیت اور عمومی اصلاح کے ایک خاص نظام کے ذریعہ مسلمان قوم میں حقیقی ایمان اور دین کے شعور اور اس کی قدر کو عام کرنے کی کوشش کرنا ہے ۔

بار بار عرض کیا جا چکا ہے اور اب پھر عرض کیا جاتا ہے کہ اس کام کے سلسلے میں آپ کو ہماری دعوت یہ نہیں ہے کہ آپ فلاں انجمن یا فلاں جماعت سے وابستہ ہو کر یہ کام کیجئے بلکہ ہماری گزارش صرف یہ ہے کہ دین کی اس خدمت کے لئے اور اس سلسلے میں اپنا فرض ادا کرنے کے لئے کمربستہ ہو جائیے اور اللہ کے جو بندے اس کام کو کر رہے ہیں ان کے طریقہ کار کو دیکھئے پھر اگر بالفرض اس طریق عمل کے کل اجزا پر آپ کا ضمیر مطمئن نہ بھی ہو تو جتنے حصہ پر یا جس طریقہ پر آپ کو اطمینان ہو اس کو شروع کر دیجئے ۔

اس وقت دنیا بہت تیزی سے اپنا سفر طے کر رہی ہے۔ برسوں کی منزلیں دنوں میں طے ہو رہی ہیں اگر یہ وقت بھی ہم نے غفلت سے گزار دیا تو خطرہ ہے کہ مسلمانوں کی اصلاح اور دین کے احیاء کے جو امکانات اور جو سہولتیں ابھی باقی ہیں۔ بہت سے علاقوں میں وہ ختم نہ ہو جائیں ۔ العجل العجل الساعۃ الساعۃ ۔

---

[1] یہ دینی دعوت وتبلیغ کے اس کام کی طرف اشارہ ہے جو حضرت مولانا محمد الیاس رح کی طرف نسبت کیا جاتا ہے اور جس کا مرکز ۔ بستی حضرت نظام الدین اولیاء دہلی میں ہے ۔ ۱۲ ۔

حضرت مولانا محمد الیاس رحمۃ اللہ علیہ کے چند ارشادات

[حضرت رحمۃ اللہ علیہ کے مرض وفات کے آخری مہینوں میں ناچیز مدیر الفرقان حضرت کی خدمت میں رہا تھا۔ ان دنوں میں حضرت کے جو ارشادات قلمبند کئے تھے ان میں سے چند درج ذیل ہیں]

(۱) فرمایا۔ اس دینی دعوت کے سلسلے میں ہر طبقہ کے مسلمانوں سے ملنا اور ان سب کو اس طرف لانے کی سعی کرنا ضروری ہے۔ میں اپنا ایک واقعہ سناتا ہوں (اس کے بعد مولانا نے ایک مشہور عالم دین کے متعلق جو اس عصر کے بڑے عالم اور شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن رحمۃ اللہ علیہ کے ممتاز شاگردوں میں سے ہیں بتایا) کہ انھوں نے ایک دفعہ برسر عام حضرت مولانا ..... نور اللہ مرقدہٗ کے متعلق بہت ہی خراب اور بالکل ہی غلط بعض باتیں کہیں جس سے میرا بہت ہی دل دکھا، اور میری حالت یہ ہوگئی کہ میں ان کی صورت نہیں دیکھنا چاہتا تھا۔ کچھ دنوں کے بعد جب میں اس کام میں لگا ہوں تو ایک دن میرے دل میں آیا کہ ان صاحب کے متعلق میرا یہ طرز عمل ٹھیک نہیں ہے۔ آخر وہ مومن و مسلم ہیں، حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کے فیوض بھی ان کے اندر ضرور ہوں گے، قرآن مجید کے علمی انوار بھی ان کے پاس ہیں۔ جس شخص میں خیر کے اتنے پہلو ہوں اس سے اتنی دوری اختیار کر لینا خود اپنا نقصان کرنا ہے، لہٰذا خود مجھے جا کر ان کی زیارت کرنی چاہئیے۔ اور ان کے ان دینی کمالات کی وجہ سے مجھے ان کا اکرام کرنا چاہئیے اور ان کی جس بات سے میرا دل دکھا، اس میں یہ بھی احتمال ہے کہ یہ باتیں ان سے کسی دوسرے شخص نے اسی طرح کہی ہوں اور ان کی غلطی صرف اتنی ہی ہو کہ انھوں نے ان کو سچ سمجھ کے اس عام موقع پر نقل کر دیا ہو یا اسی طرح کی کوئی اور اجتہادی غلطی اس معاملہ میں ان سے ہوئی ہو۔ بہرحال یہ غلطی ایسی نہیں ہے جس کی وجہ سے ان کو اس طرح چھوڑ دینا میرے لیے درست ہو۔

(فرمایا) یہ باتیں میں نے اپنے نفس کو تنہائیوں میں بیٹھ بیٹھ کے سمجھائیں اور میری ان باتوں کے

جواب میں میرے نفس نے جو جو حجتیں پیش کیں، میں نے ان سب کو دلیلوں سے رد کیا اور "زیارت مسلم" اور "اکرام مسلم" پر جن جن اجروں کی بشارتیں نصوص میں وارد ہوئی ہیں، میں نے ان کو یاد کیا اور اپنے نفس کو یاد دلایا اور بالآخر خود ان کے پاس جانے کا ارادہ کر لیا۔

پھر مجھے اس میں تردد ہوا کہ مجھے اس وقت ان کے پاس صرف شرعی زیارت ہی کی نیت سے جانا چاہیے یا اپنی دعوت پیش کرنے کا بھی قصد کرنا چاہیے (یعنی ان دونوں صورتوں میں سے کونسی اَولیٰ اور احب الی اللہ ہے) ـــــ بالآخر میں نے یہ طے کیا کہ "زیارت" اور "دعوت" کی مستقل مستقل نیت کر کے مجھے ان کی خدمت میں حاضر ہونا چاہیے۔ اس میں انشاء اللہ دونوں چیزوں کا پورا پورا ثواب ملے گا۔ چنانچہ میں نے ایسا ہی کیا اور یہ ملاقات پھر بہت ہی برکتوں اور بہت سے فائدوں کا ذریعہ بنی۔

---

(۲) اسی سلسلۂ کلام میں فرمایا ـــــ ہمارے بعض خاص حضرات میرے اس رویہ سے ناراض ہیں کہ میں اس دینی کام کے سلسلے میں ہر طرح اور ہر وضع کے لوگوں اور مسلمانوں کے ہر گروہ کے آدمیوں سے ملتا ہوں اور ملنا چاہتا ہوں اور اپنے لوگوں سے بھی ان کے ساتھ ملنے جلنے کو کہتا ہوں، لیکن میں اپنے حضرات کی اس ناراضی کو سہنا اور ان کو معذور قرار دیتے ہوئے ان کو بھی اسی طرف لانے کی پوری سعی کرتے رہنا "شکر و احسب" کا ایک جز سمجھتا ہوں۔

چو حق بر تو پاشد تو بر خلق پاش

ان حضرات کا خیال ہے کہ یہ طرز عمل حضرت نور اللہ مرقدہٗ کے طریقہ اور مذاق کے خلاف ہے لیکن میرا یہ کہنا ہے کہ جس چیز کا دین کے لیے نافع اور نہایت مفید ہونا دلائل اور تجربہ سے معلوم ہو گیا اس کو صرف اس لیے اختیار نہ کرنا کہ ہمارے شیخ نے یہ نہیں کیا، بڑی غلطی ہے شیخ شیخ ہی تو ہے خدا تو نہیں ہے۔

---

(۳) فرمایا ـــــ اس دینی کام (تبلیغ دین اور اصلاح امت کی عوامی تحریک) کی طرف مجھے متوجہ کرنا اللہ تعالیٰ کی ایک خاص تائید ہے۔ اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے مجھے کچھ ایک خصوصیات حاصل تھیں کہ جن بعض اکابر کو میرے اس کام کے متعلق پوری معلومات نہ ہونے کی وجہ سے کبھی کچھ شکوک بھی ہوئے تو انھوں نے بھی میری وجہ سے سکوت اختیار کیا اور اپنے اختلاف

رائے کو ظاہر نہیں فرمایا۔ میری دو خصوصیات یہ رہیں: ایک تو یہ کہ میری نیازمندی کا تعلق اپنے زمانہ کے سب ہی بزرگوں سے رہا اور الحمد للہ سب کی عنایات، اور سب کا اعتماد مجھے حاصل رہا۔ دوسرے یہ کہ میرے والد ماجد ایک عالی مرتبہ اور متفق علیہ بزرگ تھے اور باہم بہت سے اختلافات رکھنے والے اہل دین کے مختلف طبقے ان پر متفق تھے۔ تیسرے یہ کہ میرا خاندان ایک خاص اثر اور عزت و وجاہت رکھنے والا خاندان تھا۔

---

(۴) فرمایا ــــــ علماء حق کو میرا یہ پیغام ادب واحترام کے ساتھ پہنچا دو کہ آپ لوگوں کو میری اس تحریک کے متعلق جو حسن ظن یا کچھ توجہ ہوئی ہے تو وہ ان بجائے ان پڑھ میواتیوں کے بیان کرنے یا ان میں کچھ اصلاحی تغیر کے مشاہدہ سے ہوئی ہے جو پہلے گوبر تک پوجتے تھے اور اس لیے اگلے مشرکوں سے بھی گھٹیا تھے۔ (کیونکہ وہ تو خوبصورت مورتیوں اور چکدار پتھروں ہی کو پوجا کرتے تھے) تو ایسے گرے ہوئے لوگوں کی طبیعت رسانی یا مشاہدے سے کام کا صحیح اندازہ کیونکر ہو سکتا ہے۔ آپ جیسے حضرات اگر براہ راست مجھ سے مل کر اس کام کو سمجھیں تو اصل قدر و قیمت معلوم ہو۔

---

(۵) ــــــ ہماری اس تحریک کا ایک خاص مقصد یہ ہے کہ مسلمانوں کے سارے جذبات پر دین کے جذبہ کو غالب کر کے اور اس راستہ سے مقصد کی وحدت پیدا کر کے اور اکرام مسلم کے اصول کو رواج دے کے پوری قوم کو اس حدیث کا مصداق بنایا جائے المسلمون کجسد واحد۔

---

(۶) فرمایا ــــــ ہمارے اس کام میں اخلاص اور صدق دلی کے ساتھ اجتماعیت اور شُوْرٰى بَيْنَهُمْ کی (یعنی مل جل کر اور باہمی مشورے سے کام کرنے کی) بڑی ضرورت ہے اور اس کے بغیر بڑا خطرہ ہے۔

---

(۷) بعض خدام کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا ــــــ حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ حضرت ابو عبیدہ اور حضرت معاذ سے فرماتے تھے کہ میں تمہاری نگرانی سے مستغنی نہیں ہوں، میں بھی آپ لوگوں سے یہی کہتا ہوں کہ میرے احوال پر نظر رکھنے اور جو بات ٹوکنے کی ہو اس پر ٹوکئے۔

(۸) فرمایا ــــ حضرت فاروق اعظم کے عاملوں کے پاس سے جب کوئی قاصد آتے تو آپ اُن سے عاملوں کی خیریت پوچھتے اور ان کے حالات دریافت کرتے لیکن اس کا مطلب دینی خیریت اور دینی حال پوچھنا ہوتا تھا نہ کہ آج کل کی مروجہ مزاج پرسی، چنانچہ ایک عامل کے پاس سے آنے والے قاصد سے جب آپنے عامل کی خیریت پوچھی تو اس نے کہا وہاں خیریت کہاں ہے، میں نے تو ان کے دسترخوان پر دو دو سالن جمع دیکھے۔ گویا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جس طرز زندگی پر صحابہ کرام کو چھوڑ گئے تھے بس اس پر قائم رہنا ہی ان حضرات کے نزدیک خیریت کا معیار تھا۔

---

(۹) فرمایا ــــ اللہ سے اس کا فضل اور رزق وغیرہ مانگنا تو فرض ہے اور اپنی عبادت و خدمت وغیرہ کا دنیا ہی میں معاوضہ چاہنا ناجائز ہے۔

---

(۱۰) فرمایا ــــ کسی مسلمان کو اس کی بے راہ روی کی وجہ سے قطعی طور سے کافر کہنا اور خلود فی النار والی تکفیر کرنا بڑا بھاری کام ہے۔ ہاں "کفرٌ دونَ کفر" کا اصول صحیح ہے تمام معاصی کفر ہی کے فروع اور اس کی اولاد ہیں اور اسی طرح تمام معروفات ایمان کی آل اولاد ہیں، پس ہماری یہ تحریک درحقیقت تجدید ایمان اور تکمیل ایمان کی تحریک ہے۔

---

(۱۱) فرمایا ــــ اِتَّخَذُوْا دِیْنَهُمْ لَعِبًا وَّلَهْوًا: دینی کاموں کو بے مقصد یا اطاعت امرالہی و رضاء خداوندی اور ثواب اخروی کے سوا اور مقاصد کے لیے کرنا بھی دین کو لہو و لعب بنانا ہے۔

---

(۱۲) فرمایا ــــ ظُنُّوا الْمُؤْمِنِیْنَ خَیْرًا "اور" ان حسن الظن من العبادة" کا حکم اس حالت میں ہے جب کسی سے کوئی معاملہ کرنا نہ ہو، تو اس وقت صرف حسن ظن ہی سے کام لینا چاہئیے۔ اور جب معاملہ کرنا ہو تو اس وقت کے لئے "الحزم سوء الظن" کا حکم ہے، محامل اور مواقع کا فرق نہ سمجھنے سے نفوس میں بڑی غلط فہمیاں ہو جاتی ہیں۔

(۱۴) فرمایا ہمارے سب کام کرنے والوں کو یہ بات اچھی طرح ذہن نشین کر لینی چاہیئے کہ تبلیغ کے لیے باہر جانے کے زمانہ میں بالخصوص علم اور ذکر کی طرف بہت زیادہ توجہ کریں، علم اور ذکر میں ترقی کے بغیر دینی ترقی ممکن نہیں، نیز علم اور ذکر کی تحصیل و تکمیل اس راہ کے اپنے بڑوں سے وابستگی رکھتے ہوئے اور ان کے زیر ہدایت اور ان کی نگرانی میں ہو۔ انبیاء علیہم السلام کا علم و ذکر اللہ تعالیٰ کے زیر ہدایت اور اس کے حکم کے ماتحت ہوتا تھا۔ اور حضرات صحابہ کرام کا علم و ذکر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہدایت کے ماتحت اور آپ کی نگرانی میں ہوتا تھا، پھر ہر زمانہ کے لوگوں کے لیے اس قرن کے اہل علم اور اہل ذکر گویا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خلفاء ہیں۔ لہذا علم و ذکر میں اپنے بڑوں کی نگرانی سے استغنا نہیں۔

یہ بھی ضروری ہے کہ خاص کر باہر نکلنے کے زمانہ میں صرف اپنے خاص مشاغل میں اشتغال رہے اور دوسرے تمام مشاغل سے یکسو رہا جائے اور وہ خاص مشاغل یہ ہیں تبلیغی گشت، علم و ذکر، دین کے لیے گھر چھوڑ کر نکلنے والے، اپنے ساتھیوں کی خصوصاً اور عام خلق اللہ کی عموماً خدمت کی مشق، تصحیح نیت اور اخلاص و احتساب کا اہتمام اور اتہام نفس کے ساتھ بار بار اس اخلاص و احتساب کی تجدید، یعنی اس کام کے لیے نکلتے وقت بھی یہ تصور کرنا اور اثنا سفر میں بھی بار بار اس تصور کو تازہ کرتے رہنا کہ ہمارا یہ نکلنا صرف اللہ کے لیے اور ان نعمائے آخرت کی طمع میں ہے۔ جن کا وعدہ دین کی نصرت و خدمت پر اور اس راہ کی تکلیفیں اٹھانے پر فرمایا گیا ہے یعنی بار بار اس دھیان کو دل میں جمایا جائے کہ اگر میرا یہ نکلنا خالصاً مخلصاً ہو گیا اور اللہ تعالیٰ نے اس کو قبول فرما لیا تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے مجھے وہ نعمتیں ضرور ملیں گی جن کا وعدہ اس کام پر قرآن پاک اور احادیث میں فرمایا گیا ہے اور وہ یہ یہ ہوں گی۔ بہرحال ان الٰہی وعدوں پر یقین اور ان کی امید کے دھیان کو بار بار تازہ کیا جائے اور اپنے سارے عمل کو اسی یقین اور اسی دھیان سے باندھا جائے، بس اسی کا نام "ایمان و احتساب" ہے اور یہی ہمارے اعمال کی روح ہے۔

---

(۱۵) فرمایا ــــــ ہائے اللہ کے وعدوں پر یقین نہیں رہا، اللہ کے وعدوں پر یقین اور اعتماد پیدا کرو اور پھر اس یقین و اعتماد ہی کی بنیاد پر کام کرنے کی مشق کرو۔ اور اللہ کے وعدوں کے معنی بھی خود نہ گھڑو، تمہارا علم اور تجربہ بہت محدود ہے، اس کے وعدوں کا مطلب اس کی شان کے

مطابق سمجھو اور اس سے یہی مانگو کہ اپنی شان اور اپنی قدرت کے شایان ان وعدوں کو پورا فرما' اخروی نعمتوں کی نوعیت اور اصل حقیقت کا تم اس دنیا میں کیا اندازہ کر سکتے ہو اور کیونکر وہ اندازہ صحیح ہو سکتا ہے. جب کہ حدیث قدسی میں ان نعمتوں کی صفت ہی یہ بیان کی گئی ہے۔

لاعین رأت ولا اذن سمعت ولاخطر علی قلب بشر (یعنی جنت میں ایسی نعمتیں ہیں جو نہ تو کسی آنکھ نے دیکھی ہیں اور نہ کسی کان نے ان کا حال سنا ہے اور نہ کسی انسان کے دل میں کبھی ان کا خیال آیا ہے)

افسوس! ہم نے اس کی موعود نعمتوں کو اپنے علم و فہم اور اس دنیا کے اپنے مشاہدہ اور تجربہ کے مطابق سمجھ کر اور اس کی امید باندھ کے بڑا گھاٹا کر لیا" لقد حجرتم واسعاً " اس کی عطا اور اس کی داد و دہش تو اس کے شایان شان ہو گی۔"

---

(۱۵) فرمایا ـــــ تم نے "ماخلقت الجن والانس الا لیعبدون" کے تقاضے سے جس قدر انحراف کیا' اسی قدر خلقنا لکم مافی السمٰوٰت والارض کا ظہور کم ہو گیا جس نسبت سے تمھاری عبدیت میں کمی آئی اسی نسبت سے زمین و آسمان کی کائنات سے تمھارا تمتع (نفع حاصل کرنا) کم ہو گیا. کائنات کو تمھارا خادم اسی لیے بنایا گیا تھا کہ تم اللہ تعالیٰ کا کام کرو اور اس کی اطاعت و بندگی اور اس کی مرضیات کے فروغ میں لگے رہو، جب تم نے اپنا یہ فریضہ چھوڑ دیا تو زمین و آسمان بھی تم سے پھر گئے۔"

ہر قسم کے اسلحہ
کی خرید و فروخت کے لئے
رابطہ قائم کیجئے —
الٰہی بخش اینڈ کمپنی
(قائم شدہ ۱۸۲۵ء)
تاجران اسلحہ و کارتوس
اور متعلقہ سامان
۹- لاٹوش روڈ، لکھنؤ
فون: دوکان — ۲۲۵۰۸
رہائش — ۲۲۹۲۴
ٹیلی گرام
"EBCO"
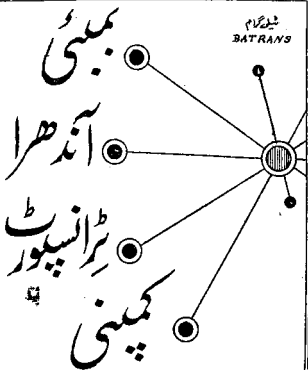
ٹیلی گرام
BATRANS
بمبئی
آندھرا
ٹرانسپورٹ
کمپنی
ٹرانسپورٹ کنٹریکٹرس
ٹیلی فون نمبر
320169
322027
۱۱۳- بھنڈاری اسٹریٹ۔ بمبئی نمبر ۳

کیا ابھی وقت نہیں آیا

کہ مسلمان اپنے طریق کار پر از سر نو غور کریں

ہندوستان کی سیاست جس رُخ پر نہایت تیز رفتاری سے جا رہی ہے اور اس سے جو نئے نئے حالات پیدا ہو رہے ہیں اور اس ملک کے بالخصوص مسلم اقلیت والے صوبوں میں مسلمانوں کا مسئلہ جس قدر نازک اور ان کا مستقبل جس قدر بھیانک ہوتا جا رہا ہے اس سے ہر با خبر اور صاحب فہم و فکر مسلمان کسی نہ کسی درجہ میں پریشان ہے اور مسلمانوں کے قومی مسائل سے تعلق و دلچسپی رکھنے والی مختلف جماعتیں اپنی اپنی صوابدید کے مطابق ان مشکلات کو حل کرنے اور ان پر قابو پانے کے لئے مصروف جد و جہد بھی ہیں۔

—— لیکن خیالات و نظریات کے بڑے بڑے اختلافات کے باوجود ان سب کے طرز فکر اور طریق کار میں ایک عجیب وحدت اور یکسانیت بھی ہے اور وہ یہ کہ سب کے سب معاملہ پر صرف مادی پہلو ہی سے غور کرتے ہیں اور اس لئے جو کوششیں بھی اس سلسلہ میں ہماری مشہور اور قابل ذکر قومی جماعتوں کی طرف سے ہو رہی ہیں وہ سب مادی تدبیروں ہی کی مختلف صورتیں ہیں اور بلا خوف تردید کہا جا سکتا ہے کہ اگر بالفرض اس ملک کی کسی دوسری قوم کو (جو خدا سے بالکل نا آشنا اور ایمان کی دولت سے محروم ہو بلکہ جو دشمن دین و ایمان ہو) ایسے حالات پیش آ جائیں جو اس وقت ہم مسلمانوں کو در پیش ہیں تو یقیناً وہ قوم بھی وہی سب کچھ کرے گی جو ہماری قومی اور سیاسی جماعتیں عام طور سے اس وقت کر رہی ہیں اور اس کی پالیسی بالکل وہی ہوگی جو آج ہماری ہے۔ الغرض یہ بات خواہ کتنی ہی رنج و افسوس کے قابل ہو اور ہمارے قومی کارکنوں کو خواہ کتنی ہی کڑوی لگے مگر یہ ایک غیر مشتبہ حقیقت اور ناقابل انکار واقعہ ہے کہ ہماری قومی اور سیاسی پالیسی کا رشتہ انبیاء علیہم السلام کی رہنمائی سے گویا کہ کٹ چکا ہے اور کم از کم زندگی کے اس نہایت اہم شعبہ میں ہم دنیا کی خدا فراموش اور مادہ پرست قوموں کے پورے پورے پیرو ہو گئے ہیں۔ انہی کی طرح سوچتے ہیں اور انہی کے نقش قدم پر چلتے ہیں ——

اگر صاف گوئی سے آپ کے دل پر چوٹ لگے یا اس حقیقت میں آپ کو کوئی شک شبہ ہو تو للہ تھوڑی دیر کے لئے دل و دماغ کو ماحول کے اثرات اور جذبات سے صاف کر کے ہماری مندرجہ ذیل گزارشات پر غور کیجئے

ساری دنیا کی خدا ناآشنا قوموں اور نبوت کی روشنی سے محروم تمام طبقوں کا طریقہ یہ ہے کہ ان پر جو حالات آتے ہیں اور دنیا میں جو انقلابات برپا ہوتے رہتے ہیں وہ ان کا کوئی خاص تعلق اللہ کے ارادہ اور مشیت سے نہیں سمجھتے اور اس دنیا میں اللہ تعالیٰ کے جو خاص قوانین کارفرما ہیں (مثلاً قانون تکوین، قانون ابتلاء، قانون مکافات وغیرہ وغیرہ) وہ چونکہ ان کو بالکل نہیں جانتے، اور اس عالم کے تمام چھوٹے بڑے واقعات کو وہ سلسلۂ اسباب ظاہری کا نتیجہ سمجھتے ہیں اس لئے صرف ظاہری تدبیروں اور مادی کوششوں ہی سے ان کا مقابلہ کرتے ہیں —— مثلاً ان میں سے کسی قوم پر کوئی دوسری طاقت اگر حملہ کردے اور اس کو شکست دے کے اس کے ملک پر قبضہ کرلے تو اس کے زعماء اور مفکرین اس سانحہ پر صرف اس طرح سے غور کریں گے کہ ہمارے دشمن کی فوجیں تعداد میں ہم سے زیادہ اور زیادہ منظم اور زیادہ تربیت یافتہ تھیں، ان کے پاس سامان جنگ ہم سے زیادہ اور ہم سے بہتر تھا، بحری، بری اور ہوائی ذرائع رسل و رسائل میں ان کو برتری اور فوقیت حاصل تھی۔ میدان جنگ جغرافیائی حیثیت سے دشمن کے لئے سازگار اور ہمارے لئے ناسازگار تھا وغیرہ وغیرہ۔

الغرض دنیا کی تمام خدا ناشناس قومیں اپنی مغلوبیت اور شکست کے اسباب و وجوہ پر صرف اس طرح سے غور کرتی ہیں اور اس لئے اُن کی جد و جہد صرف ظاہری تدبیروں، اسباب و وسائل کی تیاریوں اور مادی کوششوں ہی میں منحصر رہتی ہے —— اور کون باخبر اور حقیقت شناس اس سے انکار کرسکتا ہے کہ اس وقت ہم مسلمانوں کی قومی پالیسی بھی اصولاً بالکل یہی ہے یہی ہمارے قائدین کا طرز فکر ہے اور یہی طریق عمل ہے اور ظاہر ہے کہ انبیاء علیہم السلام کا بتلایا ہوا طریقہ اس سے بالکل اور بنیادی طور پر مختلف ہے، ان کے فکر و نظر کا اولین اور اساسی نقطہ یہ ہے کہ اس دنیا میں جو کچھ ہوتا ہے اور کسی فرد یا کسی قوم پر جو اچھے برے حالات آتے ہیں اگرچہ بظاہر وہ سلسلۂ اسباب ہی کے راستہ سے آتے ہیں لیکن درحقیقت وہ سب ایک علیم و خبیر اور حکیم و بصیر قادر مطلق ہستی کے حکم سے آتے ہیں لہٰذا دنیا کے ہر واقعہ کے متعلق ہمیں یہی یقین رکھنا چاہئے، اسی کی بنیاد پر سوچنا اور اسی کے مطابق طریق کار اختیار کرنا چاہیے کہ یہ اللہ کی طرف سے ہے اور اس کو باقی رکھنا یا ختم کردینا یا بدل دینا صرف اسی کے دست قدرت میں ہے اور وہ اگر چاہے تو ظاہری اسباب و وسائل کی ناساعدت کے باوجود سب کچھ کرسکتا ہے وہ اسباب و وسائل کی کمی اور کمزوری کی تلافی اپنی غیبی مدد سے کرکے بہتوں کے مقابلہ میں تھوڑوں کو، زورآوروں کے مقابلہ میں کمزوروں کو، اسباب و وسائل میں برتری رکھنے والوں کے مقابلہ میں بے وسیلوں اور بے ساز و سامان ہے تو انہوں کو اپنی خاص مدد سے کامیاب کرسکتا ہے اور اس بارہ میں اس کی خاص سنت

اور خاص قانون ہے۔

اور انبیاء علیہم السلام کی سچائی اور رہنمائی پر ایمان و یقین رکھنے والوں اور ان کے طریقہ پر کام کرنے والوں نے بارہا اس دنیا میں اللہ تعالیٰ کے اس خاص "قانون نصرت" کا تجربہ بھی کیا ہے ـــــ قرآن مجید میں حضرات انبیاء علیہم السلام اور ان کے زور آور اور سرکش مخالفوں اور فرعون و نمرود جیسے طاقتور حکمرانوں کے جو واقعات بیان کئے گئے ہیں وہ "درحقیقت اسی سنت اللہ کی مثالیں ہیں۔

لیکن اللہ تعالیٰ کی اس سنت امداد و نصرت کی کارفرمائی کے لئے کچھ اصول اور شرائط ہیں جن کا تعلق عقائد و خیالات، اعمال و اخلاق، سیرت و کردار غرض انسان کی پوری زندگی سے ہے اور جس کا ایک مختصر اور جامع عنوان "ایمان والی زندگی" ہے تو اگر کوئی قوم اور امت اجتماعی طور پر ان اصول پر کاربند ہو جائے اور انھیں اصولوں کے ماتحت جد و جہد کرے تو اللہ تعالیٰ اس کے ساتھ یہ اختصاصی معاملہ کرتا ہے کہ تعداد میں کمی اور اسباب و وسائل میں کمزوری کے باوجود اپنی غیبی مدد سے اس کو کامیاب و فتح مند کر کے اس دنیا میں بھی عزت و سربلندی کا مقام عطا فرما دیتا ہے۔

لیکن پھر اس کا دوسرا رخ یہ بھی ہے کہ اگر یہ قوم کسی وقت اس راہ سے منحرف ہو جائے اور اس کا طرز زندگی بدل جائے تو پھر اس کے ساتھ اللہ تعالیٰ کا معاملہ بھی بدل جاتا ہے اول اول تو اس کو متنبہ کرنے اور چونکانے کے لئے اس پر مصیبتیں بھیجی جاتی ہیں، دکھوں اور تکلیفوں میں مبتلا کیا جاتا ہے لیکن اگر وہ ان تنبیہی کارروائیوں سے بھی کوئی سبق نہ لے اور اپنے حال کو درست نہ کرے تو پھر اس کے لئے دنیا میں مستقل ذلت و پستی اور تباہ حالی کا فیصلہ کر دیا جاتا ہے (یہودیوں کے متعلق قرآن مجید نے جو کچھ فرمایا ہے وہ اسی سنت اللہ کی مثال ہے)

بہرحال دنیا میں رونما ہونے والے واقعات اور قوموں کے اچھے برے حالات بالخصوص کتاب و پیغمبر سے وابستگی رکھنے والی امتوں کے عروج و زوال کے متعلق یہ ہے انبیاء علیہم السلام کے طرز فکر اور طریق کار کا اولین اور اساسی نقطہ ـــــ بیشک وہ ترک اسباب اور ترک تدابیر کی تعلیم نہیں دیتے بلکہ حدود اللہ کے اندر تمام ممکن اسباب و تدابیر کے استعمال کا اور استطاعت کی آخری حد تک جد و جہد کا سبق دیتے ہیں لیکن اللہ تعالیٰ کی قدرت کو ان اسباب سے بالاتر اور اس کے ارادہ اور مشیت کو اصل کار فرما یقین کرتے ہیں اور اس لئے اس کی رضا جوئی اور اس کی خاص مدد کے استحقاق کو سب سے بڑی اور بنیادی تدبیر اور اصل فیصلہ کن کوشش سمجھتے ہیں۔

انبیاء علیہم السلام کے بتلائے ہوئے اس طرز فکر و طریق کار کو اور زیادہ مفصل اور واضح طور پر سمجھنے کے لئے قرآن مجید کی مندرجہ ذیل آیات پر غور کیجئے ا۔

(۱) قُلِ اللّٰهُمَّ مٰلِكَ الْمُلْكِ تُؤْتِی الْمُلْكَ مَنْ تَشَآءُ وَتَنْزِعُ الْمُلْكَ مِمَّنْ تَشَآءُ وَتُعِزُّ مَنْ تَشَآءُ وَتُذِلُّ مَنْ تَشَآءُ بِيَدِكَ الْخَيْرُ اِنَّكَ عَلٰى كُلِّ شَیْءٍ قَدِيْرٌ۔ (آل عمران ع ۳)

کہو اے اللہ ملک وبادشاہت کے حقیقی مالک! تو جسے چاہے ملک دے اور جس سے چاہے ملک لے لے جسے چاہے عزت دے اور جس کو چاہے ذلت دے تیرے ہی قبضہ میں ہے ہر بھلائی تو بیشک ہر چیز پر پوری پوری قدرت رکھتا ہے۔

(۲) اِنْ يَّنْصُرْكُمُ اللّٰهُ فَلَا غَالِبَ لَكُمْ وَاِنْ يَّخْذُلْكُمْ فَمَنْ ذَا الَّذِیْ يَنْصُرُكُمْ مِّنْ بَعْدِهٖ وَعَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ ۝ (آل عمران ع ۱۷)

اگر اللہ تمھاری مدد کرے تو کوئی تم پر غالب نہ ہوسکے اور اگر وہ تمھاری مدد نہ کرے تو پھر کون ہے جو اسکے بعد تمھاری مدد کرسکے اور اللہ ہی پر اعتماد اور توکل کرنا چاہیئے ایمان والوں کو۔

(۳) مَا يَفْتَحِ اللّٰهُ لِلنَّاسِ مِنْ رَّحْمَةٍ فَلَا مُمْسِكَ لَهَا وَمَا يُمْسِكْ فَلَا مُرْسِلَ لَهٗ مِنْ بَعْدِهٖ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ۝ (فاطر ع ۱)

اللہ جس رحمت کا دروازہ لوگوں کیلئے کھولے تو پھر کوئی اس کو روکنے والا نہیں اور وہ جس نعمت کو روک لے تو پھر کوئی اس کو بھیجنے والا نہیں اور وہ بڑے زور والا اور حکمت والا ہے۔

(۴) اِنَّمَآ اَمْرُهٗۤ اِذَآ اَرَادَ شَيْـًٔا اَنْ يَّقُوْلَ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ فَسُبْحٰنَ الَّذِیْ بِيَدِهٖ مَلَكُوْتُ كُلِّ شَیْءٍ وَّاِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ ۝ (یٰسٓ ع ۵)

اس کا معاملہ تو بس یہ ہے کہ جب وہ کسی چیز کو کرنا چاہتا ہے تو اس کو کہتا ہے کہ ہوجا بس وہ ہو جاتی ہے بس پاک ہے وہ ذات جس کے قبضہ میں ہر چیز کی بادشاہی اور فرمانروائی ہے اور تم سب مرنے کے بعد اسی کی طرف لوٹو گے۔

(۵) وَكَمْ مِّنْ فِئَةٍ قَلِيْلَةٍ غَلَبَتْ فِئَةً كَثِيْرَةًۢ بِاِذْنِ اللّٰهِ وَاللّٰهُ مَعَ الصّٰبِرِيْنَ ۝ (بقرہ ع ۳۳)

اور کتنی ہی چھوٹی جماعتیں غالب آئی ہیں بڑی جماعتوں پر اور اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔

ان آیات میں بتلایا گیا ہے کہ کسی فریق کو حکومت دے کر بالاتر کر دینا اور کسی سے حکومت چھین کے بالاتری کے مقام سے اس کو گرا دینا، کسی کو عزت اور برتری دینا اور کسی کو ذلیل اور پست کر دینا سب اللہ ہی کے حکم اور ارادہ سے ہوتا ہے اور ہر بھلائی اسی کے اختیار میں ہے اور اس کو سب کچھ کرنے کی قدرت حاصل ہے آج اس نے جس کو اونچا کیا ہے وہ کل اس کو نیچا بھی کر سکتا ہے اور جس کو آج اس نے

پھر دیا ہو وہ اس دینے کے بعد چھین لینے اور چھین لینے کے بعد پھر عطا فرا دینے پر بھی قدرت رکھتا ہو۔ (۲) اور اگر وہ تمھاری مدد کرنا چاہے تو پھر دنیا کی کوئی بڑی سے بڑی طاقت تمھاری کامیابی کو نہیں روک سکتی ــــ (۳) وہ اگر کسی کو اپنے انعام و رحمت سے نوازنا چاہے تو کسی کی ہستی نہیں جو اس میں حائل ہو سکے ــــ (۴) وہ تمھارے سارے اسباب و وسائل سے بے نیاز ہو۔ اس کی مشیت کا ایک ادنیٰ اشارہ اور بس اس کا ارادہ ہی سب کچھ کرنے سکتا ہو سب کچھ اس کے اختیار میں ہو ــــ (۵) بارہا اس دنیا میں ایسا ہوا ہو کہ اس کے حکم و ارادہ سے اور اس کی غیبی مدد سے بہت تھوڑے سے آدمیوں نے بہت بڑی بڑی فوجوں کو شکست دیدی ہو۔

اللہ تعالیٰ کی قدرت اور اس دنیا میں اس کے ارادہ اور مشیت کی کارفرمائی اور کسی کو حکومت دینے اور کسی سے حکومت چھین لینے اور اپنی مدد سے جس کو چاہے اس کو غالب کر دینے کے بارہ میں اللہ تعالیٰ کی یہ شان بیان فرمانے کے ساتھ ساتھ قرآن کریم یہ بھی صاف صاف بتلاتا ہو کہ اللہ تعالیٰ کی یہ خاص غیبی مدد کیونکر حاصل ہوتی ہو اور اس کی خصوصی عنایات اور فضل و رحمت اور تائید و نصرت کے استحقاق کے کیا اصول اور کیا شرائط ہیں ــــ مندرجہ ذیل آیات کو غور سے پڑھیئے:۔

(۱) وَلَا تَهِنُوا وَلَا تَحْزَنُوا وَأَنْتُمُ الْأَعْلَوْنَ إِنْ كُنْتُمْ مُؤْمِنِينَ (آل عمران ع ۱۴)	اور اپنی کمزوری اور اسباب و وسائل کی کمی کے خیال سے ہمت نہ ہارو اور ان ابتک تم پر جو گزر چکی اسکا غم نہ کرو اور تم ہی بالاتر ہوگے اگر تم ہو ایمان والے۔[1]
(۲) وَكَانَ حَقًّا عَلَيْنَا نَصْرُ الْمُؤْمِنِينَ (الروم ع ۵)	اور حق ہو ہم پر مدد ایمان والوں کی۔

---

[1] واضح رہے کہ قرآن و سنت کی خاص اصطلاح میں مومنین سے مراد اللہ کے وہ خاص بندے ہوتے ہیں جو اللہ تعالیٰ کی لاشریک الوہیت اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت پر ایمان لائیں اور اس ایمان کے تقاضوں کے مطابق زندگی گزاریں ــــ لیکن جو لوگ اپنے کو مسلمان کہیں اور اپنی زندگیوں کو اللہ و رسول کے احکام کے تابع نہ بنائیں (جیسا کہ آج کل اکثر مسلمانوں کا حال ہو) تو قرآن کی وسیع اصطلاح میں ایسوں کا نام "منافق" ہے پس موجودہ مسلمان قوم کو "مومنین" کا مصداق سمجھ کر اس جیسی آیات کے وعدوں کا مستحق سمجھنا محاورات قرآن سے نا واقفی ہو موجودہ مسلمان قوم تو اپنی اکثریت کے اعتبار سے ان آیات قہر کی مصداق ہو جن میں دین سے بے اعتنائی برتنے والوں اور خدا و رسول کی نافرمانی کرنے والوں کو دنیا و آخرت میں ذلت و خواری کی سزا دینے کا اعلان فرمایا گیا ہو۔ اس نکتہ کو اچھی طرح سمجھ لینا چاہیے۔

(۳) إِنَّ اللّٰهَ يُدَافِعُ عَنِ الَّذِينَ آمَنُوا إِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ كُلَّ خَوَّانٍ كَفُورٍ (الحج ع ۵)

یقیناً اللہ تعالیٰ دفاع کرے گا ایمان والے بندوں کی طرف سے (یعنی ان کی حمایت کرے گا دشمنوں کے مقابلہ میں) اللہ تعالیٰ خیانت کرنے والو اور نہ ماننے والوں کو نہیں چاہتا۔

(۴) وَلَيَنصُرَنَّ اللّٰهُ مَن يَنصُرُهُ إِنَّ اللّٰهَ قَوِيٌّ عَزِيزٌ (الحج ع ۶)

اور یقیناً اللہ تعالیٰ مددگار ہوگا ان بندوں کا جو اس کے دین کی مدد کریں، بےشک اللہ تعالیٰ قوت اور غلبہ والا ہے۔

(۵) فَأَقِيمُوا الصَّلٰوةَ وَآتُوا الزَّكٰوةَ وَاعْتَصِمُوا بِاللّٰهِ هُوَ مَوْلَاكُمْ فَنِعْمَ الْمَوْلَىٰ وَنِعْمَ النَّصِيرُ (الحج ع ۱۰)

پس قائم کرو نماز اور ادا کرتے رہو زکوٰۃ اور مضبوطی کے ساتھ وابستہ ہو جاؤ اللہ سے وہ تمہارا کارساز ہے پس بڑا اچھا کارساز اور بڑا اچھا مددگار ہے۔

(۶) وَقَالَ اللّٰهُ إِنِّي مَعَكُمْ لَئِنْ أَقَمْتُمُ الصَّلٰوةَ وَآتَيْتُمُ الزَّكٰوةَ وَآمَنتُم بِرُسُلِي وَعَزَّرْتُمُوهُمْ وَأَقْرَضْتُمُ اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا (المائدہ ع ۳)

اور اللہ نے فرمایا ہے میں تمہارے ساتھ ہوں (یعنی میرا فضل اور میری مدد تمہارے ساتھ ہے) اگر تم قائم کرتے رہو نماز اور ادا کرتے رہو زکوٰۃ اور ایمان لاؤ میرے رسولوں پر اور ان کی تعظیم و توقیر کرتے رہو اور (اپنا مال و دولت) اللہ کے کاموں (اور دین کی ضرورتوں) میں خرچ کرتے رہو۔

(۷) وَمَن يُطِعِ اللّٰهَ وَرَسُولَهُ وَيَخْشَ اللّٰهَ وَيَتَّقْهِ فَأُولٰئِكَ هُمُ الْفَائِزُونَ (النور ع ۷)

اور جو اطاعت کریں اللہ کی اور اللہ کے رسول کی اور ڈریں اللہ سے اور بچیں اس کی نافرمانی سے تو وہی کامیاب ہوں گے۔

(پھر ان آیتوں میں اس مضمون کو اور زیادہ مؤکد فرمانے کے بعد ارشاد فرمایا گیا ہے)

(۸) وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِينَ آمَنُوا مِنكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْأَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِينَ مِن قَبْلِهِمْ وَلَيُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِينَهُمُ الَّذِي ارْتَضَىٰ لَهُمْ وَلَيُبَدِّلَنَّهُم مِّن بَعْدِ

اللہ کا وعدہ ہے ان سے جو ایمان لاویں تم میں سے اور نیک اعمال کریں، ان کو ضرور زمین میں حکومت دیگا جیسا کہ ان سے پہلوں کو حکومت بخشی تھی اور ان کے لئے ان کے اس دین (اسلام) کو قوت دیگا جو اس نے ان کے لئے پسند کیا ہے اور ان کے خوف کے

خَوْفِهِمْ أَمْنًا ۚ (النور ع ۷)

خطر کو امن و اطمینان سے بدل دیگا۔

(۹) اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَكَانُوْا يَتَّقُوْنَ لَهُمُ الْبُشْرٰى فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَفِي الْاٰخِرَةِ ۚ لَا تَبْدِيْلَ لِكَلِمٰتِ اللّٰهِ ۚ ذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ۝ (النحل رکوع ۴)

جو لوگ ایمان لاویں اور تقویٰ اختیار کریں ان کے لئے (اچھی انعام والی زندگی کی) بشارت ہے دنیا میں اور آخرت میں، اللہ کی باتیں یقیناً پوری ہونے والی اور اٹل ہیں، دنیا اور آخرت میں یہ انعام والی زندگی ملنا، یہ بڑی کامیابی ہو۔

(۱۰) لِلَّذِيْنَ اَحْسَنُوْا فِيْ هٰذِهِ الدُّنْيَا حَسَنَةٌ ۚ وَلَدَارُ الْاٰخِرَةِ خَيْرٌ (النحل ع ۴)

اور نیکوکاروں کے لئے اس دنیا میں بھی بہتری ہو اور دار آخرت تو ان کے لئے بہت ہی اچھا ہو

(۱۱) مَنْ عَمِلَ صَالِحًا مِّنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَلَنُحْيِيَنَّهٗ حَيٰوةً طَيِّبَةً (النحل ع ۱۳)

جو عمل صالح کریں مرد یا عورت اور وہ ایمان والے ہوں تو ہم اُن کو اچھی زندگی بخشیں گے۔

(۱۲) وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ مَعَ الْمُتَّقِيْنَ ۝ (بقرہ ع ۲۴)

اور اللہ سے ڈرو (اور اس کی نافرمانیوں سے بچتے رہو) یقیناً اللہ متقیوں کے ساتھ ہو۔

(۱۳) اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الَّذِيْنَ اتَّقَوْا وَّالَّذِيْنَ هُمْ مُّحْسِنُوْنَ (النحل ع ۱۶)

اللہ تعالیٰ تقوےٰ والوں اور نیکوکاروں کے ساتھ ہو۔

(۱۴) وَمَنْ يَّتَّقِ اللّٰهَ يَجْعَلْ لَّهٗ مَخْرَجًا ۝ وَّيَرْزُقْهُ مِنْ حَيْثُ لَا يَحْتَسِبُ ۚ وَمَنْ يَّتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ فَهُوَ حَسْبُهٗ ۚ اِنَّ اللّٰهَ بَالِغُ اَمْرِهٖ ۚ قَدْ جَعَلَ اللّٰهُ لِكُلِّ شَيْءٍ قَدْرًا ۝ (الطلاق ع ۱)

اور جو اللہ سے ڈریں اور اس کی نافرمانی سے بچیں تو ان کے واسطے نکالے گا کوئی راہ اور دیگا ان کو روزی نعمتیں وہاں سے جہاں سے انہیں گمان بھی نہ ہوگا اور جو اعتماد کریں اللہ پر تو اللہ ان کو کافی ہو یقیناً اللہ جس طرح چاہے اپنا کام پورا کرنے والا ہو اللہ نے ہر چیز کا ایک اندازہ مقرر کر رکھا ہو۔

(۱۵) يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اسْتَعِيْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوةِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الصّٰبِرِيْنَ (بقرہ ع ۱۹)

اے ایمان والو صبر و ثبات اور نماز سے قوت پکڑو یقیناً اللہ صبر و ثبات والوں کے ساتھ ہو۔

(۱۶) يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اصْبِرُوْا وَصَابِرُوْا وَرَابِطُوْا ۣ وَاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ۝ (آل عمران آخری آیت)

اے ایمان والو مضبوطی سے حق پر (اور راہ حق میں) جمے رہو اور جمائے رہو اور کمربستہ رہو اور لگے رہو اور اللہ سے ڈرتے اور اس کے احکام کی خلاف ورزی

سے بچتے رہو تاکہ تم فلاح یاب ہو جاؤ

(۱۷) إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَالَّذِينَ هَاجَرُوا وَجَاهَدُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ أُولَٰئِكَ يَرْجُونَ رَحْمَتَ اللَّهِ (بقرہ)

بیشک وہی لوگ جو ایمان لائے ہیں اور جنھوں نے ہجرت کی (یعنی دین کی خاطر اپنے گھر اور اپنے چین و آرام کو چھوڑا) اور اللہ کے راستہ میں جدوجہد کی وہی اللہ کی خاص رحمت کی امید کریں۔

اور سورہ صف میں اللہ و رسول پر صحیح طریقہ سے ایمان لانے والوں اور راہ خدا میں جان و دل سے کوشش کرنے والوں کو جنت عطا کرنے کا وعدہ دینے کے بعد ارشاد فرمایا گیا ہے۔

(۱۸) وَأُخْرَىٰ تُحِبُّونَهَا نَصْرٌ مِّنَ اللَّهِ وَفَتْحٌ قَرِيبٌ وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِينَ (الصف ع ۲)

اور (دار آخرت کی اس جنت کے علاوہ اور اس سے پہلے اس دنیا میں) ایک دوسری نعمت بھی تم کو عطا ہوگی جس کو تم بہت چاہتے ہو یعنی اللہ کی خاص مدد اور اس کے نتیجہ میں ملنے والی قریبی فتح اور اے رسول آپ ایمان لانے والوں کو اس کی خوش خبری سنا دیجیے۔

(۱۹) وَالْمُؤْمِنُونَ وَالْمُؤْمِنَاتُ بَعْضُهُمْ أَوْلِيَاءُ بَعْضٍ يَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنكَرِ وَيُقِيمُونَ الصَّلَاةَ وَيُطِيعُونَ اللَّهَ وَرَسُولَهُ أُولَٰئِكَ سَيَرْحَمُهُمُ اللَّهُ إِنَّ اللَّهَ عَزِيزٌ حَكِيمٌ (التوبہ ع ۹)

[۲]

(اور ایمان والے اور ایمان والیاں باہم ایک دوسرے کے رفیق ہیں ان کے اوصاف یہ ہیں) حکم کرتے ہیں اچھائی کا اور روکتے ہیں برائی سے اور قائم کرتے ہیں نماز اور اطاعت کرتے ہیں اللہ و رسول کی یہی وہ لوگ ہیں جن کو اللہ نوازے گا عنقریب ہی اپنی خاص رحمت سے نوازے گا بیشک اللہ پاک زبردست اور حکمت والا ہے

(۲۰) وَمَن يَتَوَلَّ اللَّهَ وَرَسُولَهُ وَالَّذِينَ آمَنُوا فَإِنَّ حِزْبَ اللَّهِ هُمُ الْغَالِبُونَ (المائدہ ع ۸)

اور جو بھی دوست رکھے گا اللہ کو اور اللہ کے رسول کو اور ایمان والوں کو تو بس اللہ کی جماعت ہی غالب آنے والی ہے۔

(۲۱) وَإِنَّ جُندَنَا لَهُمُ الْغَالِبُونَ (الصافات ع ۵)

اور بے شک ہمارا لشکر ہی غالب رہنے والا ہے

(۲۲) وَلَوْ أَنَّ أَهْلَ الْقُرَىٰ آمَنُوا وَاتَّقَوْا لَفَتَحْنَا عَلَيْهِم بَرَكَاتٍ مِّنَ السَّمَاءِ وَالْأَرْضِ (اعراف ع ۱۲)

اور اگر بستیوں والے ایمان اور تقویٰ کی راہ اختیار کرتے تو ہم ان پر آسمان و زمین کی برکتوں کے دروازے کھول دیتے۔

(۲۳) وَاَنِ اسْتَغْفِرُوْا رَبَّكُمْ ثُمَّ تُوْبُوْٓا اِلَيْهِ يُمَتِّعْكُمْ مَّتَاعًا حَسَنًا اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى۔ (هود ع ۱)

اور میں تمہیں پیغام دیتا ہوں کہ اپنے گناہ معاف کراؤ اپنے رب سے پھر رجوع ہو جاؤ اس کی طرف وہ تم کو خوش عیشی دے گا ایک مقررہ وقت تک۔

(۲۴) وَيٰقَوْمِ اسْتَغْفِرُوْا رَبَّكُمْ ثُمَّ تُوْبُوْٓا اِلَيْهِ يُرْسِلِ السَّمَآءَ عَلَيْكُمْ مِّدْرَارًا وَّيَزِدْكُمْ قُوَّةً اِلٰى قُوَّتِكُمْ وَلَا تَتَوَلَّوْا مُجْرِمِيْنَ ۝ (هود ع ۵)

(اور) حضرت ہود علیہ السلام نے اپنی قوم والوں سے کہا اے میری قوم اپنے پروردگار سے اپنے گناہ معاف کراؤ پھر اس کی طرف رجوع کرو وہ تم پر خوب بارش برسا دیگا (جس سے تمہاری بہت سی تکلیفیں اور بہت سی مشکلیں حل ہوں گی اور پیداوار میں زیادتی ہوگی) اور اپنی خاص مدد سے تمہاری قوت میں اضافہ کر دے گا اور دیکھو اس راہ سے نہ پھرو مجرم بن کر۔

ان آیات سے معلوم ہوتا ہو کہ کوئی قوم اللہ کے فضل و انعام اور اس کی خاص رحمت و نصرت اور اس کی غیبی تائید کی مستحق اس وقت ہوگی جبکہ اس میں یہ اوصاف ہوں —— حقیقی ایمان۔ اللہ کے دین کی نصرت و خدمت۔ اقامت صلوٰۃ۔ اداء زکوٰۃ۔ اللہ تعالیٰ کے ساتھ پوری پوری وابستگی۔ انبیاء علیہم السلام کی ہدایت و رہنمائی پر کامل یقین، ان کی تعظیم و توقیر اور ان کی ہدایت کے مطابق مال و دولت کو راہ خدا میں خرچ کرنے کی عادت، اللہ و رسول کی اطاعت، تقوے والی زندگی، حسن عمل، اللہ کا خوف و خشیت، استعانت بالصبر والصلوٰۃ۔ دین کے واسطے اپنا گھر اور اپنا چین و آرام اور اپنی مرغوبات و مالوفات کو چھوڑنا، راہ خدا میں جد و جہد کرنا اور جان و مال کی قربانی سے دریغ نہ کرنا، بھلائیوں کو پھیلانے اور برائیوں کو مٹانے کی کوشش کرنا، اللہ و رسول کا ساتھ پکڑ لینا اور بس ان کی طرف اور ان کے زیر فرمان ہو جانا، ان ہی کے سپاہی بن جانا، سابقہ گناہوں سے معافی مانگ کے آئندہ کو اللہ ہی کی طرف رجوع ہو جانا۔ بس جس قوم اور جس امت میں بحیثیت مجموعی یہ اوصاف موجود ہوں اس کے لئے اللہ تعالیٰ کا وعدہ ہو کہ آخرت میں جنت اور نہایت راحت و سرور والی زندگی کے علاوہ اس دنیا میں بھی اس قوم کو عزت کی اور چین و امن کی زندگی اور اپنے دشمنوں کے مقابلہ میں کامیابی اور برتری عطا ہوگی —— بہر حال اللہ تعالیٰ کی اس خاص غیبی مدد اور خصوصی عنایت و رحمت کے ظہور کے لئے (جو تعداد میں کمی اور اسباب و وسائل کی کمزوری کے باوجود کسی قوم کو غالب اور بالاتر کر دیتی ہو) اس قوم میں ان مذکورہ بالا اوصاف کا ہونا ضروری ہو۔

اور ظاہر ہو کہ کسی قوم میں ان اوصاف کے ہونے کا یہ مطلب نہیں ہو کہ لاکھوں کی تعداد میں اگر دو چار بھی ان اوصاف کے حامل ہوں تو قوم ان اوصاف کی حامل [illegible] جائے گی بلکہ جب تک کسی قوم کی غالب

اکثریت میں اور خصوصاً اس کے نمایاں عناصر اور سربرآوردہ افراد میں اور خاص کر جدوجہد کرنے والے طبقہ میں یہ اوصاف عام نہ ہوں اس وقت تک وہ قوم ان اوصاف والی قوم نہیں سمجھی جائے گی اور اس وجہ سے یہ انعامی وعدے اس کے حق میں پورے نہ ہوں گے اور عزت و شوکت اور غلبہ و حکومت والی موعود زندگی اس کو حاصل نہ ہوگی ـــــ ہاں اُس کے صالح افراد کو آخرت میں اپنے صلاح و تقوے کا پورا پورا بدلہ مل جائے گا اور اللہ تعالیٰ چاہے گا تو اس دنیا میں بھی ان کو انفرادی طور پر حیوٰۃً طیبۃً اور نعمت و رحمت والی زندگی کسی شکل میں عطا فرما دے گا، چاہے دوسرے بے بصیرت اور حقیقت ناشناس لوگ اپنے حیوانی اور سراسر مادی نقطۂ نظر کی وجہ سے ظاہری تنگیوں میں ان کے شاہانہ چین و اطمینان اور روحانی و قلبی راحت و سرور کا اندازہ نہ کر سکیں۔

بہر حال فضل و انعام کے طور پر کسی قوم کو من حیث القوم عزت کا مقام اور امن و چین والی بہتر زندگی اس وقت عطا ہوتی ہے جب کہ اس قوم کی زندگی مذکورۂ بالا ایمانی خصائص کی آئینہ دار ہو، قرآن مجید نے اللہ تعالیٰ کی سنت و عادت یہی بتائی ہے۔ وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللّٰهِ تَبْدِيْلًا ٥

نیز قرآن مجید ہی سے اللہ تعالیٰ کی اس سنت کا دوسرا پہلو یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اگر کوئی قوم اللہ و رسول کو ماننے اور ان کے احکام کو تسلیم کر لینے کے بعد نافرمان ہو جائے یا اپنی خواہش اور مرضی سے دین کے کچھ حصول پر عمل کرے اور کچھ کو پس پشت ڈال دے تو پھر وہ قہر و غضب کی مستحق ہو جاتی ہے اور اس عدول حکمی اور نافرمانی کی سزا میں اللہ تعالیٰ اپنی بہت سی نعمتیں اس سے چھین لیتا ہے اور طرح طرح کی بلاؤں اور مصیبتوں کو اس پر بھیجتا ہے اور کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ اس کے دشمنوں سے اسے ذلیل اور پامال کراتا ہے۔ مندرجہ ذیل آیتوں پر غور کیجئے!

(۱) سورہ بقرہ کے دسویں رکوع میں بنی اسرائیل کے ایک گروہ کا یہ حال بیان فرمانے کے بعد کہ ہم نے ان کو یہ احکام دیئے تھے اور انھوں نے ان احکام کو قبول کر لیا اور مان لیا تھا لیکن اس کے اپنی ذاتی خواہش سے انھوں نے فلاں ایک حکم کی تو تعمیل کی مگر اس کے علاوہ دوسرے تمام احکام کے خلاف عمل کیا ـــــ بہر حال اُن کی یہ روداد عمل بیان کرنے کے بعد، قرآن مجید میں فرمایا گیا ہے۔

(۱) فَمَا جَزَآءُ مَنْ يَّفْعَلُ ذٰلِكَ مِنْكُمْ اِلَّا خِزْيٌ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَيَوْمَ الْقِيٰمَةِ يُرَدُّوْنَ اِلٰٓى اَشَدِّ الْعَذَابِ وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ ٥

پس جو لوگ تم میں سے ایسا کریں تو ان کی جزا اس کے اور کیا ہے کہ ذلت و رسوائی ہو اس دنیوی زندگانی میں اور قیامت کے دن ڈھکیل دیئے جائیں گے نہایت سخت عذاب میں اور اللہ تعالیٰ غافل

(بقرہ ع ۱۰)

تمہارے کرتب اور کردار سے ۔

(۲) فَلْيَحْذَرِ الَّذِينَ يُخَالِفُونَ عَنْ أَمْرِهِ أَنْ تُصِيبَهُمْ فِتْنَةٌ أَوْ يُصِيبَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ ۔ (النور ع ۹)

پس جو لوگ خلاف چلتے ہیں اس کے حکم سے انہیں ڈرنا چاہیے کہ آجائے ان پر کوئی بڑی مصیبت یا پہونچے انہیں سخت دکھ والا عذاب[1]

(۳) ذَٰلِكَ بِأَنَّ اللَّهَ لَمْ يَكُ مُغَيِّرًا نِعْمَةً أَنْعَمَهَا عَلَىٰ قَوْمٍ حَتَّىٰ يُغَيِّرُوا مَا بِأَنْفُسِهِمْ (انفال ع ۶)

یہ اس سبب سے ہے کہ اللہ تعالیٰ نہیں ہے بدلنے والا کسی نعمت کا جو بخشی ہو اس نے کسی قوم کو جب تک کہ نہ بدلیں وہ اپنے ذاتی اعمال ۔

(۴) وَمَنْ أَعْرَضَ عَنْ ذِكْرِي فَإِنَّ لَهُ مَعِيشَةً ضَنْكًا وَنَحْشُرُهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ أَعْمَىٰ (طٰہٰ ع ۷)

اور جو لوگ روگردانی کریں اور بے رخی برتیں میری نصیحت سے تو ان کے واسطے (اس دنیا میں) زندگی ہو تنگی اور بے چینی اور بے اطمینانی کی اور قیامت کے دن اٹھائیں گے ہم ان کو اندھا ۔

(۵) وَمَنْ أَظْلَمُ مِمَّنْ ذُكِّرَ بِآيَاتِ رَبِّهِ ثُمَّ أَعْرَضَ عَنْهَا إِنَّا مِنَ الْمُجْرِمِينَ مُنْتَقِمُونَ (سجدہ ع ۲)

اور کون زیادہ ظالم اور جفاکار ہے اس شخص سے جس کو نصیحت اور یاد دہانی کی گئی اس کے رب کی آیات سے مگر اس نے پھر بھی بے رخی برتی ہم مجرموں سے ضرور انتقام لینے والے ہیں ۔

ان آیات میں اللہ تعالیٰ کے اسی دستور اور اس کی اسی سنت کا ذکر کیا گیا ہے کہ جب کوئی قوم اللہ کے بھیجے ہوئے دین حق کو مان لے، اس کے پیغمبروں کے لائے ہوئے احکام تسلیم کر لے اور اس کے بعد عملاً اس کے خلاف چلے (جو موجودہ مسلمانوں کا عام حال ہے) تو مرنے کے بعد عالم آخرت کے سخت عذاب کے علاوہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس دنیا میں بھی اس کو یہ سزا دی جاتی ہے کہ اس کے دشمنوں سے اس کو ذلیل اور پامال کرایا جاتا ہے اور طرح طرح کی مصیبتیں اور قسم قسم کے فتنے اس پر بھیجے جاتے ہیں اور اس کو جو نعمتیں پہلے ملی ہوتی ہیں ان کو

---

[1] اس کے بعد متصل یہ آیت ہے أَلَا إِنَّ لِلَّهِ مَا فِي السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ قَدْ يَعْلَمُ مَا أَنْتُمْ عَلَيْهِ وَيَوْمَ يُرْجَعُونَ إِلَيْهِ فَيُنَبِّئُهُمْ بِمَا عَمِلُوا وَاللَّهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمٌ ۔ اس کے خط کشیدہ ٹکڑے سے صاف ظاہر ہے کہ اوپر والی آیت میں جس "فتنہ" اور "عذاب الیم" کا ذکر ہے اس سے مراد دنیوی عذاب اور دنیا میں آنے والے مصائب ہیں ۱۲

طرز زندگی کے بجائے غیر ایمانی طریقہ زندگی اختیار کر لینے کے جرم میں) وہ نعمتیں اس سے چھین لی جاتی ہیں ـــــ اور وہ اللہ کی ہدایت و نصیحت سے روگردانی اور اس کی ناقدری کی پاداش میں زندگی کی راہیں اس پر تنگ کر دی جاتی ہیں اور پھر بے چینی اور بے اطمینانی کے حالات اس پر مسلط کر دیئے جاتے ہیں ـــــ اور جب کسی قوم کی حالت یہ ہو جاتی ہے کہ اللہ کی باتوں اور اللہ کے احکام کو بار بار یاد دلانے کے باوجود وہ ان سے اثر نہیں لیتی بلکہ بے رخی ہی برتتی ہے تو پھر اللہ تعالیٰ کی انتقامی شان کا ظہور ہوتا ہے اور پھر اس مجرم قوم کو اس کی خدا فراموشی کا مزہ چکھایا جاتا ہے۔

نیز قرآن مجید ہی سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ عتاب ابتداءً اس لئے ہوتا ہے اور یہ مصائب اس واسطے بھیجے جاتے ہیں کہ غافل اور بدمست قوم ہوش میں آئے اور اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع و انابت اور توبہ و استغفار کر کے اللہ کو راضی کرنے والی زندگی اختیار کرے، سورہ سجدہ کی جو آیت (اوپر نمبر (۵) پر) نقل کی گئی ہے اس سے پہلی ہی آیت میں ہے۔

وَلَنُذِيقَنَّهُمْ مِّنَ الْعَذَابِ الْأَدْنَىٰ دُونَ الْعَذَابِ الْأَكْبَرِ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُونَ (السجدہ ع ۲)	اور ہم آخرت کے بڑے عذاب کے علاوہ اور اس سے پہلے ضرور ان کو چکھائیں گے اس سے کم درجہ کا عذاب (اس دنیا ہی میں) شاید کہ وہ باز آجائیں

نیز سورۂ روم کی ایک آیت میں بھی خدا فراموشی اور بدکرداری کی سزا میں آنے والی بلاؤں کا یہی مقصد بیان فرمایا گیا ہے۔ ارشاد ہے :-

ظَهَرَ الْفَسَادُ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ بِمَا كَسَبَتْ أَيْدِي النَّاسِ لِيُذِيقَهُم بَعْضَ الَّذِي عَمِلُوا لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُونَ ۝	پھیل گیا فساد خشکی اور تری میں آدمیوں کی بداعمالیوں سے تاکہ چکھا دے انہیں ان کی بعض بداعمالیوں کی سزا شاید وہ باز آجائیں۔

پھر قرآن مجید ہی سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان عتابی کارروائیوں کے ظہور سے بھی قوم میں رجوع و انابت نہ پیدا ہو، اور وہ شیطانی اعمال اور غیر ایمانی طور طریقوں کو چھوڑ کر ایمان و اطاعت والی زندگی اختیار نہ کرے تو ایسا بھی ہوتا ہے کہ ایسی بدنصیب قوم کو بالآخر ہلاک و برباد کر دیا جاتا ہے اور صفحہ ہستی کو اس کے وجود سے پاک کر دیا جاتا ہے، سورہ انعام میں ایسی ہی غافل و بدمست مبتلائے بعض قوموں اور بلائیں اور مصیبتیں آنے پر بھی اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع نہ ہونے والی امتوں کی بربادی و تباہی کی داستان اس طرح بیان فرمائی گئی ہے۔

فَلَوْلَا إِذْ جَاءَهُم بَأْسُنَا تَضَرَّعُوا	پس جب آئی ان پر ہماری طرف سے سختی تو وہ کیوں

وَلٰكِنْ قَسَتْ قُلُوْبُهُمْ وَزَيَّنَ لَهُمُ الشَّيْطٰنُ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ۝ فَلَمَّا نَسُوْا مَا ذُكِّرُوْا بِهٖ فَتَحْنَا عَلَيْهِمْ اَبْوَابَ كُلِّ شَيْءٍ ۭ حَتّٰٓي اِذَا فَرِحُوْا بِمَآ اُوْتُوْٓا اَخَذْنٰهُمْ بَغْتَةً فَاِذَا هُمْ مُّبْلِسُوْنَ ۝ فَقُطِعَ دَابِرُ الْقَوْمِ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا ۭ وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝

(الانعام ع ۵)

نہ گڑگڑائے (اور کیوں انہوں نے رجوع و انابت کی راہ اختیار نہ کی) ولیکن سخت ہوگئے ان کے دل اور شیطان نے ان کی بداعمالیوں کو ان کی نظروں میں اچھا کرکے دکھلایا، پھر جب وہ (اپنی بدمستی اور طغیانی میں) بھول گئے ان نصیحتوں کو جو انہیں کی گئی تھیں تو ایک دفعہ کھول دیئے ہم نے ان پر ہر چیز کے دروازے یہاں تک کہ جب وہ خوب اترانے لگے ان چیزوں پر جو انہیں دی گئی تھیں (اور ان کی غفلت و بدمستی حد کو پہنچ گئی) تو ہم نے دفعتہً انہیں اپنی سخت گرفت میں لے لیا تو وہ بالکل حیرت زدہ اور درماندہ ہو کے رہ گئے پھر اس عذاب سے اس ظالم قوم کی جڑ کاٹ دی گئی اور وہ نیست و نابود کردی گئی اور حمد ہے اللہ رب العالمین کے لئے۔

الغرض قوموں کے عروج و زوال، ان کی خوشحالی و بدحالی اور ان کی بقا و فنا کے متعلق یہ ہے انبیاء علیہم السلام کا لایا ہوا خاص فلسفہ اور قرآن مجید کا بتلایا ہوا خاص راز کہ جب کوئی قوم ایمان و طاعت والی زندگی اختیار کرلیتی ہے جو اللہ کو محبوب ہے تو وہ قوم اللہ تعالیٰ کی خصوصی رحمت و عنایت کی مستحق ہوجاتی ہے اور پھر حق تعالیٰ اس دنیا میں بھی اس کی خاص نصرت فرماتے ہیں جس کی وجہ سے اس کو عزت و وقار والی زندگی حاصل ہوتی ہے اور اس کے دشمن و بدخواہ اس کے مقابلہ میں زیر ہوتے ہیں ـــــــ لیکن پھر یہی امت اگر خدا فراموش ہوجائے اور نافرمانی کی زندگی اختیار کرلے تو پھر اللہ تعالیٰ کا رویہ بھی اس کے ساتھ بدل جاتا ہے، اس کو طرح طرح کی مصیبتوں اور پریشانیوں میں مبتلا کیا جاتا ہے۔ دشمنوں کے مقابلہ میں اس کی کوئی مدد نہیں کی جاتی، وہ ذلیل ہوتی ہے اور ٹھوکریں کھاتی ہے ـــــــ پھر اگر ان آفتوں اور ذلتوں سے بھی وہ سبق نہ لے اور اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع و انابت نہ کرے اور خدا فراموشی اور بدمستی ہی کی راہ پر چلتی رہے تو پھر ایسا بھی ہوتا ہے کہ وہ بالکل تباہ و برباد کردی جاتی ہے اور اس کی جڑ تک کاٹ دی جاتی ہے۔

افسوس کہ انبیاء علیہم السلام کی ہدایات سے ہماری دوری اور قرآنی تعلیمات سے ہماری بیگانگی اس حد تک پہنچ گئی ہے کہ نہایت مہیب اور لرزہ خیز قومی واقعات اور بڑے بڑے مصائب و ابتلاآت

کے وقت بھی ہم کو انبیاء علیہم السلام کا یہ سبق یاد نہیں آتا اور اپنے قومی مسائل پر کبھی ہم اس روشنی میں غور نہیں کرتے ـــــ اس وقت بھی جب کہ یہ سطریں سپرد قلم کی جا رہی ہیں ہماری قوم کے سامنے نہایت اہم اور دوررس مسائل ہیں جن سے عہدہ برآ ہونا مشکل نظر آرہا ہے اور بڑے سخت خطرات کے سرخ و سیاہ بادل سر پر منڈلاتے نظر آرہے ہیں (اور بعض صوبوں میں یہ خطرات خونی واقعات بن کر بھی ظاہر ہو چکے ہیں۔ اور ہماری قوم کے تمام طبقے ان حالات سے متاثر اور سخت متفکر بھی ہیں لیکن اللہ سے دوری اور دل و دماغ کی گمراہی کا یہ عالم ہے کہ خالص مادہ پرست اور خدا ناآشنا قوموں کی طرح وہ تدبیریں تو سب کی جارہی ہیں جو ہمارے مادہ پرست دماغوں میں آرہی ہیں اور جو عصر حاضر کی ملحد قوموں سے ہم نے سیکھی ہیں لیکن انبیاء علیہم السلام نے ایسے حالات کے لئے جو کچھ بتلایا تھا ہماری قومی مجلسوں میں کبھی بھولے سے بھی اس کا تذکرہ نہیں آتا گویا کہ ایسے اہم معاملات کے متعلق اللہ اور اللہ کے رسول اور اس کی کتاب نے ہم کو کچھ بتلایا ہی نہیں ہے یا (معاذ اللہ) ہماری دانائی اور سیاسی مہارت اتنی ترقی کر چکی ہے کہ اس دائرہ میں ہمیں ان سے رہنمائی حاصل کرنے کی حاجت ہی نہیں رہی۔

موجودہ مسلمان قوم میں اگر کچھ لوگ گمراہی کے اس درجہ تک پہنچ چکے ہوں تو ان سے تو بیشک کچھ کہنا نہیں ہے لیکن ہزار غفلتوں کے باوجود ہماری قوم کا سواد اعظم یقیناً اتنا گمراہ اور اللہ و رسول سے اس قدر دور نہیں ہوا ہے۔ اسی نیک گمانی کی بنیاد پر اس سے عرض کرنا ہے کہ اپنے قومی معاملات و مسائل میں آخر ہم کب تک اللہ و رسول کی ہدایت سے غافل و بے پروا رہیں گے اور قرآن مجید کی روشنی میں سمجھنے سے ہم کب تک گریز کرتے رہیں گے؟ اور کیا بظاہر حالات اس کا کوئی بھی امکان ہے کہ اپنے موجودہ مادہ پرستانہ رویہ سے کبھی ہم ان مشکلات پر قابو پا سکیں گے اور اپنے مسائل کو اپنی منشا کے مطابق طے کرا لینے میں کامیاب ہو جائیں گے؟ـــــ کیا آپ اس بدیہی حقیقت سے بھی ناواقف ہیں کہ صرف ظاہری اسباب و تدابیر اور مادی کوششوں کے ذریعہ کامیابی حاصل کرنے کا امکان جب ہی ہوتا ہے کہ مادی اسباب و وسائل میں بالاتری یا کم از کم برابری حاصل ہو اور ظاہر ہے کہ مسلمانان ہند (بالخصوص اقلیت والے صوبوں کے مسلمانوں) کو یہ پوزیشن حاصل نہیں ہے وہ تعداد میں بھی بہت کم ہیں اور دولت و صنعت اور تنظیم و تعلیم وغیرہ کے لحاظ سے بھی نہایت پسماندہ ہیں اس لئے اگر صرف ظاہری تدابیر اور مادی کوششوں ہی پر انحصار رہا (جو آج تک ہماری قومی پالیسی ہے) تو ظاہر ہے کہ انجام دائمی ذلت و ناکامی کے سوا کچھ بھی نہ ہوگا۔ پس ہماری موجودہ مشکلات کا بھی کوئی حل اس کے سوا نہیں ہے کہ ہم دین کو مقصد حیات اور نجات آخرت کو اصل

مطمح نظر بناکے قرآن مجید اور اسوۂ نبوی کی رہنمائی میں اپنی قومی پالیسی از سرِنو مرتب کریں۔

اس سلسلہ میں سب سے اہم اور اولین فریضہ ہمارا یہ ہوگا کہ موجودہ مسلمان قوم میں وسیع پیمانہ پر دین وایمان والی زندگی اور وہ اوصاف پیدا کرنے کی کوشش کریں جن پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے خاص عنایت ورحمت اور غیبی تائید ونصرت کا وعدہ ہو ـــــــ اس کے بعد نہ صرف یہ کہ اللہ کی مدد سے موجودہ مصائب وابتلاآت اور مستقبل کے خطرات ہی سے نجات پاسکیں گے بلکہ اللہ تعالیٰ کی سنت اور اس کے کھلے کھلے وعدوں پر ایمان رکھتے ہوئے ہمیں یقین کرنا چاہیئے کہ پھر ہم ہی بالاتر کردیئے جائیں گے اور تاریخ کا ورق ایک دم الٹے گا اور اس کی تکمیل کے لئے اس عالم اسباب میں جن اسباب ووسائل کی ضرورت ہوگی اللہ تعالیٰ دیکھتے ہی دیکھتے اپنی خاص قدرت سے ان سب کو ہمارے لئے مہیا فرمادیگا کہ جیسا کہ اپنے ایمان والے بندوں کے ساتھ اس دنیا میں بارہا وہ یہ معاملہ کرچکا ہے۔

ہماری اس گزارش سے کسی کو یہ غلط فہمی نہ ہونا چاہیئے کہ ہمارے نزدیک دین کا اصل مقصد اس قسم کی دنیوی مشکلات ومصائب سے نجات حاصل کرنا اور اس حیاتِ دنیا میں عزت ووقار والی زندگی تک پہنچنا ہو اور ہم انہیں مقاصد کے حصول کے واسطے اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع وانابت اور دین کی طرف رجعت کا مشورہ مسلمانوں کو دے رہے ہیں۔ حاشا وکلاّ!

ہمارا ایمان ہو کہ دین کا اصل موضوع اور اولین مقصد اپنے خالق ومالک کی رضا جوئی اور مرنے کے بعد عالم آخرت میں نجات وفلاح حاصل کرنا ہو اور اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع وانابت اور اسکی عبادت واطاعت اور قوم میں اصلاحی کوشش اور دینی زندگی پیدا کرنے کی جدوجہد یہ سارے کام خالصاً لوجہ اللہ اور صرف اس لئے اور اسی نیت سے ہونے چاہئیں کہ مرنے کے بعد والی اس ابدی زندگی میں جو کبھی ختم نہ ہوگی اللہ کے عذاب سے ہم بچ سکیں اور اس کی رضا اور مغفرت ورحمت کے مستحق ہوسکیں ـــــــ بہرحال دینی زندگی اور دینی دعوت کا اصل موضوع ومقصد یہی ہو اور یہی ہونا بھی چاہیئے اور بلاشبہ انبیاء علیہم السلام نے نجاتِ اُخروی ہی کے مسئلہ کو انسانیت کا سب سے اہم مسئلہ قرار دیا ہو اور اسی کو ان بزرگواروں نے دینی دعوت کی بنیاد بنایا ہو لیکن اسی کے ساتھ انھوں نے یہ بھی بتلایا ہو کہ جو قوم اللہ کی رضا جوئی اور نجاتِ اُخروی کی فکر میں یہ دینی زندگی اختیار کرے گی تو اللہ تعالیٰ اس کو بخشش اور انعام کے طور پر آخرت کے طفیل میں اس دنیا میں بھی "حیاتِ طیبہ" عزت اور چین والی زندگی عطا فرمائیں گے اور پردۂ غیب سے اس کی مشکلات حل فرماتے رہیں گے اور اس کے دشمنوں اور بدخواہوں کے مقابلہ میں اس کی نصرت وحمایت ہوتی رہے گی۔

پس ہم اپنی قوم کو اس کی موجودہ مشکلات و مصائب سے نجات حاصل کرنے اور حیات طیبہ اور عزت و وقار کے مقام تک پہنچنے کے لئے اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع و انابت اور دین کی طرف بازگشت کی جو دعوت دے رہے ہیں اس کی حیثیت صرف یہی ہے اور ہم واضح کر دینا چاہتے ہیں کہ دینی زندگی اور دینی دعوت میں دینی ہونے کی شان اسی وقت ہے جب کہ اس سے اصل غرض اللہ کی رضا جوئی اور نجات و فلاح اُخروی ہو اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے رحمت و نصرت کا وعدہ بھی اسی شرط کے ساتھ مشروط ہے ورنہ اگر کوئی قوم اور کوئی جماعت دنیوی فلاح و ترقی اور اس حیات دنیا ہی میں عزت و برتری حاصل کرنے کے لئے اسلامی طور طریقوں کو اختیار کرے تو اللہ تعالیٰ کے یہاں اس کا کوئی اعتبار نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کی نظر میں ایسے لوگ سخت مجرم ہیں جو دنیا ہی کو اصل مطمح نظر بنائیں یا آخرت کے مقابلہ میں اس کی زیادہ فکر کریں

كَلَّا بَلْ تُحِبُّونَ الْعَاجِلَةَ وَتَذَرُونَ الْآخِرَةَ ۝ (القیامۃ ع ۱ پ ۲۹)	بس تم لوگ دنیا کو چاہتے ہو اور آخرت کو چھوڑے ہوئے ہو۔
بَلْ تُؤْثِرُونَ الْحَيَاةَ الدُّنْيَا وَالْآخِرَةُ خَيْرٌ وَأَبْقَىٰ (الاعلیٰ)	بلکہ تم دنیوی زندگی کو مقدم رکھتے ہو حالانکہ آخرت اس سے بدرجہا بہتر اور زیادہ باقی رہنے والی ہے۔

پس ہماری دینی دعوت کا پہلا مطالبہ اپنی مسلمان قوم سے یہ ہے کہ دنیا کی خدا ناآشنا عقبیٰ فراموش اور دنیا پرست قوموں کی طرح صرف اس دنیا میں عزت و چین کی زندگی اور علو و بالاتری کا مقام حاصل کرنے کو جس طرح اس نے اپنا اصل مطمح نظر بنا لیا ہے اور تمام تر قومی و سیاسی مساعی کا نصب العین قرار دے لیا ہے اور صرف دنیوی مفادات پر دوسروں سے لڑنے جھگڑنے کی جو پالیسی اس نے اختیار کر رکھی ہے وہ اس کی شان ایمان و اسلام کے قطعاً منافی ہے لہٰذا جلد سے جلد وہ اس سے دست بردار ہو جائے اور خالص دنیا پرستی کے اس محاذ سے ہٹ کر انبیاء علیہم السلام کی دعوت و تعلیم کے مطابق رضاء الٰہی اور فلاح اُخروی کو اپنا اصل مقصود و نصب العین بنائے اور اس کے حصول کے لئے اللہ کی عبدیت اور ایمانی اطاعت والی زندگی اختیار کرے اور اسی زندگی کی داعی اور پیامبر بن کر کل انسانیت کی ہمدردی و خیر خواہی کے صادق جذبہ کے ساتھ وہ اقوام عالم کے سامنے آئے اور پھر دیکھے کہ اللہ تعالیٰ ان کی کیسی مدد کرتا ہے۔ (الفرقان جمادی الاولیٰ ۱۳۶۶ھ)

ٹیلی گرام
FINESUEDE
BOMBAY
ٹیلی فون
دفتر: ۳۳۴۷۵۳
مکان: ۵۴۲۹۸۲
سی ایس ٹریڈرس
ایکسپورٹرس
ہر قسم کا چمڑا ○ لیدر گڈس
○ ریڈی میڈ گارمنٹ ○ آرٹیفیشل جویلری
○ پلاسٹک گڈس
اور واشیٹیشنری وغیرہ وغیرہ
پتہ یاد رکھئے
دفتر
پوسٹ بکس نمبر ۳۲۵۰
۱۹/۳ دھرمسی اسٹریٹ بمبئی ۳
کارخانہ
۲۴۲/۲۴۴ دھراوی روڈ
بمبئی ۱۷ (انڈیا)

عطریات کی دنیا میں سب سے بہتر اور ممتاز
ڈوانمول تحفے!
عطر کوثر ®
ATTAR MAJMUA
KAUSAR PERFUMERS
KAUSAR
PERFUME
عطر مجموعہ
جو فرحت بخش اور دیرپا خوشبو کے لئے مشہور ہیں
بھینی بھینی اور میٹھی خوشبو والے
ہر قسم کے خالص دیسی عطریات اور پھولوں
کی طرح مہکتے ہوئے ولایتی سینٹ
ملنے کا واحد مرکز
(ہول سیل اور ریٹیل)
کوثر پرفیومرس
جامع مسجد کے نیچے بمبئے ۲

داعی الی اللہ کی علالت اور وفات

مکتوب بنام مولانا عبدالماجد دریابادی

(از مولانا سید ابوالحسن علی ندوی)

چار پانچ روز ہوئے دہلی سے آیا ہوں مولانا محمد الیاس صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی وفات میرے زمانۂ قیام میں ہوئی ۲۰-۲۲ روز ان کی خدمت میں رہنے کی سعادت حاصل ہوئی، آنکھوں نے ان دنوں میں جو کچھ دیکھا یعنی ثبات، استقامت تعلق باللہ اور کام کے انہماک و استغراق کے جو مناظر نظر کے سامنے آئے ان کی نظیریں میرے محدود علم میں بزرگانِ سلف کے سوانح و حالات میں بھی وفور و کثرت کے ساتھ نہیں ملیں گی۔ اس آٹھ مہینے کی علالت میں جس میں ضعف اس حد کو پہونچ گیا تھا کہ چارپائی پر حرکت کرنا دشوار تھی لبوں پر کان رکھ کر اکثر آواز سننی پڑتی تھی، شاید دو چار وقت کی نمازیں اور وہ بھی شدت غفلت کی حالت میں جماعت کے بغیر پڑھی ہوں گی۔ آخر مئی یا جون کے اوائل تک تو پانچوں وقت یہ دیکھنے میں آتا تھا کہ مولانا خود چارپائی سے اتر نہیں سکتے تھے، نہ خود کھڑے ہو سکتے تھے، دو آدمی پکڑ کر صف میں کھڑا کر دیتے تھے، اٹھنے بیٹھنے کی طاقت نہیں تھی، مگر جہاں امام نے اللہ اکبر کہا پھر خدا جانے کہاں کی طاقت آجاتی کہ بغیر کسی سہارے کے خود رکوع، سجود و قیام کرتے اور پوری نماز امام کی اقتدا میں ادا کرتے۔ جہاں امام نے سلام پھیرا پھر وہ طاقت خدا جانے کہاں چلی جاتی کہ خود کھڑے نہیں ہو سکتے تھے۔ آدمی پکڑ کر چارپائی تک لاتے۔ سنتیں و وتر شخص کی امداد اور سہارے سے ادا کرتے (لیکن وتر واجب) پھر بغیر کسی امداد و سہارے کے از خود ادا کرتے سینکڑوں آدمی پانچوں وقت یہ عجیب و غریب منظر دیکھتے۔ جب کھڑے ہونے سے بالکل معذوری ہو گئی اور اطبا اور علما نے متفقہ طور پر کھڑے ہونے سے منع کر دیا تو کچھ عرصہ تک بیٹھ کر نماز پڑھتے رہے۔ آخر دنوں میں تقریباً ایک مہینہ اطباء اور علما نے بیٹھ کر نماز پڑھنے سے بھی روک دیا تو لیٹے لیٹے جماعت کے ساتھ نماز ادا کرتے۔ لیٹے ہی لیٹے بڑے اہتمام سے وضو کرتے، ایک ایک سنت اور مستحب کا التزام کرتے۔ اس عرصہ میں مجھے نہیں معلوم کہ کسی چھوٹی سے چھوٹی سنت کو ترک فرمایا ہو، تندرستی میں بھی میں نے بہت کم لوگوں کو سنن و مستحبات کا اتنا اہتمام کرتے ہوئے دیکھا ہے جتنا مولانا کو اس شدید علالت اور اس انتہائی ضعف میں کرتے ہوئے پایا۔ وفات سے

دو چار روز پہلے مولانا ظفر احمد صاحب اور دوسرے علماء کے فتوے پر تیمم فرمایا، مگر وہ بھی اس نیت کے ساتھ کہ یہ اللہ کی نعمت اور بخشش ہوئی ایک رخصت ہے جس کو قبول کرنا چاہیے۔ اسمیں بھی وہی اہتمام تھا جو وضو میں۔

کام کے انہماک و شغف کا یہ حال تھا کہ اس طویل زمانۂ علالت کا ایک لمحہ بھی اپنی طرف سے ضائع نہیں کیا۔ دن رات میں ۴،۴، ۵،۵ مرتبہ طلب فرماتے اور شدید تکلیف کی حالت میں، بخار کی شدت میں اور آخر میں غنودگی کی حالت میں کہ آواز اور زبان میں رعشہ پیدا ہوگیا تھا اور ایک ایک لفظ ۲،۳ مرتبہ بدقت ادا ہوتا، لوگوں کے نام برابر پیغام دیتے رہتے ضروری باتیں فرماتے رہے اور بستر مرگ پر پڑے ہوئے آخر وقت تک اپنے کام کی جو بہت دور تک پھیلا ہوا تھا، نگرانی فرماتے رہے جزئیات تک کے متعلق ہدایات دیتے رہے زائرین و معتقدین کا مجمع روز افزوں تھا، ایک ایک وقت میں ۳۰۰۔۴۰۰ آدمی وہیں پڑے رہتے، وہیں کھانا کھاتے، ہر ایک کے مناسب حال ضروری پیغام دیتے، ایک لمحہ کے لیے گوارا نہ تھا کہ لوگ معطل بیٹھیں یا محض مزاج پرسی کر کے چلے جائیں ان کو ذکر و علم و تبلیغ میں مشغول رہنے کی تاکید فرماتے، اور خود لیٹے لیٹے اس کی نگرانی کرتے۔ اس کے روادار نہ تھے کہ کوئی مخلص محض جسمانی آرام پہنچانے والی اعانت کرنے اور ذاتی خدمت پر اکتفا کرے، کسی ایسے شخص سے جسمانی خدمت لینے سے صاف انکار فرما دیتے اور سخت تکدر کا اظہار فرماتے جو دین کی خدمت اور علمی کام میں مشغول نہیں، اس کو اپنے سامنے سے ہٹا دیتے کہ "مجھے تکلیف ہوتی ہے۔" پھر جب وہ اس کا عہد کرتا کہ دین کی خدمت میں عملی حصہ لے گا (اور مولانا کے طرز تعبیر کے مطابق) انبیاء علیہم السلام کے اس طریق ذکر و علم اور نصرت دین کے لیے (جو عام طور پر تبلیغ کے لفظ سے مشہور ہوگیا ہے) اپنے مشاغل سے وقت نکالے گا تو باغ باغ ہوجاتے، اس کو سینہ سے لگا لیتے، اس کے ہاتھ چومتے، دعائیں دیتے۔ اگر کبھی تیمار داروں نے مولانا کے ضعف اور بخار کی شدت کی رعایت کی تو سخت خفگی کا اظہار فرمایا، اور فرمایا کہ تم نے مجھے دین پر کیوں مقدم کیا، میرے ضعف و تعب کا کیوں لحاظ کیا۔

اس ظاہری انہماک و مشغولیت کے ساتھ اللہ کے ساتھ مشغولی برابر بڑھتی جارہی تھی، روحانی کیفیات اور قلبی قوت بڑی ترقی پر تھی، اور اسمیں اس قدر تیزی اور قوت تھی کہ ماحول اور رفقاء کا ساتھ چلنا مشکل ہوگیا تھا، آخر وقت جتنا قریب آتا جاتا تھا "یدخلون فی دین اللہ افواجا" کی کیفیت بڑھتی جارہی تھی علماء، مشائخ اور امراء کے ہر طبقہ کے لوگ کشاں کشاں چلے آرہے تھے، وفود کا اور مخلصین کے ہجوم اور تبلیغی جماعتوں اور قافلوں کی آمد کی وجہ سے کہیں تل دھرنے کی جگہ نہ تھی، دہلی کی زمین تو گویا ایک حرکت و مسلسل جنبش میں تھی، سینکڑوں اللہ کے بندے جو اپنی کوٹھیوں اور مسہریوں پر آرام کرتے ہیں بے تکلف فرش زمین پر سر کے نیچے اینٹ رکھ کر رات گزار دیتے اور

دیکھنے والا ہرگز اندازہ نہ کرسکتا کہ ان میں کتنے لکھ پتی تاجر اور کیسے کیسے آسودہ و ناز پروردہ اشخاص ہیں! اگلے پچھلے پہر یہ مسجد اور اقامت خانہ ذکر و تلاوتِ قرآن سے گونجنے لگتا۔ دن کو حدیث اور دینی کتابوں کے مذاکرات اور درس کے حلقے ہوتے، شام کو تبلیغی گشت اور رات کو ذکر و نوافل۔ یہ مناظر عمر بھر کہیں دیکھنے میں نہیں آئے۔

• یدخلون فی دین اللہ افواجا" کی کیفیت جس قدر بڑھتی جاتی "فسبح بحمد ربک واستغفرہ" کا ظہور بھی اسی قدر نمایاں ہوتا چلا جاتا تھا۔ دیارِ حبیب کا اشتیاق بہت بڑھ گیا تھا اور حضرت عمر کی یہ دعا وردِ زبان تھی اللّٰھم ارزقنی الشہادۃ فی سبیلک واجعل موتی فی بلد رسولک' جمعرات کو برابر دریافت فرماتے رہتے۔ جمعرات کی رات کو فرمایا "کیا کل جمعرات ہے؟" لوگوں نے کہا جی ہاں! فرمایا میرے کپڑے اور بستر اچھی طرح دیکھ لو کوئی نجاست تو نہیں ہے۔ لوگوں نے دیکھ کر اطمینان دلایا، فرمایا میرا جی چاہتا ہے آج زمین پر اتر کر نماز پڑھوں، تیمارداروں نے منع کیا۔ سنت کے مطابق سُرمہ لگایا۔ یہ دعا خاص طور پر پڑھتے رہے اللّٰھم انّ مغفرتک اوسع من ذنوبی ورحمتک ارجی عندی من عملی' رات کو اللہ اکبر کی آواز بار بار آتی رہی۔ پچھلے پہر صاحبزادہ مولانا محمد یوسف صاحب کو یاد فرمایا اور کہا یوسف مل لو ہم تو چلے۔ حاضرین سے فرمایا "دوستو مل لو، ہم تو چل دیئے۔" فجر کی اذان سنی پھر پورے ہوش و حواس کے ساتھ قبلہ کی طرف کروٹ بدل کر لیٹ گئے اور جان جانِ آفریں کے سپرد کی۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

مصحف بکف دپا بر ہ و دیدہ بردست　　　　بر پیک اجل خندہ زناں بیروں رفت

جنازہ میں بے حد ہجوم تھا، لوگوں کا اندازہ ۲۰۔۲۵ ہزار کے مجمع کا ہے۔ شہر میں عام طور پر مسلمانوں کی دکانیں بند ہو گئیں، لوگ دفن میں شرکت کے لیے رسیاں ڈال ڈال کر مسجد میں داخل ہوئے۔ ڈیوڑھی میں مٹی بھر بھر کر لوگ چھتوں اور دیواروں پر چڑھے ہوئے تھے کہ مٹی ڈال سکیں۔ مسجد کے صحن کے باہر جنوبی و مشرقی گوشے میں اپنے والد اور برادرِ معظم کے پہلو میں دفن ہوئے۔ یہ ۱۳ جولائی کا واقعہ ہے۔

مولانا رحمۃ اللہ علیہ کی دعوت و تحریک کیا تھی اور کس چیز کے درد میں شمع کی طرح ساری عمر پگھلتے رہے؟ اس کا تفصیلی جواب ذرا طویل فرصت کا محتاج ہے ؎

کچھ کہہ سنائیں گے جو طبیعت سنبھل گئی

چند مہینے پیشتر الفرقان میں خاکسار راقم کا ایک مبسوط مضمون "مسلمانوں کی عمومی تعلیم و تربیت" کے عنوان سے شائع ہوا ہے جو حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ کی نظرِ مبارک سے گزر چکا ہے اور اس کی خود اصلاح و تصحیح فرمائی تھی نیز تازہ الفرقان میں محب محترم مولانا محمد منظور صاحب نعمانی

کے قلم سے ایک تصحیحی مقالہ بعنوان "نصرت دین کی ایک کوشش" شائع ہوا ہے۔ ان دونوں مضامین سے اس تحریک و پیغام کو سمجھنے میں ان شاء اللہ بڑی مدد ملے گی۔ باقی مولانا رحمۃ اللہ علیہ کے مفصل حالات زندگی بھی زیر تحریر ہیں۔ ان شاء اللہ عنقریب شائع ہوں گے۔

البتہ بڑے درد کے ساتھ اس کا شکوہ کر کے اپنے غمزدہ دل کا بوجھ ہلکا کرنا ہے کہ مولانا کی تحریک دعوت پر اس علمی سنجیدگی کے ساتھ غور اور اس کا مطالعہ نہیں کیا گیا جس کی وہ مستحق تھی۔ لوگوں نے عام طور پر ایک سطحی نظر سے دیکھ کر اور زیادہ کیا تو اسے سن کر ہی اس کے متعلق سرسری رائے قائم کی کسی نے اس کو میوات کی ایک مقامی تحریک سمجھا، کسی نے اس کو دینی حلقہ کی دینی اصلاح و تبلیغ کی غرض جیسا کہ جناب ... نے سیرت احمد شہید کے پیش لفظ میں مولانا روم کا شعر لکھا ہے۔

ہر کسے از ظن خود شد یار من وز درون من نجست اسرار من

اس عریضہ کو جو اندازہ سے زیادہ طویل ہو گیا اقبال مرحوم کی اس رباعی پر ختم کرتا ہوں جو جانے والے کے حسب حال ہے

چو رخت خویش بر بستم ازیں دیر ہمہ گفتند با ما آشنا بود
و لیکن کس ندانست ایں مسافر چہ گفت و با کہ گفت و از کجا بود

(الفرقان رجب و شعبان ۱۳۶۳ھ)

اپنے محترم خریداروں سے

الفرقان کے اکثر خریدار حضرات دفتر سے رابطہ قائم کرتے وقت خریداری نمبر کا حوالہ دینا بھول جاتے ہیں جس سے ضروری اندراجات اور تعمیل میں بیحد دشواری ہوتی ہے۔ براہ کرم خط و کتابت اور منی آرڈر کوپن پر اپنا نمبر خریداری (جو پتہ کی چٹ پر لکھا رہتا ہے) ضرور لکھ دیا کیجیے تاکہ طرفین زحمت سے محفوظ رہیں۔

جواب طلب امور کے لیے جوابی کارڈ یا ۱۵ پیسے کے ڈاک ٹکٹ ضرور ارسال کیجیے بصورت دیگر تعمیل ممکن نہ ہوگی۔

ALFURQAN'S ENGLISH DIGEST

1974

Founder
MAULANA MOHAMMAD MANZOOR NOMANI

Editors
ATIQUR RAHMAN SAMBHALI
MOHAMMAD ASIF KIDWAI

A Bold Experiment in Propagating Islam and its teachings on all aspects of life, individual and collective, among English Speaking Societies.

Brings to you choicest reading material appertaining to Islamic faith and muslims.

Educative ! *Informative !* *Heart-lifting !*

Price : Rs. 10/-

ٹیلی گرام ہوٹل گل
لکھنؤ میں اعلیٰ ترین قیام گاہ
ہوٹل گلمرگ
امین الدولہ پارک، لکھنؤ
ٹیلی فون
۲۳۳۲۶ ۲۳۳۲۷ ۲۹۹۵۸
* پچاس کمرے * ہر کمرہ کے ساتھ ٹیلی فون، غسل خانہ
* خوش نما کشادہ لان
گلنار ریسٹورنٹ
بہترین لذیذ ہندوستانی اور انگریزی کھانے
خوش نما اور معیاری طباعت
کے لئے
لکھنؤ کا مشہور اور قدیم ترین
تنویر پریس
ہر قسم کے پوسٹر، پمفلٹ، شادی کارڈ، سہرے، کتابوں اور رسائل
کی طباعت کیلئے تشریف لائیے
۷۰۔ باغ گونگے نواب امین آباد، لکھنؤ
فون نمبر:- 22934
ایک بار ضرور آزمائش کریں

بقیہ "ایک حادثہ"

کیفیت بہت کرب واذیت کی تھی۔ بائیں ٹانگ پر اوپر سے نیچے تک پٹی بندھی ہوئی اور ایک طرف سامنے پاؤں میں، دوسری طرف کروٹ کو، ران میں کئی کئی سیر وزن لٹکا ہوا، ایک تخت پر لیٹے ہوئے تھے۔ زندگی پر شکر کے ساتھ، اس کیفیت پر بے اختیار دل بھی بھر آیا۔ مگر موقع ضبط کا تھا، کسی بھی طرح اپنے اوپر قابو رکھا۔

چند ہی منٹ میں اطلاع پاکر دارالعلوم کے دوسرے نائب مہتمم مولانا نصیر احمد خاں صاحب اور پھر جناب مولانا معراج الحق صاحب بھی تشریف لے آئے معلوم ہوا کہ صرف کولھے میں چوٹ ہے۔ اور گو صدمہ اتنا سخت پہنچا کہ بیہوشی ہوگئی تھی مگر بحمداللہ کولھے کی اصل ہڈی میں کوئی ٹوٹ پھوٹ نہیں ہوئی، وہ صرف ذرا اوپر کو چڑھ گئی ہے اور اس کے ٹکراؤ سے اوپر کی ایک آدھ پتلی ہڈی میں کچھ اثر ہوا ہے۔ ایکسرے اور اس کی رپورٹ بھی موجود تھی۔ بار بار خدا کا شکر کیا۔

مظفر نگر کے ڈاکٹر ایس یو خان نے ٹانگ کی بندش کی تھی، اور اللہ جزائے خیر دے ایسے خلوص وعقیدت سے کہ دیوبند آکر بھی کوئی فیس کسی طرح قبول نہیں کی۔ اُن کی اجازت سے لکھنؤ لے چلنے کا فیصلہ کیا۔ دیوبند سے سہارنپور تک جیپ میں چارپائی پہ لٹا کر اور سہارنپور سے لکھنؤ تک دہرہ ایکسپریس کی فرسٹ کلاس برتھ پہ لٹائے ہوئے ۲۸ رکی صبح کو ہم لوگ خدا کے کرم سے بخیریت لکھنؤ پہنچے۔

مجھ سے چھوٹے بھائی حفیظ الرحمٰن نے اپنے محب خاص اور ہم سب کے کرم فرما ڈاکٹر غلام السیدین صاحب ڈپٹی چیف میڈیکل آفیسر لکھنؤ کی اعانت سے یہاں کے بلرام پور اسپتال میں داخلہ کا انتظام پہلے سے کر رکھا تھا۔ موصوف اسٹیشن پر بھی دوسرے محبین ومخلصین کیساتھ موجود تھے، اللہ بڑی ترقیاں انھیں عطا فرمائے۔ اسپتال کی ایمبولینس میں اسٹیشن ہی سے سیدھے اسپتال پہنچے۔ ڈاکٹروں نے آن کی آن میں ایمبولینس کار ہی پر آکے والد ماجد کو دیکھا اور اسپیشل وارڈ کے کمرہ ۱۵ میں پہنچا دیئے گئے۔ ڈاکٹر جی، ایم گرگ صاحب معالج خاص ہوئے، اور الحمدللہ آج ۱۰ رجون کو، جبکہ یہ سطریں لکھی جارہی ہیں، بیٹھ کر نماز پڑھنے کے قابل ہو چکے ہیں۔ ٹانگ کی پٹی اور وزن وغیرہ جو مظفر نگر کی تجویز کے مطابق برقرار رہا تھا، جمعہ، رجون کو ایکسرے کے بعد یکسر ہٹا دیا گیا۔ اب صرف ٹانگ کی ورزش کرائی جارہی ہے، اور بحمداللہ بہتری کے تمام آثار ہوئی نمایاں ہیں۔ خدا نے چاہا تو ایک ہفتہ کے اندر اسپتال سے گھر آنے کی اجازت مل جائے گی۔

ناظرین سے بصد منت التجاہے، کہ ایسی کامل صحت کیلئے دُعا فرمائیں۔ کہ
کوئی اثر چوٹ کا باقی نہ رہ جائے۔ وَاللّٰہُ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْر

یہ کاپی آج ۱۹ رجون کو چھپنے جارہی ہے اسوقت تک قیام اسپتال ہی میں ہے ۱۱ رجون سے تھوڑا تھوڑا چلنا بھی شروع ہوگیا ہے ۲-۳ دن میں مکان آجانے کی امید کی جاتی ہے۔ ع

لکھنؤ میں انگریزی دواؤں کی قابل اعتماد دوکان
سراج احمد وکیل احمد
کیمسٹ اینڈ ڈرگسٹ
اسٹاکسٹ
ہمدرد (وقف) لیبارٹریز، دہلی
جے اینڈ جے ڈیشین، حیدرآباد
جہاں سے آپ آنکھ بند کر کے ہر دوا خرید سکتے ہیں
هول سیل اور ریٹیل کیلئے یاد رکھئے
SERAJ AHMAD VAKIL AHMAD
Chemist & Druggist
45. AMINABAD PARK
LUCKNOW-1
PHONE 24506

جب کبھی کسی عمارت یا مکان کے انہدام
کا مسئلہ درپیش ہو!
تو
ہمیں یاد فرمایئے
آپ کی خدمت کیلئے ہمہ وقت حاضر
عبدالغنی
بلڈنگ ڈیمالیشن کنٹریکٹرس
۶- کلب روڈ
بمبئی ۸

علم حدیث اور فقہ پر اہم اور مستند کتابیں.

صحیح بخاری ۵،۲۷۵ احادیث نبوی کا بیش بہا خزانہ دو گراں بہا ترجمہ مع ضروری فوائد جو گذشتہ پچاس سال سے اہل علم میں مقبول اور مستند ہے.

ترجمہ اردو مع عربی متن مکمل سٹ ۷۰/-

مکمل اردو ترجمہ قیمت کامل سٹ ۵۰/-

تفہیم البخاری سات ہزار احادیث کا مستند اور سلیس ترجمہ۔ اطمینان بخش ترجمانی اور عام فہم تشریح کے ساتھ مطالب حدیث و معارف نبوی کا شاندار گلدستہ قیمت مکمل سٹ ۱۰۰/-

ایضاح البخاری احادیث کی سب سے مستند کتاب (بخاری شریف) کی اردو شرح۔ افادات حضرت مولانا فخر الدین صاحب (شیخ الحدیث دار العلوم دیوبند) ۳، حصے طبع ہو چکے ہیں. قیمت فی حصہ ۲/۲۵

صحیح مسلم مکمل امام مسلم کی جمع کردہ بارہ ہزار احادیث نبوی کا قابل قدر بیش بہا مجموعہ۔ اصل عربی مع مقابل اردو ترجمہ از حضرت مولانا وحید الزماں صاحب چھ جلدوں میں کامل۔ قیمت مکمل سٹ ۷۰/-

شمائل ترمذی و خصائل نبوی اردو شمائل ترمذی کی عارفانہ و فاضلانہ شرح جس میں احادیث کی روشنی میں حضور کی سیرت و صورت، عادات، خصلتیں، معمولات و لباس وغیرہ کی تفصیل ہے۔

قیمت ۶/-

مظاہر حق (اردو مع متن عربی) حدیث کی مشہور و مقبول ترین کتاب مشکوٰۃ شریف کی اردو زبان میں شرح۔ پانچ جلدوں میں مکمل۔ قیمت مجلد کامل ۷۵/-

ترجمان السنہ مکمل (تالیف، مولانا بدر عالم میرٹھی مہاجر مدنی) اردو زبان میں ضروری تشریح و مباحث کے ساتھ ارشادات نبوی کا جامع اور مستند ذخیرہ ہے۔ حدیث کے مستند لٹریچر میں یہ کتاب بلاشبہ عدیم النظیر ہے۔

قیمت جلد اول ۱۶/- جلد دوم ۱۲/- جلد سوم ۱۲/- جلد چہارم ۱۶/-

زاد سفر "ریاض الصالحین" کا اردو ترجمہ از امتہ اللہ تسنیم یہ کتاب بہترین مصلح و مرشد کا کام کرتی ہے۔ عنوان کے نیچے پہلے قرآن مجید کی آیات مع ترجمہ پھر احادیث ہیں۔ (دینا اور دین) قیمت جلد اول ۶/- دوم ۵/۵۰

فتاویٰ دار العلوم دیوبند افادات حضرت مفتی عزیز الرحمٰن عثمانی قدس سرہٗ، دار العلوم دیوبند سے پوچھے گئے ہزارہا فقہی سوالات اور ان کے جوابات کا یہ بے نظیر مجموعہ جو اب تک بطور اوراق میں محبوس تھا مولانا ظفیر الدین صاحب مفتاحی نے ۶ جلدوں میں مرتب کیا ہے۔ قیمت کامل سٹ ۱۰۵/-

فتاویٰ رشیدیہ حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی قدس سرہٗ کی شخصیت علمی حلقہ میں کسی تعارف کی محتاج نہیں ہے۔ آپ کو تمام علوم اسلامیہ میں منصب امامت حاصل تھا مگر خصوصی مناسبت آپ کو فقہ و حدیث میں تھی۔ زندگی کے تمام ضروری مسائل کے بارے میں آپ کے فتاویٰ کا مجموعہ قیمت ۱۰/-

ملنے کا پتہ کتب خانہ الفرقان کچہری روڈ لکھنؤ

اکابر و مشائخ کے سوانح و تذکرے

تاریخ دعوت و عزیمت (از مولانا سید ابوالحسن علی ندوی) عالم اسلام کی اصلاحی و تجدیدی کوششوں کا تاریخی جائزہ، نامور مصلحین اور ممتاز اصحاب دعوت و عزیمت کا مفصل تعارف، ان کے علمی و عملی کارناموں کی روداد اور ان کے اثرات و نتائج کا تذکرہ تین حصوں میں مکمل ۲۹/

تذکرۃ الرشید قطب العالم مولانا حافظ رشید احمد گنگوہی کی سوانح حیات حضرت مولانا عاشق الٰہی کے قلم سے اس کتاب کے مطالعہ سے ایمان میں جدید تازگی محسوس ہوتی ہے۔ دو حصوں میں یکجا قیمت ۱۵/

تذکرہ شاہ علم اللہ حضرت سید احمد شہید کے جد اعلیٰ اور عہد عالمگیری کے ممتاز شیخ اور عارف باللہ حضرت سید شاہ علم اللہ کا تذکرہ اور ان کے ممتاز خلفاء اور نامور فرزندوں کے حالات زندگی قیمت مجلد ۴/

تذکرۃ المشائخ یہ کتاب کئی بیش بہا رسالوں کا مجموعہ ہے ہر رسالہ میں کسی کامل بزرگ و ولی اللہ کی دینی، روحانی اور عملی زندگی کا دلنواز مرقع ہے جس کے مطالعہ سے اولیاء اللہ کے نقش قدم پر چلنے کی توفیق نصیب ہوتی ہے۔ قیمت مجلد ۹/

حیاۃ عبدالحی یعنی مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کے والد ماجد حضرت مولانا حکیم سید عبدالحی (سابق ناظم ندوۃ العلماء) کی سوانح حیات جس میں ممدوح کے علمی کمالات، دینی خدمات اور ان کی عربی اردو تصنیفات پر مفصل تبصرہ کیا گیا ہے۔ قیمت ۱۱/

حیات شبلی علامہ شبلی رحمۃ اللہ علیہ کے سوانح حیات اور علمی کارنامے مرتبہ مولانا سید سلیمان ندوی قیمت ۲۱/

حیات سلیمان علامہ سید سلیمان ندوی کے سوانح حیات اور ان کے علمی کارنامے قیمت ۲۱/

سوانح قاسمی حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی کی مکمل و مفصل سوانح حیات، آپ کے علمی، اخلاقی اور مجاہدانہ کارناموں کو مولانا مناظر احسن گیلانی کے قلم نے اور بھی حسن عطا کر دیا۔ تعارف شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد مدنی نے پیش کیا ہے۔ تین حصوں میں مکمل قیمت ۱۲/

اشاعت اسلام از مولانا حبیب الرحمٰن عثمانی۔ اسلام کی اشاعت و پذیرائی کے حقیقی اسباب کیا تھے؟ کیا واقعی اسلام تلوار سے پھیلا ہے؟ ہر سوال کا مدلل جواب۔ اس موضوع پر یہ کتاب حرف آخر کا درجہ رکھتی ہے۔ قیمت مجلد ۹/

بزم صوفیہ یعنی عہد تیموری سے پہلے صوفیائے کرام حضرت خواجہ معین الدین چشتی، خواجہ نظام الدین اولیاء، خواجہ گیسو دراز اور بہت سے صوفیائے کرام کے مستند حالات زندگی اور تعلیمات۔ کثیر اضافوں کے ساتھ دوسرا ایڈیشن قیمت ۱۸/

تاریخ دیوبند گذشتہ ایک صدی میں مسلمانوں کا سب سے بڑا دینی کارنامہ اسلامی علوم و فنون کی عظیم درسگاہ دارالعلوم دیوبند کی علمی، تاریخی، دینی و دنیاوی اور اکابر علمائے کرام کے حالات قیمت ۸/

تاریخ مشائخ چشت جس میں حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحب مدظلہ نے نبی اکرم سے اپنے پیر و مرشد حضرت مولانا خلیل احمد صاحب گنگوہی تک کے اپنے سلسلۂ مشائخ کے وقیع حالات، ان کی زندگی کے اہم کارنامے اور گوناگوں اوصاف ان کے تعلق باللہ اور حضور کی ذات پر بھروسہ اور اعتماد کے عجیب واقعات تحریر فرمائے ہیں۔ قیمت مجلد ۹ روپیہ

ملنے کا پتہ: کتب خانہ الفرقان کچہری روڈ لکھنؤ

تصوّف کیا ہے؟
مولانا محمد منظور نعمانی
مولانا سید ابو الحسن علی ندوی
اور
مولانا محمد اویس ندوی
کی مشترکہ نایاب تصنیف
اپنے کرم فرما حضرات کے مسلسل اصرار پر دوبارہ شائع کی جارہی ہے
یہ کتاب اپنے اختصار کے باوجود انصاف و تحقیق اور مباحث
کے سلجھاؤ کے لحاظ سے اپنے موضوع کی ضخیم کتابوں کے مقابلہ
میں بہت ممتاز سمجھی گئی ہے۔ آٹھ گرانقدر مقالوں پر مشتمل ہے۔
بہترین ونڈ الکس کی طباعت — معیاری کاغذ — قیمت — مجلد صرف -/۵
انشاء اللہ ماہ جولائی کے وسط تک شائع ہوجائے گی!
ناشر:۔ کتب خانہ الفرقان۔ کچہری روڈ، لکھنؤ
آپ بھی اپنی جلد کو
خوب سے خوب تر بنائیے!
اپنی جلد کو نرم، ملائم و صاف رکھنے کے لیے اور
مہاسوں اور دوسری جلدی تکلیفوں سے
بچنے کے لیے صافی سے اپنا خون صاف رکھیے۔
صافی
خون صاف کرتی ہے
جلد کو نکھارتی ہے
SAFI
صافی
خون صاف کرنے کی قدرتی دوا
ہمدرد
HDG-3137

بریلوی فتنہ کا نیا روپ
کتب خانہ الفرقان کی تازہ ترین پیشکش
جس میں
بریلویت کے ایک نئے نقیب ارشد القادری صاحب کی کتاب "زلزلہ" کا نہایت تحقیقی جواب اور تنقیدی جائزہ
مولانا محمد عارف صاحب سنبھلی
استاذ دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ
نے پیش کیا ھے
انشاءاللہ جولائی ۱۹۷۳ء میں منظر عام پر آ رہی ہے
اس کے مطالعہ سے معلوم ہوگا کہ
ارشد القادری صاحب نے زلزلہ میں علماء دیوبند پر جو الزامات لگائے ہیں، وہ صرف دھوکا اور فریب ہیں، ان میں ذرہ برابر بھی سچائی نہیں ہے
توحید اور شرک کی حقیقت پر ایسی روشنی ڈالی گئی ہے اور "علم غیب" اور "تصرف" ان دونوں مسئلوں کی ایسی تنقیح و تحقیق کی گئی ہے جس کے بعد کسی غلط فہمی کی گنجائش نہیں رہتی
آخر میں
بریلی کے تکفیری فتنہ کی تاریخ اور تعارف پر ایک مستقل بصیرت افروز اور حیرت آفریں مضمون ہے
شروع میں مولانا محمد منظور نعمانی کا ایک مفصل مکتوب ہے
وہی گویا اس کتاب کا پیش لفظ ہے۔
قیمت ۵ روپے
ملنے کا پتہ: کتب خانہ الفرقان، کچہری روڈ، لکھنؤ

Regd. No. LW/NP-62

Monthly **AL FURQAN** Kutchery Road Lucknow U. P.

VOL. 42 NO. 3, 4, 5 SPECIAL NUMBER APRIL, MAY, JUNE.

مُدیر

محمد منظور نعمانی

اپریل - مئی - جون ۱۹۷۵ء
ماہنامہ الفرقان لکھنؤ
اشاعت خاص
دوسرا انتخاب نمبر
سنہ ۱۹۴۷ء سے سنہ ۱۹۵۸ء تک کے فائلوں کے منتخب مضامین
مدیر
محمد منظور نعمانی
چندہ
سالانہ ۱۲/-
عام شمارہ کی قیمت ۱/۲۰
اشاعت خاص کی قیمت 5/-
غیر ممالک سے
ایک پونڈ بحری ڈاک سے
پاکستان سے ۲۰/-
یہاں سرخ نشان اس بات کی علامت ہے کہ آپ کی مدت خریداری ختم ہو گئی۔ براہ کرم آئندہ کے لیے سالانہ چندہ (۱۲/-) ارسال کریں، اگر خریداری جاری رکھنے کا ارادہ نہ ہو تو فوراً مطلع فرمائیں ورنہ اگلا شمارہ بصیغۂ وی۔پی ارسال ہوگا۔
ناظم دفتر الفرقان

فہرستِ مضامین

باب ۵ ۔ حکمت وموعظت

باب ۶ ۔ مردانِ حق

ضروری دفتری اطلاعات

یہ نمبر اپریل، مئی، جون کا مشترک شمارہ ہے۔ اسکے بعد جولائی کا شمارہ انشاءاللہ ۱۰ر جولائی تک شائع ہوگا۔

یہ "دوسرا انتخاب نمبر" بھی "پہلے انتخاب نمبر" کی طرح خریداروں کی موجودہ تعداد سے کچھ زیادہ چھپوایا گیا ہے (اس کی قیمت بھی پانچ روپے ہے) جو صاحب صرف یہ نمبر طلب فرمانا چاہیں وہ طلب کر سکتے ہیں۔ جو حضرات اس نمبر سے خریداری قبول فرمائیں گے ان کو یہ نمبر خریداری کے حساب ہی میں پیش ہوگا۔

دفتر الفرقان اور کتب خانہ الفرقان کے پتہ میں تبدیلی ۔ نوٹ کر لیجئے ___
اب الفرقان کا دفتر اور کتب خانہ لکھنؤ ہی میں کچہری روڈ سے دوسری جگہ منتقل ہوگیا ہے۔ اب پتہ اس طرح لکھیے ۔ ۳۱ - نیا گاؤں مغربی ۔ لکھنؤ (یو۔پی)

پاکستانی خریداروں سے: الحمدللہ اب ایک عرصہ کے بعد الفرقان پاکستان جانے لگا ہے۔ پاکستانی حضرات اپنا چندہ مبلغ -/۲۰ روپیہ ادارہ اصلاح وتبلیغ، آسٹریلین بلڈنگ لاہور کو ارسال فرماکر رسید ہمیں ارسال فرمادیں۔

ناظم دفتر الفرقان وکتب خانہ الفرقان، ۳۱ - نیا گاؤں مغربی - لکھنؤ (یو۔پی)

سُخنہائے گُفتنی

بسم اللہ، والحمد للہ، والصلوٰۃ والسلام علیٰ سیدنا محمد رسول اللہ وآلہٖ وصحبہٖ ومن والاہ ○

جیساکہ ناظرین کرام کو معلوم ہے اب سے تقریباً ڈھائی سال پہلے جب الفرقان کے اجراء پر چالیس سال پورے ہو رہے تھے تو یہ خیال دل میں پیدا ہوا کہ چالیس سال کی اس طویل مدت میں مختلف موضوعات اور مسائل پر بہت سے ایسے مضامین اور مقالات الفرقان میں شائع ہوتے رہے ہیں جن کی آج بھی ویسی ہی ضرورت اور اُن میں وہی افادیت ہے جو اُس وقت تھی جب وہ لکھے گئے تھے، مگر اب بس الفرقان کے پُرانے فائلوں میں دفون ہیں، اور اُسکے موجودہ ناظرین میں یقیناً ۸۰-۹۰ فیصد سے زیادہ وہ ہیں جن کی نظر سے وہ مضامین نہیں گزرے اور وہ اُن سے بالکل بے خبر ہیں ــــــ اُسی وقت یہ تجویز ذہن میں آئی تھی کہ ایسے مضامین کا انتخاب کرکے الفرقان کے ایک "خاص نمبر" کی شکل میں اُن کو پھر شائع کردیا جائے ــــــ لیکن جب اس نظر سے اُس کے پُرانے فائلوں کی ورق گردانی کی گئی تو اندازہ ہوا کہ ان سب مضامین کو ایک نمبر میں نہیں سمیٹا جاسکے گا بلکہ متعدد نمبر شائع کرنے ہوں گے اور یہی طے کرلیا گیا ــــــ اس فیصلہ کے مطابق "پہلا انتخاب نمبر" گزشتہ سال (۱۹۷۴ء) اسی جون کے مہینے میں ڈھائی سو صفحات پر شائع ہوا تھا، اس میں ان ابتدائی تیرہ سال کے منتخب مضامین جمع کردیئے گئے تھے، جب الفرقان بریلی سے شائع ہوتا تھا[1] ــــــ الحمد للہ اس نمبر کو اُمید سے زیادہ مقبولیت حاصل ہوئی، خاص طور سے اس کے وہ مضامین بہت مفید سمجھے گئے اور بہت قدر سے پڑھے گئے جو الفرقان کے ابتدائی دَور میں مشرکانہ عقائد اور رسُوم و بدعات پر لکھے گئے تھے، یا جن میں موجودہ مسلمانوں کے قومی مزاج کے فساد و بگاڑ کی نشان دہی اور اصلاح کی کوشش کی گئی تھی۔

---

[1] اس نمبر کی کچھ کاپیاں اب بھی دفتر الفرقان میں باقی ہیں، شائقین طلب فرما سکتے ہیں۔ قیمت، پانچ روپے علاوہ محصول ڈاک ــ ناظم دفتر الفرقان لکھنؤ

ٹھیک سال بھر بعد اب یہ "دوسرا انتخاب نمبر" ناظرین کی خدمت میں پیش کیا جا رہا ہے۔ اس میں الفرقان کے لکھنوی دور کے ابتدائی گیارہ بارہ سال (۱۹۴۷ء سے ۱۹۵۸ء تک) کے منتخب مضامین جمع کرنے کی کوشش کی گئی ہے ـــــ جیساکہ ناظرین کرام دیکھیں گے یہ مضامین مختلف النوع ہیں ـــ ان سب میں قدر مشترک یہ ہے کہ ان میں کے ہر مضمون میں مسلمانوں کی نظری، فکری یا عملی غلطیوں، یا حالات و اطوار کی خرابی کی اصلاح کی کوشش کی گئی ہے اور دین کی محکم تعلیمات اور عقل سلیم کی روشنی میں ان کو اس زندگی اور فکر و عمل کی اس صراط مستقیم کی دعوت دی گئی ہے جو اُن کے لئے دُنیا و آخرت میں صلاح و فلاح کی واحد راہ ہے۔

پہلے انتخاب نمبر کی طرح اس نمبر کے مضامین و مقالات کو بھی چھ عنوانات یا چھ بابوں میں تقسیم کر دیا گیا ہے۔

یہاں اس کا اظہار ضروری ہے کہ ان دس بارہ سال کے فائلوں سے جو مضامین اس "دوسرے انتخاب نمبر" کے لئے منتخب کئے گئے تھے صفحات میں گنجائش نہ ہونے کی وجہ سے وہ سب اس میں شامل نہ ہو سکے، اور متعدد اہم مضامین رہ گئے۔ اگر اللہ تعالیٰ کو منظور ہوا تو آئندہ سال "تیسرے انتخاب نمبر" میں وہ شامل کئے جا سکیں گے، البتہ ایک دو مضمون جن کی کتابت بھی ہو چکی تھی اور گنجائش ختم ہو جانے کی وجہ سے ان کو روک لینا پڑا، انشاء اللہ آئندہ مہینے جولائی کے شمارہ میں وہ شامل کر دیئے جائیں گے۔

اس وقت بمشکل اتنا کاغذ دستیاب ہو سکا ہے کہ یہ نمبر تقریباً دو سو صفحات پر شائع کیا جا رہا ہے۔ اس کی کتابت اسلئے زیادہ باریک قلم سے کرانی پڑی کہ زیادہ سے زیادہ مضامین کھپ سکیں، اگر اسی قلم سے کتابت ہوتی جس سے الفرقان کے عام شمارے لکھے جاتے ہیں تو یہ مضامین ڈھائی سو صفحات سے کم میں نہ سما سکتے۔

نگاہِ اوّلیں ـــــــ

اب سے ٹھیک ڈیڑھ مہینے پہلے ۲۵ر مارچ کو شاہ فیصل مرحوم شہید کئے گئے (اللہ تعالیٰ ان کی تربت پر رحمت و رضوان کی بارش کرے) بادشاہوں اور حکومت کے سربراہوں کی موت و حیات بھی عام انسانوں کی موت و حیات کی طرح روزمرّہ کے واقعات و حوادث ہیں۔ لیکن شاہ فیصل مرحوم کی شہادت کا حادثہ عالم اسلام کے اُن عظیم اور غیر معمولی حوادث میں سے ہے جو صدیوں میں کبھی واقع ہوتے ہیں ـــ اس حادثہ کے بعد الفرقان کا یہ پہلا شمارہ شائع ہو رہا ہے۔ اسمیں "نگاہِ اوّلیں" کے تحت اسی حادثہ پر لکھا گیا ہے۔

جیساکہ ناظرین کرام کو معلوم ہے مولوی عتیق الرحمٰن کئی سال سے ایسے حال میں ہیں کہ الفرقان کے لئے سطر دو سطر بھی نہیں لکھ پاتے لیکن شاہ فیصل مرحوم کے حادثہ کا اُن پر غیر معمولی اثر ہوا، اور ان کی طبیعت اپنے

احساسات و تاثرات سپردِ قلم کرنے کیلئے بیچین ہوئی، انھوں نے اس نقطۂ نظر سے لکھنے کی کوشش کی ہے کہ
کے کام اور خصوصیات کو صحیح طور پر سمجھا جائے اور اُس سے روشنی حاصل کرنے کی کوشش کی جائے۔ ناظرین
"نگاہِ اولیں" کے ذیل میں اسی کو پڑھیں گے۔

افسوس ہے کہ اپنی خواہش اور کوشش کے باوجود اس نمبر کی کتابت کیلئے بھی اچھے کاتبوں کا وقت نہ
مل سکا۔ جو صاحب الفرقان لکھا کرتے تھے اُن کی صحت طویل مدت سے خراب ہے۔ اسلئے الفرقان کی کتابت
کا نظام تقریباً ڈیڑھ دو سال سے خراب ہی چل رہا ہے۔ اللہ ہی سے فریاد اور دُعا ہے۔

الفرقان کا حال:

اللہ تعالیٰ کا یہ بہت ہی عظیم انعام و احسان ہے کہ الفرقان کے ناظرین عموماً وہ ہیں جو اسکے صرف "خریدار"
نہیں ہیں بلکہ اسکو دینی خدمت کا ایک سلسلہ سمجھ کر اس سے لوجہ اللہ محبت و ہمدردی رکھتے ہیں، اُنکا حق ہے کہ الفرقان
کا حال اُنکے علم میں رہے ــــــ اسوقت صورت یہ ہے کہ الفرقان کے مستقل صفحات صرف ۴۸ ہیں اور
چندہ بارہ روپے ہے (جو خود میرے نزدیک بھی بہت زیادہ ہے) لیکن کاغذ کی قیمت اور دوسرے مصارف میں
اسقدر اضافہ ہوا ہے کہ خریداروں سے جو کچھ آتا ہے وہ رسالہ کی تیاری و اشاعت کے اخراجات اور دفتری مصارف کے
لئے پورا نہیں ہوتا ــــــ اس کمی کے پورا ہونیکی شکل بظاہر اسباب یہی تھی کہ چند مستقل اشتہارات فراہم ہو جائیں لیکن
ایسا نہیں ہو سکا۔ ان گزشتہ سال پہلے انتخاب نمبر کیلئے بعض مخلصین نے چند اشتہارات فراہم کر کے بھیجے تھے
وقت بھی اس دوسرے انتخاب نمبر کیلئے انھوں نے یہ زحمت فرمائی (جس سے نمبر کی تیاری میں بڑا سہارا ملا) اللہ تعالیٰ
ان کو بہتر سے بہتر جزا اس تعاون علی الخیر کی عطا فرمائے۔

اس سلسلہ میں بعض مخلصین نے یہ مشورہ دیا ہے کہ الفرقان میں اشتہارات زیادہ نہ شائع کئے جائیں، اشتہارات
کی فراہمی کی کوشش کے بجائے ایسے حضرات کو "خصوصی معاون" بننے کی ترغیب دی جائے جو صاحبِ استطاعت
اور صاحبِ توفیق ہوں (وہ "معاون خصوصی" کی حیثیت سے سالانہ چندہ سو روپے دینا قبول فرمائیں۔
جن مخلص دوست نے یہ مشورہ دیا ہے انھوں نے تین معاونین کا چندہ بھی ساتھ ہی روانہ فرما دیا
اللہ تعالیٰ اُن کو اپنے خاص فضل و کرم سے نوازے ــــــ اس مشورہ کے مطابق اب یہ طے کر لیا گیا ہے
الفرقان کے محبین و مخلصین اشتہارات کی فراہمی کیلئے زحمت نہ فرمائیں۔ ہاں جو صاحبِ استطاعت اور باتوفیق
حضرات الفرقان کی مشکلات میں مدد فرمانا چاہیں وہ "معاون خصوصی" بننا قبول فرمالیں ــــــ واجرھم علی اللہ

محمد منظور نعمانی ۔ ۱۳ جمادی الاولیٰ ۱۳۹۵ھ ۔ ۲۴ مئی ۱۹۷۵ء

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

عتیق الرحمٰن سنبھلی

نگاہِ اولیں

فیصل شہید - رحمہ اللہ رحمۃ الابرار الصالحین

بڑی مدتوں کے بعد، دعاؤں اور آرزوؤں کے بعد، یاس اور ناامیدیوں کے بڑے ہی گہرے اندھیرے کی تہہ سے، ایک آفتاب امیدوں کے چراغ جلاتا ہوا نکلا تھا۔ مگر عین عروج کی حالت میں یہ ایسا یکایک غروب ہو گیا کہ امیدوں اور امنگوں کا یہ زندگی سے سرشار قافلہ، آج دو ماہ گزر جانے کے بعد بھی ایک سکتے کے عالم میں، تصویرِ غم بنا کھڑا ہے!

ڈھلتے ڈھلتے یکسر زرد ہو کر ڈوبنے والا آفتاب بھی اپنے پیچھے تھوڑی بہت روشنی چھوڑتا ہے اور دنیا اس کے ڈوبنے کے ساتھ ہی ایکدم اندھیری نہیں ہو جاتی۔ پھر جو آفتاب عین نصف النہار میں غروب ہوا ہو اس کے پیچھے ایکدم اندھیرا چھا جانے اور امیدوں کی دنیا اسی دم تاریک ہو جانے کا کیا سوال؟ روشنی ابھی پوری طرح قائم ہے۔ امیدیں ناامیدی سے بدلنے پر مجبور نہیں ہوئی ہیں۔ مگر ان امیدوں میں وہ زندگی اور شگفتہ روئی جو ایک آفتاب کے وجود ہی پہ منحصر ہے، اس وقت تک کہاں سے بحال ہو سکتی ہے جب تک کہ کوئی آفتابِ تازہ اس ڈوبنے والے کی جگہ نہ لے؟ اللہ سے دعا ہے کہ وہ ہماری اس ضرورت اور آرزو کو پورا فرمائے!

امیدوں کا یہ آفتاب سعودی عرب کے فرمانروا شاہ فیصل بن عبدالعزیز کی صورت میں عالمِ اسلام پر طلوع ہوا تھا۔ شاہ فیصل (برّد اللہ مضجعہ) نے ۱۹۶۴ء میں ایسے وقت میں حکومت کی باگ ڈور سنبھالی جبکہ ان کا ملک ہی ایک بحرانی دور سے نہیں گزر رہا تھا بلکہ پوری عرب

دنیا میں بھی ایک ہلچل مچی ہوئی تھی، نزاکتوں سے بھری ہوئی وہ سنگین کیفیت وہاں طاری تھی جو کسی ایسے خطے کی انقلابی روح اور (وہاں) سامراجی مفادات رکھنے والی بڑی بیرونی طاقتوں کے درمیان بھرپور کشمکش سے پیدا ہوتی ہے، جہاں انقلابی شعور عام نہ ہو پایا ہو، جہاں ہر سطح پر کوتاہ بین اور کمزور کیرکٹر کے ایسے حلقے پائے جاتے ہوں جو سامراجی طاقتوں کو مورچے باندھنے کی گنجائش فراہم کرتے ہوں، یا کم از کم اس کا شبہ اُن کے بارے میں کیا جا سکتا ہو۔ عرب دنیا اُس وقت اسی کیفیت سے دوچار تھی۔ باہر کی طاقتوں ہی سے نہ جاگ پڑنے والی انقلابی روح نہیں ٹکرا رہی تھی بلکہ کہیں بجا اور کہیں بیجا اپنوں سے بھی اسکا ٹکراؤ تھا اور جیسا کہ قدرتی طور پر ہوتا ہے یہ ٹکراؤ روز بروز زیادہ اندھا اور زیادہ بھیانک ہوتا جا رہا تھا، اس کے دائرے کا پھیلاؤ بھی بڑھتا جاتا تھا، حتیٰ کہ پورا عرب خطہ آپس کی لاگ ڈانٹ، باہمی جدال و قتال اور ایک حکومت کی دوسری حکومت کے خلاف سازشوں اور جوابی سازشوں کی نحوست میں اس طرح غرق ہوا کہ ۱۹۶۷ء میں اسرائیل کے ہاتھوں آخری درجہ کی ذلت کا داغ عربوں کے چہرے پر لگا جسے کسی وقت بھی سمندر میں ڈبو دینے کی باتیں وہ کرنے لگے تھے۔

شاہ فیصل اپنی اعتدال پسندی اور مصلحت شناسی کی بناء پر ۶۷ء کے اس اندوہناک لمحے تک خود بھی اس خطے کے تیز گام اور آتش زبان انقلاب پسندوں کی نظر میں ناپسندیدہ بلکہ اُن کے حد سے گزرے ہوئے لعن طعن تک کا نشانہ بنے رہے اور اس لیے اُن کے وہ جوہر عام طور سے لوگوں پر نہیں کھل سکے جو انھیں عربوں کی قیادت کے لیے ایک موزوں ترین فرد ٹھہرا رہے تھے۔ گو دیکھ سکنے والوں کے لیے (جوہر) اس لعن طعن کی دھول میں بھی مخفی نہیں رہ پا رہے تھے ــــــ لیکن ۶۷ء کے حادثے نے انتہا پسند انقلابیت کا نشہ علمبردارانِ انقلاب سے دور کر دیا۔ اندرونی تناؤ اور لاگ ڈانٹ کی فضا ہوئی۔ اور عرب دنیا ناسازگار حالات کی جس دلدل میں پھنس گئی تھی وہاں سے نکل سکنے کے لیے سارے طاقتوں کے باہمی تعاون کی ضرورت ایک واجب التسلیم حقیقت بن گئی اور ہر عرب طاقت کو اس کا کھلا موقع فراہم ہوا کہ حالات کی اس آخری درجہ کی ناسازگاری سے عہدہ برآ ہونے اور ذلت کو بدلنے کی مہم میں اپنی صلاحیت اور اہلیت کا مظاہرہ کرے، تو مرحوم شاہ کے وہ جوہر جو اپنے کام آنے کے لیے بیتاب تھے، ایک ایک کر کے کھلنا شروع ہوئے اور بہت تھوڑے سے عرصہ میں یہ جانے لگا کہ عربوں کے موجودہ حالات میں اُن کی قیادت موجودہ لوگوں میں سے جس کے حصے میں آنا تھی اُس کی طرف کردہ تجلیٰ شروع ہو گئی ہے۔

عربوں کو فوری نوعیت کی سب سے پہلی ضرورت، سربراہوں کے دلی اتحاد کی تھی ــــ اُن

کے دلی اتحاد کی، جن کے دل ایک دوسرے کے ہاتھوں بری طرح زخمی، بری طرح پھٹے ہوئے یا شکایت و بدگمانی کے داغوں سے بھرے ہوئے تھے ـــــ یہ چیز کشادہ دلی چاہتی تھی، حلیمی اور بردباری کی طلبگار تھی، ماضی کو بالکل بھول جانے کا حوصلہ اس کے لیے درکار تھا۔ شاہ فیصل اس کشادہ دلی، حلیمی اور بلند حوصلگی کی عملی مثال بن کر ان سربراہوں کی مجلس میں آئے وہ ان لوگوں سے عمر میں اور اُن کی دستگیری کے سب سے زیادہ سنجیدہ اور بے چین داعی بن کر کھڑے ہوئے جنھوں نے بار بار اُن کا بدگمانہ ہاتھ ہی نہیں جھٹکا تھا بلکہ طرح طرح سے منہ بھی چڑھایا تھا۔ شرافت اور اخلاقی رفعت کے اس ایک چراغ نے سب چراغوں کو روشن کر دیا، اور سب کو حوصلہ ملا کہ ماضی کو یکسر بھول کر مستقبل کے لیے فکر و عمل کا باب شروع کیا جائے۔

اس اتحاد کی برقراری کے لیے ضروری تھا کہ نام پانے اور لیڈری چمکانے کا سودا کسی سر میں پرورش نہ پائے بلکہ ایسی بات کا خواہ مخواہ شبہ پیدا کرنے والی صورتوں سے بھی بچ کے رہا جائے... سیاست و قیادت کی دنیا میں یہ خانقاہی ریاضت کا سبق! اس پہ چلنا تو اب خانقاہوں میں بھی آسان نہیں رہا ہے! لیکن ـــــ خدا بے پایاں رحمتیں اس شہید کی قبر پر نازل کرے ـــــ اس نے اس سخت ترین چڑھائی کو سر کرنے کا بھی حوصلہ عملی مثال سے ان ارباب سیاست میں پیدا کیا۔ اُس نے ۱۹۶۷ء کی جنگ میں تباہ ہو جانے والے تین ملکوں (مصر، شام اور اردن) کی اقتصادیات کا غیر معمولی بوجھ اپنی مملکت کے ذمے کر کبھی کسی طرح کا نام یا خصوصی مقام اس کے صلے میں نہیں چاہا اور نہ کبھی اسے جتانے کا کوئی ڈھنگ اپنایا۔ بلکہ آج تک جاری رہنے والا یہ عمل مسلسل اس طرح کیا جیسے کوئی سراسر فرض ادا کرتا اور اجر کی طمع صرف اس کی توفیق دینے والے سے رکھتا ہے۔

دوسری اہم وقتی ضرورت عرب محاذ کی یہ تھی کہ اُن کی جو تین ریاستیں (یعنی مصر، شام اور اردن) اسرائیل کے سامنے پڑتی ہیں اور کسی بھی عرب اسرائیل جنگ میں عرب دنیا کا دفاع انہی کی سرحدوں پر اُن ہی کے ذریعہ ہوتا ہے، ۱۹۶۷ء کی جنگ میں یہ تینوں بیک وقت جس بری طرح تباہی کا شکار ہو گئی ہیں اُس خستہ اور تباہ حالی سے انھیں نکالنے کے لیے غیر معمولی امداد بہم پہونچائی جائے تو جیسا کہ ابھی ضمناً تذکرہ آیا اس امداد کا سب سے بڑا مالی بوجھ جس عرب ملک نے اُٹھانے کی پیش کش کی وہ شاہ فیصل ہی کا ملک سعودی عرب تھا۔ یہ پیش کش بلا تعیین مدت اُس وقت تک کے لیے کی گئی جب تک کہ یہ شکستہ حال مملکتیں اس کی ضرورتمند رہیں اور اس پہ عملدرآمد بھی بلا تاخیر نہایت کشادہ دلی کے ساتھ شروع کر دیا گیا۔ اور وہ آج بھی اس نوعیت کے ساتھ جاری ہے جیسے کہ خود سعودی عرب کی ضرورتوں پہ یہ صرف ہو رہا ہو۔

اس مالی امداد میں دوسری دولتمند عرب ریاستوں نے بھی اپنی استطاعت کے بقدر بے شک پورا حصہ لیا ہی مگر یہ کہنا شاید غلط نہ ہوگا کہ ان میں بھی اتنی بھرپور کشادہ دلی اور پھر ایک غیر متعین مدت تک اس پر برقرار کا حوصلہ اور جذبہ پیدا کرنے میں مرحوم شاہ کے جوش اور جذبہ اور عمل کا بڑا دخل تھا۔ ورنہ جس خود غرضی کے زمانے میں ہم رہ رہے ہیں اُس میں برادرانہ خلوص اور جذبہ کی اتنی بلند پایہ مثالیں نصیب عام نہیں ہیں۔

یہ وہ ضروریات تھیں جو عربوں کو ۶۷ء کی ذلت کے گڑھے سے نکلنے کے عزم اور ارادہ کے بعد شرط اول کے طور پر درکار تھیں۔ لیکن ان کی فراہمی بے کار ہی ہوتی ۔ اگر اس عزم و ارادہ کو حرکت و عمل کا وہ راستہ ہاتھ نہ آتا جو کامیابی کی منزل تک پہنچا سکے ۔ اور وہ قیادت میسر نہ آتی جو راستہ کو ہموار کرنے کی صلاحیتوں سے آراستہ، اس کے پیچ و خم سے عہدہ برآ ہونے کے فن سے آگاہ، ذوقِ عمل سے سرشار، امید و اعتماد سے لبریز اور اس سب کے ساتھ تازہ دم بھی ہو! کہ سفر بہت طویل اور طرح طرح کی پیچیدگیوں سے بھرا ہوا تھا ______

کامیابی کے لیے شرط ٹھہرنے والی اس راہ عمل کی یافت اور اس کے لیے موزوں قیادت کی یہ ضرورت بھی عربوں کے لیے جہاں سے پوری ہو سکی وہ شاہ فیصل مرحوم ہی کی ذات تھی!

عربوں کو جس طرز عمل اور راہ عمل نے ۶۷ء کے گڑھے میں ڈالا تھا وہ "عصا بغیر کلیمی" کی راہ تھی۔ جنگ کی واقعی تیاری اور دشمن سے دو بدو ہونے کی ٹھوس اہلیت کچھ نہیں تھی لیکن بگل اتنے زور سے بجایا جا رہا تھا کہ جیسے کسی بات میں کوئی کسر نہیں ہے۔ اسرائیل کو بھی میدان میں آنے کا چیلنج تھا، امریکہ کو بھی للکار رکھی، بیچ بچاؤ والوں سے بھی ہٹ جانے کی ضد، لیکن سب کچھ ہوا پر، تمام تر نمائشی دم خم اور محض ایکٹنگ سے رعب میں لے لینے کا بر خود غلط اعتماد!

اس قسم کی ایکٹنگ اور کھوکھلی رعب آزمائی کا یہ تجربہ اپنی سیاسی فراست و مہارت کے زعم میں اور بین الاقوامی حالات کی ایک خاص سازگار نوعیت کے بل پر، اتنے دن سے کیا جا رہا تھا ــــ اور ان دونوں ہی باتوں (سیاسی فراست و مہارت اور بین الاقوامی حالات کی مساعدت) کے نتیجے میں کامیاب بھی ہوتا رہا تھا ــــ کہ اس نے شاید ہمیشہ ہی کامیاب رہنے کے بر خود غلط اعتماد میں مبتلا کر دیا۔ حالانکہ یہ طریقے بہت ہی ناگزیر حالات میں وقتی کاربر آری کے ہیں، مستقلاً انہی کو شعار بنا کر کوئی بڑے سے بڑا سیاست باز اور وقت شناس بھی اس بد انجامی سے نہیں بچ سکتا جو اس طرز عمل والی عرب قیادت اور اس کے طفیل پوری عرب دنیا کے حصہ میں آئی۔

۶۷ء کے تجربے سے یہ کام تو از خود ہی ہو گیا کہ اس بھبھکی "جنگھاڑتی" اور محض ہوائی فنکاری پر چلنے والی سیاست کا نام تک لینے کی اب کوئی ہمت نہ کرے۔ اور یہ حقیقت آخری حد تک روشن ہو گئی کہ عربوں

کو ایک باعزت زندگی کے لیے نہایت سنجیدہ، ٹھوس، حقیقت پسند، کم آواز اور زیادہ طاقت ساز پالیسی کی ضرورت ہے۔ چنانچہ پچھلی سیاست کے خوگر اور بناکار بھی ہوش و حواس درست کرتے ہی اپنے آپ کو ضرورت کے اسی نئے سانچے میں ڈھالنے لگے اور جو کچھ تگ و دو کا میدان اُن کے لیے رہ گیا تھا اُس میں اپنی مخصوص ذمہ داری کے تحت اپنے ذہن و فکر کے مطابق اسی نئے طرز پر انھوں نے کام شروع بھی کر دیا ۔۔۔ یہ کام اور اس کا میدان تھا روس کے ذریعہ اپنی جنگی طاقت کی بحالی اور اُس میں ضروری اضافہ اور اقوام متحدہ میں اپنے دوستوں کو امکان بھر اپنی حمایت اور وکالت کے لیے کھڑا کرنا۔

لیکن جو بھاری چٹان اسرائیلی جارحیت سے عربوں کے سینے پر آپڑی تھی اور جسے اپنے شرائط منوائے بغیر ہٹنے نہ دینے پر نہ صرف اسرائیل اڑا ہوا تھا بلکہ امریکہ کی پوری پشت پناہی بھی اُسے حاصل تھی ۔۔۔ اس چٹان کو اتنے کام اور اس کی پیدا کردہ طاقت سے جلدی نہیں اُٹھا سکتا تھا اس کے لیے بین الاقوامی بساط پر ایک نئی حرکت سے ایک نئی طاقت فراہم کرنے کی ضرورت تھی جو بذات خود بھی اس کام میں مؤثر ہو اور جو دوسرے راست اقدامات اپنے وسائل سے کیے جا سکتے ہوں اُن کے موقع پر یہ طاقت تحفظ کا وسیلہ بن سکتی ہو۔

اس کام کو انجام دینے کی حیثیت میں، عربوں کے درمیان اگر کوئی شخص تھا، تو وہ شاہ فیصل تھے۔ شاید اسی دن کے لیے مشیت الٰہی نے اُن سے تحریک تضامن اسلامی (اتحاد اسلامی) کی داغ بیل ۶۶ء ہی میں ڈلوا دی تھی۔ اور وہ بہت ہی لگن کے ساتھ اس کام میں لگے ہوئے تھے، جس کا مقصد یہ تھا کہ اسلامی ممالک جو مجموعی طور پر اتنے وسائل اور طاقت کے خام ذخائر کے مالک ہیں کہ دنیا کی ایک عظیم طاقت وہ ان کے صحیح اور معیاری استعمال سے بن سکتے ہیں، اپنے ان وسائل و ذخائر کو ترقی دینے اور کام میں لانے کے لیے باہمی امداد و تعاون کا ایک مضبوط اور برادرانہ نظام قائم کر کے اپنی اپنی انفرادی بہبود کا بھی سامان فراہم کریں اور اسلامی دنیا کی مجموعی طاقت، بہبود اور عالمگیر سطح پر امن کے امن دوں کی تجدید کا بھی ذریعہ بنیں جو اپنے عقیدے کی رو سے اس کی ذمہ داری ہے۔

شاہ کی نظر میں، اسلامی تعلیمات کے تقاضوں سے مربوط یہ جد و جہد ہی عرب اور غیر عرب ہر جگہ کے مسلمانوں کے ہر طرح کے مسائل کا حل تھی۔ اسلامی دنیا کے جو سربراہ مذہب کی اطاعت کا ذوق اور جذبہ رکھتے تھے وہ اس تحریک کی آواز سنتے ہی مذہبی گرمجوشی کے ساتھ اس کے ہمنوا ہو گئے جن میں یہ ذوق و جذبہ تو نہیں مگر ملّی احساس بہرحال تھا یا کم از کم سیکولرزم کے اس خبط میں مبتلا نہیں تھے کہ مذہبی اور دینی تشخص کو کسی بھی دنیوی سرگرمی کی بنیاد نہیں بنانا چاہیے انھیں بھی یہ دعوت اپنے ملک اور اپنی وسیع تر ملت

عین مفاد میں نظر آئی اور مرحوم شاہ کو اُن کی حمایت و اعانت حاصل کرنے میں بھی کامیابی ہوئی۔ بدقسمتی سے صرف عرب دنیا ہی میں اپنے کو مسلمان کہنے والے ایسے بعض حکمراں رہ گئے تھے جو اسے ایک رجعت پسندانہ حرکت اور اپنی تحریک عرب اتحاد کے خلاف سامراجی اشاروں پر ایک سازش قرار دے رہے تھے۔ ۱۹۶۷ء کے پیدا کردہ حالات نے نہ صرف یہ کہ اپنوں کا یہ واحد مخالف مورچہ بھی توڑ دیا بلکہ انھیں یہ سمجھنے پر بھی آمادہ کر دیا کہ اس تحریک سے انھیں کچھ نہ کچھ سہارا ضرور ملے گا۔ چنانچہ ۱۹۶۹ء میں اُن لوگوں کی بھی شرکت کیساتھ رباط میں پہلی مکمل اسلامی چوٹی کانفرنس منعقد ہوئی، اور اس طرح مرحوم شاہ کے لیے پوری طرح میدان کھلا کہ وہ بین الاقوامی بساط پر جس طاقت کی پوزیشن میں اسلامی دنیا کو کھڑا کرنا چاہتے تھے اُس کے لیے آزادی کے ساتھ سرگرم ہوں۔

اب تک وہ یہ ملّی خدمت کے، اور خاص طور پر عربوں کی خدمت کے، سارے کام اپنے ذاتی احساسِ ذمہ داری کے ماتحت کر رہے تھے، مگر ۱۹۷۰ء میں صدر عبدالناصر کے انتقال کر جانے کے بعد اُن کی حیثیت عربوں کے درمیان، قوم کے ایسے واحد آدمی کی بن گئی جس پر معاملات کی سربراہ کاری کا مدار تھا۔ کیونکہ اب اُن کے سے بین الاقوامی تجربہ اور قد و قامت کا کوئی دوسرا آدمی وہاں نہیں تھا اور بوجھ اُٹھانے کے اُن کے جذبے اور ہمت کا مشاہدہ سب کر رہے تھے۔ چنانچہ کسی رسمی قرارداد کے بغیر قوم کے عملی رویہ کی زبان نے قوم کی طرف سے بھی اُن پر یہ ذمہ داری عائد کر دی جو کسی کو بڑا اور سر دھرا مان لیے جانے سے عائد ہوتی ہے! ــــ اور رحمت خداوندی اُنھیں اب تک اپنی بارشوں سے نہال کرے کہ انھوں نے کوئی دقیقہ اپنی اس ذمہ داری کی ادائیگی میں فروگزاشت نہیں کیا۔ بلاشبہ اُن کے بھائی امیر نواف بن عبدالعزیز کے اس بیان میں مبالغہ کا ایک حرف بھی نہیں کہ

"ادھر چند سال سے انھیں دنیا میں کوئی دلچسپی بجز اس کے نہیں رہ گئی تھی کہ زیادہ سے زیادہ کام کریں اور زیادہ سے زیادہ ہی اپنے رب کی یاد و عبادت!"

حکمت و تدبر، توازنِ طبع و دوربینی، امیدی و استقامت کے اعلیٰ فکری و اخلاقی اوصاف کے ساتھ بے انتھک محنت اور لگن ہی تھی جس نے گنتی کے چند سال کے اندر اسلامی دنیا ــ "نیل کے ساحل سے لے کر تا بخاک کاشغر" کی شیرازہ بندی کا کام اس ایک شخص کے ہاتھوں اُس منزل تک پہونچا دیا جو فروری ۱۹۷۴ء کی لاہور اسلامی کانفرنس کے آئینہ میں دنیا کے سامنے آئی تو غیروں سے اسلامی دنیا کو ایک زندہ حقیقت منوا لینے والی اور اپنوں کو "قم باذن اللہ" کا پیام دے جانے والی چیز تھی! ــــ وہ چیز جس کی تمنا میں اسلامی دنیا کی کتنی نسلیں اس دنیا سے گزر گئیں اور ملّت کی کتنی بلند قامت ہستیاں اس کی خاطر جانفشانی میں ایک ایک رگ نچوڑ کر بھی داغ حسرت لیے ہوئے چلی گئیں!

اس طرح اس مردِ خدا و خود آگاہ نے بین الاقوامی بساط پر عربوں کے جادو گرانہ اور طلسم بندانہ وقار و اعتبار کی ہوا، ایک ٹھوس حقیقت سے ٹکرا کر، بحجم اکھڑ جانے اور ایک بھیانک خلا پیدا ہو جانے کے بعد، معجزانہ تیزی کے ساتھ ایک ٹھوس طاقت اسی بساط پر کھڑی کر کے ایک بہترین بدل اس خلا کو دیا ـــــ اور پھر اپنے خدا کے بھروسے اور اس کی دی ہوئی فراست و بصیرت اور وقت شناسی اور اپنے کی اہلیت پر اعتماد کے بعد ظاہری اسباب میں یہی وہ ٹھوس طاقت تھی جس میں پوشیدہ تحفظ کی طاقت پر تکیہ کر کے، اسرائیل نواز طاقتوں پر عرب تیل کی بند کر دینے کے راست اقدام کا وہ منصوبہ مرحوم شاہ نے بنایا جس کے نفاذ نے اس سرے سے اُس سرے تک بشمول امریکہ اُن تمام ملکوں کو سر کے بل جھکا دیا جو عربوں کے سامنے جھکنے سے زیادہ کمزوری کی بات شاید ہی کسی اور بات کو سمجھتے ہوں! ـــــ اسرائیلی جارحیت کی چٹان سے دبے ہوئے عربوں کی بے بسی کا تماشہ دیکھنے والے اور اُن سے ہار منوا لینے کے لیے اسرائیل کو شہ پر شہ دینے والے امریکہ کے وزیرِ خارجہ کے پاؤں میں "ایک مستقل چکر" اس جھٹکے کے بعد، اس نیک مقصد کے لیے پیدا ہو گیا کہ اسرائیل عربوں کی چھاتی سے ہٹے اور ہار منوا لینے کی بات بھول جائے۔

حالات کا یہ انقلاب اور ایک ٹھوس بنیاد پر اُبھرنے والا یہ دیدنی وقار و اعتبار، عربوں اور پوری ملتِ اسلامیہ کو شاہ کے قومی و ملی خلوص اور قرار نا آشنا یت و تاب کا وہ تحفہ تھا کہ اس جیسے کا ابھی وہ بہت دور تک خواب بھی نہیں دیکھ رہے تھے۔

لیکن ابھی، کر دلوں میں شکر گزاری کا جوش کم نہ ہوا تھا، زبانیں اظہارِ جذبات و احساسات سے سیر نہ تھیں، نظروں میں عقیدت و عظمت کا عالم جوں کا توں بنا ہوا تھا، یہ "مردے از غیب بروں آید" کا مصداق حکیمانہ اور مجاہدانہ و مصلحانہ قیادت کے بعد شہادت کا بھی اعزاز لے کر ۱۳ ربیع الاول م ۲۵ مارچ ۷۵ء کو اپنی اصل دنیا میں لوٹ گیا ـــــ اور ابھی جو اور بہت کچھ اُس کے چھیڑے ہوئے کام کی تکمیل کے سلسلے میں اُسی کے ہاتھوں دیکھنے کی اُمید، دل و نگاہ کا سرور بنی ہوئی تھی غم کی تصویر بن کے رہ گئی ہے۔

شاہ فیصل مرحوم کا کارنامہ صرف یہی نہیں ہے جس کا تذکرہ اوپر کی سطروں میں ہوا۔ یعنی سیاسی سطح پر مدت سے بکھری ہوئی ملت کی شیرازہ بندی، عمومی طور سے اس کے منہدم وقار کی تعمیرِ نو اور خصوصی طور پر عربوں کو ایک نئی طاقت و ہمت کی فراہمی! بلکہ اسی کے برابر کا ـــــ اور دینی نقطۂ نظر سے اس سے بھی بڑھا ہوا ـــــ اُن کا دوسرا کارنامہ یہ بھی ہے کہ سیاست کی مذہب نا آشنائی و بیگانگی کے اس دور میں،

نہ صرف مذہب کی اذان اپنے ... مسلم ادی بلکہ نے مسلم سیاست کا امام بنا دیا ــــ انھوں نے اس وقت میں جبکہ سیاست کی مذہب سے دوری، بلکہ سیاست کی مذہب کُشی کا سب سے زیادہ سرگرم اور سب سے زیادہ بلند آہنگ مرکز خود خطۂ عرب بنا ہوا تھا، اسلامیت کو پیچھے ڈال کر بلکہ طوق وسلاسل میں جکڑ کر عرب قومیت کو عربوں کا کلمۂ عُلیا اور واحد رشتۂ ارتباط و محور حیات و ممات بنانے کی وہ مہم کوشش کی جا رہی تھی کہ اس سیاق میں اسلام کا نام لینا کسی صاحب اقتدار کے لیے بھی اپنی جان و آبرو کو داؤں پر لگانے سے کم نہ تھا، عین اسی دور میں مرحوم نے صاف صاف اسلامی وحدت کی دے کر اپنی تحریک "تضامن اسلامی" کا آغاز کیا اور طعنہ زنی و تمسخر کی تمام گرد کو مضبوطی اور عزیمت سے سہا ــــ پھر وہ وقت آیا کہ عرب قومیت کی اسلام دشمنی کا وبال شکست کی ہزیمت کی شکل میں قصوروار اور بے قصور سب عربوں کے سر پر آیا اور مسلمانوں کا قبلۂ اول بیت المقدس یہودیوں کے قبضے میں چلا گیا ــــ اس ہزیمت نے "عرب قومیت" کی علمبردار قیادت کا تمام طلسم توڑ دیا اور عرب قومیت و اشتراکیت جیسے بتوں کی "کارسازی" خود ان کے پرستوں اور پرستاروں کی نظر میں بہت کچھ مشکوک ہو گئی تو اسلام اور اُس کے نام لیواؤں کو بھی اس بازی کو پلٹنے اور اسرائیل اور اس کے حامیوں سے نپٹنے کی صلاح و مشورت اور تدبیر و عمل میں شریک ہونے کی راہ ملی اور اُن کے کاروان شاہ فیصل کی اب کچھ قدر اُن لوگوں پر کھلی جو اُنھیں بے قدر کرنے میں ہی پر اب تک تُلے رہے۔

یہ موقع نفسیاتی طور پر بڑا نازک تھا۔ شاہ کو اگر سچے ایمان اور مضبوط عقیدے کی دولت نہ ہوتی اور کچھ بھی سیاست گری اُن کی تحریک اتحاد اسلامی کے پیچھے ہوتی تو وہ عرب سیاست میں وہ سب سے اونچی جگہ آسانی سے پا لینے کی نفسانی ترغیب پر، جس کے واضح امکانات حالات کے نقشے میں موجود تھے اور جو بالآخر اُن ہی کو ملی بھی، ان "بت پرستوں" کی رعایت سے اپنی اسلامیت کچھ دھیما کرنے اور کچھ پھر ان کی بھی زبان اختیار کر لینے کی طرف مائل ہو سکتے تھے۔ مگر یقیناً وہ مخلص اور صادق الایمان تھے کہ خدا نے اس نازک موقع پر اُن کی حفاظت کی۔ اور "جماعت کی آستینوں" کے "بت" چھپے ہونے کے باوجود اس صاحب ایمان نے

مجھے ہے حکم اذان لا الٰہ الا اللہ

پر نظر کرتے ہوئے اپنے اسلام کی آواز کو نئی گنجائشوں کے مطابق پہلے سے بھی کچھ بلند و موثر کیا اور بے دریغ کہا کہ بیت المقدس کا مسئلہ اصلاً عرب مسئلہ نہیں ہے بلکہ اسلامی مسئلہ ہے۔ ہم اس کی بازیافت ایک مسلمان کی حیثیت سے چاہتے ہیں۔ اسی حیثیت سے اس کے لیے بے چین ہیں اور

بے چین رہیں گے۔ یہی بات انھوں نے مسلمانوں کے مجمعوں میں کہی اور یہی غیروں سے گفتگوؤں میں، امریکی وزیر خارجہ کسنجر تک سے انھوں نے یہی کہا کہ وہ بیت المقدس کی بازیافت کے سلسلے میں اس لیے زیادہ صبر نہیں کرسکتے کہ اُن کی عمر کا پیمانہ لبریز ہو رہا ہے اور وہ وہ سجدے اس آنے والے وقت سے پہلے بیت المقدس کی آزاد سرزمین پر ادا کرنا چاہتے ہیں۔

اور صرف بیت المقدس کے مسئلے ہی کو نہیں پورے عرب اسرائیل مسئلے کو انھوں نے معقول گنجائش کی آخری حد تک عرب مسئلے کے ساتھ ساتھ عین اسلامی ذہن و مزاج کے مطابق مسلمانوں کی آفاقی برادری کا بھی مسئلہ بنانے میں کوئی کمزوری اور کوتاہی نہیں دکھائی۔ ۶۹ء کی رباط کانفرنس جو اِس زمانہ میں عالمی پیمانہ پر مسلم ممالک کے سربراہوں کا پہلا عالمی اجتماع تھی، صاف صاف عرب اسرائیل مسئلے پر ہی بلائی ہوئی تھی۔ اور یہ اس زمانے کے اسی مجذوب کا کام تھا! ــــــ اور اتنا مضبوط و مبارک بھی کہ چار سال بعد لاہور کانفرنس کی صورت میں اس کی مضبوطی و بابرکتی کا ظہور "كَشَجَرَةٍ طَيِّبَةٍ أَصْلُهَا ثَابِتٌ وَفَرْعُهَا فِي السَّمَاءِ" (گویا ایک مبارک درخت ہو جس کی جڑ زمین میں دور تک اور شاخیں آسمان سے مل رہی ہیں۔ قرآن) کا سماں باندھ گیا۔

مسلمانوں کی بین الاقوامی سطح پر اُن کی سیاست کو اس سے زیادہ مذہب آمیزی تک پہونچا دینے کے لیے ظاہر ہے کہ ایک لمبے وقت کی کوششیں درکار تھیں، مدتوں کی مذہب گریزی کی عادت اور بالکل مختلف سانچے میں ڈھل جانے والی طبیعت ارادہ ہو جانے پر بھی بتدریج ہی اور بڑی حکیمانہ "تدبیروں" سے بدل سکتی تھی۔ مرحوم شاہ نے اذان دی، دروازوں پر جا جا کے دستک دی، مسجد میں مدتوں کے بے نمازیوں کو بلوالیا اور اتنی دیر کے لیے عالمی مسلم سیاست بہر حال اپنے مذہب کی اقتدار میں آگئی! ــــ اسلام کا یہ مرد حکیم و جلیل اگر کچھ اور زندہ رہ جاتا تو اُس کے خلوص، حکمت اور لگن کے چاروں طرف پھیلے ہوئے کرشمے دیکھ کر دل کہتا ہے کہ عرب اسرائیل معرکہ کی طرح اس کام کو بھی وہ بہت امید افزا حد تک آگے بڑھا جاتا مگر اللہ کی مرضی کہ اس مرد باخدا، خدمت و سعادت کا وقت اُس نے عطا نہیں کیا۔ يفعل الله ما يشاء ويحكم ما يريد۔

عالمی مسلم سیاست کو اسلامیت کی راہ پہ لگانے کی ان مومنانہ اور حکیمانہ کوششوں کے ساتھ اپنے حدودِ اقتدار میں اسلامی ذہن و مزاج کو فروغ دینے اور منصب حکومت کے اسلامی تقاضوں پر عمل پیرا ہونے کی فرائض کو ادا کرنے میں مرحوم نے جو مثال قائم کی وہ بھی کوئی کم درجہ کی نیکی نہیں ہے ! بلکہ جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ جیسے جیسے عالمی مسلم سیاست میں مرحوم کی حیثیت چمکتی گئی اور جیسے جیسے اسی کے ساتھ انکی بین الاقوامی اہمیت بھی بڑھتی گئی، ویسے ویسے وہ اپنے حدودِ اقتدار سے متعلق اپنی دینی ذمہ داریوں کے احساس میں

ترقی ہی کرتے گئے" تو یہ دیکھ کر دین سے اہلِ سیاست کی عام بے وفائیوں کے اس دور میں اُن کی اور اُن کی اس روش کی قدر و منزلت الفاظ و بیان سے ماوراء نظر آنے لگتی ہے۔ اپنے اس آخری دور میں کہ اُن کی سیاسی عظمت و اہمیت نصف النہار کی بلندی تک پہونچ چکی تھی وہ اپنی مملکت کے حدود میں ایک شاہ و فرمانروا سے زیادہ ایک داعی و مصلح کا کردار ادا کرنے لگے تھے۔ باہر تقریریں اور گفتگوئیں کرنے میں وہ بہت سی مصلحتوں کی بناء پر محتاط تھے۔ مگر اپنی مملکت میں اس احتیاط کی ضرورت بھی نہیں تھی، مختلف ذمہ داریاں تقاضہ بھی کرتی تھیں اور مملکت کی قدیم دینی اور جدید سیاسی و اجتماعی مرکزیت کی بناء پر مواقع بھی بہت پیدا ہوتے تھے۔ ایسے تمام ہی مواقع پر اُن کے عمومی خطابات اور گفتگوؤں کا رنگ خالص دینی و ملی وعظ کا نظر آتا تھا جو داعیانہ سادگی اور ایمان و اخلاص سے بھرپور ہوتا۔ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر پر مبنی بہت سے قوانین اور اُن کے لیے ضروری ادارے جو مملکت میں پہلے سے موجود تھے اپنے زمانہ کے نئے منکرات کے انسداد کے لیے مرحوم نے ان پر ضروری قوانین اور انتظامات کا اضافہ بھی کیا اور مصلحانہ تلقین سے سوسائٹی کا ضمیر بھی ان چیزوں کے خلاف بیدار کرنے کی کوشش کو پیش نظر رکھا۔ — کاش اس کی کچھ مثالیں دینے کی یہاں گنجائش ہوتی۔ انشاء اللہ آئندہ اشاعت میں اس سلسلے کی ایک اہم چیز آئیگی

جتنی بھی دعائیں ملت اسلام اپنے اس یکتا و یگانہ فرزند کو دے کم ہیں۔ اس کی صحیح جانشینی موجودہ لوگوں میں سے کسی کے حصے میں آئے گی یا نہیں؟ اور آئے گی تو کب آئے گی؟ اسے خدا ہی جانتا ہے۔ اور کم از کم ہم جیسے لوگوں کے کرنے کا اس سلسلہ میں دعا کے علاوہ کوئی کام بھی نہیں — لیکن اس مثالی شخصیت کی زندگی میں کچھ پہلو ایسے بھی ہیں جن سے سبق لیکر ہم اپنے دائرہ استطاعت میں اسلام اور مسلمانوں کی خدمت کے کاموں میں ایسی ہی توانائی اور ترقی کا رنگ خدا چاہے تو ابھر سکتے ہیں جیسی ترقی و توانائی اور مقبولیت اللہ نے مرحوم کی کوششوں کو عطا کی تھی۔

مرحوم کی جو خصوصیت ہر دائرہ کے کارکنوں اور قائدوں کے لیے سب سے اوّل سبق لینے کی ہے، وہ اُن کے یہ مخلصانہ اطوار ہیں کہ کام سب سے زیادہ کیا جائے، بوجھ سب سے زیادہ اُٹھایا جائے مگر اپنا نام بالکل اوپر اُٹھانے کی کوشش نہ ہو! — اپنی اہمیت اور خصوصی افادیت خواہ دوسروں کی نظر میں بھی ایک مسلّم حقیقت دکھائی دے رہی ہو مگر زبان تو زبان اپنے کسی انداز سے بھی اس کے اظہار کا شائبہ نہ آنے دیا جائے — اور تحسین و اعتراف سے ایسی بے نیازی ہو جیسے کوئی کام ہی نہیں کیا!

غور کیا جائے تو یہ بالکل واقعہ نظر آئے گا کہ اس حسد و منافست اور تنگ دلی اور خوردہ بینی کے دور میں جہاں معمولی درجہ کا قائد بنے اور راہبرانہ رول بھی شک و شبہ اور منافست کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہو۔

(باقی صفحہ ۱۹۷ پر)

یٰاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا اٰمِنُوْا !

ایمان و اصلاح کی دعوت

مولانا محمد منظور نعمانی

ہم مسلمانوں کی مثال

فرض کیجئے اگر کوئی شخص سائل بن کر آپ کے پاس اس حال میں آئے کہ مسلسل فاقوں سے اس کا پیٹ کمر سے لگ رہا ہو جسم سوکھا جا رہا ہو بھوک اور خشکی سے ہونٹوں پر پپڑیاں جمی ہوں اور کپڑے بھی پھٹے پرانے میلے کچیلے ہوں اور پاؤں بھی جوتوں سے ننگے ہوں ——— اور آپ کو اس کا علم ہو کہ اس کا باپ فلاں شخص تھا جو ایک بڑے اچھے نفع بخش کارخانے کا مالک تھا، اس کی آمدنی سے خود بھی عیش و راحت کی اور باعزت زندگی گزارتا تھا اور بہت سے غریبوں محتاجوں کی مدد بھی کیا کرتا تھا۔ اور آپ یہ بھی جانتے ہوں کہ اپنا کارخانہ صحیح سالم چھوڑ کے وہ اس دنیا سے گیا ہے، اور اس کا یہ بیٹا ہی اس کا تنہا وارث و مالک ہے ——— اور وہ خود بھی آپ سے اس کا اقرار کرے اور بتلائے کہ ہاں میں اسی باپ کا بیٹا ہوں، اور بیشک میرے اس باپ کا وہ کارخانہ اب بھی موجود ہے، لیکن مجھے اس سے چونکہ دلچسپی نہیں ہے اور اس کے چلانے میں جو محنت اور زحمت اٹھانی پڑتی ہے وہ میرے بس کی نہیں ہے اس لیے والد کے مرنے کے بعد سے وہ بند پڑا ہے اور آمدنی کا کوئی اور ذریعہ نہیں ہے۔ والد صاحب جو کچھ چھوڑ کے گئے تھے کچھ دنوں تک وہ کھایا اس کے بعد گھر کا اثاثہ بیچ بیچ کے کھایا، یہاں تک کہ تن کے کپڑے بھی بیچ ڈالے اب جب بیچنے کے لیے بھی کچھ نہیں رہ گیا ہے تو میں کئی وقت کے فاقوں کے بعد سائل بنکر آپ کے پاس آیا ہوں، آپ اللہ کے واسطے میری کچھ مدد کریں! تو ذرا سوچئے کہ اس شخص کی یہ حالت دیکھ کر اور اس کی یہ بات سنکر آپ کے دل کا تاثر اور آپ کا جواب کیا ہوگا؟ ——— ظاہر ہے کہ اگر وہ دماغ کا بیمار اور پاگل نہیں ہے تو آپ اُسے انتہائی درجہ کا غلط کار قرار دیں گے اور اس کی سب سے بڑی خدمت اور مدد یہی سمجھیں گے کہ اگر وہ سمجھ سکے تو کسی طرح سمجھا بجھا کے اس کو اس پر آمادہ کریں کہ وہ اپنے باپ کے اس کارخانہ کو جس کا وہ خود وارث اور مالک ہے چلائے اور اس کے ذریعہ سے اپنے

باپ کی طرح آرام و عزّت کی زندگی گزارے۔
بلاشبہ یہ ایک ذہنی ـــــ بالکل ذہنی مثال ہے، لیکن غور کیجئے کیا مسلمان کہلانے والی امت یا قوم کا مسئلہ اس وقت ہوبہو بالکل یہی نہیں ہے؟ ـــــ ہمارے اسلاف اولین نے رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی دعوت پر ایمان لاکر ایمانی زندگی کو اپنایا تھا جس کے متعلق دنیا و آخرت و ما فیہا کے خالق و مالک کا فیصلہ اور وعدہ تھا کہ جو قوم اس کو اپنائے گی وہ دونوں زندگیوں میں سربلند و سرفراز کی جائے گی، ہم اس کے والی اور حامی ہوں گے وہ ہمیشہ کامیاب اور غالب رہے گی ـــــ چنانچہ اس خداوندی فیصلہ اور وعدہ کے مطابق ہمارے ان اسلاف کو یہ سب چیزیں حاصل ہوئیں اور اس درجہ میں حاصل ہوئیں کہ صدیوں تک ان کی ناخلف نسلوں اور اُن نام لیواؤں نے بھی اُن کی بچی کھچی برکات سے فائدہ اٹھایا جنھوں نے ایمان اور ایمانی زندگی کو ان کی طرح نہیں اپنایا تھا ـــــ لیکن بالآخر ایک وقت آیا کہ اگلے بزرگوں کی وہ کمائی اور ان کا وہ اندوختہ ختم ہوا اور اس کے بعد ان کے نام لیوا جو ان کے طریقہ پر نہ ہونے کے باوجود صرف زبانی جمع خرچ یا نسلی تعلق کی بنا پر اپنے کو ان کا خلف اور وارث سمجھتے ہیں ـــــ ذلت اور پستی کے اس گڑھے میں جا پہنچے جہاں آج وہ پڑے نظر آرہے ہیں، اب ان کا حال زار یہ ہے کہ اپنی روزی اور معاش اور عزّت و آبرو بلکہ اپنی زندگی اور بقا کو بھی اب وہ دوسرے اپنے ہم جنسوں کی نگاہِ کرم سے وابستہ سمجھتے ہیں اور اس لیے اب وہ ان میں سے ہر چیز کے لیے سائلانہ نظروں سے دوسروں ہی کی طرف دیکھتے ہیں ـــــ آہ تُمَّ رَدَدْنَاهُ أَسْفَلَ سَافِلِيْنَ ؕ کا یہ کیسا دردناک منظر ہے۔

حالانکہ کم از کم ماننے اور اقرار کرنے کے درجہ میں آج کے ان خستہ و شکستہ نام کے مسلمانوں کے پاس بھی ایمان اور ایمانی زندگی کا وہ نسخہ بجمیع اجزائہٖ موجود ہے جس کو صحیح طریقہ پر اور پورے طور سے استعمال کر کے ان کے اسلاف نے اللہ کی خاص مدد اور سرپرستی اور اس کے نتیجہ میں تسخیر کائنات کی طاقت حاصل کر لی تھی۔

پس جو لوگ اس حقیقت سے واقف ہیں اور ایمانی زندگی میں اللہ کی رکھی ہوئی اس تسخیری قوت پر اب بھی ایمان رکھتے ہیں، ان کی نظروں میں مسلمانوں کی موجودہ ذلت و پستی اوپر کی فرضی مثال والے پریشان حال سائل کی طرح خود ان کی مجرمانہ غلط کاری کا نتیجہ ہے اور اسی طرح ان کی بھی سب سے بڑی خدمت اور مدد یہی ہے کہ کسی طرح انھیں یہ سمجھا دیا جائے اور اس پر آمادہ کر دیا جائے کہ ایمان اور ایمانی زندگی کو پھر سے اپنے اندر پیدا کریں اور اپنے اسلاف کی جس پاک اور بلند زندگی پر وہ فخر کرتے ہیں اس کو

بھرے اپنائیں ___ یعنی خواہشات کی پیروی کے بجائے اللہ کی عبدیت اور بندگی والی زندگی اختیار کریں، اس فانی دنیا کے بجائے کبھی نہ فنا ہونے والی آخرتی زندگی کی کامیابی کو اصل مقصد حیات بنائیں اور ان کے اسلاف نے جس طرح اللہ کے لیے مٹ جانے کو زندگی کی غایت دنہایت سمجھا تھا اسی طرح وہ بھی سمجھیں ___ مسلمانوں کے لیے بس یہی ہے تسخیر کائنات کی کنجی اور اسی کا نام ہے ایمانی و اسلامی زندگی، جس کے متعلق اللہ کا فیصلہ اور وعدہ ہے۔

وَاَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ___ وَكَانَ حَقًّا عَلَيْنَا نَصْرُ الْمُؤْمِنِيْنَ

یہی ہمارا فلسفہ ہے اور یہی ہماری تاریخ ہے۔ (الفرقان صفر ۱۳۷۲ھ)

مولانا محمد منظور نعمانی

اسلام کے تین بنیادی عقیدے

اور

موجودہ مسلمان قوم

["کیا ابھی وقت نہیں آیا کہ دین کی امانت کے امین اپنا فرض ادا کریں، کیا ہم عذاب اور غضب الٰہی کی آخری صورتوں کے منتظر ہیں؟"]

اسلام میں تین عقیدوں کو بنیادی اہمیت حاصل ہے، مطلب یہ ہے کہ ان تین عقیدوں پر ایمان و یقین جتنا گہرا اور حقیقی ہوگا عملی زندگی اتنی ہی اسلامی تعلیمات اور ہدایات کے مطابق ہوگی اور جس قدر یہ یقین کمزور اور ڈھیلا ہوگا زندگی اسلامی معیار سے اسی قدر پست ہوگی ــــ ان ہی عقیدوں کو امہات العقائد یعنی بنیادی عقیدے کہتے ہیں۔

(۱) ان میں پہلا عقیدہ یہ ہے کہ اس ساری کائنات کا ایک خالق و مالک ہے وہی اس کے پورے نظام کو چلا رہا ہے اور وہی ہمارا پروردگار اور پالن ہار ہے یعنی در اصل وہی ہماری زندگی کی ساری ضرورتیں مہیا کرنے والا ہے اور ہر ایک کا بناؤ بگاڑ اور نفع نقصان سب اسی کے ہاتھ میں ہے اور ہم سب اسی کے بندے ہیں اور ہمارا فرض ہے کہ اسی کی عبادت کریں اور پوری زندگی اس کی بندگی اور فرمانبرداری میں گزارہ

(۲) اسلام کا دوسرا بنیادی عقیدہ یہ ہے کہ اس دنیوی زندگی کے خاتمہ کے بعد ایک اور زندگی آنے والی ہے جس میں ہر ایک کو یہاں کی برائی بھلائی کا بدلہ ملے گا اور وہ زندگی چونکہ دائمی اور ابدی ہوگی جس کا خاتمہ نہ ہوگا اس لیے وہ اس دنیوی زندگی سے زیادہ فکر کے قابل ہے اور وہاں فلاح و نجات صرف وہی لوگ حاصل کر سکیں گے جو اس دنیا میں اپنے

خالق و مالک کی مرضی کے تحت اور اس کے احکام کے مطابق زندگی گزار کے جائیں گے۔

(۳) تیسرا بنیادی عقیدہ یہ ہے کہ اس دنیا کے خالق اور پروردگار کی طرف سے وقتاً فوقتاً اس کی ہدایتیں اور اس کے احکام لے کر پیغمبر آتے رہے ہیں یہ سب اللہ کے مقدس بندے تھے اور ان کی تعلیمات و ہدایات در اصل اللہ کی تعلیمات و ہدایات تھیں اور اس لیے ہر قوم کے واسطے اپنے پیغمبر کی پیروی اور تابعداری ضروری تھی۔ اس سلسلہ کے آخری پیغمبر حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) ہیں جو اپنے زمانے کے اور بعد میں پیدا ہونے والے تمام انسانوں کے واسطے خدا کا پیغام اور اس کی ہدایات لائے۔ اب اس دنیا کے خاتمہ تک تمام انسانوں کے لیے ان کی لائی ہوئی خداوندی ہدایات واجب العمل ہیں اور اب کوئی شخص بھی ان کی اطاعت و پیروی کے بغیر اپنے خالق اور پروردگار کی رضامندی حاصل نہیں کر سکتا اور اس کی خاص رحمت و محبت کا مستحق نہیں ہو سکتا۔

محال است سعدی کہ راہ صفا　　　　تواں رفت جز در پے مصطفیٰ

خلاف پیمبر کسے رہ گزید　　　　کہ ہرگز بمنزل نہ خواہد رسید

سب جانتے ہیں کہ یہ تین عقیدے اسلام کے بنیادی عقیدے ہیں بلکہ کسی شخص کے مومن و مسلم ہونے کے لیے تو ان کے علاوہ بھی چند اور حقیقتوں پر ایمان لانا ضروری ہوتا ہے لیکن بہرحال ان کا درجہ ان تین کے بعد ہی ہے اور اساسی و بنیادی حیثیت ان ہی کو حاصل ہے۔

ان تین بنیادی باتوں کو مان لینے اور ان پر ایمان لانے کے بعد چند باتیں آدمی پر آپ سے آپ لازم ہو جاتی ہیں گویا وہ ان کے لازمی اور منطقی نتائج ہیں ـــــ مثلاً یہ کہ اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہ کی جائے ـــــ کسی منفعت کی امید اور کسی نقصان یا تکلیف کا خوف حقیقی طور پر اس کے سوا کسی سے نہ ہو ـــــ ربِّ حقیقی اور آقائے برحق ہونے کی حیثیت سے اس کے احکام کی تعمیل کی جائے اس کے حکموں کو ہر چیز سے بالاتر سمجھا جائے اور ہر دوسری چیز سے زیادہ اس کی رضاجوئی کی فکر کی جائے ـــــ اس کے مقابلہ میں کسی کو ترجیح نہ دی جائے۔

پہلے عقیدے (توحید) کے یہ سب لازمی نتائج ہیں۔

اسی طرح دوسرے عقیدے (حیات بعد الممات) کے لوازم یہ ہوں گے کہ آخرت کی فکر سب دنیاوی فکروں پر غالب ہوگی ـــــ اپنے ہر عمل اور اقدام میں آدمی یہ خیال رکھے گا کہ اس کا انجام آخرت میں کیا ہوگا۔ عذاب ہوگا یا ثواب ـــــ اگر کوئی منفعت یا عزت اس دنیا میں ایسے

طریقے سے حاصل ہوتی ہو گی جس کا انجام آخرت میں عذاب ہو تو آخرت پر سچا ایمان و یقین رکھنے والا آدمی ہرگز اس کے حاصل کرنے کی کوشش نہ کرے گا۔ اور ایسی منفعت و عزت سے اپنے کو دور رکھے گا۔

اسی طرح تیسرے عقیدے (رسالت) کے لازمی نتائج یہ ہوں گے کہ اس پر ایمان رکھنے والا آدمی اللہ کے سارے پیغمبروں کو اس کے برگزیدہ بندے اور انسانیت کے سب سے بڑے محسن سمجھے گا ــــ حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس دور کا پیغمبر اور آخری نبی سمجھتے ہوئے اپنی اور اس دور کے سارے انسانوں کی نجات و فلاح آپ پر ایمان لانے اور آپ کی پیروی کرنے میں منحصر جانے گا ــــ آپؐ کی لائی ہوئی شریعت اور آپ کے بتلائے ہوئے طریقۂ زندگی کو اللہ کا الہام کیا ہوا دستور العمل جانتے ہوئے انسانی زندگی کے تمام دوسرے طریقوں اور ضابطوں سے بہتر اور صالح تر یقین کرے گا اور اپنے لیے اور ساری دنیا کے لیے اسی کو پسند کرے گا ــــ آپؐ کی اتباع اور آپ کی پیروی کو انسانیت کی سعادت اور آپ کی نافرمانی کو شقاوت و بدبختی سمجھے گا۔

اسلام کے ان تینوں بنیادی عقیدوں کے یہ سب ایسے لوازم ہیں جن کی لازمی حیثیت کو ہر سمجھدار آسانی سے سمجھ سکتا ہے۔

پھر ہر ایک کے لیے یہ اندازہ کرنا بھی آسان ہے کہ ان تینوں عقیدوں پر اگر کسی کو پورا پورا ایمان اور کامل یقین ہو (جیسا کہ ہونا چاہیے) اور ان کے مذکورہ بالا لوازم و نتائج بھی ظاہر ہو جائیں (جن کا ظہور لازمی ہے) تو اس شخص کی سیرت کیسی ہو گی اور اس دنیا میں وہ زندگی کس طرح گزارے گا۔

ظاہر ہے کہ وہ اللہ کا مطیع اور فرمانبردار بندہ ہو گا اس کی عبادت اور بندگی کرے گا اس کے احکام پر چلے گا اسی سے ڈرے گا اور اسی سے امید رکھے گا۔ اس کی مخلوق کا ہمدرد اور خیر خواہ ہو گا اس کا ہر کام خود غرضی و تنگ نظری سے بالاتر ہو گا اور اللہ کی مخلوق کے لیے اس کا وجود سراسر رحمت ہو گا اسی طرح دنیا سے زیادہ وہ آخرت کی فکر کرے گا اور یہاں کی منفعتوں اور لذتوں کے لیے اپنے دوسرے ابنائے جنس سے جھگڑنے کے بجائے آخرت کی فلاح و بہبود اور جنت کی نعمتوں کے حصول کے لیے دوڑ دھوپ کو زندگی کا اصل مقصد سمجھے گا اور ہر کام کے دنیاوی نتیجوں سے زیادہ اس کی نظر اس کے اخروی انجام یعنی عذاب و ثواب پر ہو گی اس لیے نہ تو وہ زیادہ دولتمند بننے کے لیے ناجائز طریقے اختیار کرے گا نہ کسی کا حق غصب کرے گا نہ ناحق کسی پر ظلم کرے گا۔

علی ہٰذا حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے رسول ہونے پر حقیقی طور پر ایمان لانے کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ وہ زندگی کے ہر شعبہ میں اور ہر انفرادی و اجتماعی معاملہ میں آپ کی ہدایت اور رہنمائی تلاش کرے گا اور اسی کی روشنی میں چلے گا اس کا طریقہ یہ نہ ہوگا کہ جو جی میں آیا یا جس کام میں اپنا یا اپنی پارٹی یا اپنی قوم کا یا اپنے ملک اور اپنی حکومت کا فائدہ نظر آیا وہ کر ڈالا بلکہ اس کا اصول یہ ہوگا کہ اللہ کے رسول نے ایسے موقع کے لیے اللہ کی طرف سے جو ہدایت اور تعلیم دی ہے وہ بس اسی کی پیروی کرے گا۔ الغرض اس کا اصول نفس پرستی کے بجائے خدا پرستی اور احکام خداوندی کی بجا آوری اور نبوی ہدایات و تعلیمات کی پیروی کرنا ہوگا اور ہر معاملہ میں اس کی نظر مصلحتوں اور منفعتوں سے زیادہ اللہ کے رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کے اسوۂ حسنہ اور آپ کی ہدایتوں پر ہوگی

بہر حال مومن اگر سچا ہے اور اسلام کے ان تین بنیادی عقیدوں پر کامل اور حقیقی ایمان اس کو نصیب ہو چکا ہے تو یقیناً اور لازماً اس کی زندگی بالکل یہی ہوگی اور اس میں جتنی کمی اور کوتاہی ہوگی وہ بلاشبہ نتیجہ ہوگا ایمان و یقین ہی کی کمزوری کا۔

صحابہ کرام کی پوری جماعت کا امتیاز یہی ہے کہ دین کی ان تین بنیادی حقیقتوں پر ان کو ایسا ایمان و یقین نصیب ہو گیا تھا کہ زندگی کے تمام شعبے اور اس کی ساری جزئیات ان ہی عقیدوں کے زیر اثر آگئی تھیں وہ ہر معاملہ کو خدا کی عبدیت، رسول کے اتباع اور اُخروی انجام کے ماتحت سوچتے تھے اور ان کا کوئی فیصلہ ان تین عقیدوں سے آزاد یا غافل ہو کر نہیں ہوتا تھا وہ جس طرح نماز روزہ اور نکاح و طلاق جیسے معاملات میں اللہ و رسول کے احکام اور آخرت کے انجام کا فکر رکھتے تھے اسی طرح اپنے عام انفرادی اور اجتماعی معاملوں میں بھی اللہ و رسول کی ہدایت کا اتباع کرتے تھے اور یقین رکھتے تھے کہ اگر ہم نے ان معاملات میں اللہ و رسول کی مقرر کی ہوئی حدوں سے تجاوز کیا تو ہم اللہ کی لعنت و عذاب کے مستحق ہو جائیں گے اور خدانخواستہ جہنم ہمارا ٹھکانا ہوگا۔

پھر بعد کے زمانوں میں دینی لحاظ سے مسلمانوں میں جو انحطاط ہوتا رہا ہے اس کا اصلی سبب یہی ہوا کہ مختلف اسباب سے مسلمانوں کے اکثر طبقوں میں یہ بنیادی عقائد کچھ سست اور کمزور ہو گئے اور زندگی پر ان کی گرفت ڈھیلی ہوتی رہی، پھر جس طبقے میں یہ عقیدے جتنے کمزور ہوئے اس کی زندگی اسلامی معیار سے اتنی ہی پست اور خدا و رسول کے احکام سے اتنی ہی بے تعلق اور آخرت کی فکر سے اتنی ہی آزاد ہوتی گئی۔

اس وقت مسلمانوں کی جو یہ حالت ہے کہ ان کی بہت بڑی تعداد (قرآن کے الفاظ میں) "هُمْ لِلْكُفْرِ يَوْمَئِذٍ أَقْرَبُ مِنْهُمْ لِلْإِيمَانِ" کی حالت میں ہے (یعنی وہ اپنے طرز زندگی کے لحاظ سے بہ نسبت ایمان و اسلام کے کفر سے زیادہ قریب ہیں) اس کا اصلی سبب، صرف یہی ہے کہ یہ تین عقیدے (جو آدمی کی زندگی کو ایمانی اور نورانی بناتے ہیں) بے حد کمزور پڑ گئے ہیں جس کا نتیجہ یہ ہے کہ یہ لوگ مسلمان کہلانے کے باوجود اللہ کے ساتھ اپنی عبدیت کے تعلق کو اور رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کے امتی اور پیرو ہونے کی اپنی حیثیت کو گویا بالکل فراموش کر چکے ہیں اور آخرت کے ثواب و عذاب سے یکسر غافل ہیں۔

ان بنیادی عقیدوں کی کمزوری اور زندگی میں ان کی بے اثری کے بارہ میں اس وقت مسلمانوں کی غالب اکثریت کا حال وہی ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت اور قرآن کے نزول کے وقت اہل کتاب کا، خاص طور سے یہود کا تھا کہ وہ زبان سے ان عقیدوں کے اقراری تھے اللہ کو اپنا واحد اِلٰہ و رب مانتے تھے، حضرت موسیٰ کو خدا کا سچا رسول اور اپنے کو ان کا امتی کہتے تھے، توراۃ کو اللہ کی کتاب یقین کرتے تھے آخرت کی جزا و سزا کے بھی قائل تھے غرض ان میں سے کسی چیز کے بھی منکر نہ تھے مگر بات یہ تھی کہ ان کے یہ عقیدے بے حد کمزور ہو چکے تھے اور زندگی پر ان کا جو اثر ہونا چاہیے تھا وہ نہ تھا، خدا پرستی اور خدا کی بندگی پر عملاً غرض پرستی اور نفس و خواہشات کی بندگی غالب تھی، اپنے رسول کے احکام اور ان کی لائی ہوئی کتاب کی ہدایات کے وہ پابند نہیں رہے تھے الکل یہی وہ غیر ایمانی زندگی تھی جس سے اللہ تعالیٰ سخت ناراض تھا آج غور کیجئے بالکل یہی حالت مسلمان قوم کی غالب اکثریت کی ہے، مسلمانوں میں بہت تھوڑی تعداد ایسے بندگانِ خدا کی باقی ہے جن کو دین حق کے ان تین بنیادی عقیدوں پر ایسا ایمان و یقین ہو جو زندگی میں مؤثر ہو رہا ہو اور ان عقیدوں کے لوازم و نتائج ظاہر ہو رہے ہوں ــــ آخری نبی کی آخری امت کی اکثریت کا اس حالت تک گر جانا اتنا بڑا حادثہ ہے اور ہم لوگوں پر اس کی اتنی بڑی ذمہ داری ہے کہ اگر اس کو سوچیں اور سمجھیں تو راتوں کو ہمیں آرام کی نیند نہ آئے اور کھانے پینے میں لذت محسوس نہ ہو، جس امت کو قیامت تک کے لیے نبوت و رسالت کی نیابت و نمائندگی کا منصب سپرد کیا گیا ہو خود اس کی اکثریت کا ایمان و یقین تک کی دولت سے محروم ہو جانا خدا اور رسول کے احکام سے بے پروا اور آخرت کے انجام سے بے فکر ہو کر زندگی گزارنا اللہ کے غضب کو جتنا بھی بھڑکائے کم ہے۔ کیا ابھی وقت نہیں آیا ہے کہ دین کی امانت کے امین اپنا فرض ادا کریں۔ کیا ہم عذابِ الٰہی اور غضبِ الٰہی کی آخری اور انتہائی صورتوں کے منتظر ہیں ــــ

(الفرقان بابت ربیع الثانی ۱۳۶۸ھ)
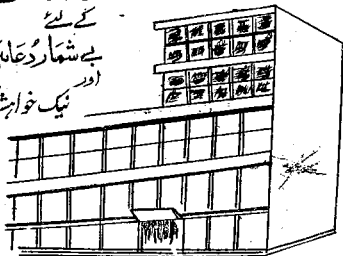
مولانا سید ابوالحسن علی ندوی

ناموافق حالات میں اہلِ ایمان کا رویّہ

اخلاق و سیرت کے اعتبار سے دُنیا میں ہمیشہ دو قسم کے لوگ رہے ہیں، ایک وہ جن میں کسی عقیدہ کسی اصول اور کسی صداقت پر زیادہ دیر تک قائم رہنے اور اس کے لئے کسی مخالفت اور کسی آزمائش کا مقابلہ کرنے کی بالکل طاقت نہیں ہوتی، وہ کسی عقیدہ و اصول پر اس وقت تک قائم رہ سکتے ہیں جب تک سارا ماحول اور ساری فضا اس کے لئے سازگار ہو، اور اس کو سوسائٹی کی تائید اور سرپرستی حاصل ہو، واقعات اس کی تصدیق و توثیق کر رہے ہوں، اس کے ماننے والوں کی مادی کامیابیاں اس کی صداقت پر مہر تصدیق لگا رہی ہوں، کوئی قابلِ التفات آواز اس کے خلاف نہ اُٹھ رہی ہو۔ اس وقت اس عقیدہ پر اُن کا اطمینانِ قلب بہت بڑھ جاتا ہے اور ان کی ذہانت اپنا پورا کام کرنے لگتی ہے، اور ہر طرف ان کو اس کی تائید ہی تائید نظر آتی ہے۔ لیکن جیسے ہی مطلع غبار آلود ہوتا ہے، زمانہ کے تیور بدلتے نظر آتے ہیں، ان کا سینہ تنگ اور ذہن کند ہونے لگتا ہے، قوتِ ارادی اور قوتِ عمل ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جواب دینے لگی ہے، کان میں ایسا محسوس ہوتا ہے کہ غیبی آواز آرہی ہے، کہ ع "زمانہ با تو نہ سازد تو با زمانہ بساز" — اور ع "چلو تم اُدھر کو ہَوا ہو جدھر کی"۔

قرآنِ مجید میں اس صورتِ حال کی نہایت سچّی اور بلیغ تصویر کھینچی گئی ہے ——

وَمِنَ النَّاسِ مَن يَعْبُدُ اللّٰهَ عَلٰى حَرْفٍ فَإِنْ أَصَابَهُ خَيْرٌ اطْمَأَنَّ بِهِ وَإِنْ أَصَابَتْهُ فِتْنَةٌ انْقَلَبَ عَلٰى وَجْهِهِ —— (بعض آدمی اللہ کی بندگی ایسے طور پر کرتے ہیں جیسے کسی کنارہ پر کھڑے ہوں، اگر ان کو کوئی نفع پہونچتا ہے تو اُن کو قرار رہتا ہے اور اگر کوئی آزمائش ہو جاتی ہے تو اپنے مُنھ کے رُخ پر پلٹ جاتے ہیں۔)

دوسری قسم اُن لوگوں کی ہے کہ جبتک اُن کو نرم و ہموار راستہ ملتا رہتا ہے وہ دھیمی چال چلتے رہتے ہیں، انھیں کسی خاص عزم و جوش اور قوتِ ارادی کا احساس نہیں ہوتا، لیکن جیسے ہی ان کے راستہ میں رکاوٹیں آتی ہیں، ٹیلے اور چٹانیں اُن کو اپنے ارادہ سے باز رکھنا چاہتی ہیں، خاردار جھاڑیاں اُن کا دامن پکڑتی ہیں، سنگریزے اور پتھر ان کے پاؤں پڑتے ہیں، راستہ کی دلآویزیاں اُن کو پھسلاتی ہیں، اُن میں منزلِ مقصود کا عشق ترقی کرتا ہے، اپنے سفر کی تکمیل کا ارادہ جنون کو پہونچ جاتا ہے، اُن کی رفتار اور طاقت کہیں سے کہیں پہونچ جاتی ہے۔ ان کو نہ راستہ کی ناہمواری کا احساس رہتا ہے، نہ مسافت کی زیادتی کا، نہ اپنے تکان کا۔ میدانی ندی آہستہ آہستہ اور مزے مزے سہتی رہتی ہے، لیکن پہاڑی دریا کو جب کوئی مغرور چٹان یا ضدی پتھر اپنے ارادہ سے باز رکھنے کی کوشش کرتا ہے، اور اس کا راستہ روک کر کھڑا ہوجاتا ہے تو وہ جوش میں آکر آبشار کی صورت اختیار کرلیتا ہے، اپنی آواز سے کوہ و صحرا کو پُرشور بنادیتا ہے اور اپنے زور میں چھوٹی چھوٹی چٹانوں کو بہاکر اور بڑے بڑے پتھروں کو گراکر سُرمہ بنادیتا ہے، اس وقت اُس کے جوش کے سامنے نہ ہاتھیوں کے پاؤں جم سکتے ہیں نہ پہلوانوں کے پنجے۔ یہی حال اہلِ یقین کا ہے کہ جب ان کو ہر طرف مزاحمتیں اور آزمائشیں نظر آتی ہیں، تو ان کا اپنے عقیدہ پر ایمان، اپنے اُصول کی صداقت کا یقین اور اس پر قائم رہنے کا جذبہ اور جوش بڑھ جاتا ہے۔ ہر رکاوٹ میں انکو اپنے عقیدہ کی صحت کی دلیل اور ہر آزمائش میں انکو اپنے مسلک کی صداقت کا تازہ ثبوت نظر آتا ہے کہ روزمرہ کے واقعات، طبعی عادات اور نفس کی خواہشات سے عقائد و اصُول کو جو چیز ممتاز کرتی ہے وہ اُن کے راستے کی مشکلات اور اس راہ کی آزمائشیں ہی ہیں، قیمت کی زیادتی اور سودے کی کمیابی اس کی بیش قیمتی اور مقبولیت کی دلیل ہے۔ أَلَا إِنَّ سِلْعَةَ اللّٰهِ غَالِيَةٌ أَلَا إِنَّ سِلْعَةَ اللّٰهِ الْجَنَّةُ —— (حدیث) (یاد رکھو اللہ کا سودا بڑا قیمتی ہے، اللہ کا سودا جنّت ہے)۔ اس سودے کی خریداری طبعی ناگواریوں کے بغیر ممکن نہیں —— حُفَّتِ الْجَنَّةُ بِالْمَكَارِهِ وَحُفَّتِ النَّارُ بِالشَّهَوَاتِ —— (جنّت ان تمام چیزوں سے گھری ہوئی ہے جو نفس کو ناگوار ہیں، اور جہنم ان تمام چیزوں سے گھری ہوئی ہے جو نفسانی و طبعی طور پر نہایت خوش گوار ہیں)۔

اسی لئے جب رکاوٹوں، دشمنوں اور وقت کی آزمائشوں میں لوگوں کے لئے تذبذب و تردّد کا سامان ہوتا ہے، اہلِ یقین کے لئے یقین کی ترقی اور اطمینان کی زیادتی کا سامان ہوتا ہے، موجوں کے تھپیڑوں سے وہ سمجھتے ہیں کہ جہاز سمندر میں آچکا ہے اور اپنے سفر پر روانہ ہے۔ گودی میں

لگے ہوئے اور خشکی پر کھڑے ہوئے جہاز کے لئے کیسی موج اور کہاں کا تلاطم؟ مگر ہم نوں سنے وہ سمجھتے ہیں کہ اب ہماری دعوت اور ہمارے عقیدے نے اپنا طبعی سفر شروع کر دیا ہے اور یہ جو کچھ پیش آرہا ہے اس کی قدرتی منزلیں ہیں۔ قافلہ اگر صحیح سمت کی طرف روانہ ہوا ہے تو اس کو راستہ کی وہ سب منزلیں اور مقامات ملیں گے جو واقف کار رہنما نے بتلائے تھے اور ان کی پیش گوئی کی تھی، اسلئے ان منزلوں کے پیش آنے سے قافلہ کے ہمراہیوں کو اپنے سفر کی صحت اور اپنے رہنما کی بصیرت پر اعتماد بڑھتا ہے کہ یہ جو کچھ پیش آرہا ہے بالکل وہی ہے جس کی اس نے خبر دی تھی۔ فَلَمَّا رَاَ الْمُؤْمِنُوْنَ الْاَحْزَابَ قَالُوْا هٰذَا مَا وَعَدَنَا اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ وَصَدَقَ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ وَمَا زَادَهُمْ اِلَّآ اِيْمَانًا وَّتَسْلِيْمًا ـــــ (جب غزوۂ خندق کے موقع پر اہل ایمان نے مخالفین کی فوجوں کو دیکھا تو انھوں نے کہا کہ یہی ہے جس کا اللہ اور اس کے رسولؐ نے ہم سے وعدہ کیا تھا۔ اور اللہ اور اس کے رسولؐ نے سچ کہا تھا اور اس سے ان کے ایمان و تسلیم میں ترقی ہوئی)۔

راستہ کی مشکلات اہل یقین اور اہل عزم کے لئے "تازیانۂ شوق" کا کام دیتی ہیں، اُن سے اُن کی ذاتیں اُبھرتی اور طاقتیں اُبلتی ہیں، علم و تمدن کی ترقی میں بھی مشکلات کا بڑا ہاتھ ہے اور اہل دین کی روحانی ترقی میں بھی مشکلات کا بڑا دخل ہے اگر مشکلات نہ ہوتیں تو قوتیں ٹھٹھر کر رہ جاتیں، ذہانت کے بہت سے چشمے خشک ہو جاتے، انسانی کوششیں اور انسانی ذہن سیدھی پٹری پر آرام سے چلنے کے عادی ہو جاتے، زندگی کے مسائل و مشکلات میں دماغ اجتہاد سے اور قوائے عمل مقابلہ جہاد سے عاری ہو کر رہ جاتے، زندگی کے دریا کی سطح بالکل ساکن ہو جاتی جس پر کائی جمی ہوتی۔ سچ پوچھئے تو مشکلات سے بہت کچھ زندگی کی ہماہمی اور چہل پہل قائم ہے۔

سہولتوں اور راحتوں کی فراہمی جمود و غفلت کا پیش خیمہ ہے اور جمود و غفلت قوموں کے زوال، سلطنتوں کے سقوط اور عام بربادی کا مقدمہ ہے، دُنیا کے مسلمانوں پر بھی اور ہندوستان کے مسلمانوں پر بھی سہولتوں اور راحتوں کا طویل دَور گزرا اور اس کے نتیجہ کے طور پر وہ طویل عرصہ تک جمود و غفلت کا شکار رہے، اور اس کا طبعی نتیجہ ظاہر ہوا۔ اب تمام دُنیا میں مشکلات کا دَور ہے، یہ دَور اگر انھوں نے صبر و استقامت سے گزار دیا اور ان کے قوٰی بیدار ہو گئے تو اُن کی تاریخ کے نئے اور بہتر دَور کا آغاز ہوگا جس کی پیش گوئی وَنُرِيْدُ اَنْ نَّمُنَّ عَلَى الَّذِيْنَ اسْتُضْعِفُوْا فِي الْاَرْضِ وَنَجْعَلَهُمْ اَئِمَّةً وَّنَجْعَلَهُمُ الْوٰرِثِيْنَ کہہ کر کی گئی اور جس کی طرف

(باقی صفحہ ۵۰ پر ملاحظہ ہو)

حضرتِ جگر مُرادآبادی

شائع شدہ الفرقان جمادی الاول ۱۳۶۹ھ
(مارچ ۱۹۵۰ء)

سُوزِ جگر

پہلے تو حُسنِ عمل، حُسنِ یقیں پیدا کر — پھر اسی خاک سے فردوسِ بریں پیدا کر
یہی دُنیا جو بُت خانہ بنی جاتی ہو — اسی بُت خانہ سے کعبہ کی زمیں پیدا کر
رُوحِ آدم، نگراں کب سے ہو تیری جانب — اُٹھ اور اک جنّتِ جاوید یہیں پیدا کر
خس و خاشاک تو ہم کو جلا کر رکھ دے — یعنی آتش کدۂ سوزِ یقیں پیدا کر
غم میسّر ہو تو اُس کو غمِ جاوید بنا — دل حسیں ہو تو محبت بھی حسیں پیدا کر
آسماں مرکزِ تخئیل و تصوّر کب تک — آسماں جس سے خجل ہو وہ زمیں پیدا کر
دلِ ہر قطرہ میں طوفانِ تجلّی بھر دے — بطنِ ہر ذرّہ سے اک مہرِ مبیں پیدا کر

***

بندگی یوں تو ہو انسان کی فطرت لیکن — ناز جس پہ کریں سجدے وہ زمیں پیدا کر
پستیٔ خاک پہ کب تک تری بے بال و پری — پھر اسی خاک سے فردوسِ بریں پیدا کر

عشق ہی زندہ و پائندہ حقیقت ہو جگر
عشق کو عام بنا ذوقِ یقیں پیدا کر

حضرت مولانا عبدالباری صاحب ندوی
سابق پروفیسر جامعہ عثمانیہ دکن

علم دین اور مسئلہ معاش

عالم ہو کر کھائیں کیا؟ کا قرآنی اور ایمانی جواب

[حضرت مولانا عبدالباری ندوی نے ۱۳۵۰ھ و ۱۳۵۱ھ میں ایک سلسلۂ مضمون حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی کی اصلاحات و تجدیدات پر لکھا تھا جو الفرقان میں شائع ہوا تھا، مندرجہ ذیل مضمون اسی کی ایک قسط ہے۔]

ایک مخدوم بزرگ جو خود ماشاء اللہ عالم باعمل ہیں اور ایک معروف بزرگ و شیخ کی قائم کردہ خاص دینی درس گاہ کے ناظم ہیں اور اسی درس گاہ میں خود اپنے ایک بچے کو قرآن حفظ کرا رہے ہیں باوجود اس کے ایک مرتبہ فرمانے لگے کہ

"یہ تو بتاؤ کہ آخر حافظ، عالم ہو کر کھائیں کیا؟"

اسی طرح ایک اور مخدوم و مخدوم زادہ بزرگ جن کا ہندوستان کے ایک ایسے مشہور و مسلم خاندان سے قریب ترین تعلق ہے جس کا فخر و امتیاز نسلاً بعد نسلٍ تک علوم دینیہ ہی کی طلب و خدمت رہا، اور جو ابھی ایک ہی پشت پہلے کے ایک ایسے صاحب تقویٰ و توکل مشہور و مسلم شیخ وقت کے صاحب سجادہ ہیں جن کے یہاں فاقہ ہو جانا بھی کوئی غیر معمولی بات نہ ہوتی ان مخدوم کے ایک صاحب زادے جب ایم اے ہو کر ملازمت اور اس کے لیے سعی و سفارش میں سرگردان و پریشان تھے تو ایک موقع پر احقر نے اپنے ان مخدوم کی خدمت میں عرض کیا کہ حضرت نے آخر اپنے خاندان کے دینی علم و توکل کے راستہ سے اولاد کو ہٹا کر اس دنیوی تعلیم و تذلیل کو کیوں پسند فرمایا! جواب دیا کہ دین اور علم دین کا پوچھنے والا

اب کون ہے اور اس کو حاصل کر کے کھاتے کہاں سے ؟ احقر نے عرض کیا اس سے تو تجارت اور کاروبار کی کوئی راہ اہون و اسلم ہوتی، اس کا جواب واقعی بڑا پُر معنی اور پُرلطف عطا فرمایا کہ

"میاں تجارت بڑی محنت و مشقت، ہوشیاری و بیداری کا کام ہے ہم تو بس ملازمت ہی کے کام کے رہ گئے ہیں کہ سوتے جاگتے بری بھلی طرح تیس دن کے بعد کسی پر کچھ واجب ہو جائے"!

اس میں شک نہیں کہ ملازمت کا یہ بہترین ترجمہ ہے، میمن بوہرے وغیرہ نسلاً بعد نسل کی تجارت پیشہ مسلمان جماعتوں کا ذکر نہیں ورنہ عام مسلمانوں خصوصاً آخوند زادوں کو دیکھا کہ نوکری تو وہ بُری بھلی طرح نباہ کر اور تیس دن کے بعد کسی پر کچھ واجب کر کے وصول کر لیتے ہیں، لیکن تجارت میں اکثروں کا دیوالہ ہی نکلتے دیکھا۔

غرض جب خود ایسے ایسے خاندانی مشائخ اور دیندار علمائے دین تک اپنی اولاد کو تعلیم دین سے ڈر کر دور رکھتے ہیں، کہ علم دین کو حاصل کر کے کھائیں گے کہاں سے؟ تو پھر بادشاہ یا امراء کا ذکر ہی کیا جو خاندانی دنیادار اور دینی تعلیم و دولیات سے یکسر محروم ہیں!

ایسے دیندار اور دنیادار دونوں قسم کے مسلمانوں کی خدمت میں عرض ہے کہ "کھائیں گے کہاں سے" کا خوف وہی خشیتِ املاق (خوفِ افلاس) ہے جس کی بنا پر جاہلیت کے مشرکین اپنی اولاد کو قتل تک کر ڈالتے تھے اتنا فرق ہے کہ وہ اس خوف سے اپنی اولاد کی چند روزہ دنیوی زندگی کا خاتمہ کر دیتے تھے اور ہم ہمیشہ کی اخروی زندگی کو برباد کر دیتے ہیں، آج بھی جاہلیت جدیدہ میں ضبطِ تولید کی (جو قتل اولاد کی خفی شکل ہے) بڑی دلیل بیان کی جاتی ہے کہ آبادی بڑھتی جاتی ہے "اتنے آدمی آخر کھائیں گے کہاں سے"!

اس کا حقیقی جواب نئے اور پرانے سب جاہلوں کو قرآن نے جو دیا ہے، وہ ایسے مسلمانوں کے لیے اور زیادہ حقیقی ہے، جو "خوفِ افلاس" کی بنا پر اپنی اولاد کو تعلیم دین سے محروم رکھ کر دنیا کی غیر یقینی زندگی کو بنانے سے زیادہ آخرت کی یقینی زندگی بگاڑتے ہیں، جواب یہ ہے کہ تمہاری اولاد کو بھی وہی خدا رزق دے گا جس نے تم کو دے رکھا ہے "نَحْنُ نَرْزُقُهُمْ وَإِيَّاكُمْ" اگر ہم کسی درجہ میں بھی مسلمان ہیں، اور قرآن پر ہمارا کچھ بھی ایمان ہے تو خوب یاد رکھنا چاہیئے، کہ قرآن کے خدا نے انسان کو کھانے کمانے کی فکر میں فنا ہو کر مرنے کے لیے ہرگز نہیں پیدا فرمایا، ہمارا "زیستن برائے خوردن" نہیں، بلکہ "خوردن برائے زیستن" ہے، اور زندگی کا اصل مقصود عبدیت و بندگی کے فرائض کی ادائی ہے، صاف صاف وولڈ کا ارشاد ہے۔

مَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنَ ۝ مَآ اُرِيْدُ مِنْهُمْ مِّنْ رِّزْقٍ وَّمَآ اُرِيْدُ اَنْ يُّطْعِمُوْنِ ۝ اِنَّ اللّٰهَ هُوَ الرَّزَّاقُ ذُو الْقُوَّةِ الْمَتِيْنُ ۝

میں نے جن والنس کو محض عبدیت وبندگی کے لیے پیدا کیا ہے، رزق کی فکر کے لیے نہیں پیدا کیا، اور نہ اس لیے کہ مجھ کو کھلائیں، رازق تو سب کا صرف اللہ ہی ہے جو رزق رسانی کی بخنہ قوت رکھتا ہے۔

باقی اپنی بندگی وعبدیت کو بھلا کر رزاقیت کی تدبیر وقوت کے ہنگام انسان کی درماندگی کا تماشہ جو مسلسل ۶-۷ سال سے دیکھا دکھلایا جا رہا ہے تاریخ نے تو کب کیھا ہوگا، لیکن آج ہر آنکھ والے کی آنکھ دیکھ رہی ہے کہ ایک طرف تو "زیستن" کا مطلب تمام تر خوردن" قرار دے لیا گیا ہے اور حکومت وسیاست سب کا اصل مطلب ومقصود لکار لکار کر تحریہ روٹی کپڑا بتایا جاتا ہے دوسری طرف عالمگیر جنگ کے سلسلہ میں اور خصوصاً اس کے بعد ساری دنیا جس طرح عالمگیر قحط کے چنگل میں پھنسی ہے، اس کے ازالہ کی ہر روز ہر حکومت کی جانب سے طرح طرح کی تدبیروں کا اعلان کیا جاتا ہے، فراہمی غذا کی مستقل وزارتیں اور محکمے قائم ہیں، ہر دن قومی وبین الاقوامی کانفرنسیں منعقد ہوتی رہتی ہیں، ساری حکومتوں نے راشن بندی کر رکھی ہے یعنی ناپ تول کر دو وقت کا بڑا بھلا غلہ حوالہ کر دیا جاتا ہے جو اکثر صورتوں میں انسان کی معمولی مقدار غذا کا نصف سے زیادہ نہیں ہوتا ہے، اس پر بھی وقتاً فوقتاً تخفیف وتقلیل کی دھمکی اور اطلاع شائع ہوتی رہتی ہے کہ بس ایک مہینہ یا دو مہینہ کا غلہ رہ گیا ہے اور آئندہ فلاں مہینہ بڑا نازک آنے والا ہے۔ امریکہ جو دنیا کا سب سے دولتمند وخوشحال ملک ہے ابھی (۱۴ر اکتوبر ۱۹۴۶ء کے) پائنیر میں وہاں کے غذا وزراعت کے ڈائرکٹر جنرل کا بیان چھپا ہے، کہ

"اس موسم سرما میں ایسے شدید قحط سے دوچار ہونا ہے جو دنیا میں کبھی نہ پڑا ہوگا اور جس کا مقابلہ ہر طرح کی معاشی تدابیر اور قومی وبین الاقوامی اجتماعی جد وجہد ہی سے ممکن ہوگا"

انسان نے جس طرح اپنے خالق سے منہ موڑا ہے، اس کی سمجھ میں آنا تو اب مشکل ہے لیکن راقم ہذا کو یہ روز افزوں وعالمگیر قحط نہیں، بلکہ عالمگیر قہر ہی نظر آ رہا ہے، اور قرآن مجید میں جا بجا جو رزق ورزاقیت کا ذمہ بالکلیہ حق تعالیٰ نے خود لے کر نہ صرف یہ کہ انسان کو عبدیت وبندگی کے لیے فارغ وبے فکر فرمانا چاہا ہے، بلکہ غور کیجیے تو اس دنیا میں اس کی

سب سے جامع الصفات صفت ربوبیت کا سب سے بڑا اور نمایاں مظہر رزاقیت ہی ہے اور انسان انفرادی یا اجتماعی طور پر بالکلیہ اپنے کو اسکا ذمہ دار ٹھہرا کر نہ صرف اللہ تعالیٰ کی اس صفت خاصہ میں اپنے کو شریک و سہیم ٹھہرا رہا ہے بلکہ دراصل خدا کی خدائی چھین کر خود خدا بن بیٹھا ہے، اس کے بعد اگر اسی کا قہر و عذاب اسی قبض رزق کی راہ سے ظاہر ہو تو عین سنۃ اللہ ہے۔

اپنا تجربہ تو اپنے اکثر عزیزوں دوستوں کے انفرادی واقعات تک میں یہی ہے اور جو بھی ذرا غور کرے گا اس کو تجربہ ہوگا کہ معاش و رزق کا معاملہ کچھ مِنْ حَيْثُ لَا يَحْتَسِبُ ہی ظاہر ہوتا ہے اور تدبیر کے تیر بالعموم اپنے نشانہ سے ہٹ کر ہی گرتے ہیں، بار بار دیکھا کہ انگریزی تعلیم میں بھی طالب علمی میں جن کو بڑا ہونہار خیال کیا جاتا تھا، وہ کچھ نہ ہوئے، اور جن کو ناہون سمجھا گیا، وہ ان ہونہاروں سے میدانِ معاش میں کہیں آگے نکل گئے، یہی تجارت وغیرہ ہر چیز میں مشاہدہ ہوتا رہتا ہے کہ بارہا جس شخص اور جس چیز کی تجارت کے چلنے کے ظاہری اسباب زیادہ ہوتے ہیں، وہ وہ جاتی ہے، اور جس کے ظاہری امکانات کم ہوتے ہیں وہ چل جاتی ہے، باقی یوں نکات بعد الوقوع تو ہر واقعہ میں نکال لیے جا سکتے ہیں۔

الغرض کوئی اور سمجھے نہ سمجھے مگر مسلمان کو اس کے سوا سمجھنے کا حق ہی کیا ہے، کہ رزق یا معاش کی تنگی و فراخی، قبض و بسط، عطا و منع بالکلیہ مشیت الٰہیہ پر منحصر ہے، اِنَّ رَبَّكَ يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ يَّشَاءُ وَيَقْدِرُ۔ اَوَلَمْ يَعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ يَّشَاءُ وَيَقْدِرُ وغیرہ کثیر آیات نے اس باب میں کوئی شک و شبہ کی گنجائش نہیں چھوڑی ہے کہ رزق کے ظاہری اسباب بس ظاہری سے زیادہ نہیں اس لیے غیروں کی طرح ان میں اتنا غلو و فنا کہ گویا اسباب و تدابیر ہی حقیقی رزاق ہیں، نہ اسلام ہے نہ اسلام کے خدا پر ایمان اور نہ حقیقی اسلام اور نہ حقیقی مسلمان کی تاریخ و زندگی ہی سے اس کی شہادت ملتی ہے، یہ تو دراصل زبان سے خدا کا اقرار اور عمل سے اپنی خدائی کا اعلان ہے۔ اس قسم کے تصورات کو جب تک دماغ بدر نہ کیا جائے اس وقت تک اسلام کی دینی و دنیوی برکات اور انفرادی و اجتماعی ثمرات کی توقع کا حق ہی کیا حاصل ہے۔

یہ تو اس سوال کی کہ "عربی یا دینی تعلیم حاصل کر کے کھائیں گے کیا" بڑی خطرناک ایمانی اعتقادی خامی تھی، ایک دوسری بڑی خود فریبی اور مغالطہ یہ ہے کہ کھانے سے مراد ضروریات زندگی سے زیادہ فضولیات زندگی ہوتی ہیں، یعنی ہم نے کھانے پینے رہنے سہنے، شادی بیاہ، مکان سامانِ زندگی کے تمام جاری و وقتی مصارف کا ایک خود ساختہ معیار مقرر کر رکھا ہے، جب تک وہ پو

نہ ہو، اس وقت تک ہم سمجھتے اور کہتے ہیں، کہ کھوانے ہی کو نہیں مل رہا ہے، حد یہ کہ اگر ان سے اگر یہ سوال کیا جائے کہ آخر آپ کو اس کی کیا حاجت ہے، کہ دینی تعلیم سے محروم رکھ کر اولاد کو ججی و کلکٹری کے لیے دنیاوی تعلیم دلاتے ہیں" تو جواب یہی ملتا ہے، کہ اگر ہماری آمدنی زیادہ ہے تو ہماری حیثیت و مصارف بھی تو ویسے ہی ہیں، یعنی اس حیثیت جاہ و مال کو موجودہ آمدنی میں اضافہ اور جاہی مناصب حاصل کیے بغیر کیسے برقرار رکھا جاسکتا ہے یہ ایسی منطق ہے کہ جاہ و مال کے کسی اونچے سے اونچے مقام پر پہنچ کر بھی لا جواب نہیں ہو سکتی!

ورنہ ابھی عالمگیر حب جاہ و مال کی اس عالمگیر جنگ سے پہلے اسی ہندوستان میں زندگی کی نفس ضروریات پانچ سات روپیہ ماہوار سے زیادہ نہ تھیں، یعنی چھوٹے بڑے چار پانچ آدمیوں کے گھر کے لیے پچیس تیس ماہوار نفس ضروریات کی حد تک بلا کسی تکلیف و تنگی کے کافی ہوتے تھے اور بہتیرے مولوی بلکہ اچھے اچھے علماء اس سے بھی کم میں گزر فرماتے تھے، خود حضرت علیہ الرحمۃ کی تنخواہ کانپور میں پچیس روپیہ ماہوار تھی، جو حضرت کے علم و عمل کے کمالات کے لحاظ سے کیا تھی پھر بھی حضرت نے اس کو بہت بڑی تنخواہ سمجھا تھا اور فرماتے کہ

> "میں طالب علمی میں سوچا کرتا تھا، تو زیادہ سے زیادہ دس روپیہ ماہوار کی مدرسی اپنی ضروریات معاشی کے لیے کافی سمجھتا تھا (اس میں بھی) پانچ روپیہ اپنے خرچ کے لیے اور پانچ گھر کے خرچ کے لیے، اس سے زیادہ کی تنخواہ پر کبھی نظر ہی نہ جاتی، نہ اس سے زیادہ کا اپنے کو مستحق سمجھتا"

(اشرف السوانح حصہ اول ص ۳۷)

خود راقم ہذا کو اپنے گھر کا تجربہ ہے کہ والد مرحوم دیہاتی وہ بھی نہایت قانع و متوکل طبیعت کے طبیب تھے، خرچ اوسطاً ۷، ۸ آدمیوں کا، اندر باہر ایک آدھ نوکر چاکر بھی، کھانے پینے رہنے سہنے، شادی بیاہ سب کا معیار اوسط درجہ کے شرفاء اور اہل برادری کا مگر آمدنی کا اوسط شاید ہی کبھی ۳۰۔۴۰ سے بڑھا ہو، نہ آمدنی میں ترقی کی کبھی کوئی فکر فرمائی، البتہ اللہ اور اللہ والوں سے تعلق میں ترقی کی فکر آخر دم تک رہی، حضرت مولانا محمد نعیم صاحب فرنگی محلی رحمۃ اللہ علیہ سے بیعت و اجازت کے باوجود اُن کی وفات کے بعد حضرت مولانا تھانوی رحمۃ اللہ علیہ سے آخر تک برابر اصلاح و استفادہ کا تعلق جاری رہا، زیادہ عبرت و سبق کی بات یہ کہ گھر بھر میں چھوٹے بڑے سب کو قلب کی جو راحت و طمانیت یا دل کا جو سکون چین نصیب تھا، وہ اس

نالائق نام ہوا اور اس کے متعلقین کو سینکڑوں، ہزاروں کی آمدنی اور کوٹھی و موٹر میں بھی میسر نہ ہوا ہاں گھر بھر میں والد علیہ الرحمۃ کے اس رنگ و برکت کا وارث والدہ مدظلہا کا دم رہ گیا ہے، (رب ارحمھما کما ربّیانی صغیرا) برکت کی حقیقت بھی ان اللہ والے والدین ہی کی زندگی و آمدنی کو دیکھ کر سمجھ میں آئی،

باقی اپنی سینکڑوں، ہزاروں کی آمدنی کو کٹھی موٹر نوکر چاکر کے جو تہائی صدی کے تجربات کی میزان اپنے ایک حکیم و حکیم طبع استاد (مولانا شیر علی صاحب مرحوم) کے ایک بے تہ نکلا نہ نقرہ کے سوا کچھ نہ نکلی، مولانا ندوہ میں جب راقم الحروف آخری جماعت میں تھا، صدر مدرس و مہتمم تھے، پھر جامعہ عثمانیہ میں شعبۂ دینیات میں علم کلام کے استاد مقرر ہو گئے تھے، مشاہرہ چھ سو ماہوار تھا، ابھی تک موٹروں کے بجائے گھوڑا گاڑی کا چلن وہاں زیادہ تھا۔ اکثر عہدہ دار اپنی گھوڑا گاڑی رکھتے تھے، مولانا کے پاس بھی تھی، جس پر یونیورسٹی تشریف لاتے تھے، کچھ دن بعد دیکھا کہ ایک کرایہ کی گاڑی پر تشریف لانے لگے، عرض کیا کہ حضرت گھر کی گاڑی کیا ہوئی؟ فرمایا نکال دیا دو گھنٹے میں اس پر سوار ہوتا تھا، چوبیس گھنٹے وہ میرے اوپر سوار رہتی تھی"!

اس وقت تو یہ حکیمانہ بات سمجھ میں نہ آئی تھی، اور مولانا کی پیرانہ سالی اور کم ہمتی کا تقاضا معلوم ہوئی، لیکن اس کے بعد خود گھوڑا گاڑی بھی رکھی، موٹر بھی رکھا، سو ماہوار تک کی کوٹھی بنگلہ کا بھی مزا چکھا، لکھنؤ میں ایکڑ بھر زمین میں خود اپنی دو منزلہ لمبی چوڑی کوٹھی بنائی لان اور پھلواری نوکر چاکر، سامان اور فرنیچر سب ہی کا ٹھاٹھ، اپنی حیثیت و حوصلہ سے بڑھ کر دیکھا دکھلایا، مگر خدا کو گواہ کر کے کہتا ہی دیتا ہوں کہ جیسا جیسا حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کی جوتیوں کے تعلق سے کچھ عقل ٹھکانے لگی، ویسا ہی ویسا اس سارے فخر و نمائش کے ساز و سامان کو راحت و آسائش سے زیادہ خود اپنے دل و دماغ پر سوار پانے لگا! اور بالآخر کچھ عرصہ بعد حیدرآباد ہی میں جب ایک محب و محسن کی محبت و احسان سے جامعہ کے قریب ایک نو تعمیر مسجد کے احاطہ ہی میں خاص راقم الحروف احقر کے لیے دو حجرے تیار ہو کر ان میں قیام نصیب ہوا تو بلا مبالغہ ایسا محسوس ہوا! تھا کہ دل و دماغ قید کی کوئی بڑی سزا جھیل کر باہر آ گیا ہے! اور آج بھی لکھنؤ کی ذاتی طویل و عریض کوٹھی میں بیٹھ کر حیدرآباد کی کوئی چیز یاد آتی ہے، تو شہر و شہریت سے دور مسجد اقصیٰ[1] کے یہی دو حجرے اور اسی زاویہ کے دو چار

[1] یہ مسجد شہر کے بالکل کنارے دور (جو لفظ اقصیٰ کے معنی ہیں) واقع ہے جہاں اب جامعہ کی بدولت کچھ آبادی ہو چلی ہے

(بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

اسنے گئے عنایت فرما لکھنؤ کی اپنی کوٹھی کا معاملہ بھی دارم جرائیم ختم کا ہو رہا ہے، ورنہ اب کوٹھی کے بجائے کوٹھری ہی کو دل ڈھونڈتا ہے، یہ تو آپ بیتی تھی، جگ بیتی بھی جو کچھ دھن و دکن ہر جگہ دیکھی اور سنی وہ یہی کہ بڑے بڑے عہدہ دار اور بلند مناصب وزراء و امراء بظاہر جاہ و مال سب کچھ رکھ کر بھی سب کے سینہ کے اندر مزید جاہ و مال کے مقابلہ و مسابقت کی بھٹی دہکتی رہتی ہے اور بالعموم اسی کے انگاروں میں لوٹتے لوٹتے دم نکل جاتا ہے۔

یہ اپنی پرائی بظاہر طویل داستان اپنے مقصد و مفاد کے اعتبار سے طویل نہیں قصیر ہی ہے اس لیے کہ دنیا کی جس طلب میں دین و آخرت کا ہوش نہ رہے جائز و ناجائز کی تمیز اٹھ جائے، دوزخ و جنت کا خوف و شوق دل سے نکل جائے، خدا کی رضا و ناراضی کا غم نہ ہو، یہ تو معاذ اللہ مومن و ایمان کے منافی کافر و کفر کی دنیا کے سوا کیا ہے، اور یہ دنیا کی طلب نہیں، دنیا کا عشق بلکہ جنون ہے۔ بقول حضرت علیہ الرحمۃ کے کسب دنیا کے کمانے کا مضائقہ نہیں، مگر یہ نہ ہو کہ اس میں بالکل کھپ جائے، کہ گویا خدا تعالے سے بالکل واسطہ ہی نہیں، یہ تو کافر ہی کی زندگی کی خاص شان ہے کہ گویا خدا سے کوئی واسطہ نہیں،

اور مومن کی زندگی کی خاص شان یہ ہے کہ وہ اس دنیا سے بس مسافر اور سرائے کا سا تعلق رکھتا ہے باقی فکر و عمل جد و جہد کا اصل تعلق خدا و آخرت سے ہوتا ہے، اور دنیا میں جو ہم چاہتے ہیں کہ یہ بھی ہو جائے اور وہ بھی ہو جائے، حضرت علیہ الرحمۃ فرماتے ہیں:

> "ایسا ہی ہے جیسے کوئی سرائے میں یہ تمنا کرے کہ یہاں جھاڑ فانوس سب لگا دیے جائیں اور پھر اپنی کمائی سے خرید کر لگا دے، تو ظاہر ہے کہ کتنی بڑی حماقت ہے، خاص کر جب یہ بھی حکم ہو مثلاً اس سرائے میں چار دن سے زیادہ کوئی قیام نہیں کر سکیگا، اس وقت تو اپنی کمائی وہاں کی تزئین میں لگانا پورا خلل دماغ ہے اور دنیا ایسی ہی محدود قیام کی سرائے ہے، کہ اس حد کے بعد بلا اختیار یہاں سے نکل جانا پڑے گا، تو اول تو سرائے میں قیام اگر اختیاری بھی ہو تب بھی یہی ہونا چاہیئے کہ اس کے ساتھ گھر کا سا معاملہ نہ کرے اور جب اختیاری بھی نہیں تب تو ہرگز ہرگز اس میں دل نہ لگانا چاہیئے اور یہی معنی ہیں میرے نزدیک الدنیا

(پچھلے صفحے کا بقیہ حاشیہ ملاحظہ فرمایئے۔)

مولانا گیلانی احقر کے سالہا سال کے رفیق قیام و طعام بھی اسی مسجد کے جوار میں تشریف فرما ہیں اور اس مسجد کا "مسجد قطبی" نام تو ایک اور دوست نے تجویز کیا تھا مگر اس کا تاریخی نام ثابت ہو تا مولانا ہی کی یادگار ہے۔

سجن المومن کے، لوگوں نے اس حدیث کے مختلف معنی لیے ہیں، مگر میں کہتا ہوں کہ جیل خانہ تکلیف وغیرہ کی وجہ سے نہیں فرمایا، بلکہ اس لیے کہ جیل خانہ میں جی کبھی نہیں لگا کرتا خواہ کیسا ہی ہو، تو مسلمان کی شان ہے کہ دنیا میں اس کا جی نہ لگے گا، اگرچہ بظاہر اس میں کیسا ہی عیش و آرام ہو کیونکہ جی لگنے کی جگہ گھر ہے اور دنیا گھر نہیں، پھر جب جی نہ لگے گا تو کیوں ہوسیں ہوں گی، اور کیوں سوچے گا کہ یوں ہو اور یہ ہو اور وہ ہو، بلکہ اب یوں سوچے گا، کہ دنیا تو پردیس ہے، یہاں جس طرح بھی گزر جائے اور دنیا کی بجائے آخرت کی سوچ ہونی چاہیے، اور یہ سوچے گا کہ اگر یہ سامان ہو گیا، تو پھر وہاں یوں بہار ہوگی، یوں عیش ہوگا، ورنہ یوں پریشانی ہوگی، یوں مصیبت ہوگی» (الفرقان صفحہ ۲۰۴، ۲۰۵)

لیکن ہماری زندگی اور اسکے برتاؤ اور معاملات سے (الا ماشاء اللہ) بس یہی معلوم ہوتا ہے کہ:

«جیسے کوئی منکرِ آخرت ہو، کیونکہ جتنی محبت دنیا کی ہے، آخرت کی نہیں، نہ اس کا اتنا شوق ہے، چنانچہ دلوں کو ٹٹول کر دیکھ لیں کہ دنیا میں قیام کی بابت ہم لوگ کیا کیا خیالات پکاتے ہیں، کہ یوں رہیں گے، یوں کریں گے، جائداد ہوگی، ملازم ہوں گے، ڈپٹی کلکٹر ہوں گے، وغیرہ وغیرہ»

«اب انصاف سے دیکھو کہ آخرت کے متعلق بھی کبھی ایسی امنگیں ہوتی ہیں کہ مرجائیں گے تو خدا کے سامنے جائیں گے، یوں جنت ہوگی، اس میں باغات ہوں گے، مکانات ہوں گے، حوریں ہوں گی غالباً کبھی یہ امنگیں نہیں ہوتیں، بلکہ خیال بھی بہت کم آتا ہے»

«بعض ایسے ہیں جن کے پاس دنیا کی خوشی کا کوئی سامان نہیں، اور وہ یوں کہیں گے کہ صاحب ہم تو دنیا کی خوشیاں نہیں مناتے بلکہ ہم تو سوچا کرتے ہیں کہ کوئی والی وارث نہیں، زندگی کیسے کٹے گی تو ان سے یہ شکایت ہے کہ جیسے تم نے دنیاوی زندگی کو سوچا کبھی آخرت کو بھی سوچا، اور وہاں کی مصیبت کا بھی خیال کیا کہ وہ زندگی کیسے کٹے گی، دوزخ میں جانا پڑا، تو وہ مصیبت کیسے سہی جائے گی پھر جیسے یہاں تکلیف کو سوچ کر تدبیر سوچتے ہو، کہ شاید فلاں تدبیر سے یہ تکلیف کٹ جائے یا فلاں تدبیر سے مشکل آسان ہو جائے ایسے کبھی آخرت کی مصیبت کے لیے بھی سوچا،

"حالانکہ دنیا کے مصائب بعض ایسے ہیں، جن کی کوئی تدبیر ہی نہیں، اور اس لیے اس کو سوچنا ہی عبث ہے، مگر پھر سوچتے ہو، اور آخرت کی کوئی مصیبت بھی ایسی نہیں جو لا علاج ہو بلکہ ہر مصیبت کی تدبیر موجود ہے لیکن پھر اس کا نکہ نہ فکر" (الرفیق ص ۲۳۰-۲۳۲)

خدا و آخرت سے بے تعلق و بے فکری کا یہ حال صرف عام دنیا داروں ہی کا نہیں جو لوگ اپنے کو دیندار سمجھتے اور سمجھے جاتے ہیں، ان کا حال بھی اس معاملہ میں کچھ بہتر نہیں ارشاد ہے کہ

"دنیا دار تو الگ رہے، دینداروں کو بھی آخرت کے متعلق نہ امنگیں پیدا ہوتی ہیں نہ اندیشے، حالانکہ خدا تعالیٰ صاف صاف فرماتے ہیں یا ایھا الذین آمنوا اتقوا اللہ ولتنظر نفس ما قدمت لغد

پھر جو لوگ علم بھی دنیا کا نہیں دین ہی کا حاصل کرتے ہیں، ان کو بھی اگر دین و آخرت کی امنگوں اور اندیشوں کے بجائے اس کی فکر دامنگیر رہے کہ کھائیں گے کہاں سے تو یہ کیسے ظلم و حسرت کی بات ہے! ان کی زندگی قناعت کے لیے خیال و اسوہ ہونا چاہیے اور ان کا اسوۂ حسنہ رسول خدا صلے اللہ علیہ وسلم کی زندگی ہونا چاہیے، کہ حضور کو اپنے اور اپنے اہل وعیال کے لیے کیسی زندگی پسند و مرغوب تھی، اس کا اندازہ اس سے کرو کہ لوگوں کی آسودہ حالی سے متاثر ہو کر ازواج مطہرات کو بھی کچھ طبعاً اس طرف میلان ہوا اور حضور سے کچھ مزید نان نفقہ اور سامان کی درخواست کی، جو حضور کے قلب مبارک پر اتنی گراں گذری کہ ایک مہینہ گھر میں نہ جانے کی قسم کھالی، بالآخر یہ آیت اتری۔

یا ایھا النبی قل لازواجک ان کنتن	(خلاصہ یہ کہ حضور کو امر ہوا کہ صاف صاف
تردن الحیوۃ الدنیا وزینتھا	اپنی بیبیوں سے فرما دیں کہ اگر تم کو دنیا اور
فتعالین امتعکن واسرحکن	اس کا ساز و سامان مطلوب ہے تو میرا تمہارا
سراحا جمیلا وان کنتن تردن	نباہ نہیں ہو سکتا، اور اگر تم خدا و رسول
اللہ ورسولہ والدار الاخرۃ	کی رضا و خوشنودی اور آخرت کے مراتب
فان اللہ اعد للمحسنات منکن	و انعامات کی طالب ہو تو ایسی نیک بیبیوں
اجرا عظیما۔	کیلئے اللہ تعالیٰ نے آخرت میں عظیم الشان اجر و
	انعام مہیا فرما رکھا ہے۔

ازواج مطہرات، آخر ازواج مطہرات تھیں، سب کی آنکھیں اتنی تنبیہ ہی سے کھل

گئیں اور پھر مدت العمر حضور کیساتھ خوشی خوشی فقر و فاقہ میں گزار دی؛ کیونکہ حضور کے ہاں بارہا فاقہ ہو جاتا تھا، قرض لینے کی نوبت آجاتی تھی، اور حضور کا یہ فقر و فاقہ اضطراری نہیں بالکل اختیاری تھا، جس کو حضرت مجدد تھانوی علیہ الرحمہ نے فقر صادق سے تعبیر فرمایا ہے۔

• جس کی علامت یہ ہے کہ اس کے ساتھ دلچسپی ہو، اور دلچسپی اس کو کہتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو فقر محبوب تھا، حتیٰ کہ اپنی اولاد کے لیے بھی اس کو قولاً و عملاً اختیار کر کے دکھلایا، قولاً تو یہ ہے کہ خدائے تعالیٰ سے دعا کی۔

اَللّٰھُمَّ اجْعَلْ رِزْقَ آلِ مُحَمَّدٍ قُوتاً	اے اللہ محمدؐ کی اولاد کو رزق بس بقدر گذر اوقات عطا فرما۔

اور عملاً یہ کہ حضرت فاطمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا جو سب خاندان سے زیادہ محبوب تھیں، لیکن ایک مرتبہ جب ان کے ہاتھوں میں چکی چلانے سے چھالے پڑ گئے تو حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے فرمانے سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے کسی لونڈی غلام کی درخواست کی تاکہ کچھ مدد ملے، آپ نے فرمایا کہو تو لونڈی غلام دوں، اور کہو تو اس سے بھی اچھی چیز دے دوں، یہ سن کر حضرت فاطمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے بغیر پوچھے کہ وہ اچھی چیز کیا ہے، بلکہ فوراً عرض کیا کہ اچھی چیز ہی دے دیجئے، آپ نے فرمایا کہ سوتے وقت سبحان اللہ ۳۳ بار، الحمد للہ ۳۳ بار اور اللہ اکبر ۳۴ بار پڑھ لیا کرو، بس یہ لونڈی غلام سے بہتر ہے، اس خدا کی بندی نے خوشی خوشی قبول کر لیا، تو دیکھئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو فقر محبوب تھا، تو اپنی اولاد کے لیے اس کو تجویز کر کے دکھلایا۔ (التبلیغ ص ۳۰۴)

اور جو اولاد کے لیے محبوب تھا، محبوب اصل میں وہی امت کے لیے بھی تھا، جیسا کہ اس عمومی ارشاد سے ظاہر ہے کہ

من اصبح منکم معافی فی جسمہ	یعنی جس کو جسم کی صحت و عافیت، اور دل کا
واٰمنا فی سربہ وعندہ قوت یومہ	امن و چین نصیب ہو اور ایک دن کا کھانا
فکانما حیزت لہ الدنیا بحذا فیرھا۔	پاس ہو تو گویا ساری دنیا جمع ہو گئی۔

البتہ ضعفائے امت کے حال پر ارحم الراحمین و رحمۃ للعالمین کی شان رحمت تھی کہ جائز حد تک دنیا کے کسب و طلب کی اجازت و اباحت فرما دی، لیکن دنیا کا ایسا عشق و جنون کہ جیسے کوئی منکر آخرت ہو یا جیسے خدا سے کوئی واسطہ ہی نہیں اس کی اگر اجازت ہو تو پھر دین و دنیا کا فرق و کوئی

کا جھگڑا ہی کیا رہا۔

(۱) الغرض اسلامی و دینی زندگی کے لیے سب سے مقدم یہ ہے کہ ہر کام میں یوم دین اور مالک یوم الدین سے معاملہ دو واسطہ پیش نظر ہو، اس کے بعد دنیاوی زندگی کے سارے مسائل و مشکلات از خود حل و سہل ہو جاتے ہیں، اس لیے کہ ان کی قدر و قیمت وزن و اہمیت ہی مستقل مسائل و مقاصد کی نہیں رہ جاتی، نہ اپنی سعی و عمل کا سارا زور کوئی ہوشمند اس دنیا کے کھانے پینے، عیش و آرام پر اس طرح لگا دینے کو راضی ہو سکتا ہے کہ ساری جد و جہد اسی ادنیٰ یا خسیس و حقیر زندگی میں گم ہو کر رہ جائے، اور پھر حسن ظن یہ کہ ہم بڑا کارنمایاں انجام دے رہے ہیں "فقل سعیھم فی الحیوٰۃ الدنیا وھم یحسبون انھم یحسنون صنعا" یہ تو بقول حضرت علیہ الرحمۃ کے ویسا ہی خلل دماغ ہوگا، جیسا کوئی شخص کسی منزل مقصود کو بھلا کر ڈیننگ روم اور ہوٹل یا مسافر خانہ اور سرائے کے چند ساعت یا چند دن کے قیام کے لیے اپنی فکر و گل کی ساری قوت اس کی زینت و راحت پر خرچ کر ڈالے، سرائے و سفر میں تو آدمی کو اگر ایک آدھ وقت کھانا بھی نہ ملے — اور فاقہ ہو جائے تو بھی زیادہ پروا نہیں کرتا چہ جائیکہ کسی ایسی سرائے میں مستقل جی لگا بیٹھے، جہاں سے نکالا جانا یقینی ہے۔ یہ رضوا بالحیوٰۃ الدنیا واطمأنوا بہا تو خاص کافر و منکر آخرت ہی کا شیوہ ہے۔ اور ان ہی کو مبارک ہو۔

(۲) دوسری بات جو منکر کے مقابلہ میں مومن بالخصوص اہل علم مومن کے پیش نظر رہنے کی ہے وہ ہمارا یہ ایمان و اعتقاد ہے کہ ہر چھوٹی بڑی چیز کی طرح رزق اور اس کا قبض و بسط یا فراخی و تنگی بھی بالکلیہ حق تعالیٰ ہی کے ہاتھ میں ہے، اور پہلے ہی سے اس کا سارا پروگرام یا نظام عمل متعین و مقدر ہو چکا ہے اس طرح اصل نظر اسباب کے بجائے مسبب الاسباب اور تدبیر کے بجائے تقدیر پر رہنا عین ایمان ہے جس کے بغیر ایمان ہی صحیح اور پورا نہیں ہوتا، "جو کچھ خدا دینا چاہے اس کو کوئی روک نہیں سکتا، اور جو وہی نہ دینا چاہے گا تو کوئی دے نہیں سکتا" (لا معطی لما منعت ولا مانع لما اعطیت) حدیث میں تو صاف ہے کہ کوئی بندہ بلا ان چار باتوں پر ایمان لائے مومن نہیں ہو سکتا، ایک توحید (لا الٰہ الا اللہ) دوسرے رسالت محمدیہ صلی اللہ علیہ وسلم تیسرے آخرت یا بعث بعد الموت، اور چوتھے تقدیر۔

(۳) تیسرے جوان دونوں مقدمات کا لازمی نتیجہ ہے کہ اس دنیا کی زندگی میں مومن کبھی زیادہ سے زیادہ اپنی سعی و طلب کو ضروریات زندگی تک محدود رکھے اور فضولیات زندگی کی فکر و سعی قطعاً وقت عزیز کو کھونا ہے اور طفلانہ لہو لعب سے زیادہ نہیں، البتہ بلا اضاعت وقت اور بلا ابتلا و لہو و لعب، کچھ راحت کا سامان بھی میسر ہو جائے تو اس کو بھی اللہ تعالیٰ ہی کا اس طرح ایک انعام و احسان جان کر متمتع ہو جس سے خدا و آخرت

کا قلق اور بیدار و پائیدار ہو، البتہ راحت بھی یاد رہے کہ اصل میں قلب کی راحت کا نام ہے۔

اہلِ بصیرت کان کھول کر دینداروں ہی کو نہیں دنیاداروں کو بھی سن اور کچھ لینی چاہیئے، جیسا اوپر اپنے اور پرائے سب کے تجربات سے واضح کیا جا چکا، کہ قلب کی راحت یا دل کے سکھ چین کا راز مادی ساز و سامان یا فضولیات کی بہتات میں نہیں بلکہ ضروریات زندگی پر قناعت ہی میں پوشیدہ ہے، اور ساتھ ہی اگر ایمان و عمل صالح یا دیندار کی زندگی بھی نصیب ہو تو حیاتِ طیبہ کی موعودہ زندگی کا تجربہ اسی دنیا میں ہو جاتا ہے جس کا جی چاہے آزما کر دیکھ لے۔

سو آپ نے اچھی طرح دیکھ لیا کہ مومن کامل کے اس سوال کا کہ "کھائیں گے کہاں سے" کیسا کامل و سہل حل موجود ہے: بلکہ جس کو معاش کی فکر و پریشانی کہا جاتا ہے، ایمانی زندگی سے جسم و جان کو گھلانے والی یہ فکر معاش در اصل سرے سے خارج ہو جاتی ہے اور یہ سوال سرے سے بے معنی ہو جاتا ہے، کہ "دینی یا عربی تعلیم حاصل کر کے کھائیں گے کیا،" خصوصاً علم دین کی تحصیل و تعلیم کی ہمت و سعادت رکھنے والوں کا یہ سوال تو اور بھی بے معنی ہے اس کے معنی تو صرف یہ ہیں کہ ابھی علم دین کی ابجد بھی نہیں سمجھی — اور دستارِ فضیلت باندھ دی گئی تھی اس لیے کہ جیسے کہ اوپر تشریح و تاکید کے ساتھ عرض کیا گیا ہے، زندگی میں دین پیدا کرنے کے لیے تعلیم دین کے ساتھ ساتھ تربیت دین لازم بلکہ الزم ہے کیونکہ تربیت بلا تعلیم تو دیندار بنا دیتی ہے لیکن تعلیم بلا تربیت سے شاذ و نادر ہی دین پیدا ہو سکتا ہے۔

(الفرقان شوال ۱۳۹۷ھ)

حاشیہ صفحہ گزشتہ —

[1] الفاظ یہ ہیں: قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لا یؤمن عبد حتی یؤمن باربع یشہد ان لا الٰہ الا اللہ وانی رسول بعثنی بالحق ویؤمن بالموت والبعث بعد الموت ویؤمن بالقدر۔

مجلس تحقیقات و نشریات اسلام لکھنؤ
کی
چند نئی مطبوعات
دریائے کابل سے یرموک تک
مغربی ایشیا کے چند مسلم و عرب ممالک کے اس معلوماتی و دعوتی دورے کی مفصل روئیداد اور ڈائری جو مولانا سید ابو الحسن علی ندوی نے حال میں کیا تھا۔ اس کتاب میں ان ممالک کی دینی، فکری، سیاسی، اقتصادی صورت حال کی سچی تصویر آ گئی ہے۔
اس میں ملت اسلامیہ کے دل کی دھڑکنیں سنی جا سکتی ہیں۔
امیدوں اور اندیشوں کا ملا جلا مرقع — تاریخ کے صدہا صفحات کا نچوڑ
بعض اہل نظر کا کہنا ہے کہ "اس نصف صدی کے اندر جو چند فکر انگیز کتابیں لکھی گئی ہیں، ان میں اس کتاب کا ممتاز مقام ہے۔ طباعت، گرد پوش اعلیٰ، مفصل اشاریہ (انڈکس) صفحات ۳۰۴ قیمت مجلد ۱۴/-
اسلام اور غیر اسلامی تہذیب
تالیف: شیخ الاسلام ابن تیمیہ
ترجمانی: شمس تبریز خاں
رواداری، مدارات اور بقاء باہم کے اصول و حدود کتاب و سنت اور اسلامی تعلیمات کی روشنی میں اعلیٰ کتابت و طباعت۔ دیدہ زیب ڈسٹ کور — مجلد ۹/-
مولانا سید ابو الحسن علی ندوی کی تازہ تصنیفات اور اصلاحی تقریریں
• مغرب سے کچھ صاف صاف باتیں اردو 5/- انگریزی 5/-
• ہندوستانی مسلمان ایک نظر میں " 5/- " 10/-
• معرکۂ ایمان و مادیت " 5/- " 10/-
• اسلام مکمل دین مستقل تہذیب " 85/- " 1/50
• انسانی و تہذیبی جاہلیت کا المیہ " 75/- " 1/-
• ایک بہتر ہندوستانی سماج کی تشکیل " 1/- " 2/-
• قادیانیت — اسلام اور نبوت محمدی کے خلاف ایک بغاوت " 1/- " 1/-
• دو اقتباس چہرے قرآن کے مرقع میں 75/- • صحبت فاتح عالم 25/-
• مقام انسانیت 2/- • پیام انسانیت 2/50
مزید تفصیلات و معلومات کے لیے مجلس کی فہرست کتب ملاحظہ فرمائیے
مجلس تحقیقات و نشریات اسلام
پوسٹ بکس ۱۱۹ دار العلوم ندوۃ العلماء، لکھنؤ

پیامِ انسانیت

مولانا سید ابو الحسن علی ندوی

نفس پرستی یا خدا پرستی؟

محترم مولانا کی یہ تقریر ۲۰ نومبر ۱۹۵۱ء کو لکھنؤ کے ایک ایسے اجتماع میں فرمائی جس میں ہر مذہب و خیال کے لوگ موجود تھے

خطبۂ مسنونہ کے بعد:

اے بزم جہاں احباب سے دو دل کی کہہ لے
پھر التفات دل دوستاں رہے نہ رہے

دوستو!

میں آپ سے اس وقت کچھ دل کی باتیں کہنا چاہتا ہوں، اور اس طرح کہنا چاہتا ہوں جیسے میں آپ میں سے ہر ایک کے ساتھ تنہا بیٹھ کر گفتگو کر رہا ہوں۔ فی الواقع اگر اس کا کوئی امکان ہوتا کہ آپ میں سے ہر دوست سے الگ ہی الگ اپنے دل کی بات کہہ سکتا تو میں ضرور ایسا ہی کرتا تاکہ آپ اسے تقریر سمجھ کر نہیں بلکہ ایک دوست کا درد دل سمجھ کر سنتے مگر کیا کروں ایسا ممکن نہیں ہے۔ اگر یہ چیز ممکن ہوتی تو الکشن میں کھڑے ہونے والے امیدوار ضرور اس پر عمل کرتے، اور وہ اپنی انتخابی مہم کے سلسلے میں جلسے منعقد نہ کرتے، اس لیے کہ انھیں تو اس جلسے میں وہ باتیں کہنا ہوتی ہیں جو تنہائیوں میں لے جا کر کسی کے کان میں کہنا گراں ہوتی ہیں، یعنی اپنی تعریف، اپنی اہلیت کا اظہار، اور اپنی شان میں بے تحاشہ آپ ہی قصیدہ خوانی کر سکتے ہیں بس اتنا ہی کر سکتا ہوں کہ آپ سے یہ درخواست کروں کہ براہ کرم میری گزارشات کو تقریر کی نہیں بلکہ دل کی باتیں سمجھ کر سنئے۔

دوستو اور بزرگو!

دنیا میں زندگی کے بہت سے طرز رائج ہیں اور اس کی بہت سی قسمیں کی جاتی ہیں، مشرقی زندگی، مغربی زندگی، جدید فلسفۂ زندگی، قدیم فلسفۂ زندگی وغیرہ وغیرہ، لیکن حقیقت میں زندگی کی بنیادی قسمیں صرف دو

ہیں۔ ایک نفس پرستانہ زندگی دوسری خدا پرستانہ زندگی۔ باقی جتنی قسمیں جتنے مختلف ناموں سے مشہور ہیں وہ سب ان ہی دو کی شاخیں ہیں۔

پہلی قسم کی زندگی یہ ہے کہ آدمی اپنے آپ کو ایک شتر بے مہار سمجھ کر زندگی گزارے اور جو جی میں آئے کر گزرے اس کو من مانی زندگی بھی کہہ سکتے ہیں، دوسری قسم کی زندگی ایک ایسے آدمی کی زندگی ہے جو یقین رکھتا ہے کہ اسے کسی نے پیدا کیا ہے وہ پیدا کرنے والا ہی اس کی زندگی کا مالک اور حاکم ہے، وہ اس کی ضرورتوں اور مصلحتوں کو سب سے زیادہ جانتا ہے، اس کی طرف سے زندگی گزارنے کے کچھ ضابطے اور قاعدے ہیں جن کی پابندی کرنا ضروری ہے۔

ہندوستان میں مہابھارت ایک بہت بڑی تاریخی لڑائی ہوئی ہے، مجھے اس کی تاریخی حیثیت سے انکار نہیں ہے مگر اس دنیا میں ایک دوسری مہابھارت بھی پائی جاتی ہے یہ ہندوستان کی مہابھارت سے زیادہ قدیم ہے، یہ وہ لڑائی ہے جو خدا پرستی اور نفس پرستی کے درمیان ہمیشہ سے جاری ہے، یہ لڑائی کسی ایک ملک تک ہی محدود نہیں رہی ہے بلکہ دنیا کی ہر ہر ملک میں پہنچی اور نہ یہ جنگ کے میدانوں ہی تک محدود رہی بلکہ اس کے معرکے گھروں کے اندر بھی ہوئے ہیں، یہ زندگی کے وہ اصول ہیں جو ہمیشہ ایک دوسرے پر غالب آنے کی کوشش کرتے رہے ہیں۔ حضرات پیغمبران نے اپنے اپنے وقتوں میں ہر جگہ خدا پرستانہ زندگی کی دعوت دی ہے، اور ان کی کامیابی کے دور میں اسی قسم کی زندگی کا دور دورہ رہا، لیکن نفس پرستی ہمیشہ کے لیے کبھی فنا نہیں ہوئی بلکہ اسے جب بھی موقع ملا وہ زندگی پر قابض ہو گئی۔ بدقسمتی سے ہمارا زمانہ وہ ہے جس میں نفس پرستی زندگی پر پوری طرح مسلط ہے، زندگی کا ہر شعبہ اور ہر میدان اس کی گرفت میں آیا ہوا ہے، گھر دن میں نفس پرستی، بازاروں میں نفس پرستی، دفتروں میں نفس پرستی، کارخانوں میں نفس پرستی۔۔۔۔ گویا ایک سمندر ہے جو خشکی میں پورے زور شور سے بہہ رہا ہے، اور ہم اس میں گلے گلے اترے ہوئے ہیں۔ یہ نفس پرستی اب مستقل ایک مذہب بن چکا ہے نہیں، بلکہ ہمیشہ سے اس کی یہ نوعیت رہی ہے اور عموماً اسی مذہب کے ماننے والوں کی تعداد سب سے زیادہ رہتی ہے ہر چند کہ مذاہب کی فہرست میں اس نام کا کوئی مذہب نہیں بتلایا جاتا، اور نہ اس نام سے کسی مذہب کے ماننے والوں کی تعداد کا شمار کیا جاتا ہے، مگر یہ اپنی جگہ بالکل حقیقت ہے کہ یہ دنیا کا سب سے بڑا مذہب ہے، اور اس کے ماننے والے سب سے زیادہ تعداد میں پائے جاتے ہیں۔ آپ کے سامنے مختلف مذاہب کے ماننے والوں کے اعداد و شمار آتے ہیں کہ عیسائی مذہب کے پیرو اتنے، اسلام کے پیرو اتنے، اور ہندو دھرم کے ماننے والے اتنے گویا ان میں سے ہر ایک میں سے ایک بڑی تعداد ان لوگوں کی ہے جو کہلاتے تو ہیں مذہباً عیسائی، ہندو اور مسلمان لیکن ہیں درحقیقت اسی مذہب نفس پرستی کے پیرو۔۔۔ نفس پرستی کی زندگی کا رواج، اور اس مذہب کی مقبولیت صرف اس

وجہ یہ ہے کہ آدمی کو اس میں مزہ بہت آتا ہے، اکہ نفس پرستی کی زندگی بڑے مزے کی اور بڑے لطف کی ہے۔ اور ہر آدمی کی طبعی خواہش لطف اندوزی ہوتی ہے، لیکن اگر دنیا کے تمام انسانوں کو سامنے رکھ کر دیکھا جائے تو پھر اس قسم کی زندگی دنیا کے لیے ایک لعنت ہے، اور اس کی ساری مصیبتیں اور سارے دکھ اسی نفس پرستی کا نتیجہ ہیں، اور دنیا کی ساری تباہیوں، تمام فسادوں، اور ناانصافیوں کی ذمہ داری انہیں پر عائد ہوتی ہے جو اس منحوس مذہب کے پیرو ہیں۔ اس دنیا میں اس مذہب کی گنجائش صرف اسی صورت میں نکل سکتی ہے کہ پوری دنیا میں صرف ایک انسان کا وجود ہو، اسی صورت میں وہ اپنے نفس کی مانگ من مانے طور پر پورا کرنے کا حقدار ہو سکتا ہے، لیکن وہ تو یوں نہیں ہے، اس دنیا کے پیدا کرنے والے نے اس میں کروڑوں اور اربوں انسانوں کو بسایا ہے، اور ان میں سے ہر ایک کے ساتھ نفس، خواہشات اور ضروریات نفس لگی ہوئی ہیں ایسی صورت میں جو شخص بھی من مانی زندگی گزارنے کی کوشش کرتا ہے گویا اس واقعہ سے آنکھیں بند کرتا ہے کہ اس کے ساتھ اس کے اور بھی ہم جنس رہتے ہیں۔ لیکن واقعہ سے آنکھیں بند کرنے سے واقعہ غلط نہیں ہو جاتا وہ اپنی جگہ پر رہتا ہے اس لیے کچھ لوگوں کی نفس پرستی کا نتیجہ لامحالہ دوسروں کی مشکلات اور مصائب کی شکل میں نکلے گا۔

نفس پرستی کی زندگی گزارنے والا من کا راجہ ہوتا ہے، من کا راجہ وہ راجہ ہے کہ اگر ساری دنیا میں بھی اس کی خواہشات سکّہ چلے، تو اس کا پیٹ اتنے میں بھی نہیں بھر سکتا، وہ اس سے اور زیادہ کا مند رہے گا ——— غور فرمایئے جب یہ ساری کائنات بھی ایک من کے راجہ کی تسکین کے لیے ناکافی ہے تو آج جو ایک ایک گھر کی محدود سی دنیا میں کئی کئی من کے راجہ پائے جاتے ہیں تو وہ کیونکر سکھ اور چین پا سکتے ہیں۔ اس نفس پرستی کے مرض نے ایک ایک گھر میں چار چار من کے راجہ پیدا کر دیئے ہیں۔ باپ بھی راجہ، ماں بھی رانی، بیٹا بھی راجہ، اور بیٹی بھی اپنے من کی رانی، تو کیونکر گھروں میں چین اور امن رہ سکتا ہے؟ یہ نفس پرستی کی زندگی جس کو ہر شخص گزار کر مزہ حاصل کرنا چاہتا ہے۔ ایک آگ بنی ہوئی ہے جس میں ایک گھر کے افراد بھی جل رہے ہیں، ایک ملک کی قوم بھی جل رہی ہے اور دنیا کی پوری آبادی جل رہی ہے۔

دوستو!

دنیا کی مصیبتوں کی جڑ یہی ہے کہ ہر شخص اپنے نفس کی اطاعت کرنا چاہتا ہے! دوا ان مصیبتوں کی یہ ہے کہ من کا کہا ماننے کے بجائے خدا کی اطاعت کرو۔ یہ دنیا کروڑوں کی تو کیا، دو آدمیوں کی بھی من مانی کی گنجائش اپنے اندر نہیں رکھتی اس لیے من مانی زندگی گزارنے کے خیال کو چھوڑ دو، اور اس طرح

ہش کر جس کا پیغام اللہ کے پیغمبروں نے دیا تھا، یعنی خدا پرستی کی زندگی۔ اس دنیا کے پیدا کرنے والے
انے میں اس زندگی کے پیغامبر پیدا کیے، کیونکہ اسی طرز زندگی سے دنیا کا نظام ٹھیک طریقے سے چل سکتا ہے
روں نے پوری طاقت سے اس طرز زندگی کی دعوت دی، اور نفس پرستی کا زور توڑنے کی اپنی طاقت بھر کوشش
کی، لیکن جیسا کہ میں شروع میں عرض کر چکا ہوں پھر بھی نفس پرستی کا رواج دنیا سے نہ مٹا، اور جب
پرستی کی دعوت کمزور پڑی، نفس پرستی کا رواج بڑھ گیا اور اسکا سیلاب آتے آتے دنیا کے تمام لوگوں کی تہذیب پر چھا گئیں اور تمام
حد تک پہنچ گئیں۔ مثال کے طور پر چھٹی صدی عیسوی کا زمانہ دیکھیے، اس صدی میں نفس پرستی کی زندگی کا دور اپنی انتہا کو پہنچ
گیا تھا، ملک ملک اس کا دور دورہ تھا، یہ ایک بھیانک اور دریا تھا جس کے دھارے پر ہر چھوٹا بڑا
تھا بادشاہ اپنی نفس پرستی میں مبتلا تھے، رعایا ان کی نقل میں نفس پرستی کا شکار تھی۔ مثال کے طور پر ایران
بیان کرتا ہوں۔

وہاں قوم کا ہر طبقہ نفس پرستی کا بیمار تھا ـــــ شاہ ایران کی نفس پرستی کا حال یہ تھا کہ اس کی بیبیوں کی
رہ ہزار تھی جب مسلمانوں نے اس ملک کو اس مصیبت سے نجات دلانے کے لیے حملہ کیا، اور ایران کا بادشاہ
چھوڑ کر بھاگا تو ایسے نازک وقت میں بھی حال یہ تھا کہ اسکے ہمراہ ایک ہزار باورچی تھے، ایک ہزار
تھے اور ایک ہزار باز اور شکرے کے محافظ و منتظم تھے، مگر اس پر بھی اسکو افسوس تھا کہ بڑی بے سروسامانی
نا ہوا ہے۔ اس زمانے کے جنرل اور سپہ سالار ایک لاکھ کی ٹوپی اور ایک لاکھ کا پٹکا لگاتے تھے اونچی
ں میں معمولی کپڑا پہننا گویا جرم تھا لیکن اس طبقہ کی نفس پرستی نے عوام کو کن کن مشکلات میں مبتلا
ں کا اندازہ اس سے کیجیے کہ کسانوں کا حال یہ تھا کہ وہ لگان بھی نہیں دے سکتے تھے، اور زمینیں چھوڑ
خانقاہوں، عبادت گاہوں میں جا بیٹھتے تھے۔ متوسط طبقہ کے لوگ امراء کی ریس میں دیوالیہ ہو گئے
تھے چنانچہ معاشی لوٹ کھسوٹ برپا تھی، غرض زندگی کیا تھی، ایک ریس کا میدان تھی ظلم و زیادتی عام
ر بڑا اپنے چھوٹے کو، اور حاکم اپنے محکوم کو لوٹنے، اور اس کا خون چوسنے کی کوشش میں لگا ہوا تھا اور پوری
ٹی میں ایک بڑا ہنگامہ پھیلی ہوئی تھی ـــــ آپ سمجھتے ہیں کہ ایسی سوسائٹی میں عقائد، اخلاق اور کیرکٹر
پ سکتا ہے، اور کس کو آخرت کی فکر اور اخلاقی ذمہ داریوں کا احساس رہ سکتا ہے ان تمام اعلیٰ چیزوں کو تو
پرستی کا سیلاب بہائے چلا جا رہا تھا: لیکن کوئی نہ تھا جو اس سیلاب پر بند باندھتا اور اس دھارے کو تھا
، ادبار، اور فلسفہ، سب اسی کے رخ پر تنکوں کی طرح بہہ رہے تھے۔ کسی میں ہمت نہ تھی
ارے کے رخ کے خلاف پیر کر دکھاتا، اور دھارا بھی کون سا؟ پانی کا نہیں عام
کا دھارا؟ اس کی ہمت ایک شیر دل انسان ہی کر سکتا ہے ـــــ اللہ کو منظور

تھا کہ اس دھارے کا رخ موڑا جائے اس کام کے لیے اس نے عرب میں ایک انسان کو پیدا کیا اور اس کو نبوت عطا کی، جس کو ہم محمد رسول اللہ کے نام سے یاد کرتے ہیں (صلی اللہ علیہ وسلم) جنھوں نے دھارے کے خلاف پیر کر ہی نہیں بلکہ اس کا رخ کر کے دکھایا ـــــــ اس وقت کسی آدمی سے کام نہیں چل سکتا تھا جو دھارے کا رخ تو نہ موڑ سکے، بلکہ اس میں بہنے والی چیزوں کو نکال لائے، اس لیے کہ اس وقت کوئی ایسا محفوظ مقام نہ تھا جہاں اس سیلاب کا دھارا چل رہا ہو عبادت گاہوں اور کلیساؤں تک کو تو اس سیلاب نے اپنی زد میں لے رکھا تھا اس سمندر میں کوئی ٹاپو نہ تھا اور اگر تھا تو وہ ہر آن خطرے کی زد میں تھا۔ ایمان، اخلاق، شرافت، تہذیب اور مختصر الفاظ میں انسانیت کی روح کو اس سیلاب سے بچانے کا کام اگر کوئی شخص کر سکتا تھا تو وہی شخص کر سکتا تھا جس میں دھارے کا رخ موڑ دینے کی ہمت ہو۔ ایسی ہستی اس وقت صرف اللہ کے اسی آخری پیغمبر کی ہستی تھی جس نے رواج عام کے اس دھارے کو جو ایک طوفانی انداز میں نفس پرستی کی سمت میں بہہ رہا تھا چند سال کی کوشش سے خدا پرستی کی طرف پھیر دیا۔ ہمیں جو چھٹی صدی عیسوی کی دنیا کی تاریخ میں ایک دم سے ایک حیرت انگیز انقلاب نظر آتا ہے جس نے ساری زندگی کو اور بالآخر ساری دنیا کو متاثر کیا اور اب بھی جو کچھ انسانیت، اور خدا پرستی کا بچا کھچا سرمایہ ہے وہ سب انھیں کی محنت کا فیض ہے ؂

بہار اب جو دنیا میں آئی ہوئی ہے یہ سب پود انھیں کی لگائی ہوئی ہے

ممکن ہے آپ میں سے کسی کو یہ شبہ گزرے کہ یہ کہنا تو صحیح نہیں ہے کہ اس زمانے میں عام طور پر لوگ صرف نفس پرست تھے کیونکہ وہاں بہت سی دوسری "پرستیاں" بھی موجود تھیں۔ کچھ لوگ سورج پرست تھے، کچھ لوگ آگ کو پوجتے تھے، کچھ صلیب کو پوجتے تھے، کچھ درختوں کو پوجتے تھے اور کچھ پتھروں کی پرستش کرتے تھے، ٹھیک ہے! یہ بات اپنی جگہ پر صحیح ہے مگر یہ تمام "پرستیاں" ایک پرستی کی تھیں جسکے عام رواج کا میں دعویٰ کر رہا ہوں یہ ساری پرستیاں اس لیے کی جاتی تھیں کہ یہ نفس پرستی کے خلاف نہیں تھیں، یہ پرستیاں، انسانی زندگی گزارنے میں رکاوٹ نہیں ڈالتی تھیں۔ آگ، پیڑ، پتھر، سورج وغیرہ ان سے نہ کہتے تھے کہ یہ کام کرو اور یہ مت کرو، اس لیے وہ ان کی پرستش کے پہلو بہ پہلو اپنے نفس کی اطاعت بھی کرتے رہتے تھے، اور دونوں میں کوئی تناقض نہیں پاتے تھے ـــــــ بہر حال ہمارے پیغمبر (صلی اللہ علیہ وسلم) نے اس سیلاب سے لڑنے اور اس کا رخ موڑ دینے کا بیڑا اٹھایا، اور پوری سوسائٹی سے لڑائی مول لی، حالانکہ آپ اپنی اس سوسائٹی میں بہت مقبول اور ہر دلعزیز تھے، صادق اور امین کے معزز لقب سے یاد کیے جاتے تھے اور اس لیے آپ کو ترقی کے بڑے بڑے مواقع حاصل تھے، آپ کو اپنی قوم کا اتنا اعتماد حاصل تھا کہ ترقی کا کوئی اونچے سے اونچا مقام نہ تھا جو آپ کو مل نہ سکتا مگر یہ سب کچھ جب ممکن تھا جب آپ ان

کی زندگی کو غلط نہ کہتے" اور اس کو ایک دوسرے رُخ پر موڑ دینے کے عزم و ارادہ کا اظہار نہ فرماتے مگر آپ کو اللہ نے کھڑا ہی اسلئے کیا تھا کہ بہاؤ کے رخ پر نہ خود بہیں اور نہ کسی کو بہنے دیں۔ اسلئے سب سے پہلے تو آپ نے اپنی زندگی کو خدا پرستی کی زندگی کا نمونہ بنا کر پیش کیا اور بالفاظ دیگر دھارے کے خلاف پیر کر دکھایا۔ پھر پوری سوسائٹی کے رخ کو نفس پرستی سے ہٹا کر خدا پرستی کی طرف موڑ دینے کی کوشش شروع کی۔ اس کوشش کو کامیاب بنانے کے لیے آپ نے تین بنیادی چیزیں لوگوں کے سامنے پیش کیں۔ —— [1] یقین کرو کہ تمہارا اور اس ساری دنیا کا پیدا کرنے والا اور اس پر حکومت کرنے والا ایک ہے۔ [2] یقین کرو کہ اس زندگی کے ختم ہونے کے بعد ایک دوسری زندگی ہے جس میں اس زندگی کا حساب و کتاب دینا ہے۔ [3] یقین کرو کہ میں اللہ کا بھیجا ہوا پیغمبر ہوں، اس نے اس دنیا کے متعلق احکام دیکر مجھے بھیجا ہے۔ جن احکام پر مجھے بھی چلنا ہے اور تمھیں بھی —— آپ نے جب ان چیزوں کا اعلان فرمایا تو سوسائٹی میں ایک ہل چل مچ گئی۔ نفسیں اٹھ کھڑی ہوئیں! اس لیے کہ یہ نعرہ ان کی زندگی کے آرام میں خلل ڈالنے والا تھا، سارا زمانہ جس رُخ پر بہہ رہا تھا، اس کو چھوڑ کر دوسرا رخ اختیار کرنا آخر کوئی آسان کام نہ تھا۔ زندگی کی کشتی بہاؤ پر بلا دقت کے چلی جا رہی تھی انھیں کیا پڑی تھی کہ بہاؤ کے خلاف اپنی کشتی چلا کر دقتیں اور خطرات مول لیں، اس لیے انھوں نے چاہا کہ یہ آواز دب جائے، کچھ لوگوں نے آپ کی نیت ہی پر شبہ کیا، ان کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ دیکھنے میں ایک انھیں جیسا انسان اتنا صاحب عزم بھی ہو سکتا ہے کہ زندگی کے اس طوفانی دھارے کا رُخ موڑنے کی ٹھانے جس میں صرف ہم ہی نہیں دنیا کی ساری قومیں، ان کے علماء اور حکمران ان کے احبار و رہبان ان کے ائمہ تہذیب و سیاست، ان کے عقائد و اخلاق، ان کے علوم و فلسفے، اور ادب و سیاست خس و خاشاک کی طرح بہے چلے جا رہے ہیں —— وہ اس دعوے میں کسی شخص کو مخلص ماننے سے قطعًا عاجز تھے، اس لیے انھوں نے سمجھا کہ اس دال میں کچھ کالا ضرور ہے، ہو نہ ہو اس بلند بانگ دعوے کے پیچھے کچھ اور مقصد اور کوئی خواہش کام کر رہی ہے اس لیے انھوں نے ایک وفد رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کے پاس بھیجا جس نے اپنے خیال کے مطابق تین بڑی چیزیں آپ کے سامنے پیش کیں۔ اس نے کہا اگر آپ کا مقصد اس قسم کی باتوں سے یہ ہو کہ ہم آپ کو اپنا سردار تسلیم کر لیں تو چھوڑیئے ان باتوں کو ہمیں یہ منظور ہے اور یا اگر آپ بہت سے مال و دولت کے طالب ہوں تو ہمیں یہ بھی منظور ہے۔ اور یا اگر آپ کسی حسین عورت کے خواہشمند ہوں تو ہمیں یہ بھی منظور ہے ہم ملک کی سب سے حسین عورت آپ کو پیش کر دیں گے، آپ نے جو یہ نئی بات اٹھانی شروع کی ہے اس سے دستبردار ہو جایئے!

مگر اللہ کے اس سچے رسول ﷺ اور خدا پرستی کے سب سے بڑے علمبردار نے نہایت بے نیازی سے جواب دیا کہ میں تم سے کچھ لینا نہیں دینا چاہتا ہوں، اور وہ میری یہی تین باتیں ہیں جن کی میں تمھیں دعوت دے رہا ہوں میں چاہتا ہوں کہ تمھیں موت کے بعد والی زندگی میں راحت ملے اور وہ میری ان تین باتوں کے قبول کرنے پر موقوف ہے۔ آپ کی زبان ہی نہیں بلکہ آپ کی پوری زندگی نے ان لوگوں کے اس خیال کی تردید کی، کہ آپ دنیا کی کسی چیز کے خواہشمند ہیں، مخالفت نے اتنی شدت اختیار کی کہ آپ کو مکہ چھوڑ کر مدینہ جانا پڑا، مگر خدا پرستی کی دعوت کو نہیں چھوڑا، مخالفین کو اندازہ نہیں تھا کہ آپ نفس پرستی سے کتنی دور ہیں اور اس دھارے کے مخالف سمت میں تیرنے کی آپ میں کتنی طاقت تھی اور کتنا عزم تھا۔ آپ نفس پرستی سے اتنی دور تھے کہ جب مکہ چھوڑنے کے کچھ سال بعد آپ پھر مکہ میں آئے اور فاتحانہ حیثیت سے آئے، اپنے مخالفوں کو مغلوب کر کے آئے، تب بھی آپ کی خدا پرستانہ شان میں ذرا تغیر نہ ہوا، فتح کا نشہ آپ پر ذرا بھی نہیں چڑھا، مکہ میں آپ کا داخلہ اس شان سے ہوا کہ اونٹ پر سوار تھے، بدن پر غریبانہ لباس تھا، اور زبان پر خدا کا شکر اور اپنی عاجزی کا اظہار تھا۔ اس موقع پر ایک آدمی آپ کے سامنے آیا اور رعب سے کانپنے لگا، آپ نے فرمایا گھبراؤ نہیں، میں قریش کی اس غریب عورت کا بیٹا ہوں جو سوکھا گوشت کھایا کرتی تھی۔ سوچئے! کیا کوئی فاتح ایسے وقت میں ایسی بات کہہ سکتا ہے جس سے اس کا رعب لوگوں پر سے اٹھ جائے؟ ایسے وقت میں تو کوشش کی جاتی ہے کہ زیادہ سے زیادہ رعب ڈالا جائے ــــــــ آپ آج بھی دیکھتے ہیں اور آج سے پہلے کا حال تاریخ میں پڑھ سکتے ہیں کہ جن لوگوں کے ہاتھ میں حکومت اور اقتدار آجاتا ہے، ان کی آل اولاد اس سے کتنا نفع اٹھاتے ہیں، اور اس کے بل پر کیسے کیسے عیش و آرام کے مزے لوٹتے ہیں، مگر خدا پرستی کے سب سے بڑے علمبردار کا حال اس معاملہ میں بھی دنیا سے مختلف تھا، آپ کی صاحبزادی اپنے گھر کا سارا کام اپنے ہاتھ سے کرتی تھیں، جس کی وجہ سے آپ کے ہاتھوں میں گھٹے پڑ گئے تھے اور جسم پر مشکیزہ اٹھانے کے نشانات ہو گئے تھے، ایک دن انھوں نے سنا کہ میدان جنگ سے کچھ غلام اور کنیزیں ابا جان کی خدمت میں لائی گئیں ہیں، خیال کیا کہ میں بھی اپنے لیے ایک آدھ غلام یا کنیز مانگ لاؤں، تشریف لے گئیں، اپنی پریشانی کا حال بیان کیا، ہاتھوں کے گھٹے دکھائے، حضور نے فرمایا: بیٹی! میں تمھیں غلام اور باندی سے اچھی چیز دیتا ہوں، غلام اور باندی اور مسلمانوں کے حصے میں جانے دو، تم سوتے وقت تینتیس[۳۳] مرتبہ سبحان اللہ، تینتیس[۳۳] مرتبہ الحمد للہ، اور چونتیس[۳۴] مرتبہ اللہ اکبر پڑھ لیا کرو!" بے نفسی اور خدا پرستی کی کیسی عجیب مثال ہے بیشک آپ خدا پرستوں

کے سردار تھے، کیا کوئی بھی آپ کی بے نفسی پر حرف لا سکتا ہے۔ دوسروں کے حق میں بے نیازی اور اپنے اور اپنی اولاد کے لیے فقر و غربت کو ترجیح دینا پیغمبر ہی کی شان ہے ؎

عدیل ہمت ساقیست فطرت عرفی ۔۔۔ کہ حاتم دگراں و گدائے خویشتن است

آج ایسے لوگ آپ کے سامنے ہیں جنھوں نے پچھلے کچھ دنوں میں چند روز یا چند سال جیلیں کاٹ لی ہیں تو آج اقتدار حاصل ہونے پر ان تکلیفوں کا سارا حساب مع سود کے چکا لینے پر ہیں —— جب کسی شخص کو اقتدار اور قانون کی طاقت مل جاتی ہے تو عموماً وہ اپنے اعزہ، اور اپنی اولاد کو قانون کی گرفت سے بچانے کی سعی کرتا ہے، مگر خدا پرستوں کے سردار کی شان اس معاملہ میں بھی بالکل نرالی تھی۔ ایک عورت پر چوری کا الزام ثابت ہوا، آپ نے ہاتھ کاٹنے کا حکم دے دیا، لوگوں نے حضورؐ کے ایک مقرب اور محبوب صحابی سے سفارش کرائی کہ معاف فرما دیا جائے، حضورؐ کا چہرہ غصہ سے سرخ ہو گیا اور فرمایا: "خدا کی قسم! اگر محمدؐ کی (چہیتی) بیٹی فاطمہؓ سے بھی یہ جرم سرزد ہو جائے، تو محمدؐ اس کا بھی ہاتھ کاٹے گا۔"

اپنے آخری حج کے موقع پر مسلمانوں کے عظیم ترین اجتماع میں آپ نے کچھ قوانین اور احکام کا اعلان عام فرمایا تو ان کو سب سے پہلے اپنے رشتہ داروں اور اپنے خاندان پر جاری کیا۔ آپ نے مجمع عام میں کھڑے ہو کر اعلان فرمایا کہ جاہلیت کے تمام دستور ختم کئے جاتے ہیں، منجملہ ان کے سودی لین دین آج سے ختم، اور سب سے پہلے میں اپنے چچا عباسؓ کے سودی قرضے کو باطل قرار دیتا ہوں، اب ان کا سود کسی پر واجب نہیں، اب وہ سود کا روپیہ کسی سے وصول نہیں کر سکتے۔ یہ تھی خدا پرستی! ورنہ آج کل کے قانون ساز اگر اس قسم کے قانون بنانے والے ہوں تو اپنے رشتہ داروں اور ملنے والوں سے پہلے سے کہدیں کہ فلاں قانون آنے والا ہے ذرا جلدی جلدی اپنی فکر کر لو۔ زمینداری کے خاتمہ کا قانون پاس ہونے والا ہے، جتنی زمین نکال سکتے ہو نکال لو یا بیچنا چاہو تو بیچ دو۔ ایسے ہی اس موقع پر آپ نے اعلان فرمایا کہ زمانۂ جاہلیت (یعنی قبل اسلام) کے تمام خون باطل کیے جاتے ہیں، اب ان کا انتقام نہیں لیا جا سکتا، اور اس کے ماتحت میں سب سے پہلے (اپنے خاندان کا خون) ربیعہ بن الحارث کا خون باطل قرار دیتا ہوں ـــــــ ہمارے حضورؐ اس بے مثال خدا پرستی کے ساتھ (جس کی طرف چند مثالیں میں نے بیان کی ہیں) نفس پرستی کے اس سیلاب سے لڑتے رہے جو دنیا کی ساری قوموں کو بہائے لیے چلا جا رہا تھا، اور آخر کار اس کو روکنے میں کامیاب ہوئے، اور لوگ مجبور ہوئے کہ آپ کی بات پر کان دھریں اور مانیں۔ چنانچہ جن لوگوں نے آپ کی ان تین بنیادی باتوں کو کما حقہٗ قبول کر لیا جو

خدا پرستی کی زندگی کی بنیاد ہیں، تو پھر ان لاکھوں کروڑوں انسانوں کی زندگیوں کا رخ ایک دم ایسا بدلا کہ آج کی دنیا میں یقین آنا مشکل ہے کہ کیا ایسے بھی انسان ہو سکتے ہیں! ـــ میں مثال کے طور پر ان میں سے چند کا ذکر کرتا ہوں:

آپ کی دعوت قبول کرنے والوں میں سے ایک ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ تھے، جو آپ کی وفات کے بعد آپ کے پہلے جانشین اور اسلامی حکومت کے ذمہ دار بھی ہوئے۔ آپ کی بے نفسی کا حال یہ تھا کہ گو اسلامی سلطنت کے سب سے بڑے عہدیدار تھے، مگر زندگی اس طرح گزارتے تھے کہ آپ کے گھر والے میٹھا تک کرنے کے لیے ترستے تھے۔ ایک دن اہلیہ نے عرض کیا کہ بچوں کا جی کچھ میٹھا کھانے کو چاہتا ہے تو فرمایا کہ سرکاری خزانہ تو ہمارا میٹھا کرنے کا ذمہ دار نہیں ہے، ہاں جو کچھ وہاں سے ہمیں روزانہ ملتا ہے اسی میں سے اگر تم کچھ بچا سکو تو بچالو! اور کچھ میٹھی چیز پکالو، چنانچہ انھوں نے روزانہ کے خرچہ میں سے روزانہ تھوڑا تھوڑا بچا کر تھوڑے سے پیسے جمع کر لیے اور ایک دن حضرت ابوبکرؓ کو دیے کہ اس کا کچھ سامان لا دیجئے تاکہ آج کچھ میٹھی چیز پکالوں۔ آپ وہ پیسے لیے ہوئے خزانچی کے پاس چلے گئے، اور وہ پیسے بیت المال کو واپس کر دیے، اور فرمایا کہ یہ اسی خرچہ ہمارے میں سے جو ہمیں بیت المال سے ملتا ہے اتنے دنوں میں بچایا ہوا ہے، معلوم ہوا کہ ہمارا کام اس سے کم میں چل سکتا ہے، لہٰذا اب ہمیں اتنا کم کر کے دیا جائے۔

خلیفۂ دوم، حضرت عمر فاروقؓ کے دور خلافت میں جب مسلمانوں نے بیت المقدس فتح کیا، اور حضرت عمرؓ خود وہاں تشریف لے گئے، ساتھ میں ایک غلام تھا لیکن اسلامی حکومت کے اس سب سے بڑے شخص کے پاس سواری صرف ایک ... تھوڑی دور خود سوار ہو لیتے تھے تھوڑی دیر غلام کو سوار کر کے خود پیدل چلتے تھے، جس وقت بیت المقدس میں داخل ہو رہے تھے غلام سواری پر تھا اور خود پیدل، اور کپڑوں میں کئی پیوند۔ آپ ہی کے زمانہ میں ایک دفعہ سخت قحط پڑا، تو آپ وہ کھانا کھانا اپنے لیے جائز نہ سمجھتے تھے جو قحط کی وجہ سے عام رعایا کو میسر نہ تھا۔ حضرت خالدؓ جو مسلمان فوجوں کے کمانڈر انچیف تھے، اور خود حضورؐ نے ان کو سیف اللہ (اللہ کی تلوار) کا اعزازی خطاب دیا تھا، ایسے بے نفس اور نفس پرستی سے اس قدر آزاد تھے کہ ایک مرتبہ ان کی کسی غلطی کی بنا پر عین میدان جنگ میں ان کے پاس حضرت عمرؓ کی طرف سے معزولی کا پروانہ پہنچا تو ماتھے پر شکن تک نہ آئی اور کہا کہ اگر میں عمرؓ کی خوشنودی کے لیے یا اپنی ناموری کے لیے لڑتا تھا تو اب نہ لڑوں گا، لیکن اگر میں اللہ کے لیے لڑتا تھا تو سپہ سالار کے بجائے ایک معمولی سپاہی کی حیثیت سے بھی بدستور لڑتا رہوں گا۔ اس کے برعکس اس زمانہ کی ایک تازہ مثال آپ کے سامنے میکؔ آرتھر کی ہے جنھیں ٹرومین نے کوریا میں لڑنے والی افواج کی سپہ سالاری سے معزول کر دیا تو وہ

سخت ناراض ہوئے، اور ٹرومین کی صدارت کے درپے ہوگئے۔

اور صرف یہی چند افراد ہی نہیں، بلکہ آپ نے پوری قوم اور سوسائٹی کی اسی اصول پر تربیت کی تھی کہ وہ ایک خدا پرست سوسائٹی ہو؟ پکا ایک یہ اصول تھا کہ جو کسی عہدے کا طالب ہو اور خواہش مند ہو اسکو عہد نہیں دیتے تھے، ایسی سوسائٹی میں عہدے کے امیدوار بننے اپنی تعریف و توصیف کرنے اور حکومت کے لیے ایک دوسرے کا مقابلہ کرنے کی کیا گنجائش تھی، جس جماعت کے سامنے ہر وقت قرآن مجید کی یہ آیت رہتی ہو:-

تلك الدار الآخرة نجعلها للذين	یہ آخرت کا گھر ہم ان لوگوں کے لیے مخصوص رکھیں گے
لا يريدون علوا في الأرض ولا فسادا	جو زمین میں اپنی سربلندی نہیں چاہتے اور نہ فساد پھیلانا
والعاقبة للمتقين ○	چاہتے ہیں اور انجام خدا سے ڈرنے والوں کا ہے۔

جس جماعت کا اس حقیقت پر ایمان ہو، وہ کیا اپنی سربلندی اور فتنہ و فساد کے جرم کا ارتکاب کر سکتی ہے؟

دوستو! اور بزرگو! یہ خدا پرستی کی دعوت تھی جو حضور نے دنیا میں پیش کی تھی، اور نتائج کے لحاظ سے یہ دنیا کی سب سے زیادہ نفع بخش کوشش ہے، کوئی شخص دنیا کی کسی اور دعوت کا نام لیکر نہیں تبلا سکتا کہ اس نے دنیا کو اتنا فائدہ پہنچایا۔ حالانکہ اس دعوت کے حصہ میں انسانوں کی اتنی کوششیں اور اتنے وسائل نہیں آئے جو عصر حاضر کی معاشی اقتصادی اور سیاسی تحریکوں کے حصے میں آئے ہیں، مگر پھر بھی ان تمام تحریکوں کے فائدے مل کر بھی اس ایک دعوت کے فائدوں کا دسواں حصہ بھی نہ ہو سکے۔ آج بھی دنیا سے معاشی اور سیاسی ظلم اور اخلاقی برائیاں جبھی دور ہو سکتی ہیں جب دنیا اس دعوت کو قبول کرلے، لیکن اور کسی کے متعلق کیا کہا جائے جب کہ خود اس دعوت کے علمبردار ہی نفس پرستی میں مبتلا ہوگئے ——— نفس پرستی تو چوٹ کھائے ہوئے بیٹھی تھی اس نے موقع پاکر خدا پرستی کے علمبرداروں سے خوب انتقام لیا جس نے اُسے شکست دی تھی، اور وہ مسلمان جس کا امتیاز تھا۔ کنتم خیر امة اخرجت للناس تامرون بالمعروف وتنهون عن المنكر افسوس! آج اس نفس پرستی کا خود شکار ہے۔

مسلمانو! تم نے بڑا ظلم کیا ہے، تمہارا کام تو خدا پرستی کا نمونہ بننا تھا، اور ساری دُنیا کو اس کی دعوت دینا تھی، تم نے نفس پرستی کو اختیار کرکے اپنا بھی نقصان کیا، اور ساری دنیا کو بھی مشکلات میں پھنسا دیا۔ اگر تم اپنا فرض ادا کرتے رہتے، تو نہ نفس پرستی دنیا میں دوبارہ غالب ہوتی، اور نہ دنیا کا یہ حشر بنتا۔ آج دنیا کی سب سے بڑی مصیبت نفس پرستی ہے، دنیا کے بڑے بڑے لیڈر اور امن کے علمبردار (ٹرومین، چرچل اور اسٹالن) سب سے بڑے نفس پرست ہیں، یہ اپنی نفس پرستی میں اور قومی غرور میں (جو نفس پرستی کی ایک ترقی یافتہ اور وسیع شکل ہے) دنیا کو خاک سیاہ کرنے کے لیے

ہر وقت تیار ہیں، ایٹم بم سے زیادہ خطرناک نفس پرستی ہے جس نے دنیا کو تباہ کر دیا، لوگوں کو ایٹم بم پر غصہ آتا ہے کہ قیامت برپا کر دے گا، میں کہتا ہوں کہ ایٹم بم کا کیا قصور؟ اصل مجرم تو اس کا بنانے والا ہے، اور اس سے کہیں پہلے وہ بدمستگاہیں اور وہ تہذیب ہے جو اس ایٹم بم کو وجود میں لائی ہے اور اس سب کی جڑ وہ نفس پرستی ہے جس نے اس تہذیب کو جنم دیا ہے۔

دوستو! ہماری دعوت اور ہماری تحریک بس یہی ہے، اور اسی مقصد کے لیے ہے کہ نفس پرستی کے خلاف محاذ قائم کیا جائے، خدا پرستی کی زندگی کا طریقہ دنیا میں عام کیا جائے۔ ہم نے اسی مقصد کے لیے یہ خاص اجتماعات کیے ہیں، اور محض اسی مقصد کے لیے ہفتہ وار اجتماع کرتے ہیں، جہاں ہم قوم کے ہر طبقہ کو جمع ہونے کی دعوت دیتے ہیں اور ان کے سامنے خدا پرستی کی دعوت کے سب سے بڑے علمبردار حضرت محمد (صلے اللہ علیہ وسلم) کی تعلیمات ان کے حالات زندگی، اور ان کے سابقوں کے واقعات پیش کرتے ہیں جو سچی خدا پرستی کا راستہ دکھانے والے ہیں، اور ہمارے یقین کے مطابق انہیں میں انسانیت کی نجات، اور دنیا کی مشکلات کا حل ہے ـــــ ہمارا کام اور ہماری دعوت ایک کھلی ہوئی کتاب ہے جس کا جی چاہے پڑھ لے۔

واخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین ؑ

(الفرقان، بابت صفر و ربیع الاول ۱۳۷۱ھ)

مولانا محمد منظور نعمانی

انسانیت کا سب سے بڑا مسئلہ

اور
اُمّتِ مسلمہ کی ذمہ داری

مدیر الفرقان کی ایک تقریر جو اپریل ۱۹۵۱ء میں صوبہ بہار کے شہر گیا کے ایک ایسے عام اجتماع میں کی گئی جس میں غیر مسلم حضرات بھی کافی تعداد میں موجود تھے

الحمد للهِ الَّذِي هَدَانَا لِهٰذَا وَمَا كُنَّا لِنَهْتَدِيَ لَوْلَا أَنْ هَدَانَا اللّٰهُ لَقَدْ جَاءَتْ رُسُلُ رَبِّنَا بِالْحَقِّ۔

حضرات!

ہم سب خدا پرستوں کا عقیدہ ہے کہ اس ساری دنیا کو ایک اللہ نے پیدا کیا اور وہی دنیا کے اس کارخانہ کو چلا رہا ہے اور ہم آپ یہ بھی جانتے ہیں کہ اس پوری کائنات میں اور اس سارے سنسار میں انسان کو اللہ نے وہ صلاحیتیں دی ہیں اور وہ طاقتیں بخشی ہیں جو دوسری مخلوقات کو نہیں ملی ہیں اس دنیا میں جو ترقیاں اور جو نئی نئی ایجادیں ہو رہی ہیں وہ سب انسان ہی کی قابلیت اور انسان ہی کی ترقی پسندی کا نتیجہ ہیں۔

انسان کو ترقی کرنے اور بڑھنے کی جو صلاحیت اور قابلیت دی گئی ہے اس کے ذریعہ وہ نیکی اور بھلائی میں بھی ترقی کر سکتا ہے اور اسی طرح بدی اور برائی میں بھی۔ وہ اگر اپنی صلاحیتوں اور طاقتوں کو نیکی کے راستہ پر لگائے تو ایسے بلند مقام تک پہنچ سکتا ہے اور وہ مرتبے حاصل کر سکتا ہے جہاں فرشتوں کی بھی

رسائی نہیں، اور اگر اپنی اسی طاقت اور قابلیت کو وہ برائی کے راستہ پر لگائے اور اس کے ذریعہ بدی اور شرارت میں ترقی کرے تو ایسا شریر اور موذی بن سکتا ہے کہ سانپ بچھو اور بھیڑیئے اور چیتے بھی اس سے پیچھے رہ جائیں۔

اللہ تعالیٰ نے نبوت اور پیغمبری کا سلسلہ اسی لیے جاری فرمایا اور مختلف زمانوں اور مختلف ملکوں اور قوموں میں ہزاروں رسول اور پیغمبر اسی واسطے بھیجے کہ وہ انسان کو نیک بن کر دنیا میں رہنے اور نیکی کے راستہ پر اپنی طاقت صرف کرنے کا طریقہ بتلائیں اور اپنی تعلیم و تربیت سے ان کو نیک اور صالح بنا کر فرشتوں سے بھی آگے بڑھائیں۔

انبیاء علیہم السلام کی تاریخ سے ہم نے جو کچھ سمجھا اور جانا ہے وہ یہ ہے کہ انسانوں کو وہ زندگی کے تین بنیادی اصول دیتے ہیں اور ان ہی اصولوں کی بنیاد پر وہ پوری زندگی کی تنظیم اور تشکیل کرتے ہیں یعنی یہ بنیادی اصول جن کاموں کے کرنے کا تقاضا کرتے ہیں وہ حضرات اپنے ماننے والوں کو ان کے کرنے کا حکم دیتے ہیں اور جن چیزوں سے بچنے اور جن باتوں کو چھوڑنے کا تقاضہ کرتے ہیں وہ ان سے منع کرتے ہیں۔

ان میں پہلا بنیادی اصول جو یہ دیتے ہیں کہ انسان اس پر یقین کرے اور دل سے اس کو مانے کہ میرا اور ساری دنیا کا بس ایک خالق اور رب ہے وہی دنیا کے اس پورے کارخانے کو بلا شرکت غیرے چلا رہا ہے اور اس پوری کائنات کی ہر چیز صرف اسی کے قبضہ اور اختیار میں ہے، جس کو جو چاہے دے اور جس سے جو چاہے لے، موت اور زندگی، بیماری اور تندرستی، رزق کی فراخی اور تنگی، خوشحالی اور بدحالی سب اسی کے ہاتھ .... اور اسی کے حکم سے آتی اور جاتی ہے اس لیے بس وہی عبادت کا مستحق ہے اور اس کو راضی کرنا اور زندگی کے سارے معاملات میں اس کی مرضیات پر چلنا اور اس کا حکم ماننا انسان کا سب سے اہم فرض ہے۔

یہ سب سے پہلا اصول ہے جو انبیاء علیہم السلام انسانوں کو زندگی کی بنیاد کے طور پر دیتے ہیں اور ہدایت کرتے ہیں کہ زندگی کے سارے معاملات میں اس اصول کو ملحوظ رکھا جائے جو کچھ سوچا جائے اسی کی روشنی میں سوچا جائے اور جو کچھ کیا جائے اسی کی بنیاد پر اور اس کے تقاضے کے مطابق کیا جائے۔

دوسرا اصول وہ یہ دیتے ہیں کہ انسان اس کا یقین کرے اور دل سے اس کو حق اور یقیناً ہونے والا واقعہ مانے کہ اس زندگی میں وہ جو اچھے برے عمل کریگا مرنے کے بعد والی زندگی میں وہ ضرور اسکی سزا یا جزا پائیگا اگر وہ اچھے اور نیک اعمال کریگا اور زندگی اچھے طریقے اور اپنے پیدا کرنے والے کے حکموں پر چلتے ہوئے گزار کے مر جائیگا تو مرنے کے بعد وہ بڑی لذت اور مسرت والی زندگی

پائے گا اور ہمیشہ ہمیشہ اس سے لذتیں اور مسرتیں حاصل کرے گا ـــــ اور اگر وہ غلط طریقہ پر زندگی گزار کے اور اللہ کی نافرمانیاں اور بندوں کی حق تلفیاں کر کے اس دنیا سے جائے گا تو اگلی دنیا میں اسے بڑے سخت دُکھ اٹھانا پڑیں گے اور وہاں اس کی زندگی بڑی ذلتوں اور مصیبتوں والی زندگی ہوگی اور وہاں کی وہ ذلتیں اور مصیبتیں اس دنیا کی بڑی سے بڑی ذلتوں اور مصیبتوں سے بھی ہزاروں لاکھوں گنا بڑی ہوں گی۔

تو انسانوں کی زندگی کے لیے دوسرا بنیادی اصول انبیاء علیہم السلام یہ دیتے ہیں کہ مرنے کے بعد کی جزا و سزا پر یقین رکھتے ہوئے اور اس کا دھیان فکر کرتے ہوئے وہ زندگی گزاریں۔

تیسرا بنیادی اصول انبیاء علیہم السلام یہ دیتے ہیں کہ انسان ہمیشہ اس حقیقت کو نظر کے سامنے رکھے اور کبھی اس سے غافل نہ ہو کہ اس کی دو حیثیتیں ہیں یعنی خود اس کی زندگی میں دو پہلو اور دو رخ ہیں ایک مادیت کا اور ایک روحانیت کا اور ان دونوں کے تقاضے باہم بہت مختلف ہیں، ہماری مادیت کی بعض خواہشیں وہ ہیں جو روحانیت کے لیے زہر ہیں اور روحانیت کے بعض تقاضے وہ ہیں جو مادی خواہشوں کے سراسر خلاف ہیں تو انبیاء علیہم السلام انسانی زندگی کا ایک بنیادی اصول یہ قرار دیتے ہیں کہ مادیت کو اور مادی خواہشات کو ہماری روحانیت پر غالب آنے اور اس کو دبانے کا موقع نہ دیا جائے بلکہ روحانیت کو غالب رکھ کر طبیعت کے مادی تقاضوں کو اس کا ماتحت اور تابع بنایا جائے۔

اللہ کے جو پیغمبر بھی جب کبھی جس ملک میں اور جس قوم میں آئے اگر ان کی تعلیم اور ان کے کام کے متعلق صحیح معلومات حاصل کرنے کا ہمارے آپ کے پاس کوئی ذریعہ ہو تو اس ذریعہ سے جو معلومات حاصل ہوں گی وہ یہی بتلائیں گی کہ انھوں نے زندگی کا جو نقشہ اور جو نظام ـــــــــــ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اپنی قوم کے سامنے پیش کیا تھا اس کی بنیاد ان ہی اصولوں پر تھی۔

پھر انسان جب ان سچے اصولوں کو مان لے تو اسے آپ سے آپ ضرورت محسوس ہوگی کہ وہ معلوم کرے کہ میں اللہ کی عبادت کس طرح کروں، اور زندگی کے بارہ میں اس کے کیا احکام ہیں جن کی میں فرماں برداری کروں اور وہ کیا اعمال ہیں جن کو کر کے میں اللہ تعالیٰ کی رضامندی اور مرنے کے بعد لذت و مسرت والی دائمی زندگی حاصل کر سکتا ہوں اور وہ کون اعمال ہیں جن کو خدانخواستہ اگر میں نے کیا تو مرنے کے بعد مجھے بے انتہا ذلتیں اور تکلیفیں اٹھانی پڑیں گی۔ اور وہ کون سا طریقہ ہے جس پر چل کر میری روحانی ترقی ہوتی ہے اور مادیت کو روحانیت پر غالب آ کر اس کا گلا گھونٹنے کا موقع نہ ملے ـــــ اسلئے انبیاء علیہم السلام ان بنیادی اصولوں کے ساتھ انسانی زندگی کے متعلق اللہ کی طرف سے تفصیلی ہدایات بھی لاتے ہیں اور بتلاتے ہیں کہ تم کو یہ کام کرنے ہیں اور یہ باتیں چھوڑنی ہیں۔

ہمارا ایمان ہے کہ اللہ کے جو رسول اور پیغمبر جب کبھی کسی ملک اور کسی قوم میں آئے وہ اس سلسلہ کی ضروری ہدایتیں بھی اللہ تعالیٰ کی طرف سے لائے اور جن لوگوں نے ان کی بات مانی اور ان کی پیروی قبول کی ان کی تعلیم و تربیت انھوں نے ان ہی اصولوں اور ان ہی ہدایات کے مطابق کی اور انھیں وہ ترقیاں حاصل ہوئیں اور وہ کمالات نصیب ہوئے کہ فرشتوں نے ان پر رشک کیا اور اللہ کے وہ پیارے ہوگئے اور مرنے کے بعد ہم اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں گے کہ انھوں نے کیا کچھ پایا۔

اور جن لوگوں نے پیغمبروں کے لائے ہوئے ان اصولوں کو اور زندگی کے بارہ میں ان کی ہدایات کو نہیں مانا اور نہیں اپنایا اور خدا کی ہدایت، اور مرنے کے بعد کی جزا و سزا کی فکر اور روحانیت کی تکمیل و ترقی سے بے پروا ہو کر جنھوں نے اپنی اغراض و خواہشات اور ہویٰ و ہوس ہی کو زندگی کا منتہا اور نصب العین بنا لیا ان کا انجام اس کے سوا کچھ نہیں ہوا کہ وہ انسان نما درندے یا شکل آدم میں شیطان یا کم از کم ایک ترقی یافتہ حیوان بن گئے ہیں۔

ہماری بدنصیبی ہے کہ اس وقت دنیا ایسے ہی انسان نما حیوانوں اور آدم صورت شیطانوں سے بھری ہوئی ہے۔ خدا اور مذہب اور آخرت کا انکار کرنے والے تو اگرچہ اب بھی بہت کم ہیں لیکن زندگی کے بارہ میں انبیاء علیہم السلام کے لائے ہوئے اصول اور ان کی ہدایات اور تعلیمات سے بے پروا ہو کر اور خدا کے احکام اور آخرت کی جزا و سزا اور روحانیت کے تقاضوں سے بے فکر ہو کر خدا و مذہب کے منکروں کی سی زندگی گزارنے والوں سے ہماری یہ دنیا بھری ہوئی ہے اور اس کا نتیجہ یہ ہے کہ انسان اپنی خداداد قابلیت سے صرف حیوانیت میں اور درندگی میں ترقی کر رہے ہیں اور روحانی کمالات سے روز بروز خالی اور دیوالیہ ہوتے ہوئے جا رہے ہیں۔

حضرات! ــــ آپ اگر عقل سلیم اور انصاف سے کام لے کر غور کریں تو معلوم ہوگا کہ اس وقت انسانی دنیا جن مصیبتوں میں مبتلا ہے اور تباہی و بربادی کے جو سخت خطرے اس وقت دنیا پر منڈلا رہے ہیں جن کا خیال کر کے تمام یورپ و ایشیا والے سہمے جا رہے ہیں یہ سب اسی کا نتیجہ ہے کہ ہماری اس دنیا نے انبیاء علیہم السلام کا لایا ہوا انسانی اور روحانی طریقۂ زندگی چھوڑ کر اور خدا اور آخرت اور روح کے تقاضوں کو بالکل پس پشت ڈال کر شیطان کا بتلایا اور سکھایا ہوا حیوانی اور خالص مادی طریقۂ زندگی اختیار کر لیا ہے۔ کم از کم اجتماعی اور قومی معاملات میں تو ہم خدا اور آخرت اور روحانیت کو بالکل بھلا چکے ہیں ــــ اور خیر یورپ والوں نے اگر یہ مادہ پرستانہ طرز زندگی اختیار کیا تھا تو کیا تھا ان کی کورانہ تقلید میں ہم ایشیا والے بھی اسی راستہ پر چل پڑے

ہیں حالانکہ ایشیاء کی سرزمین نبیوں، رسولوں، رشیوں منیوں اور مہاتماؤں کی سرزمین ہے۔

آج حماقت اور جہالت سے یورپ کی اس کورانہ تقلید کو ترقی سمجھا جا رہا ہے حالانکہ میں نے جیسا کہ ابھی عرض کیا تھا یہ صرف حیوانیت میں شیطانیت میں اور درندگی میں ترقی ہے اور اگر یہ ترقی یوں ہی ہوتی رہی اور انبیاء علیہم السلام کے انسانیت اور روحانیت اور عبدیت کے اصولوں کو پھر سے نہیں اپنایا گیا تو اس خدا فراموش اور آخرت سے بے پرواہ دنیا کے سامنے جلد ہی اس کا انجام آجائے گا اور تیسری جنگ عظیم اگر برپا ہوئی تو اس سے جو تباہی آئے گی وہ دیکھ لیں گے کہ خدا اور اس کی ہدایت سے بے تعلق ہوکر اور آخرت کو بھلا کر ترقی کرنے والوں کا اور ان کی ترقیوں کا حشر کیا ہوا کرتا ہے

وَسَيَعْلَمُ الَّذِينَ ظَلَمُوا أَيَّ مُنقَلَبٍ يَنقَلِبُونَ ۝

حضرات!

ہمارے سامنے یہی مسئلہ ہے اور ہم اسی کو انسانیت کا سب سے بڑا مسئلہ سمجھتے ہیں۔ ہماری دعوت اور ہمارا پیام اپنے کو اور آپ سب حضرات کو بھی بس یہی ہے کہ اللہ کے نبیوں اور رسولوں کے بتلائے ہوئے ان اصولوں کو ہم پھر سے زندگی کی بنیاد بنائیں جو انسان کو خدا کا اچھا بندہ اور اچھا آدمی بناتے ہیں اور مادہ پرستی اور خدا فراموشی کے ان طور طریقوں کو چھوڑ دیں جنھوں نے ہماری زندگی کو حیوانی اور شیطانی زندگی بنا کر پوری انسانی دنیا کو جہنم کے کنارہ پر کھڑا کر دیا ہے۔

عجیب بات ہے! آج سڑکوں اور گلی کوچوں کی صفائی کا مسئلہ قابل فکر ہے، گندی نالیوں کی دھلائی کا مسئلہ فکر کے قابل ہے، مچھروں اور مکھیوں اور چوہوں کو مارنے اور کم کرنے کے لیے لمبی لمبی سکیمیں بنائی جاتی ہیں اور ان کاموں پر ہزاروں لاکھوں آدمیوں کا وقت اور کروڑوں روپیہ صرف ہوتا ہے لیکن آدمیوں میں سے درندگی اور حیوانیت کی تباہ کن صفات نکالنے اور ان کو اچھا آدمی اور اللہ کا اچھا بندہ بنانے کی طرف بالکل توجہ نہیں کی جاتی۔ میرے نزدیک تو یہ اسی کا عذاب ہے کہ ہمارا کوئی مسئلہ سلجھنے میں نہیں آتا اور اگر برسوں کی محنت اور کروڑوں اربوں روپے کے صرف کے بعد کوئی ایک مسئلہ کچھ قابو میں آتا ہے تو چار اور الجھ جاتے ہیں ـــــ ابھی گزشتہ ہفتہ کے اخباروں میں آپ نے پڑھا ہوگا کہ صرف غذا کے مسئلہ پر اب تک اٹھاسی کروڑ روپیہ ہماری حکومت کا صرف ہو چکا ہے اور مسئلہ کی شکلیں جوں کی توں ہیں اور اس وقت خاص طور سے آپ کے صوبہ بہار کو قحط کا سخت خطرہ لاحق ہے بلکہ ابھی کل میں نے ایک دوست سے سنا کہ غذا اور غلہ کی کمی کے علاوہ اب بہار کے بعض علاقوں میں پانی کی کمی ہو رہی ہے اور کنوئیں سوکھ رہے ہیں اور ڈر ہے کہ بھوک کے عذاب سے پہلے بہت سے آدمی

اور جانور کہیں پانی نہ ملنے کے عذاب سے موت کا شکار نہ ہو جائیں۔

حضرات!

ہم خدا پرستوں کا ایمان ہے کہ دنیا اس وقت جن پریشانیوں میں مبتلا ہے وہ محض اتفاقی نہیں ہیں بلکہ اللہ کی بادشاہی میں کوئی چیز بھی آپ سے آپ اور محض اتفاق سے نہیں ہوتی، یہاں جو کچھ ہوتا ہے، وہ اللہ کے حکم سے ہوتا ہے اس لیے ہماری موجودہ پریشانیاں یقیناً خدا کے حکم سے ہیں اور وہ اللہ ظالم نہیں ہے اور نہ بلا وجہ ہمیں ستانے میں اسے کوئی لذت آتی ہے بلکہ انسانی دنیا کی پریشانیاں اور بے چینیاں اس کی خدا فراموشی اور آخرت سے بے فکری کی سزا ہیں۔ (وَمَنْ اَعْرَضَ عَنْ ذِكْرِيْ فَاِنَّ لَهٗ مَعِيْشَةً ضَنْكًا)

پس ہمیں آپ سے صرف یہ کہنا ہے کہ جہاں آپ اور بہت سے قومی کاموں پر اپنا وقت، اپنا روپیہ اور اپنی طاقتیں صرف کرتے ہیں وہاں اس کام کی طرف بھی توجہ کریں، اس کے لیے جماعتیں اور سوسائٹیاں بنائیں اس کے طریقے سوچیں، جب آپ خلوص اور دیانت داری سے ایسا کام کو شروع کریں گے اور صاف ذہن سے غور کریں گے تو آپ پر خود راہیں کھلیں گی، اور آپ کی طرف سے اپنے ملک اور اپنی قوم کی بلکہ ساری انسانیت کی بہت بڑی خدمت ہوگی۔

اگر آپ نے اپنے کو اچھا خدا پرست اور خدا ترس آدمی بنا لیا اور اپنی قوم کے صرف دس بیس فیصدی افراد ہی کو آپ اچھا آدمی بنا سکے اور وہ زندگی کے ہر معاملہ میں خدا سے ڈرنے والے اور مرنے کے بعد والی جزا و سزا کی فکر کرنے والے بن گئے تو یقین کیجئے کہ روحانی فائدوں کے علاوہ آپ ملک اور قوم کو موجودہ مصیبتوں سے نجات دینے میں بھی بڑی مدد دیں گے۔ اس وقت ہم جن مصیبتوں میں مبتلا ہیں ــــ ان میں ۹۰-۹۵ فیصدی وہ ہیں جن میں ہم صرف اسی لیے گھرے ہوئے ہیں کہ قوم میں خدا پرستی اور ایمانداری نہیں ہے اور مرنے کے بعد کی جزا و سزا کی کوئی فکر نہیں ہے، اگر ہمارے وزیروں اور چھوٹے بڑے افسروں میں اور حکومت کے عام اہلکاروں میں، اسی طرح تاجروں میں، مزدوروں میں، اور دوسرے عام طبقوں میں انبیاء علیہم السلام کی تعلیم کے مطابق بجائے غرض پرستی اور مادہ پرستی کے خدا ترسی اور ایمان داری آجائے، بجائے حرص اور طمع کے قناعت آجائے، ایثار اور سخاوت آجائے دوسروں کی غم خواری اور دوسروں کے لیے خود تکلیف اٹھانے اور قربانی کرنے کا رواج ہو جائے تو ہماری ساری وہ مشکلیں ایک دن میں دور ہو جائیں گی جن کو حل کرنے سے کروڑوں روپیہ صرف کرنے کے باوجود ہماری وزارتیں آج عاجز ہیں۔

حضرات!

اتنی بات جو میں نے اب تک کہی یہ کسی مذہب و ملت سے مخصوص نہیں ہے اس لیے یہ بات تو ہم ہر مذہب اور ملت والے سے کہتے ہیں عیسائیوں سے بھی کہتے ہیں اور یہودیوں سے بھی، اسی طرح اپنے وطنی بھائیوں، ہندوؤں سے بھی کہتے ہیں اور سکھوں سے بھی۔۔۔

البتہ مسلمانوں سے ہم اس کے ساتھ یہ بھی کہتے ہیں کہ تم تو اپنے کو مسلمان کہہ کر ان سب باتوں کا عہد اور اقرار کر چکے ہو کیونکہ کسی شخص کے مسلمان ہونے کا مطلب یہی ہوتا ہے کہ وہ یہ فیصلہ کر چکا ہے کہ اپنی زندگی وہ ان اصولوں اور ان ہدایات کے مطابق گزارے گا جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے انبیاء علیہم السلام اور سب سے آخر میں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم مکمل ترین شکل میں لے کر آئے اور دنیا سے زیادہ فکر وہ آخرت کی کرے گا اور مادی خواہشات کے مقابلہ میں روحانی تقاضوں اور مطالبوں کو ترجیح دے گا۔

اس لیے ہر مسلمان سے ہمارا مطالبہ ہے کہ وہ اپنی زندگی کو اس اقرار اور ان اصولوں کے مطابق بنائے۔ یعنی اس کی زندگی اللہ کی بندگی اور عبدیت والی زندگی ہو، وہ نفس کی خواہشات اور طبیعت کے تقاضوں کے بجائے اللہ کے احکام پر اور اس کی بھیجی ہوئی شریعت پر چلنے والا ہو، مرنے کے بعد کے حساب اور جزا و سزا سے ڈرنے والا اور دنیا سے زیادہ آخرت کی زندگی بنانے کی فکر کرنے والا ہو اسی طرح مادی ترقی سے زیادہ اس کو روحانی ترقی کی فکر ہو۔۔۔

مسلمان اسی لیے پیدا کیے گئے تھے کہ وہ دنیا میں اللہ تعالیٰ کی بتلائی ہوئی ایمانی اور روحانی زندگی گزاریں اور اسی مبارک زندگی کو دنیا میں رواج دیں۔۔۔ قرآن میں فرمایا گیا ہے۔

"کُنْتُمْ خَیْرَ اُمَّۃٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَتُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰہِ"

اگر ہم مسلمان اس سے غفلت برتیں تو خدا کے مجرم اور اپنے مقصد وجود سے باغی ہیں، اللہ تعالیٰ ہمیں اپنا مقام و منصب سمجھنے اور اپنا فرض ادا کرنے کی توفیق دے۔

(الفرقان بابت رجب ۱۳۸۰ھ)

رُوحانیت!

(شفیق صدیقی جونپوری (مرحوم

جبیں چمکے جو سجدوں کے نشاں سے — جھکیں قدموں پہ تارے آسماں سے

نگاہِ مردِ مومن کے اشارے — پلٹ دیتے ہیں تقدیروں کے پانسے

طلوعِ صبحِ نو کا منتظر ہوں — سمجھ لوں گا زمین و آسماں سے

مہ و خورشید سے اکتا گیا ہوں — نئی شام و سحر لاؤں کہاں سے

مرتب کر لے آزادی کے لمحے — شہیدوں کی حیاتِ جاوداں سے

مجاہد کی دعائیں اللہ اللہ — اتر آتی ہیں نوجیں آسماں سے

وہ دل کی روشنی از فرش تا عرش — حجاباتِ اٹھ گئے تھے درمیاں سے

جنوں کی سرد بازاری کہاں تک — قلندر کام لے قلبِ تپاں سے

ذرا پھر اُٹھ کے بنِ غازی کے جھونکے — گلے مل جائیں گردِ کارواں سے

بہادر بی بیاں اللہ اکبر — مسلح حسن بھی تیر و کماں سے

کہیں سلمیٰ کہیں عذرا کی محمل[1]! — وہ منزل کے تقاضے ساربان سے

وہ چھلنا لے کے مشکیزہ سرِ دوش — زمیں گلشن جبیں خونِ چکاں سے

زہے بے شمع خیموں کے تجلّی — اجالا آتشِ سوزِ نہاں سے

خوشا قسمت کہ پھر ایسی ہو محفل

سجی ہو خوش نگاہانِ جہاں سے

---

[1] محمل کو میں مؤنث استعمال کرتا ہوں، کیونکہ اس لفظ میں زیادہ نسوانیت ہے۔ ۱۲ (شفیق)

چائے کے تھوک اور خوردہ بیوپاری
لبرٹی ٹی کمپنی
ہوٹل کی ترقی
اور
خریداروں کی
پسند کی خاطر
آپ
ہمیشہ ہماری ارزاں اور
بہترین چائے استعمال کیجئے
لبرٹی ٹی کمپنی ـ حبیبی بلڈنگ، دوکان نمبر ۵
۸۰۔ ایس، وی، پٹیل روڈ۔ نل بازار
بمبئی ۳

جناب مولانا عبد السلام صاحب قدوائی ندوی

ہندوستان کا نیا دور اور مسلمان

"ہم یہاں اس لیے آئے ہیں کہ اللہ کے بندوں کو بندوں کی بندگی سے نکال کر اللہ کی بندگی میں داخل کریں، دنیا کی تنگی سے نجات دیکر وسعت وکشائش کی راہ دکھائیں۔ ظلم وجور سے بچا کر عدل وانصاف کی فضا میں لائیں بنی آدم ایک ہی ماں باپ کی اولاد ہیں ان کے درمیان برادرانہ محبت قائم ہونی چاہیے۔ ہماری نظر میں انسانوں کے درمیان شریف وکمینہ کی تقسیم صحیح نہیں ہے۔ ہم انسانوں کی خود ساختہ اونچ نیچ کے قائل نہیں ہیں۔ ہم تمام آدمیوں کو ایک ہی اصل کی شاخیں سمجھتے ہیں اور سب کے ساتھ اچھا برتاؤ کرنا چاہتے ہیں۔ ملک گیری اور کشور کشائی ہمارا مقصد نہیں ہے۔ ہم انسانوں کو انسانوں کی غلامی سے نجات دلانے کے لیے یہاں آئے ہیں، اگر ہماری بات مان لی جائے تو ہم واپس لوٹ جائیں گے[1]"

مذکورہ بالا الفاظ میں عرب قاصدوں نے امرائے ایران اور شاہ ایران کے سامنے اپنے مقاصد پیش کیے۔ یہ خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم کے عہد مبارک کا واقعہ ہے۔ مسلمان جب سرزمین عرب سے نکلے اور روما اور ایران کی حدود میں داخل ہوئے تو ان کے دلوں میں یہی پاک خیالات تھے اور وہ نوع انسانی کی ہمدردی وخیر خواہی کے غیر معمولی جذبات اپنے سینوں کے اندر رکھتے تھے ملکوں کا فتح کرنا، سلطنتیں قائم کرنی، مال ودولت کے انبار لگانے، اور عیش وعشرت کی زندگی بسر کرنا ان کا مقصد نہ تھا درحقیقت وہ نوع انسانی کی پریشانیوں سے دلگیر تھے۔ ان کا مقصد یہ تھا کہ ظلم وستم کے مارے ہوئے انسانوں کو امن وسکون اور راحت وآرام نصیب ہو۔ سلاطین وامراء کی چوکھٹوں پر جھکے ہوئے سروں کو اٹھا کر وہ رب العالمین کے سامنے سربسجود

[1] ملاحظہ ہو وفد عرب کی گفتگو امرائے ایران سے طبری جلد ۴ تاریخ کامل ابن اثیر۔

کرنا چاہتے تھے۔ وہ ہر قسم کی مشکلیں عوام الناس کی راہ سے دور کرنا چاہتے تھے انھیں اپنی راحت و آرام کا ذرہ برابر بھی خیال نہ تھا بلکہ ان کی دلی آرزو تھی کہ خود تکلیف اٹھا کر دوسروں کو آرام پہونچائیں۔ وہ شاہانہ شکوہ وجبروت سے ناآشنا اور امیرانہ عیش وعشرت سے کوسوں دور تھے۔ ان کے حکمراں کو بادشاہت کا لفظ بھی گوارا نہ تھا، وہ موٹا جھوٹا کھا کر اور پھٹا پرانا پہن کر انسانوں کی خدمت کیا کرتے تھے۔ وہ کسی معاملہ میں اپنی فوقیت اور ترجیح کے روادار نہ تھے بلکہ ملک کے معمولی سے معمولی باشندہ کی ضروریات کو اپنی ضروریات پر ترجیح دیتے تھے اور سارے ملک کو کھلا کر خود کم سے کم پر گزر کرتے تھے۔ حضرت عمرؓ کا مشہور واقعہ ہے کہ ایک مرتبہ شام سے ایک قاصد آیا۔ کھانے کے وقت اس نے دیکھا کہ امیر المومنین کے دسترخوان پر صرف جو کی روٹی ہے۔ یہ منظر اس کے لیے بڑا درد انگیز تھا کہ مسلمانوں کا امیر اس قدر تکلیف اٹھائے اس نے عرض کیا آپ گیہوں کی روٹی کیوں نہیں کھاتے۔ آپ کی حدود سلطنت میں تو گیہوں کی پیداوار بہت ہے اور آپ آسانی سے گیہوں کی روٹی کھا سکتے ہیں۔ قاصد کی گفتگو سُن کر حضرت عمرؓ نے اس سے پوچھا بتاؤ تمہاری کیا رائے ہے اگر مملکت کے تمام لوگ گیہوں کھانے لگیں تو کیا اس سلطنت کے اندر اتنی مقدار میں گیہوں پیدا ہوتے ہیں کہ ہر شخص پیٹ بھر گیہوں کی روٹی کھا سکے۔ یہ سوال سُن کر قاصد چکرا گیا اور کہنے لگا نہیں ہماری حدود سلطنت میں تو اتنے گیہوں پیدا نہیں ہوتے ہیں کہ اگر سب باشندے گیہوں ہی کی روٹی کھانا چاہیں تو کھا سکیں۔ قاصد کا جواب سُن کر حضرت عمرؓ نے فرمایا پھر جب صورت حال یہ ہے تو میں گیہوں کیسے کھا سکتا ہوں میں تو وہی کھانا چاہتا ہوں جو سب لوگ کھا سکیں۔

وہ حکومت کو ذریعہ عزت نہیں سمجھتے تھے بلکہ اسے ذمہ داری کا ایسا بار گراں خیال کرتے تھے جس سے ہر دم لرزتے رہتے تھے وہ اپنے آپ کو ایک معمولی انسان کی طرح سمجھتے تھے۔ خطبۂ خلافت دینے کھڑے ہوتے تو برسر منبر اعلان کرتے کہ میں تمہارا حاکم مقرر کیا گیا ہوں لیکن تم سے بڑھ کر نہیں ہوں۔ جب تک میں قانون الٰہی کی پابندی کرتا ہوں تو میرا کہنا مانو اور اگر میں اس راہ سے منحرف ہو جاؤں تو تم پر میرے احکام کی اطاعت واجب نہیں ہے۔ اُن کے یہاں ہر شخص کو اس کا حق تھا کہ اگر وہ خلیفہ کو غلط رو سمجھے تو بے جھجک ٹوک دے۔ ایک بڑھیا بھی خلیفہ کو متنبہ کرنے کا حوصلہ رکھتی تھی۔ ایک بدو برسر عام خلیفہ کو ٹوک دیتا تھا اور برملا کہتا تھا کہ اگر تم کجروی اختیار کروگے تو ہم تمہیں سیدھا کر دیں گے ہر شخص کو اجازت تھی کہ خلیفہ سے بازپرس کر سکے۔ تاریخ کا مشہور واقعہ ہے کہ ایک مرتبہ حضرت عمرؓ تقریر کر رہے تھے۔ آپ نے فرمایا لوگو! اسنو اور مانو۔ ان الفاظ کو سُن کر ایک شخص نے فوراً کہا ہم

تمہاری بات نہ سنیں گے۔ نہ مانیں گے جو چادریں تقسیم ہوئی ہیں وہ چھوٹی تھیں اسمیں کسی طرح تمہارا کرتہ تیار نہ ہو سکتا تھا پھر یہ کیا بات ہے کہ میں دیکھ رہا ہوں کہ تمہارے جسم پر اسی چادر کا بنا ہوا کرتہ ہے آخر اتنا کپڑا زیادہ کہاں سے آیا جب تک مجھے اس سوال کا جواب نہیں ملے گا میں نہ تمہاری بات سنوں گا اور نہ تمہارا کہنا مانوں گا۔ حضرت عمرؓ نے اپنے بیٹے عبداللہؓ کی طرف اشارہ کیا وہ اُٹھے اور اس شخص کی طرف مخاطب ہو کر فرمایا تم صحیح کہتے ہو واقعی چادر چھوٹی تھی اور ایک چادر میں امیرالمومنین کا کُرتہ نہیں ہو سکتا تھا۔ لیکن میں نے اپنے حصے کی چادر بھی امیرالمومنین کو دیدی تھی اور دونوں کو ملا کر ان کا یہ کُرتہ تیار ہوا یہ سُن کر معترض مطمئن ہو گیا اور حضرت عمرؓ کو مخاطب کر کے کہنے لگا۔ فرمائیے اب آپ جو کہیں گے میں اسے سنوں گا اور جو حکم دیں گے اس کی تعمیل کروں گا۔

وہ پوری جدوجہد کرتے تھے کہ سارے ملک کے باشندے چین اور اطمینان کے ساتھ زندگی بسر کریں۔ دن اسی فکر میں بیتتے اور راتیں اسی دُھن میں گزرتیں۔ جمہور عیسائیوں کے ساتھ انھوں نے جو برتاؤ کیا وہ آج تک تاریخ اسلام کا طغرائے امتیاز ہے۔ ایک موقع پر جنگی حالات نے یہ صورت پیدا کر دی کہ مسلمانوں کو اپنی پوری طاقت سمیٹ کر محاذ پر لے جانی پڑی۔ حمص میں حفاظتی محصول وصول کیا جا چکا تھا جب حالات کی نزاکت کی بنا پر مسلمان امیر ہیاں سے اپنے تمام سپاہیوں کو لے کر جانے لگا تو اس نے شہر کے باشندوں کو جو مذہباً عیسائی تھے بلا کر کہا۔ ہم نے تم سے کچھ رقم اس لیے وصول کی تھی کہ تمہاری حفاظت کا انتظام کریں گے لیکن ایسے حالات درپیش ہیں کہ ہمارے لیے تمہاری حفاظت دشوار ہے اس لیے ساری وصول شدہ رقم تمہیں واپس کر رہے ہیں۔ حمص کے عیسائی باشندوں نے مسلمان امیر شہر کے یہ الفاظ حیرت کے ساتھ سنے اور کہنے لگے خدا وہ دن جلد لائے کہ آپ لوگ پھر ہمارے شہر میں تشریف لائیں۔

اس قسم کے واقعات اسلامی تاریخوں میں بکثرت موجود ہیں اس مختصر مضمون میں مزید تفصیل کی گنجائش نہیں ہے۔ حالات کا اندازہ کرنے کے لیے چند اشارے کر دیے گئے ہیں۔ صدر اول کے مسلمانوں اور خلفائے راشدین کا یہی وہ نقطۂ نظر اور طرز عمل تھا جس کی وجہ سے وہ دنیا کے جس ملک میں گئے وہاں فرشتۂ رحمت سمجھے گئے اور ہر ملت و مذہب کے لوگوں نے انھیں ہاتھوں ہاتھ لیا اور دل کھول کر ان کا استقبال کیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ صرف پندرہ سولہ سال کے اندر لاکھوں مربع میل زمین اُن کے زیر اثر ہو گئی۔ لوگوں کے دل ان کی محبت و عقیدت سے لبریز ہو گئے اور انھوں نے دل و جان سے اس عادلانہ نظام حیات کو قبول کر لیا اور ان کی زندگیاں

اسلامی رنگ میں رنگ گئیں گنتی کے چند برسوں میں اس عظیم الشان کامیابی کی نظیر تاریخ عالم میں کہیں اُ[illegible]
نظر نہیں آتی۔

لیکن ہندوستان کے مسلمان فاتحین کے اندر خلفاء راشدین کے عہد کی یہ روح موجود نہ تھی وہ سر
زمین ہند میں اللہ کے بندوں کو بندوں کی بندگی سے نکال کر اللہ کی بندگی میں داخل کرنے کا جذبہ لیکر
داخل نہیں ہوئے تھے بلکہ ملک گیری اور کشورکشائی کے جذبہ سے آئے تھے، اصلاحی مقاصد بہت کم
ان کے پیش نظر تھے، انسانی مساوات کا ان کی زندگی میں کہیں عکس مشکل ہی سے نظر آتا تھا۔ جمہو[ر]
کی رضامندی کے بجائے خاندانی وراثت اُن کا دستور حکومت تھا اور سلطنت عموماً جاگیر داری حیثیت
رکھتی تھی۔ یہ سچ ہے کہ وہ اپنے آپ کو مسلمان کہتے تھے اور اسلام کا کلمہ اپنی زبان سے ادا کرتے تھے لیکن
اسلام ان کی زندگی کا ایک نجی معاملہ تھا، بہترین حکمرانوں نے بھی اسلام کے اجتماعی نظام کو نافذ کرنے
کی فکر نہیں کی اور جمہور کو کبھی یہ حق نہیں دیا کہ وہ اپنی رائے سے اپنے حکمران منتخب کریں۔ نتیجہ یہ ہوا
سات آٹھ سو برس تک مسلمان ہندوستان میں برسر اقتدار رہے لیکن یہاں کے باشندوں کو وہ اپنے
راجوں مہاراجوں کی طرح نظر آئے، وہی اقتدار پسندی، وہی طمطراق، وہی جاہ و حشمت، وہی شان و شکوہ
وہی مطلق العنانی اور وہی عیش پرستی مسلمان بادشاہوں میں بھی پائی جاتی تھی۔ حق پسند زبانیں اکثر
خاموش رہیں، اگر کسی نے کلمۂ حق زبان پر لانے کی جرأت کی تو اسے پہلے اپنا سر ہتھیلی پر رکھنا پڑا۔

سلاطین ہند کے اس طرز عمل نے اسلامی نظام اور اسلامی زندگی کا دلکش مرقع اہل ہند
کے سامنے نہ آنے دیا، ان حکمرانوں کا طرز عمل اسلام کے لیے ایک حجاب بن گیا اور اس ملک کے غیر مسلم
باشندوں کو یقین ہوگیا کہ صرف نام اور تمدن و معاشرت کے فرق کے علاوہ مسلمانوں اور غیر مسلموں کے درمیان
کوئی بڑا فرق نہیں ہے۔ مسلمان حاکموں کے برتاؤ کو دیکھ کر انھیں اسلام سے بدظنی ہوگئی اور ان کے
دل میں یہ خیال جاگزیں ہوگیا کہ اسلام نوع انسانی کے مصائب و مشکلات کا علاج نہیں بلکہ غلامی کا
ایک نیا پھندا ہے اس خیال کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ مسلمان بادشاہوں اور امیروں کے ساتھ اسلام کے بھی
دشمن ہو گئے۔

سلاطین ہند کے حالات اور ان کے دور حکومت کے واقعات کی تفصیل کا یہ موقع نہیں
ہے یہاں صرف قارئین کی توجہ اس جانب منعطف کرانی ہے کہ ہندوستان کے بادشاہوں اور امیروں
کا طرز عمل بہت کچھ غیر مسلموں کے لیے اسلام تک پہونچنے کی راہ روکتا رہا ورنہ سات آٹھ سو برس تو
بہت بڑی مدت ہوتی ہے۔ صدر اول کے مسلمانوں کو اس ملک میں آنے کا موقع ملتا تو سات

آٹھ برس میں یہاں اسلام کی ایسی لازوال عمارت قائم ہو جاتی جو کبھی متزلزل نہ ہو سکتی۔

کئی سو برس تک زمامِ اقتدار ہاتھ میں رہنے کے بعد آخر کار ہندوستان سے مسلم دورِ حکومت کا خاتمہ ہو گیا۔ جو کچھ ہوا اس کی داستانِ غم اوراقِ تاریخ میں درج ہے آج بھی دیکھنے والے دیکھ سکتے ہیں کہ اس محرومی کا سبب اپنی کوتاہی، غفلت، نااہلی اور بدعملی کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔ انیسویں صدی عیسوی میں زمامِ حکومت انگریزوں کے ہاتھ میں آگئی کچھ دنوں مسلمانوں کی بادشاہت کا نام باقی رہا۔ ۱۸۵۷ء میں یہ نام بھی ختم ہو گیا اور پورے طور پر انگریزی حکومت قائم ہو گئی۔ حالات کا یہ بڑا انقلاب تھا جو کبھی حاکم تھے وہ محکوم بن گئے۔

مسلمانوں کو اپنے اقتدار کے زوال کا بیحد صدمہ ہوا انھوں نے اس پر دردناک مرثیے لکھے اور عظمتِ رفتہ کے غم میں مدتوں خون کے آنسو روتے رہے لیکن اب بھی ان کی توجہ اصل سبب کی طرف نہیں ہوئی۔ ان کے دل میں صرف یہ ارمان تھا کہ آباؤ اجداد کی عزت پھر حاصل کر لیں اور وہی اقتدار پھر انھیں نصیب ہو جائے جو کبھی ان کے بزرگوں کو حاصل تھا اس دور کے لٹریچر میں آپ کو یہ روح ہر جگہ کارفرما نظر آئے گی۔

۱۸۵۷ء سے ۱۹۴۷ء تک نوے برس کا زمانہ تقریباً اسی حال میں گزر گیا یعنی عظمتِ ماضی کو یاد کر کے رونا اور یہ تمنا کہ کسی طرح پھر وہی دورِ عروج واپس آجائے۔ اس اثناء میں اسلام پر سیکڑوں معترضانہ کتابیں لکھی گئیں۔ ان کے جواب میں مسلمانوں کی طرف سے بھی بہت سی کتابیں لکھی گئیں۔ ان تحریروں میں اسلامی نظامِ حیات کی خوبیاں واضح کی گئیں۔ انسانی مساوات کی دلآویزی کی مثالیں تاریخِ اسلام سے نقل کی گئیں اور خلفاء راشدین کی سادگی، اخلاصِ خدمت، بے غرضی اور ایثار کے بڑے پُراثر واقعات بیان کیے گئے۔ مسلمانوں کا عام طرزِ عمل اس کے برعکس نہیں رہا اور "مسلمانی در کتاب و مسلمانان در گور" کی پرانی مثال عام طور سے صادق آتی رہی۔

ایک طرف مسلمانوں کا طرزِ عمل عموماً غیر مسلموں کو صحیح اسلام سے متعارف کرنے میں مانع رہا اور دوسری طرف غیر مسلموں کے دلوں میں سابق مسلمان حکمرانوں کے خلاف ناگواری موجود تھی۔ انگریزی حکومت بھی ایسی ترکیبیں کر رہی تھی جس کی وجہ سے اس ناگواری میں اور اضافہ ہوتا جاتا تھا۔ مسلمان سلاطین کے خلاف کتابیں لکھی جاتی تھیں۔ رسالوں میں انھیں بدنام کیا جاتا تھا۔ مسلمانوں کو قومی عصبیت کی بنا پر یہ امور ناگوار ہوئے۔ انھوں نے بھی اس کے جواب میں مضامین لکھے اور کتابیں شائع کیں اس کی وجہ سے تاریخی ناگواری ان کی جانب منتقل ہو گئی۔ تاریخ میں صحیح یا غلط جو بھی باتیں

مسلمان بادشاہوں کے متعلق درج کی جاتی تھیں غیر مسلم انھیں بالکل صحیح سمجھ لیتے تھے اور موجودہ مسلمانوں کو سابق مسلمانوں کا جانشین سمجھ کر ان سے ان کے بزرگوں کے مفروضہ مظالم کا انتقام لینے کے لیے تیار رہتے تھے۔ یہ صورت حال خود ہی فضا کو تلخ کرنے کے لیے کافی تھی؛ اس پر طرہ یہ ہوا کہ محض اظہار اقتدار کی خاطر روزمرہ کی زندگی میں، تقریبوں میں تیوہاروں میں، میلوں اور عرسوں میں مناقشات پیدا ہوتے تھے۔ مسلمان اگرچہ اب حاکمانہ طاقت نہیں رکھتے تھے اور ہندوؤں کی طرح انگریزوں کے محکوم تھے لیکن چونکہ ان کی حکومت کے خاتمہ کو زیادہ زمانہ نہیں گزرا تھا اس لیے حاکمانہ احساس فنا نہیں ہوا تھا وہ ہندوؤں کو جو بعض حیثیتوں سے ان سے زیادہ صاحب اثر ہو چکے تھے، خاطر میں نہیں لاتے تھے۔ نتیجہ یہ ہوتا تھا کہ وقتاً فوقتاً تصادم کی نوبت آجاتی تھی، ہندوؤں کے دل میں بھی تاریخی کتابوں کی رطب و یابس روایات کی بناء پر مسلمانوں کے خلاف تنفر موجود تھا اس لیے وہ بھی مسلمانوں کے سامنے جھکنے کے لیے تیار نہ ہوتے تھے اور کئے دن جھگڑے ہوتے رہتے تھے۔ اگر آپ ان جھگڑوں کی تفصیل پر غور کریں تو آپ محسوس کریں گے کہ گو ان جھگڑوں میں مذہب کا نام لے کر ہنگامے برپا کیے گئے لیکن انھیں مذہب سے کوئی واسطہ نہ تھا، جلوسوں کے گزرنے، میلوں کے منعقد کرنے، تعزیوں کے گشت ــــ اور اسی طرح کے دوسرے معاملات عموماً باعث نزاع ہوتے تھے جنھیں یہی نہیں کہ مذہب سے کوئی تعلق نہیں تھا بلکہ مذہب ان باتوں کا مخالف ہے۔

اگر مسلمان حقیقی طور پر اپنے مذہب کے پیرو ہوتے، ان کی انفرادی زندگی بھی اسلام کی چلتی پھرتی تصویر ہوتی اور ان کی اجتماعی زندگی میں بھی اسلام کی اعلیٰ اخلاقی صفات کا اظہار ہوتا تو ان کے خلاف ناگواری میں کمی ہوتی اور تجربہ کے بعد جب غیر مسلموں کو معلوم ہوتا کہ مسلمانوں کا وجود ان کے لیے مفید ہے اور مسلمانوں کے ساتھ رہ کر انھیں کوئی خطرہ نہیں ہے بلکہ بے شمار فوائد پہونچتے ہیں تو رفتہ رفتہ ان کی مخالفت ختم ہو جاتی اور وہ دل و جان سے مسلمانوں کے ہمدرد اور ہمنوا بن جاتے لیکن چونکہ عام طور سے مسلمان اسلام کی تعلیم سے گہرا عملی تعلق نہیں رکھتے تھے بلکہ اپنے مناقشات میں اسلام کا نام غلط طور پر لیتے رہتے تھے اس لیے غیر مسلموں کے دلوں میں قدرتی طور پر مسلمانوں کے ساتھ اسلام کے خلاف بھی دشمنی پیدا ہو گئی۔ حالات اسی طرح آگے بڑھتے رہے اور ناگواریوں میں برابر اضافہ ہوتا رہا۔

انگریزی عہد کے نوے برس یوں ہی گزر گئے، مسلمان اپنے محکوموں کے برابر ہو گئے تھے بلکہ بعض اعتبارات سے ان سے بھی کم حیثیت رکھتے تھے لیکن ان کی سمجھ میں اب بھی یہ بات نہ آتی تھی کہ وہ واقعی اپنے گزشتہ محکوموں کے برابر ہو گئے ہیں وہ فلک کج رفتار کا شکوہ کرتے زمانے کی نیرنگی کو برا بھلا کہتے طالع

ناسازگار کی شکایت کرتے لیکن حقائق کو سمجھ کر اپنی کوتاہی کی تلافی کا انھیں زیادہ خیال نہ آتا تھا۔ بہرحال نو برس کا یہ دور گزر گیا اور ۱۹۴۷ء سے ایک نئے دور کا آغاز ہوا۔ اس دور کے آغاز سے پہلے ایک طویل کش مکش کا سلسلہ جاری رہا۔ اس کش مکش نے تاریخ کی پرانی ناگواریوں کو کئی گنا زیادہ کر دیا اور بات یہاں تک پہنچی کہ ہندوستان اپنی وسعت کے باوجود دونوں قوموں کے لیے تنگ ہو گیا، بالآخر ملک تقسیم ہوا۔ اس تقسیم نے ناگواریوں کو تیز سے تیز تر کر دیا۔ اس کا جو افسوسناک انجام ہوا وہ سب کے سامنے ہے۔

اس وقت ہندوستان کے مسلمان ایک ایسی اقلیت کی طرح ہیں جس سے اکثریت کو ناگواری بھی ہے اور بے اعتمادی بھی۔ مسلمان افسردہ اور پریشان خاطر ہیں۔ ان کے متعلق جو ناگواری ہے وہ صرف انھیں تک محدود نہیں ہے بلکہ اس مذہب سے بھی نفرت ہے جس کے وہ نام لیوا ہیں۔ اس وقت تک غنیمت یہ ہے کہ دستور حکومت میں کوئی بات نہیں جو مسلمانوں کے خلاف ہو یعنی ہندوستان کے آئین حکومت کے نقطۂ نظر سے مسلمانوں اور غیر مسلمانوں میں کوئی فرق نہیں ہے۔ قانوناً ہندوستان کے تمام باشندے خواہ وہ کسی نسل یا مذہب سے تعلق رکھتے ہوں یکساں حقوق رکھتے ہیں۔ شہری زندگی میں کوئی فرق نہیں رکھا گیا ہے۔ قانوناً ترقی کے مواقع سب کو دیے گئے ہیں۔ موجودہ حکومت [illegible] بھی اپنے قانون اور دستور العمل کے اعتبار سے مسلم اور غیر مسلم میں کوئی فرق نہیں کرتی ہے۔ یہ بہرحال مسلمانوں کے لیے غنیمت ہے ورنہ فضا میں وقتاً فوقتاً زیادہ خطرناک آوازیں آتی رہتی ہیں۔ ابھی تک اس قسم کے علی الاعلان متعصب گروہوں کو ملک کے نظام حکومت میں کوئی دخل نہیں ہے لیکن ملک میں ان کی آوازیں سنائی ضرور دیتی ہیں۔ اگر ان جماعتوں کو فروغ حاصل ہوا تو وہ مسلمانوں کی موجودہ حالت برقرار نہیں رکھیں گے۔ ابھی تک آئین حکومت کے مطابق مسلمان غیر مسلموں کے مساوی ہیں لیکن متعصب فرقہ وارانہ جماعتوں کے ہاتھوں میں اگر نظام حکومت آ گیا تو پھر مسلمان قانوناً بھی مساوی حقوق سے محروم ہو جائیں گے اور ان کی حیثیت ایک طاقتور متعصب اکثریت کے نیچے دبی ہوئی اقلیت کی ہو جائے گی جسے نہ عملاً ترقی کا کوئی موقع حاصل ہوگا نہ قانوناً۔

اس صورت حال کو روکنے کے لیے مسلمانوں کو بڑی ہمت، بڑے استقلال اور بڑی دانشمندی سے کام کرنا پڑے گا۔ تاریخ میں یہ تدریجی انحطاط جو انھیں منزل بہ منزل پیش آ گیا ہے اس کا انھیں گہرا مطالعہ کرنا پڑے گا اور جذبات اور تمناؤں کے بجائے عقل اور تجربات کی روشنی میں اپنے لیے راہ عمل بنانی پڑے گی۔ سیاست مذہبی حقائق کی طرح کوئی اٹل چیز نہیں ہے بلکہ حالات کے مطابق طرز عمل ضروری ہے۔ جذبات خواہ کتنے ہی خوشگوار کیوں نہ ہوں لیکن ان کے دھارے میں بہنا صحیح نہیں ہے بلکہ عقل کی روشنی اور تجربات کی رہبری میں قدم اٹھانے چاہئیں۔ تہذیب اور رسم و رواج

بھی دائمی حقیقت نہیں رکھتے بلکہ وہ بھی حالات کی بنا پر بنتے اور بدلتے ہیں۔ یہی حال بہت سے زندگی کے اطوار اور آداب کا ہے۔ ان حقائق پر مسلمانوں کو ٹھنڈے دل سے غور کرنا چاہیے۔ اس سلسلہ میں سب سے پہلا کام یہ ہے کہ ان بدلے ہوئے حالات میں مسلمانوں کو اپنی رہنمائی کے لیے ایسے لوگوں کو منتخب کرنا چاہیے جو حالات کو صحیح طور سے سمجھنے والے ہوں، جن کا ذہن تنگ اور نقطۂ نظر فرقہ وارانہ نہ ہو جن کی سیرت مضبوط، اخلاق بلند اور زندگی بے داغ ہو، اسلام کی اعلیٰ قدریں ان کی زندگی سے نمایاں ہوں پھر وہ گمنام نہ ہوں بلکہ سارے ملک میں متعارف ہوں اور ایک حد تک بین الاقوامی شہرت کے مالک ہوں، سیاسی حقوق حاصل کرنے کے لیے اسلام کا نام استعمال نہ کیا جائے بلکہ ایک ہندوستانی کی حیثیت سے اپنے ملکی حقوق حاصل کرنے کی کوشش کی جائے۔ مذہب کو اختلاف اور مخاصمت کے رنگ میں کبھی نہ پیش کیا جائے بلکہ اس طور پر سامنے لایا جائے کہ غیر مسلم اسلام کو نوعِ انسانی کے لیے پیامِ رحمت سمجھیں۔ اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ مذہب کو سیاست اور مصلحت کا تابع کیا جائے۔ یہ بھی مطلب نہیں ہے کہ مذہب کے اصولوں میں قطع و برید کی جائے بلکہ مقصد یہ ہے کہ جس طرح زمانۂ سابق میں مذہب کو ایک مفید تحریک اور انسانیت کے لیے امن و سکون کا باعث ظاہر کرنے کے بجائے ایک اختلافی اور نزاعی معاملہ بنا دیا گیا تھا اور اپنے جھگڑوں میں کھینچ کر مذہب کو لایا جاتا تھا اب ایسا نہ ہونا چاہیے۔

مسلمانوں کے اندر صبر و تحمل، ضبط و برداشت کی عادت پیدا کرنا چاہیے۔ ان کے اندر اسلام کی حقیقی روح کو بیدار کرنے کی جدوجہد کی جائے تاکہ ان کا مذہب انسانیت کی خدمت کا بہترین ذریعہ سمجھا جائے۔ لوگ مسلمان کو بہترین رفیق، بہترین پڑوسی، بہترین مشیر، بہترین غم گسار، اور بہترین معین و مددگار سمجھیں وہ اپنے اخلاق سے غیر مسلموں کے دل ہاتھ میں لینے کی کوشش کریں۔

خلافت راشدہ کے بعد جب سلاطینِ اسلام کی زندگی اسلامی اصولوں کے مطابق باقی نہیں رہی تو بہت سے اللہ کے مخلص بندوں نے ایک روحانی نظام قائم کیا۔ یہ حضرات اسلامی تعلیم کے سچے نمونے تیار کرتے تھے۔ ان کے ہاتھ میں زمین کی حکومت نہ تھی۔ لیکن یہ لوگ دلوں پر حکومت کرتے تھے۔ ان کا نظام طاقت پر قائم نہ تھا بلکہ محبت و عقیدت اور شفقت و خدمت کے رشتوں سے بندھا ہوا تھا، ان کی تنظیم سلطنتوں کی تنظیم سے زیادہ مستحکم دیرپا اور اثر انگیز تھی، مسلمان حکمرانوں کی بے راہ روی کی روک تھام بھی ان بزرگوں کی توجہ سے بہت کچھ ہوتی رہتی تھی مطلق العنان سلاطین ان بزرگوں کی روحانی طاقت کے سامنے بسا اوقات سپر انگندہ ہو جاتے تھے۔ دوسری طرف غیر مسلموں کو بھی

اسلامی تعلیمات کا جلوہ انسانی زندگی میں دیکھنے کا موقع ملتا تھا اور وہ اسلام کے جمال و دلکش سے متاثر ہوتے تھے اور اپنا سر نیاز اس کے آستانے پر جھکا دیتے تھے۔ یہ صوفیائے کرام کا مقدس گروہ تھا ہندوستان میں حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ، حضرت قطب الدین بختیار کاکیؒ، حضرت شیخ نظام الدینؒ، حضرت نصیر الدین چراغ دہلیؒ، حضرت علاء الدین صابرؒ، حضرت بابا فرید الدین شکر گنجؒ، حضرت سید حسین گیسو درازؒ وغیرہ بہت سے بزرگوں نے اپنی زندگی کے دلکش نمونے دکھا کر اہل ہند کو گرویدہ کر لیا تھا۔ آج کل ذکر و فکر کے آستانے سونے پڑے ہیں ہمیں ان کو پھر سے آباد کرنا چاہیے۔

اس کے ساتھ اسلام کی صحیح تعلیمات سے لوگوں کو واقف کرنے کے لیے درس و تدریس کے حلقے جا بجا قائم کرنے چاہئیں تاکہ مسلمانوں کو کتاب و سنت کی صحیح تعلیم سے آگاہی ہو، وہ بدعات و خرافات کا شکار ہونے سے بچ جائیں، عقلی طور پر بھی اسلامی تعلیمات کے فضائل و محاسن سے واقف ہوں، زندگی کی تیرہ و تار راہوں میں اسلام کی شمع ہدایت سے خود بھی رہنمائی حاصل کر سکیں اور دوسروں کو بھی لغزشوں اور ٹھوکروں سے بچا سکیں، اپنے آپ کو متحمل اور رواداد بنائیں۔ اپنی بات کہنے کے ساتھ دوسروں کی بات کو سمجھنے کی بھی کوشش کریں، جس بات کو صحیح سمجھتے ہوں، اس پر خود جمے رہیں، لیکن دوسروں کی نیت پر شبہ نہ کریں اور یہ سمجھیں کہ جس طرح ہمیں ایک رائے قائم کرنے اور اس کے مطابق راہِ عمل اختیار کرنے کا حق ہے اسی طرح دوسروں کو بھی حق ہے کہ وہ اپنی فہم و بصیرت سے کوئی رائے قائم کریں اور اس کے مطابق عمل کریں۔ دل آزار تبصروں اور ناگوار تنقیدوں سے سخت پرہیز کریں، ہر شخص کا احترام کریں اس طرح مسلسل عمل کرنے کے امید ہے کہ وہ مستقبل قریب میں خود بھی اپنی جماعت کو مضبوط کر لیں گے اور دوسری قوموں کو اپنے متعلق ہمدرد اور خیر خواہ بنا لیں گے اور اس ملک میں ایک صحیح پُر اخلاص اور ہمدردانہ فضا پیدا کریں گے۔ (الفرقان رمضان ۱۳۷۳ھ)

محدثین عظام اور انکے علمی کارنامے

مولفہ:- مولانا تقی الدین ندوی مظاہری
سابق استاد حدیث، دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ

* ائمۂ اربعہ و ارباب صحاح ستہ اور امام طحاوی کا تحقیقی تذکرہ۔
* محدثین عظام کے علمی کارنامے اور تصنیفات پر سیر حاصل بحث۔
* تاریخ تدوین حدیث اور محدثین عظام کی کوششوں کا ذکر۔

نیا اڈیشن ــــ ترمیم و اضافہ کے ساتھ پہلے سے کہیں بہتر۔ کتابت و طباعت عمدہ گلیز کاغذ صفحات تقریباً ۳۰۰۔ خوبصورت گردپوش سے مزین۔ قیمت مجلد صرف ۱۰/-

صحبتے با اولیاء

عصر حاضر کے مشہور عارف باللہ حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحب کے ملفوظات کا حسین گلدستہ
مرتبہ:- مولانا تقی الدین ندوی مظاہری
اس کتاب میں حضرت شیخ الحدیث دامت برکاتہم کے وہ مجلسی ملفوظات و ارشادات ہیں جن سے اصلاح نفس، فکر آخرت اور ایمان و یقین کی کیفیت پیدا ہوتی ہے نیز تصوف و سلوک کے رموز و آداب دلنشیں ہوتے ہیں۔

نہایت سبق آموز۔ بہت معلومات افزا۔ انتہائی درجہ پر درد اور حیات آفریں۔ قیمت مجلد صرف ۶/-

سوانح حضرت مولانا محمد یوسف کاندھلوی رح

تالیف مولانا محمد ثانی حسنی،
مقدمہ:- مولانا سید ابوالحسن علی ندوی
داعی الی اللہ حضرت مولانا یوسف صاحبؒ کی ایک ایسی مکمل اور مستند سوانح جس میں کاندھلہ اور جھنجھانہ کے خاندانوں کے حالات خصوصاً مولانا محمد الیاسؒ کا ذکر خیر۔ نیز تبلیغی جماعتوں کے مجاہدانہ کارناموں کی سرگذشت ہے۔

حضرت شیخ الحدیث مدظلہٗ کے تفصیلی حالات زندگی۔ مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کے جداگانہ قلم خوبصورت رنگین کی جلد۔ اعلیٰ طباعت
قیمت مجلد صرف ۱۵/-

صدر یار جنگ

نواب صدر یار جنگ
مولانا حبیب الرحمن خاں صاحب شیروانی ماضی قریب کے ایک ممتاز فرد اور ملت کا قیمتی سرمایہ تھے۔ ایک جید عالم دین حضرت مولانا فضل الرحمن گنج مرادآبادی کے مسترشد سلطنت آصفیہ حیدرآباد کے صدر الصدور، ایک خاندانی رئیس اور ساتھ ہی مشرقی تہذیب و تمدن کا نمونہ اور اردو کے ایک صاحب طرز ادیب تھے۔ یہ سوانح ملی تاریخ کی اہم کڑی اور ایک قومی ضرورت کی تکمیل ہے۔ قیمت مجلد صرف ۱۲/-

نوٹ:- ہر قسم کے مترجم و مصری قرآن شریف اور درسی و غیر درسی۔ دینی علمی و ادبی اور اصلاحی کتابوں کیلئے رجوع کیجئے

ناشر:- مکتبہ دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ

اِسلامی دُنیا میں
تجدُّد وَ اِلحَاد کے اَثرات

مولانا سید ابوالحسن علی ندوی

دین کے خدمتگذاروں کیلئے سبق

پچھلے مہینہ مصر میں ایک ایسا واقعہ پیش آیا جس میں ہمارے لئے بڑی عبرت ہے۔ اور دین کے خدمت گذاروں کے لئے سیکھنے کے بہت سے سبق ہیں مصر ترکی کے بعد تمام عالم اسلام میں نئی اصطلاح کے مطابق سب سے زیادہ "روشن خیال و آزاد" اور مغربی تہذیب و تمدن کا پرجوش پیرو اور کامیاب نقّال ہے۔ عورتوں کی آزادی اپنے مشرقی و اسلامی حدود سے کہیں آگے گزر چکی ہے۔ مخلوط تعلیم، بے پردگی، یورپ کے مقابلۂ حسن میں شرکت، تعلیمی وفود (بعثات) میں رفاقت اور اعلیٰ تعلیم کے لئے طالبات کا یورپ کا سفر روزمرہ کے واقعات میں سے ہے، جن پر اب بحث کی کوئی گنجائش نہیں۔ سیاسی و تعلیمی زندگی میں، ورزشوں اور تفریحات میں، طبقۂ اناث طبقۂ ذکور کے دوش بدوش ہے۔ نیم برہنہ لباس، ساحل سمندر کا غسل شمسی، فلم کمپنیوں میں تمثیل (ایکٹنگ) اور مصری روزناموں اور رسائل کی عریاں تصویریں، روزانہ زندگی کے ایسے واقعات ہیں جن پر چند باحمیت مسلمانوں اور بعض دینی جماعتوں کے سوا کوئی چیں بجبیں بھی نہیں ہوتا۔ نگاہیں ان تمام مناظر کی عادی، اور ذہن ان تمام واقعات کا خوگر ہو چکا ہے، اب ان میں استعجاب کا کوئی پہلو اور اعتراض کا کوئی موقع باقی نہیں رہا۔ قاسم امین نے "المرأة المصرية" کے ذریعہ مصر کی شاداب زمین میں جو بیج ڈالے تھے اور سیاسی جماعتوں اور قائدوں نے اپنے سیاسی مصالح سے ان کی آبیاری اور مصر کے ادیبوں اور افسانہ نگاروں نے ان کی پرورش کی تھی، وہ کھیتی اب پک کر تیار ہوئی ہے۔

ا۔ اس عرصہ میں حسین سرّی پاشا کی عبوری وزارت بنتی ہے اور وزارت تعلیم کا قلمدان احمد مرسی بدر کے سپرد ہوتا ہے۔ یہ صاحب یقیناً مصر کے جدید تعلیم یافتہ اشخاص میں سے ہوں گے جنھوں نے مغرب…

یورپ میں اعلیٰ تعلیم حاصل کی ہوگی اس لئے کہ ایک بڑی سیاسی پارٹی کا نمائندہ اور ایک ترقی یافتہ ملک کا وزیر تعلیم کوئی قدیم عالم یا معمولی تعلیم یافتہ آدمی نہیں ہو سکتا۔ معلوم نہیں کہ مصر کی حد سے بڑھی ہوئی بے حجابی اور اخلاقی انحطاط سے وزیر صاحب کا دل کب سے دُکھا ہوا تھا، اور کتنے عرصے سے وہ موقع کے منتظر تھے کہ انھوں نے وزارت تعلیم کی ذمہ داری سنبھالتے ہی چند نہایت اہم احکام صادر کئے، جنھوں نے سارے ملک کی نگاہیں اور توجہ ان کی طرف منعطف کر دی، اور سارے مصر میں ایک ہنگامہ برپا ہو گیا۔ انھوں نے سب سے پہلے ایک معلّم کو اس جُرم میں ملازمت سے برطرف کر دیا کہ اس نے چلتی ہوئی ٹرین میں بعض نوجوانوں کی فرمائش سے رقص کیا تھا۔ سابق وزیر تعلیم نے معلّمہ پر معمولی سا جرمانہ کیا تھا، وزیر صاحب کی نگاہ میں یہ فعل خلاف اسلام اور غیر اخلاقی تھا، اور ایسی معلّمہ فرائض درس و تدریس ادا کرنے اور مسلمان لڑکیوں کے لئے نمونہ بننے کی صلاحیت نہیں رکھتی تھی؛ اس لئے وہ اپنے معزز عہدہ پر برقرار رہنے کے قابل نہیں تھی۔ اسی کے ساتھ انھوں نے تمام تعلیم گاہوں کے منتظمین کے نام حکم جاری کیا کہ معلمات و طالبات کو ایسے لباس میں آنے کی اجازت نہ دی جائے جو غیر ساتر ہو، مدرسہ کی استانیوں اور طالبات کو ہدایت کی جائے کہ مدرسوں میں آنے کے وقت اُن کی قمیصوں کی آستینیں لانبی، اور لباس ڈھیلا ڈھالا ہو، اور ہدایت کی کہ سختی کے ساتھ اس حکم کی پابندی کی جائے۔

تیسرا حکم جس نے مصر کے ترقی پسند حلقوں میں سب سے زیادہ غم و غصہ اور ناراضگی کی لہر پیدا کی، یہ تھا کہ آئندہ سے مصری طالبات اعلیٰ تعلیم کے لئے یورپ نہیں جائیں گی۔ اس لئے کہ نوجوانوں کے ساتھ یورپ کا سفر اور وہاں کا قیام اخلاقی حیثیت سے سخت قابلِ اعتراض اور مشتبہ ہے۔ اس حکم نے آگ پر تیل کا کام کیا اور سارے مصر میں ایک طوفان سا اُٹھ کھڑا ہوا۔ مصر کا ترقی پسند اور آزاد خیال پریس وزیر صاحب کی جان کو آگیا۔ ادیبوں اور نوجوانوں نے اس رجعت پسند اور تاریک خیال وزیر کے خلاف "مقدس جنگ" شروع کر دی؛ دُرّیہ شفیق جیسی بے حجاب مقرر خواتین نے "مظلوم مصری عورت" کی حمایت کا علم بلند کیا۔ ڈاکٹر طٰہٰ حسین نے، جو جدید طبقہ کے مقبول ادیب اور مصنف ہیں، پیرس میں بیٹھ کر مصر کے "الاہرام" میں اس رجعت پسندانہ اقدام کے خلاف مسلسل مضامین لکھے اور مصر کی عالمی شہرت اور اس کی ترقیوں کا واسطہ دیکر اس قدامت پرستی سے باز آنے کی تبلیغ کی۔ غرض معلوم ہوتا تھا کہ شاید مصر نے کوئی نہایت خطرناک قدم اُٹھایا ہے، یا خودکشی کا ارادہ کیا ہے، یا برطانوی سامراج کو دوبارہ دعوت دی ہے۔ پورے مصر میں صرف چند سنجیدہ اشخاص اور شباب سیدنا محمد (جیسی) خالص دینی جماعت نے وزیر تعلیم کے ان احکام کی حمایت اور اُن کی اخلاقی جرأت اور ... دینی خدمت کی تحسین و ترحیب کی اور ان کو مبارکباد کے

تار بھیجے، اور ان کی تائید میں مضامین شائع کیے۔

وزیر تعلیم احمد مرسی بدر بے اس طوفان کے مقابلہ میں اپنے فیصلہ پر قائم رہے، اور انھوں نے پامردی اور جرأت سے اس کا مقابلہ کیا، قریب تھا کہ یہ سرکاری احکام اور وزیر تعلیم کی استقامت مصر کی تعلیمی و تمدنی زندگی پر خوش گوار اثر ڈالے اور بے حیائی و بے حجابی کے سیلاب میں کسی حد تک پشتہ کا کام دے اور رفتہ رفتہ غم و غصہ میں سکون پیدا ہو اور ان نئے احکام سے فائدہ حاصل ہو، لیکن خدا بھلا کرے اس جمہوری نظام کا جو کسی کام کرنے والے کو بھی پورے طور پر کام کرنے کا موقع نہیں دیتا اور جس نے انسانوں کی سنجیدہ مملکت کو بچوں کا گھر وندا بنا دیا ہے جو کسی ایک حال پر نہیں رہنے پاتا۔ آنے والے انتخابات کے سلسلے میں کسی اختلاف کی بناپر وزارت نے استعفا دے دیا، نئی وزارت بنی، اور احمد مرسی بدر بے کی جگہ پر نئے وزیر تعلیم منتخب ہوئے۔ نئے وزیر صاحب نے سب سے پہلے اپنی ترقی پسندی اور آزاد خیالی کا ثبوت دیا اور وزارت تعلیم میں قدم رکھتے ہی پیشرو وزیر کے سب احکام منسوخ کیے، اور مصر کو وہ تمام آزادیاں مرحمت فرمائیں جو اس کو پہلے حاصل تھیں، عورتوں اور ان کے "محبت گواہوں" نے اپنی مسرت و رضامندی کا پُر جوش مظاہرہ کیا، اظہار مسرت کے لئے جلوس نکلے، جلسے ہوئے اور آئندہ کے لئے بھی یہ ظاہر کر دیا گیا کہ کسی وزیر کو رائے عامہ کو ناراض کرنے کی غلطی نہیں کرنی چاہیے، اور اپنے کو غیر مقبول نہیں بنانا چاہیے۔ اس طرح گویا مرسی بدر بے اور ان کے ہم خیالوں کے لئے کسی حلقہ سے منتخب ہونے اور وزارت میں آنے کے امکانات بھی کم رہ گئے اور ظاہر ہو گیا کہ مصر کا مقبول خیال کیا ہے۔ اس کا نتیجہ ہے کہ مصر کی سب سے بڑی طاقت ور سیاسی جماعت وفد پارٹی برابر اعلان کر رہی ہے کہ وہ اپنی حکومت میں مصری عورتوں کے حقوق کی پوری حمایت و حفاظت کرے گی، اور سمجھنے والے سمجھتے ہیں کہ ان حقوق کے حدود کیا ہیں۔؟

مصر کے ان واقعات سے ہمیں یہ سبق حاصل ہوتا ہے کہ ہماری غفلت نے جدید تعلیم یافتہ طبقہ کو دین سے کس قدر بیگانہ اور اسلامی تہذیب سے نہ صرف نا آشنا بلکہ متوحش بنا دیا ہے، اور جدید نظام تعلیم و تمدن نے مغربی نظریات و افکار کا کس قدر حلقہ بگوش اور پُر جوش حامی بنا دیا ہے، اپنی تعلیمی صلاحیتوں، عصری واقفیت اور سیاسی جدوجہد کی وجہ سے آج یہی طبقہ تمام عالم اسلام میں ہر اسلامی ملک کی دماغی، سیاسی اور تعلیمی زندگی پر حاوی، اور حکومت کی کرسیوں پر فائز ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ اسلام کا قانون معا

وسیاست ان تمام ممالک سے بے دخل ہے اور باوجود مسلمان حکومتوں کے اسلامی نظام معاشرت و تمدن کے لئے ان ممالک میں کوئی جگہ نہیں ہے، قوم کا ذوق اتنا غیر اسلامی ہو چکا ہے کہ اسلام کے اخلاقی ومعاشرتی اصلاحات اور ضوابط اس کی قوت برداشت سے باہر اور اس کے ذہن کے لئے ناقابل ہضم ہیں۔ ترکی، مصر، شام، عراق، افغانستان، ایران اور پاکستان سب جگہ وہی طبقہ برسر اقتدار ہے، جو خالص مغربی تہذیب وتعلیم کا پروردہ اور اپنے ذہن وذوق کے لحاظ سے ٹھیٹھ مغربی ہے۔ اس کو جب کبھی اپنے صحیح خیالات اور ذوق کے اظہار اور آزاد قانون سازی کا موقع ملتا ہے وہ اپنی مغربی روح اور اصلی رجحانات ومعتقدات کی صحیح ترجمانی کرتا ہے۔ ہمارے مذہبی گروہ کو اس موقع پر صدمہ بھی ہوتا ہے اور استعجاب بھی۔ حالانکہ کم سے کم استعجاب کا کوئی موقع نہیں، یہ طبقہ قلبی ودماغی طور پر اسلام اور اس کی تہذیب سے جس حد تک غیر متاثر اور اندرونی طور پر غیر معتقد رہا ہے اس کا قدرتی ولازمی نتیجہ یہی ہونا چاہیئے تھا۔ جب اس طبقہ کا دل ودماغ ڈھل رہا تھا اور اس کے ذہن و طبیعت کا سانچہ تیار ہو رہا تھا تو اس وقت اسلامی اثرات کہیں آس پاس بھی نہ تھے، کوئی چیز ان کے پاس ایسی نہ آنے پائی جو ان کے دل ودماغ پر اسلامی تعلیمات کی عظمت کا نقش قائم کرتی، اور اس کی وقعت ان کے دل میں پیدا کرتی۔ اب جب وہ اقتدار کی کرسی پر آ گئے اور ملک کی باگ ڈور ان کے ہاتھ میں آئی تو ہم ان سے توقع کرتے ہیں کہ وہ اپنے ذہن، اپنی ساری تعلیم وتربیت اور اپنے عمر بھر کے خیالات اور ذوق کے خلاف کسی دینی ادارہ یا جماعت کی مرتب کی ہوئی ایک اسلامی ضابطۂ معاشرت یا اخلاقی قانون کو نافذ کریں یا اس قانون کو جو اتفاقاً باقی رہ گیا ہے یا نافذ ہو گیا ہے منظور کر لیں۔ اس لئے اہم ترین کام یہ ہے کہ اس طبقہ کا ذہن بدلنے کی امکانی کوشش کی جائے اور اس کو ذہنی وعلمی وقلبی طور پر دین سے متاثر کرنے کی کوشش کی جائے۔ اور جو طبقہ مستقبل میں اس کی جگہ لے گا اس سے غفلت برتنے کا دوبارہ جرم نہ کیا جائے۔ اور ابھی سے اس میں اسلامی ذہن پیدا کرنے کی کوشش کی جائے۔

دین کی عام فضا پیدا کرنے کے لئے اور صحیح اسلامی ماحول تیار کرنے کے لئے عمومی کوشش نہایت ضروری ہے، یہ گویا زمین کی تیاری ہے جس کے بغیر باغ نہیں لگ سکتا۔ خواص اور اہل حکومت کا کوئی طبقہ عام فضا سے غیر متاثر نہیں رہ سکتا، کسی بڑی سے بڑی طاقت ور سیاسی جماعت کے لئے عوام کے رجحان اور جمہور کے مطالبہ کو نظر انداز کرنا اور اس کے معتقدات ومسلمات کو رد کرنا ممکن نہیں، دیرپا انقلاب اور مستحکم ومتوازن تعمیر کے لئے یہ شرط ہے کہ قوم کے سب طبقے اس کے لئے تیار

ہو چکے ہوں اور ان میں اس کی استعداد و صلاحیت پیدا ہو چکی ہو جو مصر کے وزیر تعلیم احمد مرسی بدر بیے کی پشت پر اگر ملک کی رائے عامہ اور مصری قوم کی تائید ہوتی تو ان کا جانشین ان کے احکام کو منسوخ اور ایک جنبش قلم ان کو کالعدم قرار نہیں دے سکتا تھا، اس لئے بیک وقت دونوں کوششوں کو جاری رہنا چاہئے۔ حالات اس طرح حد سے گزر گئے ہیں اور خطرات اس طرح سر پر منڈلا رہے ہیں کہ کسی ایک کوشش کے لئے دوسری کوشش کو ملتوی نہیں کیا جا سکتا۔ دین کی عمومی اشاعت و تبلیغ اور عوام کی تعلیم و تربیت کو خواص کے انقلاب و اصلاح تک کے لئے موقوف نہیں رکھا جا سکتا کہ مسئلہ کسی سیاسی اصلاح و ترقی اور کسی معمولی تبدیلی کا نہیں ہے بلکہ لاکھوں بندگانِ خدا کی ہلاکت و نجات کا ہے، اور چند افراد کے لئے لاکھوں انسانوں کو جہالت و ضلالت میں نہیں چھوڑا جا سکتا، دوسرے یہ کہ خود خواص کے انقلاب و تغیر کے لئے عوام کی اصلاح اور بیداری ضروری ہے، دوسری طرف عوام کے کام کے لئے خواص کی ذہنی تبدیلی اور انقلاب حال کی کوشش کو ایک دن کے لئے ملتوی نہیں کیا جا سکتا، کہ زندگی ان سے برابر متاثر ہو رہی ہے اور ان کی تھوڑی توجہ مسلمانوں کی زندگی میں محسوس و نمایاں دینی انقلاب پیدا کر سکتی ہے اور ان کی بے راہ روی اور دین سے بغاوت رسولوں کی کوششوں پر پانی پھیر سکتی ہے۔ اسی لئے حضرت خواجہ عبید اللہ احرارؒ نے اپنے لئے یہ میدان تجویز کیا، وہ ارکانِ سلطنت اور اہلِ رسوخ و وجاہت کو دین سے متاثر کر کے ان کے ذریعہ احکامِ شریعت کا اجرا کراتے اور دین کو رواج دینے کی کوشش کرتے، حضرت مجدد الف ثانیؒ نے اکبر کے زمانہ میں حد سے گزری ہوئی حالت کو دیکھ کر یہی راستہ اختیار کیا، انھوں نے بادشاہ اور اس کے اعیانِ دولت اور امرائے دربار کو دین کا حلقہ بگوش بنا کر سلطنت مغلیہ کے رجحانات اور ذہن میں وہ انقلاب پیدا کر دیا جو بالآخر محی الدین اورنگ زیب عالمگیر کی شکل میں ظاہر ہوا۔ دینی رجحان کا وہ تدریجی ارتقاء جو جہانگیر سے شروع ہو کر عالمگیر پر ختم ہوتا ہے مجدد صاحبؒ کا دینی کارنامہ ہے جس کا اثر ہندوستان میں آج تک کسی نہ کسی شکل میں باقی ہے، جن ملکوں میں برائے نام ہی لیکن اسلامی سلطنتیں ہیں، وہاں کام کرنے والوں کو مجدد صاحبؒ کی سیرت اور مکتوبات اور ان کے طریقِ کار کا ضرور مطالعہ و تجربہ کرنا چاہئے۔

دوسری طرف امت کے سوادِ اعظم میں اس ایمان و یقین میں برابر انحطاط جاری ہے جو اس امت کا اصل سرمایہ اور اصلی طاقت تھی۔ اور ساری زندگی اس کی تابع تھی۔ اللہ پر یقین، اس سے خوف و محبت، رسولؐ سے تعلق، آخرت کا کھٹکا، جہنم کا خوف، جنت کا شوق، رضائے الٰہی کے حصول کا جذبہ، یہ مزاج براہِ راست پیغمبروں کی کوشش اور تعلیم سے پیدا ہوتا ہے، اور صحابۂ کرامؓ کے حالات

پڑھ کر ہم کو بداہتہً نظر آتا ہے کہ ان کی عام سیرت اور مزاج یہی تھا، اس مزاج کا تغیر اور ان اوصاف میں زوال و انحطاط سب سے زیادہ تشویش ناک واقعہ ہے' ایمان و احتساب (اللہ کے وعدوں پر یقین اور اس کے انعامات کی لالچ میں زندگی کے کام انجام دینا) یہ وہ قوتِ محرکہ تھی جو اس اُمت کی گاڑی کے لئے پہیہ کا کام دیتی تھی، اگر یہ قوتِ محرکہ جواب دے جائے تو کوئی چیز اس کے قائم مقام نہیں ہوسکتی۔ صدیوں سے یہ قوت ضعیف ہوتی جارہی ہے اور خصوصیت سے اس پچھلے عرصہ میں یہ قوت بہت مضمحل اور کمزور ہوگئی ہے' اس قوت کی حفاظت اور اگر ضرورت ہو تو اس کا اعادہ وقت کا اہم ترین فریضہ ہے، جس کو ایک دن کے لئے بھی مؤخر نہیں کیا جاسکتا۔ صاحب علم و صاحب اختیار طبقہ کے ذہن کے اسلامی بننے سے پہلے بھی یہ کام ضروری ہے اور اس کے بعد بھی درحقیقت نہ وہ کام اس کام کے قائم مقام ہوسکتا ہے اور نہ یہ کام اس کام کا بدل ہوسکتا ہے۔ ان دونوں کاموں کو بیک وقت جاری رہنا چاہئے، ان دونوں میں قطعاً کوئی تضاد نہیں، جو لوگ ان دونوں میں کوئی تضاد یا الگ الگ کام کرنے والوں میں کوئی مخالفت محسوس کرتے ہیں یہ صرف ان کی تنگ نظری اور تنگ ظرفی ہے۔

(الفرقان۔ محرم ۱۳۶۹ھ)

بقیہ صفحہ (۲۹)

إِنَّ مَعَ الْعُسْرِ يُسْرًا، إِنَّ مَعَ الْعُسْرِ يُسْرًا دو دو بار کہہ کر اطمینان دلایا گیا حقیقت یہ ہے کہ مشکلات سے کہیں زیادہ راحتوں اور سہولتوں کا دور خطرناک امتحان ہے کہ اس میں ذرا سی چوک بڑی گرفت کا سامان بن جاتی ہے۔ فَلَمَّا نَسُوا مَا ذُكِّرُوا بِهِ فَتَحْنَا عَلَيْهِمْ أَبْوَابَ كُلِّ شَيْءٍ حَتَّىٰ إِذَا فَرِحُوا بِمَا أُوتُوا أَخَذْنَاهُم بَغْتَةً فَإِذَا هُم مُّبْلِسُونَ (جب وہ ان چیزوں کو بھول گئے جو ان کو یاد دلائی گئی تھیں، تو ہم نے ہر چیز کے دروازے ان پر کشادہ کر دیے۔ یہاں تک کہ جب وہ ان چیزوں پر اترا گئے جو ان کو دی گئی تھیں، ہم نے اُن کو دفعتہً پکڑ لیا پھر وہ بالکل حیرت زدہ رہ گئے) ـــــ اور راحتوں اور سہولتوں کے دور میں ہوشیار و خبردار رہنا اور دولت و قوت کے نشہ سے سرشار نہ ہونا بڑا مشکل اور قوموں کی تاریخ کا بڑا نادر واقعہ ہے، یہ انبیاء علیہم السّلام کے جانشینوں اور صدیقین و صالحین ہی کا کام ہے جن کی اعلیٰ روحانی و اخلاقی تربیت ہوچکی ہو' ورنہ ؎

تاریخ امم کا یہ پیام ازلی ہے
صاحب نظراں نشۂ قوت ہے خطرناک

اس سیلِ سبک سیر و زمیں گیر کے آگے
عقل و خرد و علم و ہنر ہے خس و خاشاک

(الفرقان۔ ربیع الثانی ۱۳۶۰ھ)

شان دار
خوبصورت
اور۔ جدید ترین ڈیزائنوں میں
ٹائم اسٹار گھڑیاں
نیز
دیگر اقسام کی معیاری اور قابل اعتماد
گھڑیوں کے لیئے
ہمارے شوروم میں
تشریف لایئے
کنگ واچ ہاؤس
۲۔ امین آباد لکھنؤ

تعارف و تبصرہ

از عتیق الرحمٰن سنبھلی

ہندوستان میں مذہب اسلام پر نظر ثانی کی ضرورت

[مندرجہ بالا عنوان سے جناب آصف بن علی اصغر فیضی صاحب کا ایک مقالہ کتابی شکل میں شائع ہوا تھا جس پر الفرقان جمادی الاولیٰ ۱۳۸۳ھ میں ناشر کی فرمائش پر حسب ذیل تبصرہ کیا گیا تھا۔]

ہندوستان میں مذہب اسلام پر نظر ثانی کی ضرورت

از۔ جناب آصف بن علی اصغر فیضی (سابق سفیر ہند برائے مصر)

ناشر:۔ مکتبہ جامعہ ملیہ۔ دہلی

یہ مقالہ دراصل انگریزی زبان میں واشنگٹن (امریکہ) میں منعقد ہونے والی ایک کانفرنس (COLLOQUIUM OF ISLAMIC STUDIES) کے لیے لکھا گیا تھا اور اب مصنف نے اس کو اردو ترجمہ کرا کے زیر تبصرہ رسالہ کی شکل میں شائع کیا ہے۔

بڑی حد تک اصل مقالہ اور کسی حد تک ترجمہ کا سب سے پہلا قابل تنقید پہلو یہ ہے کہ عبارت کے الجھاؤ اجزاء مقالہ کی بے ربطی، خیالات کی بے ترتیبی اور غیر منطقی طرز بیان کے باعث پڑھنے والے کو سخت انقباض سے واسطہ پڑتا ہے اور مطالعہ ختم کرنے کے بعد اگر سوچیے کہ اس پورے مقالہ میں وہ مرکزی نقطہ کیا ہے جس پر پوری بحث مرکوز رہی ہو اور جس کو سامنے رکھ کر کوئی ایک منضبط بات حاصل بحث کے طور پر ذہن نشین ہو تو شاید ہر قاری کو اس تلاش میں ناکامی رہے گی۔

دو باتیں جو بالکل الگ الگ ہیں انھیں مقالہ نگار نے ایک ہی مقالہ میں سمو کر گڈمڈ کر دیا ہے۔ یعنی ایک تو یہ مسئلہ کہ جدید ہندوستان کے خاص حالات اور رجحانات اور اسلام کے موجودہ تصور کیا

جو تصادم ہو رہا ہے اسے کیسے ختم کیا جائے؟ اور ایک مسئلہ یہ ہے کہ جدید تعلیم یافتہ طبقہ کے جو افراد اسلام کے موجودہ تصور سے غیر مطمئن ہیں ان کی بے اطمینانی کو کیسے دور کیا جائے؟ ——— ہر چند کہ دونوں مسئلوں کا حل مقالہ نگار کے نزدیک یہ ہے کہ اسلام پر نظر ثانی کی جائے، مگر اس سے دو جداجدا مسئلے ایک تو نہیں بن جاتے، کہ انھیں ایک ہی مقالہ میں گھسیٹ لایا جائے ——— یہ تو ہے مقالہ کے مذکورہ بالا عیب کا بنیادی سبب اور اس پر مستزاد یہ (جیسا کہ ذکر کیا گیا) کہ مقالہ کے بعض اجزا اور میں تو اپنے ماسبق کے ساتھ کوئی منطقی ربط اور تعلق پایا ہی نہیں جاتا، بعض جگہ فی الواقع ربط موجود ہے، مگر بادی النظر میں نظر نہیں آتا۔ عبارت میں الگ الگ اسجھاؤ اور اکھڑا پن ہے۔ بہت سے جملے اپنے ماقبل سے کوئی جوڑ نہیں کھاتے۔ جس کی بنا پر یہ کہنا شاید غلط نہ ہوگا کہ اگر مقالہ نگار دو مختلف موضوعوں کے بجائے ایک ہی موضوع تک مقالہ کو محدود رکھتے تب بھی کسی نہ کسی درجہ میں مذکورہ بالا عیب موجود ہی رہتا۔

بہرحال اب اس قصہ کو ختم کر کے صاحب مقالہ کے خیالات پر نظر ڈالنی چاہیے۔

جیسا کہ مقالہ کے عنوان سے اندازہ ہوگیا ہوگا فیضی صاحب کا خیال یہ ہے کہ ہندوستان کے نئے حالات اور رجحانات کے پیش نظر اسلام پر نظر ثانی کی ضرورت ہے! وہ کیا حالات اور رجحانات ہیں جن کی بنا پر نظر ثانی کی ضرورت ہے؟ اور کس پہلو سے نظر ثانی کی ضرورت ہے؟ ان سوالات کا جواب ان کے یہاں کہیں تلے اور واضح الفاظ میں تو ملتا نہیں کہ ان کی عبارت پیش کر دی جائے البتہ ہم نے کافی در دسری کے بعد جو کچھ سمجھا ہے وہ بڑی حد تک انھیں کے الفاظ میں یہ ہے۔

گو موجودہ جمہوری حکومت نے مسلمانوں کے شخصی معاملات میں ان کا مذہبی قانون برتا جانے کا سلسلہ پیشرو حکومت کی طرح فی الحال برقرار رکھا ہے مگر جدید قوانین نے اس کے حصار میں کچھ رخنے ڈال دیے ہیں حتیٰ کہ ایک غیر جانبدار مبصر کو یہ صاف نظر آتا ہے کہ ہندوستان میں اسلامی قانون کے تار و پود میں، شریعت پر قانون نے بھرپور حملہ کر دیا ہے نیز زمانہ کی رفتار اور قانون سازی کے اس جدید اصول کے پیش نظر کہ "ہر شخص کے لیے ایک ہی قانون ہونا چاہیے" یہ بات یقینی ہے کہ مستقبل میں ایسے تمام انفرادی اور شخصی قوانین جو قدیم معاشرتی اور سماجی اصول پر مبنی ہیں رفتہ رفتہ یا تو منسوخ ہو جائیں گے یا ان میں اتنی تبدیلی ہو جائے گی کہ قوانین کی ایک ایسی عام اسکیم کے ماتحت ہو جائیں جو بلا لحاظ اختلاف مذہب ہر شخص پر عائد ہو۔

یہ ہیں وہ حالات اور جدید ہندوستان کے رجحانات جن کی بنا پر فیضی صاحب ہندوستان

میں مذہب اسلام نظر ثانی کی ضرورت محسوس کرتے ہیں ــــــ نظر ثانی وہ بایں معنی چاہتے ہیں کہ انسان کی انفرادی اور اجتماعی (دنیوی) زندگی کے معاملات میں شریعت کے منصوص احکام اور ان کی روشنی میں مرتب شدہ فقہ کو جو اب تک جزو مذہب سمجھا جاتا رہا ہے اس تصور کو ختم کر کے مذہب کے قانونی حصہ یعنی شریعت کو مذہب سے الگ کیا جائے اور اس میں ضروریات زمانہ اور عصری رجحانات کے مطابق ترمیم و تنسیخ کا حق مانا جائے اور ایک مسلمان جو کسی غیر مذہبی اور جدید طرز کی حکومت میں رہتا ہو اسے جدید قوانین کی پیروی کی آزادی دی جائے خواہ وہ قانون مباحات شرعیہ کے ذیل میں آتا ہو یا نہ آتا ہو۔

اس نقطۂ نظر پر ہم بلا کسی برافروختگی اور جذباتیت کے یہ عرض کرنا چاہتے ہیں کہ اس میں کوئی معقولیت نہیں ہے۔ ایسے حضرات جو صرف اس بنا پر کہ کسی ملک کی حکمران اور قانون ساز طاقتیں اسلام کے کسی حصہ کو معطل کر رہی ہیں اور ان کے رجحانات مستقبل میں اس حصہ کے عملی نفاذ کے لیے کوئی گنجائش باقی نہ رہنے دیں گے، یہ سوچتے اور مسلمانوں کو مشورہ دیتے ہیں کہ اتنے حصہ کے خارج از اسلام یا قابل تنسیخ و ترمیم ہونے کا خود ہی اعلان کر دیا جائے، ان کے لیے اس سے زیادہ معقول طریقہ کار یہ ہے کہ وہ اسلام سے اپنی وابستگی پر نظر ثانی کریں اور ضروری سمجھتے ہوں تو مسلمانوں کو بھی اس کا مشورہ دیں، بلکہ وہ لوگ بھی جو صرف حالات سے مجبور ہو کر اسلام کے کسی سے دستبردار ہونا نہیں چاہتے بلکہ جدید افکار و رجحانات سے متاثر ہونے کی وجہ سے اسلام کے کسی حصہ کو غیر معقول اور ناقابل تسلیم سمجھتے ہیں اور اس بنا پر اس میں ترمیم و تنسیخ کا عمل کرنا چاہتے ہیں، ان کے لیے بھی معقول طریقہ کار یہی ہے۔ الّا یہ کہ یہ ثابت کیا جائے کہ وہ حصہ کتاب و سنت کے منصوصات یا ان کے مقتضیات میں سے نہیں ہے بلکہ اگلے لوگوں نے اپنی ضروریات اور اپنے زمانہ کے حالات کے مطابق محض اپنے فہم و فکر سے کچھ چیزیں اختیار کی تھیں جنھیں بعد کے لوگوں نے غلطی سے جزو مذہب سمجھ لیا ــــــ لیکن ہمارے مقالہ نگار نے اس طرح کی کوئی تحقیق پیش نہیں کی ہے۔ رہا ان کا خیال کہ

> "یہ فروعات کی بتدریج تبدیلی، شریعت اسلام کی بنیادی حقیقت کو ضرر نہیں پہنچا سکتی۔ اس مسئلہ کو صحیح طور پر بہ نظر تعمق دیکھا جائے تو اندازہ ہوگا کہ یہ صرف اوپر کا چھلکا ہے جو اتر رہا ہے اور اندر کا پھل یعنی اسلام کا مرکزی نقطۂ نظر اسی طرح برقرار رہ سکتا ہے کہ اس کی ہر عہد میں اور تہذیب کے ہر دور میں پھر سے تشریح کی جائے" (ص۲۵)

پس ان کا خیال اور مجرد دعویٰ ہے جو اس نظرثانی کی معقولیت کی دلیل نہیں بن سکتا۔

علیٰ ہذا یہ کہنا بھی کہ :-

"موجودہ زمانہ میں یہ ہمارا کام ہے کہ اس بات کا تعین کریں کہ اسلام میں کون سے عناصر باقی رہنے والے اور کون سے تبدیلی کے قابل ہیں" (ص۲۵)

اپنے لیے ایک حق کا محض دعویٰ ہے جو بلا کسی واجب التسلیم سند کے ہرگز قابل تسلیم نہیں۔ صرف اس بات سے کہ ہندوستان میں قانون سازی کا جدید رجحان شرعی قانون کے نفاذ کے لیے گنجائش نہیں چھوڑے گا کسی کو اسلام میں قطع و برید کا حق نہیں مل سکتا اور نہ اس کے لیے یہ بات کافی ہے کہ "علماء کی روایاتی شریعت موجودہ زمانے کے دماغوں کو مطمئن نہیں کرتی"

اب لیجئے دوسرے مسئلہ کو جس کو صاحب مقالہ نے اس مقالہ میں زیر بحث لاکر خلط مبحث کر دیا ہے اور وہ یہ کہ چونکہ علماء کی روایاتی شریعت موجودہ زمانے کے دماغوں کو مطمئن نہیں کرتی (ص۲۵) اور راسخ العقیدہ شارحین' اسلام کے بنیادی عقائد کا جس شکل میں تعین کرتے ہیں وہ اس سے قطعاً غیر مطمئن ہیں (ص۱۹) اس لیے اسلام پر نظرثانی ہونی چاہیئے۔

اس سلسلہ میں ان کا خیال ہے کہ دین کے اصول اور عقائد اور شریعت کے مسائل، سب پر از سر نو غور ہونا چاہیئے اور پھر اسلام کی ایسی تشریح اور تشکیل ہونی چاہیئے جو ان لوگوں کی تسکین کا باعث ہو جن کا اعتقاد اسلام کے پرانے (اعتقادی اور عملی) ڈھانچہ پر نہیں رہا ہے ——— انھوں نے صرف یہ مشورہ دینے، قابل نظرثانی امور کی ایک عارضی فہرست پیش کرنے اور نظرثانی کے لیے چند رہنما اصول (جن کے بیان میں منطقیت کا فقدان ہونے کی وجہ سے بعض جگہ ان کی اصولی حیثیت مبہم رہ گئی ہے) پیش کرنے پر اکتفاء کیا ہے۔ خود کسی تشریح و تشکیل جدید کی کوشش نہیں کی ہے۔ لیکن کچھ تو اس فہرست سے اور کچھ اس جائزہ سے جو انھوں نے "ہندوستان میں موجودہ مذہبی فکر اور شرعی روایات" کا لیا ہے اندازہ ہوتا ہے کہ اس نئی تشریح و تشکیل کا ڈھنگ کیا ہوگا۔ ماضی قریب اور حال کی جدت پسند اور آزاد مذہبی فکر کا جائزہ لیتے ہوئے انھوں نے مولانا آزاد اور ان کے پرائیوٹ سکریٹری پروفیسر محمد اجمل خان صاحب کے طرز فکر کو بہت سراہا ہے۔ چنانچہ وہ مولانا آزاد کا ذکر کرکے لکھتے ہیں کہ

"اصول شریعت میں جدت کی تحریک کے لیڈر کی حیثیت سے آزاد کا کارنامہ مختصراً ... یہ ہے وہ خذ ما صفا و دع ما کدر کے اصول پر کاربند ہیں اور مذہب و سیاست

کے ذریعوں سے وہ سنی اور شیعہ کے اصول، جدید سائنس، دور جدید کے افکار اور گاندھیت کا فلسفہ کام میں لاکر اسلام کو بطور مذہب انسانیت کے اس شکل میں پیش کرتے ہیں، جو زمانہ حال کے نوجوانوں کے لیے قابل برداشت ہو۔ اس طرح ملک میں وہ سب سے ممتاز مذہبی رجحان کی نمائندگی کرتے ہیں، لیکن جیسا کہ اندیشہ کیا جا سکتا تھا روایاتی علماء ان کی قابلیت اور خلوص کا تو اعتراف کرتے ہیں مگر ان کے مذہبی نقطۂ نظر اور معقولیت کے معیار کو قبول کرنے کے لیے پورے طور پر تیار نہیں ہیں۔" (صفحہ ۲۲۔۲۳)

پروفیسر محمد اجمل خاں صاحب کو خراج تحسین پیش کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"اسلام کے بنیادی اصولوں پر عہد حاضر کے مصنفین میں اجمل خاں کی حیثیت ایک آزاد مفکر کی ہے۔ وہ قرآن کو ترتیب نزول کے مطابق مطالعہ کرنے کی اہمیت پر زور دیتے ہیں، اسلام کے پس منظر پر مؤرخانہ انداز سے نظر ڈالتے ہیں۔ قرآن کو سمجھ کر پیغمبر اسلام کی سوانح حیات کا خاکہ بناتے ہیں اور شروع سے آخر تک وہ اپنے نقطۂ نظر میں عہد جدید کے روشن پدرش، سائنٹفک اصول سے محتاط ہو را۔ اسلام کا پورا پورا احترام کرتے ہوئے بیسویں صدی کے عالم مشرقیات کی ناقدانہ صلاحیت کا اظہار کرتے ہیں۔ گو پرانے طرز کے علماء ان کے خیالات پر ناک بھوں چڑھاتے ہیں، تاہم وہ عہد جدید کے افکار پر اپنا سکہ جما کر رہیں گے۔" (صفحہ ۲۴)

مولانا آزاد کے خاص کارنامہ "اسلام کو مذہب انسانیت کی شکل میں پیش کرنے" سے بظاہر اشارہ ان کی تفسیر کے اس حصہ کی طرف ہے جس کی بدولت مذہب کے ہندوستانی (یا گاندھیائی) تصور (وحدت ادیان) کو خود قرآن سے سند اور تائید حاصل ہوئی۔ اور اسی بنیاد پر ہم نے کہا تھا کہ مولانا آزاد کے طرز فکر کو سراہنے سے خود مقالہ نگار کے طرز فکر کا اندازہ ہوتا ہے یعنی مقالہ نگار کے ذہن میں اسلام کا وہی تصور ہے جو تصور وحدت ادیان کے قائلین مذاہب کے متعلق عموماً رکھتے ہیں، پس ظاہر ہے کہ ان کے ذہن میں اسلام کی جدید تشریح و تشکیل کا کیا نقشہ ہوگا۔ علیٰ ہذا پروفیسر محمد اجمل خاں صاحب تو بہت کھلے ہوئے وحدت ادیان

---

[1] مولانا آزاد نے خود اس کا قصد کیا ہے یا نہیں اس بارہ میں قطعیت کے ساتھ کوئی بات کہنی مشکل ہے۔ مولانا موصوف کی بعض تحریروں اور ان کے طرز عمل نے اس معاملہ کو ابہام کی تاریکی میں ڈال دیا ہے۔ افسوس کہ مولانا انتقال فرما گئے اور یہ فرض باقی رہ گیا کہ اس اہم مسئلہ کے بارہ میں کوئی واضح بیان دے کر اس ابہام کو ختم کر دیں۔ (ع)

کے مبلغ ہیں۔ ان کی جن تین کتابوں کا تذکرہ فیقی صاحب نے اس مقالہ میں کیا ہے ان میں سے ایک کتاب (مختصر سیرت قرآنیہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم) دیکھنے کا اتفاق ہمیں بھی ہوا ہے اور اسی بنا پر ہمیں حیرت ہے کہ اجمل خاں صاحب کو مولانا آزاد کی صف میں کیسے رکھ دیا گیا ہے! وہ عالم شرقیات ہوں تو ہوں مگر ان کا نقطۂ نظر (جیسا کہ وہ پیش کرتے ہیں) سائنٹفک نظر آتا ہے اور نہ ان کے طرز تحریر اور انداز استدلال سے "ناقدانہ صلاحیت" کا اظہار ہوتا ہے ان کے اَن سائنٹفک (UNSCIENTIFIC) انداز فکر اور غیر منطقی طرز استدلال کا تو یہ حال ہے کہ وہ یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ سورۂ علق کی ابتدائی پانچ آیتیں جو سب سے پہلے نازل ہوئیں ان میں سارا اسلام آگیا ہے یعنی اگر سلسلۂ وحی بند ہو جاتا تو انسانیت کی ہدایت کے لیے جو حل ان میں پیش کیا گیا ہے وہ کافی تھا اور اس پر غزوۂ احد میں نازل ہونے والی اس آیت سے استدلال کرتے ہیں کہ أَفَإِن مَّاتَ أَوْ قُتِلَ انقَلَبْتُمْ عَلَىٰ أَعْقَابِكُمْ؟ انداز استدلال یہ ہے کہ اگر یہ بات نہ ہوتی تو ان لوگوں کو زجر و توبیخ کی کوئی معقول وجہ نہیں ہو سکتی جو غزوۂ احد میں "اِن مَاتَ اَوْ قُتِلَ" کے وقوع کی صورت میں دین اسلام کو چھوڑ دیتے اس لیے کہ اگر اس وقت تک دین مکمل نہیں ہوا تھا تو لوگ اُسے ترک کر دینے میں معذور ہوتے لہٰذا ماننا چاہیے کہ اصل دین پورا کا پورا پہلے ہی وحی میں آچکا تھا بعد کے عرصہ میں محض رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس کی تشریحات فرماتے رہے۔ (ملاحظہ ہو "مختصر سیرت قرآنیہ" صفحہ ۳۲، ۳۴، ۹۴)

ذرا غور تو فرمایئے اس استدلال اور انداز بحث پر! کیا اس کی مضحکہ خیزی میں کچھ شبہ ہے؟[1]۔ اس مبلغ فہم اور انداز فکر کے اصحاب کو بھی جو لوگ مفکرین اسلام کا درجہ دینے لگیں سمجھ میں نہیں آتا کہ اسلام کے بارے میں خود ان کے فہم و فکر کو کیا درجہ دیا جائے۔؟

بہر حال ــــــ بات میں بات نکل آئی، کہنا یہ تھا کہ اگر فیقی صاحب کے پیش نظر انھیں خطوط پر اسلام کی جدید تشریح و تشکیل ہے جن پر ابتدائی کام ان کے بقول مولانا آزاد کر چکے ہیں اور جس کو اپنے طرز پر اجمل خاں صاحب آگے بڑھا رہے ہیں، تو یہ تشریح و تشکیل فی الواقع اس اسلام کی تو ہوگی نہیں جس کو قرآن نے پیش کیا اور جس کی دعوت و تعلیم کے لیے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مبعوث ہوئے بلکہ اپنی طرف سے اس اسلام کے سر چپکائی ہوئی ایک چیز ہوگی۔ یا یوں کہیے کہ تھوڑے سے اشتراک کے ساتھ اسلام سے مختلف ایک مستقل مذہب ہوگا۔ کسی چیز کی کوئی ایسی تشریح جس میں اس کی حقیقت اور ماہیئت بدل جائے اور ایسی تشکیل جو اس کی ماہیئت کے

---

[1] اسی بنا پر ہم یہاں اس پر تنقید کی ضرورت نہیں سمجھتے۔ دیکھیے الفرقان جلد ۱۲ نمبر ۴ میں "سیرت قرآنیہ" پر تبصرہ کے ذیل میں اس استدلال کی مضحکہ خیزی کو ظاہر کیا جا چکا ہے۔ (ع، س)

مزاج کے مطابق بہ وجدت پسندانہ تو کہلائی جا سکتی ہے لیکن حقیقت پسندانہ ہرگز نہیں کہلائی جا سکتی۔ یہی وہ معیار ہے جس کی بنا پر ہم مولانا آزاد کو ان کے اس کارنامہ میں جسے نیفی صاحب ان کا کارنامہ قرار دے رہے ہیں اور پروفیسر اجمل خاں صاحب کو ان کی "مفکرانہ اور ناقدانہ" کاوشوں میں تجدد پسند تو مان سکتے ہیں لیکن حقیقت پسند ماننے سے معذور ہیں۔

کسی چیز کی نئے زمانہ کے مطابق "نئی تشریح" کے دو مطلب ہو سکتے ہیں۔

۱- ایک یہ کہ اس کی حقیقت کو اس زمانہ کی زبان اور مانوس الفاظ و عبارات میں بیان کیا جائے اور اس کی صحت و حقانیت پر زمانہ کے مناسب طرز استدلال اختیار کیا جائے۔

۲- دوسرا مطلب یہ ہو سکتا ہے کہ اگر کسی خاص زمانہ کا ذہن اس کو اس کی نفس الامری حقیقت کے ساتھ قبول کرنے سے انکار کرتا ہے تو اس کی اصل حقیقت بدل کر کچھ اور بتائی جائے۔

پہلے معنی میں تو نئی تشریح کی ضرورت یقیناً اسلام کو ہے اور باخبر علماء ہر زمانہ میں اس ضرورت کو تسلیم کرتے ہیں لیکن دوسرے معنی میں "نئی تشریح" درحقیقت تشریح نہیں بلکہ تحریف ہو جاتی ہے۔ علماء اگر مولانا آزاد کی پیش کردہ اسلام کی شکل (بشرطیکہ وہ ویسی ہی ہو جیسی نیفی صاحب اور ان کے ہم فکر حضرات سمجھتے ہیں) کو قبول نہیں کرتے یا اجمل خاں صاحب کی تجدیدی کد و کاوش پر "ناک بھوں چڑھاتے ہیں" تو اس کی وجہ یہی ہے کہ وہ یہاں اسلام کی واقعی حقیقت کی جدید تشریح سے زیادہ (ایک جگہ خفی اور دوسری جگہ جلی) تحریف پاتے ہیں۔ اور ظاہر ہے کہ کوئی دیانتدار اور حقیقت شناس آدمی اس معنی میں کسی "نئی تشریح و تشکیل" کو نہ پسند کر سکتا ہے نہ قبول کر سکتا ہے۔

پس جو حضرات اپنے علم و مطالعہ کی بنا پر دیانتداری کے ساتھ یہ سمجھتے ہیں کہ اسلام جو اصول و عقائد اور احکام دیتا ہے ان میں سے بعض نظر ثانی اور ترمیم و تنسیخ کے محتاج ہیں۔ تو ان کے لیے بجائے اس کے کہ وہ ان چیزوں کو "روایاتی" اور کسی زمانہ کے لیے ناقابل قبول کہہ کر ان پر نظر ثانی شروع کریں، دیانتدارانہ راستہ یہ ہے کہ وہ اسلام کو خیرباد کہہ دیں۔ ہاں اسلام کے عقائد و احکام سے متعلق جو جو تفصیلات اور تفریعات منصوص نہیں بلکہ متکلمین و مجتہدین کی کاوشوں کا نتیجہ ہیں (اور اس لیے سلف سے ان میں اختلاف رائے چلا آ رہا ہے) ان میں بے شک ہر زمانہ میں غور و فکر ہو سکتا ہے لیکن کتاب و سنت

ملہ اور اجمل خاں صاحب کے خیالات پر "ناک بھوں چڑھانے" کی تو ایک وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ ان کے افکار میں معقولیت اور منطق کی ضرورت سے زیادہ کمی کے باعث ایک سلجھے ہوئے ذہن کے آدمی کا انقباض طبعی ہے۔

کو اصل سند اور دین کا اصل ماخذ نہ مان کر ـــــــ مگر معلوم یہ ہوتا ہے کہ فیضی صاحب کو یہ بنیادی اصول ہی تسلیم نہیں ہے کہ دین میں نفیاً و اثباتاً کچھ کہنے کے لیے کتاب و سنت کی سند ضروری ہے۔ اس لیے سب سے پہلے ضرورت اس بات کی ہے کہ وہ "روایاتی علماء" کے سلف سے خلف تک کے اس مسلمہ بنیادی اصول کی غلطی واضح فرمائیں ورنہ اس بنیادی اختلاف کی موجودگی میں کوئی گفتگو نتیجہ خیز نہیں ہو سکتی۔

حرفِ آخر ۔ اس رسالہ میں "اسلام پر نظر ثانی" کی جو تجویز پیش کی گئی ہے اس کو قابلِ اعتناء سمجھا جائے یا نہ سمجھا جائے۔ البتہ اس کی ضرورت کو ظاہر کرنے کے لیے ہندوستان کے حالات کی جو رفتار اور یہاں کی حاوی ساز طاقتوں کے جو رجحانات صاحب مقالہ نے بیان کیے ہیں وہ یقیناً قابلِ اعتناء ہیں۔ کیونکہ ان کے بیان کی حیثیت "شَہِدَ شَاهِدٌ مِنْ أَهْلِهَا" کی ہے۔ ہمیں ماننا چاہیے کہ جدید ہندوستان کی تعمیر کا کام جن لوگوں کے ہاتھوں میں ہے ان کی عملی سرگرمیوں کا رُخ اور ان کا ذہنی رجحان بے شک یہی ہے جس کی گواہی حرم قیادت کے ایک رازداں نے ہمارے سامنے پیش کر دی ہے اور اس رجحان کے زیر اثر صاحب مقالہ کے بیان کے مطابق "ہندوستان میں قانون نے (مسلم پرسنل لا کے تار و پود میں) شریعت پر بھرپور حملہ کر دیا ہے اور کرتا رہے گا ـــــــ اور اس کو مان لینے کے بعد ان تمام سوچنے سمجھنے والے مسلمانوں کو جو مذہب اور قانون کی علیحدگی کے اصول کو ماننے کے لیے تیار نہیں ہے، پہلی فرصت میں اس پر غور کرنے کی ضرورت ہے کہ اس صورت کا مقابلہ کس طرح کیا جائے۔

اس مقالہ کا یہی ایک پہلو ہماری نظر میں بہت قابلِ قدر ہے کہ صاحب مقالہ نے مسلمانانِ ہند کو ایک قریبی خطرہ سے بہت واضح الفاظ میں خبردار کیا ہے۔ (ع۔ س)

(بقیہ مضمون صـ ۱۸۱)

تو ان کے حکم سے کھانا آیا۔ ابن تیمیہؒ کے سوا سب نے کھایا، وجہ دریافت کی گئی تو صاف فرمایا کہ میں یہ کھانا کیسے کھاؤں، جو لوگوں کے مال سے لوٹ کر حاصل کیا گیا ہے اور لوگوں کے درختوں کو کاٹ کر پکایا گیا ہے۔

تازہ خواہی داشتن گر داغہائے سینہ را
گاہے گاہے باز خواں این قصۂ پارینہ را

(الفرقان بابت شوال ۱۳۷۱ھ)

عتیق الرحمٰن سنبھلی

سیرت کے جلسوں میں وحدت ادیان کا ساز

اور اسلامی نقطۂ نظر سے اس کی حقیقت

(ذیل کا مضمون نگاہ اولیں کے تحت تین قسطوں میں لکھا گیا تھا)

سید الانبیاء حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی آمد سے اس عالم کی قسمت جاگی، اس کی مصیبتیں دور ہوئیں، اس کی زندگی کا ایک خوش منظر دور شروع ہوا، اور اللہ کے بندوں کو اللہ کی بندگی کا سیدھا راستہ ہاتھ آیا۔ اس لیے بجا ہے اگر اس محسن اعظم کی ولادت کے یوم سعید پر احسان شناسوں کے دلوں میں مسرت کی ایک لہر دوڑ جائے۔ — مگر احسان شناسی اور سپاس گزاری کا وہ کیسا مظاہرہ ہوگا جس میں بہت سی باتیں اس کی منشاء کے خلاف ہوں، اس کی مقدس روح کو تکلیف پہونچانے والی ہوں اور اس کے حیات آفریں پیغام پر پردہ ڈال دیتی ہوں؟

ابتک ایسی باتوں کا ارتکاب ہمارے کم پڑھے اور بے پڑھے عوام کرتے تھے اور ہم انھیں کوستے تھے اور ان کے ساتھ ان مولویوں کی جان کو بھی دعا دیتے تھے جو ان باتوں کو کار ثواب بتاتے تھے، مگر اب سمجھ میں نہیں آتا کہ "پنبہ" کہاں کہاں رکھا جائے کہ "تن ہمہ داغ داغ شد" —— چند برس سے ایک نئی صورت حال پیدا ہوئی ہے کہ ہمارے تعلیم یافتہ طبقہ نے بھی یہ کام ذرا تعلیم یافتہ طریقہ سے شروع کر دیا ہے، یہاں ہمیں اس اپٹوڈیٹ قسم کے جشن مسرت کے پورے پروگرام سے تو بحث نہیں کرنا ہے کیونکہ اس کے اکثر اجزاء "نئی بوتلوں میں پرانی شراب" کے مصداق ہیں، البتہ اس کا ایک جزو بالکل نیا ہے، وہی گفتگو کا محتاج ہے۔

وہ نیا جزو جو اس پروگرام میں بڑی اہمیت کے ساتھ شامل کیا جا رہا ہے یہ ہے کہ غیر مسلم

سیاسی لیڈروں کو خصوصاً برسراقتدار گروہ کے متعدد اصحاب کو تقریر اور پیغامات کے لیے مدعو کیا جاتا ہے بلکہ بعض جگہ مسند صدارت بھی پیش کی جاتی ہے۔ چنانچہ یہ حضرات کمال نیازمندی کے ساتھ تقریریں ارشاد فرماتے ہیں اور پیغامات ارسال فرماتے ہیں اور حاضرین ـــ جن میں نوے فیصدی سے زیادہ مسلمان ہوتے ہیں ـــ ان کو "با ادب با ملاحظہ ہوشیار" ہو کر سنتے ہیں۔

برادران وطن کی نفس شرکت یا نفس تقریر سے ہمیں کوئی اختلاف نہیں، بلکہ یہ تو ایک گونہ خوشی کی بات ہے کہ غیر مسلم بھی اس ذات والاصفات کو نذر عقیدت پیش کرتے ہوئے نظر آویں! مگر اس نذر عقیدت میں نری عقیدت تو نہیں ہوتی، اس میں کچھ اور بھی ہوتا ہے جو اظہار عقیدت کی مٹھاس میں بڑی آسانی کے ساتھ مسلمانوں کے حلق سے اتر جاتا ہے اور غیر شعوری طور پر ان کے خیالات کا جزو بن جاتا ہے۔

اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ ان سارے پیغامات اور تمام تقریروں کی تان وحدت ادیان کی تلقین پر آکر ٹوٹتی ہے اور ان سب میں قدر مشترک یہی ٹیپ کا بند ہوتا ہے کہ

"تمام مذاہب کی تعلیمات یکساں طور پر اچھی اور سچی ہیں، یہ بظاہر مختلف راستے ہیں مگر ہر راستہ خدا تک پہونچتا ہے" اس لیے اس ظاہری اختلاف کی بنیاد پر انسانوں میں کوئی حقیقی اختلاف نہ ہونا چاہیے، ہر مذہب کی روح یہی ہے کہ لوگ پریم اور بھائی چارے کے ساتھ رہیں۔ تمام مذاہب کے بزرگوں کی تعلیمات کا حاصل ہی باہمی رواداری اور صلح و آشتی ہے، حضرت محمد نے بھی یہی تعلیم بڑے اچھے طور سے دی ہم سب کو ان کی تعلیم سے فائدہ اٹھانا چاہیے تاکہ ہم مکمل رواداری اور بھائی چارے کے ساتھ بھارت ماتا کی خدمت کرسکیں!"

یہ وہ تلقین ہے جس کو چند سال پیشتر مسلمان آسانی کے ساتھ سن نہیں سکتا تھا، مگر اب منانے والوں کو دھوکے کے سنتا ہے، اس قسم کی تلقین کا (قابل ذکر) واقعہ سب سے پہلے غالباً جمعیۃ علماء ہند کے سالانہ اجلاس (۱۹۴۵ء) منعقدہ لکھنؤ میں پیش آیا تھا جبکہ بھارت ادیان کے مبلغ اعظم پنڈت سندرلال جی نے اپنی تقریر میں بڑے دھڑلے سے مسلمانوں کو اس کی تلقین کی تھی ـــ اگرچہ یہ واقعہ ہے کہ داعیان اجلاس کے قصد کو اس میں بالکل دخل نہ تھا، اور وہ عجیب کشمکش میں پڑ گئے تھے کہ اپنے اس "بے تکلف" مہمان کے ساتھ کیا سلوک کریں ـــ مگر دیکھنے والے جانتے ہیں کہ مسلمان پبلک کو یہ لمحات کس قدر شاق تھے، اور خود داعیین کو بھی یارائے ضبط نہ رہا تھا، اور وہ برملا کہہ اٹھے تھے کہ "یہ ایک مجذوب کی بڑ ہے، جس کو کوئی وقعت نہ دیجیے" ـــ مگر یہ باتیں ہیں جب کی جب "آتش جوان تھا"۔ اب مسلمانوں میں یہ دہشت

نہیں ہی ہے، اب وہ قریب آ رہے ہیں یا خود کو قریب لا رہے ہیں، اور اگر ان کے جانے پہچانے لوگ اس بندوق کے لیے اپنے کندھے یوں ہی پیش کرتے رہے جیسے کہ اس وقت ہوا چل پڑی ہے تو کون جانے کب ہم اس انقلاب کی یہ حد بھی دیکھ لیں۔

ہمہ آہوان صحرا سر خود نہادہ برکف　　بامید آنکہ روزے بشکار خواہی آمد

پہلے یہ بتانے کی ضرورت نہیں تھی کہ یہ باتیں ناقابل سماعت ہیں اور اسلام کی رو سے وحدت ادیان کا فلسفہ بالکل مہمل شے ہے، اللہ کے یہاں سند قبول صرف ایک ہی دین کو حاصل ہے اور وہ اسلام ہو (إِنَّ الدِّينَ عِندَ اللَّهِ الْإِسْلَامُ) مسلمان ہزار گنہگار اور بے عمل ہوتے ہوئے بھی اس بات پر پکا اعتقاد رکھتا تھا کہ نجات کی راہ صرف ایک ہے اور وہ اسلام ہے! — مگر اللہ رے انقلاب زمانہ! کہ وہی مسلمان اب جلسۂ سیرت النبی میں دو زانو بیٹھ کر یہ سبق پڑھتا ہے کہ ہر مذہب راہ نجات ہے اور ہر راستہ سے خدا ملتا ہے، اسلام ہی کی کوئی اجارہ داری نہیں ہے!

ہم اپنے ان بھائیوں سے جو دانستہ یا نادانستہ طور پر اس فتنۂ وحدت ادیان کی خدمت انجام دے رہے ہیں، پوچھنا چاہتے ہیں کہ کیا واقعی جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا پیغام یہی تھا جس کو زندہ رکھنے کے لیے ہم سیرت کے جلسے منعقد کرتے ہیں؟ کیا آپ کی بعثت کی غایت اسی "ہندوستانی رواداری" کی تعلیم و تلقین تھی؟ اگر جواب اثبات میں ہے تو پھر کوئی ہمیں سمجھائے کہ آپ نے اپنی قوم اور اپنے خاندان سے کیوں لڑائی مول لی تھی؟ کیا اس طرح کی رواداری میں ان باتوں کا کوئی بھی امکان تھا جو آپ کو تیرہ سال کی مکی زندگی میں پیش آئیں۔ اور بالآخر ہجرت تک لے گئیں؟ قریش کب کہتے تھے کہ آپ اپنے باپ دادا کے دین کو چھوڑ کر اپنی پسندیدہ راہ پر نہ چلیں؟ وہ تو صرف یہ چاہتے تھے کہ آپ باپ دادا کے دین کو غلط نہ کہیں، ان کے معبودوں کو معبودان باطل نہ بتلائیں۔ اور لوگوں کو پرانا طریقہ چھوڑنے کی تلقین نہ کریں، گویا وہ آنحضرتؐ سے اسی "ہندستانی ٹائپ" کی رواداری کے طالب تھے، — جس پر عمل پیرا نہ ہونا ہی آپ کی مخاصمت کی سب سے بڑی بنا تھی! اور اگر جواب اثبات میں نہیں نفی میں ہو اور ہمارے یہ بھائی الحمد للہ اس تاریخی اور مذہبی گمراہی میں مبتلا نہیں ہیں تو پھر برائے خدا بتلایا جائے کہ ان جلسوں کے پروگرام کے اس جزو کا کیا مقصد ہے؟ کیا اس سے خوشنودیٔ اقتدار اور رضائے اکثریت مطلوب ہے؟ —— سوال یقیناً بہت تلخ ہے مگر اس مجبوری کو کیا کیا جائے کہ ان دو کے علاوہ تیسری کسی بات کا امکان نہیں ہے، ان دونوں میں سے ایک نہ ایک بات بہرحال ہے اور جو بھی ہے وہ ہلکی نہیں ہے! پہلی بات نہایت دور رس اثرات کی حامل ضلالت ہے، اور دوسری حد درجہ کی گراوٹ۔

اگر وحدت ادیان کے اس تصور کو صحیح مان لیا جائے تو اس کا سب سے پہلا منطقی نتیجہ یہ ہو گا کہ غیر مسلموں میں اسلام کی تبلیغ کو قطعاً غیر ضروری سمجھا جائے اور اس میں وقت صرف کرنے کو اضاعت وقت سمجھا جائے کیونکہ جب ہر راہ، راہ نجات ہو تو انسان اپنے لیے جس راہ کو بھی پسند کرے کرلے لیکن دوسروں کو اس کی تلقین کی کوئی حاجت باقی نہیں رہتی اور پھر اسی کو اگر ذرا دور تک سوچیے تو ماننا پڑے گا کہ وہ ذات گرامی جس کو خراجِ عقیدت پیش کرنے کے لیے ہم یہ جلسے منعقد کرتے ہیں (معاذ اللہ) عمر بھر اسی لایعنی کام میں مشغول رہی۔ کوئی قرآن و حدیث اور سیرت طیبہ سے چن چن کر ہزاروں باتیں بھی بزعم خود مذہبی رواداری کے اس تصور کے ثبوت میں پیش کر دے مگر اس تاریخی واقعہ سے تو کوئی انکار نہیں کر سکتا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم دنیا کے تمام انسانوں کو اپنے لائے ہوئے دین کی دعوت دیتے تھے اور یہی بات قریش مکہ کو آپ کی جان کا دشمن بنائے ہوئے تھی۔ اس کے سوا اور کوئی شکایت انھیں آپ سے نہ تھی، لہٰذا اس منطقی نتیجہ کی رو سے یہ ذات گرامی سے بھی نہیں بچ سکتی! —— تو کیا یہی ہے وہ "خراج عقیدت" جسے بارگاہ رسالت میں پیش کرنے کے لیے ہر سال مسلمانوں کے لاکھوں روپے پانی کی طرح بہا دیے جاتے ہیں؟

اور اگر بفضل خدا ہم اس تصور سے بھی کانوں پر ہاتھ دھرتے ہیں تو ہمیں سوچنا چاہیے کہ ہم اس متبرک تقریب کے پروگرام کے اس جزو سے اپنی کس درجہ گراوٹ کا ثبوت پیش کر رہے ہیں۔ ہم یہ جانتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پیغام ہدایت کو وحدت ادیان کے اس تصور سے کوئی واسطہ نہیں ہے، اس تصور کی رو سے آپ کی اصل دعوت غلط ٹھہرتی ہے اور آپ کی ساری جدوجہد ایک لایعنی چیز بن جاتی ہے، مگر ملک کے سیاسی حالات کے پیش نظر ہم اس تبلیغ کو صرف سننا ہی گوارا نہیں کرتے، بلکہ اپنے خرچ پر اس کی نشر و اشاعت کا انتظام بھی کرتے ہیں! "کہ غیرت نام ہے جس کا گئی تیمور کے گھر سے" —— ہم ابھی تک اتباع دین سے تہی دست ہوئے تھے، مگر حمیت دین سے ہمارے سینے خالی نہ تھے۔ ۴۷ء کے انقلاب کی نوعیت نے اس چنگاری کو خوب خوب اکھ میں دبا یا! مگر دھواں اس سے پھر بھی کبھی کبھی اٹھتا نظر آجاتا تھا، مگر کیا اب اس کی بچی کھچی حرارت کا خاتمہ خود ہمارے ہی ہاتھوں ہونا ہے؟

اس موقع پر ہم اس وحدت ادیان کے دام ہمرنگ زمین کی حقیقت بھی واضح کرنا چاہتے ہیں، تاکہ ان جلسوں کی "برکت" سے اگر کوئی ناواقف مسلمان اس کا شکار ہو گیا ہو تو اس کی غلط فہمی کا ازالہ

ہو سکے۔

وحدت ادیان کے جس تصور پر گفتگو ہے جیسا کہ بتلایا جا چکا ہے وہ یہ ہے کہ ہر دین و ہر مذہب اور ہر دھرم سچا اور خدا رسی کا ذریعہ ہے۔ مختلف مذہبی راستوں میں سے جس راستہ کو بھی آدمی اختیار کرے وہ خدا کا قرب اور اس کی رضا حاصل کر سکتا ہے یا دوسرے الفاظ میں حق اور سچائی ایک ہی ہر مذہب کا مقصد اس کی تلاش ہے، مختلف قومیں اور مختلف ملکوں کے باشندے اس کی تلاش کے لیے جن طریقوں کو بھی اپنائیں ان میں حق و باطل کی کوئی تفریق نہیں ہے بلکہ حق پرستوں کا کام یہ ہو کہ سب کو حق سمجھیں۔

یہ تصور دراصل ہندومت کا ہے۔ اس لیے اس مذہب میں اپنے دائرہ سے باہر اپنی تبلیغ کا کوئی خیال اب سے کچھ عرصہ پہلے تک پیدا ہی نہیں ہوا تھا ــــــ مگر اب مسلمانوں کے سامنے اس طرح اس تصور کو پیش کیا جاتا ہے کہ گویا یہی قرآن کی بھی تعلیم ہے۔ اور بعض لوگ تو بعض آیتیں بھی اس کے ثبوت میں پیش کرنے کی کوشش کرتے ہیں مثلاً

- إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَالَّذِينَ هَادُوا وَالنَّصَارَىٰ وَالصَّابِئِينَ مَنْ آمَنَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ وَعَمِلَ صَالِحًا فَلَهُمْ أَجْرُهُمْ عِندَ رَبِّهِمْ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ. (البقرہ ع ۸)

  وہ لوگ جو ایمان لائے اور یہود و نصاریٰ اور صابئین جو بھی اللہ اور یوم آخرت پر ایمان لائے اور اچھے اعمال کیے بیشک ان کے لیے اجر ہو ان کے رب کے پاس اور انھیں نہ کوئی خوف ہوگا اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔

(۲) إِنَّ الَّذِينَ يَكْفُرُونَ بِاللَّهِ وَرُسُلِهِ وَيُرِيدُونَ أَن يُفَرِّقُوا بَيْنَ اللَّهِ وَرُسُلِهِ وَيَقُولُونَ نُؤْمِنُ بِبَعْضٍ وَنَكْفُرُ بِبَعْضٍ وَيُرِيدُونَ أَن يَتَّخِذُوا بَيْنَ ذَٰلِكَ سَبِيلًا ۝ أُولَٰئِكَ هُمُ الْكَافِرُونَ حَقًّا ج (النساء ع ۲۱)

(۲) جو لوگ منکر ہیں اللہ اور اس کے رسولوں سے اور چاہتے ہیں کہ اللہ اور اس کے رسولوں میں فرق کریں اور کہتے ہیں کہ ہم بعض کو مانتے اور بعض کو نہیں مانتے اور چاہتے ہیں کہ (کلی ایمان اور کلی انکار کے) بیچ کی کوئی راہ نکالیں ــــــ یہی لوگ ہیں اصل کافر

پہلی آیت سے اس طرح استدلال کیا جاتا ہے کہ دیکھئے آیت سے صاف طور پر معلوم ہوتا ہے کہ نجات کسی ایک مذہب میں منحصر نہیں ہے مسلمان ہوں یا یہودی، نصرانی ہوں یا صابی ہر ایک

آخرت میں فلاح یاب ہو سکتا ہے بس شرط یہ ہے کہ اللہ اور یوم آخرت پر ایمان رکھے اور اچھے اعمال کرے اصل چیز مطلق ایمان اور مطلق عمل صالح ہے نہ کہ اس کا کوئی متعین مفہوم اور متعین صورت ——— یہ گویا اس دعوے پر مثبت استدلال ہے۔

اور دوسری آیت سے استدلال اس طرح کیا جاتا ہے کہ اس آیت میں تفریق بین الرسل ... (رسولوں کے درمیان تفریق کرنے) کو حقیقی کفر قرار دیا گیا ہے لہذا مذاہب کی الگ الگ صورتیں اور مختلف ملتیں جو مختلف انبیاء ہی کی آمد سے وجود میں آئی ہیں ان میں سے کسی ایک کو حق اور کسی کو باطل سمجھنا یہ بھی کفر ہے کیونکہ اس سے وہی تفریق بین الرسل لازم آتی ہے جسے کفر حقیقی قرار دیا گیا ہے ——— یہ گویا منفی استدلال ہے۔

لیکن حقیقت یہ ہے کہ وحدت ادیان کے جس تصور سے یہاں بحث ہے اس کی ذرا سی بھی تائید ان آیات سے نہیں ملتی۔ ان لوگوں نے نادانستہ وحدت دین اور وحدت ادیان کے فرق کو نہیں سمجھا ہے ورنہ کبھی ان آیات سے استدلال نہ کرتے۔ یہ آیات وحدت دین کا ثبوت ہیں نہ کہ وحدت ادیان کا، وحدت ادیان کا تصور تو اتنی غیر معقول بات ہے کہ خدائے حکیم کے کلام میں اس کی تائید تلاش کرنا ہی بے سود ہے البتہ وحدت دین ایک حقیقت ہے اور قرآنی حقیقت ہے ان دونوں آیتوں سے بھی بس اسی حقیقت کا اظہار ہوتا ہے۔

پہلی آیت میں بتلایا گیا ہے کہ دنیا کے تمام انسانوں اور تمام گروہوں کے لیے نجات کی شاہراہ صرف ایک ہے وہ ہے ایمان باللہ، ایمان بالآخرۃ اور عمل صالح جو اس پر چلے گا وہ منزل پر جا پہنچے گا اور جو اسکو چھوڑ دے گا وہ کبھی کامیاب نہ ہو سکے گا چاہے وہ انبیاء کی نسل سے ہو یا بت پرستوں کی نسل سے ——— قرآن بار بار کہتا ہے کہ اللہ کے تمام پیغمبروں نے اپنے مخاطبین کو یہی پیغام ہدایت دیا اور اسمیں کبھی سرمو فرق نہیں ہوا۔

فِطْرَةَ اللهِ الَّتِيْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا ط	یعنی خدا کی وہ بناوٹ ہے جس پر اس نے انسانوں
لَا تَبْدِيْلَ لِخَلْقِ اللهِ ذٰلِكَ الدِّيْنُ	کو بنایا (اور) اللہ کی بناوٹ کو کبھی تبدیلی نہیں
الْقَيِّمُ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ.	(بس) یہی سیدھا دین ہے لیکن بہت سے لوگ
(الروم۔ ع ۴)	جانتے نہیں۔

اللہ کا دین ہمیشہ سے انسانوں کی فطرت کے مطابق ہے اور فطرت انسانی میں کوئی تبدیلیاں نہیں ہوتی اس لیے دین میں بھی کوئی رد و بدل نہیں ——— اور اس سے بھی صاف الفاظ میں قرآن کہتا ہے

شَرَعَ لَكُم مِّنَ الدِّينِ مَا وَصَّىٰ بِهِ نُوحًا وَالَّذِي أَوْحَيْنَا إِلَيْكَ وَمَا وَصَّيْنَا بِهِ إِبْرَاهِيمَ وَمُوسَىٰ وَعِيسَىٰ أَنْ أَقِيمُوا الدِّينَ وَلَا تَتَفَرَّقُوا فِيهِ

(الشوریٰ ع ۲)

اس نے (اللہ نے) متعین کردی ہے تمہارے لیے دین کی وہی راہ جس کا حکم نوح کو دیا گیا تھا اور جس کی ہم نے تیری طرف وحی کی اور جس کا حکم ہم نے ابراہیم اور موسیٰ اور عیسیٰ کو دیا (یہی بات تھی) کہ اسی دین حق کو قائم رکھو اور اسمیں باہم اختلاف نہ کرو۔

اس آیت میں بتلایا گیا کہ سلسلۂ نبوت کی پہلی کڑی (حضرت نوح علیہ السلام) سے آخری کڑی (خاتم النبیین حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم) تک دین حق ایک ہی رہا ہے۔ یہی مطلب ہے وحدت دین کا۔ دوسری آیت میں جو بات کہی گئی ہے وہ گویا اسی کا لازمی نتیجہ ہے کہ جب یہ حقیقت ہے کہ اللہ کے تمام پیغمبر ایک ہی دین کے داعی ہیں تو پھر اس کے کیا معنی کہ بعض کی تصدیق کی جائے اور بعض کی تکذیب، پیغمبر کی تصدیق اور تکذیب کا مطلب اس کی دعوت کی تصدیق و تکذیب ہوتا ہے لہذا ایک پیغمبر کی تکذیب کرنے سے آدمی اُس دین قیم کے انکار کا مرتکب ہوتا ہے جو شاہراہ نجات ہے پس اس کا شمار مومنین میں نہیں بلکہ کافرین میں ہوگا۔

بہرحال یہ ہے قرآن کا تصور وحدت دین اور اس کے برعکس وحدت ادیان کا مطلب جیسا کہ اوپر گزر چکا ہے یہ ہے کہ دین ایک نہیں متعدد ہیں مگر وہ اپنی غرض و غائت کے اعتبار سے ایک ہیں یعنی سب کی غرض رضائے الٰہی کی طلب اور سب کی غائت رضا کا حصول ہے اور قابل اعتنا بس یہی چیز ہے ـــــ بایں معنی وہ متعدد ہونے کے باوجود ایک ہی ہیں پس وہ تمام راہرو جو ایک ہی منزل کی جستجو میں مختلف راستوں پر گامزن ہیں ان کو چاہئے کہ ایک دوسرے کو مسافران جادہ حق سمجھیں اور ایک دوسرے پر اپنی مخصوص راہ کے لیے اصرار نہ کریں۔ تبلائیے کہ قرآن کی کوئی آیت اس نظریہ کی تائید کر بھی کیسے سکتی ہے جب کہ یہ قرآنی نظریہ کی بالکل ضد ہے؟ اور تفریق بین الرسل کی مخالفت کا تقاضہ یہ کیونکر ہوسکتا ہو کہ دو باہم متضاد دینوں کی بیک وقت تصدیق کی جائے قرآن کی تفریق بین الرسل کی مخالفت تو اسی امر پر مبنی ہے کہ تمام انبیاء و رسل ایک ہی دین کے داعی تھے۔

قرآن اس نظریہ کے پہلے جزء کو تو مانتا ہے اور وہ بالکل واقعاتی چیز ہے کہ "دین متعدد ہیں" مگر اس دوسرے جزء کا کھلا انکار کرتا ہے کہ "وہ سب حق ہیں" وہ بنیادی طور پر دین کی دو قسمیں تبلاتا ہے ایک اسلام اور ایک کفر ـــ اسلام دین کی اس قسم کا نام ہے جسکی دعوت اللہ کے پیغمبروں نے دی یہی حق ہو اور مقبول ہو اور کفر وہ ہو جسے لوگوں نے خود گھڑا ـــ اور باطل ہو اور نامقبول ہو خواہ انسان اپنے اس دین میں خود کو فنا ہی کیوں نہ کر دے!

وَمَن يَّبْتَغِ غَيْرَ الْاِسْلَامِ دِيْنًا فَلَنْ يُّقْبَلَ مِنْهُ وَهُوَ فِي الْاٰخِرَةِ مِنَ الْخَاسِرِيْنَ۔ (آل عمران۔ ع ۹)

اور جو کوئی اسلام کے سوا دین کی کوئی اور راہ چاہے گا تو اس کی راہ ہرگز قبول نہ کی جاوے گی اور وہ آخرت میں ٹوٹے میں رہنے والوں میں سے ہوگا۔

یہاں ایک سطحی شبہ ہو سکتا ہے کہ مسلمانوں، یہودیوں اور عیسائیوں کے دین میں تو باہم بہت کچھ اختلاف ہے تو پھر قرآن سب کی تصدیق کیسے کرتا ہے۔

یہ شبہ حقیقت میں بالکل بے بنیاد ہے اور اسی شخص کے ذہن میں آسکتا ہے جس نے قرآن کا مطالعہ نہ کیا ہو بلکہ صرف یہ سُن لیا ہو کہ قرآن ان سب کے دین کی تصدیق کرتا ہے۔ قرآن کہیں بھی ان مذاہب کی موجودہ شکلوں کی تصدیق نہیں کرتا۔ بلکہ وہ کہتا ہے کہ اللہ نے ان سب کے پاس وہی دین بھیجا تھا جو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ بھیجا ہے (پڑھیے سورہ شوریٰ کی وہ آیت جو اوپر گزری شرع لکم من الدین ما وصّی بہ نوحاً الخ) مگر انھوں نے اسکو اصل حالت میں قائم نہیں رکھا جس سے قدرتی طور پر مذاہب کی الگ الگ صورتیں بن گئیں اور لوگ ان کو لے کر ٹکڑیوں میں بٹ گئے۔

فَرَّقُوْا دِيْنَهُمْ وَكَانُوْا شِيَعًا كُلُّ حِزْبٍ بِمَا لَدَيْهِمْ فَرِحُوْنَ۔ (الروم۔ ع ۴)

انھوں نے (ایک ہی) دین کے الگ الگ کئی دین بنا لیے اور ان کے مختلف (مذہبی) گروہ بن گئے۔ ہر گروہ کا یہ حال ہے کہ جو کچھ ان کے پاس ہے وہ اسی میں مگن ہے۔

پھر اس دین کی اصلیت اور اختلاف باہمی کی وجہ بتلاتا ہے۔

اِنَّ الدِّيْنَ عِنْدَ اللّٰهِ الْاِسْلَامُ وَمَا اخْتَلَفَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ اِلَّا مِنْ بَعْدِ مَا جَآءَهُمُ الْعِلْمُ بَغْيًا بَيْنَهُمْ۔ (آل عمران۔ ع ۲)

دین اللہ کے یہاں (معتبر) صرف اسلام ہے اور یہ جو اہل کتاب کا باہمی اختلاف ہو یہ اس حقیقت سے واقف ہو جانے کے باوجود ہوا صرف آپس کی ضد میں!

قرآن ان مذاہب کی موجودہ صورتوں کو "اسلام" نہیں سمجھتا۔ بلکہ ان سب کو کفر و شرک کے اقسام قرار دیتا ہے اور مسلمانوں کو ان کے پیروؤں کا طریقہ اختیار کرنے سے بچنے کا حکم دیتا ہے۔

وَلَا تَكُوْنُوْا مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ مِنَ الَّذِيْنَ فَرَّقُوْا دِيْنَهُمْ۔ الآیہ۔

اور تم نہ ہو جاؤ مشرکین میں سے، ان میں سے جنھوں نے دین کی الگ الگ صورتیں بنالیں

(الروم۔ ع ۴) (اور اصل دین کو گم کر دیا)

پھر قرآن اصل دین کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ اسکی اصلی صورت میں پیش کرتا ہے اور اہل کتاب کو یاد دلاتا ہے کہ دیکھو یہی تمہاری متاع گم گشتہ ہے "اُ اسکو مضبوطی سے پکڑ" لو اگر تم اپنی اصل پر آجاؤ گے تو دیکھو گے کہ تمہارے اور مسلمانوں کے درمیان کوئی اختلاف نہیں ہے۔

الغرض یہ خیال سراسر بے بنیاد ہے کہ قرآن ان مذاہب کی موجودہ شکل میں بھی تصدیق کرتا ہے قرآن نے اس مغالطے کے لیے کوئی گنجائش نہیں چھوڑی ہے لہذا اس تصدیق کی بنیاد پر ایک سے زیادہ ادیان کے حق ہونے کا نظریہ ثابت نہیں ہو سکتا۔ بلکہ قرآن کا کھلا ہوا نظریہ اس بارے میں یہی رہتا ہے کہ دین حق اور اللہ کے یہاں مقبول صرف ایک ہے اور وہ ہے ایمان باللہ، ایمان بالآخر اور عمل صالح لیکن مطلق ایمان اور مطلق عمل صالح نہیں کہ اس کا جو تصور بھی آپ قائم کر لیں اور اس کے مطابق جو شکل بھی آپ اسکو دیدیں وہ دین حق ہی ہے جیسا کہ قائلین وحدت ادیان کو سورۂ بقرہ کی اس آیت سے دھوکا ہوا ہے جو ابتدائے مضمون میں اُن کے استدلال کے طور پر پیش کی گئی ہے۔

(ان الذین آمنوا والذین ھادوا الخ)

بلکہ اس کا ایک خاص مطلب ہے جس کے بغیر یہ مقبول نہیں ——— اور وہ یہ ہے کہ اللہ کے سوا کسی کی بندگی نہ کی جائے، کسی چیز کو اللہ کا شریک نہ ٹھہرایا جائے اور کسی انسان کو رب کا درجہ نہ دیا جائے ——— یہی وجہ ہے کہ اہل کتاب کے پاس "ایمان" اور "عمل صالح" جس شکل میں موجود تھا قرآن نے اسکو غلط ٹھہرایا اور اسکو بدلنے پر اصرار کیا۔ علیٰ ھذا مشرکین عرب بھی خدا کو مانتے تھے اور اپنے خیال کے مطابق اسکی خوشنودی کے لیے "عمل صالح" بھی کرتے تھے مگر قرآن اس من مانی خدا پرستی پر راضی نہ تھا اس کے نزدیک خدا پرستی کی مقبول صورت صرف وہی ہے جو بیان کی گئی اس کو وہ مختصر الفاظ میں "الدین الخالص" کہتا ہے چنانچہ مشرکین کے معاملہ میں بھی صاف ارشاد ہے:۔

الا للہ الدین الخالص والذین اتخذوا من دونہ اولیاء ما نعبدھم الا لیقربونا الی اللہ زلفیٰ ان اللہ یحکم بینھم فیما ھم فیہ یختلفون۔ (الزمر۔ ع ۱)	خوب سمجھ لو کہ اللہ کے لیے سزاوار ہے آمیزش بندگی اور جن لوگوں نے ٹھہرا لیے ہیں اس سے ورے کچھ معبود (کہتے ہیں) کہ ہم ان کو صرف واسطے پوجتے ہیں کہ یہ ہمیں اللہ سے قریب کر دیں تو اللہ فیصلہ کرے گا ان کے ان جھگڑے کا۔

لہٰذا ایک مسلمان کے لیے اب کوئی شبہ نہیں رہ جاتا کہ دیوی دیوتاؤں کی پرستش کے ساتھ (چاہے یہ پرستش خدا کے قرب کے حصول ہی کی نیت سے کیوں نہ ہو) خداپرستی کا دعویٰ بالکل قابل قبول نہیں اور ایسے "ایمان" اور "عمل صالح" سے رضائے الٰہی کے حصول کی توقع ایک خواب پریشاں سے زیادہ کوئی حقیقت نہیں رکھتی۔

اب تک بحث سے جو باتیں ثابت ہوئیں وہ خلاصہ کے طور پر یہ ہیں۔

۱۔ دین حق ایک ہے متعدد نہیں۔

۲۔ اللہ کے تمام پیغمبروں نے مختلف زمانوں اور مختلف قوموں میں اسی ایک دین کی دعوت دی۔

۳۔ دین میں جو تعدد پیدا ہوا ہے وہ اللہ اور اس کے رسولوں کا پیدا کردہ نہیں ہے بلکہ انسانی آمیزشوں کا پیدا کردہ ہے۔

۴۔ ان آمیزشوں کے ساتھ دین، وہ دین نہیں جو اللہ کے یہاں مقبول اور موجب نجات ہو۔

۵۔ رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے جو دین پیش کیا وہی ہمیشہ کا مقبول دین ہے اور انسانی آمیزش سے پاک کرکے اس کے اصلی رنگ میں پیش کیا گیا ہے اور وہ رنگ توحید خالص ہے۔

پس ظاہر ہے کہ جس دین میں توحید خالص کا رنگ نہ ہو وہ دین اللہ کے یہاں مقبول نہیں ہو سکتا۔

اب ایک سوال یہ کیا جا سکتا ہے کہ اچھا اگر توحید کی اس کسوٹی پر کس کر تمام مذاہب کے پیرو اپنے مذاہب کو آمیزشوں سے پاک کر دیں لیکن عملی زندگی میں دین کے تقاضے پورے کرنے کے لیے اپنے قدیم دستور العمل پر کاربند رہیں یعنی شریعت محمدی کا اتباع نہ کریں تو کیا وہ فلاح یاب ہو سکتے ہیں؟

اس سوال کے متعلق پہلی بات تو یہ ہے کہ یہ سوال صرف ان لوگوں کے حق میں کیا جا سکتا ہے جس کے متعلق یقینی طور پر معلوم ہو کہ ان کا تعلق کبھی اللہ کے کسی پیغمبر سے رہا ہے یعنی وہ زمانہ قدیم میں کسی نبی برحق کے متبع رہے ہیں، جن لوگوں کے متعلق یہ بات یقینی طور پر معلوم نہ ہو سکے اُن کے متعلق اس کا کوئی سوال ہی نہیں کیونکہ جب یہی نہیں معلوم کہ یہ کسی نبی کے متبع تھے بھی تو اس کا کیسے یقین ہو سکتا ہے کہ ان کا مذہبی دستور العمل بھی کوئی آسمانی شریعت ہے کیونکہ آسمانی شریعت تو نبی کے ذریعہ ہی مل سکتی ہے، پس، اب یہ سوال صرف اُن لوگوں کے حق میں رہ جاتا ہے جن کا کسی نبی سے تعلق ہونا یقینی طور پر معلوم ہے جیسے یہود و نصاریٰ کہ ان کے اس تعلق کی خبر خود قرآن دیتا ہے۔ پھر ان کے بارے میں بھی یہ سوال جب قائم رہتا ہے جبکہ یہ ثابت ہو جائے کہ ان کے پاس جو مجموعہ احکام شریعت کے نام سے ہے وہ بعینہ وہی ہے جو ان کے نبی کے ذریعہ انھیں دیا گیا تھا۔ اگر اسمیں شبہ ہے

تو پھر ان لوگوں کے حق میں بھی یہ سوال قائم نہیں رہتا اور آج یہ بات پوری طرح ثابت ہو چکی ہے کہ کسی سابقہ شریعت کے متعلق اس کی اصلی حالت میں ہونے کا دعویٰ نہیں کیا جا سکتا ـــــ اس تنقیح کے بعد یہ سوال صرف نظری رہ جاتا ہے کہ بالفرض اگر کوئی سابقہ شریعت من وعن موجود ہو یا اس کا کسی طور پر غیر محرف طور پر موجود ہونا ثابت ہو جائے تو پھر کیا حکم ہے؟ ہم کہیں گے اس سوال کا جواب نفی میں ہے ـــ اور جو لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ قرآن شریعت محمدی کے اتباع پر زور نہیں دیتا وہ غلط سمجھتے ہیں ـــ کیوں؟ اس لیے کہ جو نبی جن لوگوں کی طرف بھیجا جاتا ہے ان کے لیے اس کی مکمل اطاعت اور اس کے طریقہ کا اتباع لازم ہوتا ہے چنانچہ قرآن کہتا ہے:-

ما ارسلنا من رسول الّا لیطاع	اور ہم نے کوئی رسول ایسا نہیں بھیجا جس سے مقصود
باذن الله۔ (النساء ع ۹)	یہ حکم نہ ہو کہ اس کی اطاعت کی جائے

اب اگر قرآن سے یہ ثابت ہو کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کسی خاص وقت یا کسی خاص انسانی گروہ تک محدود نہ تھی بلکہ قیامت تک ساری دنیا کے لیے تھی تو پھر خود بخود آپ کی اطاعت کامل سب پر واجب ہو جاتی ہے۔ اور کسی دوسری اطاعت کا سوال نہیں رہتا۔

قرآن اس بارے میں صاف شہادت دیتا ہے کہ:-

وما ارسلنٰك الّا كافّةً للنّاس	اور (اے محمد) بلا شبہ تمہاری رسالت کل عالم
الآیہ (السبا۔ ع ۳)	انسانی کے لیے ہے۔

یہ قرآن چند مقدمات کے نتیجے کے طور پر ثابت ہوا ـــ اور یہ ثبوت بھی قطعی ہے لیکن اگر صراحت چاہی جائے جس میں صاف طور پر یہ کہا گیا ہو کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع ضروری ہے تو یہ صراحت بھی سنیئے۔

قل یاایها النّاس انّی رسول الله الیکم	(اے محمد) کہو کہ اے لوگو میں اللہ کا فرستادہ
جمیعا الذی له ملك السمٰوٰت و	ہوں تم سب کی جانب وہ اللہ جس کی حکومت
الارض لا الٰه الا هو یحی ویمیت فآمنوا	ہے آسمان و زمین پر کوئی معبود نہیں بجز اس
بالله ورسوله النبی الامی الذی	کے وہی جلاتا ہے اور مارتا ہے۔ سو تم مانو اللہ کو
یؤمن بالله وکلمٰته واتبعوه لعلکم	اور اس کے بھیجے نبی امی کو جو مانتا ہے اللہ کو اور
تهتدون	اس کے کلمات کو (یعنی اس کی سب کتابوں کو) اور
(الاعراف ع ۲۰)	اس کے قدم بقدم چلو تاکہ تم راہ پا جاؤ۔

دو ٹوک انداز میں کہا جا رہا ہے کہ ہدایت پانی دو چیزوں پر موقوف ہے۔ ایک اللہ اور نبی امی پر ایمان اور

دوسرے اس نبی کی اتباع۔ پھر یہ صرف لامذہبوں اور پشتینی مشرکوں سے نہیں کہا جا رہا ہے بلکہ خاص طور پر اس کے مخاطب وہ لوگ ہیں جن کو قرآن خود اہل کتاب کہتا ہے کیونکہ اس سے پہلی آیتوں میں مسلسل انہیں کا تذکرہ چلا آ رہا ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنی امت کے لیے رحمت حق کی دعا کی تو اللہ تعالیٰ نے چند شرائط کے ساتھ رحمت کا وعدہ کیا ان میں سے ایک شرط یہ تھی (تمہاری امت میں سے رحمت کے مستحق وہ لوگ ہوں گے جو) اس نبی امی کا اتباع کریں جس کا ذکر ان کے پاس تورات و انجیل میں موجود ہے اور اس کی یہ علامتیں ہیں اس کے بعد پھر حاصل کلام کے طور پر یہ بات کہی گئی کہ جو اس کو مانیں گے اس کی رفاقت و نصرت کریں گے اور اس کی کتاب و شریعت کی روشنی میں ایمان کے تقاضے پورے کریں گے ______ فلاح انہی لوگوں کا حصہ ہے۔ یہاں تک گویا اللہ نے اہل کتاب کو یاد دلایا کہ ہمارے تمہارے درمیان یہ وعدہ تھا ___ اس کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے کہلوایا جاتا ہے کہ اللہ کا یہ وعدہ اب بھی قائم ہے اب وقت آ گیا ہے اس شرط کے پورا کرنے کا۔

الغرض ہم یہ کہنا چاہتے ہیں کہ مذکورہ بالا آیت میں "الناس" کے دائرہ عموم میں تو اہل کتاب آتے ہی ہیں مگر وہ خاص طور سے بھی پیش نظر ہیں اور اس کا بہت واضح قرینہ یہ ہے کہ انہیں "آمنوا باللہ و رسولہ" کہنے پر اکتفا نہیں کیا گیا بلکہ رسول کی صفت میں النَّبِیَّ الاُمِّیَّ کا اضافہ کیا گیا اس اضافہ کا مقصد بجز اس کے اور کیا ہو سکتا ہے کہ "الناس" میں سے جو اہل کتاب ہیں ان کا ذہن اس طرف منتقل کرایا جائے کہ جس رسول کی تصدیق اور اتباع کا مطالبہ کیا جا رہا ہے یہ وہی رسول ہے جس کی تصدیق اور جس کے اتباع کو ان کے استحقاق رحمت و فلاح کی شرط قرار دیا گیا تھا کیونکہ اس شرط میں بھی اس رسول کی یہی صفت بیان کی گئی تھی ___ بہتر یہ ہے کہ جن آیتوں کا تذکرہ کیا جا رہا ہے آپ ان کو خود ملاحظہ فرما لیں کہ یہ اس امر میں انتہائی تشفی بخش ہیں۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کی جس دعا کا ذکر کیا گیا ہے اس کے جواب میں اللہ تعالیٰ کے ارشاد کو قرآن یوں بیان کرتا ہے۔

قَالَ عَذَابِیٓ اُصِیْبُ بِهٖ مَنْ اَشَآءُ ۚ وَرَحْمَتِیْ وَسِعَتْ كُلَّ شَیْءٍ ؕ فَسَاَكْتُبُهَا ..... الَّذِیْنَ یَتَّقُوْنَ وَیُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَالَّذِیْنَ هُمْ بِاٰیٰتِنَا یُؤْمِنُوْنَ ۚ الَّذِیْنَ یَتَّبِعُوْنَ الرَّسُوْلَ النَّبِیَّ	فرمایا اللہ تعالیٰ نے کہ میرا عذاب جو ہے سو وہ واقع کرتا ہوں (خاص طور پر) اسی پر جس کو میں چاہتا ہوں اور رحمت میری سو وہ ہر چیز کو شامل ہے پس میں قطعی طور پر لکھ دوں گا رحمت ان لوگوں کے لیے جو میرا لحاظ کریں گے اور زکوٰۃ دیں گے۔

الامی الذی یجدونہ مکتوبًا
عندھم فی التوراۃ والانجیل ز
یامرھم بالمعروف وینھٰھم
عن المنکر ویحل لھم الطیبٰت
ویحرم علیھم الخبٰئث ویضع عنھم
اصرھم والاغلٰل التی کانت علیھم
فالذین اٰمنوا بہ وعزروہ و
نصروہ واتبعوا النور الذی
اُنزل معہ اولٰئک ھم المفلحون۔
(الاعراف۔ ع ۱۹)

اور پر ہماری باتوں پر یقین کریں گے (یعنی) وہ
لوگ جو اللہ کے بھیجے اس نبی امی کا اتباع کریں
گے جس کو وہ اپنے پاس توراۃ و انجیل میں لکھا
ہوا پائیں گے جو انھیں حکم کرے گا پسندیدہ باتوں
کا اور روکے گا ناپسندیدہ باتوں سے اور حلال
کرے گا ان کے واسطے سب پاک چیزیں اور
حرام کرے گا ناپاک چیزوں کو اور وہ بوجھ اور
پھندے ان پر سے اتار کر الگ کرے گا جن
میں وہ دبے ہوئے اور پھنسے ہوئے ہوں گے۔
(الحاصل)

جو اس پر ایمان لائے اور اس کی رفاقت کی اور اسکی مدد کی اور اتباع کیا اس نور (ھدایت کا) جو اس کے ساتھ اتارا گیا ہے بس وہی لوگ ہوں گے کامیاب اور بامراد ہونے والے یہی وہ آیات ہیں جن کا خلاصہ ہم نے اوپر بیان کیا تھا اور انھیں کے بعد متصلاً وہ آیت شروع ہو جاتی ہے جو ان سے پہلے نقل کی گئی۔ یہ ۱۹ویں رکوع کی آخری آیات ہیں اور وہ ۲۰ویں رکوع کی پہلی آیت اس کے بعد کون کہہ سکتا ہے کہ شریعت محمدی کے اتباع کے بغیر نجات و فلاح کی امید رکھنا کسی دیوانے کے خواب سے زیادہ اہمیت رکھتا ہے۔ یہ امر و نہی تحلیل و تحریم شریعت ہی کے تو عناصر ہیں جنھیں نبی امی کے لیے ثابت کرنے کے بعد کہا جا رہا ہے۔ فالذین آمنوا بہ واتبعوا النور الذی انزل معہ اولٰئک ھم المفلحون جب مصدق اہل کتاب تک کو اتحاد فی الدین کافی نہیں ہے بلکہ اتباع شریعت بھی ضروری ہے تو پھر وہ لوگ کس شمار و قطار میں ہیں جن کا اہل کتاب ہونا بھی غیر مصدق ہے۔

بات گو بالکل صاف ہو چکی ہے مگر بعض آیتیں اب بھی ایسی ہیں جن سے کسی کو شبہ پیدا ہو سکتا ہے یا مغالطہ دیا جا سکتا ہے ان میں سے زیادہ اہم سورۂ مائدہ کی ایک آیت ہے۔ بہتر ہے کہ اس کو بھی صاف کر دیا جائے۔

فرمایا گیا ہے

لِکُلٍّ جَعَلْنَا مِنْکُمْ شِرْعَۃً وَّ — تم میں سے ہر ایک کے لیے ہم نے (عمل کا)

مِنْهَاجًا ۚ وَلَوْ شَاءَ اللَّهُ لَجَعَلَكُمْ أُمَّةً وَاحِدَةً وَلَٰكِن لِّيَبْلُوَكُمْ فِي مَا آتَاكُمْ ۖ فَاسْتَبِقُوا الْخَيْرَاتِ الخ (مائدہ - ع ۷)

ایک ضابطہ اور طریقہ بنایا، اور اللہ اگر چاہتا تو یہ ہو سکتا تھا کہ تم سب کو ایک ہی امت بنا دیتا مگر ایسا نہ کرنے میں ایک حکمت یہ بھی تھی کہ اپنے احکام میں تمہاری آزمائش کرے۔ پس سبقت کرو بھلائیاں قبول کرنے میں۔

اس سے بھی بعض لوگ فائدہ اٹھاتے ہیں، اور یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ تمام انسانوں کے لیے ایک ہی شریعت کی پابندی ضروری نہیں ہے، بلکہ خود خدائے تعالیٰ ہی الگ الگ شریعتیں اور الگ الگ امتیں دکھنا چاہتا ہے ــــ لیکن یہ محض غلط فہمی ہے، اور آیت کا مقصد قطعاً یہ نہیں ہے، جو ان لوگوں نے سمجھا ہو یہ آیت دراصل ماقبل کی آیات سے پیدا ہونے والے ایک سوال کا جواب ہے۔ لہٰذا ہمیں یہ دیکھنا چاہیے کہ ماقبل میں کیا کہا جا رہا ہے اور اس سے کیا سوال پیدا ہوتا ہے۔

ماقبل میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ کہا جا رہا ہے کہ اگر اہل کتاب آپ سے کسی معاملے میں حکم دریافت کریں (جیسا کہ یہود نے زنا کی سزا کے بارے میں پوچھا تھا) تو آپ وہی حکم بتلائیں جو ہماری طرف سے آپ کو دیا گیا ہو، یعنی قرآن کے مطابق فیصلہ کریں. کیونکہ ہر کتاب کا ایک دور ہوتا ہو جس میں اسی (کتاب) کے مطابق فیصلہ کرنا ضروری ہوتا ہے. ہم نے جب توراۃ نازل کی تو انجیل کے نازل کرنے تک ہمارا حکم یہی تھا کہ اس کے احکام پر عمل کیا جائے، چنانچہ جو فرمانبردار تھے وہ اسی کے مطابق عمل کرتے رہے اس کے بعد ہم نے (حضرت) عیسیٰ کو انجیل دے کر بھیجا تو اسی قدیم دستور کے مطابق حکم یہ تھا کہ احکام انجیل کی پابندی کی جائے. اور اب آپ کو قرآن دے کر بھیجا ہے تو ٹھیک اسی دستور کے مطابق اب ہمارا حکم یہ ہے کہ ہر معاملے کا فیصلہ قرآن کے مطابق کیا جائے (اور بعد والی کتاب کا مقصد جہاں کچھ نئے احکام دینا ہوتا ہے وہاں اس سے پہلی کتابوں کے ان احکام کی تجدید بھی مقصود ہوتی ہے جن میں اہل کتاب تحریف کرنے لگتے ہیں) قرآن کی بھی بہت سی ہدایات اور بہت سے احکام وہی ہیں جو کتب سابقہ میں تھے، مگر جب ان کتابوں کے امین ان میں بددیانتی کرنے لگے تو پھر اب ان کتابوں پر اعتماد نہیں کیا جا سکتا، اور ضروری ہو کہ ہدایات الٰہی کی امانت اب ازسرنو دوسرے لوگوں کے سپرد کی جائے چنانچہ قرآن کی امانت کے لیے سابقہ اہل کتاب کو چھوڑ کر ایک نئی امت کا انتخاب کیا گیا) پس اب ہر حکم کے حق و باطل ہونے کا معیار قرآن کی مطابقت ہے، جو حکم قرآن کے مطابق ہو وہ حق ہو، یعنی اللہ کا حکم ہے اور جو قرآن کے مطابق نہیں ہے وہ باطل یعنی غیر اللہ کا حکم ہے چاہے وہ حکم توریت کے ٹھیک

دین یا انجیل کے؟ ــــــ یہ ہے ان آیات کا ذرا تفصیلی مطلب جو زیر بحث آیت کے ماقبل کی ہیں ــــ اس پر اہل کتاب کی طرف سے یہ کہا جا سکتا تھا کہ ہم (یعنی اہل کتاب) اگر پوری دیانتداری کے ساتھ کتب سابقہ کے احکام و ہدایات کو پیش کرنے لگیں تب بھی تو قرآن سے پوری مطابقت نہیں ہو سکتی، کیونکہ اسمیں کتنے ہی احکام بدل کر نئے احکام رکھے گئے ہیں، ہم اپنی پہلی کتاب اور پہلی شریعت کو کیسے چھوڑ دیں حالانکہ وہ بھی ــ منجانب اللہ ہے اور ہم اپنے کو (حضرت) محمد کے لائے ہوئے احکام کا کیسے پابند بنائیں جبکہ ان کے احکام ہماری قدیم شریعت سے کبھی مختلف بھی ہوتے ہیں؟

اس سوال کا جواب دیا گیا لِكُلٍّ جَعَلْنَا مِنكُمْ شِرْعَةً وَمِنْهَاجًا الخ۔ یعنی بیشک یہ بات ہے کہ تمہاری قدیم شریعتوں میں اور اس نئی شریعت میں کچھ فرق ہے، اور یہی نہیں بلکہ پہلی شریعتوں میں بھی خود آپس میں تھوڑا بہت اختلاف ہوا اور یہ اختلاف ہمارا ہی رکھا ہوا ہے لیکن اس فرق و اختلاف کی دلہ بہت سی وجوہ و مصالح کے علاوہ ایک بڑی حکمت یہ ہے کہ ہر بعد والی شریعت کے ذریعہ پہلی شریعت والوں کا امتحان ہو جاتا ہے، یعنی یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ کون لوگ اس شریعت کی پابندی خدا پرستی کے جذبے سے کر رہے ہیں اور کون لوگ آبا پرستی کے جذبے سے، جو خدا پرستی کے جذبے سے کرتے ہیں وہ یہ معلوم ہونے کے بعد کہ اب خدا کا حکم یہ ہے، اس کے سامنے سر تسلیم خم کر دیتے ہیں، اور یہ سوال نہیں اٹھاتے کہ ہمارے پاس جو اللہ کا حکم سابق ہو جس پر ہمارے باپ دادا چلتے رہے ہیں وہ اس سے مختلف ہو، اس لیے کہ اطاعت و فرمانبرداری کی روح یہی ہے کہ جس وقت جو حکم دیا جائے بے چون و چرا مان لیا جائے، کل یہ حکم تھا کہ نماز میں رُخ بیت المقدس کی طرف کیا جائے تو اس پر عمل تھا، اور آج اگر یہ حکم ہے کہ بیت المقدس کے بجائے مکہ کے بیت اللہ کی طرف کیا جائے تو بلا تامل اس پر عمل ہو جائے، اور جن لوگوں کی اطاعت میں خدا پرستی کی روح کے بجائے آبا پرستی کی روح آجاتی ہے وہ یہ کہہ کہہ کر کہ ہمارے پاس تو اللہ کا حکم یہ ہے نئے احکام سے روگردانی کرتے ہیں، لیکن ان کی یہی ضد یہ بتلا دیتی ہے کہ ان کو اپنی پہلی شریعت پر اصرار صرف اس لیے ہو کہ یہ ان کے باپ دادا کے زمانہ کی شریعت ہے، نہ اس لیے کہ یہ خدا کا حکم ہے، اور نئی شریعت سے انکار اس لیے ہو کہ اس کے پیش کرنے والے ان میں سے نہیں ہیں، کیونکہ اگر یہ حکم کے بندے ہیں تو پھر اس بارے میں اطمینان کے بعد کہ نئے احکام اللہ ہی کی طرف سے ہیں، کسی بھی حکم پر سمعنا و اطعنا کہنے میں پس و پیش نہ ہونا چاہیے، ــــــ بس یہ مطلب ہے اس آیت کا جس میں کہیں سے بھی وہ بات نہیں نکلتی جو بعض لوگ سمجھتے ہیں۔

بے شک اگر آیت کا صرف اتنا ہی حصہ پڑھا جائے "لِكُلٍّ جَعَلْنَا مِنكُمْ شِرْعَةً وَمِنْهَاجًا وَلَوْ شَاءَ اللَّهُ لَجَعَلَكُمْ أُمَّةً وَاحِدَةً" تو یہ بات نکل سکتی ہے لیکن اگر اس کے آگے "وَلَكِن لِّيَبْلُوَكُمْ

فی ما آتٰکم فاستبقوا الخیرات بھی پڑھ لیا جائے اور ساتھ ہی چند پہلی آیات پر بھی نظر ڈال لی جائے تو پھر بات بالکل دوسری ہو جائے گی، اور وہ نتیجہ نکلے گا جو ہم عرض کر چکے ہیں یعنی یہ آیت شریعت محمدی کے بعد بھی سابقہ شرائع پر عمل کی سند نہیں دے رہی ہے، بلکہ صرف اس اختلاف کی توجیہہ کر رہی ہے جو ان شرائع کے درمیان واقعی طور پر پایا جاتا ہے، اور وہ توجیہ ہے امتحان و آزمائش! ــــ ظاہر ہے کہ یہ آزمائش اسی صورت میں ہو سکتی ہے کہ سابقہ شرائع والوں کو نئی شریعت کے اتباع کا حکم دیا جائے، پس اس آزمائش سے کامیاب ہو کر نکلنے کی تنہا یہی سبیل ہے کہ جس وقت جو حکم مل رہا ہے اس پر سر جھکا دیا جائے، جو کام جس طرح سے کرنے کے لیے کہا جا رہا ہے وہ اپنی قدیم عادت اور خواہش کے علی الرغم ویسے ہی کیا جائے ــــ یہی خدا پرستی ہے، یہی نیکی ہے، اور یہی خیر ہے! "فاستبقوا الخیرات" (پس سبقت کرو نیکیوں اور بھلائیوں کی طرف!)

اس آیت کے بارے میں تو غالباً اب کوئی شبہ نہیں رہا ہوگا، لیکن قرآن کا یہ انداز کلام جو اس آیت میں بعض لوگوں کے لیے اس غلط فہمی کا باعث ہوا کہ قرآن کسی ایک شریعت کی پابندی تمام اقوام عالم پر لازم نہیں کرتا، یہ اسی آیت تک محدود نہیں ہے، بلکہ قرآن میں متعدد جگہ یہی انداز کلام اختیار کیا گیا ہے، مثلاً:

(۱) وَلِكُلٍّ وِجْهَةٌ هُوَ مُوَلِّيهَا فَاسْتَبِقُوا الْخَيْرَاتِ (سورۂ بقرہ ع ۱۳)	(۱) ہر ایک گروہ کے لیے ایک سمت ہے جس کی طرف وہ (عبادت میں) رخ کرتا ہے، پس سبقت کرو بھلائیوں میں۔
(۲) لَيْسَ الْبِرَّ أَنْ تُوَلُّوا وُجُوهَكُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ وَلَٰكِنَّ الْبِرَّ مَنْ آمَنَ بِاللَّهِ الخ (سورۂ بقرہ ع ۲۲)	نیکی اسی میں نہیں رکھی گئی ہے کہ تم اپنا رخ پورب یا پچھم کی طرف کرو، بلکہ نیکی کا مدار ایمان اور اعمال صالحہ پر ہے۔

پس ان آیات سے بھی کچھ ایسا ہی مطلب سمجھا جا سکتا ہے، اگر سیاق و سباق کو نظر انداز کر دیا جائے۔ ان تمام مقامات کے لیے یہ ایک اصولی نکتہ سمجھ لینا چاہیے کہ اس قسم کا انداز گفتگو جہاں کہیں اختیار کیا گیا ہے، وہاں مخالفین اسلام کے اس اعتراض پر تنبیہ مقصود ہے کہ کیونکر اللہ کے رسول ہیں قرآن کے اندر اور پیروؤں کے بعض وہ طریقے دوسرے انبیاء اور ان کی امتوں سے کیوں مختلف ہیں؟ ــــ چنانچہ مختلف مواقع پر مختلف عنوانات سے یہ بات کہی گئی کہ یہ انداز فکر بالکل غلط ہے، دیکھنے کی جو چیز ہے وہ یہ ہے کہ دعوت، ایمان و عمل صالح کی ہے یا نہیں۔

(ب) بعض اعمال کی خاص شکل و صورت جو بعض مصلحتوں اور حکمتوں کے پیش نظر کسی قوم کے لیے مقرر کر دی جاتی ہے اور کسی کے لیے کچھ اشکال منسب ہیں، قابل لحاظ ہے، جس سے مذکورہ بالا دونوں آیتیں متعلق ہیں۔

(باقی ۱۸۶ پر ملاحظہ ہو)

حق و اعتدال کی راہ
افراط و تفریط اور انحراف

ڈاکٹر احمد حسین کمال بھوپالی (پاکستان) (شائع شدہ الفرقان محرم ۱۳۷۸ھ اگست ۱۹۵۸ء)

اسلام کی جدید تعبیر و تشریح

——— اپنی انتہا میں

اس صدی کے اوائل میں دین سے متعلق جن فکری گمراہیوں کا آغاز ہوا، ان میں سب سے بڑی گمراہی، عقلیت پرستی کا رجحان تھا، جو انیسویں صدی کے یورپ سے زور وشور کے ساتھ اٹھا، اور بعض مسلمان اہل قلم اس سے شدید طور پر متاثر ہوئے۔ ان صاحبان تحریر نے کوشش کی کہ اسلام اور اس کے معتقدات دینی کو کسی نہ کسی طرح عقلیت اور نام نہاد سائنس کے تابع کر دیا جائے۔ ہر چند کہ بعد میں عقلیت پرستی کا یہ طوفان اپنا اثر کھونے لگا۔ تاہم اس کی وجہ سے اسلام کی جدید تعبیر و تشریح کا ایک نیا اور گمراہ کن سلسلہ شروع ہو گیا، جو کسی نہ کسی صورت میں اب تک جاری ہے اور دنیا کی ہر نئی بات، نئی تجویز اور نئے نظریہ پر اسلام کو چسپاں کرنے کی جسارت عام ہو گئی۔ چنانچہ سیاست و معیشت کا ہر پردہ تصور اور تحریک جو اس عہد میں پیدا ہوئی اسلام کو اس کے مطابق بنانے کی سعی و کوشش ضرور کی گئی اور بعض فکر رس دماغوں نے اسلام کی دعوت و ہدایت و رضائے الٰہی کے نصب العین تک کو ایک نظام حکومت و سیاست یا نظریہ معیشت و عمرانیت بنا ڈالنے کی جد و جہد شروع کر دی، ابتداءً جب اس بارے میں انھیں ٹوکا گیا تو انھوں نے جواب دیا کہ یہ تو محض وقت کی زبان میں اسلام کی تشریح و توضیح ہے حالانکہ اس قسم کی تشریح و توضیح سے جن معنوی تحریفات کا اندیشہ تھا، اور جن کے مفاسد اب ظہور میں آنے لگے ہیں، انھیں ان جدید نقطہ ہائے نظر کے حاملین نے باوجود تنازعی کے یکسر نظر انداز کیے رکھا۔

نیتوں کا خلوص اور ارادوں کی معصومیت کسی غلط چیز کو صحیح نہیں بنا دیتی۔ یہ بنیادی ذہن جن غلط تصورات کے ساتھ ابھرا ہے، اپنی دیانت و صداقت کے باوجود مسلمانوں کے لیے ایک شدید فتنۂ آزمائش بن گیا ہے ایک طرف اس کا نو تجدید کے یہ دعوے ہیں کہ وہ اسلام کا تنہا صحیح ترجمان ہے اور اس کی تمام تر جد و جہد احیائے ملت

دین کی ہے اور زندگی کے ہر شعبہ اور ہر گوشہ میں اسلام کا نفوذ چاہتا ہے اور پوری انفرادی و اجتماعی زندگی کی تعمیر کتاب اللہ پر کرنا اس کا مقصود ہے، لیکن دوسری طرف جس گروہ بندانہ عصبیت کے ساتھ یہ ذہن اپنی اجتماعی تنظیم شروع کرتا ہے، وہ نہ صرف انسانیت کی ہی تقسیم کر ڈالتی ہے بلکہ مسلمانوں کو بھی دو متقابل گروہوں میں بانٹ دیتی ہے اور پھر یہ تقسیم رفتہ رفتہ مسلمانوں کے درمیان بھی حق و باطل کی تقسیم بن جاتی ہے۔ ساتھ ہی نیک و بد کی آویزش کو جس طرح یہ تعبیر کرتا ہے اس سے دینی خلوص کے بجائے ذاتی اور گروہی عصبیت کا جذبہ بیدار ہوتا ہے اور بسا اوقات شخصی اغراض، اسلامی مقاصد کے ساتھ اس طرح خلط ملط کر دیے جاتے ہیں کہ ان کے درمیان نہ صرف تمیز کرنا ہی مشکل ہوجاتی ہے بلکہ انجام کار شخصی اغراض کی کامیابی پر ہی اسلامی مقاصد کی کامیابی منحصر کردی جاتی ہے۔ پھر یہ کہ یہ ذہن اپنی پیش کردہ فکر کی انفرادیت کو برقرار رکھنے کیلئے ماضی وحال کے تمام افکار کی بے رحمانہ تنقید کرتا ہے اور دوسروں کی آراء کو جانچنے کے لیے ایک ایسا محدود اور تنگ سانچہ بنا لیتا ہے جس کے اندر کسی دوسرے کی رائے کے لیے کوئی گنجائش باقی نہیں رہ جاتی جب کہ اپنی آراء کے تبدیلیوں کے لیے اسی سانچے میں اتنی وسعتیں پیدا کرلی جاتی ہیں کہ ہر قسم کے تضادات بھی بیک وقت اس میں سمو دیے جاسکیں۔ اس طرز عمل کے جواز کے لیے حکمت عملی کا نام لیا جاتا ہے اور خدا اور رسول کی بخشی ہوئی بعض رخصتوں کو جو محض اضطراری اور انفرادی حالات کے لیے دی گئیں تھیں۔ اختیاری اور اجتماعی صورتوں کے لیے دلیل بنا کر پیش کر دیا جاتا ہے۔

کتاب وسنت کے معیار کے علاوہ "حکمت عملی" کا معیار جس کے لیے ضوابط و اصول کی کوئی حد مقرر نہیں کی جاسکتی، اور جو تمام تر شخصی و ذاتی فکر و رجحان کا تابع ہے اور جس کے ذریعہ دین و دنیا کی ہر چیز کو اسلام و حق کے نام سے رد و قبول کیا جاسکتا ہے، اس دور کی ایسی عظیم غلط فکری ہے جس کی اندیشناکیاں دور دور تک سرایت کئے ہوئے ہیں۔ کون کہہ سکتا ہے کہ آج کی حکمت عملی کے تقاضے، کل کی حکمت عملی کے تقاضوں کے ساتھ ہم آہنگ ہوسکتے ہیں، حکمت عملی صد فی صد ایک شخصی اور ذاتی چیز ہے اور ہر قسم کے طرز عمل کیلئے اگر ایک شخص کی عقل زرخیز ہو تو اسے دلیل جواز بنایا جاسکتا ہے۔

ہمیشہ ہی چھوٹی چھوٹی باتیں بڑے بڑے فتنوں کا سبب بنی ہیں، کتاب وسنت کے پہلو بہ پہلو جب کبھی دوسری بات کہی گئی وہ ابتدا میں بظاہر کتنی ہی غیر اہم اور حقیر معلوم ہوئی ہو آخر کار کتاب وسنت سے علیحدہ اپنی مستقل حیثیت اختیار کئے بغیر نہیں رہی اور بسا اوقات اس نے کتاب وسنت کو ہی اپنا تابع بنایا اس خطرناک حقیقت کی طرف جب ایسے قائدین ومفکرین کی توجہ منعطف کرانے کی کوشش کی جاتی ہے تو وہ اور ان کے متبعین بجائے ان باتوں کے متوقع خطرات محسوس کرنے، سمجھنے اور رجوع کرلینے

کے، اپنے دوسرے ناقابلِ اعتراض اقوال و افکار کو سامنے لاکر جواب اور صفائی کی ایسی مہم شروع کر دیتے ہیں جس میں تدلیس، اخفا، اور مغالطوں کی آمیزش کے علاوہ ٹوکنے والوں پر انشا پردازانہ گالیوں کی بہیم بوچھار ہوتی ہے تاکہ اصل حقیقت عوام کے نظروں سے مستور رہ جائے اور چونکہ ہر زمانے میں بعض وقتی اور ہنگامی مسائل کا زور ہوتا ہے۔ عوام و خواص کی بیشتر توجہ ان ہی مسائل میں الجھی رہتی ہے، اس لیے یہ حضرات بھی ان ہی مسائل پر اپنے زورِ فکر و بیان کی عمارت تعمیر کرتے ہیں اور یہ سمجھ لیتے ہیں کہ ان کی یہ خدمت انھیں ہر فکری و عملی لغزش سے غیر مسئول کر دے گی۔ حالانکہ اس کے ساتھ یہ بھی حقیقت ہے کہ ان ہی ہنگامی مسائل کے ہجوم و یورش میں، خطاؤں اور لغزشوں کے امکانات بہت زیادہ اور قوی تر ہیں اور ایسے ہی حالات میں کتاب و سنت بطریقِ سلف کو مضبوطی سے پکڑے رہنا ضلالت و گمراہی سے بچے رہنے کا واحد ذریعہ ہے۔

اواخر خلافتِ راشدہ میں، جس گروہ نے قرآن سے ماخوذ نعرہ "الحکم للہ" پر عامۃ المسلمین کے خلاف خروج کیا تھا، اُس نے اپنی فہم و فراست کے مطابق، غالباً نیک نیتی کے ساتھ ہی اس خروج اور نعرہ کو وقتی مسائل کا دینی حل سمجھا تھا، لیکن اُس دور کی سب سے زیادہ مستند اور محترم ہستی نے ان کے اس نعرہ کو مسترد کر دیا، حالانکہ آپ کو ان کی حمایت بھی حاصل ہو سکتی تھی۔

"قرآن مخلوق ہے" کا نظریہ جو بظاہر محض ایک علمی اور بے ضرر نظریہ نظر آتا ہے اور جسے ایک ایسے گروہ نے پیش کیا تھا جو بزعمِ خود، وقت کی زبان اور علمی سطح کے مطابق قرآن اور اسلام کی بہترین خدمات انجام دے رہا تھا اور دورِ حاضر کے متجددین تک کو جن کے افکار و استدلال سے گہری دلچسپی ہے اگر اس کے خلاف اُس زمانہ کا سب سے بڑا گوشہ نشین زاہد متقشف لب کشائی نہ کرتا اور انھیں نہ ٹوکتا تو آج دین کے جو صحیح خد و خال ہمارے سامنے موجود ہیں، خدا جانے تاویلات کے گورکھ دھندوں میں وہ اب تک کیا کیا بن چکے ہوتے۔ علیٰ ہذا القیاس ابتدائے اسلام سے سر سید احمد خاں مرحوم کے دورِ نیچریت اور مرزا غلام احمد صاحب کے دورِ تنبیت تک ایسے اصحابِ فہم و دانش کی ایک طویل فہرست تیار ہو سکتی ہے جن کی نیک نیتی اور جذبۂ خدمات تو مسلّم، لیکن اُن کے فکری لغزشوں کے ایک معمولی اقدام کی حوصلہ افزائی نے امتِ مسلمہ کے مستقبل پر نہایت اندوہناک اثر ڈالا۔ وہ گروہ مقدسین و زاہدین متقشف جن کی مخالفت کو اول اول ہمیشہ ریاکارانہ مذہبیت سے تعبیر کیا گیا۔ بالآخر مستقبل کے مورخ نے اُن کے ہی "فرمودہ" نقوش پر مہرِ تصدیق ثبت کی۔

بے لگام آزادیٔ افکار کے اس دور میں، آزادانہ انشا پردازی ہی شہرت و عظمت کا دا

ذریعہ ہے، چنانچہ انشاء پردازوں کا ایک گروہ جدید اسلام کو بھی اپنی قلموں کی جولانگاہ بنائے ہوئے ہے حتیٰ کہ آج کے جدید افسانوی ادیب نے بھی اُسے اپنی قلم کاریوں کا تختۂ مشق بنا رکھا ہے حالانکہ جو لوگ ادب پر گہری نظر رکھتے ہیں وہ سمجھ سکتے ہیں کہ دینی حقائق کے اظہار کے لیے شعر و افسانہ کا قلم ناموزوں ہی نہیں بلکہ گمراہ کن بھی ہے اور اسی لیے وحی الٰہی نے انبیاء و رسل کے شاعر و داستان گو ہونے سے بار بار اور بشدت انکار کیا ہے۔

آج کے مسلمانوں میں اسلام سے بغاوت کا جو ذہن جگہ جگہ پھیلا ہوا ہے غور کیجئے تو اس کا آغاز عقلیت پرستی کے رجحان سے ہی ہوا ہے۔ یہ رجحان ابتداء میں نہایت معصوم و بے ضرر نظر آتا ہے۔ اس کا پہلا مقصد اسلام اور جدید دور کے نظریات و تقاضوں میں موافقت پیدا کرنا تھا۔ موافقت پیدا کرنے کی یہ کوششیں کبھی جدید معلومات کو دین پر منطبق کرنے اور کبھی دین کو جدید معلومات پر منطبق کرنے میں صرف ہوتی رہیں اور رفتہ رفتہ وقت کے افکار سے اذہان مرعوب ہوتے رہے، دین کے اصولوں پر جدت کا رنگ چڑھنے لگا بغیر دین کی خدمت کا تصور دقیانوسی نظر آنے لگا۔ چنانچہ شارحین اسلام نے اپنی ہمہ دانی کے زعم میں اسلام کو جدید نظریات و افکار کا ملغوبہ بنا ڈالا۔ ایک ایسا دین جو خالص ایمان و عمل کا دستور العمل تھا، جس پر وقت و ماحول کی کسی حد بندی کا اطلاق نہیں ہو سکتا تھا اور جس کی قوت فعالیہ انسانی زندگی کے حال کو آخرت کے مستقبل سے وابستہ کر دینے والی تھی۔ وہ ان نئے اسلام کے خیر خواہوں کی بدولت کبھی محض ایک نظام سیاسی کی صورت میں نظر آتا ہے کبھی ایک نظام عسکری کی شکل میں، کبھی نظام معاشی کے رنگ میں تو کبھی نظام اقتصادی کے لباس میں اور بعضوں نے اسے محض ایک نظام حکمرانی کا خاکہ بنا کر پیش کر رکھا ہے اور اب ایک اور نیا ذہن اس دعوے کے ساتھ نمودار ہو رہا ہے کہ اسلام بھی موجودہ دور کے ملکی، عدالتی اور بین الاقوامی قسم کے قوانین رکھنے والا مجموعۂ دستور و آئین ہے، جسے ہم آج کی قانونی موشگافیوں کی جگہ قائم کر سکتے ہیں۔

الغرض مسلمانوں کی تاریخ میں ایک ایسا گروہ برابر پیدا ہوتا رہا ہے، جس نے اسلام کی خدمت اسی میں سمجھی ہے کہ وقت کے علمی، سیاسی اور عمرانی نظریات کو جوں کا توں قائم رکھتے ہوئے اور ان میں سے کسی ایک یا سب کو معمولی ترمیم کے ساتھ اپنا کر اسلام کی شکل دے دی جائے اور افسوس یہ ہے کہ وقت کا ایک بڑا قابل قدر گروہ جو اس ذہن سے لڑتا ہوا اٹھا تھا اس میں چونکہ خود جدت کا مادہ تھا، اس لئے تھوڑی دور چلنے کے بعد اب وہ خود بھی اسی راہ پر چل نکلا ہے۔ یہ لوگ اب اسلام کو جمہوریت کی تکمیل، مملکت کی تعمیر، سیاست کی تنظیم اور امارت و سیادت کی تشکیل کا ذریعہ بنا دینا چاہتے ہیں، اگرچہ وہ

(باقی صـ ۱۲۲ پر ملاحظہ ہو)

ڈاکٹر احمد حسین کمال بھوپالی (پاکستان)

دین و اقتدار

(شائع شدہ الفرقان ربیع الثانی ۱۳۷۸ھ مطابق نومبر ۱۹۵۸ء)

"اسباب زوال امت" قریباً سو ڈیڑھ سو سال سے اہل قلم حضرات کا پسندیدہ موضوع رہا ہے اس موضوع پر مسلمانوں کے علاوہ مستشرقین یورپ نے بھی طویل بحثیں کی ہیں اور شاید جدید طرز کی تحریروں کا آغاز بھی ان ہی کی قلموں سے ہوا ہے، میرا گمان ہے کہ اس صدی کے جدید تعلیم یافتہ مسلمانوں میں شاید ہی کوئی ایسا شخص ہوگا جو کسی نہ کسی طرح ان کے نقطۂ نگاہ سے متاثر نہ ہوا ہو، وہ نہایت تفصیل و دل سوزی سے مسلمانوں کی مادی کمزوریوں کو زوال اسلام کا بنیادی سبب قرار دیتے ہیں۔ ان کمزوریوں کو وہ دو حصوں میں تقسیم کرتے ہیں، ایک یہ کہ مسلمانوں کا وہ ملکی نظام قائم نہیں رہ سکا جو انھوں نے صدر اول میں قائم کیا تھا۔ اور وہ مادی اقتدار سے محروم ہو گئے دوسرے یہ کہ ان کے اندر وہ تنظیمی طاقت باقی نہ رہی جو انھیں ایک دوسرے سے مربوط کئے ہوئے تھی۔

وہ یہ بات درحقیقت اس بنا پر کہتے ہیں کہ ان کے نزدیک اسلام کی اولین کامیابی بھی اس اقتدار کی بدولت تھی جسے محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ پہنچکر ایک ریاست کی صورت میں قائم کیا تھا، وہ جناب رسول اللہؐ کی مکی زندگی کو نعوذ باللہ ناکامی کا دور بتاتے ہیں ان کا خیال ہے کہ اسلام سیاسی قوت و اقتدار کے ذریعہ قائم ہوا اور پھیلا اور اس کے زوال کا سبب بھی یہی سیاسی قوت و اقتدار کا زوال ہے، کیونکہ وہ اسلام کو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی شخصی اور ذاتی تحریک کہتے ہیں جو آپ کے اولوالعزمانہ مقاصد کے تحت وجود میں آئی تھی، اس لیے وہ نہایت بے باکی سے سیاسی قوت اور ریاستی اقتدار کو تمام اسلامی کامیابیوں کا واحد سبب قرار دیتے ہیں۔

اگرچہ رسول اللہؐ کے مشن کی یہ تعبیر اور آپ کی مکی و مدنی زندگی کی اس طرح کی تقسیم، مقام رسالت و نبوت کے قطعی منافی اور سیرت رسول و تاریخ اسلام کی نہایت غلط تشریح ہے تاہم ان کے نہایت تفصیلی اور بظاہر غیر جانب دارانہ تجزیوں نے اور اس صدی کے مادی افکار و نظریات اور جدید فلسفۂ سیاست و اجتماع نے مسلمان مفکرین کی بھی ایک بڑی کھیپ کو کم و بیش اسی قسم کے

انداز فکر کا قائل کر دیا ہے وہ بیں مادی تصورات پر مبنی تنظیمات و تحریکات کو اسلام اور مسلمانوں کے شاندار مستقبل کے لیے ضروری قرار دیتے ہیں اور صاف صاف کہتے ہیں کہ اقتدار نہ ہونے کی وجہ سے مکی زندگی میں اشاعت اسلام کی رفتار سست رہی اور جب مدینہ میں بقول ان کے سب سے پہلے ایک ریاست اور حکومت قائم کرلی گئی تو اسلام نہایت تیزی کے ساتھ پھیلتا چلا گیا ــــــ قطع نظر اس کے کہ یہ بات حقیقت سے کس قدر مختلف ہے، اور اسلام کے "دین و دولت" ہونے کو کس قدر اشتباہ میں ڈال دینے والی ہے۔ اسلام کے بارے میں ان کے طرز فکر کو مستشرقین کے نظریات سے بہت ہی قریب کر دیتی ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ جس قدر یہ بات سچی ہے کہ "جدا ہو دیں سیاست سے تو رہ جاتی ہے چنگیزی" اس سے بھی زیادہ یہ بات صحیح ہے کہ اگر دین کو سیاسی اقتدار کے تحت کر دیا جائے تو پھر نہ صرف دین بے اثر ہو کر رہ جائے گا مسخ کر دیا جائیگا۔ بلکہ سیاستدانوں اور اقتدار رکھنے والوں کے ہاتھوں میں ان کے اغراض کا آلۂ کار بن کر رہ جائے گا، ماضی اور حال کی تاریخ میں اس کی بے شمار مثالیں موجود ہیں، اور اگر ایسے اقتدار کے تحت کبھی کسی جگہ صحیح اسلام قائم ہو بھی گیا تو وہ خود اپنی قوت سے نہیں بلکہ اقتدار کے وسیلے سے قائم رہے گا اور اقتدار کے گرتے ہی خود بھی ختم ہو جائے گا۔

مقام شکر ہے کہ سلف صالحین صدر اول کے بعد سے ہی اس نازک صورت حال کی طرف سے غافل نہیں رہے ــــــ دین و اقتدار کا تعلق نہایت نازک ہے۔ اس میں ذرا سی افراط و تفریط بے شمار مفاسد کا دروازہ کھول سکتی ہے، یہ ضروری نہیں کہ دین کو اقتدار کا ذریعہ بالارادہ بنایا جائے بلکہ عین ممکن ہے کہ نہایت نیک نیتی سے ایک شخص دین کی خدمت کے لیے ہی ایسا کرے لیکن اس کی یہ خواہش بھی بجائے خود ایک فتنہ بن سکتی ہے۔ کیونکہ اقتدار کو سامنے رکھ لینے کے بعد وہ اور اس کا گروہ اپنے سے جائز اختلاف رکھنے والوں کو بھی شک و شبہ کی نگاہ سے دیکھے گا ــــــ وہ ہرگز گوارا نہیں کرے گا کہ اس کے دائرۂ کار میں کوئی دوسرا شخص مداخلت کرے، خواہ وہ مداخلت کتنی ہی ضروری، جائز اور دین کے لیے ہو ــــــ وہ تمام مسائل کو اپنے نقطۂ نگاہ سے حل کرے گا اور اسی نقطۂ نگاہ کو دینی نقطۂ نگاہ بتائے گا ــــــ وہ دوسروں کا مشورہ اپنی رائے کی حمایت کے لیے تو قبول کرے گا لیکن اصلاح و تردید کے لیے نہیں ــــــ وحی و رسالت کے انقطاع کے بعد اب اس کی عقل و بصیرت ہی فیصلہ کن ہو گی اور اگرچہ وہ نبوت کا مدعی نہ ہو لیکن مقام نبوت کی رعایتوں اور خصوصیات سے ضرور فائدہ اٹھانا چاہے گا۔ اور حقیقت یہ ہے کہ اس کا احساس فرض (اگر شعوری طور پر نہیں تو) غیر شعوری طور پر ہی احساس برتری میں تبدیل ہوئے بغیر نہیں رہے گا۔

اور یہ صورت حال نہ صرف امّت کی اجتماعیت کے لیے مضر ہو جائے گی بلکہ مسلمانوں کے ذہنِ عبدیت کا رُخ بھی پھیر سکتی ہے۔ چنانچہ اسی لیے ایک عظیم تربیت یافتہ جماعت، ایک صالح کردار معاشرہ اور ایک مضبوط و بالاتر شورائیت کے بغیر دین و اقتدار کے باہمی تعلق کو موجودہ دور میں متوازن رکھنا ناممکن ہے اور جب تک ایسا نہیں ہو جاتا یہ بات دینی مصلحت اور دینی حکمت کے عین مطابق ہے کہ اقتدار اور دین کے درمیان واضح امتیاز قائم رکھا جائے۔

اقتدار خالص دینی ہاتھوں میں ہو تو یقیناً وہ مقاصد پورے ہو سکتے ہیں جن کی طرف قرآن و سنت نے رہنمائی فرمائی ہے۔ ورنہ بصورت دیگر دین کے نام سے بے دینی کا وہ فساد و طوفان اٹھے گا جو تاریخ پر نظر رکھنے والوں سے پوشیدہ نہیں خوارج و معتزلہ کی بے راہ رویاں دین کو اقتدار سے باندھ دینے کی ہی کار فرمائیاں تھیں اور دنیا کی بہت سی دیگر بڑی بڑی الفانیاں بھی مذہب کے نام عمل آئیں اور اس وقت عمل میں آئیں جبکہ مذہب کے نام سے اشخاص و جماعتوں نے اپنا اقتدار قائم کیا ہوا تھا ——— اسلام کو بھی اس صورت حال کی ذمہ داری میں شامل کر دینا بجز نادانی کے اور کیا ہے؟

جب تک خالص و کامل دینی اقتدار کا ماحول و موقع نہیں میسر آجاتا ہے اور جب تک اس قسم کا موقعہ و ماحول بنا لینے کی کوششیں بار آور نہیں ہو جاتی ہیں اس وقت تک دین و اقتدار کے مابین امتیاز رکھتے ہوئے اصلاح احوال اور دعوت و ہدایت کی کوششیں ضروری اور قابل قدر ہیں بلکہ یہ کوشش ہی اس ماحول اور موقع کو پیدا کرنے والی ہیں جس میں اسلام کی اصولی اور معیاری حکومت قائم ہو سکتی ہے اور جس سے دنیا کا ہر سعید و صالح انسان اتفاق کرے گا۔

اسلام کی برتری اور عظمت کا راز اس کی عظیم روحانی قوتوں میں ہے جن سے صرف نظر کرنے کی تعلیم اوّل اوّل یورپ کے مستشرقین نے دی۔ انھوں نے اسلام پر جو کچھ بھی لکھا مادی نقطۂ نگاہ سے لکھا اور غلط مفروضات و قیاسات پر لکھا، جن لوگوں نے ان ذرائع سے اسلام کا مطالعہ کیا اور متاثر ہوئے انھوں نے "" اسلام کی ایسی ہی تعبیرات کو صحیح تعبیرات سمجھا، مستشرقین نے قبل اسلام عرب کے حالات کو اس طریقہ پر پیش کیا ہے کہ گویا اسلامی انقلاب کو بروئے کار لانے کے لیے تمام وسائل و اسباب موجود تھے صرف ان کو استعمال کرنے والوں کی ضرورت تھی، اور یہ ضرورت محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے رفقاء رضوان اللہ علیہم اجمعین نے پوری فرمادی۔ اسی طرح انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مکی و مدنی زندگی کو غیر سیاسی اور سیاسی حیثیتوں میں تقسیم کر کے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ اسلام کی کامیابی کا تمام تر دار و مدار حصول اقتدار پر ہے اور اسی

طرح وہ خلافت راشدہ کے دور حکومت پر بھی اپنی فرضی اور قیاسی آراء کے حاشیے چڑھاتے جاتے ہیں ایک معترض و مخالف کی حیثیت سے نہیں بلکہ ایک دوست اور مؤرخ کی حیثیت سے۔ اس سے ان کا مقصد در اصل یہ ہوتا ہے کہ وہ اسلام کو دین کے بجائے محض ایک قومی تحریک بنا ئیں اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو رسول اللہ کے بجائے ایک نہایت اعلیٰ درجہ کا سیاسی و عسکری مدبر و مفکر قرار دیں اور اس طرح پورے رسالت و خلافت راشدہ کے دور کو صرف چند صاحب فکر اولوالعزم انسانوں کا دور ٹھہرا دیں جن کی شخصی کوششوں سے وقت کی ایک سیاسی اور تہذیبی تاریخ وجود میں آگئی اور اس نے دین و مذہب کی صورت اختیار کرلی۔

اب اگر ان ہی افکار کو نئے اسلوب و انداز پر احیاء اسلام کی بنیاد بنایا جائے تو یقیناً اول تو اسلام کی روحانی حیثیت کا انکار کرنا پڑے گا اور اس کی کامیابی کا دار و مدار تمام تر ریاست و اقتدار پر رکھنا ہوگا۔ اور یہ ریاست و اقتدار موجودہ دور کے ان طریقوں سے ہی حاصل ہو سکے گا جسے یوروپ کے فلسفۂ سیاست و اجتماع نے مرتب کیا ہے۔ یہ فلسفۂ سیاست اول تو ایک چیز کو صرف نظری حیثیت سے پیش کرتا ہے اس نظریت سے ایک طبقہ کے جذبات کو سیراب کرتا ہے اور شدت کے ساتھ اصول پرستی کا مظاہرہ کرتا ہے لیکن جب عمل و اقدام کا موقع آتا ہے تو وہ سابقہ نظریت و اصول پرستی سے دست بردار ہونے لگتا ہے۔ اب اس کے سامنے صرف حصول اقتدار و قیام اقتدار کا مسئلہ سب سے زیادہ اہم رہ جاتا ہے۔ اور پہلا مقصد و نظریہ اس کی توضیح و تاویل کا کھلونا بن جاتا ہے۔ ماضی قریب کی یوروپ کی چند نظری تحریکات کا یہ حشر سب کے سامنے ہے۔ اس قسم کے طور طریقوں میں جو رد عمل کی کیفیت پائی جاتی ہے جب تک اس سے انھیں پاک و صاف نہ کرلیا جائے اس وقت تک اسلامی مقاصد کے لیے انھیں استعمال کرنا اسلام کے لیے کم اور استعمال کرنے والے گروہ کے لیے زیادہ فائدہ بخش اور دین کو روحانیت سے جدا کر کے مادیت کے تابع کر دینے کے مترادف ہے۔

(بقیہ مضمون صفحہ ۱۱۱)

اس بارے میں نیک نیتی میں کہ یہ سب کچھ وہ احیاء اسلام کے لیے ہی کر رہے ہیں لیکن افسوس ہے کہ انھیں کون سمجھائے کہ اسلام کے لیے اسلام کو ہی فکری طور پر مسخ کر ڈالنا اور ایک اصول کی بقاء و استحکام کے لیے اس سے پیدا ہونے والے دوسرے اصول و ضوابط میں تبدیلیاں کر ڈالنا اسلام اور اس نئے اصول کی خدمت نہیں ہے۔

عتیق الرحمٰن سنبھلی

قربانی

حقیقتِ اسلام کا ایک رمز

عَنْ زَیْدِ بْنِ اَرْقَمَ قَالَ قَالَ اَصْحَابُ رَسُوْلِ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ مَا ھٰذِہِ الْاَضَاحِیُّ ـ قَالَ سُنَّۃُ اَبِیْکُمْ اِبْرَاھِیْمَ عَلَیْہِ السَّلَامُ

(الحدیث) رواہ احمد و ابن ماجہ ـ مشکوٰۃ ـ باب الاضحیۃ

زید بن ارقم رضی اللہ عنہ (صحابی) سے روایت ہے کہ اصحاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے آپ سے عرض کی کہ "یا رسول اللہ یہ (عید کی) قربانی کیا ہے" ارشاد ہوا کہ "تمہارے باپ ابراہیم علیہ السلام کی سنت ہے"

اللہ کے لیے قربانی ملتِ ابراہیمی کی روح ہے۔ یہ قربانی ——— زندگی کے ہر ہر موڑ اور ہر ہر گوشہ میں قربانی ——— یہی وہ طرّہ امتیاز ہے جس نے ابراہیم کو "خلیل اللہ" بنایا (علیہ وعلیٰ نبینا الصلوٰۃ والسلام) سب سے پہلے محبتِ پدری کی قربانی دی۔ اور باپ کی زبان سے اللہ کے لیے۔

لَئِنْ لَّمْ تَنْتَہِ لَاَرْجُمَنَّكَ وَاهْجُرْنِیْ مَلِیًّا۔ (مریم۔ ع ۳)

اگر تو اس دعوتِ توحید سے باز نہ آیا تو میں تیرا سر پھوڑ دوں گا۔ چل میرے پاس سے دفعان ہو جا!

جیسے الفاظ سنے۔ اور پھر

سَلٰمٌ عَلَیْكَ سَاَسْتَغْفِرُ لَكَ رَبِّیْ اِنَّهٗ كَانَ بِیْ حَفِیًّا وَاَعْتَزِلُكُمْ

تم سلامت رہو میں تمہارے لیے اپنے رب سے معافی چاہوں گا۔ کہ وہ مجھ پر بڑا مہربان ہے

وَمَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اور تمہیں اور تمہارے ... کو چھوڑ کر الگ ہو جاؤں گا۔

ایضاً

کھیلتے ہوئے، جیتے جی باپ کے سایۂ عاطفت سے محروم ہو گئے۔
باپ کے ساتھ ساتھ سارے اہلِ وطن دشمن جان ہو گئے تو اپنے وجود ہی کی قربانی کا سوال سامنے آگیا اور ساری خدائی نے دیکھا کہ

بے خطر کود پڑا آتشِ نمرود میں عشق

یہ مرحلۂ عشق طے ہوا تو اپنے وطن کو خیر باد کہنے کی باری تھی، قربانی کا ابراہیمی جذبہ اس گھاٹی کو بھی ہنستے کھیلتے پار کر گیا، اور اب بابل کے بجائے ارضِ کنعان اس دولتِ عشق کی وارث ہوئی۔ یہاں بڑھاپے کی عمر میں پہونچ کر پہلی اولاد عطا ہوئی تو عہدِ شیر خوارگی ہی میں حکم ملا کہ اس کو اور اس کی ماں کو (مکہ کی) وادیٔ غیر ذی زرع میں چھوڑ آؤ ——— عشق کا یہ مرحلہ بھی بلا حیل و حجت طے ہوا، یہ قربانی ہی کیا کم تھی ؟ مگر اللہ کی "دوستی" اس سے بھی زیادہ مہنگی تھی۔ اور "نرخ بالا کن کہ ارزانی ہنوز" کی صدا ابھی تھمنے کا وقت نہیں آیا تھا۔

چند سال بیتے اور اس وادیٔ غیر ذی زرع میں پلنے والے اکلوتے فرزند کی عمر اتنی ہو گئی کہ
بَلَغَ مَعَهُ السَّعْيَ (طفٰت) بوڑھے باپ کا کچھ ہاتھ بٹانے کے قابل ہو گئے
تو قربانی کے اس مرحلے کا سامان بھی ابراہیمؑ کے لیے ہو گیا جس کے بعد اس بارگہ والا سے بھی "ارزانی ہنوز" کی نہیں۔

إِنَّ هٰذَا لَهُوَ الْبَلَاءُ الْمُبِيْنُ بے شک یہ بڑی کھلی ہوئی جانچ تھی۔

ایضاً

• کی صدائے اعتراف اٹھی۔ ابراہیم علیہ السلام نے ایک خواب سے سمجھا کہ بیٹے کی قربانی کا حکم مل رہا ہے، بیٹے سے شرحِ صدر ہو گیا تو باپ جھجکا نہ بیٹا کسمسایا۔ اور ساری خدائی نے دم بخود ہو کر یہ ماجرا دیکھا کہ بیٹا منھ کے بل زمین پر ہے اور باپ کی چھری بیٹے کی گردن پر، لیکن خدا کو اسمٰعیل کی قربانی مطلوب نہیں تھی، ابراہیمؑ کا دل دیکھنا یا کہیے کہ محبت کا آخری مرحلہ طے کرانا مقصود تھا، وہ طے کرا دیا گیا اور ابراہیمؑ کے جذبۂ عبدیت و فدائیت کی صداقت کو آزما لیا گیا، تو قبل اس کے کہ چھری اپنا کام کرے پکار آئی۔

يَا إِبْرَاهِيْمُ قَدْ صَدَّقْتَ اے ابراہیم تم نے سچ کر دکھایا

الرُّؤْيَا ۔ (وانفیا) خواب سچا کر دکھایا۔

اب تیرا بیٹا تجھے مبارک ہو۔

اِنَّا كَذٰلِكَ نَجْزِى الْمُحْسِنِيْنَ ہم صادقین محسنین کو اسی انداز سے جزا دیتے ہیں۔

پے در پے آزمائشوں کے سلسلہ کی یہ وہ آخری آزمائش تھی جس میں پورا اترنے کے بعد حضرت ابراہیم علیہ السلام کو نوع انسانی کی امامت کا مژدہ سنایا گیا۔ قرآن کا بیان ہے۔

وَاِذِ ابْتَلٰۤى اِبْرٰهٖمَ رَبُّهٗ بِكَلِمٰتٍ فَاَتَمَّهُنَّ قَالَ اِنِّىْ جَاعِلُكَ لِلنَّاسِ اِمَامًا۔ (بقرہ ع ۱۵) اور جب آزمایا ابراہیمؑ کو اس کے رب نے متعدد باتوں میں، اور وہ ان میں پورا اترا فرمایا میں بناؤں گا تجھے بنی آدم کا امام۔

یہی امامت تھی جس کا کامل ظہور اس طرح ہوا کہ آپ کی نسل میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو تمام نوع انسانی کا رسول بنا کر مبعوث کیا گیا اور اس کے لیے وہی طریقہ اور وہی دین پسند کیا گیا جو ابراہیم علیہ السلام کا طریقہ اور ان کا اسوہ تھا۔ چنانچہ قرآن میں محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے کہلوایا گیا۔

قُلْ اِنَّنِىْ هَدٰىنِىْ رَبِّىْۤ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ دِيْنًا قِيَمًا مِّلَّةَ اِبْرٰهِيْمَ حَنِيْفًا۔ (الانعام۔ ع ۲۰) (آپ کہہ دیجئے کہ) مجھے سجھائی ہے میرے رب نے سیدھی راہ یعنی دین قیم جو طریقہ ہے ابراہیم حنیف کا۔

اور اسی طرح ابراہیمی کیش وملت کو تمام نوع انسانی کے لیے اسوہ ٹھہرا دیا گیا ــــــ امت محمدی کے اولین طبقہ کو (جو نزول قرآن کے وقت داخل اسلام ہو چکا تھا) خطاب کر کے فرمایا گیا۔

هُوَ اجْتَبٰىكُمْ وَمَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِى الدِّيْنِ مِنْ حَرَجٍ مِّلَّةَ اَبِيْكُمْ اِبْرٰهِيْمَ هُوَ سَمّٰىكُمُ الْمُسْلِمِيْنَ (الحج) اس (اللہ) نے تم کو منتخب کیا ہے اور نہیں کی ہے دین میں تمہارے اوپر کوئی تنگی تمہارے باپ ابراہیم ہی کی تو ملت ہے اسی نے نام رکھا ہے تمہارا مسلمان۔

پس وہ ابراہیمی کیش وملت جس کی روح ہی "قربانی" ہے اور جس کو اسلام کا نام ہی اس عظیم آخری قربانی کے سلسلہ میں دیا گیا ہے جیسا کہ سورۂ "الصّٰفّٰت" میں اسی موقع پر ارشاد خداوندی

ـــ

فَلَمَّآ أَسْلَمَا وَتَلَّهُ لِلْجَبِينِ الخ — پس جب ان دونوں باپ بیٹوں نے کمال اطاعت (اسلام) کا مظاہرہ کردیا اور ابراہیمؑ نے اسمٰعیل کو پیشانی کے بل لٹادیا۔ الخ

یہ کیسے ہوسکتا تھا کہ اس کیش و ملت میں کوئی مستقل نشان اس عظیم قربانی کا نہ ہوتا، جس بنیاد پر اسے اسلام کا نام دیا گیا تھا، بعد میں اس بنیاد کا کوئی اثر اس اسلام نامی ملت میں نظر نہ آتا؟ پس حق اور تقاضا حق یہ تھا کہ "اسلام" کے اس حقیقی مظاہرہ کی کوئی نہ کوئی یادگار اس ملت کے خاکہ میں مستقل جگہ پاتی۔ اور قربانی پیش کرنے کی کوئی نہ کوئی شکل اسلام کا دائمی شعار قرار دی جاتی۔ چنانچہ خداوند قدوس نے اسی موقع پر خود حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ہاتھ سے قربانی کی شکل متعین کرائی کہ اسمٰعیل کی قربان گاہ پر اسی چھری سے ایک مینڈھا ذبح کرایا۔ اور ہر سال اسی دن اس عمل کے نہایت عظیم اور عالمگیر پیمانہ پر اعادہ کو ملت ابراہیمی کا جزو بنا دیا ——— اسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پیغمبر آخر الزماں نے جو دین حنفی اور ملت ابراہیمی کا پیامبر تھا، بقرعید کی قربانی کے سلسلہ میں اپنے صحابہ کرام کو بتایا کہ یہ تمہارے باپ ابراہیم کی سنت ہے۔ اور تلقین کی کہ ان میں ہر ذی استطاعت اس سنت کی پیروی میں ذوق و شوق سے حصہ لے۔

اب سمجھ میں آتا ہے کہ قربانی کے بارے میں اس قسم کی احادیث کا مطلب (یا زیادہ صحیح الفاظ میں ان کا راز) کہ

(عَنْ عائشۃ قالت قال رسول اللہ — (حضرت عائشہؓ بیان فرماتی ہیں کہ جناب

---

[1] اس آیت کے سلسلہ میں حضرت عبد اللہ بن عباس کا ارشاد گرامی ہے "والذی نفس ابن عباس بیدہ لقد کان اوّل الاسلام" (قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ میں ابن عباس کی جان ہے یہ اسلام کا سب سے پہلا کامل ظہور تھا) (تفسیر ابن کثیر ج ۴)

[2] امام ابن جریر طبری نے حضرت حسن بصری سے نقل کیا ہے۔

انہ کان یقول ما یقول اللہ وفدیناہ بذبح عظیم لذبیحۃ التی ذبح فقط ولکنہ الذبح علی دینہ فتلک السنۃ التی الی یوم القیامۃ (تفسیر طبری ج ۲۳)

کہ وہ فرمایا کرتے تھے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد وفدیناہ بذبح عظیم صرف اس خاص ذبیحہ سے متعلق نہیں ہے جو ابراہیم علیہ السلام نے کیا تھا بلکہ اس میں ذبح عظیم سے مراد وہ عظیم رسم قربانی ہے جو اس ابراہیمی طریق پر ادا کی جاتی

صلى الله عليه وسلم: مَا عَمِلَ ابْنُ آدَمَ مِنْ عَمَلٍ يَوْمَ النَّحْرِ أَحَبَّ إِلَى اللهِ مِنْ إِهْرَاقِ الدَّمِ وَإِنَّهُ لَيَأْتِي يَوْمَ الْقِيَامَةِ بِقُرُونِهَا وَأَشْعَارِهَا وَأَظْلَافِهَا. وَإِنَّ الدَّمَ لَيَقَعُ مِنَ اللهِ بِمَكَانٍ قَبْلَ أَنْ يَقَعَ بِالْأَرْضِ فَطِيبُوا بِهَا نَفْسًا۔ رواه الترمذی وابن ماجه۔ (مشکوٰۃ)

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا قربانی کے دن ابن آدم کا کوئی عمل اللہ کو اتنا محبوب نہیں جتنا خون بہانے کا عمل، تمہارے یہ قربانی کے جانور قیامت کے دن لے کر آئیں گے اپنے سینگ، اپنے بال اور اپنے کھر! (یعنی اس کا ایک ایک بال تک تمہاری میزان عمل میں نیکی بنا کر رکھا جائے گا) اور (کیا پوچھتے ہو) یہ خون جو تم بہاتے ہو قبل اسکے کہ زمین پر گرے، اللہ کے حضور میں گرتا ہے (یعنی مرتبہ قبول پاتا ہے) بس خوب اچھے دل سے قربانی کیا کرو۔

جس قربانی کی یہ تاریخ ہو کہ اس کی طرح خود خداوند قدوس نے اپنے خلیل کے ہاتھوں ڈلوائی ہو۔ اور وہ اس عظیم عمل کی یادگار اور رمزدار ہو، جس کی عظمت کا اعتراف " قد صدقت الرؤیا " کہہ کر اس دربار عالی سے برملا کیا گیا ہو، جس کی عظمت و کبریائی کے آگے ابن آدم کی بڑی سے بڑی پیشکش ہیچ و حقیر ہے جس کو کمال اطاعت و اسلام (اسلما) سے تعبیر کر کے اس کا درجۂ قبولیت بھی اس عظیم ہستی ہی کی طرف سے دنیا پر عیاں کر دیا گیا، ہو جس کی شان بے نیازی کو جاننے والا انسان، عمر بھر کی اطاعت گزاری پر بھی اطمینان نہیں کر پاتا کہ کوئی درجۂ قبولیت اس سب کو اُن بارگہ عالی میں مل پائے گا! ——— سچ کہیئے کہ اگر اس تاریخی قربانی والے دن میں اللہ کو ابن آدم کا کوئی عمل اس درجہ پسند نہیں جتنا یہ قربانی اور اہراق دم والا عمل پسند ہے، تو اس میں تعجب کی کون سی بات ہے؟ ——— حق یہ ہے کہ اس عمل کی یہی شان ہونی چاہیئے اور ابراہیمی خلوص و خوشدلی کی ادنیٰ جھلک بھی اگر کسی کے اس عمل میں پائی جائے تو اس کو یہی درجۂ محبوبیت و قبولیت ملنا چاہیئے جو حدیث بتا رہی ہے۔ ہاں! ہاں!! خون کے ان قطروں کو جو ابراہیمی ذوق و شوق کے ساتھ کسی عبد مسلم کے ہاتھ سے بہیں یہی رفعت عطا ہونی چاہیئے کہ زمین پر گرنے سے پہلے وہ کہیں عرش کے دامن قبول میں جگہ پائیں اور اس سنت ابراہیمی کی پیروی کا یہی صلہ قدرشناسی جذبہ ابراہیمی سے

ملنا چاہیے کہ قربانی کا ایک بال بھی رائیگاں نہ جائے۔ سچ کہا اور یقیناً خدا کی طرف سے کہا "دعائے خلیل" کے ظہور مجسم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے کہ

بکل شعرۃ حسنۃ (قالوا	ہر بال کے حساب میں ایک نیکی (اصحاب
فالصوف یا رسول اللہ ؟) قال	نے عرض کیا کہ حضور اور جو جانور اون
قال بکل شعرۃ من الصوف	والے ہیں ؟) فرمایا اون میں سے بھی ہر بال
حسنۃ ! (رواہ احمد و ابن ماجہ، مشکوٰۃ)	کے حساب میں ایک نیکی۔

بعض لوگ جو روایاتِ حدیث کے استناد میں شک رکھتے ہیں اور بنا بریں دین میں کوئی بات محض حدیث کی بنیاد پر ماننے کو تیار نہیں ہوتے، بلکہ قرآن سے سند اور حجت چاہتے ہیں، آپ ان کو کہتا ہوا سنیں گے بلکہ بارہا سن چکے ہوں گے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اس سنت (قربانی) کا تعلق تو صرف مناسک حج سے تھا اور قرآن نے بھی امت مسلمہ کے لیے صرف اسی ذیل میں اس سنت کا اجرا کیا ہے۔ حج اور حجاج کے دائرہ سے باہر اس سنت کے اجرا کی ہدایت قرآن میں کہیں نہیں ملتی۔

یہ بات ٹھیک ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی قربانی بیشک اسی موقع کی ہے، اور اس قربانی کو جاری کرنے کا حکم قرآن نے حج ہی کے سلسلہ میں دیا ہے لیکن اگر حدیث کی بنیاد پر دین میں کوئی چیز ماننے سے ان لوگوں کو صرف یہی خیال مانع ہے کہ حدیث کی روایات مستند نہیں ہیں، نہ یہ کہ قرآن کے سوا دین میں کوئی شئ حجت اور ماخذ دین ہی نہیں، اور وہ مانتے ہیں کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے کسی قول یا عمل کی کوئی روایت، اگر قابلِ اطمینان ثابت ہو جائے تو وہ دین میں حجت ہو گی۔ اور اس سے ثابت شدہ امر دین ہی کا حکم سمجھا جائے گا ؟ تو انہیں معلوم ہونا چاہیئے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے قربانی کی روایت ان روایات میں سے نہیں ہے جن کی صحت پر صحیح یا غلط طور پر کوئی بھی شک کیا جا سکے۔ یہ روایت صرف قول کی نہیں ہے کہ کہہ دیا جائے کہ پتہ نہیں کس نے گڑھ لی ہو۔ بلکہ ایسے مسلسل متواتر اور علانیہ عمل کی روایت ہے۔ پھر اس سلسلہ میں موجود ہے جس میں جھوٹ چار قدم بھی نہیں چل سکتا۔ ثقہ ترین صحابی عبداللہ بن عمرؓ راوی ہیں، اور ان کی یہ روایت جامع ترمذی میں موجود ہے کہ

اقام رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم	رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ کی پوری
بالمدینۃ عشر سنین یضحی۔	دس سالہ اقامت میں برابر قربانی کرتے رہے

(مشکوٰۃ۔ باب فی الاضحیۃ)

دوسری طرف انھیں عبداللہ بن عمرؓ کی یہ بھی روایت ہے کہ

كَانَ رَسُولُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَذْبَحُ وَيَنْحَرُ بِالْمُصَلّٰى
(رواہ البخاری)

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کا معمول تھا کہ عیدگاہ ہی پر قربانی (بھی) کیا کرتے تھے۔

کیا کوئی معقولیت پسند آدمی سوچ سکتا ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے بارے میں اتنا بڑا جھوٹ بھی امت میں قبول پاسکے کہ ایک کام آپ نے سرے سے کیا ہی نہ ہو اور کہنے والا کہے کہ آپ دس سال تک متواتر عیدگاہ کے ایسے بھرے مجمع میں یہ کام کرتے رہے ہیں؟ کس قدر بدعقلی کی بات ہے کہ ایسی روایات کو بھی یہ کہہ کر نظر انداز کر دیا جائے کہ پتہ نہیں سچ ہے یا جھوٹ ۔۔۔ حدیث کے مجموعے ہزار دو ہزار سے مرتب ہوئے ہوں، مگر ان میں اس قسم کی باتیں بھی اگر "عجمی سازش" کے ماتحت جھوٹ موٹ گھڑ کے بھر دی گئی ہوں تو ایک طرف تو ان عجمیوں کی سازشی "عقل" کی داد دیجئے کہ جھوٹ کی صنف انتہا کی کہ منہ سے نکلتے ہی پکڑ لیا جائے اور دوسری طرف حیرت میں ڈوب جائیے کہ کوئی ایک عرب ایسا نکلا جو ان عجمیوں کا گریبان پکڑ لیتا کہ ہماری پشتیں گزر گئیں، ہمیں رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے اس مسلسل اور مجمع عام کے عمل کی خبر تک نہ ہوئی۔ آج تم ترنذ بخارا سے اٹھ کر ہمیں یہ خبر دینے آئے ہو! رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دس سال تک متواتر اور علی الاعلان ایک عمل کرتے رہے اور ہمارے آباؤ اجداد جو آپ کے ایک ایک قدم سے قدم ملا کر چلتے تھے، اس سے کوئی اعتنا ہی نہ کیا! ۔۔۔ اور پھر یہ ہی نہیں، تم یہ بھی خبر دیتے ہو کہ آپ نے یوں یوں اس قربانی کے فضائل اپنے اصحاب سے بیان کئے اور ترغیب کے ساتھ ساتھ یہ زبردست تہدید بھی کی کہ

مَنْ كَانَ لَهُ يَسَارٌ فَلَمْ يُضَحِّ فَلَا يَقْرَبَنَّ مُصَلَّانَا

جس کسی نے وسعت ہوتے ہوئے قربانی نہیں کی وہ ہماری عیدگاہ کے قریب بھی نہ آئے۔

مگر اس کے باوجود ہمارا پورا معاشرہ اور ہمارے اسلاف کی زندگی ہے کہ عید کی اس قربانی سے ناآشنائے محض! گویا رسول خدا کی ترغیب و تہدید سے بھی ان کے کانوں پر جوں نہ رینگی؟ جبھی تو ہمیں ان کے کسی ایسے عمل کی ہوا تک نہ لگی ۔۔۔ قربان ہو جائیے اس عرب معاشرہ کی سادہ لوحی پر کہ اس "نئی دریافت" پر ایک عام ہیجان تو درکنار کسی ایک فرد کے ذہن میں بھی یہ بدیہی سوال پیدا نہ ہوا کہ سب کے سب آمنّا و صدّقنا کہتے ہوئے قربانی کرنے لگے! کیا یہ عقل میں آنے والی بات ہے اور کوئی عقل والا ایسی صورت حال فرض بھی کر سکتا ہے؟

پھر اس سے کیا بات ثابت ہوئی؟ اس سے بالکل دو اور دو چار کی طرح یہ ثابت ہوتا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے قربانی کے عمل ہی کی نہیں، قربانی کے حکم کی بھی روایات ہر کذب و خطا سے پاک ہیں۔ اور اُمت کے عمومی توارثِ عمل نے ان کی پوری پوری تصدیق کی ہے ——— یعنی یہ روایتیں اگرچہ ویسے بھی مدون ہو کر منظرِ عام پر آئی ہوں مگر ان پر کوئی انکار اور استعجاب و احتجاج نہ ہونا اس بات کی دلیل ہے کہ قربانی کا عمل پورے عموم کے ساتھ نسلاً بعد نسلٍ اُمت میں منتقل ہوتا چلا آرہا تھا ——— اور یہ عمومی توارث کی شہادت کسی دعوے کا وہ ثبوت ہے جس کی قوت اور قطعیت سے وہی شخص انکار کرسکتا ہے جو موجودہ قرآن کے اصلی قرآن ہونے میں شک کرنے کو تیار ہو، کیونکہ اس کے لیے بھی ہمارے پاس آج سب سے بڑا ثبوت یہ تواتر ہی ہے۔

بہر حال لاریب یہ ثابت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی حج کے مخصوص دن (۱۰ ذی الحجہ یوم النحر) والی قربانی (عید کی قربانی کے عنوان سے) حج کے باہر بھی پابندی کے ساتھ کی ہے اور اس کا اسی طرح حکم بھی دیا ہے ——— پس اب کیا تامل ہوسکتا ہے کہ یہ قربانی رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم کا لایا ہوا دین ہے، نہ کہ بعد میں کسی کی ایجاد و اختراع!

یہ تو نقلی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے قربانی کے قولی و عملی ثبوت کی بحث اور ایک مومن کے لیے سمعنا واطعنا کہنے کو بالکل کافی ہے۔ لیکن اس موضوع پر گفتگو صرف ایک خشک ثبوت اور ضابطہ کی کارروائی پر ختم نہیں ہوجاتی ہے بلکہ اسلام میں قربانی کے اجراء کا جو پس منظر صفحہ میں بیان کیا گیا ہے اسے اگر نگاہ میں رکھئے تو یہ بات بڑی صحیح اور وجدان و فطرت کا عین تقاضا نظر آتی ہے کہ قربانی کا یہ حکم حجاج کی تعداد ہی تک محدود نہیں ہونا چاہئے تھا بلکہ پوری امت مسلمہ جس کی اکثریت حج کی استطاعت نہیں پاسکتی، اس سبھی کو اسلام کامل کا رمز رکھنے والے اس عمل سے بہرہ اندوز ہونے کا موقع ملنا چاہیے تھا۔ بالفاظ دگر اگر ابراہیمی انداز کی قربانی ہی وہ عمل ہے جس سے "اسلام" کی اصل کیفیت ظاہر ہوتی ہے اور اسی عمل کو اپنے کرنے کی حد تک گزرنے پر ابراہیمی کیش و ملت کو "اسلام" کا نام ملا۔ تو اس کیش و ملت کے پیروؤں میں اسی کی حقیقی روح سدا برقرار رکھنے کے لیے اگر یہ مناسب اور تقاضائے عقل و فطرت تھا کہ اس جذبۂ ابراہیمی کا کوئی رمز ملتِ ابراہیمی میں مستقل طور سے ودیعت کر دیا جائے اور کوئی ایسا عمل جو اس جذبے اور شیوۂ تسلیم و رضا کا غماز ہو مشروع کرکے مستقل جزءِ ملت بنا دیا جائے تو کوئی وجہ نہ تھی کہ اس تشریع کو حجاج ہی تک محدود رکھا جاتا۔ ان کی

تعداد" امت مسلمہ کے پھیلاؤ کو دیکھتے ہوئے بڑی تھوڑی تھی۔ دل کہتا ہے کہ بالکل یہی ہونا چاہیے تھا کہ اگر حجاج کو دس باتوں سے اپنے امام و پیشوا (ابراہیم) کے جذبۂ فدائیت کے اظہار کی سعادت ملے۔ وہ لبیک لبیک کہتے ہوئے معبود کے در اقدس پر پہنچیں۔ اس کے گھر کا طواف پر طواف کریں۔ اپنا پورا وجود نثار کر دینے کا اشارہ کریں، حجر اسود کو چوم کر اور آنکھوں سے آنسو بہا کر چشم تصور میں خود اس کی دست بوسی کریں اور اشک ہائے عبدیت کی نذر اتار کر تسلیم و وفا کا بھرپور اظہار کریں۔ کبھی ملتزم سے چمٹ کر روئیں اور گڑگڑائیں اور کبھی صفا و مروہ کے درمیان دوڑیں کہ اے ربّ ابراہیم تو کہاں ہے؟ کہ اب یہ سروبال دوش اور دم تیرے قدموں پر نکلنے کے لیے بے تاب ہے۔

کبھی عرفات کے میدان میں حسرتیں نکالنے کی کوشش کریں، اور پھر بھی تشنگی رہ جائے تو منیٰ جا پہنچیں اور اپنے امام و پیشوا کی اقتدا میں کسی دوسری ہی جان کا نذرانہ پیش کر کے ایک گونہ تسکین کا سامان مہیا کرلیں۔ بیشک یہ اتنا بہت تو حجاج ہی کا حصہ ہے۔ ہم نہیں پہنچ سکے تو لبیک لبیک کیوں کہیں؟ ہم خانۂ کعبہ ایک ہی ہے تو اس سے دور رہ کر طواف کا ہے کا کریں؟ ملتزم ہمیں نصیب نہیں، حجر اسود سے ہم دور کہ دست بوسی کا رمز پیدا کرسکیں، صفا و مروہ کے دامن تک ہماری رسائی نہیں کہ خوب دوڑ سکیں لیکن دل کہتا ہے کہ اگر حجاج کو یہ دس باتیں نصیب ہیں تو دو ہم بد نصیبوں کے حصہ میں آجانی چاہئیں ہم ہزار کوتاہ دست و شکستہ پا سہی کہ اپنے امام و پیشوا کی اذان حج پر لبیک نہ کہہ سکے مگر امت مسلمہ میں تو ہم بھی ہیں۔ ہمارے اندر بھی اسلام کی حقیقی روح برقرار رکھنے کا کچھ نہ کچھ سامان ضروری ہے — دل کی یہی آواز اور امت مسلمہ کی فطرت کی یہی خاموش پکار تھی جس کے جواب میں خدا نے اپنے رسول کے ذریعہ اعمال حج کا ایک حصہ اور حجاج سے ایک گونہ تشبہ کا سامان پوری امت کو بقدر استطاعت نصیب فرمادیا ——

حج والی قربانی کو حج سے باہر بھی جاری کرانے کا یہی فلسفہ ہے جسے عقل بھی تسلیم کرتی ہے اور فطرت بھی اس کی معقولیت پر شہادت دیتی ہے۔ ہم سے ارباب استطاعت کو موقع دیا گیا (فقہ کی اصطلاح میں وجوب کہیئے یا سنت) کہ وہ اپنے گھروں ہی پر رہتے ہوئے ابراہیم خلیل اللہ کی سنت قربانی کو ہر سال تازہ کرکے اس مرموز جذبۂ ابراہیمی کی زندگی اور تازگی کا سامان کریں جو اسلام کی اصل اور اس کی روح و جان ہے۔ باقی کو بھی محروم نہیں رکھا گیا، کہ عرفات کا والہانہ اجتماع نماز عید کی متبادل شکل میں عطا کر دیا گیا اور ایسا نہ ہو کہ جو نہ قربانی کر سکے اور نہ عید کی نماز میں پہنچ سکے وہ ملت اسلامی کی تاسیس کے ان تاریخی ایام میں جو روح اسلام کی بالیدگی کے لیے قدرتی طور پر نہایت

سازگار ہیں، اس روح کی آبیاری کے کسی سامان سے بالکل ہی محروم رہ جائے اس لیے تیسری آسان ترین چیز یہ عطا کی گئی کہ ۹ ذی الحجہ سے ۱۳ ذی الحجہ تک، ہر فرض نماز کے بعد اللہ کی تکبیر و تحمید کا غلغلہ بلند کرو۔ اللّٰہ اکبر اللّٰہ اکبر لا اِلٰہَ اِلّا اللّٰہ و اللّٰہ اکبر اللّٰہ اکبر و للّٰہ الحمد۔ پس اللہ کی رحمت اور سلام اس نبی پر جس کے صدقہ میں پوری امت مسلمہ کو اپنے امام و پیشوا کی سنت نصیب ہوئی۔

بہ مصطفیٰ برساں خویش راکہ دیں ہمہ اوست
اگر بہ او نہ رسیدی تمام بولہبی ست

بعض لوگ آپ کو اور ملیں گے، یورپ کی پھیلائی ہوئی مادیت پرستی جن کے روحانی حاسہ کو کھا گئی ہے انھیں آپ کہتا ہوا پائیں گے کہ آخر یہ قربانی سے کیا فائدہ ہے؟ ثواب ہی مطلوب ہے تو اتنا روپیہ انفرادی طور پر خیرات کر دیجیے یا کسی اجتماعی نظم کے تحت غریبوں کی فلاح و بہبود پر خرچ کیجیے اس میں تو سوائے اس کے کہ دو چار وقت آپ خود اور غرباء اناپ شناپ گوشت خوری کر لیں اور ایک خواہ مخواہ کی بہیمیت کا مظاہرہ ہو جائے اور کچھ نہیں! بھلا اللہ کو اس خوں ریزی کا کیا لینا ہے کہ یہ اس کی رضامندی کا ذریعہ بنے؟ اس کے نام پر کسی کو سلیقہ سے فائدہ پہنچائیے تو ثواب کی بات بھی ہے۔

یہ مسلمان کہلانے والے سب وہ لوگ ہوں گے جو گوشت خوری میں کسی سے پیچھے نہیں ہیں، مگر انھیں اپنی گوشت خوری اور اس کے لیے جانوروں کے ذبیحہ پر بہیمیت کا خیال کبھی نہیں آتا۔ ان کی ساری رحمدلی اور لطیف الحسی سال بھر میں صرف اسی ایک دن بھڑکتی ہے جب جانوروں کا ذبیحہ خود ان کے خالق کے نام پر کیا جاتا ہے۔

بہ بیں تفاوت رہ از کجاست تا بہ کجا؟

دوسری بات یہ کہتے ہیں کہ اس خونریزی میں ثواب کا کیا کام ——— اس سے اللہ کو کیا لینا؟ تو انھیں معلوم نہیں کہ یہ کوئی خاص عقلی انکشاف نہیں فرما رہے ہیں کہ اس سے قربانی کو عبادت سمجھنے والے مبہوت ہو کر رہ جائیں ——— یہ بات جو وہ آج بڑے عقلی طنطنے کے ساتھ کہتے ہیں خدا نے اسی دن صاف صاف بتا دی تھی جس دن قربانی کا حکم دیا تھا۔ سورۂ حج ہے جس میں قربانی کا بڑے شد و مد کے ساتھ ذکر ہے۔ اسی میں اللہ کی طرف سے اس حقیقت کا اظہار بھی ہے کہ

لَنْ يَّنَالَ اللّٰهَ لُحُوْمُهَا وَلَا دِمَاۤؤُهَا　　خدا کو ہرگز ہرگز نہ تمہاری ان قربانیوں کا گوشت

وَلٰكِنْ يَّنَالُهُ التَّقْوٰى مِنْكُمْ (ع ۵)
پہنچتا ہے اور نہ ان کا خون اس کے حضور صرف تمہارے دل کا جذبۂ اطاعت و نیازمندی پہنچتا ہے[1]۔

تو یہ کوئی ایسا انکشاف نہیں فرما رہے ہیں کہ قربانی کرنے والے سوچنے لگیں کہ ہم کیا بیکار کام کر رہے ہیں؟ (اور خاکم بدہن) خدا کو نظر ثانی کرنی پڑے کہ اس نے کیا بے فائدہ کام کا حکم دے دیا
قل اَتُنَبِّئُوْنَ اللّٰهَ بِمَا لَا يَعْلَمُ (یونس ع ۲)
آپ کہیے کہ کیا تم کوئی ایسی خبر اللہ کو دے رہے ہو جس کا پتہ اُسے نہیں تھا؟

اس حقیقت کا اسے اس وقت علم تھا، جب ہمارے اور ان اہلِ خرد کے ابوالآباء بین الماء والطین تھے۔ مگر پھر بھی اس نے قربانی کا حکم دیا جس کی حکمت کی طرف سورۂ حج کی اسی آیت کے آخری الفاظ (ولکن ینالہ التقویٰ منکم) میں اشارہ بھی کر دیا گیا ہے ——— جس کو یہ اہلِ خرد از خود نہیں سمجھ سکتے تھے ——— اس حکمت کی تشریح آگے کریں گے۔

تیسری بات اسی دوسری بات پر بنیاد رکھ کر یہ لوگ صدقہ و خیرات کی کہتے ہیں مگر یہاں بھی سارے عقلی ادعا کے باوجود یہ لوگ عقل سے اتنا بھی کام نہیں لیتے کہ قرآن کا خدا کیا صدقہ و خیرات سے ناآشنا تھا کہ اس نے **قربانی جیسی** (معاذ اللہ) "نامعقول" نیکی کا حکم دے مارا، کیا ان مسکینوں کو اتنی بھی خبر نہیں کہ قرآن میں صدقہ و خیرات انفاق فی سبیل اللہ کی تعلیم کا کیا مقام ہے اور کس قدر کثرت کے ساتھ اس تعلیم کا اعادہ کیا گیا ہے۔

پھر جبکہ یہ معلوم ہے کہ جس خدا نے قربانی کا حکم دیا ہے وہ نہ صرف صدقہ و خیرات سے بھی آشنا ہے

---

[1] یہ قرآن کا اعجاز ہے کہ اس کی ایک ہی آیت کسی زمانہ میں ایک سمت کی گمراہی کا استیصال کرتی ہے تو دوسرے زمانہ میں اس کی بالکل مقابل سمت کی گمراہی کا توڑ بھی اس طرح کرتی ہے کہ معلوم ہو کہ صرف اسی گمراہی کے سدباب کے لیے نازل ہوئی ہے۔ اس آیت کا شان نزول یہ ہے کہ مشرکین عرب قربانیوں کا گوشت اور خون خانۂ کعبہ کی دیواروں پر لگاتے اور چپٹاتے تھے اور اس طرح گویا اللہ کو پہنچاتے تھے۔ بعض مومنین کو بھی یہی خیال پیدا ہوا تو یہ آیت نازل ہوئی آج بات الٹ گئی ہے کہ لوگ لن ینال اللہ لحومھا ولا دماءھا کہہ کر مسلمانوں کو قربانی سے برگشتہ کرنا چاہتے ہیں تو یہی آیت انھیں جواب دے رہی ہے کہ تم یہ کون سی نئی بات بتا رہے ہو۔ یہ تو اللہ نے خود بتا دی تھی اور اسکے باوجود قربانی کا حکم دیا تھا۔

بلکہ اس کی نظر میں اس کا ایک عظیم مقام ہے۔ اور یہ حقیقت بھی نہ صرف اس پر کھل ہوتی ہے بلکہ اس نے دوسروں پر بھی کھول دی ہے کہ قربانی کے گوشت و پوست سے اللہ کو کچھ نہیں لینا تو کم از کم کسی صاحبِ عقل کو یہ مشورہ دینے میں جلدی تو نہیں کرنی چاہیئے کہ۔

قربانی کے بجائے صدقہ و خیرات کا حکم ہونا چاہیئے تھا۔ قربانی میں تو بجز اضاعتِ مال کے اور کچھ نہیں

جہاں تک "بہیمیت" یا اس سے ملتے جلتے الفاظ سے قربانی کی رسم کو تعبیر کرکے اعتراض پیدا کرنے کا تعلق ہے۔ ہم نے اوپر اس کے جواب میں جو چند جملے کہے ہیں ان کی نوعیت اگرچہ الزامی ہے مگر انہی میں اصل جواب بھی پوشیدہ ہے اور وہ یہ ہے کہ سوال چوپایوں کا، جب انسان اپنے ذائقہ اور اپنی ضرورت کے لیے خون بہاتا ہی ہے۔ اور اللہ تعالیٰ نے ان چوپایوں میں دوسرے منافع کے ساتھ ایک منفعت یہ بھی رکھی ہے۔ تو پھر یہ بڑی ناانصافی اور محسن فراموشی کی بات ہے کہ جس نے ان چوپایوں کو وجود بخشا اس کے نام پر ان کو ذبح کرتے ہوئے آپ کو بہیمیت اور وحشت و بربریت کا تصور آنے لگے۔ حالانکہ اس صورت میں بھی وہ آپ کے اور آپ کے دوسرے بھائیوں کے کھانے ہی کے کام آتے ہیں۔ کوئی بیکار نہیں جاتے۔ ان کی کھالیں اور ان کا اون الگ کتنے ہی وسیع منافع کا باعث بنتا ہے اور یہ سب خدا ہی کے اذن و حکم سے ہوتا ہے۔ پھر خود یہ پسند نہیں ہے کہ اس کے نام پر ذبح کی ہوئی چیز بے کار جائے۔ چنانچہ یہ آیت (لن ینال اللہ لحومھا ولا دماؤھا) مشرکین جاہلیت کے اسی غلط اعتقاد اور غلط طرزِ عمل کی تردید میں نازل ہوئی تھی وہ اللہ کے نام پر ذبح کی ہوئی چیز کا گوشت پوست بھی اللہ ہی کیلئے چھوڑ کر بیکار کرتے تھے، اللہ نے اس کو جہالت کی بات ٹھیرایا اور اجازت دی کہ گوشت کھایا جائے، غریبوں کو کھلایا جائے اور پوست امورِ خیر میں صرف کیا جائے اس کے بعد تو قربانی کو بہیمیت اور وحشیانہ فعل کا نام دینا اور بھی غلط ہو جاتا ہے، اسلئے کہ اب اس ذبیحہ میں اور ہمارے روزمرہ کے ذبیحوں میں اگر کوئی فرق ہے تو صرف ایک اعلیٰ نیت اور مصارفِ خیر کے صرفہ کا!

اس جواب سے "اضاعتِ مال" والے اعتراض کی بے بنیادی بھی پوری طرح آشکار ہو جاتی ہے اب صرف یہ اعتراض کسی سطح بیں اور ظاہر پرست کے ذہن میں رہ سکتا ہے کہ جتنا روپیہ مجموعی اعتبار سے قربانی پر صرف ہوتا ہے اگر یہ روپیہ انفرادی صدقات و خیرات یا کسی اجتماعی نظم کے تحت ناداروں اور مستحق افراد کی فلاح و بہبود میں خرچ کیا جائے تو اس سے قربانی

کی قیمت بہت عظیم اور دور رس فوائد پیدا ہوسکتے ہیں ــــ مگر جیسا کہ عرض کیا گیا یہ اعتراض یورپ کی پھیلائی ہوئی اسی افادیت پرستی کا نتیجہ ہے جس کے مسلط ہو جانے کے بعد آدمی کی نظر میں انسانی اعمال کی قدر و قیمت کا واحد پیمانہ مادی اور ظاہری افادیت بن جاتی ہے۔ اور وہ روحانی حاسہ انسان کھو بیٹھتا ہے جس سے دینی اعمال کی بنیادی قدر و قیمت محسوس کی جاتی ہے اور اعمالِ دینیہ کے اسرار کھلتے ہیں۔

افادیت پرستی کے مارے ہوئے یہ لوگ نقد صدقات وخیرات کو اس لیے معقول نیکی سمجھتے ہیں کہ اس سے بڑے پیمانہ کی اور پائیدار مادی فلاح و بہبود پیدا ہوتی ہے یا ہوسکتی ہے۔ اور اور قربانی کی نیکی اس لیے ان کی سمجھ میں نہیں آتی کہ اس سے کسی بڑے اور دور رس مادی فائدے کا ظہور نہیں ہوتا۔ حالانکہ عزیز بار کر مادی افادیت کی ایک دینی قدر و قیمت کے ساتھ ساتھ صدقہ وخیرات کے نیکی ہونے اور اس میں دینی قدر و قیمت پیدا ہونے کی اصل بنیاد ہرگز یہ نہیں ہے کہ اس سے کوئی چھوٹے یا بڑے مادی فوائد عزیز یا مستحقین کے لیے پیدا ہوتے ہیں۔ صدقہ وخیرات کی شکل میں دینی قیمت پیدا کرنے والی اور اس کو ایک دینی نیکی بنانے والی چیز صرف رضائے الٰہی کی نیت اور دینے والے کا جذبہ و احساس ہے کہ یہ میرے مال پر کے مالک حقیقی کا حق تھا جو میں ادا کر رہا ہوں۔

اس حقیقت کو سمجھ لینے کے بعد اب اصل بات کو سمجھئے کہ نقد صدقہ وخیرات کی بیشک ایک دینی قیمت ہے اور بہت بڑی ہے ــــ مگر

ہر گلے را رنگ و بوئے دیگر است

قربانی کی جو خاص بات ہے وہ اس میں نہیں ہے۔ اس سے مال (سیم وزر) کا حق خداوندی ادا ہوتا ہے۔ اس حقیقت کی یاد دہانی ہوتی ہے کہ یہ اسی کی عطا وعنایت ہے اس سے جذبۂ شکر ابھرتا ہے اور اس طرح رشتۂ عبدیت و معبودیت مضبوط ہوتا ہے ــــ مگر اللہ کی عطا صرف سیم وزر ہی تک تو محدود نہیں ہے۔ اس نے کتنے ہی انواع کے چوپایوں کی صورت میں بھی تو منافع کا ایک خزانہ دے رکھا ہے جس سے انسان دن رات متمتع ہوتا ہے، دودھ پیتا ہے، گوشت کھاتا ہے، کھیتی باڑی کا کام لیتا ہے۔ وغیرہ ذالک، کیا اس جاندار عطا وعنایت میں خدا کا کوئی حق نہیں ہے؟ اس پر اس میں جذبۂ شکر نہیں ابھرنا چاہیے اور اس حقیقت کو یکسر فراموش کئے رہنا چاہیے کہ چوپایوں کی یہ منافع بھری دنیا کس کا فیضِ کرم ہے؟ اور اس عظیم کرم کو رشتۂ عبدیت کی مضبوطی میں سرے سے کام ہی نہ آنا چاہیے؟ــ حالانکہ عبدیت و معبودیت کا تمام تر رشتہ انہی گرہہائے گوناگوں پر استوار ہے ــــ قربانی یہی کام انجام

دیتی ہے[1]۔ چنانچہ فرمایا گیا ہے:

وَلِكُلِّ أُمَّةٍ جَعَلْنَا مَنسَكًا لِّيَذْكُرُوا اسْمَ اللَّهِ عَلَىٰ مَا رَزَقَهُم مِّن بَهِيمَةِ الْأَنْعَامِ (الحج)

اور ہر اُمّت میں ہم نے قربانی کا طریقہ رکھا ہے تاکہ لوگوں کو اللہ کی اس عنایت پر اس کا نام لینے کی توفیق ملے جو اس نے مویشیوں کی صورت میں فرما رکھی ہے۔

ان سب اموال سے بڑھ کر ان پر اللہ کی سب سے بڑی عنایت خود اس کی جان ہے مگر یہ اس کا کرم ہے کہ اس نے اس جان کا . . . . . نذرانہ ان دوسرے جانداروں کی جان کی طرح طلب نہیں کیا لیکن اسلام میں قربانی کی بات جہاں سے چلی ہے یعنی سیدنا ابراہیم و اسمٰعیل (علیہما السلام) کا واقعہ وہ سوچنے والوں کو اس بات کا کھلا اشارہ دیتا ہے کہ قربانی کے حکم میں جہاں یہ حکمت تھی کہ مویشیوں کی صورت میں اللہ کی زبردست عطا کا شکرانہ ادا ہو وہاں ان جانداروں کی قربانی میں یہ رمز بھی رکھ دیا گیا ہے کہ قربانی کرنے والا خود اپنی جان بھی اسی طرح جان آفریں پر نذر کرنے کو تیار ہے[2] مگر چونکہ اجازت نہیں، اس لیے اس کے بدلے میں ایک دوسری جان نذر کرتا ہوا وہ اپنے حقیقی جذبۂ فدائیت کو بشکل مجاز پیش کرتا ہے ـــــ اس طرح اس قربانی میں ایک عظیم عطا کا شکرانہ بھی ہے اور خود اپنی جان کا نذرانہ بھی ـــــ اور یہ بات نقد صدقہ و خیرات سے کسی طرح حاصل نہیں ہو سکتی۔ جبکہ اللہ سے رشتۂ عبدیت کی درستی اور مضبوطی کے لیے اس خانہ کا بھرنا صدقہ خیرات والے خانہ کے بھرنے سے کسی طرح کم ضروری نہیں۔ بلکہ کچھ زیادہ ہی ضروری نظر آتا ہے۔

---

[1] قربانی کی یہی وہ حکمت ہے جس کی طرف "ولٰکن ینالہ التقویٰ منکم" میں بھی اشارہ موجود ہے۔

[2] راقم کا خیال ہے کہ ابراہیم علیہ السلام سے امت مسلمہ کے لیے قربانی کی سنت کا اجراء جو اس طرح کرایا گیا کہ پہلے اسمٰعیل علیہ السلام کو چھری کے نیچے تک پہونچا دیا گیا اور خالانکہ اہل تحقیق کے نزدیک ابراہیم علیہ السلام کے خواب کا اصل منشا یہ نہیں تھا۔ یا تھا بھی تو کم از کم اسمٰعیل علیہ السلام کو قربانی کرا دینا تو مقصود نہیں تھا، تو اس میں ایک حکمت یہ بھی تھی کہ اصل قربانی کو یہ رمز دیا جائے۔ واللہ اعلم بالصواب۔

(از لیوپولڈ ویس (محمد اسد) وکٹر ویلین نومسلم)
ترجمہ و جناب اشتیاق حسین صاحب کوئنز کالج لکھنؤ

حدیث و سنت

پچھلے برسوں میں اصلاح کی بہت سی تجاویز پیش کی جا چکی ہیں، اور بہت سے روحانی اطبا نے اسلام کی علالت کے لیے تیر بہدف دوائیں ڈھونڈیں لیکن اس وقت تک تمام کوششیں بیکار رہیں کیونکہ یہ تمام اطبائے روحانی ــــ یا کم از کم وہ جن کو قوم میں شہرت و مقبولیت حاصل ہے۔ اپنی دواؤں، مقویات اور اکسیری نسخوں کے ساتھ اس قدرتی غذا کا تجویز کرنا بھول ہی گئے، جس پر مریض کے ارتقا کا ابتدائی دور یہ تمام و کمال منحصر تھا۔ یہ غذا سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہے وہ صرف یہی ایک غذا ہے جس کو اسلام کا جسم خواہ بحالت صحت ہو خواہ بیماری قبول کر کے جزو بدن بنا سکتا ہے جب تیرہ سو سال قبل اسلام کے آغاز و ترقی کا راز بخوبی سمجھنے کے لیے سنت رسول ہی کنجی کا کام دیتی ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ ہم اسی کنجی سے اپنے موجودہ انحطاط اور زوال کو بھی نہ سمجھ سکیں اور اس کا مداوا نہ کر سکیں۔

اسلام اور اس کی ترقی دراصل سنت رسول کی پیروی ہی کا نام ہے۔ سنت رسول سے غفلت ہی اسلام کے انحطاط و تفریق کا مترادف ہے۔ عمارت اسلام کا آہنی ڈھانچہ[1] سنت رسول تھا، اگر کسی عمارت کا آہنی ڈھانچہ ــــ نکال ڈالا جائے تو اس عمارت کا گر پڑنا کیونکر تعجب انگیز ہو سکتا ہے۔

یہ سادہ صداقت یعنی سنت رسول کی پیروی کی ضرورت، جس کو اسلامی دور کی تاریخ میں علمائے اسلام مسلمہ طور پر مانتے چلے آئے ہیں آج مغربیت کے اثر کے تحت کچھ ناقابل قبول ہو رہی ہے تاہم صداقت صداقت ہی رہے گی۔ واقعہ یہ ہے کہ صرف یہی صداقت ہے جو ہم کو موجودہ انحطاط اور ابتری سے بچا سکتی ہے۔

یہاں لفظ "سنت" کو وسیع ترین معنی میں استعمال کیا گیا ہے یعنی وہ اسوۂ حسنہ جو کہ رسول اللہ صلعم نے ہمیشہ

؎ مشہور نومسلم محمد اسد صاحب۔
[1] ڈھانچہ ...... یورپ اور امریکہ میں تمام عمارتیں ڈھانچہ پر تعمیر ہوتی ہیں مصنف نے وہاں سے استعارہ کیا ہے۔

اعمال وارشادات سے ہمارے لئے پیش کیا۔ ان کی حیرت انگیز زندگی قرآن کی زندہ تفسیر و تمثیل ہے اور ہم قرآن پاک کا حق اس سے زیادہ ادا نہیں کر سکتے کہ صاحب نزول قرآن علیہ السلام کے نقش قدم پر گامزن ہو جائیں۔

ہم دیکھ چکے ہیں کہ اسلام کا ایک مخصوص کارنامہ یہ ہے کہ اس نے انسانی زندگی کے اخلاقی اور مادی پہلوؤں میں مکمل یگانگت پیدا کر دی ہے، یہ خصوصیت اسلام کو دوسرے فوق الادراک نظاموں (یعنی مذاہب) سے ممتاز کرتی ہے یہی وجہ تھی کہ اسلام اپنے شاندار ابتدائی دور میں جہاں پہنچا باعظمت کامیابی حاصل کی، اسلام دنیا کے لیے ایک نیا پیغام لایا کہ آخرت کی بہبودی کے لیے دنیوی زندگی سے نفرت ضروری نہیں، اسلام کی اسی خصوصیت کی بنا پر رسول اللہ صلعم نے دنیا کو پیغام نبوت پہنچانے کے دوران میں انسانی زندگی کے بظاہر متضاد روحانی و مادی پہلوؤں میں یگانگت کی طرف خاص توجہ فرمائی۔

اسی لیے اگر کوئی شخص رسول اللہ کے ان احکامات کو جو عبادات و روحانیات کے متعلق ہیں ان مسئلوں سے جو اجتماعی........ زندگی سے متعلق ہیں ممتاز اور علیحدہ سمجھے تو کہا جا سکتا ہے کہ وہ اسلام پر گہری نظر نہیں رکھتا، بعض لوگوں کا یہ دعویٰ کہ احکامات متعلقہ عبادات لازمی ہیں اور اجتماعی اور معاشرتی احکامات لازمی نہیں، اتنا ہی کج اور معاندِ اسلام ہے جتنا کہ یہ خیال کہ قرآن کے بعض عام احکامات صرف نزول قرآن کے وقت کے عربوں کے واسطے تھے نہ کہ آج بیسویں صدی کے شائستہ لوگوں کے لیے۔ یہ خیال (اگر غور کیا جائے تو) دراصل رسول اللہ (صلعم) کی شان نبوت کی توہین ہے۔

جس طرح ہر مسلمان کی زندگی کا نقشہ یہ ہونا چاہیے کہ اس کی ذاتی معاشرت و ملت میں حقیقی یگانگت و توازن قائم رہے۔ اسی طرح رسول اللہ صلعم نے جو بھی تجویز کیا وہ [illegible] زندگی کو ایک نیا مجموعہ [illegible] ہی زندگی کے اخلاقی، عملی، انفرادی اور اجتماعی مظاہروں سے ہوتی ہے سنت کے حقیقی اور گہرے معنی یہی ہیں کہ رسول کی زندگی کے مختلف پہلوؤں کے توازن پر غور کیا جائے اور اسی کو اپنا لائحہ عمل بنایا جائے، قرآن کہتا ہے:

مَاۤ اٰتٰىكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ وَمَا نَهٰىكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا	اور جو کچھ رسول اللہ تم کو دیں اس کو قبول کرو اور جس چیز سے منع فرمائیں اس سے پرہیز کرو

اور نیز رسول اللہ نے فرمایا ہے:

تفرقت الیہود علی احدی وسبعین فرقۃ وتفرقت النصاریٰ علی اثنتین وسبعین فرقۃ ستفترق امتی علی ثلاث وسبعین فرقۃ	یہودیوں کے ۷۱ فرقے ہوئے تھے، اور نصرانیوں (عیسائیوں) کے ۷۲ فرقے ہوئے لیکن میری اُمّت کے جلد ہی ۷۳ فرقے ہو جائیں گے۔

(سنن ابو داؤد۔ جامع الترمذی۔ سنن الدارمی۔ مسند احمد حنبل)

یہ یاد رکھنا چاہیے کہ عربی محاورہ میں "ستر" تعداد کثیر کے لیے مستعمل ہوتا ہے اس سے کوئی مخصوص تعداد مفہوم نہیں ہوتی، بظاہر رسول اللہؐ کی مراد یہ تھی کہ مسلمانوں میں عیسائیوں اور یہودیوں سے بھی زیادہ فرقے پیدا ہو جائیں گے، اسی سلسلہ میں رسول اللہؐ نے یہ بھی فرمایا کہ

کلھم فی النار الا واحدۃ — اور علاوہ ایک کے ان میں سے سب دوزخی ہوں گے۔

صحابہؓ نے دریافت فرمایا کہ راہ راست پر کون ہوں گے، تو حضورؐ نے ارشاد فرمایا کہ

ما انا علیہ واصحابی — جو میرے اور میرے صحابہ کے پیرو ہیں

اس سے واضح ہو گیا کہ روحانی کامیابی کی شاہراہ صرف وہی ہیں جو رسول اللہ اور آپ کے صحابہ کے اسوۂ حسنہ کو اپنے لیے شمع ہدایت بنائے ہوئے ہیں۔ قرآن کی بعض آیتیں بھی اس حقیقت کو اس قدر واضح بنا رہی ہیں کہ غلط فہمی کی گنجائش باقی نہیں رہتی۔

فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُونَ حَتَّىٰ يُحَكِّمُوكَ فِيمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوا فِي أَنفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوا تَسْلِيمًا ۝

نہیں نہیں خدا کی قسم ان کا ایمان نا پختہ ہے۔ تا آنکہ وہ اپنے جھگڑوں میں آپ کو حکم بنائیں اور جو کچھ آپ فیصلہ کر دیں، اس میں کوئی اعتراض نہ کریں اور مکمل طور پر سر تسلیم خم کر دیں۔

دوسری جگہ باری تعالیٰ کا ارشاد ہے۔

قُلْ إِن كُنتُمْ تُحِبُّونَ اللَّهَ فَاتَّبِعُونِي يُحْبِبْكُمُ اللَّهُ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوبَكُمْ ۗ وَاللَّهُ غَفُورٌ رَّحِيمٌ ۝ قُلْ أَطِيعُوا اللَّهَ وَالرَّسُولَ ۖ فَإِن تَوَلَّوْا فَإِنَّ اللَّهَ لَا يُحِبُّ الْكَافِرِينَ ۝

(اے محمدؐ) کہدو کہ اگر تم خدا سے محبت رکھتے ہو تو میرا اتباع کرو (اگر تم نے ایسا کیا) تو خدا تم سے محبت کرے گا اور تمھارے گناہ بخش دے گا۔ خدا معاف کرنے والا اور مہربان ہے (یہ بھی) کہدو کہ خدا اور اس کے رسول کی اطاعت کرو۔ اگر وہ اس سے پھر یں گے (تو واضح رہے) کہ اللہ کافروں سے محبت نہیں کرتا۔

اس لیے اسلامی انفرادی اور اجتماعی زندگی کے قانون کی بنیاد قرآن کے بعد سنت رسول ہی ہے واقعہ یہ ہے کہ ہمیں سنت رسول کو قرآنی تعلیم کا واحد صحیح ترجمان سمجھنا چاہیے۔ قرآنی تعلیمات کو عملی زندگی کے ساتھ انطباق دینے اور ان کا مطلب متعین کرنے میں صرف سنت رسول ہی اختلافات کو دور کرنے کا واحد ذریعہ بن سکتی ہے۔ قرآن پاک کی بہت سی آیات کے معنی متشابہ ہیں اور جب تک ہمارے پاس تشریح و تاویل کا کوئی یقینی نظام موجود نہ ہو ان کو مختلف پیرایوں میں سمجھا جا سکتا ہے، علاوہ ازیں عملی زندگی کے بہت سے ایسے اہم مسائل ہیں جن پر قرآن بصراحت روشنی نہیں ڈالتا۔ یہ صحیح ہے کہ قرآن پاک میں شروع سے آخر تک

ایک ہی ڈھنگ غالب ہے کہ لیکن اس سے زندگی کے لئے قابل عمل مسائل کا اخذ کرنا آسان نہیں ہے۔ اگر ہمارا ایمان ہے کہ قرآن ارشاد ربانی ہے جو بہ اعتبار ہیئت خواہ بہ اعتبار مقصد ہر طرح سے مکمل ہے تو منطقی طور پر یہ نتیجہ نکالنا ناگزیر ہے کہ اس کے نزول کا مقصد ہی یہ نہ تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتی ہدایت کے بغیر اس کو استعمال کیا جا سکے، اور اللہ کے رسول کی ذاتی ہدایت ہی کا نام سنّت ہے۔ اگلے باب میں یہ سمجھانے کی کوشش کی جائے گی کہ قرآن پاک کو ہمیشہ کے لیے رسول اللہ کی رہنمایانہ اور اثر آفرین شخصیت سے مربوط رکھنے کے بنیادی اسباب کیا ہیں لیکن عقل بتاتی ہے کہ قرآنی تعلیمات کی عملی ترجمانی کے لیے اس ذات سے بہتر کوئی حکم نہیں ہوسکتا تھا جس کے ذریعہ سے باری تعالیٰ نے (اپنی) تعلیمات کو نوع انسان کے سامنے منکشف کیا۔ آج کل ہم بسا اوقات لوگوں کو یہ کہتے ہوئے سنتے ہیں کہ "ہم کو قرآن کی طرف رجوع کرنا چاہیے ہیں سنت کے غلام بننے کی ضرورت نہیں ہے۔" یہ ان کی اسلام سے ناواقفیت کی دلیل ہے: ان کی مثال اس شخص کی سی ہے جو کہ ایک محل میں تو داخل ہونا چاہتا ہے لیکن اس اصلی اور واحد کنجی کو استعمال کرنا نہیں چاہتا جس کے علاوہ کسی دوسری کنجی سے اس محل کا دروازہ کھل ہی نہیں سکتا۔

اب ایک اور اہم سوال پیدا ہوتا ہے کہ رسول اللہ کی زندگی اور ان کے ارشادات کا ماخذ کہاں تک معتبر اور مستند ہے (ہمارے لیے رسول اللہ کی زندگی اور ان کے ارشادات کا) یہ مخرج احادیث میں، یہ رسول اللہ کے ارشادات اور عمل سے متعلق روایات ہیں جو کہ صحابہ کرام سے مروی ہیں۔ ہجرت کے بعد ہی والی صدیوں میں ان کو صحت اور درستی کے ساتھ جمع کر لیا گیا تھا۔ آج کل بہت سے مسلمان کہتے ہیں کہ ہم سنت پر عمل پیرا ہونے کو تو آمادہ ہیں لیکن ہمارے نزدیک احادیث کا وہ ذخیرہ جس پر (اس وقت) سنت رسول کا قیام ہے ناقابل اعتما ہے۔

احادیث کے مستند ہونے سے اصولاً انکار کرنا اور اس طرح نظام ہی سے بحث کر رہنا آج کل فیشن بن گیا ہے لیکن اس طرز عمل کا کوئی باقاعدہ سبب جواز بھی ہے یا نہیں؟ کیا احادیث کو شریعت اسلام کا مستند ماخذ ماننے سے منکر ہونے کا کوئی اصولی ثبوت بھی ہے یا نہیں؟

چاہیئے تو یہ تھا کہ پرانے اعتقادات کے مخالفین احادیث کے ناقابل اعتماد ہونے کے ایسے یقینی ثبوت بہم پہنچا دیتے کہ احادیث کی صحت ہمیشہ کے لیے ناقابل قبول ہو جاتی لیکن واقعہ یہ نہیں ہے۔ نظام احادیث پر حملہ کرنے کی جملہ کوششوں کے باوجود عہد حاضر کے تمام نقاد خواہ مغربی ہوں یا مشرقی اپنی محض جذباتی نکتہ چینیوں کو باقاعدہ علمی تحقیقات سے ثابت نہیں کر سکے۔ مخالفین کے لیے اپنی مخالفت کے ثبوت بہم پہنچانا در اصل تھا بھی ناممکن کیونکہ احادیث کے قدیم جمع کرنے والوں نے خاص کر امام بخاری اور امام مسلم نے ہر ہر روایت کی صحت کو ہر امکانی

طریقے سے جانچنے میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی، انھوں نے احادیث کی صحت کے جانچنے کے لیے جو سخت اور بلند معیار مقرر کیے وہ ان معیاروں سے کہیں زیادہ سخت ہیں جو کہ یورپ کے مورخ قدیم تاریخ کے ماخذ پر کام کرنے میں استعمال کرتے ہیں۔

قدیم محدثین یعنی بڑے بڑے فاضل جنھوں نے احادیث کی تحقیق پر پوری پوری توجہ صرف کی تھی انھوں نے انتہائی محتاط طریقہ تحقیق برت کر احادیث کی صحت کی جانچ کی تھی اس چھوٹے سے مقالہ میں ان کے تحقیقی پر مکمل بحث تو ناممکن ہے لیکن اتنا بتلا دینا ضروری ہے کہ انھوں نے اپنی تحقیقی مساعی سے علم الحدیث کو ایک مکمل اور باقاعدہ مرتب کیا ہوا علم سائنس بنا دیا، جس کا مقصد یہ ہے کہ رسول اللہ کی روایات یعنی احادیث کے الفاظ و معانی اور اس کے طریقۂ روایت کی مکمل تحقیق کی جا سکے۔ اسی علم (علم الحدیث) کے ایک منضبط شعبہ نے بڑی کامیابی کے ساتھ تمام راویان احادیث کی مکمل سوانح عمریوں کا ایک مربوط سلسلہ مرتب کر لیا ہے۔ یعنی جن بزرگوں کے ذریعہ احادیث آنحضرتؐ کے زمانے سے سلسلہ بسلسلہ جامعین احادیث کو پہنچیں جامعین احادیث نے ان راویوں (جن میں مرد اور عورتیں دونوں شامل ہیں) کے حالات زندگی کی ہر ہر نقطہ سے مکمل تحقیق کر لی ہے اور ان میں سے صرف انھیں کو معتبر تسلیم کیا ہے، جن کی زندگی اور روایت حدیث کا طریقہ جامعین احادیث کے مقرر کردہ معیار پر پورا اترا ہے۔ واضح رہے کہ جامعین احادیث کا یہ معیار عام امکانی لحاظ سے زیادہ دشوار سمجھا جاتا ہے۔ اس لیے اگر آج کوئی شخص کسی خاص حدیث کی صحت کو یا احادیث کی صحت کو بحیثیت مجموعی تسلیم کرنے سے انکار کرے تو ان کو غلط ثابت کرنے کی ذمہ داری اسی پر عائد ہوگی، کسی تاریخی واقعہ کے ماخذ میں کوئی نقص ثابت کیے بغیر اس کی صحت سے منکر ہونا اصولاً سخت بے انصافی ہے اگر کسی روایت کے ماخذ کی صحت کے خلاف یا اس کے کسی راوی کے معتبر ہونے کے خلاف کوئی باقاعدہ اور باضابطہ اعتراض موجود نہیں ہے اور ساتھ ہی ساتھ اس واقعہ کی تردید میں کوئی اور بیان بھی محقق نہیں ہے تو ہم کو اس روایت یا حدیث کو صحیح تسلیم کرنا پڑے گا۔

فرض کیجیے کہ کوئی شخص محمود غزنوی کی ہندوستان کی جنگوں کا ذکر کر رہا ہو اور آپ کھڑے ہو کر یہ کہنے لگیں "مجھے یقین نہیں کہ محمود غزنوی کبھی ہندوستان آیا ہو۔ یہ محض ایک روایت ہے جس کا کوئی تاریخی ثبوت نہیں" اس صورت میں کیا ہوگا۔ فوراً تاریخ کے ماہر آپ کی غلطی کو درست کرنے کی کوشش کریں گے، اور ایسی تاریخوں اور تذکروں کے اقتباسات آپ کے سامنے پیش کریں گے۔ جو اس مشہور سلطان کے ہمعصروں کی اطلاعات پر مبنی ہوں یہی اس امر کا یقینی ثبوت ہوگا کہ محمود متعدد بار ہندوستان آیا۔ اس صورت میں آپ کو وہ ثبوت تسلیم کرنا پڑے گا ورنہ آپ کو وہی سمجھا جائے گا کہ بلا کسی ثبوت ہی کے آپ مستند تاریخی واقعات کو جھٹلا رہے ہیں۔ اگر یہ طریقہ استدلال

صحیح ہے تو بآسانی کہا جا سکتا ہے کہ آج کل کے نکتہ چیں احادیث کے معاملہ میں اسی بااصول اقدام سے کام کیوں نہیں لیتے ؟

کسی حدیث کے غلط ہونے کی پہلی وجہ تو یہ ہوسکتی ہے کہ اس کے پہلے راوی یعنی کسی صحابی نے عمداً دروغ بیانی کی ہے یا یہ کہ بعد کے کسی راوی نے جھوٹ سے کام لیا۔ جہاں تک صحابہ کرام یعنی آنحضرت صلعم کے صحبت یافتہ مسلمانوں کا تعلق ہے دروغ بیانی کا امکان ہی باقی نہیں رہتا۔ اس قسم کے مفروضات محض وہم کی خلاقی ہوسکتے ہیں۔ اور مسئلہ کے اس پہلو کو بخوبی سمجھنے کے لیے مسئلہ کے نفسیاتی پہلو پر غور و خوض کرنے کی ضرورت ہے۔ یہ تاریخ انسانی کا ایک نمایاں واقعہ ہے کہ رسول اللہ صلعم کی شخصیت نے صحابہ کرامؓ پر ایک زبردست اثر مرتب کر دیا تھا۔ تاریخ میں یہ واقعہ مکمل تحریری ثبوت کے ساتھ محفوظ ہے۔ کیا یہ بات قابل اعتماد ہوسکتی ہے کہ جو لوگ رسول اللہؐ کے حکم پر اپنی جان اور اپنا تمام دنیوی اثاثہ قربان کر دینے کو تیار ہوں وہ رسولؐ کے الفاظ کو توڑ مروڑ کر کچھ کا کچھ کر دیں گے؟ رسول اللہ نے فرمایا ہے۔

من کذب علی متعمداً فلیتبوأ مقعدہ من النار۔

جو جان بوجھ کر میری طرف سے جھوٹ منسوب کرے اس کا مقام دوزخ ہوگا۔

(صحیح بخاری، سنن ابوداؤد، جامع الترمذی، سنن ابن ماجہ، سنن الدارمی، مسند ابن حنبل)

صحابہ کرام کو اس کا علم تھا، وہ رسول اللہ کے الفاظ پر مکمل یقین رکھتے تھے کیونکہ وہ رسول کو خدا کی طرف سے بولنے والا تصور کرتے تھے، کیا نفسیاتی نقطۂ نظر سے ان حالات میں یہ شبہ کیا جا سکتا ہے کہ انھوں نے رسول کے اس کھلے حکم کی نافرمانی کی ہوگی ؟

عدالت فوجداری کی کارروائیوں میں جج کے سامنے ہمیشہ یہ سوال رہتا ہے کہ ارتکاب جرم سے کس کا فائدہ مقصود تھا، احادیث کے مسئلہ میں بھی یہ اصول استعمال کیا جا سکتا ہے۔ چند احادیث کے علاوہ جن کا تعلق چند افراد اور گروہوں کی حیثیت و رتبہ سے ہے (مثلاً وہ احادیث جن کا تعلق رسول اللہؐ کی وفات کے بعد والی پہلی صدی کی مختلف سیاسی جماعتوں سے ہے اور جن کو قریب قریب تمام محدثین نے مسلمہ طور پر مان کر چھوڑ دیا ہے) کسی حدیث کے وضع کرنے اور رسول اللہؐ کی باتوں کو غلط پیش کرنے میں کسی شخص کا کوئی فائدہ "مقصور نہیں ہوسکتا تھا۔

جن احادیث میں کسی فرد یا گروہ کا فائدہ مقصود تھا ان میں امکان تھا کہ ذاتی فائدہ کی بنا پر وضع کر لیا گیا ہو، اسی توجیہہ سے کام لیتے ہوئے محدثین میں سب سے زیادہ معتبر امام بخاری اور امام مسلم نے بڑی کوشش سے اپنے مجموعوں سے ایسی تمام احادیث کو نکال دیا ہے جن کا تعلق ایسے گروہ بندیوں سے ہے

احادیث باقی رہیں ان سے کسی راوی کو ذاتی فائدہ پہنچنے کا امکان متصور نہیں ہو سکتا اس لیے ان کو موضوع قرار نہیں دیا جا سکتا۔

حدیث کی صحت پر اعتراض کرنے کی ایک ... کہا جا سکتا ہے ممکن ہے کہ ان ... سے جنھوں نے رسول اللہ سے سنا یا دوسرے کسی راوی یا راویوں سے غیر محسوس طریقہ پر محض غلط فہمی ... اور نفسیاتی سبب کی بنا پر غلطی ہوئی ہو لیکن کم از کم جہاں تک صحابہ کرامؓ کا تعلق ہے۔ حالات کی اندرونی یعنی نفسیاتی شہادت کی بنا پر اس قسم کی غلطی کا زیادہ امکان باقی نہیں رہتا، ان لوگوں کے لیے جو رسول اللہ صلعم کے ساتھ رہتے تھے، رسول اللہ صلعم کے اقوال و الفاظ انتہائی وزنی اور قابل ... تھے، اس کی وجہ صرف یہ نہ تھی کہ رسول اللہ صلعم کی شخصیت نے انھیں مسحور کر رکھا تھا بلکہ وجہ یہ تھی کہ ان کا اعتقاد تھا کہ خدا کا حکم ہے کہ ہم اپنی زندگی کو مکمل طور پر رسول اللہ صلعم کی ہدایت اور مثال کے مطابق منظم کریں، اس لیے رسول اللہ صلعم کے اقوال کا مسئلہ ان کے لیے غیر اہم نہ تھا بلکہ لوگ ان کے ہر ہر قول کو یاد کرنے اور اپنے ذہن میں محفوظ رکھنے کی کوشش میں بڑی بڑی تکلیفیں برداشت کرتے تھے، بیان کیا جاتا ہے کہ رسول اللہ صلعم کے پاس رہنے والے صحابہ کرام نے دو دو کے جوڑ بنا رکھے تھے تاکہ باری باری ان دونوں میں سے ایک ایک رسول اللہ صلعم کی خدمت میں حاضر رہے اور دوسرا زندگی کی دوسری ضروریات میں مشغول ہو اور ان میں سے ہر ایک رسول اللہ کے پاس رہ کر جو کچھ دیکھتا سنتا دوسرے کو بتلا دیتا، اس سے پتہ چلتا ہے کہ صحابہ کرامؓ کو کس قدر فکر رہتی تھی کہ کہیں رسول اللہ صلعم کا کوئی فعل یا ان کا کوئی ارشاد ان کے علم میں آنے سے نہ رہ جائے، جب یہ صورت حال تھی تو کیا یہ سمجھا جا سکتا ہے کہ صحابہ کرامؓ، رسول اللہ صلعم کے عین الفاظ یاد رکھنے کی طرف سے بھی بے فکر نہیں ہوتے تھے جب کہ صد ہا صحابہ کرامؓ مکمل قرآن کو ایک ایک لفظ کے ... ساتھ اپنے حافظہ میں محفوظ رکھ سکے تو اس میں شک نہیں ہو سکتا کہ انھیں صحابہ اور ان کے تابعینؓ[1] نے رسول اللہ صلعم کی ایک ایک حدیث کو بھی بے کم و کاست اپنے حافظہ میں محفوظ رکھا ہو، علاوہ ازیں محدثین نے صرف انھیں احادیث کو مکمل طور پر معتبر مانا ہے جو مختلف اور آزاد راویوں کے سلسلہ سے مروی ہیں۔

تحقیق کی صحت کے اس اہتمام کے باوجود بھی کسی مسلمان کے نزدیک کبھی بھی احادیث کا وہ مرتبہ یا غیر نزاعی حیثیت نہیں رہی جو کہ قرآن کی ہے۔ احادیث کی تحقیق کا سلسلہ کبھی بھی بند نہیں ہوا، یہ واقعہ

---

[1] تابعین، وہ بزرگ جنھوں نے صحابہ کرامؓ کی صحبت سے کسب فیض کیا ہو۔

کی لاتعداد موضوع حدیثیں ابھی موجود ہیں یا محدثین کی نظر سے پوشیدہ نہیں رہا ہے۔ یورپ کے نکتہ چیں غالباً شرارتاً ایسی سمجھے ہوئے ہیں۔ اس کے برخلاف احادیث کے باضابطہ تحقیقی علم کی ابتدا ہی اس وجہ سے ہوئی کہ صحیح اور موضوع احادیث میں تمیز کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی اور اگر مقابلۃً کم مستند محققوں کو بھی نہ شمار کیا جائے تو امام بخاری اور امام مسلم جیسے محقق حدیث تو اسی تحقیقی تحلیل نے پیدا کئے۔ اس لئے موضوع حدیثوں کا وجود مستند احادیث کی صحت کے خلاف کوئی ثبوت نہیں ہے اور یہ بالکل اسی طرح جیسے کہ الف لیلہ کے افسانے اسی زمانہ کے تاریخی واقعات کی صحت کے مخالف یا موافق کوئی ثبوت نہیں سمجھے جا سکتے۔

آج تک کوئی نکتہ چیں باقاعدہ طور پر یہ نہیں ثابت کرسکا کہ معتبر محدثین کے مقرر کردہ معیار کے مطابق صحیح احادیث بھی غلط ہیں، مستند احادیث کو مجموعی طور پر یا بحیثیت حجت ماننے سے انکار کرنا جیسے پہلے بھی کیا جا چکا ہے محض ایک نظری امر ہے لیکن غیر متعصبانہ علمی تحقیقات سے ثابت نہیں مگر موجودہ زمانہ کے بہت سے مسلمانوں کی اختلافی روش کا مقصد اصلی سمجھنا زیادہ دشوار نہیں ہے۔ ہم اپنے موجودہ ذلیل طرز معاشرت اور طرز تخیل کو اسلام کے اس صحیح معیار پر تو پہنچا نہیں سکتے جو ہمارے رسول کی سنت سے نمایاں ہے اسلئے اپنی اور اپنے اعمال کی کمزوریوں کو حق بجانب ثابت کرنے کیلئے احادیث کے نام نہاد نکتہ چیں کوشش کر رہے ہیں کہ سنت رسول کی اتباع کی ضرورت ہی کو باقی نہ رکھا جائے کیونکہ اگر سنت رسول کے اتباع سے چھٹکارا مل جائے تو پھر "عقلیت"[1] کی روشنی میں ہر ایک حسب منشا ترجمانی کی جا سکتی ہے، لیکن اس طرح اسلام کی وہ مابہ الامتیاز حیثیت کہ وہ فرد و ملت دونوں کے لئے ایک اعلیٰ اخلاقی اور عملی آئین پیش کر رہا ہے مسخ کردہ جائے گی۔

آج کل جب اسلامی ممالک میں مغربی تہذیب کا اثر روز بروز بڑھتا جا رہا ہے مسلمان "دانشمند" جماعت کے اس عجیب و غریب طرز عمل کی ایک وجہ اور بھی ہے مغربی طرز معاشرت کی پیروی اور سنت رسول کا اتباع بیک وقت ناممکن ہے لیکن عہد حاضر کے مسلمان مغربی تہذیب اور ہر مغربی شے کی قدر و منزلت کے لئے محض اس وجہ سے تیار ہیں کہ وہ غیر ملکی بااثر اور مادی حیثیت سے خیرہ کن ہے، رسول اللہ ﷺ کی روایات اور ان کے ساتھ ساتھ سنت رسول ﷺ کے کل نظام ہی کی انتہائی غیر مقبولیت کا سب سے بڑا سبب بھی موزونی ہے۔"

مغربی تہذیب کا سنت رسول ﷺ کے بنیادی اصولوں سے اس قدر دور ہے کہ دلدادۂ مغرب کو سنت رسول

---

[1] عقلیت (Rationalism) ہر کام کو عقل کی روشنی میں کرنے کا دعویٰ۔

سے مشاہدہ پانے کے لیے اس کے علاوہ کوئی چارہ باقی نہیں رہتا کہ سنتِ رسولؐ کو مسلمانوں کے لیے لازمی ماننے سے یکسر انکار کر دے کہ اس کی بنیاد غیر معتبر روایات پر ہے" اس سیدھے سادے لیکن بے اصول عمل کے بعد قرآنی تعلیمات کا اس طرح توڑ موڑ لینا کہ وہ "روحِ مغرب" کے مطابق معلوم ہونے لگیں چنداں دشوار نہیں رہتا۔

روحِ سنّت

احادیث کے تاریخی طور پر قابلِ اعتبار ثابت ہو جانے کے بعد جس قدر اس کی (کی) بلکہ شرعی حیثیت اہم ہو جاتی ہے۔ اسی قدر یہ سوال بھی اہم ہو جاتا ہے کہ ان پر عامل ہونے کے لیے کوئی باطنی اور روحانی تائید بھی ہے یا نہیں۔ کیا صحیح طور پر اسلامی زندگی سے اخذ کئے ہوئے اعمال، رسوم اور اوامر و نواہی پر عامل ہوئے بغیر اسلام کی حقیقت سے فیضیاب ہونے کا کوئی طریقہ نہیں ہے خاص کر جب کہ اوامر و نواہی میں سے بعض تو حیاتِ انسانی کی معمولی باتوں سے متعلق ہیں، اس میں شک نہیں کہ آپ کی ذاتِ نوعِ انسان میں سب سے افضل تھی لیکن اس کے باوجود کیا آپ کی زندگی کی تمام رسمی تفصیلات کی پیروی کو ضروری قرار دینا انسان کی انفرادی آزادی کے خلاف نہ ہوگا، یہ ایک ایسا اعتراض ہے جس کو مخالفِ اسلام نکتہ چین اکثر پیش کرتے رہے ہیں، ان کا خیال ہے کہ سنت کو سختی کے ساتھ ضروری قرار دینا ہی دنیائے اسلام کے مابعد زوال کا باعث ہوا ان کا خیال ہے کہ سنت کا لازمی ہونا انسان کی آزادیٔ عمل پر حملہ آور ہو کر بالآخر جماعت کی قدرتی ترقی کو روک لیتا ہے۔

کیا ہمارے پاس اس اعتراض کا کوئی معقول جواب ہے یا نہیں؟ اسلام کے مستقبل کے لیے یہ چیز انتہائی ضروری ہے کہ مسئلہ سنت کے متعلق ہمارا کیا طرزِ عمل ہونا چاہیے۔ اسلام کے متعلق ہمارے طرزِ عمل کا تعین بھی اسی پر مبنی ہے۔

ہمیں فخر ہے اور یہ فخر حق بجانب ہے کہ اسلام بحیثیت مذہب پُراسرار کلیسائی[1] اعتقادات پر مبنی نہیں ہے۔ بلکہ عقلِ نکتہ چین اس کی صداقت کی ہر وقت تحقیق کر سکتی ہے، اس لیے ہمارا حق ہے کہ اس بات کے جان لینے کے علاوہ سنت کی پیروی ہم پر ضروری ہے یہ بھی سمجھیں کہ ایسا کیوں کیا گیا ہے۔

یہ مسئلہ خاص طور پر اہم ہے کہ اسلام زندگی کے تمام پہلوؤں کی وحدت اور یگانگت کی حقیقی تفہیم کی طرف رہبری کرتا ہے۔ اس وحدتِ مقصود تک پہنچانے کا ایک ذریعہ ہونے کے باعث اس مذہب میں خود بھی مختلف نظریوں کا ایک ایسا مکمل اجتماع موجود ہے جس میں کسی چیز کے شامل کرنے یا گھٹانے کی گنجائش نہیں، اسی لیے

---

[1] کلیسائی اعتقادات .... وہ عقیدے جن پر یقین رکھنا ضروری قرار دے دیا جائے خواہ عقلِ انسانی اس کو مانے یا نہ مانے۔

اسلام یعنی انتخاب[1] مسائل و اصول (تلفیق) کی مطلق گنجائش نہیں جو اسلامی تعلیمات قرآن یا ارشاد رسول ﷺ سے ثابت ہیں ان کو بہ تمام و کمال تسلیم کرنا چاہیے ورنہ ان کی اہمیت باقی نہیں رہ سکتی، اسلام کے متعلق ایک بنیادی غلط فہمی یہ ہے کہ اسلام عقلی مذہب ہونے کے باعث دینی تعلیمات میں ہر فرد کو حق انتخاب دیتا ہے۔ یہ دعویٰ[2] مذہب استدلال کے متعلق ایک عام غلط فہمی پر مبنی ہے عقلی استدلال کے حقیقی معنی اس معنی سے بہت مختلف ہیں جو کہ ہم نے عام طور پر سمجھ رکھے ہیں، مختلف زمانوں کے فلسفے جس کا نمایاں طور پر ہماری تائید کرتے ہیں، مذہبی معاملات میں عقل کا کام ضبط و تنظیم کا ہے، اس عقل کا فرض یہ ہے کہ انسانی دماغ پہ کوئی ایسا بار نہ پڑنے دے جس کا وہ متحمل نہ ہو سکے یعنی اس پر کوئی ایسے فرائض عائد نہ کئے جائیں جو اس کی سمجھ میں نہ آسکیں، اس کے لیے فلسفہ کی جادوگری کی حاجت نہ ہو، جہاں تک اسلام کا تعلق ہے غیر متعصب انسانی عقل بار بار اس پر مکمل اعتماد کا اظہار کر چکی ہے اس کے یہ معنی نہیں کہ ہر شخص جو اسلام سے دو چار ہو اس کی تعلیمات کو لازمی طور پر تسلیم ہی کرلے۔ اس کا تعلق قلبی میلان اور بڑی حد تک روحانی تنویر یا بہ الفاظ قرآن پاک "ہدایت" پر مبنی ہے لیکن اس میں شک نہیں کہ کوئی غیر متعصب انسان یہ نہیں کہہ سکتا کہ اسلام میں کوئی چیز بھی خلاف عقل ہے۔ یہ صحیح ہے کہ اس کی بعض چیزیں ماورائے عقل ہیں لیکن خلاف عقل کچھ نہیں ہے۔

اس حد تک مذہبی معاملات میں عقل کا کام صرف یہ ہوا کہ اپنی انفعالی حیثیت قائم رکھتے ہوئے تمام احکام مذہبی کا جائزہ لیتی رہے، عقل کو مذہبی احکام میں ان کی معقولیت و عدم معقولیت پر صرف ہاں یا نہیں کہنے کا اختیار ہے۔ گویا وہ صرف "ہاں" "یا نہیں" کہنے کا ایک آلۂ اندراج[3] ہے لیکن نام نہاد استدلال پسندی کا یہ حال نہیں ہے یہ صرف جائزہ اور اندراج پر قناعت نہیں کرتا بلکہ جلد ہی تردیدی تفکر[4] شروع کر دیتا ہے، عقل محض کی طرح اس کی تاثر پذیری[5] بے لوث نہیں ہے بلکہ انتہائی اغراض زدہ[6] اور محکوم جذبات ہے۔ عقل اپنی خامیوں سے واقف ہوتی ہے لیکن استدلال پسندی کا احمقانہ دعویٰ ہے کہ ہر فرد و احد اپنے چھوٹے سے دائرہ کے

---

[1] انتخابیت .... مختلف گروہوں کے مسلکوں سے انتخاب کرنے اور اس مرکب سے ایک نیا مذہب ترتیب دے لینے کی روش تلفیق ہے۔ [2] استدلال پسندی .... یہ اصول کہ مذہب کی بنا عقل پر ہونی چاہیے۔

[3] آلۂ اندراج .... آج کل اکثر آلات اپنے عمل کا اندراج بھی کرتے جاتے ہیں جس کو دیکھ کر بعد میں بتایا جا سکتا ہے کہ کیا اور کتنا کام ہوا۔

[4] تردیدی تفکر .... تردیدی خیالات پر دوڑ جانے والی ذہنی کیفیت۔

[5] اثر پذیری .... جو بیرونی اثرات کو قبول کر سکے یعنی اپنا اثر ڈال سکیں۔

[6] اغراض زدہ .... وہ ذہنی کیفیت جس کا تقاضا یہ ہو کہ وہ صرف اپنے ہی اغراض دیکھے۔

اللہ بھی تمام عالم اور اس کے رموز پر حاوی ہے۔ یہ مذہبی معاملات میں چند امور کے عارضی یا مستقل طور پر ماورائے عقل ہونے کے امکان ہی کو تسلیم کرنے کو تیار نہیں ہوتا، لیکن ستم ظریفی یہ ہے کہ مذہب استدلال کو سائنس کے اکثر حقائق میں ماورائے عقل ہونے کا امکان تسلیم ہے۔

اس ناکارہ استدلال پر مذہب کے متعلق غیر معمولی مبالغہ بھی آرہ اسباب میں شامل ہے جس کی وجہ سے جدت پسند مسلمان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی کے سامنے سر تسلیم خم کرنے سے منکر ہو رہے ہیں۔

لیکن آج یہ بدیہی امر ثابت کرنے کے لیے کہ انسانی عقل کی رسائی کا دائرہ نہایت محدود ہے، کانٹ جیسے فلسفی کی ضرورت نہیں ہے۔ ہم اچھی طرح جانتے ہیں کہ فطرتاً ہمارا ذہن مخلوقات کو من حیث المجموع سمجھنے سے قاصر ہے ہم ہر شے کی تفصیل سمجھنے کی قدرت رکھتے ہیں لیکن مجموعی طور پر مخلوقات کی کنہ ہماری عقل کی دسترس سے باہر ہے۔ ہم نہیں جانتے کہ ازل اور ابد کیا ہیں۔ ہم نہیں کہہ سکتے کہ "زندگی" کیا ہے۔ اس لیے مذہبی معاملات میں جن کا تعلق ماورائے عقل بنیادوں سے ہے، ہم کو لازمی طور پر ایک ایسے رہنما کی ضرورت ہے جس کا ذہن معمولی عقلی قوت استدلال کے علاوہ جو ہر انسان کو ملا ہے کچھ غیر معمولی توفیق لے کر پیدا ہوا یعنی ایک ایسے شخص کی حاجت ہے جس کا قلب نور حق سے منور ہو یعنی ایک پیغمبر کی۔

اگر ہم کو یقین ہے کہ قرآن کلام اللہ ہے۔ اگر ہم کو یقین ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم خدا کے پیغمبر تھے تو ہم نہ صرف اخلاقاً بلکہ ذہناً و عقلاً بھی مجبور ہیں کہ ان کی کورانہ پیروی کریں۔ یہاں لفظ "کورانہ" کے یہ معنی نہیں کہ ہم اپنے قوائے عقلیہ کو رخصت کردیں۔ ہم کو چاہیے کہ اپنی عقلی قوتوں سے ان کے دائرہ کے اندر پورا پورا کام لیں یعنی کوشش کرنا چاہیے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے احکام کی علت غائی کو معلوم کریں، لیکن خواہ ہم ان احکام کی علت غائی کو سمجھ سکیں یا نہیں بہر صورت ہم پر ان کی تعمیل لازمی ہے۔ اس لحاظ سے ایک مسلمان کی مثال اس فوجی سپاہی سے دی جاسکتی ہے جس کو اس کے جنرل کی طرف سے ایک اہم مورچہ سنبھالنے کا حکم ملا ہے ایک عمدہ سپاہی حکم کی فوری تعمیل کرے گا۔ اگر اس حکم کی تعمیل کے دوران میں وہ سپاہی اپنے جنرل کے حکم کی علت غائی کو سمجھ لے تو اس کو اور اس کی ذات اور نیز اس کی فوج کو اس سے مزید فائدہ پہونچے گا لیکن اگر سپاہی فوراً جنرل کے حکم کے باطنی مقصد کے سمجھنے سے قاصر بھی ہے تو اس کو یہ حق نہیں ہے کہ جنرل کے حکم کی تعمیل سے باز رہے یا تاوقتیکہ اس کی علت سمجھ میں نہ آجائے اس کی تعمیل کو ملتوی رکھے یہی حال ہر مسلمان کا ہونا چاہیے۔ مسلمان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو نوع انسان کا بہترین کمانڈر سمجھتے ہیں، اس لیے قدرتاً ہمارا اعتقاد ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو جو ہی نسبت مذہب کے روحانی اور اجتماعی پہلوؤں کا کہیں زیادہ علم تھا۔ ان کے ہر امر و نہی میں کوئی نہ کوئی اہم علت غائی پیش نظر رہتی تھی جو کہ ان کے نظر میں نوع انسان کی روحانی

اور سماجی بہبودی کے لیے لابدی ہوتی تھی، بعض صورتوں میں تو یہ مقصد صاف نمایاں نظر آتا ہے اور بعض اوقات یہ مقصد اصلی معمولی انسان کی نا پختہ نظر سے کم و بیش پنہاں رہتا ہے۔ بعض اوقات ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے انتہائی گہرے مقصد کو بھی سمجھ لیتے ہیں لیکن بسا اوقات ہماری سمجھ صرف سطحی اور فوری مقصد تک پہنچتی ہے۔ بہر حال ہم ہر صورت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے احکام کی تعمیل کے لیے مجبور ہیں خواہ ان احکام کی صحت معقولی طور پر ثابت ہو جائے۔ اس کے علاوہ اور کوئی امر ممکن نہیں ہو سکتا۔ یہ صحیح ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعض احکام بدیہی طور پر دوسرے احکام سے کہیں زیادہ اہم ہیں اور ہم کو زیادہ اہم احکام کو مقابلۃً کم اہم احکام پر ترجیح دینا ضروری ہے لیکن ہم کو کوئی حق نہیں کہ ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے کسی حکم کو بھی خواہ وہ بظاہر کتنا ہی غیر ضروری معلوم ہوتا ہو پس پشت ڈال دیں کیونکہ قرآن میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق ارشاد ربانی ہے کہ

وَمَا يَنطِقُ عَنِ الْهَوَىٰ　　وہ اپنی من مانی بات نہیں کہتے۔

یعنی ان کے ارشادات کسی نہ کسی واقعی ضرورت پر مبنی ہوتے ہیں اور وہ وہی ارشاد فرماتے ہیں جو کہ حکم رب ہوتا ہے اسی لیے ہمارا فرض ہے کہ اگر ہم سچے مسلمان بننا چاہتے ہیں تو سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر صورتاً اور معناً عمل کریں۔

جب کہ مسلمان کے لیے سنت رسول ﷺ کی پیروی کی واقعی ضرورت ثابت ہو گئی تو اس کا حق بلکہ فرض ہے کہ اسلام کے مذہبی اور اجتماعی نظام کے اندر مقام سنت کی تحقیق کرے اور معلوم کرے کہ ان مفصل اخلاقی قوانین و ضوابط کا روحانی مقصد کیا ہے جو کہ مسلمان کی زندگی پر پیدائش سے لے کر موت تک حاوی رہتے تھے، اور جن کے عمل سے زندگی کے اہم ترین پہلوؤں سے لے کر نہایت معمولی اور غیر اہم پہلو تک بچے نہیں ہیں، کیا یہ نظام بے معنی ہے؟ کیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس حکم میں کہ آپ کے پیرو ہر حکم میں آپ کے نقش قدم پر چلیں کوئی خاص فائدہ مد نظر رکھا گیا ہے؟ اگر میرے دونوں ہاتھ یکساں پاک و صاف ہیں تو کیا مضائقہ ہے کہ میں خواہ داہنے ہاتھ سے کھانا کھاؤں خواہ بائیں سے؟ اگر ایسا نہیں ہے تو اس قسم کی پابندیاں ہم پر کیوں عائد کر دی گئی ہیں، میرے داڑھی رکھنے یا منڈانے میں کیا فرق واقع ہوگا؟ کیا یہ امور محض دکھاوے نہیں ہیں؟ کیا افراد کی ترقی یا جماعت کی بہبودی میں ان امور کا کوئی خاص اثر ہے۔

اگر ہم پیروئی سنت ہی پر اسلام کے قیام و زوال کا انحصار سمجھتے ہیں تو ہمارا فرض ہے کہ ان اعتراضات کا جواب دینے میں ذرا دیر نہ کریں۔

جہاں تک مجھے علم ہے قیام سنت کے تین مخصوص اغراض ہیں۔

پیروئ سنت کی پہلی غرض یہ ہے کہ انسان کو اس طرح باقاعدہ تربیت ملے کہ اس میں بالاستقلال باطنی احساس، کامل بیداری اور خود نظمی[1] کا مادہ پیدا ہو جائے اور بے ضابطہ اعمال کی عادت جاتی رہے کیونکہ بے ضابطہ اعمال و عادات انسان کی روحانی ترقی کے راستہ میں سخت رکاوٹیں پیدا کر دیتے ہیں جیسے کہ دوڑنے والے گھوڑے کے راستہ میں وہ پتھر وغیرہ جن سے گھوڑا ٹھوکر کھا کر پیچھے رہ جائے۔ چونکہ یہ بے ضابطگیاں روحانی سکون کو برباد کر دیتی ہیں۔ اس لیے ضرورت ہے کہ ان کو جس قدر ممکن ہو کم کیا جائے ضرورت ہے کہ ہمارے ہر عمل کی تعیین قوت ارادی سے ہوا دراسے اخلاقی محاسبہ کے تحت رکھا جائے لیکن اس مقصد کی انجام دہی کے لیے ضروری ہے کہ ہم اپنی نگرانی خود کرنا سیکھیں، ایک مسلم کی اس دائمی احتساب نفس کی ضرورت کو حضرت عمر بن خطابؓ نے کیا خوب پیرایہ میں پیش کیا ہے:

حاسبوا انفسکم قبل ان تحاسبوا۔　　محاسبہ کیے جانے سے قبل اپنا محاسبہ خود کرو۔

اور رسول اللہؐ نے ارشاد فرمایا ہے:

اُعبد ربک کانک تراہ۔　　اپنے رب کی بندگی اس طرح کرو گویا کہ تم اس کو دیکھ رہے ہو۔

(صحیح بخاری، صحیح مسلم، سنن ابو داؤد، سنن النسائی)

پہلے بھی بیان کیا جا چکا ہے کہ اسلام کے عبادت کے تخیل میں صرف رسمی نماز و روزہ ہی شامل نہیں ہے بلکہ وہ ہماری مکمل زندگی پر حاوی ہے۔ اسلامی عبادت کا مقصد یہ ہے کہ ہماری ذات کے روحانی اور مادی پہلوؤں میں یگانگت پیدا کر دی جائے۔ اس لیے ہماری کوشش کا یہی مقصد بھی ہونا چاہیے کہ تا بہ مقدور انسانی ہم اپنی زندگی کے غیر محسوس اور بے ضابطہ اجزائے عمل سے پرہیز کریں۔ خود نگرانی یا محاسبہ نفس اس مقصد کے حصول کی پہلی منزل ہے اور خود نگرانی کی تربیت کا بہترین ذریعہ یہ ہے کہ ہم اپنی زندگی کے معتاد اور بظاہر غیر اہم کاموں کا بھی محاسبہ کرتے رہیں۔ یہی "چھوٹے چھوٹے" اور "غیر اہم" کام اور عادات زیر بحث ذہنی تربیت کے لئے زندگی کی بڑی بڑی سرگرمیوں سے کہیں زیادہ ہیں۔ بڑے بڑے اور ممتاز کام اپنی امتیازی حیثیت کی وجہ سے ہمیشہ نمایاں رہتے ہیں اور اسی لیے وہ قریب قریب ہمیشہ دائرہ احساس کے اندر رہتے ہیں، اور اسی لیے ان میں غافلی کا احتمال کم ہوتا ہے لیکن اکثر چھوٹے چھوٹے کاموں پر توجہ قائم نہیں رہتی اور ذاتی محاسبہ قائم نہیں رہتا، اس لئے خود نگرانی کی قوتوں کو تیز کرنے کے لیے یہی چھوٹے چھوٹے کام کہیں زیادہ اہم ہیں۔
ممکن ہے کہ خود اس بات کی کوئی اہمیت نہ ہو کہ ہم کس ہاتھ سے کھائیں، ڈاڑھی رکھیں یا منڈوائیں لیکن

[1] خود نظمی۔ خود نگری۔

اصولاً یہ چیز تو انتہائی اہم ہے کہ ہمارے کل عمل ایک اصولی ارادے کے ماتحت انصرام پذیر ہوں، اپنی پر متواتر نگرانی اور اخلاقی باقاعدگی قائم رکھنا خواہ ہماری قوتیں کتنی ہی ترقی یافتہ کیوں نہ ہوں، کم نہیں ہے۔ ذہنی تساہل جسمانی تساہل سے کم نہیں ہوتا۔ اگر آپ ایک شخص سے جو بیٹھے رہنے کا عادی ہو کچھ فاصلہ تک پیدل چلنے کی فرمائش کریں تو یقین ہے کہ وہ جلد ہی تھک کر بیٹھ جائے گا، لیکن جس نے پیدل چلنے کی عادت ڈال رکھی ہے اس کی یہ حالت نہ ہوگی، پیدل چلنے کی جسمانی محنت مشقت نہ ہوگی بلکہ اس کے لیے تو یہ ایک خوشگوار جسمانی ورزش ہوگی، جس کا وہ عادی ہے۔ انسانی زندگی کے ہر پہلو پر نیک کے عادی ہونے کی یہ ایک اور توجیہ ہے، اگر ہم اپنے جمیع افعال کی خواہ ان کا تعلق ارتکاب فعل سے ہو یا ترک ذہنی رجحان میں، رکھیں تو یہ ہماری خود نگرانی کی مہارت متواتر ترقی کر کے فطرت ثانیہ بن جائے گی، اس عمل کے جاری رہتے ہوئے روزانہ ہمارا اخلاقی تساہل گھٹتا جائے گا۔ (الفرقان بابت رجب ۱۳۵۷)

[مو]لانا محمد منظور نعمانی

مسئلہ حیات النبی صلی اللہ علیہ وسلم

(شائع شدہ الفرقان ... مطابق ... ۱۹ء)

اب سے ایک سال پہلے میں پاکستان گیا تھا، اس وقت وہاں مختلف صحبتوں میں یہ بات سننے [میں] آئی تھی کہ دیوبند کے علمی اور دینی سلسلہ سے تلمذ اور عقیدت کی نسبت رکھنے والے یہاں کے حضرات [...] میں ایک نیا اختلاف مسئلہ حیات النبی کے بارہ میں پیدا ہو گیا ہے لیکن جن لوگوں سے میں نے اس [...]ے میں وہاں کچھ سنا، وہ یا تو اصل حقیقت سے واقف نہ تھے یا اپنے علم و فہم کی خاص سطح کی وجہ [سے] نقطۂ اختلاف کو صحیح طور پر سمجھے ہوئے نہ تھے اس لیے ان کے بیانوں سے میں کچھ نہ سمجھ سکا کہ اس [اخ]تلاف کی اصل حقیقت کیا ہے ——— اور جن حضرات اہل علم کا اس نزاع کے فریق کے طور [پر نا]م لیا جاتا تھا اتفاق سے ان میں سے کسی سے بھی اس سفر میں ملاقات کی نوبت نہیں آئی اس لیے [اپن]ے ان بزرگوں اور دوستوں سے حسن ظن کی بنا پر میرا یہی خیال رہا کہ یہ اختلاف غالباً نزاع لفظی [کے] قبیل سے ہوگا۔

پھر پاکستان سے میری واپسی کے بعد مختلف اوقات میں اس سلسلہ میں میرے پاس کچھ [خطو]ط بھی آتے رہے اور ان سے معلوم ہوتا رہا کہ یہ کشمکش برابر بڑھ رہی ہے اور ایک نئے تفرقہ کی شکل [اختی]ار کرتی جا رہی ہے۔

اس سلسلے کے بعض خطوط سے یہ بھی معلوم ہوا کہ بعض لوگ حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی [کی کت]اب "آب حیات" کا حوالہ دیکر جماعت دیوبند کا مسلک یہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم [کی حیا]ت طیبی وارد ہی نہیں ہوئی، بلکہ آپ جس حیات کے ساتھ اس دنیا میں رونق افروز تھے، اسی حیات [کے س]اتھ قبر مبارک میں منتقل کر دیے گئے ——— ان میں سے بعض خطوط میں یہ بھی تھا کہ بعض دوسرے [حضرات] اس مسئلہ کی وجہ سے علماء دیوبند پر سخت طعن و تشنیع کر رہے ہیں ——— اور مجھ سے اصرار کیا گیا تھا

کہ اس بارہ میں جو کچھ میں صحیح سمجھتا ہوں اس کو "الفرقان" میں لکھوں، پھر گزشتہ مہینے (اکتوبر میں) برادر مکرم مولانا سید ابوالحسن علی ندوی پاکستان سے تشریف لائے تو انھوں نے بھی بتلایا کہ یہ اختلاف و نزاع وہاں ایک بجا خاصا فتنہ بنتا جا رہا ہے اور اس کے اور بڑھنے کا خطرہ ہے اور اسی بنا پر انھوں نے مجھے مشورہ دیا بلکہ اصرار سے فرمایا کہ اس بارہ میں کچھ لکھنا ضروری ہے۔ الغرض یہی باتیں ان سطور کے لکھنے کی محرک ہوئی ہیں۔

میں جو کچھ عرض کرنا چاہتا ہوں اس کی حیثیت ہرگز کسی فیصلے اور محاکمہ کی نہیں ہے، مجھے تو ابھی تک یہ بھی معلوم نہیں کہ واقعہ میں اصل نزاع، تضاد اور کیا ہے ـــــ بہرحال جو کچھ اس مسئلہ میں میں سمجھے ہوئے ہوں اور جو کچھ میرے نزدیک حق ہے اور ہمارے اکابر کا مسلک ہے وہ میں عرض کرتا ہوں۔

پہلے چند مسلّم دینی اور تاریخی حقیقتیں ذکر کرنا چاہتا ہوں۔

(۱) سب جانتے اور مانتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تریسٹھ سال (۴۰ سال نبوت سے پہلے اور ۲۳ سال نبوت کے بعد) اس عالم ناسوت میں قیام فرماکر ہجرت سے ٹھیک دس سال بعد ربیع الاول کے مہینے میں "کُلُّ مَنْ عَلَيْهَا فَانٍ" اور "كُلُّ نَفْسٍ ذَائِقَةُ الْمَوْتِ" کے عام قانون کے مطابق داعیٔ اجل کو لبیک کہا اور رفیق اعلیٰ سے واصل ہو گئے۔ (صلی اللہ تعالیٰ علیہ وعلیٰ آلہٖ وصحبہٖ وبارک وسلم)

(۲) بہت سے صحابہ کرامؓ پر اس صدمہ کا ایسا اثر پڑا کہ ہوش و حواس بجا نہ رہے، حضرت عمرؓ کا حال تو اس وقت یہ ہو گیا کہ قسم کھا کھا کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات سے انکار کرتے تھے اور بعض روایات میں ہے کہ اس وقت اس معاملے میں ان کی شدت کا یہ عالم تھا کہ کہتے تھے کہ جو کوئی کہے گا کہ حضورؐ کی وفات ہو گئی میں تلوار سے اس کا سر قلم کر دوں گا۔

(۳) جب صدیق اکبرؓ اپنی قیام گاہ سُنح سے تشریف لائے (جہاں حضورؐ کی اجازت سے وہ کچھ دیر پہلے چلے گئے تھے) اور آپ نے دیکھا کہ حضرت عمرؓ لوگوں کے سامنے اس طرح کی باتیں کر رہے ہیں تو اپنے کو سنبھال کے اور سب لوگوں کو جمع کر کے مسجد نبوی میں خطبہ دیا جس میں پوری صدیقی شان کے ساتھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کا واشگاف اعلان کرتے ہوئے آپ نے صحابہ کرامؓ سے فرمایا:۔

مَنْ كَانَ مِنْكُمْ يَعْبُدُ مُحَمَّدًا فَإِنَّ مُحَمَّدًا قَدْ مَاتَ وَمَنْ كَانَ مِنْكُمْ يَعْبُدُ اللهَ فَإِنَّ اللهَ	تم میں سے جو کوئی محمد (صلے اللہ علیہ وسلم) کی عبادت کرتا تھا اسے معلوم ہونا چاہئے کہ وہ تو رحلت کر گئے اور جو کوئی اللہ تعالیٰ کی عبادت کرتا

[illegible] لا یموت۔

تھا تو بیشک اللہ تعالیٰ زندہ ہے اسے کبھی موت نہیں آئے گی۔

اور اس کے بعد آپ نے قرآن مجید کی یہ آیت بھی تلاوت فرمائی:۔

وَمَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ اَفَاِنْ مَّاتَ اَوْ قُتِلَ انْقَلَبْتُمْ عَلٰى اَعْقَابِكُمْ وَمَنْ يَّنْقَلِبْ عَلٰى عَقِبَيْهِ فَلَنْ يَّضُرَّ اللّٰهَ شَيْئًا وَسَيَجْزِي اللّٰهُ الشّٰكِرِيْنَ ۝ (آل عمران)

اور محمد تو اس کے سوا کچھ نہیں کہ بس ایک رسول ہیں، ان سے پہلے بھی بہت سے رسول گزر چکے ہیں، کیا اگر ان کا انتقال ہو جائے یا وہ دشمنوں کے ہاتھوں شہید ہو جائیں تو تم الٹے پاؤں پھر جاؤ گے اور جو کوئی الٹے پاؤں پھرے گا تو وہ اللہ تعالیٰ کا کچھ نہیں بگاڑ سکے گا اور شکر کرنے والے بندوں کو اللہ تعالیٰ یقیناً اچھا بدلہ دے گا

اور بعض روایات میں ہے کہ صدیق اکبرؓ نے اس موقعہ پر حضورؐ کی وفات سے متعلق قرآن مجید کی چند اور آیتیں تلاوت فرمائیں۔

بہرحال آپ کے اس خطبہ کے بعد صحابہ کرام اس مسئلہ میں یکسو ہو گئے، حضرت عمرؓ نے بھی اپنی غلطی محسوس کر لی اور اگلے دن مجمع عام میں اس کا اعلان بھی کر دیا۔

(۴) پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال ہی کی بنیاد پر خلافت و امانت کا مسئلہ اٹھا اور آخر کار سقیفۂ بنی ساعدہ میں ابوبکر صدیقؓ کو آپ کا خلیفہ منتخب کیا گیا اور بیعت ہوئی۔

(۵) پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو آپ کے پہنے ہوئے کپڑوں ہی میں غسل دیا گیا، پھر کفن پہنایا گیا۔

(۶) پھر صحابہ کرام نے ایک خاص طریقہ اور ترتیب سے آپ کی نماز جنازہ پڑھی، یعنی اس طرح کہ چند چند صحابہ کرام (بعض روایات کے مطابق دس دس) کی جماعتیں حجرہ مبارک میں داخل ہوتی تھیں اور بغیر کسی کو امام بنائے نماز جنازہ پڑھ کر باہر آجاتی تھیں۔ اسی طرح تمام صحابہ کرام نے آپ کی نماز جنازہ پڑھی (اور ابن سعد وغیرہ کی ایک روایت کے مطابق حضرت علی مرتضیٰ نے کسی کو امام نہ بنانے کی وجہ یہ بتائی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جیسے زندگی میں امام تھے اسی طرح بعد وفات بھی امام ہیں ــــــــ «هو امامنا حيًّا وميتًا»)۔ ـــ بہرحال یہ مسلّم ہے کہ آپ کی نماز جنازہ صحابہ کرام نے بغیر کسی امام کے پڑھی۔

(۷) آپ کا وصال دوشنبہ کے دن چاشت کے وقت ہوا تھا، اس دن اس کے بعد کی رات اور سہ شنبہ کا پورا دن جنازہ اسی طرح حجرۂ شریف میں رکھا رہا اور لوگوں کی ٹولیاں باری باری نماز جنازہ ادا کرتی رہیں۔ یہاں تک کہ شب چہار شنبہ میں آپ کو اسی حجرۂ مقدسہ میں دفن کر دیا گیا۔

یہ سب وہ مسلم دینی اور تاریخی حقائق و واقعات ہیں جو حدیث و سیر کی کتابوں میں عام طور سے مذکور ہیں، اسی لیے میں نے کسی کتاب کا حوالہ دینے کی بھی ضرورت نہیں سمجھی ــــ مجھے یقین ہے کہ ان میں سے کسی بات سے بھی کسی صحیح العقیدہ صاحب علم کو انکار یا اختلاف نہ ہوگا۔

(۸) اسی طرح کسی صاحب علم پر یہ بھی مخفی نہیں ہو سکتا کہ قرآن مجید میں ان بندگان خدا کو جو راہ حق میں قتل کیے گئے اور دشمنان حق نے بظاہر جن کو موت کے گھاٹ اتار دیا، "احیاء" یعنی زندہ کہا گیا ہے اور فرمایا گیا ہے کہ وہ اپنے رب کے پاس شاداں فرحاں ہیں اور ان کو وہاں انواع و اقسام کا رزق اور طرح طرح کی نعمتیں مل رہی ہیں۔

(۹) اور یہ بھی ظاہر ہے کہ حضرات انبیاء علیہم السلام بہرحال ان سے افضل ہیں اور بدرجہا افضل ہیں، یقیناً ان کا انجام اور مقام ان شہداء کرام سے خوشتر اور بلند ہی ہونا چاہیئے اور اسی لیے اس دنیا سے جانے کے بعد ان کی حیات، شہداء کی حیات سے اعلیٰ اور اقویٰ ہی ہونی چاہیئے[۱]

(۱۰) اور نص قرآنی کے اسی "اشارہ" اور اسی "اقتضاء" کی وضاحت ان احادیث سے ہوتی ہے جو کتب حدیث میں انبیاء علیہم السلام کی حیات کے بارہ میں روایت کی گئی ہیں ــــ جہاں تک اس ناچیز کو علم ہے ان حدیثوں کو سب سے پہلے امام بیہقی نے ایک مستقل رسالے میں جمع کیا ہے پھر اس رسالے کے قریب قریب پورے مواد کو ساتویں اور آٹھویں صدی کے جلیل القدر محدث و فقیہ شیخ تقی الدین سبکی نے اپنی کتاب "شفاء السقام" میں نقل کر دیا ہے ــــ اور متاخرین حفاظ حدیث میں سے علامہ سیوطی نے بھی اس مسئلہ پر مستقل رسالہ لکھا ہے جس میں اس موضوع سے متعلق حسب عادت ہر طرح کی روایات کو جمع کر دیا ہے۔ زرقانی شرح مواہب میں بھی یہ حدیثیں دیکھی جا سکتی ہیں۔

---

[۱] حافظ ابن القیم نے "کتاب الروح" میں قرطبی کے حوالہ سے ان کے شیخ احمد بن عمرو کا ایک قول نقل کیا ہے جس کی ۲-۳ سطریں یہ ہیں۔ ان الشهداء بعد قتلهم وموتهم احياء عند ربهم يرزقون فرحين مستبشرين وهذه صفة الاحياء فى الدنيا واذا كان هذا فى الشهداء كان الانبياء بذلك احق واولى۔

ان سب احادیث اور روایات سے مجموعی طور پر یہ ضرور معلوم ہو جاتا ہے کہ جس طرح اس دنیا سے جانے کے بعد شہداء کو ایک خاص طرح کی حیات حاصل ہو جاتی ہے، جس میں وہ دوسرے مومنین سے ممتاز ہیں اور جس کی بنا پر قرآن مجید میں ان کو "احیاء" کہا گیا ہے، اسی طرح حضرات انبیاء علیہم السلام کو ایک خاص الخاص حیات اس دنیا سے منتقل ہونے کے بعد حاصل ہو جاتی ہے اور وہ تمام انبیاء علیہم السلام کو اور خاص کر خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کو حاصل ہے[۱]

یہاں تک جو کچھ عرض کیا گیا (جس سے غالباً کسی صاحب علم کو بھی اختلاف نہ ہوگا) اس سے لازمی نتیجہ کے طور پر دو باتیں ثابت ہو جاتی ہیں۔

ایک یہ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات ناسوتی کا جو سلسلہ پیدائش سے لے کر ۶۳ سال کی عمر شریف تک جاری رہا تھا وہ وفات کے دن ختم ہو گیا اور "کل نفس ذائقۃ الموت" کے قانون عام کے مطابق آپ پر وہ کیفیت وارد ہوئی اور آپ اس منزل سے گزرے جس کی تعبیر موت کے

---

[۱] علامہ ابن القیم نے قرطبی سے یہ بھی نقل کیا ہے کہ ان کے شیخ احمد بن عمر و حیات انبیاء کے سلسلہ کی ان حدیثوں کی طرف اشارہ کر کے فرماتے تھے کہ ... الانبیاء ... عن ... لا ... (کتاب الروح ...)

اس سے ضمناً یہ بات بھی معلوم ہوگی کہ مسئلہ میں اس طرح خیال کرنے والوں میں صرف زرقانی ابن حجر ہیثمی، سیوطی اور شیخ عبد الحق دہلوی جیسے حضرات ہی نہیں ہیں بلکہ اس فہرست میں ان سے بہت پہلے ابو عبد اللہ قرطبی اور شیخ احمد بن عمرو کے نام بھی ——— میں ہیں۔ لیکن ان حضرات کی ایسی عبارتوں کا یہ مطلب قرار دینا کہ انبیاء علیہم السلام پر موت وارد ہی نہیں ہوئی اور ان کو اپنی قبروں میں بعینہٖ دنیا والی ناسوتی حیات حاصل ہے ایسا سمجھنے والوں کی خوش فہمی کے علاوہ ان بزرگوں پر تہمت بھی ہے (اسی طرح ہمارے بعض بزرگوں کی تحریروں میں مثلاً "التصدیقات" میں انبیاء علیہم السلام کی قبر والی حیات کو "حیواۃ دنیویۃ" کہا گیا ہے تو اس کا بھی ہرگز یہ مطلب نہیں ہے۔ اس کا مطلب تو صرف یہ ہے کہ وہ حیات دنیا کی سی ہے یعنی مع الجسد ہے، صرف برزخی روحانی نہیں ہے جو تمام مومنین کو بھی حاصل ہے جن کے اجسام مٹی ہو چکے ہیں "التصدیقات" کے اردو ترجمہ ہی میں غور کرنے سے یہ مطلب خود واضح ہو جاتا ہے۔ علاوہ ازیں ان بزرگوں کی ایسی عبارتوں کا یہ مطلب بیان کرنا اور ان کا یہ مسلک بتانا کہ انبیاء علیہم السلام پر موت وارد ہی نہیں ہوئی اور قبروں میں بعینہٖ دنیا والی ناسوتی حیات کے ساتھ موجود ہیں، صریحاً ان پر یہ الزام لگانا ہے کہ اس مسئلہ میں ان کی رائے قرآن و حدیث کے صریح نصوص بینات اور اجماع صحابہ اور اجماع امت کے خلاف ہے۔ میں نہیں یقین کرتا کہ ہمارے علماء میں سے کسی نے ایسی لغویات کہی ہو۔ سبحانک ھذا بہتان عظیم"

لفظ سے کی جاتی ہے۔ آپ کی اس رحلت کو صحابۂ کرام نے موت ہی کہا اور موت ہی سمجھا، اور حضرت عمرؓ وغیرہ کو (کسی وقتی غلط فہمی یا غلبۂ حال کی وجہ سے) اس کے ماننے میں ابتداءً جو تأمل اور تردد تھا وہ بھی حضرت ابوبکرؓ کے خطبہ کے بعد ختم ہو گیا اور آخر الامر تمام صحابہ کرام کا اس پر اجماع ہو گیا کہ آپ کی ناسوتی حیات کا خاتمہ ہو چکا اور آپ پر موت وارد ہو چکی اور قرآن حکیم کی بات "انک میت وانہم میتون" پوری ہو گئی اور پھر اسی بنا پر آپ کو آخری غسل دیا گیا، موت کے بعد والا لباس یعنی کفن پہنایا گیا قبر میں دفن کیا گیا (حالانکہ اگر کسی آدمی میں ناسوتی حیات کا شائبہ بلکہ شبہہ بھی ہو اور اس کی موت کا پورا یقین نہ ہو چکا ہو تو اس کو دفن کر دینا شدید ترین شقاوت اور قطعاً حرام ہے۔ اور کسی پیغمبر کے ساتھ شقاوت وظلم کا یہ معاملہ کرنا تو صرف حرام ہی نہیں بلکہ سخت ترین اور خبیث ترین کفر ہے۔

اور دوسری بات مذکورہ بالا دینی اور تاریخی حقائق وواقعات سے یہ معلوم ہوئی کہ صحابہ کرام نے آپ کی وفات کو بالکل دوسرے آدمیوں کی سی موت نہیں سمجھا بلکہ اس کی نوعیت عام انسانوں سے کچھ مختلف سمجھی، اسی لیے آپ کو آخری غسل پہنے ہوئے کپڑوں میں دیا گیا۔ کرتا تک جسم اطہر سے نہیں اتارا گیا، نماز جنازہ بھی عام اموات مسلمین کی طرح نہیں پڑھی گئی بلکہ دوسرے طریقے سے پڑھی گئی (بلکہ بعض روایات سے تو معلوم ہوتا ہے کہ معروف نماز جنازہ کے بجائے صرف صلوٰۃ و سلام عرض کیا گیا اور آپ کے احسانات کے اعتراف کے ساتھ اللہ تعالیٰ سے آپ کے لیے بس دعا کی گئی) اور اس سب سے بڑھ کر یہ کہ مردوں کے دفن کرنے کے بارے میں تاخیر نہ کرنے کا شریعت کا جو عام تاکیدی حکم ہے اس کے بالکل برخلاف قریباً پورے دو دن گزر جانے کے بعد دفن کیا گیا۔ اور اس غیر معمولی تاخیر میں کوئی حرج نہیں سمجھا گیا اور کوئی اندیشہ نہیں محسوس کیا گیا۔ اور کسی ایک صحابی نے بھی اس معاملہ میں جلدی کرنے کا تقاضا نہیں کیا۔ پھر آپ کی ایک خاص ہدایت کے مطابق آپ کی زندگی کے عزیز مسکن یعنی حضرت صدیقہؓ کے اس حجرہ ہی کو آپ کا مدفن اور آپ کی دائمی آرام گاہ بنا دیا گیا اور آپ اسی میں دفن کیے گئے۔

اسی طرح آپ کی ایک ہدایت کے مطابق آپ کی املاک میں ترکہ اور وراثت کا عام قانون جاری نہیں کیا گیا بلکہ آپ کی حیات طیبہ میں ان کا جو مصرف اور جو نظام تھا وہی بدستور قائم رکھا گیا، اور وہ خلافت کی تولیت میں رہیں۔

اس طرح آپ کی ازواج مطہرات کا یہ حق سمجھا گیا کہ وہ اپنے سکونتی حجروں کو تازیست اپنے استعمال میں رکھیں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے املاک سے اپنا نفقہ تاحیات حاصل کرتی رہیں جیسا کہ حضور کے سامنے ان کو یہ دونوں حق حاصل تھے، حالانکہ کسی مسلمان کے مرنے کے بعد اس کی بیوہ بیوی

کے یہ حقوق صرف عدت کی مختصر مدت تک رہتے ہیں

ان سب استثنائی اور اختصاصی احکام و معاملات سے یہ بات بالکل ظاہر ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کی نوعیت دوسرے تمام لوگوں کی موت سے بہت کچھ مختلف ہے اور میں نہیں سمجھتا کہ اتنی بات سے ہمارے حلقے کے کسی صاحب علم کو اختلاف ہوگا۔ اسی طرح بعض احادیث سے جو یہ معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نیز دیگر انبیاء علیہم السلام کو اپنے مدفنوں میں ایک خاص قسم کی حیات حاصل ہے (جو اس عالم کے مناسب ہے اور بعض حیثیات سے دنیا والی ناسوتی[1] حیات سے بھی اعلیٰ و اقویٰ ہے) غالباً اس سے بھی کسی صاحب علم کو اختلاف نہ ہوگا۔ ہاں اس کے آگے موت و حیات کی نوعیت کی تعیین اور تفصیلات میں کچھ اختلاف ہو سکتا ہے اور اس کی گنجائش بھی ہے اور ایسے اختلافات خود اہل سنت میں بلکہ اہل سنت کے ایک ایک حلقے میں بھی ہمیشہ رہے ہیں، ان کو اہمیت دینا اور ان باتوں کا باعث تفرقہ بننا بڑی بدقسمتی کی بات ہے۔

اس کے بعد چند کلمات میں حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کے رسالہ "آب حیات" کے مضمون کے متعلق بھی عرض کرتا ہوں۔ جن حضرات نے حضرت نانوتویؒ کی تصنیفات اور مکاتیب کا مطالعہ کیا ہے وہ جانتے ہیں کہ آپ کی اکثر تحریریں اردو زبان میں ہونے کے باوجود مضامین کے لحاظ سے اتنی مشکل اور ادق ہیں کہ آجکل کے ہمارے اصحاب درس علماء میں بھی شاذ و نادر ہی ایسے نکلیں گے جو ان کو پوری طرح سمجھ سکیں، اور اس ناچیز کے خیال میں آپ کی تصنیفات میں سب سے مشکل اور دقیق ترین یہی "آب حیات" ہے۔ درس نظامی کے جملہ فنون میں سب سے مشکل منطق، فلسفہ اور کلام سمجھے جاتے ہیں اور ان فنون کی درسی کتابوں میں سب سے مشکل ہمارے درسی حلقوں میں قاضی، امور عامہ، صدرا، اور خیالی کو کہا جاتا ہے۔ اس عاجز نے یہ کتابیں پڑھی بھی ہیں اور ان میں جو مشکل ترین ہیں وہ مدرسی کے زمانہ میں پڑھائی بھی ہیں، میں خود اپنا تجربہ عرض کرتا ہوں کہ ان میں سے کسی کتاب کے سمجھنے میں مجھے اتنی مشکل پیش نہیں آئی، جتنی کہ "آب حیات" کے سمجھنے میں پیش آئی تھی۔ میں نے آب حیات کا مطالعہ پہلی دفعہ اپنی طالب علمی کے آخری دور میں اس وقت کیا تھا جب کہ منطق و فلسفہ اور کلام کی سب درسی کتابیں میں پڑھ چکا تھا، اور ان فنون کے وہ مباحث مجھے خوب مستحضر تھے جن کے استحضار

---

[1] اس تحریر میں "حیات ناسوتی" سے ہر جگہ میری مراد وہ حیات ہے جس کے لوازم اور خصائص اس متغیر مادی عالم کے ساتھ مخصوص ہیں اور اسی کا سلسلہ ختم ہو جانے کی وجہ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے براہ راست وہ استفادہ کوئی نہیں کر سکتا جو آپ کی اس ناسوتی حیات میں ہر شخص [illegible]

مجھے بغیر آب حیات کو نہیں سمجھا جاسکتا، لیکن مجھے خوب یاد ہے کہ اس وقت بھی میرا احساس یہی تھا کہ
میں نے ساری عمر میں جو کتابیں دیکھی یا پڑھی ہیں ان میں سب سے زیادہ مشکل اور صعب الفہم
یہی کتاب ہے۔ اپنے اس ذاتی تجربہ کی بنا پر مجھے یہ کہنے میں کوئی باک نہیں ہے کہ ہمارے حلقہ کے علما
میں بھی آب حیات کو پوری طرح سمجھنے والے ہند و پاک کے طول و عرض میں اب گنتی کے چند ہی ہوں گے۔

لہ مجھے اپنی اس رائے پر مزید اطمینان اپنے مکرم و محترم مولانا قاری محمد طیب صاحب
زید مجدہم سے ابھی حال میں یہ سن کر ہوا کہ حضرت مولانا حبیب الرحمان صاحب رح سابق
مہتمم دارالعلوم دیوبند نے اپنے اخیر دور حیات میں ایک دن ان سے فرمایا کہ میرا جی
چاہتا ہے کہ میں تم کو آب حیات پڑھا دوں، لیکن مجھے اس کا مطالعہ کرنا ضروری ہوگا
اس لیے تم اس کا ایک نسخہ لاکر میرے سرہانے رکھ دو میں رات کو مطالعہ کر لیا کروں گا،
قاری صاحب کا بیان ہے کہ میں نے نسخہ لاکر رکھ دیا۔ لیکن پھر یا تو مطالعہ کا وقت نہیں
مل سکا یا کوئی اور وجہ پیش آگئی کہ اس پڑھنے پڑھانے کی نوبت نہ آسکی۔ یہاں
تک کہ حضرت مولانا مرحوم کا وقت موعود آگیا اور یہ کام رہ ہی گیا۔
اس واقعہ سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ آب حیات کس قسم کی کتاب ہے کہ مولانا محمد
طیب صاحب جیسے ذکی عالم و فاضل کو بھی اس کے پڑھنے کی ضرورت تھی اور حضرت
مولانا حبیب الرحمان صاحب مرحوم جیسے راسخ العلم اس کے پڑھانے کے لیے، پہلے
مطالعہ کر لینا ضروری سمجھتے تھے۔ پھر جب کل ۷ر نومبر کو اس ناچیز نے اپنی یہ تحریر
سہارنپور میں شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا صاحب مدظلہم العالی کو سنائی تو
دو واقعے حضرت ممدوح نے بھی اس کی تائید میں سنائے۔
ایک یہ کہ حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کا جب وصال ہو تو حضرت شیخ الہند
منطق و فلسفہ کی کتابیں پڑھانا چھوڑ دیں۔ حالانکہ پہلے پڑھایا کرتے تھے، جب
اصرار کیا گیا تو آپ نے فرمایا کہ ان کتابوں کو ہم صرف اس
پڑھایا کرتے تھے کہ حضرت رحمۃ اللہ کی باتیں سمجھنے میں ان سے مدد ملتی تھی، اب
وہی نہیں رہے تو کیوں ہم خواہ مخواہ ان کتابوں پر مغز ماریں۔
دوسرا واقعہ اس سلسلہ کا یہ سنایا کہ حضرت شیخ الہند رح کے تدریسی دو...
ار بار یہ طے ہوا اور اس کا منصوبہ بنا کہ حضرت کے خاص تلامذہ حضرت مد...
حضرت مولانا شبیر احمد عثمانی رح وغیرہ جب کہ ان حضرات کے پڑھانے کا زمانہ

اور بغیر کسی تکلف وانکسار کے عرض کرتا ہوں کہ اب میں بھی ان میں سے نہیں ہوں، کیونکہ اس کے کھنے کے لیے منطق و فلسفہ اور کلام کے جو مباحث مستحضر ہونے چاہئیں وہ اب مجھے مستحضر نہیں رہے ہیں تاہم چونکہ ایک دفعہ اس کو سمجھ کر مطالعہ کیا تھا، اس لیے اس کا اصل مدعا اور مرکزی مضمون الحمد للہ اب تک ذہن میں ہے۔ پھر ان سطروں کو لکھنے سے پہلے بھی میں نے اس پوری کتاب کا ایک سرسری مطالعہ حال ہی میں کیا ہے اور میں علیٰ وجہ البصیرت یہ کہنے کا اپنے کو حقدار سمجھتا ہوں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات و ممات کے بارہ میں اس میں کوئی بات بھی جمہور امت اور اہل سنت کے ان تمام دینی اور تاریخی مسلمات اور معتقدات کے خلاف نہیں ہے، جن کا ذکر میں نے اوپر کیا ہے البتہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات بعد الممات کی خاص نوعیت کی تحقیق اور تعیین میں حضرت نانوتوی نے اپنے خاص طرز پر ایک نہایت دقیق و عمیق کلام کیا ہے (اور اسی کے ساتھ رجال کی حیات و ممات کی خاص نوعیت کے بارے میں بھی اسی طرز پر کچھ کلام کیا ہے) اور بلاشبہ یہ تحقیق اتنی دقیق ہے کہ عوام کے علاوہ اوساط کے فہم سے بالاتر ہے۔ بس اس کو عوامی مسئلہ بنانا انتہائی اتباع متشابہات اور غریب عوام کو فتنے میں ڈالنا ہے، وہ بے چارے اصل حقیقت کو تو نہ سمجھ سکیں گے، پھر یا تو کچھ کا کچھ سمجھ کے اندھی عقیدت میں اسی کو اپنا عقیدہ بنا کے گمراہ ہوں گے یا حضرت نانوتوی پر گمراہی اور بداعتقادی کے فتوے لگائیں گے۔ ہمارے علماء کرام کو للہ سوچنا چاہیئے کہ اس سارے ضلال و فساد کا ذمہ دار عند اللہ کون ہوگا۔

دیوبندیت کیا ہے؟

آخر میں چند کلمات "دیوبندی مسلک و مشرب" کے بارے میں بھی عرض کرنا ضروری سمجھتا ہوں۔

ظاہر ہے کہ ہمارے اکابر و اساتذہ حضرت علماء دیوبند کا کوئی الگ اعتقادی یا فقہی مکتب فکر نہیں ہے عقائد میں اہم اہل سنت والجماعت کے طریقہ پر اور فقہ میں حنفی ہیں۔ البتہ اصناف اہل سنت میں ہمارے اکابر کا ایک خاص رنگ ہے۔ بس اس کی تعبیر "دیوبندیت" سے کی جاتی ہے اور وہ رنگ مندرجۂ ذیل خصوصیات کے اجتماع سے پیدا ہوتا ہے۔

(بقیہ صفحہ ۱۸ کا) حضرت نانوتوی کی تصانیف حضرت شیخ الہند سے سبقاً سبقاً پڑھیں لیکن اس کی نوبت غالباً نہیں آئی۔

بہرحال جن حضرات نے حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کی مشکل تصانیف آب حیات وغیرہ خود نہیں دیکھی ہیں وہ ان واقعات سے اندازہ کرسکتے ہیں کہ وہ کس قسم کی کتابیں ہیں۔ اور اردو خواں عوام تو

(۱) فقہ حنفی پر اطمینان اور اس کے مطابق فتویٰ اور عمل کے ساتھ حدیث و سنت خاص تعلق و شغف، نیز دوسرے آئمہ مجتہدین اور اسی طرح حضرات محدثین کا ادب و احترام اور دل میں ان سب کی عظمت و محبت۔

(۲) اس فقہی اور علمی خصوصیت کے ساتھ حضرت صوفیاء کرام کی "نسبت" کی طلب و تحصیل، یا کم از کم دل میں ان کی عظمت و محبت۔

(۳) اس سب کے ساتھ اتباع سنت، اور شرک و بدعت سے نفرت اور اس معاملہ میں ایک خاص صلابت و حمیت۔

(۴) اور پھر اس سب کے ساتھ اعلاء کلمۃ اللہ کا جذبہ اور اس راہ میں مر مٹنے کا شوق۔

پس "دیوبندیت" دراصل اس خاص رنگ کا عنوان ہے جو ان عناصر اربعہ کے اجتماع سے پیدا ہوتا ہے، ہمارے اس سلسلہ کے اکابر و اساطین مثلاً حضرت نانوتویؒ و حضرت گنگوہی رح (نور اللہ مرقدہم) اور ان کے خواص تلامذہ اور مسترشدین ان چیزوں کی جامعیت ہی میں ممتاز تھے۔ ورنہ یہ خصوصیات جدا جدا دوسرے حلقوں میں بھی پائی جاتی ہیں۔

یہ بھی عرض کر دوں کہ "دیوبندیت" کی یہ تحقیق اور اس کا یہ تجزیہ ایک صحبت میں اس عاجز نے مولانا عبید اللہ سندھی رح مرحوم سے سنا تھا، اس کے بعد سے جب اور جتنا اس پر غور کیا اتنا ہی اس کو صحیح اور واقعہ کے مطابق پایا۔

بہرحال طریق اہل سنت اور فقہ حنفی سے وابستگی کے بعد یہ ہے وہ خاص رنگ یا خاص مشرب، جس کا عنوان دیوبندیت ہے۔ پس جو ہم میں سے جتنا اس رنگ میں کامل یا ناقص ہے اتنا ہی وہ "دیوبندیت" میں کامل یا ناقص ہے۔

اور سب سے پہلے میں اقرار کا اعلان کرتا ہوں کہ میں اپنے حال اور عمل کے لحاظ سے بہت ہی ناقص قسم کا دیوبندی ہوں لیکن الحمد للہ میں نے اصل دیوبندیوں کو دیکھا ہے اور ان کے طریقہ اور ان کے حال پر جینے اور مرنے کی آرزو رکھتا ہوں

احب الصالحین ولست منہم ______ لعل اللہ یرزقنی صلاحاً

آخر میں پھر عرض کرتا ہوں کہ بخدا نہ مجھے اب تک کسی ذریعہ سے معلوم ہو سکا ہے اور نہ میں خود غور کر کے سمجھ سکا ہوں کہ اس مسئلہ میں ہمارے علماء میں اصل نقطۂ اختلاف کیا ہو۔ میں خود جس طرح اس مسئلے کو سمجھے ہوئے ہوں اور جو میرے نزدیک حق ہو اور ہمارے اکابر کا مسلک ہے وہ میں نے ان صفحات میں اپنے امکان کی حد تک صاف اور منقح طور پر پیش کر دینے کی کوشش کی ہے۔

یہ ناچیز دو تین دن سے مخدومنا حضرت مولانا شاہ عبد القادر صاحب رائے پوری دامت برکاتہم کی خدمت میں

احترام و اخلاص کے ساتھ ان کی خدمت میں گذارش ہے کہ جو کچھ ناچیز نے اس تحریر میں عرض کیا ہے اگر وہ صرف اتنے پر متفق ہوں تو یہ اختلاف ختم ہو جانا چاہیئے اور اس سے آگے کے نقطہ میں اگر بالفرض اختلاف ہو بھی تو اس کو ہرگز وجہ تفریق نہیں بننا چاہیئے، بلکہ اعلان ہو جانا چاہیئے کہ یہ اختلاف اس قسم کا علمی اختلاف ہے جو ایک حلقہ کے اہلِ علم میں بھی ہو سکتا ہے، خود ہمارے اساتذہ اور مشائخ میں بعض مسائل کی تحقیق میں اختلاف ہوا ہے اور رہا ہے، اگر ضرورت ہو تو یہ عاجز اس کی بیسیوں مثالیں گنا سکتا ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں توفیق دے کہ ہم غیر ضروری بنیادوں پر تفریق کا باعث نہ بنیں۔

یہ تحریر مکمل کر لینے کے بعد میں دیوبند بھی حاضر ہوا، اور وہاں استاذی حضرت مولانا محمد ابراہیم صاحب صدر المدرسین دار العلوم دیوبند کو بھی میں نے یہ تحریر سنائی۔ حضرت ممدوح نے آبِ حیات کے مضمون پر بڑی بصیرت افروز روشنی ڈالی جو بلاشبہ آپ ہی کا حق ہے۔

(لیکن جیسا کہ میں عرض کر چکا ہوں وہ صرف خواص اہلِ علم کے سننے اور سمجھنے والی بات ہے، اس لئے میں اس کو اس تحریر کا جز بنانا نہیں چاہتا) اور ساتھ ہی مجھ سے فرمایا کہ اس تحریر کے آخر میں یہ اضافہ اور کر دو کہ "آبِ حیات" کے مضمون کو جو شخص ٹھیک ٹھیک سمجھ لے گا وہ اس کے نصوصِ قرآن و حدیث یا اجماعِ امت کے خلاف ہونے کا شبہ بھی نہیں کرے گا۔ یہ شبہ اسی کو ہوگا جو اس کا مطلب صحیح نہ سمجھ سکے گا۔ اور جو شخص اس کا مطلب ایسا بیان کرے جو نصوص اور اجماع کے خلاف ہو تو سمجھنا چاہیئے کہ اس نے اس کا مطلب صحیح نہیں سمجھا (اسی کے ساتھ مولانا ممدوح نے فرمایا کہ) آبِ حیات والی تحقیق ایک نہایت دقیق علمی تحقیق اور ایک عمیق علم ہے اس کا سمجھنا یا ماننا نہ اہلِ سنت ہونے کی شرط ہے نہ دیوبندی المشرب ہونے کی، لہٰذا اس مسئلہ کو ہرگز وجہ تفریق نہیں بننا چاہیئے دونوں فریق ہمارے ہیں اور ہماری جماعت کے افراد ہیں۔

—— دار العلوم دیوبند۔ ۱۱۔ نومبر ۱۹۵۸ء

نوٹ

۱۔ رسالہ سے متعلق تمام خطوط میں خریداری نمبر کا حوالہ ضروری ہے بغیر اس کے تعمیل میں سخت مشکلات پیش آتی ہیں۔

۲۔ منی آرڈر کوپن پر اپنا پتہ صاف صاف انگریزی میں بھی لکھیں۔ پرانے خریدار حضرات خریداری نمبر کا حوالہ ضرور دیں۔

۳۔ جواب طلب امور کے لیے جوابی خط آنا ضروری ہے۔

مینیجر "الفرقان" لکھنؤ

HHYS
حاجی حسن یعقوب سیٹھ اینڈ کمپنی
ہیڈ آفس۔ کالیم کلم
شاخیں۔ ترپونیدرم، کوئیلان، پنالور
کالیم کلم
فون نمبر
دوکان ۔ ۱۵۵۰۲
مکان ۔ ۹۲
ہارڈ ویئر ڈیلرس، اپروسٹ اسٹین لیس اسٹیل اینڈ پائپ
پینٹس ویئر، اسٹین پینٹس
ترپونیدرم
فون نمبر
دوکان ۲۷۸۵
ڈسٹری بیوٹرس۔ پیری سوسٹیٹس
کوئیلان
فون نمبر
دوکان ۲۲۲۷
مکان ۲۹۲۸
ڈسٹری بیوٹرس۔ آئی۔ ٹی۔ سی لمیٹڈ
برماشیل
پنالور۔ فون نمبر دوکان ۸۲
ایجنٹس۔ براشیل
پیغام مسرت
شادی بیاہ کے بھی کتنے ہی مسئلے ہوتے ہیں
آئیے ایک مسئلہ تو آپ کا ہم حل کریں!
ہر قسم کے بہترین اور دیدہ زیب
شادی کارڈس
انویٹیشن کارڈس
اور رومال وغیرہ کیلئے
پوسٹر
ہمارے یہاں تشریف لائیے۔
طباعت کی خدمات بھی ہمارے سپرد کر دیجئے۔
تنویر پریس
۷۰۔ باغ گونگے نواب پارک، امین آباد۔ لکھنؤ
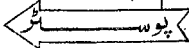
حِکمَت وَ مَوعِظَت

ارشاداتِ حضرت شیخ جیلانیؒ

از مولانا محمد اویس صاحب ندوی نگرامی

محبوب سبحانی حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی رح کی مجلس وعظ درحقیقت انوار و برکات کی مجلس ہوتی تھی جو کچھ فرماتے تھے قلوب اس سے متاثر ہوتے تھے، اللہ تعالیٰ کی بے شمار رحمتیں ہوں شیخ عفیف الدین بن مبارک پر کہ انھوں نے ان مواعظ میں سے باسٹھ وعظ قلم بند فرمائے جو آج تشنگانِ حق کے لیے چشمۂ آب حیواں سے کم نہیں ہیں۔ اہل مصر نے الفتح الربانی کے نام سے ان مواعظ کو شائع کیا تھا اور جناب مولانا عاشق الٰہی مرحوم نے اردو میں ان کا ترجمہ بھی فرمایا تھا جو غالباً اب نایاب ہو چکا ہے۔ اثنائے مطالعہ میں خیال آیا کہ ان مواعظ میں سے ملفوظات کے طور پر کچھ انتخاب کیا جائے اور اصحابِ قلوب اور صاحبانِ ذوق کے سامنے پیش کر کے اُن کی دُعا حاصل کی جائے۔

(۱) ایمان والا قلب "کیوں" اور "کس طرح" نہیں جانتا وہ نہیں جانتا کہ "بلکہ" کیا ہے اس کا قول تو "ہاں" ہے۔

(۲) اپنے "بیدار" ہونے کو موت کے بعد کے لیے نہ چھوڑو کہ اس وقت بیدار ہونا تم کو مفید نہ ہوگا۔

(۳) قلب گویا پرندہ ہے بدن کے "پنجرہ" میں، موتی ہے ڈبہ میں، مال ہے صندوق میں، پس اعتبار پرندہ کا ہے "پنجرہ" کا نہیں، اعتبار موتی کا ہے ڈبہ کا نہیں، اعتبار مال کا ہے صندوق کا نہیں۔

(۴) اوّل اپنے نفس کو نصیحت کرو اس کے بعد دوسرے کے نفس کو نصیحت کرو۔

(۵) جب توحید گھر کے دروازے پر ہو اور شرک گھر کے اندر تو یہی نفاق ہے۔

(۶) افسوس تجھ پر کہ تیری زبان تقویٰ پکارتی ہے اور دل فاجر بن رہا ہے زبان شکر کرتی ہے اور دل اعتراض کر رہا ہے۔

(۷) جب تم توبہ کرو تو چاہیئے کہ تمہارا ظاہر بھی توبہ کرے اور باطن بھی، توبہ حکومت کی

کا یا پلٹ ہے۔

(۸) یوں سمجھو کہ تمہاری عمر میں صرف یہی ایک دن باقی رہ گیا ہے پس آخرت کے لیے تیار رہو۔

(۹) کثرت سے وہ لوگ ہیں جو گھر میں بیٹھیں تو درماندہ و بیکار رہیں اور دوکان پر آئیں تو پرہیزگار رہیں کھانے پینے میں، تو زندیق اور ممبر پر گویا صدیق،

(۱۰) جو شخص اہلِ فلاح کو نہیں دیکھتا وہ فلاح نہیں پاتا۔

(۱۱) مخلوق کے دروازے کو بند کرو اور اپنے اور خدا کے درمیان دروازے کھول لو۔

(۱۲) کھردرے اور موٹے کپڑے پہننے روکھا سوکھا کھانے میں شان نہیں ہے شان تیرے قلب کے زہد اختیار کرنے میں ہے سچا شخص پہلے اپنے باطن پر صوف پہنتا ہے اس کے بعد اس کا اثر ظاہر تک پہنچتا ہے۔

(۱۳) تنگ حالی کا مقابلہ کرو صبر سے اور خوشحالی کا شکر سے۔

(۱۴) قلب کی زندگی اس میں ہے کہ مخلوق (کے خیال) سے نکل جائے اور حق تعالےٰ کے ساتھ قائم ہو۔

(۱۵) افسوس ہے کہ تمہاری زبان مسلمان ہے مگر دل مسلمان نہیں، قول مسلمان ہے مگر فعل مسلمان نہیں۔

(۱۶) تمہارا علم تم کو پکار رہا ہے کہ میں تم پر حجت ہوں۔

(۱۷) اپنی آرزو کم کرو زہد پا جاؤ گے، کہ سارا زہد تمناؤں کا کم کرنا ہی ہے۔

(۱۸) بُرے ساتھیوں کو چھوڑو، ان کے تعلقات کو توڑو اور رشتہ اہلِ حق سے جوڑو۔

(۱۹) خالق کا شکوہ مخلوق سے مت کرو۔

(۲۰) اس دنیا کے سمندر سے ڈرو کہ بہتیری مخلوق اس میں ڈوب چکی ہے۔

(۲۱) اے مبتلائے مصیبت میں تجھکو دیکھتا ہوں کہ ہر مخلوق کو راضی کرتا ہے اور خالق کو ناراض، اپنی دنیا کی آبادی کے پیچھے اپنی آخرت کو ویران کرتا ہے۔

(۲۲) دنیا کے حاصل کرنے میں ایسے نہ ہو جاؤ کہ ۔۔۔ جیسے رات کے وقت لکڑیاں جمع کرنے والا کہ اسے خبر نہیں کہ اس کے ہاتھ میں کیا آتا ہے (یعنی لکڑی یا سانپ؟)

(۲۳) قناعت اختیار کرو کیونکہ قناعت کا خزانہ کبھی ختم نہ ہوگا۔

(۲۴) اے مسکین اپنے نفس پر رو، تیرا بچہ مرجاتا ہے تو تجھ پر قیامت قائم ہو جاتی ہے۔ اور تیرا دین مرجاتا ہے تو تجھ کو پرواہ نہیں ہوتی ہے اور نہ تو اس پر روتا ہے۔

(۲۵) افسوس کہ تو سانپوں کو کس طرح چھو رہا ہے اور الٹ پلٹ رہا ہے حالانکہ نہ تجھکو سانپ پکڑنے کا ہنر معلوم اور نہ تونے تریاق کھا رکھا ہے کہ زہر اثر نہ کرے، تو خود اندھا ہے پھر لوگوں کی آنکھوں کا علاج کیونکر کرے گا، تو گونگا ہے پھر لوگوں کو تعلیم کس طرح دے گا۔ جاہل ہے پھر دین کیونکر درست کرے گا۔؟

(۲۶) اے غافلو! تیرا اور موت کا اژدہا اپنا منھ کھولے ہوئے ہے شاہ قضا و قدر کا جلاد اپنے ہاتھ میں تلوار لئے ہوئے ہے صرف حکم کا منتظر ہے۔

(۲۷) صاحبو! تم دنیا کے پیچھے دوڑ رہے ہو کہ وہ تم کو کچھ دے دے، اور دنیا اہل اللہ کے پیچھے دوڑ رہی ہے تاکہ ان کو کچھ دے دے، وہ ان کے سامنے سر جھکائے کھڑی رہتی ہے۔

(الفرقان بابت رمضان ۱۳۷۱ھ)

(ترجمہ از مولانا سید احمد قادری)

عورتوں کا ایمانی عہدنامہ

امام ربانی کا مکتوب ایک صالحہ کے نام

يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ إِذَا جَاءَكَ الْمُؤْمِنَاتُ يُبَايِعْنَكَ عَلَىٰ أَن لَّا يُشْرِكْنَ بِاللَّهِ شَيْئًا وَلَا يَسْرِقْنَ وَلَا يَزْنِينَ وَلَا يَقْتُلْنَ أَوْلَادَهُنَّ وَلَا يَأْتِينَ بِبُهْتَانٍ يَفْتَرِينَهُ بَيْنَ أَيْدِيهِنَّ وَأَرْجُلِهِنَّ وَلَا يَعْصِينَكَ فِي مَعْرُوفٍ فَبَايِعْهُنَّ وَاسْتَغْفِرْ لَهُنَّ اللَّهَ ۖ إِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ رَّحِيمٌ

اے نبی جب تیرے پاس مسلمان عورتیں آئیں بیعت کرنے کو اس بات پر کہ شریک نہ ٹھہرائیں اللہ کا کسی کو اور چوری نہ کریں اور بدکاری نہ کریں، اور اپنی اولاد کو نہ مار ڈالیں۔ اور طوفان نہ لائیں باندھ کر اپنے ہاتھوں اور پاؤں میں اور تیری نافرمانی نہ کریں کسی بھلے کام میں تو ان کو بیعت کرلے اور معافی مانگ ان کے واسطے اللہ سے بے شک اللہ بخشنے والا مہربان ہے۔

یہ آیت کریمہ فتح مکہ کے دن نازل ہوئی ہے آنحضرت علیہ وعلیٰ آلہ الصلوٰۃ والسلام جب مردوں کی بیعت سے فارغ ہوئے تو عورتوں کی بیعت لینا شروع کی، آپ عورتوں سے بیعت صرف الفاظ میں لیتے تھے۔ دست مبارک عورتوں کے ہاتھ سے کبھی مس نہیں ہوا۔ عورتوں میں چونکہ بُرے اخلاق مردوں کی بہ نسبت زیادہ پائے جاتے ہیں، اس لیے ان کی بیعت میں خصوصیت کے ساتھ چند شرطیں بڑھائی گئی ہیں۔ آپ نے امر الٰہی کی تعمیل میں عورتوں کو بیعت کے وقت ان چیزوں سے

منع فرمایا ہے۔
پہلی شرط - کسی چیز کو اللہ تعالیٰ کے ساتھ شریک نہ کریں، ظاہر ازیں کہ یہ شرک وجوب، وجود میں ہو استحقاق عبادت میں۔ اگر کسی کے اعمال ریا وسمعہ کے شائبہ سے پاک نہ ہوں اور وہ غیر اللہ سے اپنے اعمال خیر کے اجر کی طلب میں مبتلا ہو مثلاً وہ اپنے نیک عمل پر دوسروں سے مدح و ثنا کا طلب گار ہو تو ایسا شخص دائرہ شرک سے باہر نہ ہوگا اور نہ ایسا شخص مخلص و موحد ہوگا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ الشرك في امتي اخفى من دبيب النمل في ليلة مظلمة على صخرة سوداء (شرک میری اُمت میں اس چیونٹی کی چال سے بھی زیادہ مخفی ہے جو اندھیری رات میں سیاہ پتھر پر چلتی ہے)

لاف بے شرکی مزن کان از نشان پائے مور　　در شب تاریک برنگ سیہ پنہاں تر است

حضورؐ نے یہ بھی فرمایا ہے: واتقوا الشرك الاصغر قالوا وما الاصغر قال عليه وعلى آله الصلوٰة والسلام الريا (شرک اصغر سے بچو، صحابہ نے پوچھا، شرک اصغر کیا ہے، حضورؐ نے فرمایا وہ ریا دکھاوا ہے۔

توحید تو یہ ہے کہ شائبہ شرک سے بھی بیزاری ہو، بیماریوں کے دفع کرنے میں بتوں اور شیطانوں سے مدد طلب کرنا جیسا کہ اس وقت اسلام کے پردے میں رائج ہو گیا ہے عین شرک و گمرہی ہے اور تراشیدہ و ناتراشیدہ پتھروں سے اپنے حوائج و ضروریات مانگنا اللہ سے انکار اور کفر ہے۔ اکثر عورتیں انتہائی جہل و نادانی کی وجہ سے اس طرح کے حرام اعمال میں مبتلا اور مراسم شرک و اہل شرک کے ادا کرنے میں گرفتار ہیں خصوصیت کے ساتھ ہندوستان وقت دیکھی جاتی ہے جبکہ چیچک کی بیماری پیدا ہوتی ہے اس وقت کم ہی عورتیں ہوں گی جو اس شرک سے محفوظ رہتی ہوں گی اور اس مرض کو دور کرنے کے لیے شرک کی رسموں میں سے کوئی رسم نہ ادا کرتی ہوں گی۔ الا ماشاء اللہ۔ کفار و مشرکین جن ایام کی تعظیم کرتے ہیں ان ایام کی تعظیم کرنا اور جو مراسم ادا کرتے ہیں، انھیں ادا کرنا شرک و کفر تک پہونچا دیتا ہے۔ جیسا کہ دوالی کے دن میں یا بلاد اسلام ان حضرات کی عورتیں اہل کفر کی رسمیں ادا کرتی ہیں اور اس دن کو عید کے دن کی طرح مناتی ہیں۔ جس طرح اہل کفر اس دن اپنی بیٹیوں اور بہنوں کو تحفے اور ہدیے بھیجتے ہیں اسی طرح وہ بھی بھیجتی ہیں، ان دنوں میں اپنے برتنوں کو کفار کی طرح رنگتی ہیں اور اس میں سُرخ چاول بھر کر بھیجتی ہیں ان دنوں کو وہ بھی ویسا ہی سمجھتی ہیں جیسا کفار سمجھتے ہیں، یہ سب شرک اور کفر ہے۔ اسی طرح کے لوگوں کے متعلق اللہ نے کہا ہے وما يؤمن اكثرهم بالله الا وهم مشركون (ان میں اکثروں کا حال یہ ہے کہ اللہ پر یقین لاتے ہیں تو اس حال میں کہ اس کے ساتھ شریک بھی ٹھہراتے جاتے ہیں، ایک عمل

یہ بھی رائج ہے کہ جانوروں کو مشائخ کے نام پر نذر کرتے ہیں اور ان کی قبروں پر جا کر ان جانوروں کو ذبح کرتے ہیں۔ فقہ کی کتابوں میں اس عمل کو بھی شرک میں داخل کیا ہے اور پوری تاکید سے کیا ہے۔ فقہا نے اس ذبح کو ذبائح جن کی جنس سے سمجھا ہے (ذبائح جن وہ جانور ہیں جنھیں مشرکین جنوں کے نام پر ذبح کرتے تھے) اس لیے اس عمل سے بھی اجتناب کرنا چاہیے کہ اس میں شرک کا شائبہ ہے۔ نذر کے طریقے بہت ہیں۔ کیا ضرور ہو کہ کسی جانور کو ذبح کرنے کی نذر مانیں، اس کو ذبائح جن کے ساتھ ملحق کریں۔ اور اپنے آپ کو عبدۂ جن (جنوں کے پجاریوں) کے ساتھ مشابہ کریں۔ یہی حال عورتوں کے ان روزوں کا بھی ہے جو وہ پیروں اور بی بیوں کے نام پر رکھتی ہیں۔ اکثر ان ناموں کو انھوں نے خود تراشا ہے۔ اور انھیں ناموں پر اپنے روزوں کی نیت کرتی ہیں۔ اور افطار کے وقت ہر روزہ کے لیے خاص وضع متعین کرتی ہیں اور ان کے لیے مخصوص ایام کا تعین بھی کرتی ہیں۔ اپنے مطالب و مقاصد کو ان روزوں کے ساتھ جوڑتی ہیں اور ان کے توسل سے مقصد برآری چاہتی ہیں۔ یہ عبادت میں شرک ہے اور اس طرح وہ غیر اللہ کی عبادت کے توسل سے اپنا مقصد حاصل کرنا چاہتی ہیں۔ اس فعل کی قباحت پر اچھی طرح سوچنا چاہیے ـــــ حدیث قدسی میں آیا ہے الصوم لی وانا اجزی بہ یعنی روزہ میرے لیے مخصوص ہے اور عبادتِ صوم میں میرے سوا کوئی شریک نہیں، ہر چند کہ کسی عبادت میں بھی غیر اللہ کی شرکت جائز نہیں لیکن روزہ کی تخصیص محض اس اہتمام کے لیے ہے کہ اس عبادت میں نفی غیر کی نیت پر تاکید کرنی چاہیے۔ بعض عورتیں اپنے ایجاد کردہ روزوں کے حیلے میں یہ کہتی ہیں کہ ہم روزہ اللہ ہی کے لیے رکھتی ہیں صرف اس کا ثواب پیروں کی روحوں کو بخشتی ہیں۔ اگر وہ اپنے اس معاملہ میں سچی ہیں تو پھر روزوں کے لیے مخصوص ایام کی تعیین کا کیا کام ہے۔ اور پھر افطار میں مخصوص کھانوں اور مخصوص وضع و ہئیت کا التزام کیوں ہے۔ بسا اوقات دیکھا جاتا ہے کہ افطار کے وقت محرمات کا ارتکاب کرتی ہیں۔ بے ضرورت بھیک مانگتی ہیں اور اسی بھیک مانگی ہوئی چیز سے افطار کرتی ہیں۔ اور اپنی مقصد برآری کو اس امر محرم کے ارتکاب پر منحصر و موقوف سمجھتی ہیں۔ حقیقت میں یہ عین گمراہی اور شیطان کا فریب ہے۔

دوسری شرط عورتوں کی بیعت کے وقت یہ لگائی گئی ہے کہ وہ چوری نہ کریں۔ اس گناہ کبیرہ میں چونکہ اکثر عورتیں مبتلا ہوتی ہیں اس لیے مخصوص طور پر ان کو اس سے روکا گیا ہے۔ کم ایسی عورتیں ہوں گی جو اس برائی سے بالکل بچی ہوئی ہوں گی۔ جو عورتیں اپنے شوہروں کے اموال میں ان کی اجازت کے بغیر تصرف کرتی ہیں اور بے تحاشا خرچ کر کے مال کو ضائع کرتی ہیں وہ چوروں کے گروہ میں داخل ہیں۔ اور یہ گناہ ان کے اندر ثابت و متحقق ہے۔ یہ بات عام طور پر عورتوں میں پائی

جاتی ہے اور اس خیانت میں تقریباً تمام عورتیں مبتلا ہیں، کاش وہ اس بات کو برائی سمجھیں، اگرچہ حال یہ ہے کہ وہ اپنے اس تصرف بیجا کو حلال سمجھتی ہیں اور یہ نہایت خطرناک بات ہے کیونکہ کسی ثابت شدہ برائی کو حلال سمجھنا کفر تک پہونچا دیتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ حکیم مطلق جل شانہ نے شرک کے بعد عورتوں کو چوری سے منع فرمایا، اپنے شوہروں کے اموال میں بیجا تصرف کرتے کرتے ان میں خیانت اور چوری جڑ پکڑ جاتی ہے اور پھر دوسروں کے اموال میں بھی چوری اور خیانت کرنے لگتی ہیں، دوسروں کے اموال کو بلا اجازت حاصل کر لینے کی برائی ان کے ذہن سے نکل جاتی ہے۔ اور چوری ان کی عادت میں داخل ہو جاتی ہے، ان تمام باتوں کے مشاہدے کے بعد یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ عورتوں کے لیے شرک کے بعد چوری کو کیوں اتنی اہمیت دی گئی ۔ اموال میں سرقہ و خیانت کے سلسلہ میں یہاں ایک اور قسم کی چوری کا ذکر بھی مناسب ہے، ایک دن ہمارے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے اصحاب سے پوچھا، بدترین قسم کا چور کون ہے؟ صحابہ نے عرض کیا کہ ہم نہیں جانتے۔ آپ نے فرمایا کہ بدترین قسم کا چور وہ ہے جو اپنی نماز میں چوری کرتا ہے۔ اور ارکان نماز کو تمام و کمال ادا نہیں کرتا اس لیے اس قسم کے چوری سے بھی بچنا ضروری ہے۔ تاکہ انسان بدترین قسم کے چوروں میں داخل نہ ہو حضور قلب کے ساتھ نماز کی نیت کرنی چاہیے۔ کیونکہ نیت کے بغیر عمل صحیح نہیں ہوتا۔ پھر قرأت درست طریقے پر کرنی چاہیے۔ رکوع و سجود اطمینان کے ساتھ کرنا چاہیے۔ اسی طرح قومہ اور جلسہ بھی اطمینان سے بجالانا چاہیے یعنی رکوع سے اٹھنے کے بعد سیدھا کھڑا ہونا چاہیے۔ اور ایک بار سبحان اللہ کہنے کے اندازے سے کھڑا رہنا چاہیے۔ جو شخص ایسا نہیں کرتا وہ اپنے کو چوروں کے گروہ میں داخل کرتا ہے۔

تیسری شرط عورتوں کی بیعت کے وقت یہ لگائی کہ وہ زنا نہ کریں۔ عورتوں کی بیعت میں خصوصیت کے ساتھ اس کبیرہ سے ممانعت کی وجہ یہی ہے کہ اکثر اوقات زنا عورتوں کی رضا پر موقوف ہوتا ہے۔ نیز یہ کہ اکثر اوقات اس عمل بد کی علت یہ ہوتی ہے کہ عورتیں اپنے آپ کو مردوں کے سامنے پیش کرتی ہیں۔ شاید یہی وجہ ہے کہ قرآن مجید میں زانیہ عورت کو زانی مرد پر اس آیت میں مقدم رکھا گیا ہے۔ الزانية والزاني فاجلدوا كل واحد منهما مأته جلدة ۔ (زنا کرنے والی عورت اور زنا کرنے والے مرد میں سے ہر ایک کو سو کوڑے مارو)

یہ گناہ دنیا و آخرت میں انسان کو برباد کرنے والا اور تمام ادیان میں قبیح و منکر ہے۔ ابو حذیفہ رضی اللہ عنہ نے آنحضرت علیہ و علیٰ آلہ الصلوٰۃ والسلام سے روایت کی ہے کہ آپ نے فرمایا۔ اے

لوگو! زنا سے بچو کہ اس میں چھ برائیاں ہیں۔ تین دنیا میں اور تین آخرت میں۔ دنیا کی تین برائیاں یہ ہیں:-

(۱) زانی کے دل سے نورانیت اور اس کے چہرے سے رونق غائب ہو جاتی ہے (۲) اس کے فقر و افلاس آتا ہے (۳) عمر میں کمی ہوتی ہے۔ ـــــــ آخرت کی تین برائیاں یہ ہیں۔

(۱) اللہ کا غضب (۲) حساب کی سختی (۳) دوزخ کا عذاب۔

حدیث میں یہ بھی آیا ہے کہ آنکھوں کا زنا محرمات کو بُری نیت سے دیکھنا، ہاتھوں کا زنا، محرمات کو بری نیت سے پکڑنا، اور قدموں کا زنا محرمات کی طرف بری نیت سے جانا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے۔ قل للمومنین یغضوا من ابصارھم ویحفظوا فروجھم ذلک ازکی لھم ان اللہ خبیر بما یصنعون وقل للمومنات یغضضن من ابصارھن ویحفظن فروجھن یعنی کہو اے محمد مسلمانوں سے کہ اپنی نظریں نیچی رکھیں اور اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کریں اور کہدو مسلمان عورتوں سے کہ اپنی نگاہیں نیچی رکھیں اور اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کریں۔

جاننا چاہیے کہ دل آنکھوں کا تابع ہے، جب تک محرمات سے آنکھوں کو نہ بچایا جائے، دل کی حفاظت مشکل ہے اور جب دل گرفتار ہو جائے تو شرمگاہ کی حفاظت بہت مشکل ہے۔ لہٰذا آنکھوں کو بدنظری سے بچانا ضروری ہوا تاکہ شرمگاہ کی حفاظت ہو سکے اور دنیا و آخرت کے گھاٹے سے محفوظ رہے۔

قرآن میں اس کی بھی ممانعت آئی ہے کہ عورتیں اجنبی مردوں سے نرم و نازک گفتگو کریں، کیونکہ اس سے بدکار مردوں کے دل میں وسوسۂ زنا پیدا ہوتا ہے۔ اگر عورتوں کو اجنبی مردوں سے بضرورت گفتگو کرنی پڑے تو اس انداز سے بولنا چاہیے کہ اُن کے دل میں اس قسم کا کوئی وسوسہ نہ پیدا ہو سکے۔ قرآن میں اس سے بھی روکا گیا ہے کہ عورتیں اپنی زینت کا اظہار غیر مردوں کے سامنے کریں اور ان کے دل میں خواہش پیدا کریں۔ اسی طرح عورتوں کو پازیب و خلخال پہن کر اس طرح زمین پر پاؤں مارنے سے بھی روکا گیا ہے کہ اس کی آواز پیدا ہو کیونکہ اس سے بھی ان کی طرف میلان پیدا ہوتا ہے۔ خلاصہ یہ کہ ہر وہ بات جو فسق اور گناہ کی طرف لے جانے والی ہو قبیح اور ممنوع ہے۔ ـــــ فکر کرنی چاہیے کہ حرام چیزوں کے مقدمات و مبادی سے بھی پرہیز کیا جائے تاکہ نفس محرمات سے سلامتی میسر ہو، یہ بات بھی پوشیدہ نہ رہنی چاہیے کہ ایک عورت کے لیے دوسری اجنبی عورت بھی اجنبی مرد ہی کے حکم میں ہے، ان باتوں میں جو اجنبی مرد سے ناجائز ہیں، مثلاً جس طرح عورت کے لیے اجنبی مرد کو شہوت سے دیکھنا یا چھونا ناجائز ہے اسی طرح عورت کو عورت کو بھی شہوت سے

اور چھونا ناجائز ہے۔ اس بات کی بڑی نگہداشت کرنی چاہیے کیونکہ عورت کا مرد تک پہونچنا اختلافِ صنف کی وجہ سے مشکل ہے۔ بہتیرے موانع درمیان میں ہوتے ہیں، لیکن عورت کا عورت تک پہونچنا اتحادِ صنف کی وجہ سے نہایت آسان ہے۔ اس لیے یہاں زیادہ احتیاط کی ضرورت ہے اور اس فعلِ قبیح سے بچانے کے لیے بڑی تاکید و تبلیغ کرنی چاہیے۔

چوتھی شرط عورتوں کی بیعت کے وقت یہ لگائی گئی کہ اولاد کو قتل نہ کریں، فقر و احتیاج سے ڈر کر بچوں کو مار ڈالنا نہ صرف یہ کہ قتل ناحق ہے بلکہ قطع رحم کے گناہ کو بھی متضمن ہے اس لیے اس ایک کبیرہ میں دو کبائر کا ارتکاب ہے۔

پانچویں شرط عورتوں کی بیعت کے وقت یہ لگائی گئی کہ وہ افترا اور بہتان نہ باندھیں۔ یہ وصف عورتوں میں بہت پایا جاتا ہے اس لیے خصوصیت سے منع کیا گیا۔ یہ صفت بہت بری صفتوں میں سے ایک ہے۔ یہ جھوٹ ہے اور جھوٹ تمام ادیان میں حرام — اور قبیح ہے۔ اس میں ایذائے مومن بھی ہے اور مسلمان کو اذیت پہونچانا حرام ہے، نیز اس میں فساد فی الارض بھی ہے جو بہ نص قرآنی ممنوع و قبیح ہے۔

آخر میں چھٹے نمبر پر ایک جامع شرط یہ لگائی گئی کہ وہ معروف و خیر میں پیغمبر کی نافرمانی نہ کریں۔ یہ شرط تمام اوامر شرعیہ کے امتثال اور تمام نواہی شرعیہ سے اجتناب پر مشتمل ہے۔

نماز پنجگانہ کے ارکان و فرائض کو پوری خوش دلی و سعی کے ساتھ ادا کرنی چاہیے۔ مال کی زکوٰۃ مصارف زکوٰۃ میں بورغبت تمام صرف کرنی چاہیے۔ رمضان کا روزہ جو سال بھر کے چھوٹے گناہوں کا کفارہ ہے، پوری احتیاط سے رکھنا چاہیے۔ حج بیت اللہ جس کی شان میں حضور نے فرمایا ہے کہ حج گزشتہ گناہوں کو ختم کر دیتا ہے، ادا کرنا چاہیے۔ اسی طرح ورع و تقویٰ سے بھی چارہ نہیں ہے کہ حضرت پیغمبر علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا ہے ملاك دينكم الورع یعنی تمہارے دین کو قائم رکھنے والا ورع ہے۔ ورع منہیاتِ شرعیہ کو ترک کرنے کا نام ہے — نشہ آور چیزوں کے استعمال سے پرہیز کرنا چاہیے اور نشہ آور چیز کو شراب کی طرح سمجھنا چاہیے غنا (گانے) سے بھی پرہیز کرنا چاہیے کیونکہ غنا لہو و لعب میں داخل ہے اور لہو و لعب حرام ہے۔ حدیث میں آیا ہے الغناء رقية الزنا یعنی غنا زنا کا منتر ہے۔ سخن چینی اور غیبت سے بھی پرہیز لازم ہے۔ مسلمانوں کے ساتھ مسخرہ پن کرنا اور ان کو اذیت پہونچانا بھی حرام ہے۔ اس سے اجتناب ضروری ہے۔

بدفالی کا اعتبار نہ کرنا چاہیے اور نہ یہ خیال کرنا چاہیے کہ ایک کا مرض دوسرے کو لگ جاتا

ہے، مخبر صادق صلی اللہ علیہ وسلم نے ان دونوں سے منع فرمایا ہے لاطیرۃ ولاعدوی یعنی بدفالی کوئی شے نہیں ہے اور نہ ایک کا مرض دوسرے کو لگتا ہے، کاہنوں اور نجومیوں کا اعتبار نہ کرنا چاہیے۔ نہ ان سے غیب کی باتیں پوچھنا چاہیے اور نہ یہ سمجھنا چاہیے کہ وہ غیب کی باتیں جانتے ہیں، کیونکہ شریعت میں بڑی تاکید کے ساتھ اس سے روکا گیا ہے۔ نہ خود جادو کرنا چاہیے نہ کسی ساحر سے جادو کرانا چاہیے۔ اس لیے کہ یہ حرام قطعی ہے۔ اور کفر تک پہونچا دینے والی چیز ہے۔ کوئی گناہ کفر سے اتنا قریب نہیں ہے جتنا جادو اور سحر حدیث میں آیا ہے کہ جب تک ایمان دل سے نکل نہ جائے سحر کا فعل وجود میں نہیں آتا گویا سحر اور ایمان ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ خلاصہ یہ کہ جو کچھ مخبر صادق علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا ہے اور جسے علماء نے کتب شرعیہ میں بیان فرمایا ہے، دل وجان سے اس کو بجالانے میں سعی کرنی چاہیے اور اس کی مخالفت کو زہر قاتل سمجھنا چاہیے۔

جب بیعت کرنے والی عورتوں نے ان تمام شرائط کو قبول کر لیا تو آنحضرت نے ان کی بیعت قبول کر لی اور امر الٰہی کے مطابق ان کے لیے مغفرت کی دعا فرمائی۔ امر الٰہی سے جو استغفار آپ نے کسی جماعت کے لیے کیا اس کے متعلق پوری امید ہے کہ قبول ہو اور وہ جماعت مغفور ہو، ہندہ ابوسفیان کی بیوی بھی اس بیعت میں داخل تھیں۔ بلکہ اس وقت ان عورتوں کی سرگروہ وہی تھیں اور سب کی نمائندگی کر رہی تھیں۔ اس بیعت و استغفار سے ان کے حق میں بھی بڑی امید ہو، ان عورتوں کے بعد اب بھی جو عورتیں ان شرائط کو قبول کریں اور ان کے مقتضا کے مطابق عمل کریں وہ حکماً اس بیعت میں داخل ہوں گی اور استغفار کی برکتوں کی امیدوار۔ اللہ تعالیٰ نے کہا ہے مایفعل اللہ بعذابکم ان شکرتم وآمنتم یعنی اللہ تعالیٰ کیوں تم پر عذاب کرے اگر تم اس کا شکر ادا کرو۔ اور ایمان درست کرو۔ اللہ کا شکر بجالانے کا مطلب یہ ہو کہ انسان احکام شرعیہ کو قبول کرے اور ان کے مقتضا پر عمل کرے طریق نجات اور رستگاری کی راہ صاحب شریعت علیہ السلام کی پیروی ہے اعتقاد میں بھی اور عمل میں بھی۔ استاد اور پیر اس لیے ہیں کہ شریعت کی طرف رہنمائی کریں، اور ان کی برکت سے شریعت پر اعتقاد اور عمل میں سہولت ہو۔ نہ یہ کہ مرید جو سمجھیں وہ کریں، جو چاہیں وہ کھائیں پیر ان کی ڈھال بن جائیں گے اور عذاب سے بچا لیں گے، یہ تمنائے محض ہے، قیامت میں بے اجازت کوئی سفارش نہ کر سکے گا اور جب تک عمل پسندیدہ نہ ہو کوئی سفارش کرے گا بھی نہیں، اور عمل اسی وقت پسندیدہ ہوگا جب شریعت کے مقتضا کے مطابق کیا جائے اور اگر بشریت کی بنا پر کوئی لغزش ہو گئی ہو تو شفاعت سے اس کا تدارک ممکن ہو۔ واللہ سبحانہ الموفق۔　(مکتوب ۴۱ ج ۳)

(الفرقان، صفر ۱۳۷۲ھ)

کتب خانۂ الفرقان کی تازہ ترین پیش کش
تجلیاتِ مجددِ الفِ ثانی
مکتوبات کے آئینہ میں (حصۂ اوّل)
بلاشبہ قرآن پاک اور حدیث نبوی کے مجموعوں کے بعد ہدایت و اصلاح کا سب سے موثر مواد وہ ہے جو اُن اکابر اُمت کی تالیفات اور مکتوبات میں ہے جن کو اللہ تعالیٰ نے قلب و قالب اور ظاہر و باطن میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نیابت کا خاص مقام عطا فرمایا تھا۔
اور بلاشبہ پورے اسلامی ادب میں حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ کے مکتوبات کو اس باب میں خاص امتیاز حاصل ہے۔ یہ مکتوبات تین ضخیم دفتروں میں ہیں، ان میں احسان و تصوف، تعمیر باطن، حق و باطل میں امتیاز، جہاد فی سبیل اللہ اور اقامت دین و ترویج شریعت کی ترغیب اور اُمت مسلمہ کی عام رہنمائی کا وہ سامان موجود ہے جس کی صدائے بازگشت نے گزشتہ تین چار صدیوں میں اُمت مصطفویہ کے حق میں اکسیر کا کام انجام دیا ہے۔
مولانا نسیم احمد فریدی امروہی نے مکتوبات امام ربانی کے اُن دقیق و عمیق مضامین کو چھوڑ کر جن کے مخاطب صرف خواص اہل قلوب ہیں، تینوں دفتروں کو اردو میں منتقل کیا ہے — اللہ تعالیٰ نے مولانا موصوف کو یہ خاص ملکہ عطا فرمایا ہے کہ وہ بزرگان دین کے ملفوظات یا مکتوبات کو اردو میں اس طرح منتقل کرتے ہیں کہ اصل کلام کی نورانیت اور تاثیر و حلاوت گویا جوں کی توں باقی رہتی ہے۔
اسی کے ساتھ مولانا نے ایک بہت بڑا کام یہ کیا ہے کہ تاریخ کے ہزاروں صفحات پڑھ کے مکتوب الیہم کے حالات بھی فٹ نوٹس میں لکھے ہیں — ان کے مطالعہ سے یہ بھی معلوم ہو جاتا ہے کہ حضرت مجدد نے اصلاح اُمت، احیاء سنت اور ترویج شریعت کی جدوجہد میں اُس زمانہ کی عظیم اور موثر شخصیتوں سے مکاتبت کر کے کس طرح اپنے درد کا اظہار کیا ہے اور کن تدابیر سے اس وقت کے امراء اور وزراء کا بھی تعاون حاصل کیا ہے۔
کتب خانہ الفرقان، غیر معمولی اہتمام کے ساتھ اس کو دو جلدوں میں شائع کر رہا ہے۔ انشاء اللہ اگست ستمبر تک شائع ہو جائے گی — مولانا فریدی نے شروع میں نہایت مفید محققانہ مقدمہ بھی لکھا ہے۔
معیاری کتابت و طباعت۔ دیدہ زیب ٹائٹل۔ قیمت مجلد صرف ۱۱/-
کتب خانۂ الفرقان، لکھنؤ

مردانِ حق

مولانا محمد اویس ندوی نگرامی

تھوڑی دیر اہلِ حق کے ساتھ

تازہ خواہی داشتن گر داغہائے سینہ را
گاہے گاہے باز خواں ایں دفتر پارینہ را

(۱)

دل بیٹھے جا رہے ہیں، اہل دل سہمے جا رہے ہیں کہ آج مدینہ کے دار الامارۃ میں امام دار الہجرۃ حضرت مالک بن انس کو کوڑے لگائے جا رہے ہیں ـــــ امام کا فتویٰ ہے کہ خلافت نفس ذکیہ کا حق ہے منصور نے جبراً بیعت لی ہے اور جبر کا شرع میں کوئی اعتبار نہیں ہے۔ حدیث میں ہے کہ اگر کسی سے جبراً طلاق دلائی جائے تو واقع نہ ہوگی [۱]

منصور کے عمال چاہتے ہیں کہ امام طلاق جبری کے عدم اعتبار کا فتویٰ نہ دیں مبادا لوگ بیعت جبری کا انکار نہ کر بیٹھیں۔ مگر یہ ممکن کیسے تھا امام کے نزدیک مسئلہ یوں ہی ثابت تھا وہ اس کے خلاف کیسے فتویٰ دیتے۔ حکم ہوا کہ ستر کوڑے لگائے جائیں۔

اللہ! اللہ! کیسا عبرت خیز سماں ہے وہ مالک بن انس جو مدینہ کی گلیوں میں کبھی گھوڑے اور خچر پر اسلئے سوار نہیں ہوئے کہ جو سرزمین قدوم نبوی (صلے اللہ علیہ وسلم) سے مشرف ہوئی ہے اس کو میں جانور کے سموں سے کیسے روندوں؟ آج انھیں کے جسم مبارک پر کوڑے پڑ رہے ہیں۔ تمام پیٹھ خون آلود ہو گئی ہے اور دونوں ہاتھوں کے مونڈھے اتر گئے ہیں، حکم ہوا کہ ان کو باندھ

---

[۱] فقہ مالکیہ میں طلاق جبری درست نہیں ہے۔ حنفیہ کے یہاں طلاق مکرہ واقع ہو جائے گی اس کے لیے حنفیہ کے پاس دلائل ہیں جن کے ذکر کرنے کا یہ موقع نہیں ہے۔

اونٹ پر بٹھا کر ان کی تشہیر کرو، امام مالک کی مدینہ میں تشہیر ہو رہی تھی (یعنی مجرموں کی طرح باندھ کے ان کو اونٹ پہ بٹھا کے مدینہ میں گھمایا جا رہا تھا) اور انکی زبان حقیقت ترجمان سے سلسل یہ الفاظ ادا ہو رہے تھے،

من عرفنی فقد عرفنی ومن لا یعرفنی	جو مجھکو جانتے ہیں وہ تو جانتے ہی ہیں، جو نہیں جانتے
فانا مالک ابن انس اقول طلاق المکرہ	ہیں وہ جان لیں کہ میں مالک ابن انس ہوں فتویٰ
لیس بشئ۔	دیتا ہوں کہ طلاق جبری کچھ نہیں، اس کا کوئی اعتبار نہیں

(۲)

بغداد کا ایوان خلافت درباریوں سے بھرا ہے خلیفہ معتصم اپنے پورے شان و شکوہ کے ساتھ تخت خلافت پر جلوہ افروز ہے۔ امام اہل السنۃ والجماعۃ حضرت احمد بن حنبل پابہ زنجیر کھڑے ہیں بیڑیاں اتنی بوجھل ہیں کہ پیروں میں حرکت نہیں ہو سکتی ہے، خلیفہ اور معتزلی علماء امام سے خلق قرآن کی تائید چاہتے ہیں لیکن امام باواز بلند فرماتے ہیں:۔

أعطونی شیئاً من کتاب اللہ وسنۃ	اللہ کی کتاب اور اس کے رسول کی سنت میں سے کچھ
رسولہ حتیٰ اقول۔	میرے سامنے لاؤ تاکہ میں اسی کے مطابق کہوں۔

امام ربانی کی حق پرستی سے خلیفہ کا دل نرم ہوتا ہے اور کہتا ہے:۔

اے احمد میرے مسلک کی تائید کرو، تمہیں اپنا مقرب خاص بناؤں گا پھر تم کو اس قیمتی فرش پر چلنے کا فخر حاصل ہوگا۔

جواب میں پھر ارشاد ہوا۔

میرے سامنے اللہ کی کتاب اور اس کے رسول کی سنت میں سے کچھ لاؤ تاکہ میں اسی کے مطابق کہوں

حکم ہوا کہ احمد کے پیروں میں بیڑیاں ڈال دی جائیں، درّے لگانے والے بلائے گئے اور امام کے ہاتھ باندھ دیئے گئے، اتمام حجت کے لیے ایک بار زبان حق کھلتی ہے اور یوں گویا ہوتی ہے کہ

"اے امیر المومنین قیامت کے دن کو یاد کیجئے جب کہ آپ منتقم حقیقی کے دربار میں کھڑے ہوں گے ٹھیک اسی طرح جس طرح کہ اس وقت میں آپ کے سامنے ہوں، پھر آپ میرے اس خون کا کیا جواب دینگے؟ مخالفین نے دیکھا کہ معتصم ان الفاظ سے متاثر ہو رہا ہے، چیخ اٹھے کہ اے امیر المومنین یہ شخص گمراہ ہے (نعوذ باللہ) اس کو ہرگز نہ چھوڑا جائے، انجام کار کوڑے پڑنا شروع ہوگئے۔ پہلا کوڑا پڑا تو امام نے فرمایا، بسم اللہ۔ دوسرے پر فرمایا لاحول ولا قوۃ الا باللہ، تیسرے پر فرمایا "القرآن کلام اللہ غیر مخلوق" (قرآن اللہ

کا کلام ہے غیر مخلوق ہے) جو تھے پر ارشاد فرمایا قل لن یصیبنا الا ما کتب اللہ لنا، (کہہ دیجئے کا کہ ہم کو ہرگز نہ پہنچے گی کوئی چیز (تکلیف یا مصیبت) لیکن وہ جو اللہ نے ہمارے لیے لکھ دی ہے۔ شدت الم سے امام بے ہوش ہوگئے، تھوڑی دیر کے لیے کوڑے روک دیے گئے، جب ہوش آیا تو خلیفہ نے پھر کہا کہ میری بات مان لیجئے میں رہا کردوں! امام نے اس کا کوئی جواب نہ دیا اور پھر کوڑے پڑنا شروع ہوگئے۔ متعدد بار ایسا ہی ہوا۔ امام جب بیہوش ہوجاتے تو کوڑے روک دیئے جاتے جب ہوش آتا تو خلیفہ پھر درخواست کرتا مگر حق و استقامت کا یہ پہاڑ اپنی جگہ سے ٹلنے کا نام نہ لیتا۔ جب آخری بار ہوش آیا تو اپنے کو معتصم کی قید و بند سے آزاد پایا۔ گھر لائے گئے ستو پیش کیا گیا مگر روزہ سے تھے اس لیے نوش نہیں فرمایا، ظہر کا وقت آیا تو تکلیف کی شدت کے باوجود جماعت سے نماز ادا فرمائی۔

(۳)

آج عروس البلاد بغداد کی زینت و آرائش کی کوئی حد نہیں، خلیفہ ہارون رشید تخت خلافت پر متمکن ہوئے ہیں، ہر مجلس مجلس عشرت و طرب، ہر محفل محفل لطف و مسرت، ہر جا نغمۂ عیش و نشاط، ہر سمت منظر فرحت و انبساط، کہیں علماء و فضلاء کا مجمع کہیں نامی گرامی شعراء کا اجتماع، انعام و اکرام کی بارش ہورہی ہے، خزانۂ شاہی کے دروازے کھلے ہوئے ہیں اعزاز و مناصب کی تقسیم ہورہی ہے لیکن کس قدر تعجب کا مقام ہے کہ حضرت سفیان ثوریؒ جن سے خلیفہ کو دلی عقیدت ہے اس جشن مسرت میں شریک نہیں ہیں خود ہارون رشید کو بھی حیرت ہے جس کا اظہار وہ اپنے خط میں یوں کرتا ہے۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اللہ کے بندے ہارون الرشید امیر المومنین کی طرف سے اپنے دینی بھائی سفیان سعید الثوری کی جانب!۔

میرے بھائی آپ کو معلوم ہے کہ اللہ تبارک و تعالےٰ نے مسلمانوں کے درمیان بھائی چارہ قائم فرمایا ہے، مجھکو بھی محض اللہ کے واسطے آپ سے محبت اور قلبی تعلق ہے اگر خلافت کا طوق میری گردن میں نہ ہوتا تو اپنی محبت و اخلاص کے باعث خود حاضر خدمت ہوتا، کوئی ایسا نہیں ہے جس نے اس موقع پر مجھے اس منصب جلیل کی مبارک باد نہ دی ہو، میں نے خزانوں کے دروازے کھول دیے ہیں اگرانقدر عطیات اور عظیم الشان بخششوں کی وجہ سے میری آنکھوں کو نور اور دل کو سرور حاصل ہورہا ہے ان تمام باتوں کے باوجود آپ ابتک میرے پاس تشریف نہیں لائے ہیں اور میں نہایت شوق سے یہ عریضہ خدمت اقدس میں بھیج رہا ہوں، اے ابو عبداللہ آپ کو مومن کی زیارت اور اس کی ملاقات کے فضائل بخوبی

سلوم ہیں اس لیے یہ خط دیکھتے ہی تشریف لائیے اور عجلت فرمائیے۔

ہارون الرشید نے عباد طالقانی کو یہ خط دیا اور حکم دیا کہ حضرت سفیان ثوری کی خدمت میں لے جائیں، عباد کہتے ہیں کہ میں خط لیکر کوفہ پہنچا اور حضرت موصوف کی خدمت میں پیش کیا حضرت سفیان ثوری نے خط اہل مجلس کے سامنے ڈال دیا اور فرمایا کہ میں اللہ سے پناہ مانگتا ہوں کہ اپنے ہاتھ ایسی چیز میں لگاؤں جس میں ظالموں کا ہاتھ لگا ہو حضرت کے حکم سے بعض اہل مجلس نے خط پڑھنا شروع کیا پورا خط سننے کے بعد حضرت سفیان ثوری نے ارشاد فرمایا کہ اسی خط کی پشت پر ظالم کو جواب لکھو، لوگوں نے عرض کیا کہ اے ابوعبد اللہ خلیفہ کا معاملہ ہے اگر خط کا جواب اچھے اور صاف خط پر دیا جائے تو بہتر ہے۔ ارشاد فرمایا کہ نہیں اسی خط کی پشت پر جواب لکھو یہ خط اگر کسب حلال سے ہے تو ہارون الرشید کو اس کا عوض ملے گا ورنہ وہ اسی کے ساتھ ڈالا جائے گا، میرے یہاں ایسی کوئی چیز نہ رہے جس کو ظالم کے ہاتھ نے مس کیا ہو کہ مبادا وہ ہمارے دین کو خراب کر دے، عرض کیا گیا کہ جواب میں کیا لکھا جائے فرمایا کہ لکھو۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ؕ

اللہ کے بندے سفیان کی جانب سے ہارون الرشید کی طرف، جو امیدوں اور آرزوؤں کے فریب میں مبتلا ہے جس کی ایمانی حلاوت سلب کر لی گئی ہے جو تلاوت قرآن کی لذت سے محروم ہے، میں تم کو صاف لکھ رہا ہوں کہ میں نے تم سے محبت کا رشتہ توڑ دیا میرے اور تمہارے تعلقات ختم ہو گئے تم نے میرے نام جو خط بھیجا ہے اس میں اقرار کیا ہے کہ مسلمانوں کے بیت المال سے تم بیجا اور غیر صحیح مصارف کر رہے ہو گویا تم یہ لکھ کر اپنے اس فعل پر خود شاہد ہو گئے ہو۔ جن کے سامنے تمہارا خط پڑھا گیا ہے اور ہم لوگ کل اللہ کی بارگاہ میں اس کی شہادت دیں گے۔

اے ہارون، تم نے مسلمانوں کے مال پر حملہ کر رکھا ہے کیا تمہارے اس فعل سے مجاہدین فی سبیل اللہ اور مسافرین راضی ہیں؟ کیا تمہارا یہ فعل اہل علم کے نزدیک پسندیدہ ہے، کیا بیوہ عورتیں اور یتیم بچے اس سے راضی ہیں؟ کیا تمہاری رعایا کو اس سے مسرت ہے؟ اے ہارون اپنے باقذ کو ذکو کل اللہ کے یہاں جواب دہی کے لیے تیار رہو، یقین کرو کہ تم کو ایک عادل اور حکیم کے دربار میں میں کھڑا ہونا ہے۔ اپنے معاملہ میں اللہ سے ڈرو، کیونکہ ایمان اور زہد کی صورت تم سے سلب کر لی گئی ہے تلاوت قرآن مجید کی لذت اور صلحاء کی ہم نشینی کے شرف سے تم محروم ہو گئے ہو اور تم نے اپنے لیے ظالم اور ظالموں کا سرگروہ بننا پسند کر لیا ہے۔

اے ہارون تم تخت شاہی پر بیٹھے ہوئے حریر و دیبا کے استعمال میں مصروف ہو اور دروازہ پر تم نے پردے ڈال رکھے ہیں، ظالم سپاہ تمہارے قصر معلی کے سامنے کھڑی رہتی ہے، یہ لوگوں پر ظلم کرتی ہے۔ اس کا انصاف نہیں ہوتا ہے، دوسروں پر شراب کی حد جاری کرتے ہیں لیکن خود شراب خوار ہیں، زانی کو سزا دیتے ہیں لیکن خود زانی ہیں، چوروں کے ہاتھ کاٹتے ہیں لیکن خود چور ہیں، قاتل کو سزائے موت کا حکم سناتے ہیں لیکن خود قتل کرنے میں بے باک ہیں کیا یہ احکام تم پر اور تمہاری سپاہ پر ضروری نہیں ہیں قبل اس کے کہ وہ دوسروں پر جاری کیے جائیں؟

اے ہارون اس دن تمہارا کیا حشر ہو گا جب پکارنے والا پکارے گا کہ ظالمین اور ان کے اعوان و انصار کو جمع کرو، پھر تم مع اپنی پوری جماعت کے بارگاہ ایزدی میں جمع کیے جاؤ گے اور تم ان سب کے امام ہو گے!

اے ہارون رشید میری نصیحت پر عمل کرو۔ اپنی رعایا کے بارہ میں اللہ سے ڈرو اور اس پر غور کرو کہ جناب محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کا اپنی امت کے متعلق کیا حال تھا؟ اے ہارون جس طرح خلافت تم کو ملی ہے۔ اسی طرح تم سے کسی دوسرے کو ملیگی، دنیا کا یہی رنگ ہے بس کچھ لوگ تو وہ ہیں جو (اس سلسلہ میں) اپنے لیے نفع آخرت کا سامان کرتے ہیں اور کچھ لوگ وہ ہیں جن کی دنیا و آخرت دونوں تباہ ہیں اب تم آئندہ مجھے کوئی خط نہ لکھنا اس لیے کہ میں جواب نہ دوں گا۔

عباد طالقانی کہتے ہیں کہ حضرت سفیان ثوری کے نصیحت بھرے الفاظ مجھ پر اثر کر چکے تھے، میں خط لیکر کوفہ کے بازار آیا اور پکار کر کہا، کیا کوئی ایک اللہ کی طرف بھاگنے والے کا خریدار ہے؟ لوگ درہم و دینار لیکر دوڑے، میں نے کہا درہم و دینار نہیں ایک صوف کا جبہ چاہیئے، وہ لایا گیا میں نے اپنا امیرانہ لباس اتار کر اسی جبہ کو پہنا اور خلیفہ ہارون الرشید کے دربار میں پہنچا، پہلے تو دربان نے میرا مذاق اڑایا، پھر مجھے شرف باریابی حاصل ہوا، ہارون نے جب مجھے اس رنگ میں دیکھا تو کھڑا ہو گیا اور پھر بیٹھ گیا اپنا سر پیٹنے لگا کہ افسوس میں نامراد ہی رہا، اور قاصد بامراد ہو گیا پھر اس نے خط پڑھنا شروع کر دیا اور آنسو اس کے چہرہ پر جاری تھے۔

بعض مصاحبین نے عرض کیا کہ امیر المومنین سفیان نے آپ کے مقابلہ میں بڑے بیباکی سے کام لیا ہے انھیں پا بزنجیر قید خانہ میں ڈال دیا جائے۔ ہارون الرشید نے کہا اے بندگان دنیا سفیان کو ان کے حال پر چھوڑ دو بیشک وہ شخص بدبخت ہے جس کے تم ہم نشین ہو، یقیناً سفیان ایک

بردمقی ہے!

عباد کہتے ہیں کہ ہارون الرشید نے اس روز سے معمول کر لیا کہ نماز پنجگانہ کے بعد اس خط کو پڑھتا اور خوب روتا۔

(۴)

۲۰ ذی قعدہ ۷۲۸ھ آج قلعۂ دمشق کا ایک قیدی قید حیات سے آزاد ہو گیا ہے کہتے ہیں کہ جب سانس نے آخری ہچکی لی تو اس کی زبان پر یہ آیت تھی۔

إِنَّ الْمُتَّقِينَ فِي جَنَّٰتٍ وَنَهَرٍ فِي مَقْعَدِ صِدْقٍ عِندَ مَلِيكٍ مُّقْتَدِرٍ

یہ قیدی کہا کرتا کہ قید میری خلوت ہے، قتل میری شہادت ہے اور جلاوطنی میری سیاحت ہے، مقید وہ ہے جو اپنی خواہشات کا مقید ہے اور محبوس وہ ہے جس کا قلب خدا کی جانب سے بند ہے۔

اس قیدی کا نام شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ ہے، بلاشبہ علماء کی ایک جماعت نے ابن تیمیہؒ پر سخت تنقید کی ہے خود ان کے مؤیدین اور ان کے کمال کے معترفین نے بھی ان کے بعض تفردات سے اختلاف بلکہ اپنی برأت تک کا اظہار کیا ہے، مگر ان کے ولولۂ حق اور حمایت دین کے جوش کا سب کو اقرار ہے ان کو ایک سلسلہ میں زنداں خانہ جانا پڑا، وہاں دیکھا کہ سب قیدی خدا سے غافل ہیں آخرت سے بے پروا ہیں، لہو و لعب میں مبتلا ہیں، شیخ نے ان سب کو نصیحت کی، ان سے توبہ کرائی، عقائد کی تصحیح کی، جو کل تک چور اور ڈاکو تھے ان کی پیشانیاں سجدوں کے آثار سے چمک اٹھیں اور زبانیں ذکر الٰہی سے تر ہو گئیں۔

ایک مرتبہ شیخ الاسلام کی قازان سے ملاقات ہوئی قازان اور بہت سے تاتاری دائرۂ اسلام میں داخل ہو چکے تھے مگر اخلاق و اعمال میں کوئی تغیر نہیں ہوا تھا، ابن تیمیہؒ نے انتہائی بیباکی سے نصیحت کی، لوگوں کا خیال تھا کہ قازان اب قتل کا حکم دینا ہی چاہتا ہے مگر اس پر حق کی ہیبت طاری ہو چکی تھی زبان کھلی تو ان الفاظ پر کہ

میرے لیے دعا فرمائیے۔

اب ذرا سنئے کہ شیخ الاسلام نے کیا دعا شروع کی! ہاتھ اٹھائے اور عرض کیا خداوندا اگر قازان خدا اور رسول کے لیے لڑ رہا ہے تو اس کی مدد کر اور اگر مال و دولت اور سلطنت کی خواہش کے لیے لڑ رہا ہے تو اس کو اپنی مدد سے محروم رکھ۔ لوگوں نے دیکھا کہ قازان ہاتھ اٹھائے ہوئے ہر فقرہ پر آمین آمین کہہ رہا تھا۔ (باقی مضمون صفحہ ۱۹۳ پر ملاحظہ ہو)

یہ لیجیے
یا یہ!
تازہ پھلوں کے رس اور جسم کو تازگی پہنچانے والی شیریں جڑی بوٹیوں سے مرکب، شربت روح افزا، جو پیاس میں قدرتی تسکین پہنچاتا ہے اور گرمی سے پیدا ہونے والی تھکن کو دور کرتا ہے۔
شربت روح افزا پیجیے
گرمی کے مقابلہ کے لیے ایک ہی شربت

حضرت مولانا مناظر احسن گیلانی مرحوم

ایک درویش اپنے آخری وقت میں

حضرت شاہ شرف الدین منیری قدس سرہ کے وصال کا قلمی مرقع

ہندوستان کے صوبوں میں ایک صوبہ بہار بھی ہے، لیکن جیسے کابل ملک کے نام کے ساتھ اسی ملک کی ایک آبادی کا بھی نام ہے، اسی طرح بہار کے صوبہ میں بھی ایک آبادی اس وقت تک "بہار" کے نام سے پائی جاتی ہے، جو اسلام اور قبل اسلام دونوں زمانوں میں اپنی ایک خاص تاریخ رکھتی ہے اب وہ چند ہزار کی ایک معمولی آبادی ہے۔ فقیر کے کھنڈی گوشہ گیلانی سے بجانب مغرب پانچ کوس کے فاصلہ پر یہ آبادی واقع ہے۔ انگریزی عہد میں اس علاقہ کا سب ڈویزن اسی قصبہ کو قرار دیا گیا تھا۔ اس کے نام بہار کے ساتھ شریف کا لفظ بھی استعمال ہوتا ہے، ڈاک خانہ کی مہر میں بھی بہار شریف" ہی کا ٹھپہ انگریزی عہد ہی میں منظور کر لیا گیا تھا۔

جس ذات شرافت سمات کے انتساب نے بہار شریف کے اس قصبہ کو شریف بنا دیا۔ یہ ان ہی کا آخری وداعی نظارہ ہے۔ حضرت مخدوم الملک شاہ شرف الدین احمد بن یحییٰ منیری قدس اللہ سرہ کے نام سے آپ مشہور ہیں، ہندوستان کے اساطین صوفیہ میں شمار ہوتے ہیں، مکاتیب کے نام سے دین کے مختلف عنوانوں پر مقالہ نگاری کی ابتداء جہاں تک میری تحقیق ہے آپ ہی نے کی ــــ ان مقالات طیبہ کے مختلف مجموعے مکتوبات یک صدی و سہ صدی کے نام سے عام طور پر اہل ذوق و مطالعہ میں متداول ہیں۔ اور بھی بہت سی کتابوں کے مصنف ہیں۔ فارسی نثر نگاری میں ہندوستان کی سرزمین شاید ہی ان کی نظیر پیش کر سکتی ہے۔

بہر حال کہنا یہ ہے کہ ایک سو اکیس سال کی طویل عمر حضرت مخدوم کی سلطان نصیر الدین محمود کے

عہد سے فیروز تغلق کے عہد تک گزرے ہیں۔ اس طویل عرصہ میں مسلسل گیارہ بادشاہوں کے بیسیوں سیاسی جھونکوں سے ملک کو گزرنا پڑا، بڑے بڑے انقلابات ہوئے، حکومت کے خانوادوں پر خانوادے بدلتے چلے گئے۔ لیکن اللہ کا یہ راستباز بندہ بہار کے ایک گوشہ میں بیٹھا ہوا کچھ تو کتابیں لکھتا رہا اور کتابوں سے زیادہ زندہ انسانیت کے غلط مسودات کی کاٹ چھانٹ، اصلاح و ترمیم میں یکسوئی کے ساتھ مشغول رہا، تا آنکہ ایک سو اکیس سال کے بعد وہی "ناگزیر وقت" انک میت و انھم میتون کا اس کے سامنے بھی آہی گیا، خدام خاص میں زین بدر عربی ایک صاحب تھے، "ناگزیر گھڑی جس وقت گزر رہی تھی وہ بھی موجود تھے۔ ان کی آنکھیں جو کچھ دیکھ رہی تھیں، کان جو کچھ سن رہے تھے، دل ان کا جو کچھ پا رہا تھا، سب ہی کو ان ہی زین بن بدر عربی نے قلم بند کر لیا تھا، جو الحمد للہ اس وقت تک کہیں کہیں مل ہی جاتا ہے۔ اسی کی تلخیص مخدوم الملک بہار رحمۃ اللہ علیہ کی سوانح عمری "سیرت الشرف"[1] نامی سے نقل کرتا ہوں۔

مخدوم الملک بہار رحمۃ اللہ علیہ کی وفات ۶ شوال ۷۸۲ھ میں نماز عشا کے وقت ہوئی چہار شنبہ کا دن گزر چکا تھا، پنجشنبہ کی رات تھی۔ زین بن بدر عربی نے لکھا ہے کہ چہار شنبہ کی صبح کی نماز سے فارغ ہونے کے بعد تکیہ لگا کر حجرہ میں گدے پر تشریف فرما تھے۔ کچھ لوگ حاضر تھے کہ آپ نے لاحول ولاقوۃ الا باللہ کا ورد خود شروع کیا، اور جو موجود تھے ان سے اسی "کنز من کنوز الجنۃ" کا دہرانے کی فرمائش کی، پڑھتے جاتے تھے اور کہتے جاتے تھے "ملعون! اس وقت مجھے پھسلانا چاہتا ہے، نگہ میں اور تیری طرف جھانکوں" پھر اس کے بعد الحمد للہ، المنۃ للہ، کا ورد باواز بلند شروع کیا تھا۔ اخیر باشوں کے متعلق تشفی و تسلی کے کلمات کے بعد قرآنی آیت

لاتقنطوا من رحمۃ اللہ	نا امید نہ ہونا اللہ کی رحمت سے، بلاشبہ
ان اللہ یغفر الذنوب جمیعا۔	تمام گناہوں کو وہ بخش دیتا ہے۔

---

[1] مرحومہ سلطان جہاں بیگم والیہ بھوپال کے پرائیویٹ سکریٹری مولوی ضمیر الدین بہاری مرحوم نے مدت ہوئی یہ کتاب مرتب کی تھی، فارسی و عربی کے سوا وہ انگریزی زبان سے بھی واقف تھے، حسن عقیدت کے ساتھ ساتھ جدید تنقیدی رجحانات سے متاثر ہونے کی وجہ سے کسی "ہندی صوفی" کی عمر و قالب میں شاید یہ پہلی سوانح عمری لکھی گئی تھی، آج سے باون سال پہلے ۱۹۱۳ء میں کتاب طبع ہوئی تھی، افسوس ہے کہ اب نہیں ملتی، کاش! کسی ناشر کو اس کتاب کی اشاعت جدید کی توفیق ہو، پڑھنے کی کتاب ہے۔ ۱۲

کی تلاوت میں مشغول ہوئے کبھی کبھی اس کے ساتھ فارسی کا یہ شعر بھی زبان مبارک پر جاری ہو جاتا

خدایا رحمتت دریائے عام ست
از آنجا قطرۂ مارا تمام ست

اس سلسلہ میں کبھی کبھی یہ فقرہ بھی نکل جاتا۔

ماھماں دیوانہ ایم　　ہم وہی دیوانے ہیں، ہم وہی دیوانے
ماھماں دیوانہ ایم　　ہیں۔

حاضرین سے خطاب کر کے پوچھا گیا تم سے اگر دریافت کیا گیا تو کیا کہو گے؟
جواب خود ہی یہ بتاتے لَا تَقْنَطُوا مِن رَّحْمَةِ اللهِ إِنَّ اللهَ يَغْفِرُ الذُّنُوبَ جَمِيعًا
بس یہی لایا ہوں، یہی اپنے ساتھ بھی لیے جا رہا ہوں، اچانک آواز آنے لگی

أَشْهَدُ أَنْ لَا إِلٰهَ إِلَّا اللهُ
وَحْدَهُ لَا شَرِيكَ لَهُ وَأَشْهَدُ
أَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهُ وَرَسُولُهُ

میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی الٰہ و معبود نہیں ہے تنہا وہی ہے۔ اس کا کوئی ساجھی نہیں اور میں گواہی دیتا ہوں کہ محمد اللہ کے بندے اور اس کے رسول ہیں۔

اس کو دہراتے ہوئے سنا گیا کہ فرماتے ہیں:۔

رضیت باللہ ربًّا، وبالاسلام
دینًا، وبمحمد علیہ السلام نبیًّا
وبالقرآن اماماً وبالکعبۃ قبلۃ۔

میں خوش ہوں، اللہ کو رب، اسلام کو دین، محمد علیہ السلام کو نبی، قرآن کو پیشوا و امام، کعبہ کو قبلہ بنا کر۔

اس کے ساتھ یہ اضافہ بھی سننے والوں کے کانوں تک پہونچا۔

وبالمومنین اخوانا و
بالجنۃ ثوابا وبالنار
عقابا۔

یعنی خوش ہوں ایمان والوں کو بھائی بنا کر، جنت کو ثواب اور جہنم کو سزا مان کر۔

آنے والوں کا تانتا بندھا ہوا تھا، مولانا آموئی نامی کوئی بزرگ تھے۔ جب وہ سامنے آئے تو مخدوم الملک بہار نے ان کے ہاتھ کو اپنے ہاتھ میں لے کر سینہ مبارک پر ملتے ہوئے فرمایا تم نے میری بڑی خدمت کی

خاطر جمع رکھو، ہم سب ایک ہی جگہ ہوں گے،

اور فرمایا کہ

کل تم سے پوچھا جائے گا کہ تم کیا لائے؟

جواب میں پھر وہی رکھا یا۔ لاتقنطوا من رحمة الله ان الله يغفر الذنوب جميعا۔

فرماتے تھے۔ "مجھ سے بھی پوچھا جائے گا تو یہی کہوں گا۔"

مولانا آموری سے کہا کہ دوسرے جو منتظر ہیں ان سے بھی کہدو کہ خاطر جمع رکھیں،

"اگر میری آبرو رہے گی تو کسی کو نہ چھوڑوں گا۔"

ٹھٹ لگی چلی جاتی تھی، مخدوم الملک بہار کو پھر اپنا پرانا مشغلہ یاد آجاتا ہے۔

"ایمان کا غم کھاؤ، رحمت و مغفرت کے امیدوار رہو۔"

اور وہی آیت قرآنی لاتقنطوا ــ الآیۃ بار بار زبان پر جاری ہے۔

مجمع کی طرف خطاب کرکے یہ بھی ارشاد ہوا۔

میں جو کہا کرتا تھا، عاقبت عاقبت (انجام انجام) وہ یہی عاقبت (انجام) ہے۔

عزیزوں میں نو عمر کوئی بچہ سامنے بیٹھا تھا حکم ہوا کہ قرآن کچھ یاد ہو تو سناؤ، اس نے محمد رسول الله، والذین معہ سورہ فتح کے خاتمہ کی آیتیں تلاوت کرنی شروع کیں، سنبھل کر دو زانو ہوگئے جیسے قرآن سننے کے وقت ہمیشہ دستور تھا، بیٹھ گئے، تلاوت ختم ہوئی، بچے کو شاباشی دی گئی۔

وقت گذر رہا تھا۔ پانی طلب کیا گیا، انگا اتار اگیا قمیص کے ساتھ وضوء میں مشغول ہوئے لیکن آج کا رنگ ہی دوسرا تھا۔ ایک سو اکیس سال تک وضوء کی مشق کرنے والے کو دیکھا گیا کہ منہ کا دھونا بھول گئے، یاد دلایا گیا۔ پھر از سر نو وضو کا اعادہ کیا گیا۔[1] بدن پر ارتعاش طاری تھا، پاؤں دھونے میں لوگوں کو محسوس ہوا کہ قابو نہیں چل رہا ہے مدد کی طرف متوجہ ہوئے لیکن اشارہ سے روک دیے گئے، اور جس طرح ممکن ہوا اپنے اس آخری وضوء کو خود ہی پورا فرمایا، کنگھی طلب کی گئی، محاسن مبارک کے بال سلجھائے گئے اور دو رکعت نماز ادا کی گئی۔

کچھ زیادہ وقفہ نہیں گزرا تھا کہ بسم اللہ کے ساتھ

[1] حالات میں ان کے لکھا ہے کہ ایام جوانی میں جب راجگیر کی پہاڑیوں کے دامن میں آپ مجاہدہ دریافت میں مشغول تھے غسل کی ضرورت موسم سرما میں پیش آگئی، ٹھنڈے پانی کے تالاب میں غسل کیا۔ لیکن پھر ضرورت پڑی بار بار غسل کرتے، اور ضرورت ہو جاتی۔ ۱۲.

لا الٰہ الا انت سبحانک انی
کنت من الظالمین۔

کوئی الٰہ نہیں ہے مگر تو ہی، پاک ہے تیری ذات بیشک
میں تھا ظلم کرنے والوں میں

تسبیح یونسی کا اعادہ بار بار فرمانے لگے۔

اسی کے ساتھ کبھی کبھی بسم اللہ، کلمۂ شہادت، سوم کلمہ (یعنی لاحول ولا قوۃ الا باللہ) کا ورد بھی درمیان میں کرتے، اسی قسم کے کلمات طیبات زبان مبارک پر جاری تھے کہ
اچانک

"محمد رسول اللہ"

کی صدائے پر درد سینۂ پرملال سے اٹھی، اسی نعرے کے ساتھ جس کا چند بار اعادہ کیا گیا کہ

"محمدؐ، محمدؐ، محمدؐ"

آواز سے فضا گونج اٹھی، کفرستان ہند میں، محمد کا ایک غلام اپنے آقا کو پکار رہا تھا، اُسے جس پر جس کے نام پر اپنی ایک سو اکیس سال کی عمر نذر کر دی۔

سکون کی سی کیفیت اس کے بعد پیدا ہوئی، دعاء عیسوی

اللّٰھم ربنا انزل علینا مائدۃ
من السماء تکون لنا عیداً
لاولنا وآخرنا، وآیۃ منک وارزقنا
وانت خیر الرازقین۔

اے اللہ اے رب ہمارے اتار ہم پر ایک خوان
بھرا آسمان سے کہ وہ دن عید رہے ہمارے پہلوں اور
پچھلوں کیلئے اور نشانی تیری طرف سے ہو، اور روزی

سنی گئی کہ مانگی جا رہی ہے، دعاء عیسوی ختم ہوئی، پھر "اللہ ہی کو رب بنا کر پسند کر لیا، اسلام کو دین، محمدؐ کو نبی، قرآن کو امام، کعبہ کو قبلہ، ایمان والوں کو بھائی" یعنی رضیت باللہ ربا کے اقرار کو تازہ فرماتے ہوئے دیکھا گیا کہ دست مبارک آسمان کی طرف اٹھے ہوئے ہیں، اور عرض کیا جا رہا ہے، سنیے یہ مسلمانوں کے مخدوم کی زبان کے آخری کلمات ہیں:-

اللھم اصلح امۃ محمد صلی اللہ
علیہ وسلم، اللھم ارحم امۃ
محمد صلی اللہ علیہ وسلم
اللھم اغفر لامۃ محمد، اللھم
تجاوز عن امۃ محمد، اللھم

اے اللہ سنوار محمد کی امت کو، اے اللہ رحم کر
محمد کی امت پر، اے اللہ بخش دے محمد کی امت
کو، اے اللہ درگذر فرما محمد کی امت سے،
اے اللہ فریادرسی محمد کی امت کی اے
اللہ مدد فرما محمد کی امت کی،

اغث امة محمد، اللهم ارحم امة	اے اللہ محمد کی امت کی مصیبت کو ٹال،
محمد، اللهم فرج عن امة محمد عاجلا	جلدی ٹال۔

اور پھر یہ:

اللهم انصر من نصر دين محمد	اے اللہ مدد کر اس شخص کی جو محمد صلی اللہ علیہ
صلى الله عليه وسلم	وسلم کے دین کی مدد کرے اور برباد کر اس کو جو
اللهم اخذل من خذل	محمد کے دین کی تباہی کے درپے ہو اپنی رحمت
دين محمد صلى الله عليه	سے دیا ایسا کیجیے اے سارے مہربانوں سے
وسلم برحمتك يا ارحم الراحمين۔	سب سے بڑے مہربان۔

جا بجا جو الٰہی، یہ انگریز ہندوستان کے مختلف گوشوں اور زاویوں میں جو بیٹھے ہوئے تھے وہ کن کے لیے بیٹھے ہوئے تھے. کن کا کام کرتے تھے؟

لکھنے والے آج، اللہ کہ ان برگزیدوں، امت محمدیہ کے ان چاہنے والوں کی شان میں جو چاہیں کہیں، جن بدگمانیوں سے اپنے آپ کو گندہ اور ناپاک کریں. لیکن ان واقعات کا ان کو اگر صحیح علم ہو تو یورپ کی سکھائی ہوئی قولِ "عشق بازی" میں ان کو وہ روح نہیں ملے گی، جو مرنے والے کے ان زندہ کلمات میں مل رہی ہے. آواز کہتے ہیں، اسی آخری دعا کے پست ہو گئی، کان لگانے والوں نے صرف اتنا اور سنا کہ لب جو ہل رہے تھے اس سے

لا خوف عليهم ولا هم يحزنون لا اله	نہ ڈر ہے ان کو اور نہ کڑھیں گے.
الا الله بسم الله الرحمن الرحيم۔	لا الٰہ الا اللہ، بسم اللہ الرحمن الرحیم

ارتعاشی تموجات ان کے کانوں سے ٹکرا رہے تھے.. زندگی کی ایک منزل کے اختتام کے بعد شاید دوسری منزل میں قدم رکھتے ہوئے پانے والا جو کچھ پا رہا تھا کیا اسی کی یہ تعبیر تھی؟ گویا —— سمجھنا چاہیے کہ زندگی کی یہ دوسری منزل جو خوف و حزن سے پاک تھی اور وہی اللہ جو خاکی زندگی کے ابتدائی دور میں "الٰہ" بنا کر ایک سو اکیس سال تک پوجا گیا تھا وہی جزائی رنگ میں الٰہ بن کر سامنے آ گیا تھا، اسی لیے زندگی کی اس نئی اور جدید منزل میں قدم رکھنے والے نے بسم اللہ الرحمن الرحیم پڑھتے ہوئے قدم رکھا، سننے اور سنانے کا سارا قصہ آخری انجام اور جدید آغاز پر ختم ہو گیا، تغمدہ اللہ بغفرانہ، وصب علیہ شآبیب رضوانہ۔

(الفرقان شعبان ۱۳۷۲ھ)

صفحہ ۱۱۰ کا بقیہ

اسمیں کسی خاص سمت کی پابندی اگر کی جائے گی تو صرف اس لیے کہ اللہ نے دکسی مصلحت سے) اس کی پابندی کا حکم دیا ہے. ورنہ اللہ تو ہر طرف ہے جدھر بھی رُخ کر لیا جاتا مل جاتا. قُلْ لِلّٰهِ الْمَشْرِقُ وَالْمَغْرِبُ فَاَيْنَمَا تُوَلُّوا فَثَمَّ وَجْهُ اللّٰهِ ــــ (کہہ دیجئے کہ مشرق و مغرب سب اللہ کی سمتیں ہیں پس تم جدھر بھی منہ کرلو اُدھر اللہ ہے) پس اب اللہ تعالیٰ اگر دحضرت محمدؐ کے دور میں کوئی دوسری سمت قبلہ کے لیے مقرر کرتا ہو تو اس کی طرف رُخ کرکے عبادت کرو سمتوں میں خود کچھ نہیں رکھا ہے' نہ مشرق کی طرف رُخ کرنا فی نفسہٖ ثواب ہے' نہ مغرب کی طرف رُخ کرنا بذاتہٖ گناہ. گناہ و ثواب کا تعلق تمامتر حکم الٰہی کی تعمیل اور عدم تعمیل سے ہے. اگر کسی خاص سمت کا حکم دیدیا گیا تو پھر اس کا ترک گناہ اور اختیار ثواب ہے پہلے کبھی اگر مشرق کو قبلہ بنانے کا حکم تھا تو اس سے انحراف گناہ تھا اور اب اگر مغرب کو قبلہ مقرر کر دیا گیا تو اس کا استقبال ثواب اور اس سے انحراف گناہ ہے' ــــ یہ ہے مقصد ان آیات کا نہ یہ کہ کوئی خاص سمت متعین ہی نہیں ہے' جدھر کو بھی تم چاہو رُخ کرکے عبادت کرلو.

یہ مقصد محض ہمارے ذہن کی پیداوار نہیں ہے بلکہ ان آیات کے آس پاس کی دوسری آیات اسی مقصد کو متعین کرتی ہیں جن میں مکرر سہ کرر تاکید کے ساتھ سمت کعبہ کو قبلہ بنانے کا حکم دیا جا رہا ہے اور اہل کتاب کی خواہش کے مطابق' بیت المقدس کو قبلہ بنانے کی سخت لفظوں میں ممانعت کی جا رہی ہے. ــــ وہ آیات یہ ہیں:

فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ۖ وَحَيْثُ مَا كُنْتُمْ فَوَلُّوا وُجُوهَكُمْ شَطْرَهُ ۗ (بقرہ ع ۱۷)

پس موڑ دو تم (اے محمد) اپنا چہرہ مسجد حرام کی جانب' اور (اے مسلمانو!) تم جہاں کہیں بھی ہو اپنا رُخ اسی (مسجد حرام) کی طرف پھیر لو.

وَلَئِنِ اتَّبَعْتَ اَهْوَاءَهُمْ مِنْ بَعْدِ مَا جَاءَكَ مِنَ الْعِلْمِ ۙ اِنَّكَ اِذًا لَمِنَ الظّٰلِمِيْنَ (بقرہ ع ۱۷)

اور اگر تم چلے ان کی (اہل کتاب کی) خواہشات کے پیچھے درانحالیکہ تمہیں (سمت قبلہ کے معاملہ میں اللہ کی مرضی کا) علم ہو چکا ہے' تو بے شک تم تجاوز کرنے والوں میں سے ہو گے.

وَمِنْ حَيْثُ خَرَجْتَ فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ۖ وَاِنَّهٗ لَلْحَقُّ مِنْ رَّبِّكَ ۗ (بقرہ ع ۱۸)

اور جہاں سے بھی تم نکلو اپنا چہرہ (نماز میں) مسجد حرام ہی کی طرف پھیرلو' اور یہی بیشک حق ہے تمہارے پروردگار کی طرف سے.

بتلائیے کہ اگر سابق آیات کا مقصد یہ ہوتا کہ جس کا جدھر کو جی چاہے منہ کرکے عبادت کرلے' اللہ کے یہاں سب مقبول ہے تو پھر ان آیات کا کیا مقصد ہے؟ اور کیوں ان کو کہا گیا ہے کہ

وَمَا جَعَلْنَا الْقِبْلَةَ الَّتِي كُنتَ عَلَيْهَا إِلَّا لِنَعْلَمَ مَن يَتَّبِعُ الرَّسُولَ مِمَّن يَنقَلِبُ عَلَىٰ عَقِبَيْهِ ۚ (رکوع ۱۷)

اور ہم نے نہیں مقرر کیا تھا وہ قبلہ[1] جس پر اب تک تم قائم تھے مگر اس لیے کہ ممتاز کردیں ان لوگوں کو جو رسول کا (بہرحال) اتباع کرتے ہیں۔ ان لوگوں سے جو (اپنی خواہشات کے خلاف ہوتا دیکھ کر) اُلٹے پاؤں پھر جاتے ہیں[2]۔

اور پھر کیوں کہا گیا ہے کہ

وَإِن كَانَتْ لَكَبِيرَةً إِلَّا عَلَى الَّذِينَ هَدَى اللَّهُ ۗ (رکوع ۱۷)

اور بیشک یہ بات (تحویل قبلہ) بہت ہی گراں گزرنے والی تھی سوائے ان لوگوں کے جن کو اللہ نے ہدایت دی۔

سوچنے کی بات ہے کہ اگر قبلہ کے لیے کسی ایک سمت کی پابندی ضروری نہیں تھی تو تحویل قبلہ کے واقعہ میں امتحان و آزمائش کا آخر کیا پہلو نکلتا تھا؟ اور اگر قبلہ کے معاملہ میں ہر چہار سو کی وسعت قرآن نے دے رکھی تھی، تو پھر کیوں ان لوگوں کو اَلَّذِينَ هَدَى اللَّهُ (وہ لوگ جن کو اللہ نے ہدایت دی) خارج کیا گیا ہے جو کسی ایک خاص سمت کے معاملہ میں رسول اُمی صلی اللہ علیہ وسلم کے پابند نہیں رہے؟ کیا (معاذ اللہ) اللہ کے یہاں یہ اندھیر ہے کہ ایک طرف تو یہ اعلان کیا کہ جدھر کو بھی رُخ کرو اللہ مل جائے گا! اور دوسری طرف ان لوگوں کو ہدایت سے محروم ٹھہرا دیا جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ایک خاص سمت کے پابند نہیں ہوئے؟ ـــــــ تعالى الله عن ذلك علوًّا كبيرًا۔

پس بلاشبہ یہ بات غلط اور بالکل غلط ہے کہ قرآن بھی تنہا شریعت محمدی کو دستور العمل بنانا لازم نہیں ٹھہراتا بلکہ مختلف شریعتوں کی اجازت دیتا ہے۔ اس کے برعکس صحیح بات یہ ہے کہ رسالت محمدی کا دور شروع

---

[1] مکہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کعبہ ہی کی طرف منھ کرکے عبادت کرتے تھے، مگر مدینہ آکر اللہ تعالیٰ کا حکم ہوا کہ بیت المقدس کو قبلہ بنایا جائے۔ یہ حکم سولہ سترہ مہینے رہا۔ اسکے بعد پھر کعبہ ہی کو ہمیشہ کے لیے قبلہ قرار دیدیا گیا۔ آیت میں قبلہ سے مراد یہی عارضی قبلہ ہے۔ [2] یعنی ہمارا یہ حکم آزمائشی تھا، جب یہ حکم دیا گیا تو اُن مسلمانوں کی آزمائش ہوگئی جن کا آبائی قبلہ بیت اللہ تھا۔ اور جب یہ حکم واپس لیا گیا تو اُن کی آزمائش ہوگئی جن کا آبائی قبلہ بیت المقدس تھا ـــــ ان دونوں گروہوں میں جو سچے دل سے آپ پر ایمان لائے تھے انھوں نے اپنے آبائی قبلہ کی محبت پر آپ کی اطاعت کو ترجیح دی اور جو ایمان لانے میں مخلص نہ تھے وہ آپ کی اطاعت میں اپنے آبائی قبلہ کو چھوڑنے پر تیار نہ ہوئے۔

ہونے کے بعد قرآن شریعت محمدی کے علاوہ کسی اور شریعت کو دستور العمل بنانے کی اجازت نہیں دیتا۔ اور اگر کوئی سمجھنا چاہے تو اس کے لیے صرف تحویل قبلہ کے موقع پر نازل ہونے والی یہی آیت کافی ہے جو ابھی اوپر گزر چکی ہے یعنی وَمَا جَعَلْنَا الْقِبْلَةَ الَّتِي كُنتَ عَلَيْهَا الخ کیونکہ یہ حقیقت ظاہر کر دینے کے باوجود کہ "سمتوں میں کچھ نہیں رکھا ہوا، اللہ تعالیٰ ہر سمت میں ہے، مشرق میں بھی اور مغرب میں بھی پس جدھر کو بھی رُخ کر لوگے اُدھر اللہ کو پا سکتے ہو۔" (خود اس حقیقت کے ظاہر کر دینے کے باوجود) یہ مطالبہ کرنا کہ جدھر کو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم رُخ کریں اُدھر ہی کو رُخ کرو، اور اسی سمت کو قبلہ بناؤ، اور جو لوگ اس کے خلاف ورزی کریں اُن کو خواہشات کا بندہ اور ہدایت الٰہی سے محروم ٹھہرانا، یہ بلاشبہ اس بات کی دلیل ہے کہ ہدایت پیغمبر وقت کے اتباع میں منحصر ہے اور اس کے طریقے سے انحراف خواہ فی نفسہٖ کیسے ہی ہلکے معاملہ میں ہو اور اس کے طریقہ کو چھوڑ کر خواہ کسی سابق پیغمبر ہی کا طریقہ اختیار کیا گیا ہو، بلکہ خود اسی پیغمبر ہی کا کوئی سابق معمول کیوں نہ اختیار کیا گیا ہو وہ ہرگز ہرگز ہدایت کی فہرست میں نہیں آئے گا ـــــ کیونکہ سمت قبلہ کا مسئلہ خود قرآن کے بیان کے مطابق فی نفسہٖ کوئی اہمیت نہیں رکھتا، پھر یہ کہ اس مسئلہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی نہ کرنے کی صورت میں واقعاتی امکان دو ہی تھے، ایک یہ کہ جس وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بیت المقدس کا رُخ کرنے لگے تھے تو مسجد حرام سے محبت رکھنے والے لوگ بدستور مسجد حرام ہی کو قبلہ بنائے رہتے، اور دوسرا یہ کہ جس وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بیت المقدس کا رُخ چھوڑ کر پھر سے مسجد حرام کا رُخ اختیار کیا تو بیت المقدس سے محبت رکھنے والے اس تبدیلی کو قبول نہ کرتے اور بدستور بیت المقدس ہی کو قبلہ بنائے رہتے، ہر دو صورتوں میں بعض انبیاء کا بلکہ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بھی ایک سابق طریقہ کا اتباع تھا، لیکن اس کے باوجود ہدایت یاب صرف اسی گروہ کو بتلایا گیا جو ہر تبدیلی میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی کرتا رہا۔

الغرض پیغمبر وقت کے مکمل اتباع کے بغیر ہدایت کا کوئی تصور قرآن میں نہیں ملتا ہے، قرآن کا تصور اس بارے میں بعینہٖ وہی ہے جو ایک حدیث کے ان الفاظ میں انتہائی صفائی کے ساتھ واضح کیا گیا ہے کہ

لَوْ كَانَ مُوسَىٰ حَيًّا مَا وَسِعَهُ إِلَّا اتِّبَاعِي۔

(بخاری شریف)

(رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا) کہ اگر موسیٰ علیہ السلام (جیسے جلیل القدر اور صاحب شریعت نبی) بھی (میرے زمانہ میں) زندہ ہوتے تو انھیں بھی میرا ہی اتباع کرنا پڑتا۔

مستند تفاسیر اور قرآنی علوم سے متعلق اہم کتابیں				اردو میں حدیث کی مستند کتابیں	
تفسیر ابن کثیر	۱۳۰/-	قصص القرآن غیر مجلد مکمل	۴۶/۲۵	صحیح بخاری اردو	۶۰/-
تفسیر حقانی	۱۱۰/-	نظریۂ قرآن پر ایک نظر	۳/-	" " مترجم مع متن	۱۰۰/-
تفسیر بیان القرآن مکمل مجلد چرمی	۱۶۰/-	قرآن اور پیغمبر	-/۶۰	ایضاح البخاری ۱ تا ۱۲	۳۹/-
تفسیر موضح القرآن	۴۰/-	قرآن کی چار بنیادی اصطلاحیں	۲/۵۰	تقریر بخاری	۱۰/-
تفسیر حل القرآن	۷۵/-	قرآن کی معاشی تعلیمات	۱/-	مسلم شریف اردو	۶۰/
تفسیر ماجدی اول، دوم مجلد	۴۰/-	فضائل قرآن	۱/۲۵	" مترجم	۱۰۰/-
تفسیر مظہری کامل سیٹ	۲۱۰/-	قصص و مسائل	۲/۵۰	ترمذی شریف اردو	۳۰/-
اعلام القرآن	۲/۲۵	قرآن کا تعارف	۲/۷۵	مشکوٰۃ شریف اردو	۴۵/-
تفسیر رشیدی	۳/-	احسن التجوید	۱/۵۰	مظاہر حق شرح مشکوٰۃ مجلد مکمل سیٹ	۱۶۰/-
تفسیر تفہیم القرآن مکمل	۱۳۰/-	اعجاز القرآن	۱/۷۵	شمائل ترمذی اردو	۱۲/-
تفسیر الفوز الکبیر اردو	۲/۵۰	آداب القرآن	-/۸۰	مؤطا امام مالک اردو	۱۲/-
قرآن آپ سے کیا کہتا ہے؟	۶/۵۰	ام الکتاب	۱۰/-	انتخاب صحاح ستہ	۸/-
قرآن مجید اور تخلیق انسان	۲/-	قرآن کی فضیلت	۱/-	ترجمان السنہ مکمل غیر مجلد	۷۲/۵۰
قرآن اور حدیث	۳/-	کلمات القرآن	-/۶۰	حجۃ اللہ البالغہ اردو	۲۲/-
قاموس القرآن	۱۵/-	ارض القرآن مکمل	۱۴/-	معارف السنہ	۱۶/
لغات القرآن	۵۷/۵۰	قرآن مجید کا چیلنج	۳/۵۰	علم الحدیث	۲/۵۰
قرآن کی باتیں	۲/-	دین کا قرآنی تصور	۴/-	انتخاب حدیث مجلد	۵/۵۰
قرآن اور تعمیر سیرت	۷/۵۰	قرآن فہمی کے اصول	-/۵۰	فن اسماء الرجال	۲/۵۰
قرآن اور تصوف	۵/-	تجوید القرآن	-/۶۰	محدثین عظام (نیا اڈیشن)	۱۰/-
فہم قرآن	۸/۵۰	قرآن عظیم اور جبریہ تعلیم	۱/-	کتابت حدیث	۲/-
جمع و تدوین قرآن	۳/۰۰	یسرنا القرآن	۱/-	فقہ الحدیث	۲/-
رہنمائے قرآن	۱/۲۵	قرآن مجید کی پہلی کتاب	۲/-	نصرت الحدیث	۳/-
وحی الہٰی	۵/-			بہار حدیث چار بنیادی باتیں	۸/- ۲/۲۵

ملنے کا پتہ۔ کتب خانہ "الفرقان" ۳۱ نیا گاؤں مغربی۔ لکھنؤ

ملفوظات ارشادات ومقالات

کتاب	قیمت
صحبتے با اولیاء	۷/۰
صحبتے با اہل دل	۷/۰
چالیس ارشادات	۱/۵۰
مواعظ حسنہ	۸/۰
ملفوظات مولانا الیاسؒ	۲/۵۰
اشرف المواعظ	۵/۰
خطبات ماجدی	۴/۰
ملفوظات شیخ الاسلامؒ	۴/۵۰
مقالات شیخ الہندؒ	۱/۵۰
مقالات شبلی اول تا ہشتم	۳۴/۵۰
مقالات امینی	۱۵/۰
خطبات شبلی	۳/۷۵
ترجمہ امداد السلوک	۵/۰
ارشاد الملوک مجلد	۱۰/۰
خطبات ماثورہ	۰/۷۵
خطبات مدراس	۶/۲۵
مقالات احسان	۱۲/۵۰
مقالات عبد السلام	۱۲/۵۰
مقالات شیخ الاسلام	
خطبات (مودودی)	۷/۵۰
خطبات الاحکام	۴/۰

مکتوبات

کتاب	قیمت
حضرت ابوبکرؓ کے سرکاری خطوط	۷/۵۰
حضرت عمرؓ کے سرکاری خطوط	۱۱/۷۵
حضرت عثمانؓ کے سرکاری خطوط	۶/۲۵
شاہ ولی اللہ دہلوی کے سیاسی مکتوبات	۱۰/۰
مکاتیب حمد سعید	۳/۰
مکتوبات علمیہ اول مجلد	۸/۰
مکتوبات تصوف اول مجلد	۸/۰
مکتوبات شیخ دوم مجلد	۴/۰
مرزا مظہر جان جاناں کے خطوط	۵/۰
مکاتیب شبلی	۱۵/۰
مکتوبات شیخ الاسلام	۴۰/۰

تصوف کے موضوع پر کچھ کتابیں

کتاب	قیمت
تصوف کیا ہے	۵/۰
تزکیۂ نفس	۸/۰
مکتوبات تصوف	۶/۰
مدارج سلوک	۸/۰
احسان اور تصوف	۰/۴۰
تصوف کی حقیقت	۵/۰
جوہر تصوف	
مولانا مودودی اور تصوف	۲/۰
تحفۃ الادوار جامی	۱/۵۰

تبلیغی کتابیں

کتاب	قیمت
تبلیغی نصاب اول سادہ	۱۲/۰
〃 〃 پلاسٹک	۱۴/۵۰
〃 〃 چرمی	۲۰/۰
〃 دوم پلاسٹک	۱۸/۰
〃 〃 چرمی	۲۰/۰
تبلیغ دین	۴/۵۰
تبلیغی چالیس سبق	۰/۴۰
تبلیغی جماعت پر اعتراضات کا جواب	۵/۵۰
تبلیغی تقریریں	۱/۰
ایک اہم دینی دعوت	۱/۸
اسلام اور فریضۂ تبلیغ	۰/۴۰
التبلیغ مکمل مع	۴۰/۰
تبلیغ کیا ہے؟	۳/۵۰
تبلیغی سات نمبر	۲/۰
چھ باتیں	۱/۲۵
تبلیغی تحریک کے بنیادی اصول	۴/۸
مفتاح التبلیغ	۴/۰
طریقۂ تبلیغ	۲/۰
تبلیغی سرگرمیاں عہد سلف میں	۱/۵۰

ملنے کا پتہ ۔ کتب خانہ الفرقان ۳۱ نیا گاؤں مغربی لکھنؤ

(بقیہ نگاہ اولیں)

اور کہیں نہ کہیں سے عیب چینی کا نشانہ بن جاتا ہے۔ شاہ مرحوم کا اس دور میں ایسے بلند درجے کے تاثرات دلوں میں، جس کے اندر خلیفۃ المسلمین بنجانے تک کے امکانات دیکھے جا سکتے تھے، ایسی سلامتی کے ساتھ گزر جانا اور ہر طرف سے تعاون و اعتماد ہی پانا، یہ ان ہی مخلصانہ اطوار کا کرشمہ تھا جنھیں مخلصانہ کے ساتھ دانشمندانہ بھی کہہ سکتے ہیں ـــ کیسے کہا جائے کہ اخلاص کا یہ کردار آج وہاں بھی مشکل ہی سے ملتا ہے جہاں سے اخلاص کا سبق رنگ پاتے ہیں، یعنی دینی حلقے اور شخصیات! نفس عجب عجب خوشنما دیو کے پھندے اس باب میں لگاتا ہے اور بڑے بڑے آدمیوں کو چھوٹا بنا کے ان کی قوت تاثیر و کشش کو کم سے کم کر دیتا ہے۔ اشخاص کی بھی کمی نہیں، اخلاص بھی بالکل عنقا نہیں مگر یہ اطوار اخلاص ڈھونڈے تو نایاب ہیں اور یہی ہمارے کاموں کی عموماً بے اثری اور بے برکتی کا راز ہے۔

مرحوم کی دوسری خصوصیت، جو خالص دانشمندی کے اطوار میں آتی ہے کم بولنا اور زیادہ سوچنا، زیادہ کرنا۔ خاصکر جذباتی باتوں سے بالکل پرہیز رکھنا تھی۔

زیادہ بولنا اور خاص کر جذباتی بولی بولنا، اپنوں کا جوش بھڑکانا اور دوسروں کو لن ترانیاں دکھانا کم از کم آج کی نازک اور کمزور حالت میں مسلمانوں کے لیے وہ آفت ہے جو بڑی سے بڑی عالی دماغ، مضبوط اعصاب اور باعمل قیادت کو بھی اکارت کر دیتی ہے۔ گنجائش ہوتی تو مثالیں گنائی جا سکتی تھیں لیکن شاید ضرورت بھی نہیں ہے، ان اوصاف کے لوگوں کی ناکامیوں اور نامرادیوں کی داستانیں ہمارے چاروں طرف بکھری ہوئی ہیں۔

شاہ فیصل مرحوم کی اعلیٰ دماغی اور عملی صلاحیتوں کو اخلاص اور اس کے جملہ آداب کی نگہداشت کے بعد جس چیز نے کامیابی اور بامرادی سے سرفراز رکھا وہ یہی دانشمندانہ اطوار تھے۔ بولنے میں بند نہیں تھے مگر کسی نے بڑکم بولنے کی عادت رکھی اور وہ مرحلہ بمرحلہ کامیابیاں جن پر دوسرے جھوم جھوم گئے، اور وہ قیامت کی جالیں جن پر ایک عالم ششدر رہ گیا، کبھی انجنابِ بھی تو اس آدمی کو از خود رفتہ نہ کر سکیں۔ بیت المقدس کے لیے جہاد تک کی باتیں کیں پر وہاں بھی تو جذبات انگیزی کا کوئی جملہ کبھی زبان پر نہیں آیا۔

آج ہم میں کے ہر "میر کارواں" کو جس "رخت سفر" کی سب سے زیادہ ضرورت ہے وہ یہی دو باتیں ہیں! یہی شہید فیصل کی اصل میراث ہے اور یہی اپنے قدر شناسوں کو اسکی بامراد روح کا اولیں پیغام!

Regd. No. LW/NP-62

Monthly 'ALFURQAN' Kutchery Road, Lucknow U. P.

VOL. 43 NO. 2, 3 ~~FEB., MARCH~~, 1975 Phone : 25547

5, 6 April May June 1975

Cover Printed at—Shining Press, Naya Gaon, Lucknow-1

تیسرا انتخاب نمبر
ماہنامہ
الفرقان
لکھنؤ
مدیر
محمد منظور نعمانی
قیمت
5/-

قوم ترقی کی راہ پر

فولاد کی ریکارڈ پیداوار

پچھلے سات مہینوں میں قابل فروخت فولاد کی
پیداوار 31 لاکھ 40 ہزار ٹن تک پہنچ گئی ہے
جو کہ ایک نیا ریکارڈ ہے ـــ پچھلے سال کی
اسی مدت کی پیداوار سے 16 فیصد زیادہ۔
اس ضمن میں پبلک سیکٹر کے کارخانے سب سے
آگے رہے جن میں 19.3 فیصد پیداوار بڑھی ـــ
کڑی محنت اور صنعتی امن و امان کا نتیجہ۔

مضبوط ارادہ
اور کڑی محنت
ہمارے ساتھی ہیں
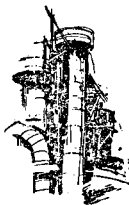
davp 75/450

اپریل، مئی، جون سنہ ۱۹۷۶ء

الفرقان

ماہنامہ — لکھنؤ

تیسرا انتخاب نمبر

گذشتہ فائلوں کے منتخب مضامین

مدیر

محمد منظور نعمانی

غیر ممالک سے
سالانہ، دو پونڈ
(بذریعہ بحری ڈاک)

یہاں سرخ نشان اس بات کی علامت ہے کہ آپ کی مدت خریداری ختم ہوگئی ہے۔ براہ کرم آئندہ کیلئے سالانہ چندہ (۱۵/-) ارسال کریں۔ اگر خریداری جاری رکھنے کا ارادہ نہ ہو تو فوراً مطلع فرمائیں۔ ورنہ اگلا شمارہ بذریعہ وی، پی، ارسال کیا جائے گا۔

● براہ کرم خط و کتابت اور منی آرڈر کوپن پر اپنا نمبر خریداری ضرور لکھ دیا کیجئے، جو پتہ کی چٹ پر لکھا رہتا ہے۔

(مولوی) محمد منظور نعمانی اڈیٹر، پرنٹر و پبلشر نے تنویر پریس، باغ گونگے نواب لکھنؤ میں چھپوا کر دفتر الفرقان ۳۱- نیا گاؤں مغربی نظیرآباد لکھنؤ سے شائع کیا۔

فہرست مضامین

ضروری دفتری اطلاعات

یہ نمبر اپریل، مئی، جون ۱۹۷۶ء کا مشترکہ شمارہ ہے۔ اس کے بعد جولائی کا شمارہ انشاء اللہ ۱۰ر جولائی تک شائع ہوگا۔

یہ تیسرا انتخاب نمبر بھی پہلے دو انتخاب نمبروں (بابت ۱۹۶۳ء و ۱۹۶۵ء) کی طرح اپنی خاص نوعیت اور دستاویزی اہمیت کی بنا پر خریداروں کی موجودہ تعداد سے کچھ زیادہ چھپوایا گیا ہے اس کی قیمت بھی ۱۰ روپے ہی ہے۔ جو صاحب صرف یہ نمبر طلب کرنا چاہیں وہ اس کی قیمت کے ساتھ دو روپے رجسٹری فیس ضرور ارسال فرمائیں — جو حضرات اس نمبر سے خریداری شروع کرنا چاہیں گے انھیں یہ خاص نمبر خریداری کے حساب ہی میں پیش کیا جائے گا۔

خصوصی رعایت۔ الفرقان کے انتخاب نمبر کے سلسلے کی تینوں خاص اشاعتیں ایک ساتھ طلب کرنے پر محصول ڈاک (مع رجسٹری فیس) دفتر کے ذمہ ہوگا۔ آپ صرف پندرہ روپے ارسال فرما کر ساڑھے چھ سو صفحات پر مشتمل تینوں ضخیم نمبر حاصل کر سکتے ہیں۔

ناظم دفتر الفرقان، ۳۱۔ نیا گاؤں مغربی (نظیر آباد) لکھنؤ ۱

سُخنہائے گُفتنی

بسم اللہ، والحمد للہ، والصلوٰۃ والسلام علیٰ سیدنا محمد رسول اللہ وآلہٖ وصحبہٖ ومن والاہ۔

اللہ کی مدد اور اُس کی توفیق سے الفرقان کا تیسرا انتخاب نمبر ناظرین کی خدمت میں پیش کیا جا رہا ہے۔

الفرقان کا پہلا شمارہ محرم ۱۳۵۳ھ (مارچ ۱۹۳۴ء) میں بریلی سے شائع ہوا تھا۔ اس بنا پر قمری حساب سے اس کی عمر کا یہ چوالیسواں سال ہے اور شمسی حساب سے تینتالیسواں ــــ جیسا کہ پہلے اور دوسرے انتخاب نمبر میں بھی ذکر کیا جا چکا ہے اب سے تقریباً چار سال پہلے جب اس کے اجرا پر چالیس سال پورے ہونے والے تھے، تو یہ خیال دل میں پیدا ہوا کہ اس طویل مدت میں مختلف موضوعات اور مسائل پر بہت سے ایسے مضامین شائع ہوئے ہیں جن کی آج بھی ویسی ہی ضرورت ہے اور ان میں وہی افادیت ہے جو اُس وقت تھی جب وہ لکھے گئے تھے، مگر اب وہ پرانے فائلوں میں مدفون ہو کر بالکل نسیاً منسیاً ہو چکے ہیں اور الفرقان کے موجودہ ناظرین میں شاذ و نادر ہی وہ حضرات ہوں گے جن کی نظر سے وہ گزرے ہوں ــــ اُس وقت یہ فیصلہ کیا گیا تھا کہ ایسے تمام مضامین کا انتخاب کر کے ایک خاص نمبر کی شکل میں اُن کو پھر شائع کر دیا جائے ــــ لیکن جب اس نقطۂ نظر سے گزشتہ چالیس سالہ فائلوں کو دیکھا گیا تو اندازہ ہوا کہ یہ سب مضامین ایک نمبر میں نہیں سما سکتے بلکہ متعدد نمبر شائع کرنے ہوں گے۔ چنانچہ یہی طے کر لیا گیا ــــ اس فیصلے کے مطابق "پہلا انتخاب نمبر" اب سے دو سال پہلے ۱۹۷۴ء کے اسی موسم میں اور دوسرا انتخاب نمبر گزشتہ سال

۱۹۷۵ء کے انہی دنوں میں شائع ہوا تھا[1] ــــ اب اللہ کی توفیق سے یہ تیسرا انتخاب نمبر نذرِ ناظرین کیا جا رہا ہے ــــ اللہ تعالیٰ اس کو اپنے بندوں کی فکری و عملی اصلاح کا ذریعہ اور ہمارے لئے مغفرت و رحمت کا وسیلہ بنائے۔

اس تیسرے انتخاب نمبر میں اب سے ۱۵، ۱۶ سال پہلے تک کے (۱۳۸۰ھ م ۱۹۶۰ء تک کے) الفرقان میں شائع شدہ وہ مضامین لے لئے گئے ہیں، جن کا اس انتخابی سلسلہ میں شائع کرنا مفید سمجھا گیا ــــ اب یہ سلسلہ اس تیسرے انتخاب نمبر پر ختم کر دیا گیا ہے۔

اس سلسلۂ انتخاب میں وہ تعزیتی مضامین بالکل نہیں لئے گئے ہیں جو اکابر دین و ملت یا اپنے اقارب و اعزہ کی وفات پر ادارہ کی طرف سے الفرقان میں وقتاً فوقتاً لکھے گئے تھے۔ ناظرین کرام میں سے بعض مخلصین نے مشورہ دیا ہے کہ وہ تمام مضامین بھی اسی طرح ایک مستقل نمبر میں شائع کر دیئے جائیں ــــ ابھی اس سلسلہ میں کوئی فیصلہ نہیں کیا جا سکا ہے۔ دینیات کے سلسلے کے مضامین کو دیکھنے کے بعد اگر مناسب اور مفید سمجھا گیا تو انشاء اللہ آئندہ سال اسی موسم میں چوتھا انتخاب نمبر شائع ہوگا جو صرف ان مضامین پر مشتمل ہوگا جو دینیات کے سلسلے میں الفرقان میں کبھی لکھے گئے ہیں ــــ واللہ الموفق

الفرقان کا حال ــــ

الفرقان کی یہ بڑی خوش نصیبی ہے کہ اس کے ناظرین عموماً وہ لوگ ہیں جو اس کے صرف "خریدار" نہیں ہیں بلکہ اس کو دینی خدمت کا ایک سلسلہ سمجھ کر اس سے محبت و ہمدردی رکھتے ہیں اور ان کی خریداری دراصل قلبی تعاون ہی کی ایک شکل ہے۔ اللہ تعالیٰ ان کو جزائے خیر عطا فرمائے اور اپنے خاص فضل سے نوازے۔

اب سے چند مہینے پہلے (جنوری ۷۶ء سے) الفرقان کا بدل اشتراک (سالانہ چندہ) بارہ روپے کے بجائے پندرہ روپے کر دیا گیا تھا۔ الحمد للہ اس کے تمام ناظرین اور معاونین نے اس کو بخوشی قبول فرما لیا۔ اس اضافہ سے اس کی گنجائش ہو گئی کہ الفرقان میں رف اخباری کاغذ کے بجائے سفید چکنا کاغذ استعمال ہونے لگا۔

---

[1] پہلے اور دوسرے انتخاب نمبر کی کچھ کاپیاں دفتر الفرقان میں اب بھی موجود ہیں۔ شائقین طلب فرما سکتے ہیں۔ قیمت، پانچ روپے (فی شمارہ)

اور اسکی ترتیب و تیاری کے کاموں میں ہاتھ بٹانے کے لئے ایک باصلاحیت عزیز کا وقت بھی حاصل کر لیا گیا، اور اس کی وجہ سے الحمد للہ بہت سہولت ہو گئی۔

پچھلے سال مولانا عتیق الرحمان سنبھلی کے قیام انگلستان کے زمانہ میں وہاں کے بعض مخلصین کی جدوجہد سے بہت سے حضرات نے الفرقان جاری کرایا تھا، اس وقت ان حضرات سے سالانہ چندہ بحری ڈاک کیلئے ایک پونڈ اور ہوائی ڈاک کیلئے ڈھائی پونڈ کے حساب سے وصول ہوا تھا، لیکن چند ہی مہینے کے بعد ہماری حکومت نے خاصکر بیرونی ڈاک کے محصول میں غیر معمولی اضافہ کر دیا ــــــ اب الفرقان کے ایک عام شمارہ پر بحری ڈاک کیلئے تیس کے بجائے اسّی پیسے کا ٹکٹ لگانا ہوتا ہے اور ہوائی ڈاک کے لئے انگلستان کے واسطے ۲/۱۰ کے ٹکٹ لگائے جاتے ہیں ــــــ اور دوسری طرف پونڈ کی قیمت اب بہت کم ہو گئی ہے، اس صورت حال کی وجہ سے بیرونی ممالک کے سالانہ بدل اشتراک میں اضافہ ناگزیر ہو گیا ہے لہٰذا اب الفرقان کے بیرونی معاونین کو بحری ڈاک سے الفرقان طلب کرنے کے لئے دو پونڈ اور ہوائی ڈاک سے منگانے کے لئے چار پونڈ سالانہ ادا کرنے ہوں گے۔

محصول ڈاک میں جس غیر معمولی اضافہ کا ذکر سطور بالا میں کیا گیا ہے، اس سے الفرقان کے پاکستانی معاون بھی اس طور پر متاثر ہوں گے کہ اس اضافہ کی وجہ سے پاکستان کے لئے الفرقان کے سالانہ زر تعاون کی شرح بیس کے بجائے اب چھتیس روپے سالانہ ہو گئی ہے ــــــ اُمید ہے کہ پاکستانی احباب و مخلصین اب الفرقان سے اپنے تعلق کی تجدید کے لئے سکریٹری ادارۂ اصلاح و تبلیغ آسٹریلین بلڈنگ لاہور کو اپنا زر تعاون اسی نئی شرح کے حساب سے روانہ فرمائیں گے۔ (ادارہ)

خریداروں سے ضروری گذارش

الفرقان کے اکثر خریدار حضرات خط و کتابت کرتے وقت خریداری نمبر کا حوالہ دینا بھول جاتے ہیں جس سے تعمیل میں بیحد دشواری اور تاخیر ہوتی ہے براہ کرم خطوط اور منی آرڈر کوپن پر اپنا نمبر خریداری (جو پرچہ کی چٹ پر لکھا رہتا ہے) ضرور لکھئے تاکہ ناظرین زحمت سے محفوظ رہیں۔

* جواب طلب اُمور کیلئے جوابی کارڈ یا ۵۰ پیسے کے ڈاک ٹکٹ ضرور ارسال کیجئے بصورت دیگر جواب نہ ملنے کی شکایت کا حق نہ ہوگا۔ (منیجر)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نگاہِ اوّلیں

———— محمد منظور نعمانی

ہماری اِس دنیا کے بہت سے ملکوں کا حال یہ ہے کہ اُن کی آبادی بہت تیزی سے بڑھ رہی ہے جس کی وجہ سے اُن کے اربابِ حکومت ہراساں اور فکرمند ہیں کہ اگر آبادی میں اضافہ کی رفتار یہی رہی تو مستقبل میں سخت مشکلات پیش آئیں گی اور پوری آبادی کیلئے زندگی کی ضروریات پوری نہ ہو سکیں گی۔ اس لئے قریب قریب اُن سب ملکوں میں سرکاری سطح پر یہ کوشش کسی نہ کسی درجہ میں ہو رہی ہے کہ آبادی کے اضافہ پر کنٹرول کیا جائے اور ایسی تدبیریں عمل میں لائی جائیں جن کے نتیجہ میں آبادی میں اضافہ بے حساب اور غیر متوازن نہ ہو ——— فیملی پلاننگ (خاندانی منصوبہ بندی) اِسی کوشش کا عنوان ہے ——— ہندوستان و پاکستان بھی انہی ملکوں میں سے ہیں اور خاصی طویل مدت سے اِن دونوں ملکوں میں یہ کوشش جاری ہے اور اس مد پر ان کا کروڑوں روپیہ خرچ ہو تا رہا ہے لیکن اب تک ان کوششوں کا انداز صرف ترغیبی رہا ہے۔

ہمارے ملک میں ایمرجنسی کے نفاذ کے بعد سے جب بہت سے سرکاری کاموں میں تیز رفتاری آئی تو خاندانی منصوبہ بندی کے اِس کام کو بھی تیزی سے چلانے اور مقررہ نشانے تک جلدی پہونچ جانے کی کوشش شروع ہوئی۔ اور اس کیلئے خاص طور پر "نس بندی" کے طریقہ پر زور دیا جانے لگا، جو ایک طرح کا آپریشن ہے۔

اگرچہ مرکزی حکومت کی طرف سے اس سلسلہ میں ——— جہاں تک ہمیں معلوم ہے ——— جبر و زبردستی کا رُجحان ظاہر نہیں کیا گیا، لیکن بعض ریاستی حکومتوں یا اُن کے وزراء اعلیٰ کی طرف سے دو یا تین بچوں کے بعد جبری نس بندی اور اس کے قانونی لزوم اور خلاف ورزی کی صورت میں قید اور بھاری جرمانے تک کے اعلانات

اور بیانات اخباروں میں آئے اور ملک کے مختلف حصوں میں ایسے واقعات بھی اس سلسلہ میں ہوئے یا اُن کی شہرت ہوئی جس کی وجہ سے بہت سے مقامات کے عوام میں ایک عجیب طرح کی دہشت اور سراسیمگی اور حکومت کے خلاف سخت ناراضی اور بیزاری کی فضا پیدا ہو گئی، اور ہم جیسوں نے محسوس کیا کہ ایمرجنسی کے اقدام سے اشیائے ضرورت کی قیمتوں میں کمی اور عوام کے لئے دوسری بہت سی سہولتیں پیدا ہونے کی وجہ سے حکومت اور حکومتی پارٹی کانگرس پر اُن کے اعتماد میں جو اضافہ ہو گیا تھا، جبر نس بندی سے متعلق بعض ریاستوں کے اعلانات اور اس سلسلہ کے واقعات کی شہرت نے اس کو بہت نقصان پہونچایا۔

ہم کو حیرت ہی کہ اس کھلی ہوئی حقیقت کو کیوں نہیں محسوس کیا جا رہا ہے کہ نس بندی کو قانون کے ذریعہ لازم قرار دینا اور پولیس وغیرہ کے ذریعہ اس پر جبری عمل درآمد کا اقدام غیر تعلیم یافتہ یا کم تعلیم یافتہ عوام، کسانوں، مزدوروں اور دیہات کے باشندوں کو ____ جن کی تعداد ملک میں یقیناً بہت زیادہ ہے ____ حکومت اور کانگرس سے کس قدر دُور کر دے گا، اور مخالف عناصر کے ہاتھ میں کیسا کارگر ہتھیار دے دے گا اور سیاسی لحاظ سے یہ سودا کسی وقت کتنا مہنگا پڑے گا!

خدا کا شکر ہے کہ اخباری روایت کے مطابق ۳۰ر اپریل کو وزیر اعظم نے کنبہ بندی کی اہمیت اور ضرورت پر حکومتی نقطۂ نظر سے زور دینے کے ساتھ یہ وضاحت بھی فرمادی کہ "**اس سلسلہ میں جبر خارج از امکانات ہے**"۔ ____ (قومی آواز لکھنؤ یکم مئی ۱۹۷۶ء)

اُمید ہے کہ اس کے بعد ملک کی کسی ریاست میں بھی یہ غلطی نہیں کی جائے گی اور اگر کی گئی تو یقیناً کانگرس کو ناقابلِ تلافی نقصان پہونچے گا ____ یہ کوئی باریک سیاسی نکتہ اور مشکل سے سمجھ میں آنے والا منطقی فارمولا نہیں ہے بلکہ عوام کی حالت اور اُن کے احساسات سے واقفیت رکھنے والوں کیلئے آنکھوں سے نظر آنے والی حقیقت ہے۔

اسی مسئلہ (خاندانی منصوبہ بندی اور اس کیلئے نس بندی) سے متعلق صوبۂ یوپی کے سابق وزیر اعلیٰ آنجہانی سمپورنانند جی کے چھوٹے بھائی مسٹر پری پورنانند ورما کا ایک مکتوب لکھنؤ کے انگریزی روزنامہ "پانیر" کے شروع مئی کے ایک شمارہ میں شائع ہوا ہے، جس میں مرکزی اور صوبائی حکومتوں کو اس مسئلہ سے متعلق بعض اہم نکتوں کی طرف توجہ دلائی گئی ہے۔ موصوف نے اس میں منجملہ دوسری باتوں کے

یہ بھی لکھا ہے ——

"میری گزارش یہ ہے کہ ہماری حکومت ویسک ٹومی (نس بندی) کے عمل پر آخر اتنا زور کیوں دے رہی ہے! کیا ہمارے علم میں یہ تازہ ترین سائنٹیفک حقیقت نہیں آچکی ہے کہ یہ آپریشن دماغ کو کند کر دیتا ہے، پیوٹری گلینڈز کو متاثر کرتا ہے اور اس کے اثراتِ مابعد بہت ضرر رساں ہوتے ہیں۔ یورپ میں اور دنیا کے دوسرے متعدد ملکوں میں یہ عمل صرف زیادہ عمر والوں کے لئے مخصوص رہتا ہے جو اپنی مردانہ قوت کو بہتر بنانا چاہتے ہیں۔ اس قسم کا آپریشن اگرچہ قوتِ مردانگی کو کچھ عرصہ کیلئے بڑھا دیتا ہے لیکن آگے چل کر اس کے اثرات اتنے ضرر رساں ہوتے ہیں کہ اب ہندوستان کے سوا ہر ترقی یافتہ ملک نے اس کے استعمال کو خیرباد کہہ دیا ہے۔ ریاستہائے متحدہ امریکہ، کناڈا، فرانس اور سوویت روس میں ویسک ٹومی کو ممنوع قرار دے دیا گیا ہے۔"

مسٹر پری پورنا نند ورما کا یہ انتباہ یا مشورہ ملک اور عوام کے خیرخواہوں کیلئے ہرگز نظرانداز کر دینے کے لائق نہیں ہے۔

فیملی پلاننگ اور بالخصوص اُس کی شکل نس بندی کے آپریشن سے متعلق خاص کر مسلمانوں کے سامنے جو اسلامی شریعت کی پیروی اور پابندی کے ساتھ زندگی گزارنا چاہتے ہیں، یہ سوال بھی آتا ہے کہ ہماری شریعت میں یہ جائز بھی ہے یا نہیں۔؟

جہاں تک ہمیں معلوم ہے اسلامی شریعت کے ماہرین اور مستند اصحابِ فتوٰی کی عام رائے اس بارے میں یہ ہے کہ کسی شخص کیلئے اپنے خاص حالات اور اپنی جائز مصلحت کی بنا پر یہ تو جائز ہے کہ اولاد کی تعداد کو محدود رکھنے کے لئے وہ عزل یا کسی اور جائز مانع حمل تدبیر یا دوا کا استعمال کرے مگر اس مقصد کیلئے نس بندی جیسے عمل جراحی کے ذریعہ تولیدی صلاحیت ہی سے اپنے آپ کو محروم کر لینا (جو اُس کے خالق و پروردگار کا ایک خاص عطیہ ہے اور جس سے بہت سے مقاصد وابستہ ہیں) جائز نہیں —— بہرحال نس بندی کو لازمی قرار دینے کا مسئلہ اس لحاظ سے بھی قابلِ غور ہے۔

آخر میں ہم ان تمام حکومتوں کے ذمہ داروں سے جو آبادی کے اضافے سے ہراساں اور فکر مند ہیں، اور اس کی وجہ سے خاندانی منصوبہ بندی کو ناگزیر سمجھتے ہیں ـــــــ اگر ہماری کمزور آواز کسی طرح اُن تک پہونچ سکے ـــــــ یہ بھی عرض کریں گے کہ وہ انسان کی اجتہادی و ایجادی صلاحیت اور کارکردگی اور زمین کی مزید پیداواری صلاحیت سے کیوں مایوس ہیں؟ انھوں نے کیوں اور کس دلیل سے سمجھ لیا ہے، کہ انسان زمین سے پیداوار حاصل کرنے کے لئے آج جو طریقے اور ذرائع استعمال کر رہا ہے آئندہ اس میں اب کوئی ترقی نہ ہوگی! اور زمین سے جو پیداوار آج حاصل کی جا رہی ہے اُس سے زیادہ حاصل ہی نہ کی جا سکے گی؟ حالانکہ ہم دیکھ رہے ہیں کہ صرف گزشتہ دس پندرہ برسوں میں خود ہمارے ملک میں پیداوار بڑھانے کی صلاحیت میں اور پہلے سے زیادہ پیداوار زمین سے حاصل کرنے میں کتنی ترقی ہوئی ہے اور برابر ہو رہی ہے۔ جن کھیتوں میں زیادہ سے زیادہ ۴۔ ۵ من فی بیگھہ گیہوں پیدا ہوتا تھا، اب ان میں ۱۵ من تک پیدا ہو رہا ہے۔ جن کھیتوں سے سال میں صرف ایک فصل لی جاتی تھی، اب اُن سے تین تین فصلیں لی جا رہی ہیں۔ اور اس سے زیادہ کے امکانات سامنے ہیں۔ اور زمین کے علاوہ سمندر میں بھری ہوئی بے حد و بے حساب خوراک کو اپنی گرفت میں لینے اور قابلِ استعمال بنانے کی باتیں ہو رہی ہیں۔ پہلے کپڑا صرف کپاس یا اُون یا ریشم سے تیار ہوتا تھا، اب طرح طرح کے مصنوعی ریشوں سے خود اپنے ملک میں کپڑے تیار ہو رہے ہیں اور ہمارے بازار اُن سے پٹے پڑے ہیں۔ زمین کی پیداوار جدید ترین طریقوں سے دس دس گُنے تک بڑھ جانے کے امکانات نظر آ رہے ہیں اور ترقی یافتہ ملکوں نے اُن امکانات کو بڑی حد تک تجربہ بنا دیا ہے۔ ان حالات میں آبادی کے بڑھنے سے فکر اور گھبراہٹ کا کیا جواز ہے؟

کافی عرصہ ہوا ملک کی عظیم شخصیت ونوبا بھاوے جی نے اسی مسئلہ کے بارے میں اظہارِ خیال کرتے ہوئے کہا تھا کہ "آدمی کا جو بچہ پیدا ہوتا ہے وہ کھانے کے لئے اگر ایک منہ لیکر آتا ہے تو کام کرنے کے لئے دو ہاتھ بھی لاتا ہے"۔ میں اس پر یہ اضافہ کروں گا کہ وہ ضرورت کے مطابق نئی نئی باتیں سوچنے اور نئی نئی چیزیں ایجاد کرنے کی صلاحیت والا دماغ بھی لے کر آتا ہے جس کا ظہور آج ہمیشہ سے زیادہ وسیع پیمانہ پر ہو رہا ہے۔ بہرحال یہ بات سوچنے کی ہے کہ اس وقت دُنیا میں جو ترقیاں ہو رہی ہیں اُن کو دیکھتے ہوئے انسان کی صلاحیت اور اس کے پیدا کرنے والے کی دین سے مایوس ہونے کا کیا جواز ہے؟

راقم سطور نے فیملی پلاننگ اور برتھ کنٹرول ہی کے متعلق ایک محقق کے مضمون میں پڑھا تھا، کہ

"روسی سائنس دانوں کی ایک ٹیم نے اندازہ لگایا ہے کہ دنیا کی زیر کاشت آسکنے والی زمین سے اتنی غذا پیدا کی جا سکتی ہے جو ساڑھے نو کھرب انسانوں کی ضروریات کے لئے کافی ہو۔"

اور اس وقت عملاً صورت یہ ہے کہ زمین پر انسانوں کی تعداد جدید ترین اندازے کے مطابق صرف ساڑھے تین ارب یا اس سے کچھ زائد ہے۔

مبارک اور خوش کن۔

۸ مئی کے روزناموں میں یہ خبر شائع ہوئی ہے کہ ہندوستان اور پاکستان کے درمیان بعض ٹوٹے ہوئے رشتوں کو پھر سے قائم کرنے کے لئے پاکستان کے دارالحکومت اسلام آباد میں دونوں ملکوں کے نمائندوں کی جو کانفرنس ہو رہی تھی وہ کامیابی پر ختم ہو گئی اور باہم سفارتی تعلقات قائم کرنے اور واگھا۔ اٹاری سرحد پر ریل کا راستہ کھولنے نیز ایک دوسرے کے علاقہ پر سے پرواز اور فضائی رابطے پھر سے قائم کرنے کا فیصلہ ہو گیا ——— دونوں ملکوں کے عوام کے لئے خاص کر مسلمانوں کیلئے یقیناً یہ فیصلہ خوش کن ہے۔

کاش دونوں ملکوں کے ذمہ داروں کو اس طرف بھی توجہ کرنے کی توفیق ملے کہ ادھر جب سے دونوں ملکوں کے درمیان ڈاک کی آمدورفت کا سلسلہ شروع ہوا ہے محصول ڈاک کی شرح میں اتنا غیر معمولی اضافہ کر دیا گیا ہے جس کا انسانی نقطہ نظر سے کوئی جواز نہیں۔ تقسیم کے بعد مدتِ دراز تک دونوں ملکوں کے درمیان محصول ڈاک کی شرح وہی تھی، جو اندرون ملک کے لئے تھی اور دونوں ملکوں کے درمیان باہمی رشتوں کی جو نوعیت ہے اس کا تقاضا یہی ہے ——— لیکن اب صورت حال یہ ہے کہ پاکستان بھیجے جانے والے سادہ کارڈ پر ایک روپیہ پانچ پیسے کا ٹکٹ لگتا ہے اور لفافہ پر دو روپے کا۔ الفرقان کے جس عام شمارہ پر اندرون ملک کے لئے صرف دو پیسے کا ٹکٹ لگتا ہے اس پر پاکستان کے لئے اسّی پیسے کا ٹکٹ لگانا ہوتا ہے ——— قریباً یہی شرح پاکستان میں ہے ——— دونوں ملکوں کی خاص نوعیت، مخصوص تاریخ اور ان کے کروڑوں عوام کے باہمی رشتوں اور تعلقات کے لحاظ سے کہا جا سکتا ہے کہ محصول ڈاک کی شرح میں یہ بے حساب زیادتی بڑی بے دردانہ ہے۔ کاش دونوں ملکوں کے ذمہ دار حضرات خالص انسانی نقطہ نظر سے اس مسئلہ پر بھی غور کریں، اور عوام کے نمائندے اس طرف توجہ دلائیں۔

ترانۂ نعت

(از جناب عمر انصاری صاحب)

تیری خاطر میرے شاہ　　دیدہ و دل فرش راہ
آ، کہ تا حدِّ نگاہ　　منتظر ہیں مہر و ماہ
اشہد ان لا الٰہ　　اشہد ان لا الٰہ

روبرو تیرے شہا　　مہر کیا ہے، ماہ کیا
یہ بھی تیرا نقشِ پا　　وہ بھی تیری گردِ راہ
اشہد ان لا الٰہ　　اشہد ان لا الٰہ

نازشِ کون و مکاں　　تاجدارِ انس و جاں
عرش تیرا آستاں　　خُلد تیری جلوہ گاہ
اشہد ان لا الٰہ　　اشہد ان لا الٰہ

تیرا قرآں بے مثال　　تیرا ایماں لازوال
تیری ذاتِ باکمال　　شانِ وحدت کی گواہ
اشہد ان لا الٰہ　　اشہد ان لا الٰہ

شافعِ روزِ جزا　　تاجدارِ انبیاء
مجتبےٰ و مصطفےٰ　　اے کہ شاہوں کے شاہ
اشہد ان لا الٰہ　　اشہد ان لا الٰہ

اُٹھ گئے وہ عالم ترا　　منبعِ جود و عطا
پھولوں سے دامن بھرا　　پھر بھی کانٹوں سے نباہ
اشہد ان لا الٰہ　　اشہد ان لا الٰہ

کیوں نہ ہوں قربان ہم　　تجھ پہ اے شاہِ اُمم
دشمنوں پر بھی کرم　　دوستوں پر بھی نگاہ
اشہد ان لا الٰہ　　اشہد ان لا الٰہ

دل ہو بیتاب و حزیں　　سبز گنبد کے مکیں
تیری فرقت میں کہیں　　آ نہ جائے لب تک آہ
اشہد ان لا الٰہ　　اشہد ان لا الٰہ

پھر ترے دربر عمرؔ　　آ گیا ہے لوٹ کر
اے جمالِ منتظر　　پھر ادھر کوئی نگاہ
اشہد ان لا الٰہ　　اشہد ان لا الٰہ

(الفرقان ربیع الاول ۱۳۸۲ھ)

قرآن کا تذکیری مطالعہ

وصیتِ ابراہیمؑ

عتیق الرحمٰن سنبھلی

وَمَنْ يَّرْغَبُ عَنْ مِّلَّةِ اِبْرَاهِيْمَ اِلَّا مَنْ سَفِهَ نَفْسَهٗ ؕ وَلَقَدِ اصْطَفَيْنٰهُ فِى الدُّنْيَا ۚ وَاِنَّهٗ فِى الْاٰخِرَةِ لَمِنَ الصّٰلِحِيْنَ ۝ اِذْ قَالَ لَهٗ رَبُّهٗٓ اَسْلِمْ ۙ قَالَ اَسْلَمْتُ لِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝ وَوَصّٰى بِهَآ اِبْرٰهٖمُ بَنِيْهِ وَيَعْقُوْبُ ؕ يٰبَنِىَّ اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰى لَكُمُ الدِّيْنَ فَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَاَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ ۝

(سورۂ بقرہ رکوع ۱۶)

(ترجمہ) اور کون روگردانی کرے گا طریقِ ابراہیمی سے بجز اس شخص کے جو بیوقوف بنالے اپنے آپ کو، ہم نے تو اپنا خاص بنایا تھا اس کو دنیا میں، اور لاریب کہ وہ آخرت میں بھی صالحین میں سے ہے!

جب کہا اس سے اس کے رب نے کہ حکم برداری کر! تو بولا کہ میں حکم بردار ہوں پروردگارِ عالم کا۔ اور پھر اسی کی وصیت کی ابراہیم نے اپنے بیٹوں کو اور یعقوب نے بھی کہ بیٹو! اللہ نے چن کر دیا ہے تم کو دینِ اسلام بس نہ موت آئے تم کو مگر مسلمانی پر!!

بس ملتِ ابراہیمی ہے جس کی ہدایت ہمیں خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ ملی اور آپ کی رہنمائی اپنے جدِ امجد کی اس میراث کی طرف خود پروردگارِ عالم نے فرمائی اور دانشگاف الفاظ میں اس حقیقت کے اظہار کا حکم آپ کو دیا کہ

اِنَّنِىْ هَدٰىنِىْ رَبِّىْٓ اِلٰى صِرَاطٍ — مجھ کو دکھا یا ہے میرے رب نے ایک سیدھا

مُسْتَقِيمٍ دِينًا قِيَمًا مِّلَّةَ إِبْرَاهِيمَ
حَنِيفًا وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِينَ ٥
قُلْ إِنَّ صَلَاتِي وَنُسُكِي وَمَحْيَايَ
وَمَمَاتِي لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ ٥ لَا
شَرِيكَ لَهُ وَبِذَٰلِكَ أُمِرْتُ وَ
أَنَا أَوَّلُ الْمُسْلِمِينَ ٥
(الانعام ع ۲۰)

راستہ، کہ وہ ایک دین ہے مستحکم، جو ملت ہے
ابراہیم کی جس میں ذرا کجی بھی نہیں ۔ اور
وہ نہیں تھے شرک کرنے والوں میں سے ۔
(آپ فرما دیجیے) کہ میری ساری عبادت اور
میرا جینا اور میرا مرنا سب خالص اللہ ہی کا ہے
جس کا کوئی شریک نہیں اور اسی کا مجھ کو حکم ہوا
ہے اور میں سب سے اول ماننے والا ہوں ۔

اس اظہار و اعلان سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلام جس حکم برداری کا اصطلاحی عنوان ہے اس کی وسعتوں میں کس طرح انسانی زندگی کا ایک ایک نفس سمایا ہوا ہے ۔ کہ پوری زندگی حکم برداری ہی کے خطوط پر گردش کرتے ہوئے موت سے ہم آغوش ہونی چاہیے اور نماز و روزہ و حج ہی کو نہیں، زندگی کے ہر ہر لمحے، حتیٰ کہ موت کو بھی "لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ" کی شانِ حنیفی کا آئینہ دار ہونا چاہیے ۔

الغرض ہم مسلمانوں نے جس دین کو اپنے لیے پسند کیا ہے ۔ یا مسلمان کہلانے کی بنا پر جس دین سے وابستگی ہمارے ذمہ لازم آتی ہے، قرآن بتاتا ہے کہ وہ اصلاً طریق ابراہیمی (ملت ابراہیمی) ہے جس سے اعراض اور بے رُخی سفاہت اور خود فریبی کے سوا کچھ نہیں، اور بالفاظ دگر جس کی پیروی حقیقت پسندی و دانشمندی کا سب واضح معیار ! ۔ اس لیے کہ اس کی پیروی میں ایک طرف دنیاوی زندگی میں پروردگار عالم کی اصطفائیت و پسندیدگی مضمر ہے، دوسری طرف یہ پیروی حیات اخروی میں نجات و فلاح کی ضمانت دیتی ہے ۔ اور اللہ کی دی ہوئی عقل سے کام لینے والا کوئی انسان، جو اس حقیقت کا یقین رکھتا ہو کہ اس تمام کائنات کی خالق اور فرماں روا وہی ایک ذات ہے جس کو اللہ کہا جاتا ہے وہ، دنیا اور آخرت کی اس خوش نصیبی کو کسی قیمت پر بھی نہیں چھوڑ سکتا ۔

طریق ابراہیمی کی کچھ جوہری تفصیل تو ہمیں سورۂ انعام کی مذکورۂ بالا آیت سے معلوم ہوتی ہے ۔ لیکن سورۂ بقرہ کی وہ آیتیں جو ہمسر مضمون ہیں اُن سے ایک اور اُسوۂ ابراہیمی بھی سامنے آتا ہے ۔ اور وہ ہے اولاد کو دینِ حق پر قائم رکھنے کی فکر ۔ جس کا بیان ان الفاظ میں ہوا ہے ۔

وَوَصّٰى بِهَآ اِبْرٰهٖمُ بَنِيْهِ وَيَعْقُوْبُ	اور وصیت کی اسی دقت کی ابراہیم نے اپنی اولاد کو
يٰبَنِيَّ اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰى لَكُمُ الدِّيْنَ	اور یعقوب نے بھی کہ اے میرے بیٹو! اللہ نے
فَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَاَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ ؕ	چن دیا ہے تمھارے لیے دین اسلام، بس نہ موت
	آئے تم کو مگر حالت مسلمانی و حکم برداری پر

اس اسوۂ ابراہیمی کو سامنے رکھ کر جائزہ لیجیے کہ آپ کا طریقہ اپنی اولاد کے بارے میں کیا ہے؟ آپ اس دین حق پر اپنی اولاد کو کاربند بننے کی ترغیب دیتے ہیں جس کو اللہ نے اپنی خاص رحمت سے آپ کی اولاد کا پیدائشی (یا آبائی) دین بنایا ہے؟ آپ انسانی کوشش کی حد تک اس کا بندوبست کرتے ہیں کہ نہ مرے وہ مگر حالت مسلمانی و حکم برداری پر؟ یا آپ کی کوششیں از اول تا آخر اس کی دنیا بنانے پر مرکوز ہوتی ہیں اور دین کا سوال آپ سراسر بخت و اتفاق کے حوالے کر کے چھوڑ دیتے ہیں؟ —— اور ذرا دیکھئے کہ کہیں ایسا تو نہیں ہے کہ آپ اولاد کو اس کی دنیا کی خاطر کسی ایسے ماحول میں بھی جھونک دینے سے دریغ نہ کرتے ہوں جہاں قسمت ہی ہے کہ اس کا دین سلامت رہ جائے اور نصیب ہی ہے کہ اس کی پیدائشی مسلمانی کچھ سخت جانی دکھا جائے؟

اگر خدانخواستہ آپ کا معاملہ یہی ہے تو غور کیجیے کہ یہ بھی وہی "سفاہت نفس" ہے یا نہیں جس کا ذکر قرآن کے حوالے اوپر آیا ہے؟ —— اس سے بڑھ کر سفاہت نفس اور خود فریبی دوسری کیا ہو سکتی ہے کہ ایک انسان اولاد کی دنیا کی خاطر خود اپنی اور اولاد کی آخرت کو خطرہ میں ڈالے! —— اگر ایمان ہے کہ ابراہیم کا طریقہ ہی عقل خداداد کا تقاضا ہے اور اس سے انحراف سراسر سفاہت و عقل فروشی، تو ابراہیم نے اولاد کے باب میں یہ طریق ہدایت بنا کیا ہے۔

رَبَّنَآ اِنِّيْٓ اَسْكَنْتُ مِنْ ذُرِّيَّتِيْ بِوَادٍ	پروردگارا! میں نے آباد کر دیا ہے اپنی اولاد کو
غَيْرِ ذِيْ زَرْعٍ عِنْدَ بَيْتِكَ الْمُحَرَّمِ	تیرے محترم گھر کے قریب بن کھیت وادی میں۔
رَبَّنَا لِيُقِيْمُوا الصَّلٰوةَ. (ابراہیم ع ۶)	پروردگارا! اس لیے کہ وہ نماز قائم کریں۔

آج سچ مچ کی بے آب و گیاہ وادی میں اپنی اولاد کو لے جا کر ڈال دینے کا کسی سے مطالبہ نہیں لیکن دینی تعلیم و تربیت کی وادی جو فی زمانہ مادی اعتبار سے غیر نفع بخش ہونے کی بنا پر بہت "وادی غیر ذی زرع" ہی نظر آتی ہے، اگر اولاد کو کماحقہٗ دین پر قائم رکھنے کی مخلصانہ خواہش ہو تو ایک حد تک اس وادی

میں دخل کیے بغیر چارہ نہیں اور ابراہیمؑ کے "اسوۂ" "وصیت" کی پیروی کا حق درحقیقت اس کے بغیر ادا نہیں ہوسکتا ۔

اور یہ وادی بے آب وگیاہ ہونے کے باوجود وہ وادی ہے کہ اس کے مخلص مکینوں کی طرف ساکنانِ عالم کے دل کھنچتے اور سرسبز وادیوں کے رُخ مڑتے ہیں، اولادِ ابراہیمؑ کے ساتھ یہی ہوا اور آج تک اس کا حیران کن اور ایمان آفریں منظر ہمارے سامنے ہے ۔ ابراہیمؑ کی راہ پر گامزن ہوکر کوئی ضائع نہیں ہوتا۔ "فَاجْعَلْ اَفْئِدَةً مِّنَ النَّاسِ تَهْوِيْٓ اِلَيْهِمْ وَارْزُقْهُمْ مِّنَ الثَّمَرٰتِ" کے وہ دعائیہ الفاظ جو اولاد کو وادیٔ غیر ذی زرع میں ڈالتے وقت ابراہیم (علیہ الصلوٰۃ والسلام) کی زبان سے نکلے تھے۔ ان کلماتِ دعا نے قیامت تک کے پیروانِ ابراہیمؑ کو اپنی حفاظت میں لے لیا ہے ـــ اور ـــ ایمان رکھیے کہ یہ راہِ ابراہیم پر چلنے والوں کے لیے خدا کی تقدیر بن گئے ہیں!!

اور صرف یہی نہیں کہ اس طریق ابراہیمی کی اقتداء میں ایک وادیٔ "غیر ذی زرع" میں بسائی جانے والی اولاد کو زندگی کی ضمانت حاصل ہے بلکہ اس وادی سے پوری دنیا کی روحانی زندگی کا چشمہ پھوٹتا ہے۔ ابراہیمؑ نے اپنی اولاد کو روحانی زندگی کے بقا کی خاطر ایک وادیٔ بے آب وگیاہ میں بسایا تو دنیا کی روحانی مُردنی کے وقت میں اسی بے آب وگیاہ وادی نے ایک مسیحا پیدا کیا آج دنیا پھر ایک بار روحانی موت کے دروازہ پر پہونچا چاہتی ہے اس کی حیاتِ تازہ کا سامان وہی لوگ کریں گے جو اس مسیحا کے دین کی بے آب وگیاہ وادی کو آباد کریں گے۔

پس کون ہے جو اس عزت سے سرفراز ہونا چاہے۔
اور کون ہے جو طریق ابراہیمی میں رغبت کا ثبوت دینا چاہے۔

وَاُولٰٓئِكَ هُمْ اُولُوا الْاَلْبَابِ اور وہی لوگ ہیں، درحقیقت جن کے پاس عقل ہے اور سرمایۂ دانش ہے ۔

(الفرقان بابت محرم ۱۳۷۰ھ)

عتیق الرحمٰن سنبھلی

سورۂ ابراہیم کا ایک تاثر

عالمِ انسانیت کی بہاریں، مادّی ہوں یا روحانی، نظر بظاہر، صدقہ ہوتی ہیں اولوالعزم افراد کی قربانیوں کا۔ یہ قربانیاں آرام و راحت کی بھی ہوتی ہیں، مال و دولت کی بھی، جسم اور جان کی بھی، اور جذبات و خواہشات کی بھی۔ انسانی نفوس گران قربانیوں کا حوصلہ نہ کریں تو انسانیت کا یہ چمن یکسر بہار نا آشنا ہو کر رہ جائے، نہ علم و فکر کو ترقی نصیب ہو۔ نہ تمدن کوئی نیا رنگ پائے۔ نہ تہذیب کے رخ پر نکھار آئے۔ نہ روحِ ارتقاء کا کوئی نیا میدان پائے اور نہ مادہ کی چھپی ہوئی صلاحیتوں کو ظہور کا موقع میسر آئے، یہ سب کچھ اگر ہوتا ہے اور عالمِ انسانیت کو نت نئی بہاروں سے ہم کنار ہونے کا موقع ملتا ہے تو ظاہراً صرف اس لیے کہ کچھ لوگ ہوتے ہیں، جو مال و دولت کی، جسم اور جان کی یا جذبات و خواہشات کی قربانی پیش کرتے ہیں اور یہ قربانیاں بہاروں کو کھینچ بلاتی ہیں۔

ایسی ہی ایک قربانی تھی جو سیکڑوں برس قبل مسیح مشرقِ وسطیٰ کے ایک سہ نفری خاندان نے دی تھی — یہ خاندان تھا، باپ بیٹا اور ماں — اس خاندان کی قربانی نے، انسانیت کو اس عالمگیر اور جاودانہ بہار کا تحفہ دیا۔ جو خزاں کے ہزار حملوں کے باوجود آج تک کسی نہ کسی شکل میں موجود ہے اور انسانیت کو طلب ہے، طلب نہیں تو احتیاج ہے، کہ ایک بار پھر اس کی تجدید ہو۔

اس قربانی کا ذکر قرآن مجید میں اس انداز سے آیا ہے:۔

رَبَّنَآ اِنِّیۤ اَسْکَنْتُ مِنْ ذُرِّیَّتِیْ — اے پروردگار! میں نے بسایا ہے اپنی اولاد

جوادٍ غیرِ ذِی زَرْعٍ عِنْدَ بَیْتِكَ
الْمُحَرَّمِ رَبَّنَا لِیُقِیْمُوْا الصَّلٰوۃَ۔
(سورۂ ابراہیم ع ۶)

کا کچھ حصہ ایک بے آب وگیاہ وادی میں
تیرے مقدس گھر کے پاس۔ پروردگار یہ اس
لیے کہ یہ قائم کریں نماز۔

یہ کہنے والے ابراہیمؑ تھے۔ یہ واقعہ کی تفصیل کسی حد تک لوگوں کو معلوم ہی ہے کہ حضرت ابراہیم (علیہ السلام) جب وطن اصلی عراق سے ہجرت فرماکر سرزمین شام میں سکونت پذیر ہوگئے، تو جناب باری سے حکم ہوا کہ اپنی ایک حرم حضرت ہاجرہ اور ان کے اکلوتے شیر خوار بچے کو سیکڑوں میل دور اس وادی غیر ذی زرع میں لے جاکر بسادیں، جہاں آج اللہ کا پاک "گھر" خانۂ کعبہ ہے۔ اس وقت نہ وہاں یہ "گھر" تھا نہ کوئی اور گھر۔ پہاڑوں سے گھرا ہوا ایک چٹیل میدان تھا۔ زیست کے ہر سامان سے محروم اور ہلاکت کے سامانوں سے بھرپور۔ حضرت ابراہیم نے تعمیل حکم کی۔ اللہ کی قدرت نے اس خشک اور بے آب وگیاہ وادی میں زیست کے سامان پیدا کیے۔ حتیٰ کہ وہ شیر خوار بچہ (اسمٰعیل علیہ السلام) کام کاج کی عمر کو پہنچ گیا ـــــ اب ابراہیم علیہ السلام کو ایک دوسرا حکم ملا۔ کہ جاکر اس وادی میں اللہ کا "گھر" بنائیں۔ اس کی طرف قرآن میں یوں اشارہ کیا گیا ہے:۔

وَاِذْ بَوَّاْنَا لِاِبْرَاھِیْمَ مَكَانَ
الْبَیْتِ اَنْ لَّا تُشْرِكْ بِیْ شَیْئًا
(الحج ع ۴)

اور جب ہم نے ٹھیک کردی ابراہیم کے لیے
"گھر" کی جگہ (اور حکم دیا کہ صرف میرے نام سے بناؤ)
نہ شریک کرو میرے ساتھ کسی اور کا نام۔

باپ بیٹوں نے مل کر یہ "گھر" بنایا، قرآن نے اس تعمیری کام کا بھی تذکرہ کیا ہے۔

وَاِذْ یَرْفَعُ اِبْرَاھِیْمُ الْقَوَاعِدَ
مِنَ الْبَیْتِ وَاِسْمٰعِیْلُ۔
(بقرہ ع ۱۵)

اور جب اٹھا رہے تھے ابراہیم اور
اسمٰعیل اس گھر کی بنیادیں۔

"گھر" بن گیا اور حضرت اسمٰعیل اس کے جوار میں رہنے لگے۔ اللہ نے ان کی نسل کے لیے بھی انتظام فرمادیا تھا۔ ہوسکتا ہے اُن سے نسل بھی شروع ہوچکی ہو جب ابراہیم علیہ السلام نے اپنے پروردگار کو خطاب کرکے یہ عرض کیا کہ "پروردگار میں نے اپنی یہ اولاد یہاں اس لیے بسائی ہے کہ ان کے دم سے نماز قائم ہو"

ظاہر ہے کہ ابراہیم علیہ السلام نے اپنی اولاد کو خود سے یہاں لاکر نہیں بسایا تھا۔ کہ اُن کے پیش نظر اپنا سوچا ہوا کوئی مقصد ہوتا۔ یقیناً یہ مقصد اللہ ہی کا متعین کردہ تھا۔ اور ابراہیم علیہ السلام کے قول کا مطلب یہ تھا کہ پروردگار تو نے جس مقصد (یعنی اقامت صلوٰۃ) کے لیے مجھے اس نو آبادکاری کا حکم دیا تھا میں نے اس کی تعمیل کر دی ہے۔

"لیقیموا الصلوٰۃ" کا کیا مطلب ہے؟ کیا صرف یہ کہ "یہ لوگ نماز پڑھیں" اور اللہ کی عبادت کریں؟ اس کے لیے اتنے پاپڑ بیلنے کی کیا ضرورت تھی۔ یہ کام کیا سرزمین شام میں نہیں ہو سکتا تھا؟ حضرت ابراہیم علیہ السلام اور اُن کے باقی متعلقین کیا یہ کام نہیں کر رہے تھے جو ان کی اسی شاخ کے لیے شام میں عبادت الٰہی کا میدان تنگ ہو گیا تھا؟ یقیناً "اقامت صلوٰۃ" کا صرف یہ مطلب نہیں تھا۔

پھر اس کا مطلب کیا تھا؟ اس عقدے کو بعد کے واقعات کھولتے ہیں اور بتاتے ہیں کہ یہ در اصل دنیا میں ایک انقلاب کی داغ بیل تھی۔ پوری انسانی آبادی میں شرک اور جاہلیت کے جراثیم پھیل چکے تھے اور بندگی کا نظام جس کی صحیح تعلیم انسان کو ابتدائے آفرینش سے ملتی رہی تھی ۔ ان جراثیم سے اس درجہ فاسد ہو گیا تھا کہ اس فساد کو دور کرنے کی کوئی کوشش کارگر نہیں ہو رہی تھی۔ انبیاء آتے اور کچھ محدود تعداد کی اصلاح کرتے کرتے ان کا وقت پورا ہو جاتا۔ ان جراثیم کا استیصال کرنے کے لیے ایک پوری نئی نسل کی ضرورت تھی۔ جس کی نیو اس فاسد ماحول سے باہر پڑے۔ اور جو تمام بُرے اثرات سے بچ کر بندگی کے صحیح نظام کے ماتحت پروان چڑھے۔ پھر اس کے مسکن کو اظہار عبدیت کا عالمی مرکز قرار دے کر گرد و پیش کی تمام انسانی آبادیوں کو اس مرکز سے وابستہ کیا جائے[1] اور مناسب وقت آنے پر اس نو آباد نسل کے ذریعہ اس مرکز سے

---

[1] چنانچہ ابراہیم علیہ السلام کو حکم ہوا تھا:۔

وَطَهِّرْ بَيْتِيَ لِلطَّائِفِينَ وَالْقَائِمِينَ وَالرُّكَّعِ السُّجُودِ وَأَذِّنْ فِي النَّاسِ بِالْحَجِّ۔ (الحج ع ۴)

اور پاک رکھ میرا گھر طواف کرنے والوں، قیام کرنے والوں اور رکوع و سجود کرنے والوں کے لیے۔ اور پکار دے لوگوں میں کہ وہ چلیں اس گھر کی طرف۔

(باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

عالمی ہدایت کا کام لیا جائے۔

چنانچہ مشیت الٰہی کے اس غیبی فیصلہ کی طرف حضرت ابراہیم علیہ السلام کی زبان سے دعا کے پیرایہ میں یوں ایک لطیف اشارہ بھی کرا دیا گیا تھا۔

رَبَّنَا وَابْعَثْ فِيهِمْ رَسُولًا مِّنْهُمْ	اے پروردگار ہمارے! اور اٹھا ان میں ایک
يَتْلُوا عَلَيْهِمْ آيَاتِكَ وَيُعَلِّمُهُمُ	رسول انھیں میں کا۔ جو تلاوت کرے ان پر
الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَيُزَكِّيهِمْ	تیری آیات۔ اور سکھائے ان کو کتاب اور
إِنَّكَ أَنْتَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ	کی باتیں، اور سنوارے ان کا ظاہر و باطن
(بقرہ ۔ ع ۱۵)	بے شک تو ہی ہے اصل زبردست اور حکمت والا۔

یہ "ایک رسول کی بعثت" ہی اس انقلاب کا نقطۂ آغاز تھی۔ جس کی داغ بیل ایک وادی بے سبزہ و آب میں اولاد ابراہیم کو بسا کر اور "بیت محرم" بنا کر ڈالی گئی تھی۔ جب وقت آ گیا اور دنیا ایک عالمی دعوت کے لیے تیار ہو گئی، تو مشیت کا یہ فیصلہ بھی جس کی طرف ابراہیم کی زبان اشارہ کر گئی تھی، وجود کے سانچے میں ڈھل گیا، اور ٹھیک اسی "گھر" کے جوار سے وہ رسول خاتم الرسل مبعوث ہو کر دنیا کے سامنے آ گیا جس کو اس انقلاب کا آغاز اور کار رسالت کا اتمام کرنا تھا۔

هُوَ الَّذِي بَعَثَ فِي الْأُمِّيِّينَ	وہی اللہ ہے جس نے اٹھایا امیوں میں سے
رَسُولًا مِّنْهُمْ يَتْلُو عَلَيْهِمْ آيَاتِهِ	ایک رسول کو تلاوت کرتا ہے ان پر اس کی آیات
وَيُزَكِّيهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ	اور سنوارتا ہے ان کو نیز تعلیم دیتا ہے ان کو کتاب
وَالْحِكْمَةَ وَإِن كَانُوا مِن قَبْلُ	اور حکمت کی۔ اگرچہ وہ اس سے پہلے ضلال مبین
لَفِي ضَلَالٍ مُّبِينٍ ۔ (جمعہ ع ۱)	میں گرفتار تھے۔

اس رسول نے مبعوث ہو کر یہی کام شروع کیے جن کا ذکر اس آیت میں کیا گیا ہے۔ اور جب

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) اور عملاً اس آواز ۂ حق کے اثر کی نوید بھی سنا دی گئی تھی۔

يَأْتُوكَ رِجَالًا وَعَلَىٰ كُلِّ ضَامِرٍ	چلے آئیں گے تیری طرف پیادہ پا، اور سواریوں
يَأْتِينَ مِن كُلِّ فَجٍّ عَمِيقٍ (ایضاً)	پر ہر دور دراز رستے سے۔

ان کے تزکیہ و تعلیم سے اس نسل کی ایک تعداد اس "ضلال" کے زنگ سے پاک صاف ہوگئی جو اسے ادیٔ زمانہ نے اس پر لگا دیا تھا، تو اس "رسولِ اُمّی" کے وجود میں آئی ہوئی بہار کا دروازہ ساری دنیا پر کھل گیا۔
ان فیض یافتگانِ رسول سے کہا گیا:-

وَجَاهِدُوا فِي اللّٰهِ حَقَّ جِهَادِهٖ	اور حق ادا کرو اللہ کی راہ میں سعی و مشقت
هُوَ اجْتَبَاكُمْ وَمَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ	کا، اس نے منتخب کیا ہے تم کو۔ اور دین میں تمہارے
فِي الدِّيْنِ مِنْ حَرَجٍ ۔ مِلَّةَ	لیے کوئی تنگی اور پریشانی کی بات بھی نہیں رکھی۔
اَبِيْكُمْ اِبْرَاهِيْمَ ۔ هُوَ سَمّٰىكُمُ	یہ تمہارے باپ ابراہیم ہی کا تو طریقہ ہے۔
الْمُسْلِمِيْنَ مِنْ قَبْلُ وَفِيْ هٰذَا	اُسی نے نام رکھا تمہارا "مسلمین" پہلے بھی اور
لِيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ شَهِيْدًا	اس کتاب میں بھی۔ (تم کو اللہ نے جس غرض
عَلَيْكُمْ وَتَكُوْنُوْا شُهَدَاءَ	سے منتخب کیا ہے وہ یہ ہے کہ) سکھائے تم کو رسول
عَلَى النَّاسِ ۔ (الحج ع ۱۰)	اور تم سکھاؤ باقی دنیا کو۔

اور انھوں نے اس فرمانِ عالی کی ایسی تعمیل اور منشائے الٰہی کی ایسی تکمیل کی کہ یا تو صرف اللہ کی بندگی کرنے والا اور بندگی کے ڈھنگ پر زندگی بسر کرنے والا مشکل سے کہیں چھپا چھپا ملتا تھا یا اب عالمِ انسانی کے ہر خطہ پر صدائے اشہد ان لا الٰہ الا اللہ گونج اٹھی۔ اور اس زور سے گونجی کہ وقت کی ساری صدائیں اس کے سامنے پست ہوگئیں۔ انھوں نے زندگی کو بندگی کے سانچہ میں ڈھالا، اور اس سانچہ کو عام کرنے کے لیے دنیا میں اس طرح پھیلے کہ

دشت تو دشت دریا بھی نہ چھوڑے ہم نے
بحرِ ظلمات میں دوڑا دیے گھوڑے ہم نے

انکی اس حد و جہد سے معمورۂ حیات شرک کی ظلمتوں سے نکلا۔ نظامِ بندگی کے ظاہری اور باطنی فساد سے جو زندگی کا پورا نظام بگڑا ہوا، اور اس درجہ بگڑا ہوا تھا کہ انسانیت کے لیے ننگ و عار ہو رہا تھا، ان کی کوششوں سے اُسے ایک نئے نظام سے بدلا جو انسان کے لیے قیامت تک باعثِ مجد و شرف ہے۔

دنیا کی یہ یادگار بہار، صدقہ تھی ایک خاندان کی قربانی کا! —— ابراہیمؑ۔ اسمٰعیلؑ

اور ہاجرہ کی قربانی کا! ـــــــ اس بہار کا شباب عرصہ ہوا ختم ہو چکا ہے، بلکہ اب تو اس کے آثار و نشان تک خزاں کی زد میں ہیں۔ خود وہ امت جسے اس قربانی نے پیدا کیا تھا، اقامت صلوٰۃ کی بلندی سے گر چکی ہے۔ اقامتِ صلوٰۃ کا وصف توحید اور عبدیت کی جس روح سے وابستہ تھا، سرد ہو چکی ہے۔ اور اس سردی کے جو نتائج بڑے پیمانہ پر بعثتِ خاتم الرسل سے پہلے، خود اولادِ ابراہیم میں ابھر آئے تھے، اچھے خاصے پیمانہ پر کچھ ویسے ہی نتائج اس امت میں رونما ہو چکے ہیں۔ باہر کی دنیا میں پرانے شرک کا بازار بھی گرم ہے۔ اور اس سے زیادہ باعث فساد وہ نیا شرک و کفر ہے جو نو تراشیدہ "بتوں" کے باعث وجود میں آیا ہے، اور پوری دنیا کو حتیٰ کہ کبھی کبھی "امت مسلمہ" کو بھی، اپنے حلقہ اثر میں لیتا جا رہا ہے، آخرت کا تو ذکر کیا، اس بے راہ روی کی وجہ سے دنیا ہی میں انسان کی بےچینی اور پریشانی کا جو حال ہے وہ سامنے ہے۔ نتائج کی اس خوفناکی نے اچھے اچھے خدا فراموشوں کو روحانی انقلاب کی باتیں کرنے پر مجبور کر دیا ہے ـــــــ مگر اس روحانی انقلاب کے لیے ویسی ہی قربانی درکار ہے جس کی طرح ابراہیم اور اُن کے خاندان نے ڈالی تھی۔ اور جس کی ذمہ داری اب ملت ابراہیمی کے نام لیواؤں پر عائد ہوتی ہے۔ اس قسم بانی کا راستہ یقیناً وادیٔ غیر ذی زرع، سے ہو کر گزرتا ہے اور اس ہری بھری، آرام و آسائش کے وسائل سے بٹی ہوئی دنیا میں رہتے ہوئے ان سب کو تج دینے کا قصد کر لینا ہوگا۔ مگر ابراہیمؑ کی وہ دعا بھی اس راہ کے ہر راہرو کے ساتھ موجود ہے، جو انھوں نے اپنی اولاد کو اس راہ میں ڈال کر کی تھی۔

فَاجْعَلْ اَفْئِدَةً مِّنَ النَّاسِ تَهْوِیْ اِلَیْهِمْ ـ وَارْزُقْهُمْ مِّنَ الثَّمَرٰتِ لَعَلَّهُمْ یَشْكُرُوْنَ ـ (ابراہیم)

پس کر دے تو کچھ لوگوں کے دلوں کو ان کی طرف مائل۔ اور مہیا فرما ان کے لیے زمین کی پیداوار شاید کہ یہ شکر کریں۔

اس دعا کے اثر سے مکہ کی وادیٔ غیر ذی زرع آج تک فیض پا رہی ہے۔ اور گواہی دے رہی ہے کہ اللہ اپنی راہ میں قربانی کا حوصلہ دکھانے والوں کو ضائع نہیں ہونے دیتا۔

(الفرقان جمادی الاول ۱۳۸۶ھ)

محمد منظور نعمانی

عبادتِ نبویؐ

[ذیل کا مقالہ ماہنامہ "فاران" کراچی کے سیرت نمبر کے لیے لکھا گیا تھا بعد میں اسے الفرقان میں بھی شائع کیا گیا۔ فاران کے نمبر کے لیے لکھتے وقت ناسازیٔ طبع کی بنا پر اس مقالہ کی تکمیل نہیں کی جاسکی تھی، خیال تھا کہ اگر بعد میں توفیق، فرصت میسر آئی تو الفرقان میں اس کی تکمیل کر دی جائے گی۔ مگر افسوس اس کی نوبت نہ آسکی۔]

اَللّٰهُمَّ اَلْهِمْنِيْ رُشْدِيْ وَقِنِيْ شَرَّ نَفْسِيْ

ناظرین کو جیسا کہ عنوان سے معلوم ہو چکا مجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی "عبادت" پر لکھنا ہے اس لیے سب سے پہلے عبادت کی حقیقت کے متعلق کچھ عرض کرنا ضروری ہے۔ "عبادت" کا اصل مادہ (ع ب د) ہے اور اصل عربی زبان میں اس کے معنی تذلل، انقیاد و اطاعت اور غلامی کے ہیں۔

لیکن جو عبادت دین کی ایک خاص اصطلاح ہے اور جس معنی میں عبادتِ نبویؐ اس مقالہ کا عنوان ہے۔ اس سے مراد وہ مخصوص تعظیمی اور تعبدی اعمال ہوتے ہیں جو کسی ہستی کو انتہائی مقدس اور بالاتر اور کن فیکونی اختیار و تصرف کا مالک سمجھ کر اس کی رضا اور عنایت حاصل کرنے کے لیے کئے جاتے ہیں۔ جن کا کرنے والا ان کے ذریعہ اپنے اس معبود کی انتہائی عظمت و قدوسیت اور اس کے حضور میں اپنے جذبۂ عبدیت اور اپنے عجز و تذلل کا مظاہرہ کرتا ہے۔

اہل علم اس حقیقت کو خوب جانتے ہیں کہ بہت سی اصطلاحات ایسی ہوتی ہیں کہ ان کا مفہوم عام طور سے صحیح کہا جاتا ہے لیکن ان کی منضبط اور جامع مانع تعریف مشکل ہوتی ہے۔ "عبادت" بھی ان ہی دینی اصطلاحات میں سے ہے۔ ہمارا خیال ہے کہ عام اہل علم بلکہ بہت سے عوام بھی عبادت کا مطلب صحیح سمجھتے ہیں۔ اور اپنی بول چال میں اس کو صحیح معنی ہی میں استعمال کرتے ہیں لیکن

اس کی منضبط اور جامع مانع تعریف تلاش کرنے والے کو کتابوں میں بھی مشکل سے ملتی ہے۔ بہت عرصہ ہوا حضرت مولانا شبیر احمد عثمانیؒ سے سنا تھا کہ عبادت کی جیسی منضبط اور منقح تعریف حضرت شاہ ولی اللہؒ نے حجۃ اللہ البالغہ میں کی ہے ایسی کسی اور مصنف کی کتاب میں نظر سے نہیں گزری۔ کچھ دن ہوئے اس عاجز کو اس کی ضرورت پیش آئی کہ عبادت کی منضبط اور جامع مانع تعریف معلوم کی جائے۔ اپنی دسترس کی حد تک بہت سی کتابوں کی ورق گردانی کی۔ لیکن واقعہ یہی ہے کہ حجۃ اللہ البالغہ کے باب "حقیقۃ الشرک" میں حضرت شاہ صاحبؒ نے جو کچھ اس سلسلہ میں حوالۂ قلم فرمایا ہے۔ اس عاجز نے بھی اسی کو سب سے زیادہ منقح اور منضبط پایا۔ اوپر کی سطروں میں عبادت کے اصطلاحی مفہوم کی وضاحت میں جو کچھ لکھا گیا ہے وہ گویا حضرت شاہ صاحبؒ ہی کے بیان کی ترجمانی بالخلیص ہے۔

الغرض عبادت سے مراد وہی خاص تعظیمی اور تعبدی اعمال ہیں جن کو ہمارے عرف عام میں عبادت کہا اور سمجھا جاتا ہے اور جن کے ذریعہ عابد اپنے معبود کے سامنے اپنی عبدیت اور بندگی کا مظاہرہ کرتا ہے، تاکہ اس کی رضا و عنایت اور اس کا قرب اس کو حاصل ہو۔

البتہ جیسا کہ اوپر عرض کیا گیا ہے، عبادت کے معنی مطلق انقیاد و اطاعت اور غلامی کے بھی ہیں۔ اور اس لحاظ سے جو کام بھی اللہ کے حکم کی تعمیل میں اور اس کی رضا جوئی اور اخروی ثواب کی خاطر کیا جائے۔ اس کو اللہ کی عبادت کہا جا سکتا ہے۔ اگرچہ مذکورۂ بالا اصطلاحی معنی کے لحاظ سے وہ عبادت نہ ہو۔ لیکن یہ لفظ عبادت کا دوسرا اطلاق اور دوسرا استعمال ہے اور دونوں کو ایک سمجھ لینا یا دونوں کے فرق کو نظر انداز کر دینا بھاری غلطی ہے۔ جس سے بہت سی غلطیاں بلکہ گمراہیاں بھی پیدا ہو سکتی ہیں!

ان دونوں میں ایک واضح اور عام فہم فرق یہ بھی ہے کہ فرمانبرداری اور اطاعت اللہ کے حکم کے تحت دوسروں کی بھی ہو سکتی ہے، بلکہ ہم کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اور اولوالامر کی اطاعت کا خود اللہ کی طرف سے حکم ہے۔ اسی طرح اولاد کو ماں باپ کی فرمانبرداری کا اور بیوی کو شوہر کی اطاعت و تابعداری کا حکم ہے لیکن عبادت کی جو اصطلاحی حقیقت اوپر بیان کی گئی ہے اور عرف میں جس کو عبادت کہا جاتا ہے۔ وہ کسی حال میں اور کسی نیت اور کسی تاویل سے بھی اللہ کے سوا کسی کے لیے نہیں کی جا سکتی۔ حتیٰ کہ اگر کوئی شخص اللہ کا حکم یا اُس کے قرب کا وسیلہ سمجھ کر بھی غیر اللہ کی عبادت

کے، (اگرچہ وہ غیر اللہ نبی و رسول ہی کیوں نہ ہوں) وہ بلا شبہ مشرک ہوگا!

اصطلاحی عبادت کی حقیقت اور عبادت و اطاعت کے فرق کو سمجھنے کے لیے اس پر بھی غور کیجیے کہ انسان کے تعلقات اور معاملات کی مختلف نوعیتیں ہیں۔ ایک تعلق وہ ہے جو اولاد کو مثلاً ماں باپ سے یا ماں باپ کو اولاد سے ہوتا ہے۔ ایک تعلق وہ ہے جو بھائی سے یا ایک عزیز سے دوسرے عزیز کو ہوتا ہے۔ ایک تعلق وہ ہے جو بیوی کو شوہر سے یا شوہر کو بیوی سے ہوتا ہے۔ ایک تعلق وہ ہے جو محکوم کو حاکم سے یا رعیت کو راعی سے ہوتا ہے۔ اسی طرح ایک تعلق وہ ہے جو کسی قوم کے عوام کو اپنے محبوب لیڈروں سے یا کسی مخلص مرید کو اپنے دینی محسن اور مربی یعنی اپنے شیخ سے ہوتا ہے۔ اسی طرح ایک تعلق وہ ہے جو ایک اُمتی کو اپنے نبی سے ہوتا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ سب تعلق بھی ایک درجہ کے نہیں ہیں بلکہ ان میں سے بعض بعض سے اہم اور اعلیٰ ہیں۔ لیکن ان سب سے اعلیٰ و بالا تعلق وہ ہے جو عبد یا عابد کو اپنے الٰہ اور معبود سے ہوتا ہے اور یہ وہ اصل خالص قلبی اور روحی تعلق ہوتا ہے۔ (اور عبدیت اسی تعلق کا عنوان ہے) پس عابد اپنے اس تعلق کو اپنے معبود کے حضور میں جن تعظیمی اور تعبدی اعمال سے ظاہر کرتا ہے۔ اس ہی کو "عبادت" کہا جاتا ہے۔ اور انسان کے تمام اعمال میں عبادت اسی لیے اعلیٰ اور اشرف ہے کہ اس کے ذریعہ دل اور روح کے مقدس ترین تعلق (عبدیت) کو ظاہر کیا جاتا ہے اور ظاہر ہے کہ یہ خصوصیت اطاعت و فرمانبرداری کو یا کسی دوسرے عمل کو حاصل نہیں ہے!

عبادت کا اسی طرح کا ایک دوسرا امتیاز یہ بھی ہے کہ اس کے علاوہ جو دوسرے اعمالِ بِر و نیکی اور ثواب کے کام ہیں، مثلاً اخلاقِ حسنہ اور معاشرتِ عادلہ یا مثلاً نبوت کی نیابت اور دین کی نصرت کے سلسلہ کے کام دعوت و تبلیغ، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر اور جہاد فی سبیل اللہ وغیرہ۔ اگرچہ یہ سب بھی اللہ تعالیٰ کے اوامر ہیں اور اپنے اپنے درجہ میں ان سب کی بڑی اہمیت ہے۔ لیکن ان سب میں یہ بات مشترک ہے کہ ان کے عمل کے وقت بندہ کا رخ غیر اللہ کی طرف ہوتا ہے اور اللہ تعالیٰ کے ساتھ بس اتنا ہی تعلق ہوتا ہے کہ باتوفیق بندہ ان کاموں کو بھی اللہ کے حکم سے اور اُس کی رضا جوئی میں کرتا ہے لیکن عبادت میں بندہ کے ظاہر و باطن کا رخ صرف اللہ تعالیٰ کی طرف ہی ہوتا ہے اور اس میں کسی دوسرے کا کوئی حصہ اور کسی حیثیت سے بھی کسی کی کوئی شرکت نہیں ہوتی!

عبادت کی حقیقت اور اس کے امتیاز کو سمجھنے کے لیے اس کے موضوع و مقصد پر بھی غور کر لینا چاہیے۔

عبادت کا موضوع و مقصد

انسان اس دنیا میں دو مختلف حیثیتوں کا حامل ہے ایک حیثیت اس کی یہ ہے کہ دوسرے حیوانوں کی طرح اس کے ساتھ بھی حیوانی تقاضے اور بہیمی خواہشات لگی ہوئی ہیں اور اس حیثیت سے وہ گویا ایک بڑھیا اور ترقی یافتہ حیوان ہے۔

اور دوسری حیثیت اس کی یہ ہے کہ اس میں ملکوتیت اور نورانیت کا بھی عنصر ہے۔ جو در اصل ملاء اعلیٰ کا لطیفہ ہے اور اس کی محبت اور چاہت کا مرکز اللہ تعالیٰ کی ذات مقدس ہے۔ اور اس حیثیت سے انسان اس زمین میں گویا عالم بالا کی ایک روحانی اور نورانی مخلوق ہے۔ اب انسان کی سعادت اور فلاح کا دارو مدار اس پر ہے کہ اس کی دوسری حیثیت پہلی حیثیت پر غالب اور حاکم رہے جس کے نتیجہ میں زمین پر رہنے، بسنے اور اپنے فطری بہیمی تقاضوں کو پورا کرتے رہنے کے باوجود اللہ تعالیٰ سے اس کا محبت و عبدیت کا تعلق اور ملاء اعلیٰ سے اس کی مناسبت پوری طرح قائم رہے۔ بلکہ اس جہت میں وہ برابر ترقی کرتا رہے اور اس کا خاص ذریعہ عبادات ہی ہیں۔ اور دین میں عبادات کے ایک خاص نصاب کی لازمی تشریع اور کثرتِ عبادت کی ترغیب کا یہ خاص راز ہے۔ اور بلا شبہ اگر عبادت صرف رسمی اور بے روح نہ ہو تو اس کی یہ تاثیر اور افادیت بالکل بدیہی ہے!

اس کے قریب اور اس سے ملتی جلتی ایک دوسری بات یہ بھی ہے کہ انسان کی فطرت میں جو روحانیت اور ملکوتیت کا حصہ اور خدا طلبی کا جذبہ و دیعت رکھا گیا ہے۔ اس کا قدرتی تقاضا یہ ہوتا ہے کہ اس کو ملاء اعلیٰ سے اور اپنے ربِّ قدوس سے وہ قرب میسر ہو جو اس عالم میں ممکن ہے۔ اور اس کا ذریعہ اس دنیا میں عبادات ہی ہیں۔ (اِذَا قَامَ احدکم یصلی فانہ یناجی[1]

---

[1] یہ ایک طویل حدیث کا ٹکڑا ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ تم میں کا کوئی شخص جب نماز میں کھڑا ہوتا ہے تو وہ اپنے پروردگار سے اپنے دل کی باتیں کرتا ہے۔

ربہ؛ اور "ابیت عند ربی"؛ جیسے ارشاداتِ نبویؐ اسی حقیقت کے اشارات ہیں۔

عبادات کے متعلق یہاں تک جو کچھ عرض کیا گیا۔ ناظرین نے اس سے یہ بات اچھی طرح سمجھ لی ہوگی کہ "عبادت" جو دین کی خاص اصطلاح ہے اور جس کا غیر اللہ کے لیے کسی نیت اور کسی تاویل سے کرنا بھی شرک ہے۔ اس سے وہی خاص تعظیمی اور تعبدی اعمال مراد ہیں جو عابد اپنے معبود کے حضور میں اپنی عبدیت کے اظہار کے لیے کرتا ہے اور جن کو عرفِ عام میں "عبادت" کہا جاتا ہے۔ نیز یہ بھی سمجھ لیا ہوگا کہ انسان کے تمام اعمال میں عبادت ہی سب سے زیادہ عظیم الشان عمل ہے۔ کیونکہ وہ عابد کے اس مقدس قلبی اور روحی جذبہ کی عملی شکل ہے جو سارے تعلقات اور جذبات سے بالاتر ہے۔ اسی لیے اس میں کسی غیر کی شرکت کی کسی تاویل اور کسی نیت سے بھی گنجائش نہیں اور ظاہر ہے کہ انسان کے دوسرے اعمال کی یہ نوعیت نہیں ہے!

اس مسئلہ کی وضاحت اور تفصیل میں اس عاجز نے یہ چند سطریں لکھنا اس لیے ضروری سمجھا کہ ہمارے اس دور میں "عبادت" کی حقیقت اور اس کے اصطلاحی مفہوم کے متعلق بعض حلقوں میں چند ایسی غلط فہمیاں پیدا ہو گئی ہیں جو بعض دوسرے بنیادی مسئلوں پر بھی اثر انداز ہوتی ہیں۔ بلکہ یہ ناچیز اس موقع پر یہ اعتراف اور اعلان کرنا بھی ضروری سمجھتا ہے کہ چند روز ہوئے "الفرقان" کے ایک بہت پرانے پرچے میں خود اپنی ایک تحریر ایسی نظر پڑی جس سے اس مسئلہ میں ناظرہ کو غلط فہمی ہو سکتی ہے۔ عبادت چونکہ دین کی ایک اہم اور بنیادی اصطلاح ہے۔ اس لیے ہماری کسی تعبیری غلطی سے اگر اس کے متعلق غلط تصور قائم ہو جائے تو توحید جیسے دین کے مرکزی مسئلہ کے متعلق تصور غلط ہو سکتا ہے اور اس سلسلہ کی غلطیوں کے بعض بڑے عبرتناک نمونے خود اس عاجز نے دیکھے ہیں اور اسی چیز نے یہاں ان سطروں کے لکھنے پر مجبور کیا۔ ویتوب اللہ علی من تاب۔

عبادت کی مذکورہ بالا تشریح و تنقیح سے ناظرین نے یہ بھی سمجھ لیا ہوگا کہ اس مقالہ کا موضوع رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ طیبہ کا کونسا گوشہ ہے۔ اور یہ بھی ظاہر ہے کہ اس موضوع پر

لہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنا حال بیان فرمایا ہے کہ رات میں میرا وقت اپنے پروردگار کے پاس گزرتا ہے۔

اگر تفصیل سے لکھا جائے تو خاصی ضخیم کتاب تیار ہو سکتی ہے لیکن اس وقت تو "الفرقان" کے سیرت نمبر کے لیے چند صفحہ کا ایک مضمون لکھنا ہی پیش نظر ہے۔ اور لکھنے والا اپنے لیے یہ آسان اور بہتر سمجھتا ہے کہ ایک مجلاتی مقالہ کی محدود گنجائش کو پیش نظر رکھتے ہوئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی عبادت سے متعلق کچھ متفرق مرویات اور معلومات کو بس یکجا کر کے ناظرین کی خدمت میں پیش کر دے۔ آئیے! اب اصل موضوع شروع کریں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا فطری ذوق عبادت

اوپر کی تمہیدی سطروں میں جیسا کہ ایک جگہ اشارہ کیا جا چکا ہے

عبادت ہر پاکیزہ روح کی غذا اور ہر قلب سلیم کے لیے آرام اور چین کا وسیلہ ہے۔ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اس باب میں جو حال تھا اس کا کچھ اندازہ اسی سے کیا جا سکتا ہے کہ قرآن مجید کا نزول جب شروع بھی نہیں ہوا تھا اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے عبادت کا بلکہ کسی حیثیت کا بھی کوئی حکم آپ کو نہیں ملا تھا تو آپ خود اپنے اندرونی جذبے اور تقاضے سے مجبور ہو کر سب سے الگ اور یکسو ہو کر مکہ کی آبادی سے کافی فاصلہ پر جبل نور کی بہت اونچی ایک چوٹی کے غار میں جا جا کر عبادت کیا کرتے تھے۔ صحیح بخاری اور صحیح مسلم وغیرہ میں آغاز نبوت کے بارے میں حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی جو مفصل روایت ہے۔ اس کے الفاظ ہیں" وکان یخلو بغار حراء فیتحنث فیہ وھو التعبد اللیالی ذوات العدد" جس کا مطلب یہی ہے کہ آپ سب سے یکسو ہو کر غار حراء میں کئی کئی دن معتکف رہتے تھے۔ اور اس تنہائی کے عالم میں صرف اللہ کی عبادت[1] میں مصروف رہتے تھے۔ یہاں تک کہ گھر بھی کئی کئی دن کے بعد تشریف لاتے تھے۔

میرے نزدیک آپ کے ذوق عبادت کا اندازہ کرنے کے لیے نبوت اور نزول قرآن سے پہلے کا آپ کا یہ معمول ہی کافی ہے۔

اس کے بعد نبوت کا دور شروع ہو گیا اور رسالت کی ذمہ داریاں آپ پر عائد ہو گئیں۔ جن کے

[1] کسی روایت سے یہ پتہ نہیں چلتا کہ اس عبادت کا طریقہ کیا تھا۔ شارحین حدیث نے مختلف اقوال ذکر کیے ہیں لیکن وہ سب قیاسات ہی ہیں۔ کوئی واضح اطلاع کسی کے پاس نہیں ہے!

لیے آپ کو وقت کا بڑا حصہ درکار تھا۔ نیز آپ کی زندگی کو اب اُمت کے لیے یعنی مستقبل کی پوری انسانی نسل کے لیے اسوہ اور نمونہ بھی بننا تھا۔ اس لیے اب اس کی گنجائش نہیں رہی کہ سب سے الگ تھلگ رہ کر حرا جیسے کسی غار میں ہر وقت اپنے پروردگار کی یاد اور عبادت میں آپ معروف رہیں۔ چنانچہ اس کے بعد وحی الٰہی کی رہنمائی میں آپ کی عبادت کا ایک ایسا معتدل اور متوازن نظام قائم ہو گیا جس کے ساتھ سارے پیغمبرانہ کام بھی انجام پاتے رہیں اور امت کے لیے اس کی تقلید اور پیروی میں زیادہ زحمت اور مشقت بھی نہ ہو۔ دیکھنے والا اگر صحیح نظر رکھتا ہو تو آپ کی حیات طیبہ اس کو ایک نہایت جامع اور حسین و متوازن پیغمبرانہ زندگی نظر آئے گی جس میں نماز، روزہ، اعتکاف، صدقات و قربانی عمرہ، حج اور اذکار و دعوات جیسی تمام عبادات اپنی اپنی جگہ مختلف رنگ و بو رکھنے والے نہایت حسین و جمیل پھولوں کی طرح درخشاں ہیں۔ پھر ان سب میں چونکہ نماز سب سے اہم اور اکمل ہے۔ اس لیے آئیے پہلے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نماز ہی کی کچھ باتیں کریں

نماز آپ کی روح پاک کی غذا دل کا چین اور آنکھوں کی ٹھنڈک

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قلب مبارک کو نماز میں جو کیفیت اور لذت حاصل ہوتی تھی اور روح پاک کو جو لطیف ولذیذ غذا ملتی تھی، بلاشبہ اس کا ادراک و احساس تو ان ہی بندگان خدا کا حصہ ہے جنھوں نے اس دولت سے کوئی حصہ پایا ہو اور اس کا کچھ ذائقہ کبھی چکھا ہو۔ ذوق ایں مے نشناسی بخدا تانہ چشی۔ لیکن ہم جیسے عوام بھی "قرۃ عینی فی الصلوٰۃ" اور "قم یابلال ارحنی بالصلوٰۃ" جیسے آپ کے ارشادات سے اس کا کچھ نہ کچھ اندازہ کر ہی سکتے ہیں۔ جو خوش نصیب بندے اس دولت سے کچھ بہرہ ور ہوئے ہیں انھوں نے اپنی یافت اور اپنے تجربے کے مطابق اس اجمال کی تفصیل بھی اپنے کلمات میں کی ہے۔ مثلاً امام ربّانی مجدد الف ثانیؒ ایک مکتوب میں فرماتے ہیں:۔

"نماز است کہ راحت دہ بیماران ہمت "ارحنی یابلال" رمز یست از یں ماجرا و

لے نماز میں میری آنکھوں کی ٹھنڈک ہے۔ یہ ایک حدیث کا ٹکڑا ہے۔ سے کبھی کبھی نماز کا وقت آجانے پر آپ حضرت بلالؓ سے یہ فرمایا کرتے تھے جس کا مطلب یہ ہوتا تھا کہ بلالؓ اٹھو نماز شروع کر کے میرے دل کو چین و راحت پہنچاؤ۔

"قرۃ عینی فی الصلوٰۃ" اشارہ بایں معنی است ...... یعنی کار حقیقت نماز آگاہ است در وقت اداء صلوٰۃ گویا از نشاء دنیوی برآید و در نشاء اخروی درآید لاجرم درین وقت دولتے کہ مخصوص بآخرت است نصیبے ازاں فراگیرد و حظے از اصل بے شائبہ ظلیت بدست آرد۔ (مکتوب ۲۶۱ جلد اوّل)

(نماز ہی بیماران عشق و محبت کا چین و آرام ہے۔ حضورؐ کے ارشاد "ارحنی یا بلال" میں اسی طرف اشارہ ہے۔ اور "قرۃ عینی فی الصلوٰۃ" میں بھی اسی مدعا کا اظہار ہے ...... جو نماز پڑھنے والا نماز کی حقیقت سے آشنا ہے وہ نماز ادا کرتے وقت گویا اس دنیا کے دائرہ سے نکل کر ایک دوسرے عالم میں پہنچ جاتا ہے۔ پھر اس کو اس دولت عظمیٰ میں سے کچھ حصہ مل جاتا ہے جو آخرت کے ساتھ مخصوص ہے۔ یعنی "اصل بے شائبہ ظلیت" کا ایک گونہ وصال ولقا میسر ہو جاتا ہے۔

نیز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے :-

ان احدکم اذا قام فی الصلوٰۃ	تم میں سے کوئی جب نماز میں کھڑا ہوتا ہے تو
فانما یناجی ربہ ۔ الحدیث	اس وقت وہ اللہ تعالیٰ سے دل کی باتیں
(جمع الفوائد بحوالہ صحیحین ونسائی عن انس)	کرتا ہے۔

اس حدیث میں جس کیفیت کو "یناجی ربہ" کے الفاظ سے تعبیر کیا گیا ہے۔ یقیناً اس کا اعلیٰ ترین درجہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو نماز کی حالت میں حاصل ہوتا تھا۔ اور غور کرکے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ ہر چیز سے زیادہ پیارے اپنے رب سے اس بلاواسطہ مخاطبہ اور مکالمہ میں آپؐ کو کیسی لذت اور حلاوت ملتی ہوگی۔ اس کیفیت کے سمجھنے میں بھی امام ربانی ہی کا ایک اشارہ ہماری کچھ رہنمائی اور مدد کرسکتا ہے۔ ایک مکتوب میں فرماتے ہیں :-

"بدانند کہ رتبۂ نماز در رنگ رتبۂ رویت است در آخرت، نہایت قرب در دنیا در نماز است ونہایت قرب در آخرت در حین رویت" (مکتوب ۱۳۶ ج ۱)

(معلوم ہونا چاہیے کہ دنیا میں نماز کا درجہ ومقام وہی ہے جو آخرت میں دیدار الٰہی کا ہے۔ اس دنیا میں بندہ کو مولا کا انتہائی قرب نماز ہی میں حاصل ہوتا ہے، اور آخرت میں انتہائی قرب دیدار کے وقت نصیب ہوگا۔)

نماز کے ساتھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قلبی تعلق کا اندازہ اس سے بھی کیا جاسکتا ہے کہ

ہجرت سے پہلے طائف میں اور بعد کو احد کے معرکہ میں دشمنوں کے ہاتھ سے سخت سے سخت تکلیفیں پہنچنے پر بھی آپ نے اُن موذیوں کے حق میں بدُعا نہیں فرمائی بلکہ ان کی ہدایت اور انجام بخیر ہی کی دعا کی۔ لیکن غزوۂ احزاب میں جب دشمنوں نے ایک دن آپ کو نماز عصر پڑھنے کی مہلت نہ دی اور آپ کی وہ نماز اس دن قضا ہو گئی۔ تو اتنی سخت بد دعا زبانِ مبارک سے نکلی کہ اس سے سخت بد دعا کسی کے لیے شاید سوچی بھی نہیں جا سکتی۔ حدیث کی کتابوں میں آپ کی اس بدُعا کے الفاظ یہ نقل کیے گئے ہیں۔

حبسونا عن صلوٰة الوسطی صلوٰة العصر ملأ اللہ بیوتھم و قبورھم نارًا۔ (بخاری و مسلم)

ان لوگوں نے ہمیں آج عصر کی نماز نہیں پڑھنے دی۔ اللہ ان کے گھروں اور ان کی قبروں کو آگ سے بھر دے۔

نماز میں روحِ پاک کو جو لذت و حلاوت ملتی تھی۔ اس کا اندازہ کرنے کی ایک راہ یہ بھی ہے کہ آپ کے فیض یافتہ بعض صحابہ کرام کی اس حالت سے اس کو سمجھنے کی کوشش کی جائے۔ اس سلسلہ کے بہت سے قابلِ ذکر واقعات میں سے صرف ایک واقعہ یہاں یاد کر لیجیے۔ جو سنن ابی داؤد اور مسند احمد میں اس طرح ذکر کیا گیا ہے۔

"رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک غزوہ میں خطرہ کے ایک موقع پر رات کو پہرہ دینے کے واسطے دو صحابیوں کو متعین فرمایا۔ ان میں سے ایک مہاجر تھے دوسرے انصاری۔ ان صاحبوں نے ڈیوٹی کو نصفا نصف تقسیم کر لیا۔ یعنی طے کیا کہ ہر ایک آدھی آدھی رات پہرہ دے اور دوسرا اس وقت سوئے۔ انصاری صحابی نے رات کے پہلے حصہ میں پہرہ دینا شروع کیا اور مہاجر ساتھی قرارداد کے مطابق سو گئے۔ پھر ان انصاری بزرگ نے خالی جاگنے کے بجائے یہ بہتر سمجھا کہ نماز میں مشغول رہ کر یہ وقت گزارا جائے۔ چنانچہ انھوں نے نماز شروع کر دی۔ دشمن کی جانب سے کوئی شخص آیا اور اس نے آدمی کھڑا دیکھ کر تیر مارا اور جب یہاں کوئی حرکت نہ ہوئی اور نہ کوئی آواز نکلی تو شاید یہ سمجھ کر کہ نشانہ خطا ہو گیا دوسرا اور پھر اسی طرح تیسرا تیر مارا۔ اور یہاں ہر تیر ان کے جسم میں پیوست ہوتا رہا اور یہ اس کو جسم

یہ سے نکال نکال کر پھینکتے رہے اور نماز میں مشغول رہے۔ پھر اطمینان سے رکوع کیا، پھر سجدہ کیا اور نماز پوری کر کے صاحب ساتھی کو جگا یا۔ انھوں نے اٹھ کر دیکھا کہ ایک نہیں تین تین جگہ سے خون جاری ہے۔ انھوں نے ماجرا پوچھا اور کہا کہ تم نے مجھے شروع ہی میں کیوں نہیں اٹھا دیا۔ ان انصاری بزرگ نے جواب دیا کہ میں نے ایک سورۃ (سورۂ کہف) شروع کر رکھی تھی۔ میرا دل نہ چاہا کہ اس کو ختم کرنے سے پہلے رکوع کروں۔ لیکن پھر مجھے یہ خطرہ ہوا کہ اگر اسی طرح پے در پے تیر لگتے رہے اور میں یونہی مر گیا تو حضورؐ نے پہرہ داری کی جو خدمت ہمارے سپرد کی تھی وہ فوت ہو جائے گی۔ اس خیال سے میں نے رکوع کر دیا۔ اگر یہ اندیشہ نہ ہوتا تو سورۃ ختم کرنے سے پہلے رکوع نہ کرتا اگرچہ مر ہی کیوں نہ جاتا۔

تیر پر تیر کھانے اور تین جگہ سے خون کا فوارہ جاری ہو جانے کے باوجود ان انصاری بزرگ کا نماز میں مشغول رہنا اور نماز کو مختصر کرنے کا بھی ارادہ نہ کرنا، نماز کے اندر کی جس لذت وحلاوت کا پتہ دیتا ہے یقیناً رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا حصہ اس میں اپنے ان انصاری خادم سے بدرجہا زیادہ تھا۔ بلکہ جو کچھ ان کو ملا تھا یا اُمت میں کسی کو بھی ملا ہو وہ آپ ہی کے فیض اور نسبت کا ایک ذرہ تھا۔

دن رات میں آپ کتنی نمازیں پڑھتے تھے

اوپر جو کچھ لکھا گیا اس کے سامنے آجانے کے بعد اس میں تو کسی کو شبہ نہیں رہ سکتا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اوقات میں آپ کی روح پاک کے لیے سب سے زیادہ لذت وسرور کا اور قلب مبارک کے لیے انتہائی راحت وفرحت کا وقت وہی ہوتا تھا جب آپ نماز میں مشغول ہوتے تھے۔ اس لیے قدرتی طور پر آپ کے قلب وروح کی خواہش یہی ہوگی کہ ہر وقت یا زیادہ سے زیادہ اوقات آپ نماز ہی میں مصروف رہیں۔ لیکن جیسا کہ اوپر بھی عرض کیا جا چکا ہے چونکہ منصب رسالت کے فرائض ووظائف، دعوت وتبلیغ، تعلیم وتربیت اور ارشاد وہدایت وغیرہ کی انجام دہی کے لیے آپ کے اوقات کا خاصکر دن کے وقت کا بڑا حصہ درکار تھا۔ نیز

آپ کی زندگی کو اُمت کے لیے نمونہ بھی بننا تھا۔ اس لیے آپ کے لیے ضروری ہو گیا کہ نماز میں صرف اتنے وقت مشغول رہیں کہ فرائض رسالت بھی پوری طرح ادا ہوتے رہیں اور اُمت کے لیے آپ کی تقلید و پیروی بھی بہت مشکل نہ ہو۔

نیز اس سے ملتا جلتا ایک اور سبب نماز جیسی عبادات میں آپ کے زیادہ مشغول نہ رہ سکنے کا یہ بھی تھا کہ اگر آپ ایسا کرتے یعنی اپنے اوقات کے بڑے حصہ میں نماز میں مشغول رہتے تو آپ کی محبت اور تقلید میں یقیناً صحابہ کرام بھی ایسا ہی کرتے اور حکمت تشریع کا یہ اصول ہے کہ اگر پیغمبر اور اس کے متبعین کوئی عبادت، اہتمام اور پابندی سے کرنے لگیں تو وہ اس اُمت پر فرض کر دی جاتی ہے۔ پس اُمت پر فرض ہو جانے کے اندیشہ کی وجہ سے بھی آپ نے نفل نمازوں کی کثرت اور پابندی میں احتیاط فرمائی۔

بہر حال ان وجوہ سے دل کی چاہت کے باوجود آپ نفل نمازیں خاصکر دن کے اوقات میں بہت زیادہ نہیں پڑھتے تھے۔ گویا یہ آپ کا زائد مجاہدہ تھا کہ دل کی طلب اور خواہش تو زیادہ سے زیادہ وقت نماز جیسی عبادات میں مشغول رہنے کی تھی لیکن مذکورۂ بالا اسباب و مصالح کی وجہ سے اپنے اس شوق کو آپ پورا نہیں کر سکتے تھے اور اس طرح آپ نے اپنے دل کی چاہت کو اللہ تعالیٰ کی رضا اور اُمت کی عام مصلحت پر قربان کر دیا تھا۔

میل من سوئے وصال و میل او سوئے فراق ترک کام خود گرفتم تا بر آید کام او

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز چاشت کی مختلف موقعوں پر بڑی بڑی فضیلتیں بیان فرمائیں۔ لیکن خود پابندی سے آپ نے یہ نماز نہیں پڑھی۔ اس کا سبب بیان کرتے ہوئے حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے ایک اصولی بات فرمائی ہے۔ صحیح بخاری میں ان کے الفاظ یہ ہیں:۔

ان كان رسول الله صلى الله عليه وسلم ليدع العمل وهو يحب ان يعمل به خشية ان يعمل به الناس فيفرض عليهم۔

(باب تحريض النبيؐ على قيام الليل والنوافل)

اسی کو حافظ ابن القیمؒ زاد المعاد میں لکھتے ہیں:۔

وقد كان يترك كثيراً من العمل وهو يحب ان يعمل به خشية المشقة عليهم[1]

---

[1] زاد المعاد ص۱۳۱ بر حاشیہ زرقانی جلد دوم

اور آپؐ ترک فرما دیا کرتے تھے، بہت سے اعمال حالاں کہ وہ اعمال آپؐ کو بہت محبوب ہوتے تھے صرف اُمّت کی دقت کے خیال سے۔

بہرحال یہ اسباب تھے جن کی وجہ سے آپؐ دل کی چاہت کے باوجود نفل نمازیں بہت زیادہ نہیں پڑھ سکتے تھے محققین نے تمام روایات کی چھان بین کے بعد لکھا ہے کہ اہتمام اور پابندی سے آپؐ شب و روز میں صرف چالیس۴۰ رکعت نماز پڑھتے تھے۔ سترہ۱۷ رکعت فرائض پنجگانہ، اور دس۱۰ یا بارہ۱۲ رکعت رواتب (یعنی موکدہ سنتیں) جن کی تفصیل یہ ہے کہ فجر سے پہلے دو۲ رکعت، ظہر سے پہلے دو۲ رکعت یا چار۴ رکعت (دونوں ثابت ہیں) ظہر کے بعد دو۲ رکعت، مغرب کے بعد دو۲ رکعت، عشاء کے بعد دو۲ رکعت۔ یہ کل دس۱۰ یا بارہ۱۲ ہوئیں۔ اور تہجد مع تین رکعت وتر کے گیارہ۱۱ رکعت یا تیرہ۱۳ رکعت (دونوں ثابت ہیں) ان کی میزان چالیس۴۰ ہوئی۔ الغرض دن رات میں یہ چالیس۴۰ رکعتیں تو آپؐ عموماً اہتمام اور پابندی سے ادا فرماتے تھے[1] ان کے سوا نوافل میں نماز چاشت اور زوال آفتاب کے وقت کی چار۴ رکعتیں پڑھنا بھی متعدد صحابہ نے روایت کیا ہے۔

— ان کے علاوہ خاص کر دن میں زیادہ نوافل جیسا کہ عرض کیا گیا۔ آپؐ اسی لیے نہیں پڑھتے تھے کہ اُمّت پر زیادہ بوجھ نہ پڑ جائے۔ نیز ذاتی اور خانگی ضروریات اور منصب رسالت کے دوسرے کاموں سے دن میں آپؐ کو زیادہ مہلت بھی نہیں ملتی تھی۔ اسی کو قرآن مجید میں فرمایا گیا ہے:-

إِنَّ لَكَ فِي النَّهَارِ سَبْحًا طَوِيلًا ۝

آپؐ کی رات کی نماز

رات چونکہ عام طور سے خلوت میں یعنی گھر کے اندر گزرتی تھی اور دوسرے کاموں سے رات میں فراغت و فرصت بھی ہوتی تھی۔ اس لیے رات کی نماز یعنی تہجد آپؐ اکثر بہت طویل پڑھتے تھے۔ یہاں تک کہ آپؐ کے پاؤں پر ورم آجاتا تھا۔ صحیحین میں حضرت مغیرہؓ بن شعبہ سے مروی ہے:-

قام النبي صلى الله عليه وسلم حتى تورمت قدماه فقيل له لم تصنع هذا وقد غفر لك ما تقدم من ذنبك وما تأخر قال أفلا أكون عبداً شكوراً۔ (جمع الفوائد و مشکوٰۃ)

[1] زاد المعاد ص۳۱۲-۳۱۵ برحاشیہ زرقانی جلد اوّل

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قیام فرمایا۔ یہاں تک کہ آپ کے دونوں پاؤں ورم کر آئے آپ سے عرض کیا گیا کہ آپ اتنا قیام کیوں فرماتے ہیں درآنحالیکہ آپ کی تو اگلی پچھلی سب چیزوں کی معافی دے دی گئی ہے۔ آپ نے فرمایا کیا میں عبد شکور نہ بنوں۔

حضرت حذیفہؓ کا بیان ہے کہ ایک دفعہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو رات کی نماز پڑھتے ہوئے دیکھا۔ تو آپ نے چار رکعتوں میں سورۂ بقرہ۔ سورۂ آل عمران۔ سورۃ النساء۔ اور سورۂ مائدہ (یا بجائے مائدہ کے سورۂ انعام) پڑھیں۔ گویا قریباً سوا چھ سپارے پڑھے۔ (ابوداؤد)

اور حضرت حذیفہؓ ہی کی ایک روایت میں جو صحیح مسلم میں بھی ہے یہ بھی بیان کیا گیا ہے کہ رات کی نماز میں آپ نے یہ لمبی لمبی سورتیں اس طرح پڑھیں کہ جہاں کوئی ایسی آیت آتی جس میں اللہ کی تسبیح کا ذکر ہوتا تو وہاں آپ اللہ کی تسبیح کرتے اور جہاں سوال اور دعا کا ذکر آتا تو وہاں آپ دعا کرتے اور جہاں دنیا یا آخرت کی کسی بلا سے پناہ مانگنے کا ذکر آتا تو وہاں آپ اللہ سے پناہ مانگتے۔ نیز اس روایت میں یہ بھی ہے کہ اس نماز میں جس قدر طویل آپ نے قیام کیا اسی کے قریب قریب آپ نے رکوع و سجود بھی کئے۔ اب غور کر کے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ یہ نماز کتنی طویل ہوئی ہوگی۔

اور صحیح بخاری و صحیح مسلم میں حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے مروی ہے کہ "ایک رات کو میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ نماز پڑھنے لگا۔ آپ نے اتنی طویل نماز پڑھی کہ میرے لیے آپ کے ساتھ کھڑا رہنا سخت مشکل ہو گیا اور میرے دل میں ایک برا خیال آنے لگا۔ کسی نے پوچھا کیا برا خیال آنے لگا تھا؟ آپ نے فرمایا ...... یہ کہ میں بیٹھ جاؤں اور آپ کو کھڑا چھوڑ دوں[2]"

صحابہ کی ان روایات سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ آپ کی رات کی نماز کس قدر طویل ہوتی تھی۔ لیکن یہ آپ کا ایسا دائمی معمول نہ تھا جس کے خلاف کبھی نہ ہوتا ہو۔ اگر ایسا ہوتا تو امت کے لیے آپ کی تقلید و پیروی سخت مشکل ہو جاتی۔ اس لیے کبھی کبھی آپ ایسا بھی کرتے تھے کہ رات کو کافی آرام بھی فرماتے اور باقی وقت میں تہجد پڑھتے۔ کبھی صرف آخری تہائی رات ہی میں تہجد پڑھتے۔ کبھی پہلے سوتے اور آخر میں اٹھ کر تہجد پڑھتے اور کبھی اس کے برعکس بھی کر لیتے۔ کبھی کبھی ایسا بھی

[1] سورۂ مائدہ اور سورۂ انعام کے بارے میں یہ شک حدیث کے ایک راوی شعبہ کو ہو گیا ہے

[2] جمع الفوائد باب صلوٰۃ اللیل [3] جمع الفوائد

کر لیتے کہ اُٹھے دو رکعتیں پڑھیں پھر کچھ دیر کے لیے سو گئے پھر اٹھ کر دو رکعتیں پڑھیں۔ اسی طرح بار بار سوئے اور بار بار اٹھ کر نماز پڑھی۔ ایسا آپ نے اسی لیے کیا کہ اُمت کے ضعفاء بھی آپ کی پیروی کر سکیں۔ ورنہ جیسا کہ عرض کیا گیا آپ کا اصل ذوق اور آپ کے دل کی چاہت یقیناً یہی ہوگی کہ ساری رات نماز ہی میں کھڑے رہیں۔ اسی میں آپ کے دل کا چین تھا۔ اور اسی میں روح کی راحت اور آنکھوں کی ٹھنڈک تھی ؎

ہمارا شغل ہے راتوں کو رونا یادِ دلبر میں ہماری نیند ہے محوِ خیالِ یار ہو جانا!

کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا۔ کہ رات کی نماز میں کسی آیت پر پہونچ کر آپ پر کوئی خاص کیفیت طاری ہوگئی اور پھر ساری رات اللہ کے حضور میں کھڑے آپ وہی ایک آیت پڑھتے رہے۔ چنانچہ مسند احمد اور مسند بزار میں حضرت ابوذر غفاریؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک رات کی نماز میں برابر سورۂ مائدہ کے آخری رکوع کی یہی ایک آیت پڑھتے رہے ؎[1]

إِن تُعَذِّبْهُمْ فَإِنَّهُمْ عِبَادُكَ وَإِن تَغْفِرْ لَهُمْ فَإِنَّكَ أَنتَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ ۔ (جمع الفوائد)

بعض صحابۂ کرام کا بیان ہے کہ ہم نے دیکھا کہ نماز کی حالت میں گریہ وبکا کے غلبہ سے آپ کے سینہ مبارک سے چکی چلنے کی سی ایک آواز نکلتی تھی۔ سنن ابی داؤد میں عبداللہ بن الشخیرؓ کی روایت کے الفاظ ہیں:۔

رأیت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یصلی وفی صدرہ أزیز کأزیز الرحی من البکاء۔

میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو نماز پڑھتے دیکھا اور اس وقت آپ کے سینۂ مبارک سے گریہ کے اثر سے چکی کی سی آواز نکلتی تھی۔ (ابوداؤد، باب البکاء فی الصلوٰۃ)

(الفرقان جمادی الثانی ۱۳۸۵ھ)

[1] جمع الفوائد ؎ قرآن مجید میں یہ آیت حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ایک عرض داشت کے ضمن میں آئی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اے اللہ اگر آپ میری امت کو عذاب میں ڈالنے کا فیصلہ کریں تو آپ کو اس کا پورا حق ہے۔ آپ مالک ہیں، وہ آپ کے بندے ہیں اور اگر آپ ان کو اپنے کرم سے بخش دیں تو آپ ایسا بھی کر سکتے ہیں کہ آپ زبردست اور حکیم ودانا ہیں۔

افادات مولانا سید مناظر احسن گیلانیؒ
تلخیص و ترتیب: عتیق الرحمٰن سنبھلی

جہانے را دگرگوں کرد، یک مردِ خود آگاہے

ذیل کا مضمون مولانا مرحوم کی کتاب "مقالاتِ احسانی" کے ایک
باب سے مرتب کیا گیا تھا۔ ع

حجۃ الاسلام امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ نے احیاء العلوم وغیرہ کی تصنیف سے آخرت طلبی کا جو صور پھونکا تھا، اور جس بری طرح عالم اسلامی کو اس کے اندرونی اضمحلال کے خلاف جھنجھوڑا تھا، اس کے کیا اثرات ہوئے؟ مولانا گیلانیؒ نے تاریخ کی روشنی میں ان اثرات کی جستجو کی ہے۔ اور سب سے پہلے ایوان خلافت، وزارت پر نگاہ ڈالی ہے کہ یہاں کے نقشے میں بھی امام کی اس چیخ و پکار کے بعد کوئی تغیر نظر آتا ہے یا نہیں؟

مولانا فرماتے ہیں کہ دیکھو ۴۵۰ھ جو امام کا سنہ ولادت اور خلیفہ مقتدر باللہ العباسی کا دورِ خلافت ہے اس میں شاہانہ کر و فر اور اظہارِ شان و ثروت کا یہ عالم تھا کہ قسطنطنیہ سے رومیوں کی جو سفارت قیدیوں کے تبادلے اور صلح کی گفتگو کے لیے بغداد آئی تھی، مقتدر باللہ سے ملنے کے لیے جب اس کے ارکان دار الخلافہ کی طرف روانہ ہوئے تو

.... پہلے اس حاجب (عرض بیگی) کے محل کے سامنے پہنچے جس کا نام قصر الفشوری تھا، حاجب کے محل کی شان و شوکت دیکھ کر سفراء کچھ اس درجہ مبہوت ہوئے کہ اسی محل کو انھوں نے سمجھا کہ خلیفہ کا محل ہے، ان کی غلط فہمی کا ازالہ کیا گیا، وہ آگے بڑھے سامنے وزیر کا قصر نظر آیا۔ اُن کو پھر یہی خیال

ہوا کہ وہ نہیں تو ضرور یہی خلیفہ کا مستقر ہے، مگر کہا گیا کہ یہ وزیر کا گھر ہے، وہ آگے روانہ ہوئے ان لوگوں کو اس طریقے سے دار الخلافہ میں داخل کیا گیا کہ چاروں طرف پہلے وہ گھوم لیں، حالت یہ تھی کہ دار الخلافہ کے اطراف و جوانب اس کے مختلف ابواب اور مقامات پر ۳۸ ہزار پردے پڑے ہوئے تھے، جن میں بارہ ہزار پانچ سو پردے تو خالص مزرکش دیبا اور حریر کے تھے۔ درمیان میں جو فرش فروش بچھائے گئے تھے ان کی تعداد بائیس ہزار تھی۔ دار الخلافہ کے احاطہ میں جو خود ایک مستقل دنیا کی حیثیت رکھتا تھا، مختلف مقامات میں جنگلی جانوروں کی قطاریں بکھری ہوئی تھیں۔ جو لوگوں سے مانوس تھے ..... مختلف قسم کے درندے، (شیر بھیڑیا وغیرہ) بھی زنجیروں میں بندھے ہوئے اپنے اپنے نگہبانوں کے ساتھ کھڑے تھے۔

سفارت والوں کو پھر اس کوٹھی میں لے جایا گیا جس کا نام "دار الشجرہ" (درخت والا محل) تھا، اس کے احاطہ میں ایک طویل و عریض تالاب تھا جس میں صاف و شفاف پانی ہر وقت چھلکتا رہتا تھا، تالاب کے وسط میں ایک عجیب و غریب درخت تھا۔ یہ مصنوعی درخت تھا جس میں بڑی بڑی بارہ ڈالیاں اور ہر ڈالی میں بے شمار شاخیں اور ٹہنیاں تھیں۔ ان شاخوں پر مختلف قسم کے پرندے اور چڑیاں طلاء اور نقرہ (سونے چاندی) سے ڈھال ڈھال کر بنائی گئی تھیں، اور یہی حال اس درخت کی شاخوں اور ٹہنیوں کا تھا یعنی ان میں بعض سونے سے بنائی گئی تھیں اور بعض چاندی سے ......

"دار الشجرہ" کے بعد سفیروں کو اس محل میں لوگوں نے پہنچایا جس کا نام "الفردوس" تھا۔ اس قصر میں فرش فروش اور ظروف و آلات کی جو کثرت تھی ان کا شمار مشکل ہے، صرف اس کی دہلیزوں پر طلائی کڑیوں سے بنی ہوئی دس ہزار زرہیں لٹک رہی تھیں، اس کے بعد آبنوسی جڑاؤ تخت پر سفراء نے مقتدر باللہ کو جلوہ افروز پایا جس پر دیبا جالردار کی کارچوبی مخمل مسند پڑی ہوئی تھی۔ تخت کے داہنی جانب اور بائیں جانب بھی خاص سلیقہ سے مختلف جواہر کے بنے ہوئے جالے کے نو نو عدد لٹکے ہوئے تھے جن کی جگمگاہٹ سے آنکھیں خیرہ ہوتی تھیں، دن کی روشنی کو بھی ان کی روشنی مات کر رہی تھی۔"

انقلاب لیکن اسی مسند خلافت پر امام غزالی کی وفات کے پچیسویں سال المقتفی باللہ کا لقب اختیار

کے جو شخص آتا ہے اس کے متعلق تاریخ بتاتی ہے کہ اس نے آتے ہی دار الخلافہ کا نقشہ یوں بدل دیا کہ:۔

"دار الخلافہ بغداد کا اپنے سارے فرش فروش، خیمہ و خرگاہ، پردے، سرا پردے، دواب چوپائے اور دوسرے جانوروں سے بالکلیہ تخلیہ ہو گیا صرف چار گھوڑے اور دار الخلافت میں پانی پہنچانے کے لیے کل آٹھ خچر اصطبل میں باقی تھے۔"

خلیفہ منتخب ہونے سے پہلے اس کا زیادہ وقت دینی مشاغل میں صرف ہوتا تھا۔ دینی علوم کی کتابیں کھولا رہتا تھا، یا قرآن کی تلاوت کرتا رہتا تھا، پھر جب خلیفہ منتخب ہوا تو زہد و عبادت و تقویٰ و طہارت کی خصوصیتوں میں اس کے کسی قسم کی کمی نہ ہوئی ...... عدل و انصاف کے چمن میں پھر بہار اس کے عہد میں آئی، نیکی کے ابواب پھر کھل پڑے۔

اسی کے ساتھ ساتھ

مقتفی کے زمانہ میں بغداد اور عراق پھر خلیفہ کے قبضۂ اقتدار میں واپس ہوا ورنہ مقتدر باللہ کے زمانہ سے صورت حال یہ ہو گئی تھی کہ خلیفہ کا صرف نام تھا اور حکومت ان سلاطین اور ملوک کی قائم تھی جنھوں نے جبراً خلیفہ کو اپنا تابع فرمان بنا لیا تھا۔

مولانا گیلانی فرماتے ہیں ——— "اور بات صرف مقتفی ہی کی حد تک اگر محدود ہوتی تو استثنا اور شذوذ کے دعوے کی گنجائش بھی پیدا ہو سکتی تھی، مگر واقعہ یہ ہے کہ امام غزالی کے بعد پے در پے پچاس ساٹھ برس کا زمانہ بغداد کی خلافت پر ایسا گزرا ہے کہ اسی خلافت کی گدی پر بیٹھنے والوں کے پہلو کو دیکھ کر تعجب ہوتا ہے کہ ان پچھلوں میں غیر معمولی انقلابی رنگ کیسے پیدا ہو گیا تھا، مقتفی کا حال تو آپ پڑھ ہی چکے ہیں، مقتفی کے بعد اسی کا بیٹا یوسف، مستنجد باللہ کے نام سے تخت خلافت پر امام غزالی کی وفات کے ٹھیک پچاس سال بعد متمکن ہوا۔ سیوطی نے تاریخ الخلفاء میں لکھا ہے:۔

مستنجد عدل اور نرم مزاجی کی خصوصیتوں سے موصوف تھا سارے عراق سے ناجائز محصول کو اس نے اٹھا دیا تھا۔

اور ابن اثیر کا فیصلہ تو اسی مستنجد کے متعلق یہ ہے کہ

کان احسن الخلفاء سیرۃً عباسی خلفاء میں رعیت کے ساتھ بہترین سلوک

صوالرهبة (صفحہ ۱۳۵ ج ۱۱) کرنے میں مستنجد بہت اچھا خلیفہ تھا۔

مستنجد کے بعد اُس کا بیٹا حسن المستضئی باللہ کے نام سے سریر آرائے خلافت ہوا۔ اس سے بڑھ کر المستضئی کے متعلق شہادت اور کیا ہو سکتی ہے کہ ابن جوزی جیسے بگڑے دل آدمی جو دوسروں پر جرح و تنقید کرنے میں تاریخی شہرت کے مالک ہیں، بخاری تک کے رواۃ پر نکتہ چینی سے ابن جوزی نہیں چوکتے۔ مستضئی کو انھوں نے خود دیکھا تھا اور بہت قریب سے دیکھا تھا، ان کی مجلس وعظ میں اکثر شریک بھی ہوتا تھا، بہرحال منتظم میں اپنی چشم دید گواہی ابن جوزی ان الفاظ میں ادا کرتے ہیں:۔

اظهر من العدل والكرم — عدل و کرم کا اظہار المستضئی نے جس پیمانے

ما لم نره في اعمارنا۔ — پر کیا ہم لوگوں نے ساری زندگی میں اس کی

(صفحہ ۲۵۵ ج ۱۰) — نظیر نہیں دیکھی۔

ابن اثیر نے (اسی کا حال لکھتے ہوئے) آخر میں مشہور عربی فقرہ (لکھا ہے)

فعاش حميدا ومات سعيدا — بس بڑی ہر دلعزیزی کے ساتھ اس نے

رضي الله تعالى عنه — زندگی بھی گزاری اور وفات بھی اس کی سعادت

(صفحہ ۱۶۳ ج ۱۱) — کے حالات کے ساتھ ہوئی۔

ایک عربی شعر بھی ابن اثیر نے مستضئی کے ذکر کو ختم کرتے ہوئے درج کیا ہے:۔

كان ايامه من حسن سيرته — مواسم الحج والاعياد والجمع

یعنی اپنی سیرت و کردار سے مستضئی نے ایک ایسا حال پیدا کر دیا تھا کہ اس کی حکومت کا زمانہ گویا حج، عید اور جمعہ کے دن تھے، یعنی ہر روز روز عید اور ہر شب شب برات کی کیفیت تھی۔

حالانکہ یہی بغداد تھا، ذرا غزالی سے پہلے بلکہ خود ان کے عہد کے حالات کتابوں میں پڑھیے عیاروں اور طراروں، لصوص یعنی چوروں اور رہزن لٹیروں کے دھاوے صبح و شام ہوتے رہتے تھے۔ دینی اور آئینی زندگی سے گریز کا رجحان روز بروز عباسی خلفاء میں بڑھتا چلا جا رہا تھا یہ اس کا لازمی نتیجہ تھا، جیسا کہ میں نے لکھا بھی ہے اور لوگوں کو معلوم بھی ہے کہ ممالک عباسیہ کے مختلف جہات و اقطار میں ملوک و سلاطین کچھ زور آور بننے میں خلفاء کی ان ہی کمزوریوں سے امداد بہم پہنچائی تھی۔

کیا یہ انقلاب بے سبب تھا؟ لیکن اچانک غزالی کے بعد ذمہ داری کا یہ احساس ان ہی خلفاء

میں کیسے بیدار ہو گیا۔ اور امن و امان کا جو تصہ بغداد کی سرزمین کے لیے افسانہ بن چکا تھا، اسی بغداد کو عید کے ان دنوں اور شب برات کی ان راتوں میں سانس لینے کا موقع جو ملا تو لوگوں نے اس انقلاب کے سبب کو کیوں نہ تلاش کیا؟

سچی بات تو یہ ہے کہ یہی ملوک و سلاطین جن کو عباسی خلفاء کی کمزوریوں نے زور حاصل کرنے کا موقع عطا کیا تھا خود ان کی حالت بھی غزالی کے بعد اور غزالی سے پہلے اتنی مختلف ہو گئی ہے کہ اسی اختلاف کو دیکھ کر حیرت ہوتی ہے۔"

ان ملوک و سلاطین کی حالت پہلے سے کس درجہ مختلف ہو گئی تھی اس کا اندازہ کرانے کے لیے مولانا نے پچھلی تاریخ کے کچھ اوراق الٹے ہیں۔ جن میں اسراف و فضول خرچی اور عشرت پسندی کے وہ نمونے نظر آتے ہیں کہ شاید تخیل کی رسائی بھی ان واقعات سے آگے ہونی مشکل ہے۔ اس کے مقابلہ میں مولانا کہتے ہیں کہ ذرا غزالی کے ۵۰ سال بعد دیکھو اسی بغدادی خلافت کا ایک متوسل سلطان نورالدین زنگی کے نام سے نظر آتا ہے۔ طویل و عریض زرخیز علاقے اس کے زیرنگین ہیں، شوکت کا یہ عالم ہے کہ حرمین اور یمن تک میں اس کا نام خلیفہ کے نام کے ساتھ خطبوں میں پڑھا جاتا ہے۔ لیکن زندگی کا ڈھنگ یہ ہے کہ

"شام کے شہر حمص میں تین دوکانیں تھیں (جنہیں نورالدین زنگی نے مال غنیمت کے حصے سے خریدا تھا) ان ہی تینوں دوکانوں کے کرایہ کی آمدنی ملکہ کے لیے نورالدین نے متعین کر دی تھی۔ سالانہ کل بیس دینار اس ذریعہ سے ملکہ کو ملتے تھے۔"

(ابن اثیر)

ملکہ نے نورالدین سے تنگی کی شکایت کرتے ہوئے اس مشاہرہ میں اضافہ چاہا۔ جواب میں نورالدین نے کہا۔

"میرے پاس اس کے سوا کچھ نہیں ہے۔ باقی میرے قبضہ میں حکومت کی جو آمدنی ہے سو اس میں مسلمانوں کا میں صرف خزانچی ہوں۔ میں اس مال میں خیانت کر کے جہنم کی آگ میں تمہارے لیے گھس نہیں سکتا۔"

اس وسیع و عریض سلطنت کے مالک سلطان نے اپنی پوری آخری بیماری اس چھوٹی سی کوٹھری میں گزار دی جس میں وہ عبادت کے لیے خلوت اختیار کیا کرتا تھا، اور بالآخر اسی میں جان جان آفریں کے سپرد کر دی۔ رضی اللہ تعالیٰ عنہٗ

مولانا فرماتے ہیں:۔

"اور ایک نور الدین ہی کیا، اسی کا شاہزادہ اسماعیل جو باپ کے بعد حلب کا حکمراں تھا۔ کُل (۱۹) سال کی عمر میں اس بے چارہ کی قولنج کے مرض سے وفات ہوئی۔ میں تو دنگ ہو کر رہ گیا، جب مورخین کی کتابوں میں یہ واقعہ پڑھا کہ عین ریعانِ شباب میں حکومت کی باگ حالانکہ اس کے ہاتھ میں آئی تھی، لیکن وہی شراب جس سے ملوک و سلاطین امراء و اعیان تو خیر، سچی بات تو یہ ہے کہ متوکل جیسے متعصب دیندار بادشاہوں تک کی مجلسِ نشاط جس کے دور سے خالی نہ ہوتی تھی، لیکن شاہزادہ اسماعیل جب قولنج میں مبتلا ہوا تو اطبا نے یہ طبی تجویز پیش کی کہ تھوڑی سی شراب استعمال کیجیے، مرض کا ازالہ ہو جائے گا۔ اطبا اصرار کر رہے تھے، مگر نوجوان شاہزادہ نے کہا:۔

لا افعل حتّٰی اسئل الفقهاء میں فقہاء سے جب تک نہ پوچھ لوں گا یہ نہ کروں گا

۔ آخر فقہاء بلائے گئے، شافعی مذہب کے علماء نے بالاتفاق جواز کا فتویٰ دیا۔ اس نے حنفی فقہاء کو خطاب کیا، آپ لوگ کیا فرماتے ہیں۔ لکھا ہے کہ صاحب بدائع علامہ ابوبکر کاسانی مشہور حنفی امام نے بھی کہا کہ جس حالت میں آپ ہیں شرعاً شراب کا استعمال آپ کے لیے جائز ہے[1]۔ مگر اس پوچھ گچھ کے بعد جو بجائے خود اس عہد کے ایک شہزادے اور وہ بھی نوجوان شہزادے سے کچھ کم اعجوبہ خیز نہیں ہے، سننے کی بات یہ ہے کہ شافعی و حنفی علماء کے ان فتوؤں کے باوجود شاہزادے نے پوچھا کہ
"میری موت کی مقررہ مدت اگر آچکی ہے تو شراب پینے سے کیا وہ ٹل جائے گی؟"
اس کا جواب جو ہو سکتا ہے وہی دیا گیا۔ یعنی قرآن جس چیز کو مؤجل قرار دے چکا ہے، جس میں

---

[1] اصل یہ ہے کہ جب تک بدل مل سکتا ہے امام ابو حنیفہ شرعی محرمات کا دوائً استعمال بھی جائز نہیں سمجھتے۔ مگر ان کے سوا عام ائمہ فقہاء حتیٰ کہ خود امام صاحب کے تلامذہ بھی دوائً استعمال کی اجازت دیتے ہیں۔ خواہ بدل سے علاج ممکن ہو یا نہ ہو۔ (منہ)

گھڑی بھر کے لیے بھی تقدیم و تاخیر کا کسی کو اختیار نہیں دیا گیا ہے۔ بھلا دوا اور علاج سے اس کو کون ٹال سکتا ہے۔

شاہزادے نے اس جواب کو سُن کر جو کہا حوصلہ کی بلندی، ایمانی برد و سکینت کی یہ کتنی اثر انگیز و عجیب و غریب مثال ہے اس نے علماء کو خطاب کرتے ہوئے اپنے دل کی بات کا اظہار ان الفاظ میں کیا۔

ایسی چیز جسے شریعت نے حرام قرار دیا ہو اسے استعمال کر کے خدا کی قسم میں اللہ سے ملاقات نہیں کروں گا۔ (رفنہ و حشت ۴۲)

مؤرخین نے لکھا ہے :۔

مات ولم يشرب رحمه الله تعالى	شاہزادہ اسماعیل مر گیا اور شراب نہیں استعمال کی۔ خدا کی رحمت ان پر نازل ہو۔

سُلطان صلاح الدین ایوبی پر تعلیمات غزالیہ کا اثر

سُلطان نورالدین زنگی رحمۃ اللہ علیہ کے بعد صلیبی حروب کی قیادت جس عالمگیر شہرت رکھنے والے بادشاہ صلاح الدین ایوبیؒ کے حصے میں آئی، مولانا فرماتے ہیں کہ ذرا اس کے حالات بھی دیکھیے کہ کس قدر حیرت انگیز ہیں۔

امام غزالی کی وفات کے ستائیس سال بعد امام صلاح الدین کی ولادت ہوئی۔ اُن کی مجاہدانہ زندگی سے تو خیر دنیا واقف ہے، میں اس وقت یہ ذکر کرنا چاہتا ہوں کہ اتنی عظیم سلطنت کے تاجدار ہونے کے باوجود ذاتی حال اس سلطان کا یہ تھا کہ وفات کے بعد اُن کے ذاتی خزانے کا جب جائزہ لیا گیا تو

ماخرج غير دينار صوري واربعين درهما ناصرية	ایک صوری اشرفی اور چالیس ناصریہ درہم کے سوا اور کچھ نہ نکلا۔[1]
(ابن اثیر ج ۱۲ ص ۳۵)	

---

[1] ابن اثیر نے تو صرف درہم و دینار کے متعلق لکھا ہے مورخ ابو الفدا جو ایوبی خاندان سے متعلق ہیں۔ لکھتے ہیں ان کا بیان ہے کہ لم يخلف عقاراً ولا داراً (سلطان نے کوئی غیر منقولہ جائداد زمین وغیرہ کی شکل میں چھوڑی، نہ کوئی ذاتی مکان چھوڑا۔

ایک طرف (امام غزالی ہی کی صدی کا کچھ پیشتر کا) عضد الدولہ تھا جو چاہتا تھا کہ روزانہ اس کے خزانہ میں دس لاکھ درہم جب تک داخل نہ ہوں گے دم نہ لے گا، دوسری طرف صلاح الدین کا یہ حال ہے کہ اپنے خزانے میں کچھ نہ چھوڑوں گا! ——— بقول ابن اثیر فاطمیوں کے مصری خزانہ کا صلاح الدین تنہا وارث ہوا تھا، مگر ان ہی کی شہادت ہے کہ

ففرقہ جمیعًا (ج ۲، ص ۱۲۲) سلطان نے سارا خزانہ تقسیم کر دیا۔

یا ایک وہ کیفیت تھی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے منبر پر چڑھنے والے خطبا، اور علما تک بھی غیر شرعی لباس سے پرہیز نہ کرتے تھے، علماء دین کے خچروں تک کے گلوں میں طلائی طوق پڑے رہتے تھے۔ یا ایک حالت صلاح الدین کا تھا کہ

لم یلبس شیئًا مما ینکرہ الشرع — ایسی کوئی چیز کبھی نہ پہنی جسے شریعت نے ناجائز ٹھہرایا ہو۔

مولانا فرماتے ہیں کہ

آخر آپ ہی بتائیے بخت و اتفاق کے پیچ آدمی کہاں کہاں تک بناہ ڈھونڈے، اور مسلسل پیش آنے والے ان واقعات کی جو غزالی کے بعد اسلامی تاریخ میں ملتے ہیں کیا توجیہ کرے ——— یہ جو کچھ ذکر ہوا مشرقی اسلامی دنیا کے خلفاء و سلاطین کا تھا لیکن جب مغربی دنیائے اسلام (اندلس اور مغربی افریقہ) کے دینی انقلاب میں ——— جس کا امام غزالی کے بغداد سے ہزاروں میل کا فاصلہ تھا، لوگوں کو امام غزالی کا ہاتھ نظر آتا ہے (جیسا کہ ابن خلدون نے روایت بیان کی ہے کہ "محمد بن تومرت جو مغرب میں موحدین کی دینی حکومت کا حقیقی بانی تھا امام غزالی ہی نے اس کو ایک ملاقات میں ایک طاقتور دینی سلطنت کے قیام پر آمادہ کیا تھا") اور ہم اس مغربی حکومت کا یہ رنگ دیکھتے ہیں کہ موحدین کا دوسرا بادشاہ جس کا نام یوسف بن عبد المومن تھا، صحیح بخاری اس کو زبانی یاد تھی، جہاد کی حدیثیں خود املا کراتا تھا ساری زندگی یورپ کے عیسائی سلاطین سے اسلامی علاقوں کو واپس لینے میں اس کی گزری۔ اس کے بعد اس کا بیٹا یعقوب جانشین ہوا، جس کے متعلق الیافعی کے الفاظ کا ترجمہ یہ ہے:-

"شریعت کو پوری طاقت سے اس نے پکڑا تھا، معروف کا حکم دیتا تھا، منکرات کو اس نے

رکھ دیا تھا، اس معاملہ میں بڑا دلیر تھا، کسی جھجک کے بغیر وہاں امور کو انجام دیتا تھا۔
مغربی افریقہ کے سوا اندلس پر بھی اس نے دوبارہ اسلامی اقتدار قائم کر دیا تھا، بے تحاشہ دولت کا مالک تھا، مگر باایں ہمہ باتفاق مورخین کا بیان ہے کہ

کان یلبس الصوف ویقف للمرأۃ	بال کے بنے ہوئے کپڑے استعمال کرتا یعنی کمبل پوش تھا، معمولی عورت اور کسی غریب کمزور کے لیے بھی
والضعیف فیاخذ لہم حقہم	کھڑا ہو جاتا تھا اور بڑے سے بڑے جھگڑے
من کل ظالم عنیف	دکھانے والے ظالموں سے حق دلا کر رہتا تھا۔
(البدایۃ ج ۱۲ ص ۱۳۶)	

جب مغربی سلاطین تک کے ان حالات میں لوگوں کو امام غزالی کی کارفرمائی نظر آئی ہے، تو آخر میرے پاس اس تاثر کو بے بنیاد ٹھہرانے کی کیا وجہ ہو سکتی ہے جب مشرق کے ان خلفاء و سلاطین و ملوک کے ان حالات میں مجھے غزالی کی روح کارفرما نظر آتی ہے ——— واقعہ یہ ہے کہ غزالی کے بعد کے خلفاء، ملوک و سلاطین کے ان طبقات میں غیر معمولی انقلاب کی جن موجوں کو ہم متلاطم پاتے ہیں ان کے متعلق اس بات کا ثابت کرنا تو مشکل ہے کہ براہ راست امام کے کارندوں نے ان لوگوں کو متاثر کیا تھا، بلکہ محمد بن تومرت کے ساتھ بھی امام غزالی کے جن تعلقات کا لوگ تاریخوں میں تذکرہ جن الفاظ میں کرتے ہیں اُن سے عام تاریخی یقین کا پیدا ہونا بھی دشوار ہے، اور ذکر بھی اس واقعہ کا اتنا سرسری طور پر دوسرے واقعات کے ضمن میں کر دیا گیا ہے کہ عوام ہی نہیں خواص تک کو بھی اس کی خبر نہ پہنچ سکی، اس لیے مولانا فرماتے ہیں کہ میرا دعویٰ یہ نہیں ہے کہ یہ نتائج مثلاً امامؒ کی مادی کوششوں سے وابستہ تھے بلکہ کہنا صرف یہ ہے کہ غزالی کے دل سے ایک آواز نکلی تھی، ان کے سامنے یہ قطعاً نہ تھا کہ کس کو سنا رہے ہیں، خلفاء کو یا سلاطین کو، اُمراء کو یا وزراء کو عوام کو یا خواص کو، بس وہ صرف سنانا چاہتے تھے اور امید قائم کی ہوگی کہ سننے کی جس میں صلاحیت ہوگی اپنے اپنے ظرف کے مطابق اس کو سنے گا۔ اور فائدہ اٹھائے گا۔ اور یہی واقعہ پیش آیا بھی۔"

خلفاء و سلاطین کے بعد وزراء

آپ کے سامنے اب تک تو اُن خلفاء و ملوک ہی کی مثالیں گزری ہیں جو یکے بعد دیگرے مشرق و

مغرب میں غزالی کے بعد نمایاں ہوتے رہے، لیکن جیسا کہ میں نے عرض کیا غزالی کے سامنے کوئی خاص طبقہ نہ تھا، سارے مسلمانوں کے لیے ان کا خطاب عام تھا۔ بس اب ذرا خلافت و سلطنت کے بلند زینوں سے نیچے اتر کر بھی دیکھیے۔

وزیر ابن ہُبیرہ

یہ اسی خلیفہ مقتفی باللہ کے وزیر ہیں جس کا تذکرہ گزر چکا ہے، امام غزالی کی وفات کے کل سو سال بعد خلافتِ عباسیہ کے وزیر اعظم کے عہدے پر سرفراز ہوئے ہیں۔ نام تو ان کا یحییٰ تھا، ہُبیرہ جو اُن کے دادا تھے ان ہی کی طرف منسوب ہو کر ابن ہبیرہ کے نام سے مشہور ہوئے۔ بارگاہ خلافت سے، جیسا کہ اس زمانہ میں عام دستور ہو گیا تھا، طویل و عریض القاب ارکانِ حکومت کے نام کے آگے پیچھے لگائے جاتے تھے، ابن ہبیرہ کو بھی

وزیر العالم، العادل، عون الدین، جلال الاسلام، صفی الامام، شرف الانام
معز الدولہ، عماد الامۃ، مصطفی الخلافۃ، تاج الملوک والسلاطین، صدر الشرق
والغرب، سید الوزراء،

کا لمبا چوڑا خطاب ملا تھا، مگر جو حالات کتابوں میں اُن کے ملتے ہیں اُن کو دیکھ کر یہی خیال گزرتا ہے کہ خود ابن ہبیرہ کے قلب میں نہ ان الفاظ کا کوئی وزن تھا اور نہ اس عہدے پر سرفرازی کے بعد آدمی جس جاہی و مالی اقتدار کا مالک ہو جاتا تھا اس اقتدار کی وقعت و قیمت بھی ان کی نگاہ میں پر پشہ سے زیادہ نہ تھی۔ ابن جوزی، ابن ہبیرہ کے صرف دیکھنے والے ہی نہیں بلکہ اُن کے حلقہ درس حدیث میں بیٹھنے والوں میں سے ایک ہیں، بڑی تفصیل سے عباسی خلافت کی اس عجیب و غریب شخصیت کا انھوں نے تذکرہ کیا ہے۔ دو واقعے سننے کے لائق ہیں:-

(۱)

صحاح ستہ کی حدیثوں کی شرح میں انتہائی تدقیق و تحقیق سے الافصاح نامی ایک کتاب خود ابن ہبیرہ نے تصنیف کی تھی۔ اسی کا درس وزارتِ عظمیٰ کے منصب پر سرفراز ہونے کے بعد ایک دن دے رہے تھے، مالکی مذہب کے ایک فقیہ نے خواہ مخواہ ایک مسئلہ میں الجھنا شروع کیا، علماء کا حلقہ تھا، ہر ایک فقیہ کو سمجھاتا تھا، فن کی معتبر کتابیں لا لا کر دکھلائی جا رہی تھیں، مگر فقیہ کا اصرار اپنی بات پر جاری رہا۔ قدرتاً ابن ہبیرہ کو اس اصرار بیجا پر غصہ آ گیا اور زبان سے بے ساختہ یہ فقرہ نکل گیا

بھیمۃٌ انت اما تسمع ھؤلاء	تو نرے جانور ہو کیا سُن نہیں رہے ہو یہ تمام لوگ کس
یشھدون ان الکتب المصنفۃ	بات کی شہادت دے رہے ہیں اور کتابوں سے کیا
وانت تنازع وتفرّق المجلس	معلوم ہوتا ہے، مگر تم ہو کہ جھگڑتے ہی چلے جا رہے ہو،
(شذرات ج ۴ ص ۱۹۳)	اور مجلس میں گڑبڑ پیدا کر رہے ہو۔

کہنے کو تو ابن ہبیرہ نے اس وقت اُن کو "جانور" کہہ دیا لیکن اس کے بعد اُن کے شریف نفس میں ذمہ داری کا احساس جب بیدار ہوا تو پھر کس حال میں وہ مبتلا ہوئے؟ یہی سننے کی بات ہے۔

لکھا ہے کہ اس دن کی مجلس تو ختم ہو گئی لیکن دوسری مجلس میں جب لوگ جمع ہوئے اور قاری نے قرأت کرنی چاہی تو ابن ہبیرہ نے اس کو روک دیا اور مالکی فقیہ کی طرف خطاب کر کے کہنا شروع کیا کہ کل آپ کے ہمراہ بیجا نے خواہ مخواہ ایک ایسے لفظ کو میری زبان پر جاری کر دیا کہ جب تک آپ اسی لفظ سے مجھ کو مخاطب نہ کر لیں گے درس شروع نہیں ہو سکتا" آخر آپ کو "بہیمہ" (جانور) کہنے کا مجھے کیا حق تھا؟ میں اپنے اندر کوئی ترجیحی وجہ نہیں پاتا" ——— مجلس سناٹے میں آ گئی۔ خلافت عباسیہ کا وزیر اعظم اکابر و امراء کے ساتھ ایک معمولی مولوی کے سامنے قصور کا اعتراف کر کے یہ استدعا کر رہا ہے کہ مجھے "بہیمہ" یعنی جانور آپ جب تک نہ کہہ لیں گے میرے دل کو چین نہ ہو گا۔ بیان کیا گیا ہے کہ اہل مجلس پر رقت طاری ہو گئی۔ لوگ رونے لگے۔ مالکی فقیہ بھی حد سے زیادہ شرمندہ تھا۔ وزیر سے کہہ رہا تھا کہ قصور تو میرا تھا۔ مجھے معذرت پیش کرنی چاہیے، مگر ابن ہبیرہ چلا چلا کر

القصاص: القصاص!! بدلہ! بدلہ!!

کے لفظ دہراتے چلے جاتے تھے۔

آخر جب لوگ آگے بڑھے اور عرض کیا کہ ہم لوگوں کی رائے ہے کہ مالکی فقیہ کو آپ مالی شکل میں کچھ معاوضہ ادا کر دیں، مگر فقیہ کو اس سے بھی انکار رہا، بہت سمجھانے بجھانے پر بیچارہ سو اشرفیوں کے لینے پر آمادہ ہو گیا، اور یوں بات رفع دفع ہوئی۔

(۲)

طالب العلمی کے زمانہ میں ایک دن سڑک پر چلے جا رہے تھے پھٹے حال تھے، ایک سپاہی نے محل کا ایک ٹوکرا اٹھانے کا حکم دیا۔ اور انکار کرنے پر ایک تھپڑ اس زور سے رسید کیا کہ ابن ہبیرہ کی داہنی

آنکھ کی روشنی جاتی رہی، لیکن زندگی بھر اس کا تذکرہ کسی سے نہیں کیا۔ اتفاقاً وزارت عظمیٰ کے زمانہ میں مجرم قتل وہی شخص گرفتار ہو کر ابن ہبیرہ کے سامنے لایا گیا، انھوں نے خوں بہا ادا کرکے مدعیوں کو روانہ کردیا۔ اور اس کو بھی پچاس اشرفیاں دے کر رخصت کیا، لوگوں نے اس غیر معمولی سلوک کی وجہ پوچھی، تب کہا کہ میری دا ہنی آنکھ کی روشنی جو غائب ہے، اس کا علم غالباً آپ لوگوں کو نہ ہوگا ـــــ قتل کے اسی مجرم کا یہ کرتوت ہے۔ پھر قصہ سنایا، اور آخر میں بولے کہ بدی کا بدلہ نیکی سے دینا چاہیئے، اس پر عمل کرنے کے لیے دل بے چین ہو گیا، اسی لیے اس کے ساتھ میں نے یہ خصوصی برتاؤ کیا۔

قاضی فاضل

غزالی کے بعد وزراء کے طبقہ میں ابن ہبیرہ ان حالات میں تنہا نہیں ہیں، بلکہ کافی تعداد ایسے وزراء کی پائی جاتی ہے، کم از کم سلطان صلاح الدین کے وزیر با تدبیر قاضی فاضل سے کون ناواقف ہے، ابن عماد نے شذرہ میں اُن کے متعلق لکھا ہے:۔

کان منزهاً عفيفاً نظيفاً	بڑے پاکباز، پارسا اور باصفا بزرگ تھے۔ لذتوں
قليل اللذات، كثير الحسنات	کا حصہ اُن کی زندگی میں بہت کم تھا۔ نیکیوں اور
دائم التهجد ملازم القرآن	بھلائیوں کی اُن کے یہاں کثرت تھی تہجد کے پابند
والاشتغال بعلوم الادب	اور قرآن کے ساتھ دائمی وابستگی رکھتے تھے، نیز ادبی
(ص ۳۲۵ ج ۴)	علوم میں مشغول رہتے تھے۔

مالی حالت یہ تھی کہ علاوہ وزارت عظمیٰ کی تنخواہ کے ہندوستان اور مغرب میں وسیع پیمانہ پر اُن کا تجارتی کاروبار پھیلا ہوا تھا۔ جاگیریں الگ تھیں، صرف ایک گاؤں ترنجہ نامی سے، ابن عماد نے لکھا ہے کہ پچاس ہزار اشرفی آمدنی ہوتی تھی، مگر اس تمام آمدنی میں قاضی فاضل کا اپنا حصہ کتنا تھا؟

یہی ابن عماد لکھتے ہیں:۔

كان لباسه لا يساوي	دو اشرفی بھی اُن کے لباس کی قیمت
دينارين۔	نہ ہوتی تھی۔

سواری جب نکلتی تو ایک غلام کے سوا کوئی ساتھ نہ ہوتا، بکثرت قبرستان جاتے، جنازوں کے ساتھ چلتے اور مریضوں کے گھر جاکر عیادت کرتے۔

محمد منظور نعمانی

صُحبتے با اولیاء

(حدیث کے درس و مطالعہ کے سلسلے میں اصحاب حال و ارباب دل کے بعض ایسے واقعات نظر سے گذرتے ہیں جن میں دلوں کی زندگی کا بڑا سامان ہوتا ہے۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس فیض صحبت میں ناظرینِ الفرقان کو بھی شریک کر لیا جائے۔ اس امت کی تاریخ ایسی مثالوں سے بھری ہوئی ہے کہ کسی اچھی بات کے پہنچانے والے سے زیادہ نفع اُن بندوں نے اُٹھایا جن کو پہنچانے والے نے وہ بات پہنچائی، اور دعوت دی۔)

محمد منظور نعمانی عفا اللہ عنہ

(۱)

امام ترمذی نے رات کے نوافل یعنی تہجد سے متعلق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے معمولات بیان کرتے ہوئے اُمّ المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی یہ حدیث اپنی سند سے روایت کی ہے کہ:-

"رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب کبھی نیند کے غلبہ کی وجہ سے (یا درد کے کسی ایسے ہی سبب سے) رات کو تہجد نہیں پڑھ سکتے تھے تو اُس روز اُس کے عوض دن میں بارہ رکعتیں پڑھا کرتے تھے۔"[1]

---

[1] دراصل یہ ایک طویل حدیث کا ٹکڑا ہے۔ پوری حدیث صحیح مسلم میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے تہجد (؟) کے بیان میں مروی ہے۔ نیز صحیح مسلم ہی میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی روایت سے رسول اللہ (باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

حضرت صدیقہؓ سے اس کے روایت کرنے والے سعد بن ہشام ہیں اور اُن سے روایت کرنے والے زُرارہ بن اَوْفیٰ تابعی ہیں۔ امام ترمذی کا دستور ہے کہ حسب موقع وہ راویانِ حدیث کا کچھ تعارف بھی کراتے ہیں۔ چنانچہ اس موقع پہ زرارہ بن اوفیٰ کے متعلق امام ترمذی نے اپنی سند سے بہز بن حکیم کا یہ بیان نقل کیا ہے۔

"یہ زرارہ بن اوفیٰ بصرہ کے قاضی تھے، وہاں بنو قشیر کی مسجد میں نماز بھی پڑھایا کرتے تھے، ایک دن فجر کی نماز میں (سورۂ مدثر پڑھتے ہوئے) یہ آیت پڑھی "فَإِذَا نُقِرَ فِي النَّاقُورِ فَذَٰلِكَ يَوْمَئِذٍ يَوْمٌ عَسِيرٌ" (جس کا مطلب یہ ہے کہ جب قیامت کا صور پھونکا جائے گا تو وہ دن بڑا ہی سخت اور کٹھن دن ہوگا) اس آیت کے پڑھتے ہی روح جسم سے پرواز کر گئی اور بے جان ہو کر محراب ہی میں گر پڑے"۔ (واقعہ کے راوی بہز بن حکیم فرماتے ہیں کہ) جن لوگوں نے اُن کی میت کو مسجد سے اٹھا کر ان کے گھر پہنچایا تھا ان میں میں بھی تھا۔

یہ واقعہ جیسا کہ اوپر بتایا گیا امام ترمذی نے اپنی پوری سند کے ساتھ بہز بن حکیم سے روایت کیا ہے۔

(۲)

حافظِ حدیث شیخ الاسلام ابو نصر مروزی نے بھی "قیام اللیل" میں اس طرح کے متعدد واقعات نقل کئے ہیں ... فرماتے ہیں کہ

"اللہ کا کوئی بندہ قرآن مجید پڑھ رہا تھا کوئی صاحبِ دل سُن رہے تھے، پڑھنے والے نے یہ آیت پڑھی "ثُمَّ رُدُّوا إِلَى اللَّهِ مَوْلَاهُمُ الْحَقِّ" (جس کا مطلب ہے کہ قیامت کے دن لوگ پیش کیے جائیں گے اپنے حقیقی مالک کے حضور میں) تو سننے والے بزرگ کی ایک چیخ نکلی اور زمین پر گر کے تڑپنے لگے اور روح اپنے قالب کو وہیں چھوڑ کے اُسی دم اپنے حقیقی مالک

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد بھی اس بارہ میں مروی ہے کہ رات کو سوتے رہ جانے کی وجہ سے جس شخص کا رات کا معمول کلاً یا جزءً فوت ہو جائے وہ اگر صبح کو فجر اور ظہر کے درمیان اس کو پڑھ لے تو اس کو وہی ثواب ملے گا جو رات کو پڑھنے کا ملتا۔ ۱۲

کے حضور میں پہنچ گئی۔

(۳)

"اسی طرح کسی صاحب دل نے سنا کہ اللہ کا کوئی بندہ یہ آیت پڑھ رہا ہے
"یا ایھا الذین اٰمنوا قوا انفسکم و اھلیکم نارا وقودھا الناس والحجارۃ"
(اے ایمان والو خود اپنے کو اور اپنے اہل و عیال کو دوزخ کی آگ سے بچانے کی فکر کرو
جس کا ایندھن آدمی اور پتھر ہیں) تو ان کا پتہ پھٹ گیا اور وہیں جاں بحق ہو گئے۔

(۴)

"عمرو بن عتبہ تابعیؒ نے رات کو اپنے گھر میں نماز پڑھنی شروع کی یہاں تک کہ اس آیت
پر پہنچے "وَ اَنذِرھُم یومَ الاٰزِفَۃِ اِذِ القُلوبُ لدی الحناجرِ کاظمین" (آپ
ان کو عنقریب آنے والی قیامت کے دن سے ڈرا دیجئے جبکہ کلیجے منہ کو آجائیں گے اور غم سے
گھٹ گھٹ جائیں گے) تو روتے روتے گر پڑے اور دیر تک نماز پڑھنے کے قابل نہ ہو سکے،
جب حالت کچھ درست ہوئی تو پھر نماز شروع کی پھر وہی آیت پڑھی اور پھر گر پڑے،
راوی کا بیان ہے کہ صبح تک ان کی یہی کیفیت رہی نماز نہیں پڑھ سکے بلکہ رکوع تک بھی نہیں
پہنچ سکے۔"

(۵)

ایک دوسرے مشہور تابعی ثابت بنانیؒ کے متعلق بھی شیخ الاسلام ابو نصر مروزی نقل
فرماتے ہیں کہ

"ان کی آنکھوں میں تکلیف تھی معالج نے کہا کہ آپ ایک بات کی ذمہ داری لے لیں
آپ کی آنکھ بالکل اچھی ہو جائے گی، انھوں نے پوچھا کس بات کی ذمہ داری لے
لوں، معالج نے کہا بس یہ کہ آپ روئیں نہیں، انھوں نے فرمایا کہ آنکھ اگر روئے
نہیں تو اس سے کیا فائدہ۔" (قیام اللیل)

(الفرقان ربیع الاول ۱۳۷۲ھ)

مولانا سید مناظر احسن گیلانیؒ

اسلامی رواداری اور مساوات و بے نفسی

کا

ایک دِل آویز مرقع

وہ ایک طرف بیٹھے زار و قطار رو رہے تھے

تذکرۂ رحمانیہ صـ۲۱

یہ زار و قطار رونے والے صاحب اردو زبان کی سب سے بڑی انقلابی نظم (مسدس حالی) کے مصنف مولانا الطاف حسین حالی تھے، ان کے استاذ شیخ حضرت مولانا قاری عبدالرحمٰن صاحب پانی پتی کا انتقال ہو رہا تھا، نزع کا عالم طاری تھا، سعادت مند شاگرد اس حال کو دیکھ کر بے قابو ہو گیا اور دھاڑیں مار کر رونے لگا۔ اسی زمانہ میں اخبار میں مضمون بھی لکھا تھا۔ ان الفاظ کے بعد کہ۔

"نہایت افسوس ہے کہ پانی پت ایک ایسے بزرگ سے خالی ہو گیا جو نہ صرف پانی پت کے لیے بلکہ تمام مسلمانوں کے باعثِ فخر تھا۔"

مولانا حالی کے ذمہ دار قلم کی اس شہادت کی قدر و قیمت کا اندازہ کیجیے، لکھا ہے کہ

"جس کا مثل آئندہ زمانہ میں پیدا ہونا محالات عادیہ میں معلوم ہوتا ہے۔"

آخر میں عربی کے اس مشہور مثالی شعر کو مولانا نے اس موقع پر درج کیا ہے کہ

وما کان قیس هلکہ هلك واحد
ولکنه بنیان قوم تهدّما

تو وہی ترجمہ بھی اس شعر کا اردو میں بایں الفاظ فرمایا ہے۔

"قیس کا مرنا ایک آدمی کا مرنا نہ تھا، بلکہ وہ قوم کی بنیاد تھی، جو گر گئی۔"

("تذکرہ رحمانیہ ص۲۶۷)

قاری صاحب کیا تھے، کن کن کمالات وصفات سے سرفراز تھے، جاننے والوں کے لیے شاید اس سلسلہ میں اتنا لکھنا کافی ہو سکتا ہے کہ سیدنا شاہ عبد العزیز کے نواسے حضرت مولانا شاہ اسحاق صاحب کے ارشد تلامذہ میں ایک غیر معمولی ممتاز ہستی اپنے زمانہ میں قاری صاحب کی بھی شمار ہوتی تھی۔ جیسا کہ معلوم ہے نسبی طور پر خانوادۂ ولی اللہی کی علمی وعملی خصوصیتوں کے آخری چشم وچراغ شاہ اسحاق رحمۃ اللہ علیہ ہی تھے۔ غدر سے پہلے ہندوستان اپنی زبوں حالیوں میں جس حد تک پہونچ چکا تھا، شاہ صاحب ان کے دیکھنے کی تاب نہ لا سکے۔ انتہائی بے سروسامانی کی حالت میں آدطن (سرزمین ہند) کو سلام کرکے ہجرت کی نیت سے حجاز پہونچے، اور خاک پاک حجاز ہی میں آسودہ ہوئے۔ مکۂ معظمہ کے مشہور مقبرہ "جنت معلی" میں محو خواب ہیں۔

قاری صاحب کی علمی جلالت شان کا اندازہ اسی سے ہوتا ہے کہ شیخ الہند حضرت مولنا محمود حسن دیوبندی حکیم الامت حضرت مرشد تھانوی جیسے بزرگوں نے تبرکاً قاری صاحب سے حدیث کی اجازت حاصل کی تھی ان ہی اجازت حاصل کرنے والوں میں ایک طرف نواب صدر یار جنگ مولنا حبیب الرحمٰن خاں شروانی مغفور بھی نظر آتے ہیں، اور دوسری طرف قاری صاحب کے حلقۂ افادہ میں شمس العلما مولانا الطاف حسین حالی کو بھی ہم پاتے ہیں۔ لکھا ہے کہ

"مولانا (حالی) نے حضرت (قاری صاحب) سے صحاح ستہ کی کتابیں پڑھی تھیں۔"

(تذکرہ رحمانیہ ص۲۷)

جس کے معنی یہی ہیں کہ ہم وطنی کے علاوہ مولنا حالی نے قاری صاحب کو بہت قریب سے دیکھا تھا، اور اپنے ان ہی ذاتی مشاہدات وتجربات کی بنیاد پر کم از کم ان کا ذاتی احساس کہئے یا خیال یہی تھا کہ اب دنیا ان نمونوں کو شاید کبھی نہ دیکھ پائے گی جن کی نمائندگی قاری صاحب نور اللہ مرقدہ کا وجود کر رہا تھا۔

اس میں شک نہیں رہا کہ قاری صاحب کے زمانہ میں جدید نظام تعلیم کے اسکولوں اور مدرسوں سے ملک روشناس ہو چکا تھا، لیکن قاری صاحب ان نئے اسکولوں کو کس نظر سے دیکھتے تھے اسکے لیے یہی کافی ہے کہ بجائے "تعلیم گاہوں" کے ہمیشہ ان اسکولوں کو وہ

"مجہلے"

کے نام سے موسوم کرتے رہے۔ (دیکھئے ان کی سوانح عمری)

بہرحال ان کی تربیت و تعلیم اول سے آخر تک پرانے نظام ہی کے تحت ہوئی تھی، ان ہی پرانے خیال والے مسلمانوں میں وہ پیدا بھی ہوئے۔ ان ہی کے حلقہائے درس و تدریس میں لکھا پڑھا اور ساری زندگی اسی ماحول میں گزار دی۔ لیکن باوجود اس کے کر کر کے جو کچھ وہ دکھاتے رہے اس کا اندازہ آپ کو ان چند خاص نمونوں سے ہوگا، قاری صاحب کے صاحبزادے مولٰنا عبدالسلام راوی ہیں، ریل کے سفر میں وہ اپنے والد ماجد کے ساتھ تھے۔ ڈبہ جس میں قاری صاحب سوار ہوئے بھرا ہوا تھا، زیادہ تعداد ہندو مسافروں کی تھی، قاری صاحب کی خاص شکل و صورت کو دیکھ کر خود بخود مسافروں نے خواہش کی کہ

"آپ تنگ ہو کر نہ بیٹھیں، ہماری طرف پاؤں پھیلا لیجئے۔"

جواب میں اپنے مذہب (اسلام) کا حوالہ دیتے ہوئے وقت کا ایک محدث ان ہی چند ہندو مسافروں سے یہ کہہ رہا تھا۔

"میرا مذہب اجازت نہیں دیتا کہ کسی انسان کے چہرے کی بے ادبی کروں، ہم ہر شخص کے چہرے کا احترام کریں گے۔"　　(تذکرۂ رحمانیہ ص۲۲)

اسی لیے باوجود اجازت بلکہ اگر حضرت والا پاؤں پھیلا دیتے تو شاید ان کے ہمسفروں کو مسرت ہی ہوتی، لیکن انسانیت کے احترام کی تعلیم مذہب کی طرف سے اس کو جو ملی تھی، اسی پر اصرار کرتے ہوئے سفر کو پورا فرمایا، لکھا ہو کہ سفر کے ان رفیقوں سے حضرت نے یہ بھی ارشاد فرمایا۔

"تمھیں اختیار ہو جس طرح چاہو بیٹھو، اگر میں اپنے اصول کے خلاف نہیں کروں گا۔"

سفر میں جس کا یہ حال تھا۔ حضر میں اس کے ہم وطنوں کو اس رنگ میں اگر پایا گیا تھا تو اس پر تعجب کیوں کیجئے لکھا ہو کہ

"جس گلی یا بازار سے گزرتے اور کوئی ہندو حقہ پیتا ہوتا تو حضرت کو دور سے آتا دیکھ کر حقہ اٹھا دیتا یا اِدھر اُدھر ہو جاتا۔"

دوامی عادت پانی پت کے ان ہی عام باشندوں کی یہ تھی۔

"جب آپ (قاری صاحب) بازار میں سے گزرتے تو ہندو آپکو جھک جھک کر سلام کیا کرتے تھے۔" (ص۱۱)

جس دن حضرت والا کا انتقال ہوا، تو لکھا ہو کہ

"ہندوؤں نے اپنی دوکانیں اور کاروبار بند کر دیئے اور بہت رنج وغم کا اظہار کیا۔"

صبح وشام دیکھنے والے جس پانی پت میں ایسی جان افروز روح پرور نظاروں کا تماشا کر رہے تھے۔ اس وقت مسلمانوں کا پانی پت سے سیاسی اقتدار کا دبدبہ اٹھ چکا تھا، مسلمان اور ہندو دونوں تیسری بڑی طاقت کے نیچے دبے ہوئے تھے۔ مگر اس وقت تک "انسانیت" کے احترام کا جو درس اسلام نے دیا تھا ابھی یہ سبق ان کو یاد تھا، حافظہ سے اس قسم کی قرآنی آیتوں کا اثر مٹا نہیں تھا، مثلاً ارشاد ہوا ہے۔

وقل لعبادی یقولوا التی هی احسن ان الشیطان ینزغ بینهم (سورۂ بنی اسرائیل)	اور کہہ دو میرے بندوں سے بولا کریں ایسی باتیں جو اچھی ہوں، الشیطان چھیڑ خانی کرتا رہتا ہے باہم ان میں۔

جس کی تفسیر میں قاضی بیضاوی لکھتے ہیں۔

یقولوا التی هی احسن الکلمة التی هی احسن ولا یخاشنوا المشرکین	"بولا کریں ایسی باتیں جو اچھی ہوں" ان کا مطلب یہ کہ ایسی بات زبان سے نکالیں جو اچھی ہو، اور مشرکین کے ساتھ سخت کلامی سے کام نہ لیں۔

مگر بجائے "الانسان" کے احترام کے، یورپ سے "قوم پرستی" کی بلا نازل ہوئی، پھر وہی پانی پت تھا، اس کا وہی آسمان تھا اور اس کی وہی زمین تھی، دیکھنے والوں نے جو کچھ وہاں دیکھا تھا اور اس وقت تک دیکھ رہے ہیں، وہ بھی سب کے سامنے ہی ہے[1]

[1] تاہم اس گئے گذرے زمانہ میں بھی اللہ کا ایک بندہ اس وقت تک ایمان واستقامت کا عملی درس اسی پانی پت میں دے رہا ہے۔ یہ ہمارے کرم فرما مولانا لقاء اللہ صوفی ہیں ۱۲

اور ہندو تو خیر محکومیت میں مسلمانوں کے اس وقت ساتھی تھے۔ آپ کو سُن کر حیرت ہوگی کہ انگریز جو حکومت سے محروم کر کے مسلمانوں کے سینوں پر چڑھے ہوئے تھے۔ سروں سے وہ خونیں سیلاب بھی گذر چکا تھا جس کا نام عہد شکن حکومت نے غدر رکھ چھوڑا تھا، جو آسمان پر تھے وہ زمین پر پٹکے جا رہے تھے۔ دلّی میں بیٹھ کر جس وقت یہ الفاظ غالب کا قلم شاید خون کے حرفوں میں لکھ رہا تھا۔

بسکہ فعّال ما یرید ہے آج ہر سلحشور انگلستاں کا
گھر سے بازار میں نکلتے ہوئے زہرہ ہوتا ہے آب انساں کا
چوک جس کو کہیں وہ مقتل ہے گھر بنا ہے نمونہ زنداں کا
شہر دہلی کا ذرہ ذرہ خاک تشنۂ خون ہے ہر مسلماں کا
کوئی واں سے نہ آسکے یاں تک آدمی واں نہ جاسکے یاں کا
میں نے مانا کہ مل گئے پھر کیا وہی رونا تن و دل و جاں کا
گاہ جل کر کیا کیے شکوہ سوزش داغہائے پنہاں کا
گاہ رو کر کہا کیے باہم ماجرا دیدہ ہائے گریاں کا

خطوط میں ایک خط غالب ہی کا ہے جس میں لکھا ہے۔

"معزول بادشاہ کے ذکور، جو بقیۃ السیف ہیں وہ پانچ پانچ روپیہ مہینہ پاتے ہیں، اُناث میں جو پیر زن ہیں وہ کٹنیاں، اور......

امرائے اسلام میں اموات گنو!

پھر طویل فہرست ان کی درج کر کے آخر میں لکھا ہے۔

"قصہ کوتاہ قلعہ اور جھجر، اور بہادر گڈھ، بلب گڈھ، اور فرخ نگر کم و بیش لاکھ کی ریاستیں مٹ گئیں، شہر کی عمارتیں خاک میں مل گئیں۔ ہنرمند آدمی کیوں پایا جائے۔"

(اردوئے معلّی ص۳۲۲)

لیکن جن انگریزوں نے مسلمانوں کو پایہ تخت دلّی سے نکالا تھا اور اس طریقہ سے نکالا تھا کہ بقول غالب

"یہاں (دلّی میں) باہر سے اندر کوئی بغیر ٹکٹ کے آنے جانے نہیں پاتا۔"

اور آخر اس خط پر تحریر ختم کی ہے کہ دلّی میں

"ابھی دیکھا چاہیے مسلمانوں کی آبادی کا حکم ہوتا ہے یا نہیں۔" (ص۲۲)

اسی دلّی سے کچھ فاصلہ پر ہانڈا کی ریاست جہاں اس زمانہ میں حضرت قاری صاحب مرحوم کا ایک مدرسہ تھا، بیان کیا گیا ہے کہ

"جب بغاوت زوروں پر تھی، تو بہتیرے انگریز مرد وزن تلاش امن میں حضرت (قاری صاحب) کے پاس آئے۔"

جس قوم کی حکومت نے مسلمانوں کو ان کے گھروں سے باہر نکالا تھا اسی ظالم قوم کے افراد امن لینے کے لیے اسلامی اخلاق کے ایک قدیم نمونے کے سامنے آتے ہیں، مذہبی جنون (فنیٹی ازم) کا بہتان مسلمانوں کے جن غریب مُلاؤں کے سر تھوپا گیا ہے اور آج تک تھوپا جارہا ہے، آنکھیں کھول کر دیکھئے وہی مُلا کھڑا ہوتا ہے۔ لکھا ہے۔

"ان سب (انگریزوں) کو اپنا مدرسہ (قاری صاحب نے) دے دیا۔

صرف یہی نہیں کیا، یہ انگریز مدرسہ میں اتارے جارہے تھے اور طلبہ و علماء جن کا مدرسہ سے تعلق تھا ان کو خطاب کرکر کے قاری صاحب فرماتے جارہے تھے:

"ان مظلوم اور بے کس انگریزوں کی مدد و حفاظت اور خاطر و مدارات لوجہ اللہ — بموجب حکم خدا اور رسول کرو۔"

پناہ مانگنے والوں نے پناہ مانگی ہے۔ ان کو اپنی ذاتی رائے کی بنیاد پر نہیں اللہ اور اس کے رسول (علیہ السلام) کے ارشاد کے مطابق پناہ دی جاتی ہے۔ یہ اسلامی کردار تھا جس کا نمونہ نازک ترین گھڑیوں میں اسلام اور اسلام کے ایک فینٹک مُلا کی طرف سے پیش ہوا تھا، اور اس کے مقابلہ میں سلف میکنگ یا خودداری پر فخر کرنے والے انگریزوں کو اسی مدرسہ میں دیکھا گیا تھا کہ

"ڈکسن نامی ایک انگریز اپنی بیوی اور نا کتخدا لڑکی سمیت چھ ماہ مدرسہ میں پناہ گزیں رہا وہ، (یعنی مسٹر ڈکسن) اور اس کی بیوی اور اس کی لڑکی، تینوں مسلمان ہوگئے تھے۔"

لیکن جب امن وامان قائم ہوگیا تو بیان کیا گیا ہے کہ چھ مہینے تک مسلمان ہونے کا اعلان کرنے والا یہی انگریز دو تین سال بعد قاری صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا، معلوم ہوا کہ اپنے آبائی دین کی طرف واپس ہوگیا، قاری صاحب نے دریافت فرمایا کہ

"پھر اس وقت تم نے مسلمان ہونے کا اعلان کیوں کیا تھا؟"
جواب میں اسی "خوددار" انگریز نے اقرار کیا تھا کہ
"محض جان کا خوف تھا اس لیے مسلمان ہو گیا تھا!"

حالانکہ ڈنکن کے سوا آپ دیکھ چکے انگریزوں کی کافی تعداد باوجود عیسائی رہنے کے قاری صاحب ہی کے مدرسے میں پناہ لیے ہوئے زندہ رہی، سب کی خورش و پوشش کا جہاں تک امکان میں تھا، نظم کیا گیا۔ سوانح نگار نے لکھا ہے اور صحیح لکھا ہے کہ

"یہ اس کی (ڈنکن) کی غلطی تھی، مسلمان ہو جانے کے لئے حضرت نے کسی پر کوئی جبر نہیں کیا تھا، اور نہ مسلمان ہو جانے والوں کے ساتھ بہ نسبت دوسرے انگریزوں کے کوئی خاص رعایت و سلوک آپ کرتے تھے۔" (ص)

یہ ڈنکن کی اخلاقی کمزوری تھی کہ بغیر ضرورت کے نفاق کے اس طریقہ کو اس نے اختیار کر لیا تھا جو اسلامی نقطۂ نظر سے کفر سے بھی زیادہ بدتر ہے، بالجبر مسلمان بنانے کا الزام مسلمانوں پر لگانے والے یہ شاید بھول جاتے ہیں کہ جبراً اسلام قبول کرنے والا یعنی دل سے تو اسلام کا منکر ہو اور زبان سے اس کی صداقت کا اقرار کرے، ایسا آدمی کافر ہی نہیں، منافق بن جاتا ہے، سمجھ میں نہیں آتا کہ بجائے کافر کے کسی کو منافق بنا لینا، یہ مسلمانوں کے نزدیک دین کا نیک کام کسی حیثیت سے بھی ہو سکتا ہے، لیکن تبلیغی کہتے چلے جاتے ہیں۔ اسی کو جو دیوانے ہیں باور بھی کر لیتے ہیں۔

حضرت قاری صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے ان انگریزوں کو اللہ اور اس کے رسول علیہ السلام کے منشاء کے مطابق اپنے مدرسہ میں پناہ دی تھی، یہ دعویٰ صرف زبان ہی سے نہیں کیا گیا تھا، بلکہ اس کے سوا اور کسی قسم کی پوشیدہ غرض اور مصلحت آپ کے سامنے نہ تھی، قدرت کی طرف سے اس کے امتحان کا بھی ایک دلچسپ نظم ہو گیا۔ اسی کتاب میں لکھا ہے کہ قیام امن کے بعد انگریزی حکومت تک جب خبر کسی طرح پہونچی کہ باندا میں انگریزوں کی کافی تعداد مسلمانوں کے ایک مُلا کی بدولت قتل ہونے سے محفوظ ہو گئی۔ تو علاقہ کے کمشنر صاحب کے نام حکومت کا پروانہ پہونچا، جس کی نقل کمشنر نے حضرت قاری صاحب کی خدمت میں باندہ بھجوائی اس میں کمشنر صاحب نے لکھا تھا۔

"ایک لاکھ روپے سالانہ کی جائداد کے آپ مستحق سمجھے گئے ہیں۔"

حکم دیا گیا تھا کہ اس انعام کے حاصل کرنے کی درخواست دیجئے۔ مولنا حالی صاحب نے چودھویں صدی اخبار (راولپنڈی) میں جو مضمون قاری صاحب کی وفات پر لکھا تھا، اسی میں اس انعام کا تذکرہ کرتے ہوئے بیان کیا ہو کہ

"حضرت نے کمشنر کے پاس جانا یا جاگیر کا لینا دونوں باتیں نامنظور فرمادیں۔"

ایک انگریز جو پناہ گزینوں میں تھا اور اسی کی کوشش سے یہ صورت پیش آئی تھی، وہ خود حاضر ہوا، لیکن اس کے شدید اصرار پر بھی بس اسی قدر فرماتے ہوئے خاموش ہو گئے۔

"لانرید منکم جزاءً ولا شکوراً (یعنی نہ بدلہ ہی کے لیے میں نے یہ کیا تھا اور نہ اس کے لیے کہ تم اس کا گن گاؤ گے) ہم نے تمہاری خدمت کسی دنیوی طمع اور لالچ سے نہیں کی تھی، بلکہ ہمارے نزدیک اس وقت تمہاری امداد اور اعانت مذہباً و اخلاقاً لازمی و ضروری تھی، اور انسانی ہمدردی کا تقاضا تھا کہ مصیبت زدوں کو حتی الوسع ہم بچاتے، مجھے حکومت سے کسی صلہ کی ضرورت نہیں، اور تمہاری ذات خاص سے بھی کچھ نہیں چاہتا، مجھے معاف رکھو۔"

مولانا حالی مرحوم نے لکھا ہے کہ اس تقریر کو سن کر انگریز کے لیے کوئی چارہ کار اس کے سوا نہ تھا کہ

"نہایت ادب کے ساتھ سلام کر کے رخصت ہو گیا۔" (تذکرہ رحمانیہ صفحہ ۳۵)

یہ یاد رکھنا چاہیے کہ یہ اس زمانہ کا قصہ ہو جب مسلمانوں کی تمام تباہیوں میں سب سے زیادہ اہم معاشی تباہیوں کے قصے تھے اور یہ ایک لاکھ کی جاگیر اس زمانہ کے کچھ ہی دن بعد دس پندرہ لاکھ کی آمدنی والی جائداد بن جاتی تھی، لیکن اللہ کے کچھ بندے اس زمانہ میں بھی تھے جو یہ بھی دیکھ رہے تھے کہ مسلمانوں پر معاش کے دروازے ایک ایک کر کے بند ہوتے چلے جاتے ہیں، مگر ان ہی حالات میں لاکھوں روپے کی جائداد کی بھی کوئی قدر و قیمت ان کی نظر میں نہ تھی، ان کی نگاہ صرف "الرزاق ذو القوۃ المتین" کے مواعید نحن نرزقک والعاقبۃ للتقوی (ہم تجھے روزی پہونچائیں گے، اور آخری انجام تو بس تقوی ہی کا ہے) پر تھی، غدر کے اس ہنگامہ کے بعد اسی دنیا میں حضرت قاری صاحب کو اپنی ناسوتی زندگی کے کم و بیش تقریباً "چالیس سال" گزارتے پڑے۔ یکے بعد دیگرے دو دو شادیاں آپ کی ہوئیں،

بکثرت بال بچے ہوئے، پانی پت کے خوشحال گھرانوں میں آپ کا بھی شمار ہوتا تھا، اچھا کھاتے، اچھا پیتے، اچھا پہنتے رہے، اور خدا کا وعدہ "نحن نرزقکم" پورا ہوتا رہتا تھا۔ یہی نہیں بلکہ معلوم ہوتا ہو کہ رزق میں اتنی کافی کشائش کی گئی تھی، کہ دس پانچ کے سوا کبھی کبھی لوگوں کو لکھے پڑھے بغیر قاری صاحب نے ہزار ہزار روپے تک بطور قرض دیے۔ لطافت اور نفاست پسندی آپ کے جبلی اقتضاؤں کے لازمی اجزا تھے۔ ٹیڑھی بچھی ہوئی چارپائی کو دیکھ نہیں سکتے تھے۔ فرمایا کرتے تھے کہ ذہنی نظام مختل ہو جاتا ہو اگر کوئی چیز بے ترتیب نظر آتی ہو، ایک طرف طبعی لطافت پسندی کا حال یہ تھا کہ لوٹے کی ٹونٹی سے پانی پینے والوں کو آپ ٹوک دیا کرتے تھے، فرماتے کہ پیالہ میں پانی نکال کر پینا زیادہ مناسب اور بہتر ہو۔ لیکن ان ہی قاری صاحب کا یہ قصہ بھی لوگ نقل کرتے ہیں کہ ایک مسلمان بھنگی عبد اللہ نامی پانی پت میں تھا، نماز کے لیے مسجد بھی آتا تھا، مسلمان اس کو روک تو نہیں سکتے تھے، لیکن لکھا ہو کہ مسجد کے لوٹوں کو چھپا دیا کرتے تاکہ عبد اللہ ان میں وضو نہ کرنے پائے۔ اس حال کا احساس قاری صاحب کو بھی ہوا۔ بیان کیا ہو کہ ایک دن مسجد میں جب لوگ بھرے ہوئے تھے، آپ نے آواز دی۔

"میاں عبد اللہ! کوئیں سے تازہ پانی کا ایک لوٹا بھر کر لاؤ۔"

عبد اللہ نے حکم کی تعمیل کی، اس کے لائے ہوئے پانی سے قاری صاحب نے وضو کیا۔ پھر ایک دن یہ کر کے بھی دکھایا کہ عبد اللہ بھنگی کو پکار کر بلا رہے ہیں، اور فرما رہے ہیں کہ بھئی! ذرا پانی تو پلاؤ۔" عبد اللہ نے بھی غضب ہی کر دیا۔

انگلیاں ڈبوتا ہوا ایک پیالہ بھر لایا، قاری صاحب نے فرمایا کہ بھائی! یہ پانی تو زیادہ ہو، کچھ تم پہلے پی لو، چند گھونٹ جب عبد اللہ پی چکا تو اسی کے جھوٹے پانی کو جو پیالہ میں رہ گیا تھا، مسجد کے مسلمانوں کے سامنے قاری صاحب کو دیکھا گیا کہ خندہ پیشانی نوش فرما رہے ہیں۔

آج چھوت چھات کے خلاف کوششوں کا ایک سلسلہ ہو جو ملک کے طول و عرض میں جاری ہو، لیکن وہ کی یہ داستان کسے سنائی جائے، کہ بنی نوع انسانی کے آخری پیغمبر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے وفادار غلام، اسی ملک میں کیسے کیسے نمونے کر کر کے لوگوں کو دکھا رہے تھے، دھتکاری ہوئی انسانیت کو جو گلوں سے لگا رہے تھے، جو گرائے گئے تھے ان ہی کو وہ اٹھا رہے تھے، اُف ان ہی پر الزام لگایا جارہا ہو کہ وہ دوسروں کو اپنے نیچے دبائے ہوئے تھے۔

الغرض ہندو مسلمان انگریز ادیبوں بچوں کے متعلق یہ اور اسی قسم کے مثالی نمونوں کا ایک دراز سلسلہ تھا جسے تقریباً (۸۱) سال کی عمر تک حضرت قاری صاحب رحمۃ اللہ علیہ اسی ہندوستان میں پیش فرماتے رہے، مولانا حالی جو ان کے تمام عقیدت مند تلامذہ میں ہیں۔ ارقام فرماتے ہیں کہ ہر جمعہ کو بڑوالی مسجد میں وعظ کہنے کا دستور تھا، قاعدہ تھا کہ وعظ کرتے ہوئے فرماتے:

"باقی انشاء اللہ آئندہ ہوگا"

لیکن آخری جمعہ جس کے بعد دنیا نے پھر آپ کا وعظ نہ سنا، ختم وعظ کے بعد حسب دستور یہ فقرہ سُنا گیا۔

"باقی بشرط زندگی"

مسجد سے گھر آئے، ہیضہ کا دورہ پڑا، شہر میں ہنگامہ برپا ہو گیا، مقامی اطباء کے سوا دیکھا گیا کہ سرہانے پر حضرت والا کے مہاراجہ پٹیالہ کے معالج خصوصی ڈاکٹر کریم اللہ بیٹھے ہوئے ہیں، آنکھیں قاری صاحب نے کھول دیں، ڈاکٹر صاحب کو دیکھ کر فرمانے لگے۔

"کیوں نہ ہو آخر محبت ہی تو ہے"

دلی سے بھی دوا آئی، یونانی اور ڈاکٹری مشورے کے تحت علاج میں زور جتنا ممکن تھا، لگایا گیا دوشنبہ کا دن تھا، عصر سے کچھ پہلے پیر بقاء اللہ صاحب کا بیان ہے کہ مولانا حالی تو زار و قطار رو رہے تھے، اور میں نے دیکھا کہ قاری صاحب کا رشتہ ناسوتی ہیکل سے ٹوٹ گیا۔

"میں نے فوراً حضرت کے دونوں قدم چوم لیے"۔ (۲۹۱)

یوں اللہ کا یہ بندہ ۱۳ ستمبر ۱۸۹۵ء مطابق ۵ ربیع الثانی ۱۳۱۳ھ کو جہاں سے آیا تھا، چلا گیا۔ اب مسلمان ان ہی پرانے مدرسوں کے ان نمونوں کو ان لوگوں میں تلاش کر رہے ہیں جن میں کہ بجائے انسانیت کے اپنی قوم، اپنے وطن، اپنی زبان، الغرض اپنی خودی کے عشق کی آگ بھڑکا دی گئی ہے۔ کلچر کے لفظ کا ایک خوش نما لفافہ ہر قوم کے ہاتھ میں تھما دیا گیا ہے، حق و ناحق، راستی و ناراستی، بھلائی اور برائی کے سارے معیار ختم کر دیے گئے ہیں، "کلچر" کے اس لفافہ میں جو کچھ بند ہے، چونکہ ہمارا ہے، اسی لیے اس پر اصرار بھی ہمارا قدرتی حق ہے، آج افریقہ کے صحرائی مردم خور باشندے بھی "کلچر" کے اسی لفافے میں بند کر کے اپنے آبا و اجداد کی ساری نا کردنیوں کو کردنی قرار دینے پر اصرار کر رہے ہیں۔

مسلمانوں میں بھی کلچری مسلمانوں کا ایک طبقہ پیدا ہو گیا ہے، خوش خیالوں کا ایک گروہ ان کو دیکھ کر شاید وقتی خوش فہمیوں کا شکار ہو رہا ہے، کہا جاتا ہے کہ "اسلامیات" یا "مسلمیات" پر خدا کا شکر ہے اب ہمارے اندر بھی فخر کرنے والے پیدا ہو گئے ہیں، لیکن کلچریت کی وجہ سے اسلام کی صداقت پر ہم کو سوچنا چاہیے واقعی اسلام کی صداقت پر امرار ہے اللھم انی اعوذ بک من الفتن ما ظہر منھا وما بطن۔

(الفرقان رجب ۱۳۶۷ھ)

حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ

(از مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی)

دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ کے تعزیتی جلسہ کی تقریر

[۱۳ جمادی الاولیٰ ۱۳۷۷ھ (۵ دسمبر ۱۹۵۷ء) کو دیوبند میں حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی نے طویل علالت کے بعد وفات پائی۔ لکھنؤ میں اس کی اطلاع پہنچنے پر دارالعلوم ندوۃ العلماء میں تعزیتی جلسہ ہوا اس میں مولانا سید ابوالحسن علی ندوی نے جو تقریر فرمائی تھی وہ اہتمام سے قلمبند کی گئی تھی، اور مولانا کی نظر سے گزرنے کے بعد جمادی الاولیٰ ۱۳۷۷ھ کے الفرقان میں شائع ہوئی تھی۔ ناظرین کرام ذیل میں اس تقریر کو ملاحظہ فرمائیں۔]

مولانا نے خطبۂ مسنونہ کے بعد فرمایا:۔

مجھے اپنی اس زندگی میں جس چیز کا بار بار تجربہ اور مشاہدہ ہوا ہے یہ ہے کہ دنیا میں سب سے زیادہ نایاب اور مشکل کام انسان کا بروقت پہچاننا ہے۔ ہر شخص اپنے اپنے تخیل اور تجربہ کے مطابق اپنے زمانہ کے مشاہیر کا ایک نقشہ اور ایک خیالی تصویر تیار کر لیتا ہے اور اس کو مقام دیتا ہے، یہاں تک کہ ایک عارف کو کہنا پڑا ہے ؎

ہر کسے از ظن خود شد یار من   وز درون من نہ جست اسرار من

لیکن بعض صورتوں میں انسان کا پہچاننا اور مشکل ہو جاتا ہے، ان میں سے ایک یہ ہے کہ جب اس پر کچھ اس طرح کے حجابات پڑ جاتے ہیں جو عام لوگوں میں معروف ہوں اور جو رواجی ہوں جن کا اپنا ایک خاص ڈھانچہ ہوتا ہے، ایسی صورت میں انسان کا پہچاننا اور مشکل ہو جاتا ہے،

مثلاً اگر کوئی شخص اہل دنیا کے لباس میں رہتا ہے تو اندر سے وہ خواہ کچھ بھی ہو لوگ اس کی اصل حقیقت سمجھنے کے قابل نہیں ہوسکتے، ہماری نگاہیں حجابات سے پار نہیں ہونے پاتیں۔

مولانا مدنی جن کے نام کے ساتھ کل تک زبان مدظلہ العالی کہنے کی عادی تھی اور اس وقت ہم رحمۃ اللہ علیہ کہنے پر مجبور ہورہے ہیں، کے سمجھنے میں ایک اور آہنی حجاب حائل ہوگیا ہے یہ ان کی سیاسی حیثیت تھی، جیسا کہ کہا جاتا ہے اور آئندہ بھی کہا، لکھا اور شائع کیا جاتا رہے گا، مولانا جنگ آزادی کے بہت بڑے قائد اور رہنما تھے۔ لوگوں کے نزدیک یہ بہت بڑی بات ہوگی اور شاید مولانا کی انتہائی تعریف اور مدح سمجھی جائے گی، لیکن ایسا نہیں ہے، مولانا کی اصل صورت وحیثیت اس کے پیچھے مستور رہی ہے اور اس حجاب نے بڑے بڑے لوگوں کی نگاہوں سے ان کو اوجھل رکھا ہے۔

اصل تو یہی ہے کہ جس نے پیدا کیا ہے وہ جانتا ہے کہ کون کیا ہے الا یعلم من خلق وھو اللطیف الخبیر لیکن کچھ لوگ ایسے ہوتے ہیں جن کو دوسری حیثیتوں کے جاننے کا تھوڑا بہت موقع ملتا ہے، ایسے لوگوں کے لیے ضروری ہوتا ہے کہ ان حجابات کو اٹھائیں اور اس شخص کی اصل صورت اور حیثیت کو سامنے لائیں، میں کہہ سکتا ہوں کہ مجھے بھی اس کا تھوڑا بہت موقع ملا ہے اور میں اپنے لیے یہ ضروری سمجھتا ہوں کہ مولانا کی زندگی کے کچھ پوشیدہ گوشے جن کو مجھے دیکھنے، سمجھنے اور جاننے کا موقع ملا ہے ان لوگوں تک پہونچاؤں جو مولانا کو اب تک کچھ اور سمجھتے رہے ہیں، میں اس وقت آپ کو سامنے رکھ کر اپنی اس آواز کو دور دور تک پہونچانا چاہتا ہوں۔

مولانا اس وقت وہاں ہیں جہاں ہماری مدح وستائش کی ان کو ضرورت نہیں، بلکہ واقعہ یہ ہے کہ ان کو اللہ تعالیٰ نے دنیا ہی میں اس مقام پر پہونچا دیا تھا جہاں انسان مدح وذم سے بے نیاز ہوجاتا ہے، اس کا تذکرہ میں اس وقت اس لیے کر رہا ہوں کہ اس کی خود ہمیں ضرورت ہے ہمیں ان کی زندگی پر نظر ڈالنی چاہیے اور اس کے مفید پہلوؤں کو اپنانا اور ان سے سبق لینا چاہیے، دوسری بات یہ ہے کہ جو باتیں میں عرض کروں گا یہ وہ ہیں جو میرے ذاتی مشاہدہ میں آئیں، ان میں کوئی مبالغہ نہیں ہے، کوئی رنگ آمیزی نہیں ہے، اس لیے کہ ان واقعات کو اس کی ضرورت نہیں ہے۔

ان کی زندگی کا سب سے پہلا امتیاز اور اعلیٰ وصف اخلاص اور للہیت ہے، افسوس یہ کہ الفاظ کثرت استعمال سے اپنی قیمت اور وزن کھو دیتے ہیں، اخلاص بھی انھیں لفظوں میں سے ہے، ہر معمولی دیندار اور ذرا پابند صوم وصلوٰۃ آدمی کو ہم مخلص کہہ دیتے ہیں، ہمارے نزدیک آدمی کی سب سے سہل تعریف مخلص ہوتی ہے، حالانکہ تاریخ کا مطالعہ بتاتا ہے کہ مخلص ہونا انسان کی آخری اور انتہائی تعریف ہے۔ ان صلوٰتی ونسکی ومحیای ومماتی للہ رب العالمین کے مقام پر پہونچنا آسان نہیں ہے، یہ مقام نبوت کا پرتو ہے، میں نے مولانا کی زندگی میں اس جوہر کو بہت نمایاں دیکھا، ایسا کام جو اخلاص ہی پر مبنی ہو اور جو عام طور پر محض اللہ ہی کے لیے کیا جاتا ہو، اور جس میں کوئی دنیاوی اور مادی نفع نہ ہو مثلاً نماز پڑھنا، اس میں اخلاص کا قائم رکھنا زیادہ مشکل نہیں، اگرچہ یہ بات بھی پورے وثوق سے نہیں کہی جاسکتی، بلکہ واقعہ یہ ہے کہ ایسے کاموں میں بھی محض خال خال اور چند ہی ایک صحیح معنی میں مخلص کہے جانے کے مستحق ہوتے ہیں، لیکن جو کام اکثر وبیشتر بلکہ تمام تر دنیاوی نفع اور فائدہ کے لیے کیے جاتے ہوں، جہاں غیر مخلصین کا مجمع ہو وہاں اخلاص کا قائم رکھنا بڑا مشکل ہے، نماز اخلاص کے ساتھ پڑھنا آسان ہے، لیکن تجارت، مزدوری، کتابوں کا لکھنا اور شائع کرنا اخلاص کے ساتھ بہت مشکل کام ہے، اور اسی لیے اللہ نے ایسے لوگوں کا خاص طور پر ذکر فرمایا ہے جو ایسے اعمال میں اپنے اخلاص کو قائم رکھتے ہیں،

رجال لا تلهيهم تجارة ولا بيع عن ذكر الله واقام الصلوٰة

مولانا کی عظمت کا راز یہ نہیں تھا کہ وہ کوئی بڑے مقرر تھے، میں آپ کے سامنے صاف کہتا ہوں کہ مولانا کوئی جادو بیان اور شعلہ بار مقرر نہیں تھے، بلکہ وہ بقدر ضرورت ہی تقریر کرتے تھے، لوگ مولانا کے سامنے اس لیے نہیں جھکتے تھے کہ وہ کوئی بڑے مصنف تھے، مولانا کا شمار ملک کے نامور ومتاز مصنفین میں نہیں، ہر شخص ان کے سامنے چھوٹا نظر آتا تھا اس لیے نہیں کہ دنیا میں ان کا جیسا کوئی عالم نہیں، میں اس کے کہنے میں کسی معذرت کی ضرورت نہیں سمجھتا اور نہ اس میں مولانا کی کوئی تنقیص ہے، بہت بڑا عالم ہو جانا کوئی بڑا کمال نہیں، جو ذرا محنتی، ذہین اور فہیم ہو اور اس کو مطالعہ کا موقع ملے ایک بڑا عالم بن سکتا ہے،

مولانا کی بڑائی کا راز یہ ہے کہ وہ سرتا پا اخلاص تھے، وہ اپنے ہر کام میں اور ہر وقت مخلص تھے، ان کا ادنیٰ سے ادنیٰ اور معمولی سے معمولی اور غیر دینی سے غیر دینی کام اخلاص کے ساتھ ہوتا تھا، ان کی ساری سیاسی جد و جہد محض ابتغاء رضوان اللہ تھی، وہ صرف اس لیے اس میں منہمک رہے کہ وہ اس کو رضائے الٰہی کا ذریعہ سمجھتے تھے، وہ اس سے قرب الٰہی چاہتے تھے، وہ ان کے لیے "سلوک" بن گیا تھا، یہ ان کے لیے جہاد تھا اور وہ اس میں شرکت سے محض تقرب یا جہاد چاہتے تھے، جس نیت سے وہ رات کو تہجد پڑھتے تھے، آپ یقین کریں کہ اسی نیت سے وہ اسٹیج پر تقریر کرتے تھے، وہ وہاں اسی نیت کے ساتھ مشغول رہتے تھے جس نیت سے وہ نوافل پڑھتے تھے، جو ثواب ان کو تہجد کی آٹھ یا دس رکعتوں میں ملتا ہوگا وہ ان کو رات کے کسی جلسہ کی شرکت میں ملتا ہوگا۔ جس طرح مجاہد میدان جنگ میں جاتا ہوگا اسی نیت سے وہ جیل خانے جاتے رہے ہوں گے، یہ آسان کام نہیں، یہ مقام وہ ہے جو صرف اہل اللہ کو بھی نہیں؛ کاملین اولیاء اللہ ہی کو حاصل ہوسکتا ہے۔ ایک منٹ کے لیے اپنے کو ایسے ماحول میں اللہ کے قریب سمجھنا مشکل ہوتا ہے چہ جائیکہ وہاں انھوں نے گھنٹوں، دنوں، مہینوں اور سالوں اپنے کو اللہ کے ساتھ مشغول رکھا، اس کی علامت یہ ہے کہ ان کو ان کی یہ سیاسی مشغولیت ان کیفیات سے دور نہیں کرتی تھی جو اس سے علاحدہ ہوتی تھیں، جس اسٹیج پر وہ ہوتے تھے وہاں اکثر وہ لوگ بھی ہوتے تھے جنھیں نماز کا بالکل خیال بھی نہیں ہوتا تھا اور بعض اوقات اکثریت غیر مسلموں کی ہوتی تھی، لیکن وہ جلسہ سے اٹھ کر کسی مسجد میں تشریف لے جاتے، وہاں اگر نماز ہوچکی ہے، کسی دوسری مسجد میں تشریف لے جاتے، جہاں جماعت ملتی وہاں پڑھتے، کہیں نہ ملتی تو اپنی علاحدہ جماعت کرتے، یہ ایک مثال ہے۔ اس طرح کے سیکڑوں واقعات ہیں جو ان کی زندگی میں پھیلے ہوئے ہیں اور ان کے اخلاص وللّٰہیت اور اللہ کے ساتھ انتہائی تعلق اور مشغولیت کی دلیل ہیں، اور یہ میں پہلے عرض کرچکا ہوں کہ یہ آسان کام نہیں یہ ان کی زندگی کا پہلا جوہر ہے جس نے ان کو وہ بلندی عطا کی جو ان کے سیاسی معاصرین میں کسی کو نہیں ملی۔

اس اخلاص کی ایک بڑی علامت یہ ہے کہ انھوں نے اپنی اس سیاسی جد و جہد میں شروع سے حصہ لیا اور اس وقت تک حصہ لیتے رہے جب تک اس کی ضرورت تھی، لیکن جب ضرورت

پوری ہوگئی اور وقت اور موقع آیا اس محنت کی قیمت وصول کرنے کا، تو انھوں نے ہاتھ کھینچ لیے
ایک وقت ہوتا ہے مزدوری کا، ایک مزد کا، مزدوری پوری کی مسلسل کی اور محنت و مشقت سے
کی، لیکن اجرت وہاں کے لیے اٹھا رکھی جہاں وہ اب ہیں، جب آزادی کا درخت لگایا جا رہا
تھا اور اس کی آبیاری کے لیے خون پسینہ کی ضرورت تھی، وہ پیش پیش تھے، لیکن جب اس
درخت کے پھل کھانے کا وقت آیا اس وقت وہ اللہ کا بندہ اتنی دور جا بیٹھا جہاں اس کی ہوا بھی
نہ لگ سکے، وہ آزادی سے پہلے بھی ایک مدرس تھے اب بھی وہی مدرس رہے، پہلے بھی ایک مختصر
سی تنخواہ پاتے تھے اب بھی وہی پاتے رہے، آزادی کی جد وجہد کے رفیقوں اور ہم سفروں میں
وہی ایک شخص تھے جن کا دامن دنیاوی منفعت کے داغ اور آلودگی سے پاک رہا اور بلاواسطہ
اور بالواسطہ وہ کسی طرح اپنے صاحب اقتدار و با اختیار رفیقوں کے ممنون نہیں ہوئے۔

۲۔ مولانا کی زندگی میں دوسرا نمایاں وصف ان کا عزم و عالی ہمتی تھی، مسلمانوں میں بالعموم
اور طبقۂ علماء میں بالخصوص قوت ارادی کی بڑی کمی نظر آتی ہے، دماغی اور ذہنی حیثیت سے بڑے
بڑے ممتاز لوگ ہوں گے اور ہیں، لیکن یہ جوہر نایاب ہے، دینی و علمی حلقہ میں مولانا جس چیز میں
ممتاز تھے وہ بلند حوصلگی ہے، جس چیز کو رضائے الٰہی کے لیے ضروری سمجھا اس کو انھوں نے بڑی
خوش دلی اور خندہ پیشانی کے ساتھ جھیلا اور برداشت کیا بلکہ دعوت دی خواہ وہ کیسی ہی تکلیف دہ
صبر آزما اور ہمت شکن ہو، انھوں نے اس وقت کئی کئی برس جیل کاٹے ہیں جب جیل جانا آسان کام
نہیں تھا، اکثر ایسا ہوتا ہے کہ انسان کسی بڑی چیز اور بظاہر زیادہ سخت چیز کا مقابلہ کر لیتا ہے، لیکن
بعض چھوٹی چھوٹی باتوں سے قدم ڈگمگا جاتے ہیں، حکومت سے ٹکر لینا اور اس کی سختیوں اور مظالم
کو برداشت کرنا آسان ہے لیکن بعض گھریلو معاملات اور گھریلو تعلقات کے سامنے پاؤں پھسل جاتے
ہیں، لیکن مولانا نے ہر چیز کا مقابلہ کیا، انھوں نے کوئی کام اپنی زندگی میں اس لیے چھوڑنا کیا معنی
ملتوی نہیں کیا کہ وہ مشکل ہے، ہم آپ سب جانتے ہیں کہ وہ کثرت سے سفر کرتے تھے، سیاسی و
غیر سیاسی، دینی و غیر دینی حلقہ میں شاید ہی کوئی ایسا ہو جس نے ان کے برابر سفر کیے ہوں، پھر ان
سفروں میں لوگوں سے ملنا، باتیں کرنا، تقریریں کرنا، معمولات کا پورا کرنا، جو لوگ مولانا سے قریب
رہے ہیں وہ ان کے جوہر سے کسی قدر واقف ہیں۔ لوگوں کی دل جوئی اور محبین کی خوشی کے لیے

بڑے بڑے مشکل اور طویل سفر اپنے ذمہ لے لیتے، جگہ جگہ ٹھیرتے اور عزیزوں اور دوستوں کی فرمائشیں پوری کرتے، نہ بڑھاپا ان کے لیے رکاوٹ تھا، نہ بیماری، نہ مصروفیت، پھر مختلف بلکہ متضاد مشاغل اور ذمہ داریوں کا جمع کرنا بغیر اعلیٰ درجہ کے عزم اور قوت ارادی کے ممکن نہ تھا، مولانا کو وہ عزم اور طبیعت کا استقلال ملا تھا جو ملکوں اور قوموں کی زندگی میں بڑے بڑے تغیرات پیدا کر دیتا ہے، مگر افسوس کہ اس سے پورا فائدہ نہ اٹھایا جا سکا۔

۳۔ دینی انہماک اور دینی مصروفیت، اس کا اندازہ وہی لوگ کر سکتے ہیں جو ان سے کچھ قریب رہے ہیں، ایسا مسلسل اور انتھک کام کرنے والا، اور نہ اکتانے اور نہ گھبرانے والا انسان کم نظر آیا ہوگا، واقعہ یہ ہے کہ جو مولانا کی مصروفیت کو دیکھتے تھے وہ گھبرا جاتے تھے اور پریشان ہو جاتے تھے کہ مولانا اتنا کام کیسے کرتے ہیں، سیکڑوں آدمیوں سے ملنا، درجنوں مہمانوں کی خاطر مدارات کرنا، ایک ایک سے اس کے مطلب اور ضرورت کی بات کرنا، حتیٰ کہ تعویذ چاہنے والوں کو تعویذ دینا، پھر اسی میں حدیث کے درس کی تیاری کرنا اور کبھی کبھی دو وقت، صبح شام، ظہر بعد عشا، بعد دیر رات تک درس دینا، اور درس بھی ایسا عالمانہ و فاضلانہ جو ان کے منصب کے مطابق تھا، پھر خطوط کا جواب دینا، جب تک خود لکھ سکنے کے قابل رہے خود ہی جواب لکھتے رہے، آخر میں دوسروں سے لکھوانے لگے تھے، لیکن پھر بھی بہت سے خطوط اپنے قلم سے لکھتے، میرا خیال ہے کہ دینی شخصیتوں میں سے کسی کے پاس اتنی ڈاک نہ آتی ہوگی جتنی مولانا کے پاس آتی تھی اس لیے کہ مولانا کی حیثیت سیاسی لیڈر کی بھی تھی، شیخ طریقت کی بھی تھی اور ایک عالم دین کی بھی تھی، مہمانوں کا اکرام کرنا، ایک ایک شخص کی طرف خصوصی توجہ، اس کی ضرورت پوری کرنا اور وہ بھی پوری بشاشت، انبساط و انشراح کے ساتھ، کرامت نہیں تو اور کیا ہے، واقعہ یہ ہے کہ دینی امور میں اتنا انہماک و سرگرمی، یا تو میں نے مولانا الیاس صاحبؒ میں دیکھی یا مولاناؒ میں، مولانا الیاسؒ میں اپنے رنگ میں اور مولاناؒ میں اپنے رنگ میں، رات کو دس بجے کہیں سفر سے واپس آئے، اسی وقت طلبہ کو اطلاع ہوئی کہ درس ہوگا، کیسی نیند، کہاں کا تکان، پورے نشاط کے ساتھ درس دیا، اسی میں طلبہ کے سوالات کے جوابات اور وہ بھی غیر متعلق سوالات کے جوابات ـــــ آپ تعجب سے سنیں گے کہ حج کے سفر سے واپس آئے ہیں جس سفر کے بعد مہینوں لوگ تھکن اتارتے ہیں، اور کس طرح آئے ہیں کہ راستہ میں

ہر بڑے شخص، متعلقین و محبین سے معانقہ کرتے، مزاج پوچھتے، ملاقات کرتے آئے ہیں، آتے ہی حکم ہوا کہ سبق ہوگا، بتائیے سیاسی لیڈروں میں یہ واقعہ مل سکتا ہے کہ مشاہیر عصر میں؛ بغیر انتہائی تعلق مع اللہ کے یہ ممکن نہیں، یہ ہیں وہ کرامتیں جو بڑی بڑی حسی کرامتوں سے بدرجہا بلند ہیں۔

مولانا کا چوتھا بڑا وصف ان کی آدمیت اور انسانیت ہے، آدمیت ایک خاص لفظ ہے اور خاص معنی میں بولا جاتا ہے، معمولی بات نہیں ع

آدمی کو بھی میسر نہیں انساں ہونا

حضرت مرزا مظہر جان جاناںؒ جب کسی کی بڑی تعریف کرتے تو فرماتے "وہ نسخۂ آدمیت" ہے۔ ایک شخص کی وفات ہوئی تو فرمایا "مرد ند و آدمیت بخاک بردند" آج مولانا کے بارے میں بھی یہی جملہ بجا طور پر دوہرایا جاسکتا ہے، مولانا کی اس صفت و خصوصیت کا اندازہ ان کے مکارم اخلاق سے ہوتا ہے، وہ دوسروں کو حتیٰ کہ معاندین و مخالفین تک کو نفع پہونچانے کی کوشش کرتے، خود تکلیفیں برداشت کر رہے ہیں لیکن دوسروں کی چھوٹی چھوٹی ضرورتوں کی فکر کر رہے ہیں، ایسا بھی ہوا ہے کہ کوئی مہمان تھکا ماندہ کہیں سے آیا ہوا رات کو سو رہا ہے اور مولانا اس کے پیر دبا رہے ہیں، مہمان کے تصور میں بھی نہیں تھا کہ یہ پیر دبانے والے مولانا ہو سکتے ہیں اور یہی نہیں جنھوں نے ان کو تکلیفیں پہونچائیں، مولانا نے ان کے ساتھ سلوک و احسان کیا اور ہمیشہ نفع رسانی اور خدمت کی فکر میں رہتے، اور جب بھی اور جس طرح بھی موقع ملا ہے اس کو آرام و نفع پہونچایا ہے، دوسروں سے اگر اس کو کام پڑا ہے تو سفارش کی ہے، خود جا سکے تو جا کر کی ہے، پیغام کے ذریعہ سے ممکن ہوا تو پیغام بھیجا ہے، جس کے جیسے حقوق ہوتے اور جس کا جیسا مرتبہ ہوا اور جس کو جیسی ضرورت ہوئی اسی کے شایان شان پورا کیا ہے، براہ راست ان مخالفین کو ضرورت پڑی تو ان کی ضرورت پوری کی اور اگر ان کے عزیزوں میں سے کسی کو ضرورت ہوئی ہے تو ان کی کاربرآری کی اور ان کے واسطے سے اپنے ان معاندین کی راحت رسانی کی، انھوں نے اپنے مخالفین و معاندین کو معاف بھی کیا، ان کے لیے دعائیں بھی کرتے تھے، ان کا عمل وہ تھا جو کسی عارف نے کہا ہے۔

ہر کہ مارا یار نہ بود ایزد اورا یار باد	ہر کہ مارا رنج دادہ راحتش بسیار باد
ہر کہ در راہ منم خار نہد از دشمنی	ہر گلے کز باغ عمرش بشگفد گلزار باد

ہماری آپ کی بدقسمتی تھی کہ ہم نے جانا نہیں کہ وہ کیسے باطنی مراتب پر فائز تھے اس کا اندازہ وہی کرسکتے ہیں جو اس کوچہ سے واقف ہوں، اور جو اس کا احساس رکھتے ہوں، وقت کے عارفین واہل نظر کی زبان سے میں نے ان کے لیے بڑے بلند کلمات سنے ہیں، اور ان سب کو ان کی عظمت وبلندی کا معترف اور ان کی مدح وتوصیف میں رطب اللسان پایا ہے، مولاناؒ اپنے زمانہ میں ڈاکٹر اقبالؒ کے ان اشعار کا کامل نمونہ ومصداق تھے ؎

ستر دیں ما را خبر او را نظر　　او درون خانہ ما بیرون در
ما کلیسا دوست ما مسجد فروش　　او ز دست مصطفےٰ پیمانہ نوش
ما ہمہ عبد فرنگ او عبدہ　　او نگنجد در جہان رنگ و بو

ڈاکٹر صاحب نے کبھی کہا تھا ؎

یا وسعت افلاک میں تکبیر مسلسل　　یا خاک کی آغوش میں تسبیح ومناجات

مولانا کا عمل پہلے مسلک پر تھا، یہ واقعہ ہے کہ وسعت افلاک میں مولانا کی زندگی تکبیر مسلسل تھی۔

یہ میں کہوں گا کہ مولانا معصوم نہیں تھے، ایسا نہیں ہے کہ ان سے کوئی غلطی نہ ہوئی ہو ضروری نہیں کہ ان کی تمام سیاسی اور اجتہادی آراء ونظریات میں ان سے اتفاق کیا جائے۔ لیکن یہ میں ضرور کہوں گا کہ جو کچھ انھوں نے کہا یا کیا محض رضائے الٰہی اور حمیت دینی میں، ان کے لیے کوئی دنیاوی محرک یا مصلحت نہ تھی۔

مولاناؒ کا چھٹا بڑا وصف ان کا اپنے بزرگوں، اساتذہ اور شیوخ سے عاشقانہ تعلق ہے، واقعہ یہ ہے کہ یہ ان کی شخصیت کی کنجی ہے، اور ان کی ساری زندگی اور اس کے اہم اور عظیم واقعات کا راز یہ ہے، یہ چیز ایسی تھی جو ان کے رگ وپے میں سرایت کرگئی تھی، ان کا یہ تعلق ان کو بعض ایسی چیزوں پر آمادہ کر دیتا تھا جو ان کے عام اخلاق وصفات کے خلاف ہوتیں، اور بعض دفعہ سمجھ میں نہ آتیں کہ یہ کیسے ہوا، یہ بات بہت کم لوگوں کو معلوم ہوگی کہ مولانا اپنی بڑی سے بڑی توہین اور اذیت برداشت کرسکتے تھے مگر اپنے اکابر واسلاف اور شیوخ واساتذہ کی تنقیص اور ان کا استخفاف برداشت نہ کرسکتے تھے، بعض مرتبہ یہ چیز ان کی شدید بیزاری ومخالفت کا سبب بن جاتی، آخر میں اپنے اسلاف کی امانت کی حفاظت اور ان کے نقش

قدم پر چلنے اور ان کے مسلک پر قائم رہنے کا جذبہ بہت شدید ہو گیا تھا، اور وہ اس راستہ سے بال برابر ہٹنا گوارا نہیں کرتے تھے، اسی طرح سے خلاف شریعت فعل کے دیکھنے کا تحمل نہیں رہا تھا، اور یہ تاثر ان کے عام اخلاق پر بھی غالب آ گیا تھا۔

مولانا کا ایک بہت بڑا کارنامہ جس کی اہمیت کا احساس بہت کم لوگوں کو ہے یہ ہے کہ ۱۹۴۷ء کے ہنگامہ میں اور اس کے بعد ہندوستان میں مسلمانوں کے بقا و قیام کا ایک بڑا ظاہری سبب مولانا ہی کی ہستی تھی، یہ وہ وقت تھا کہ بڑے بڑے کوہ استقامت جنبش میں آ گئے تھے، سب یہی سمجھتے تھے کہ اب ہندوستان میں مسلمانوں کا کوئی مستقبل نہیں، مسلمانوں کی تاریخ میں دو ہی چار ایسے دور گزرے ہیں جب مسلمانوں کے اور اسلام کے بقا کا سوال آ گیا ہے، ۱۹۴۷ء کا ہنگامہ ہندوستان کے مسلمانوں کے حق میں اسی نوعیت کا تھا، اصل مسئلہ سہارنپور کے مسلمانوں کا تھا، سارا دارومدار ان پر تھا، یہ اپنی جگہ چھوڑتے تو یوپی کے مسلمانوں کے قدم لغزش میں آ جاتے، اور سہارنپور کے مسلمانوں کا انحصار سارا کا سارا دو ہستیوں حضرت مولانا عبدالقادر صاحب رائے پوری مدظلہ اور حضرت مولانا مدنیؒ پر تھا، اس وقت مسلمانوں کی قسمت کا فیصلہ جمنا کے کنارے ہونا تھا لیکن یہ دو صاحب عزم مجاہد بندے وہاں جمے رہے، اور انھوں نے گھٹنے ٹیک دیے، ایک رائے پور کی نہر کے کنارے بیٹھ گیا اور ایک دیوبند میں، آپ کو معلوم ہو گا یہ رائے پور و دیوبند مشرقی پنجاب کے ان اضلاع سے جہاں کشت و خون کا ہنگامہ گرم تھا، متصل ہیں، لیکن یہ اللہ کے بندے پورے عزم و استقلال کے ساتھ جمے رہے اور انھوں نے مسلمانوں کو یقین دلایا کہ اسلام کو یہاں رہنا ہے اور رہے گا، انھوں نے کہا مسلمانوں کا یہاں سے نکلنا صحیح نہیں، اگر تم مشورہ چاہتے ہو تو ہم مشورہ دیتے ہیں اور اگر فتوے کی ضرورت ہے تو ہم فتویٰ دینے کو تیار ہیں کہ یہاں سے اس وقت مسلمانوں کا نکلنا درست نہیں، اس وقت جو ہندوستان میں اسلام و مسلمان قائم ہیں یہ انھیں بزرگوں کا احسان ہے، ہندوستان میں اس وقت جو مسجدیں قائم ہیں اور ان میں جو نمازیں پڑھی جا رہی ہیں اور پڑھی جاتی رہیں گی یہ ان کا طفیل ہے، ہندوستان میں جتنے مدرسے اور خانقاہیں قائم ہیں اور ان سے جو فیوض و برکات صادر ہو رہے ہیں اور ہوتے رہیں گے انھیں کے رہین منت ہوں گے، اور اس سب کا ثواب ان کے اعمال نامے میں لکھا جاتا رہے گا، اس سلسلہ میں

مولانا حسین احمد صاحبؒ نے سارے ملک کا دورہ بھی کیا، ایمان آفریں اور ولولہ انگیز تقریریں کیں، اور اپنے ذاتی اثر و رسوخ، اپنی تقریروں اور خود اپنے طرز عمل سے مسلمانوں کو اس ملک میں رہنے، اپنے ملک کو اپنا سمجھنے اور حالات کا مقابلہ کرنے پر آمادہ کیا۔

یہ بات میں اور واضح کردوں کہ مولانا کے بارے میں لوگوں کو یہ بڑا مغالطہ ہے کہ وہ موجودہ حالات سے کلی طور پر مطمئن تھے، قریب کے لوگ جانتے ہیں کہ مولانا کے سینہ کے اندر کیسا درد و سوز کیسے اسلامی جذبات اور کیسی دینی حمیت موجزن تھی، اور ان کے اندرونی احساسات کیا تھے، مسلمانوں کی بدقسمتی ہے کہ ان کو مولانا کے ان جذبات اور اندرونی احساسات اور ملت اسلامیہ اور اس کے مسائل کے ساتھ گہرے تعلق اور درد و سوز کا اندازہ نہ ہوسکا، اور مولانا کی زندگی کا یہ پہلو جتنا روشن اور معروف ہونا چاہیئے تھا روشن اور عام طور پر معروف نہ ہوسکا، آزادی کے بعد جو خلاف توقع حالات و تغیرات اس ملک میں پیش آئے، انھوں نے مولانا کی طبیعت کو بہت افسردہ کردیا تھا، ان کی عمر کا بہترین زمانہ اور ان کی بہترین قوتیں انگریزی حکومت کا مقابلہ کرنے میں صرف ہوچکی تھیں اور اس معرکہ میں وہ کامیاب ہوچکے تھے، اب ان کی ضعیفی افسردگی اور بے تعلقی کا زمانہ تھا، آخر میں ان کی تقریروں کا موضوع اور دعوت صرف ذکر کی تلقین کرنا، خاتمہ کی فکر کی طرف متوجہ کرنا، تعلق مع اللہ اور ایمان باللہ کو مضبوط کرنا دینی شعائر کا احیا، اور سنت نبویہ کی کثرت سے ترویج و اشاعت رہ گئی تھی۔ انھوں نے اپنے عالی مرتبہ شیوخ و اساتذہ سے تعلق مع اللہ، استقامت علی الشریعت اور باطنی مشغولیت کی جو دولت حاصل کی تھی، تمام اسفار و مشاغل و ہجوم خلائق درس و تدریس کی مصروفیت، اور آخر آخر میں علالت کی شدت میں بھی وہ اسی میں مشغول تھے، اور روز بروز وہ ہر چیز پر غالب آتی جارہی تھی، زندگی کے آخری ایام تک نماز کھڑے ہوکر اور باجماعت ادا کی، یہ ناچیز آخری بار ۵ر نومبر کو یعنی وفات سے صرف گیارہ روز پہلے حاضر ہوا، سخت تکلیف اور بے حد ضعف تھا، یہ وہی دن تھا جس دن ڈاکٹر صاحب نے تفصیلی معائنہ کرکے یہ کہا تھا کہ مولانا صرف اپنی قوت ارادی سے زندہ ہیں، اور ہمارا فن اس علالت کے سامنے ناکام ہے، اسی روز بھی مولانا نے ظہر کی نماز کھڑے ہوکر اور باہر آکر جماعت کے ساتھ ادا کی مولانا کی خدمت میں

جب حاضری ہوئی تو پوری بشاشت اور استقلال کے ساتھ گفتگو فرمائی۔ ایک کتاب کے پہونچنے کا ذکر کیا، میں نے عرض کیا: مجھے معلوم ہوتا کہ علالت وضعف اس درجہ تک پہنچ گیا ہے تو کبھی اس کے پیش کرنے کی جرأت نہ کرتا، فرمایا کیوں؟ میں نے تو کئی صفحات کا مطالعہ کیا، اور لفنس کتاب بھی بڑی نعمت ہے، اسی مجلس میں ایک مخلص نے جو باہر سے ملنے آئے تھے روتے ہوئے کہا کہ دنیا خالی ہوتی جا رہی ہے، فرمایا نہیں۔ دنیا میں بہت لوگ ہیں! انھوں نے عرض کیا کہ ہمیں دوسروں سے کیا تعلق؟ فرمایا ہمیں تو امت محمدی سے تعلق ہے۔

مولانا نے امت محمدی کی خدمت میں اپنی طرف سے کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کیا، انھوں نے اپنے اللہ سے جو وعدہ کیا تھا اور اپنے اسلاف سے جو امانت، اور ذمہ داری پائی تھی اس کو پورا کر گئے، ان کو نہ ستائش کی تمنا ہے، نہ صلہ کی پرواہ، نہ مدح وتوصیف کا انتظار ہے نہ ناسپاسی اور ناشناسی کا گلہ، وہ مسلمانوں کو خطاب کر کے کہہ سکتے ہیں۔

فقیرانہ آئے صدا کر چلے   میاں خوش رہو ہم دعا کر چلے
جو تجھ بن نہ جینے کو کہتے تھے ہم   سو اس عہد کو ہم وفا کر چلے

(الفرقان بابت جمادی الاولیٰ ۱۳۹۳ھ)

ٹیلیگرام:
BATRANS
بمبئی
آندھرا
ٹرانسپورٹ
کمپنی
ٹرانسپورٹ کنٹریکٹرس
ٹیلیفون: 320169 — 322027
۱۱۳، بھنڈاری اسٹریٹ، بمبئی ۳

محمد منظور نعمانی

اُمت مسلمہ کا مقصد اور تبلیغی جد وجہد

ایک تبلیغی اجتماع کی تقریر

الحمد لله الذی هدنا لهذا وما کنا لنهتدی لولا ان هدانا الله لقد جاءت رسل ربنا بالحق۔

میرے دینی بھائیو اور دوستو! میں پہلے آپ سے ایک سوال کرنا چاہتا ہوں، اور اس کا جواب بھی آپ کی طرف سے میں خود ہی دوں گا۔ اور مجھے یقین ہے کہ میرا جواب آپ کے ضمیر کے بالکل مطابق ہوگا اور آپ اُس سے بالکل متفق ہوں گے۔

وہ سوال یہ ہے کہ امت مسلمہ یعنی دنیا میں مسلمان کہلانے والوں کی جو ایک وسیع قوم ہے جس کے ہم اور آپ افراد ہیں اُس کے وجود کا مقصد کیا ہے، اور وہ اس دُنیا کی کس ضرورت اور کس کمی کو پورا کرنے کے لیے پیدا کی گئی ہے؟

یہ سوال بالکل واضح ہے لیکن اگر اس کے باوجود بعض بھائیوں کو اس کا سمجھنا مشکل ہو رہا ہو تو انھیں اُصولی طور پر پہلے اس بات کو سمجھ لینا چاہیے کہ اس دنیا میں جو چیز بھی ہے اس کے وجود کا کوئی نہ کوئی خاص مقصد ضرور ہے، اور اس کی قدر وقیمت اسی وقت تک رہتی ہے جب تک کہ اس سے وہ مقصد پورا ہو۔ اگر وہ اپنا مقصد پورا کرنے کے لائق نہ رہے یا پورا نہ کرے تو اس کی وہ قدر وقیمت باقی نہیں رہتی — میرے سامنے یہ میکروفون ہے، آپ جانتے ہیں کہ اس کا مقصد یہ ہے کہ بولنے والے کی آواز اس کے ذریعہ دور تک پہونچ جائے، یہ اسی ضرورت کو پورا کرتا ہے، اب اگر اس میں کوئی ایسی خرابی آجائے کہ یہ مقصد اس سے پورا نہ ہوسکے تو پھر اس کی کوئی قیمت نہیں، اسی طرح

بجلی کے یہ بلب جو یہاں لگے ہوئے ہیں، ان کا مقصد یہ ہے کہ ان سے روشنی کی ضرورت پوری ہو، اب اگر کوئی بلب ان میں سے فیوز ہو جائے اور وہ روشنی دینے کے لائق نہ رہے تو وہ کوڑے پر پھینک دیا جائے گا اور کوئی دو پیسے میں بھی اسے خریدنے پر تیار نہ ہوگا ـــــ یہی حال دنیا کی ساری چیزوں کا ہے، کہ ہر چیز کسی خاص مقصد کے لیے ہے، اور اس کی قدر و قیمت جب ہی تک ہے جب تک اس سے وہ مقصد پورا ہو۔

میں سمجھتا ہوں کہ اس وضاحت کے بعد سب بھائیوں نے میرے اس سوال کا مطلب سمجھ لیا ہوگا، اب ذرا اس کے جواب پر غور کیجیے!

یہ تو ظاہر ہے کہ ہم اس دنیا میں صرف کھانے پینے اور نسل بڑھانے کے لیے نہیں پیدا کیے گئے ہیں۔ یہ سب کام تو جانور بھی کرتے ہیں اور ہم سے زیادہ کرتے ہیں ـــــ اسی طرح دنیا کے لیے نئی نئی ایجادیں کرنا اور تمدن کو ترقی دینا، یا تجارت اور زراعت اور صنعت وغیرہ کے ذریعہ دنیا کی دولت میں اضافہ کرنا اور ضروریات کی پیداوار بڑھانا بھی ہمارے وجود کا اصل مقصد نہیں ہو سکتا۔ یہ سارے کام غیر مسلم بھی ہمیشہ کرتے رہے ہیں اور آج بھی کر رہے ہیں، اور اگر آج دنیا میں مسلمان نہ رہیں تو ان میں سے کوئی کام بھی بند نہ ہوگا ـــــ اس دنیا میں بہت سے ایسے علاقے اور ایسے ملک ہیں جہاں مسلمانوں کی آبادی نہیں ہے لیکن وہاں بھی یہ سارے کام ہو رہے ہیں۔ خود ہمارے ملک میں مشرقی پنجاب کے اکثر ضلعے تقسیم کے بعد سے مسلمانوں سے بالکل خالی ہو گئے ہیں، لیکن وہاں ان میں سے کوئی کام بھی رُکا نہیں پڑا ہے، تجارت کا بازار گرم ہے، کارخانے دھوم سے چل رہے ہیں۔ کھیتیاں ہو رہی ہیں، نئے نئے فارم قائم ہو رہے ہیں، بند باندھے جا رہے ہیں، نہریں نکالی جا رہی ہیں، غرض کہ مسلمانوں کے نہ ہونے سے ان میں سے کوئی کام بھی نہ تو بند ہوا ہے اور نہ اس میں کوئی خاص کمی آئی ہے، اس لیے میری یہ بات صحیح ہے کہ ان میں سے کوئی چیز بھی ایسی نہیں ہے جس کو مسلمانوں کے وجود کا مقصد کہا جا سکے ـــــ پھر آخر اس اُمت کے وجود کا کیا مقصد ہے، اور یہ دُنیا کے کس مرض کی دوا ہے؟

اس اہم سوال کے جواب میں میں اپنی طرف سے اور آپ کی طرف سے عرض کرتا ہوں کہ اس اُمت کے وجود کا اصل مقصد یہ ہے کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر سلسلۂ نبوت ختم ہو جانے

کہ یہ دنیا میں نبیوں والے کام کو جاری رکھے یعنی اس کے وجود سے دنیا میں ایمان اور خدا پرستی والی زندگی کی شمع روشن رہے اور یہ اس کے فروغ کے لیے اور انسانوں کو اللہ کی بندگی والی مبارک زندگی میں لانے کے لیے اور ان کو "عباد اللہ الصالحین" بنانے کے لیے جد و جہد کرتی رہے۔

امت کے اسی مقصد وجود کا اعلان قرآن مجید میں ان الفاظ میں فرمایا گیا ہے: كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَتُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ ۃ

دوسری جگہ ارشاد ہے۔ وَكَذَٰلِكَ جَعَلْنَاكُمْ أُمَّةً وَسَطًا لِتَكُونُوا شُهَدَاءَ عَلَى النَّاسِ ۃ

ان آیتوں کا حاصل اور مدعا یہی ہے کہ اس دنیا میں مسلمانوں کے وجود کا مقصد بس یہ ہے کہ وہ خود ایمان اور ایمانی زندگی کے حامل ہوں اور انسانی دنیا کو اللہ کے اس نور سے منور کرنے کے لیے جد و جہد کرتے رہیں۔

صحابۂ کرام نے اس مقصد کو خوب سمجھا تھا، وہ جب روم و ایران کے شاہی درباروں میں اسلام کے سفیر بن کر گئے اور وہاں اُن سے پوچھا گیا کہ تمہارے یہاں آنے کا اصل مقصد کیا ہے اور کیا غرض تم کو یہاں لے کر آئی ہے؟ تو انھوں نے جواب دیا کہ ہم خود نہیں چلے آئے ہیں، بلکہ اللہ نے ہم کو اس کام کے لیے اٹھایا اور کھڑا کیا ہے کہ ہم اللہ کے بندوں کو دوسروں کی پرستش سے نجات دلا کر خدائے واحد کا پرستار بنائیں اور جو نور ہدایت اور جو خزینۂ سعادت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وساطت سے ہم کو ملا ہے اس میں ہم اللہ کے سب بندوں کو شریک کریں بس یہی ہمارے یہاں آنے کا مقصد و باعث ہے، اور اللہ نے ہمیں اسی کے لیے کھڑا کیا ہے اور اب بس یہی ہمارا مقصد حیات ہے۔

صحابۂ کرام کا یہ صرف زبانی بیان اور قال ہی نہیں تھا، بلکہ یہی ان کا حال بھی تھا، میں یقین کے ساتھ کہتا ہوں کہ اگر کوئی شخص ۲۴ گھنٹے بھی ان میں سے کسی کے ساتھ رہتا تو ان کے بارہ میں یہی شہادت دیتا کہ انھوں نے اپنے وجود اور اپنی زندگی کا مقصد بس یہی سمجھا ہے اور اسی سانچہ میں اپنے کو ڈھال لیا ہے۔

غزوۂ بدر کے انتہائی نازک موقع پر جبکہ اُمتِ مسلمہ کے صفحۂ ہستی سے مٹ جانے کا خطرہ سر پر منڈلا رہا تھا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ تعالیٰ سے جو خاص دُعا کی تھی اُس سے بھی یہ حقیقت پوری طرح واضح ہو جاتی ہے کہ دُنیا میں اس اُمت کے وجود کا مقصد بس یہی ہے کہ اس کے ذریعہ دُنیا میں ایمان اور عبدیت والی زندگی کی شمع روشن رہے، اور اللہ کے در پر اس کے بندوں کے جھکنے اور جھکانے کا کام دنیا میں جاری رہے، حدیث، سیرت کی کتابوں میں ہے کہ آپ نے اللہ تعالیٰ کے حضور میں اس دن عرض کیا۔

اَللّٰهُمَّ اِنْ تُهْلِكْ هٰذِهِ الْعِصَابَةَ لَنْ تُعْبَدَ فِي الْاَرْضِ بَعْدُ ۔

آپ کی اس دُعا کا مطلب یہ تھا کہ اے اللہ! تین سو سے کچھ اوپر آپ کے یہ بندے جو اس وقت میرے ساتھ ہیں، انھوں نے میری دعوت پر ایمان اور خدا پرستی والی زندگی کے اصول کو قبول کر لیا ہے اور دنیا میں اس کو رواج دینا اور پھیلانا اپنا مقصدِ حیات بنا لیا ہے۔ اب اگر تو نے آج ان کی کوئی خاص مدد نہ فرمائی اور ان کا طاقتور دشمن ان کو مٹانے کے ارادہ میں اگر کامیاب ہو گیا تو دنیا کا کوئی کام تو بند نہ ہوگا، تجارتیں بھی ہوتی رہیں گی، کھیتی باڑی بھی ہوتی رہے گی، حکومتیں بھی چلتی رہیں گی، زمین اور آسمان بھی اپنی جگہ قائم رہیں گے، چاند اور سورج کی روشنی بھی رہے گی، بےشک یہ سب کچھ یونہی رہے گا، لیکن اے میرے اللہ! ایمان اور خدا پرستی والی وہ زندگی جس کے لیے تو نے مجھے بھیجا ہے وہ دنیا میں نہ رہے گی۔ اور یہ دنیا اس مقدس دولت سے ہمیشہ خالی رہے گی (لَنْ تُعْبَدَ فِي الْاَرْضِ بَعْدُ)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اس دُعا نے اس بات کو واضح کر دیا کہ دنیا میں آپ کی اُمت کا مقصد صرف یہ ہے کہ ایمان اور خدا پرستی کا نُور دُنیا میں رہے اور پوری دنیا کو اس نور سے منور کرنے کے لیے جد و جہد ہوتی رہے، گویا یہ اُمت اس دُنیا کی بس اسی ضرورت اور اسی کمی کو پورا کرنے کے لیے وجود میں آئی ہے، اور یہی اس اُمت کی وہ خصوصیت ہے جس کی وجہ سے اس کو دنیا میں رہنے کا حق ہے۔ اور وہ اللہ کی خاص نصرت اور حفاظت کی مستحق ہو سکتی ہے —— رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بدر کے اس نازک موقع پر اللہ تعالیٰ کے حضور میں یہ نہیں عرض کیا کہ اے اللہ میرے یہ ساتھی مدینہ میں اپنے بیوی بچوں کو چھوڑ کر آئے ہیں، اگر یہاں ان کے دشمن اپنے بُرے ارادوں

میں کامیاب ہو گئے تو ان کے بچے یتیم ہو جائیں گے ان کی عورتیں بیوہ ہو جائیں گی، اور کوئی ان کی دیکھ بھال والا نہ رہے گا، آپ نے اللہ سے یہ بھی عرض نہیں کیا کہ ان کو دنیا میں حکومتیں کرنا ہیں اور ترقی کی نئی نئی راہیں کھولنی ہیں، انسانوں کے معیارِ زندگی کو بلند کرنا ہے، علوم و فنون سے دُنیا کے کتب خانوں کو بھرنا ہے، الغرض آپ نے اس نازک موقع پر ان میں سے کوئی بات بھی اللہ کے حضور میں عرض نہیں کی، بس یہی عرض کیا کہ اگر آپ نے اس موقع پر ان کی مدد نہ فرمائی اور یہ اپنی تعداد کی قلت اور سامانِ جنگ کی کمی کی وجہ سے دشمن کی تلواروں کا شکار ہو گئے تو ایمان اور خدا پرستی کا چراغ گل ہو جائے گا۔ اور آپ کی بنائی ہوئی یہ دُنیا اس کی روشنی سے محروم رہے گی

بہرحال قرآن مجید کی آیات اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابۂ کرام کے طرزِ عمل سے یہ بات بالکل متعین ہو جاتی ہے کہ دنیا میں مسلمان کہلانے والی اس اُمت کے وجود کا مقصد بس یہی ہے کہ اس کے ذریعہ دُنیا میں ایمان اور عبدیت والی وہ زندگی قائم رہے اور رواج پائے جس کو قائم کرنے اور رواج دینے کے لیے اللہ کے سارے نبی آتے رہے ہیں۔ اور اسی سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ جب تک اس اُمت میں یہ بات رہے اس کی مدد کرنا اور دنیا میں حوادث سے اس کی حفاظت کرنا اللہ کے ذمہ حق ہے، اور اس کا واسطہ دے کر آڑے وقتوں میں اللہ سے مدد مانگی جا سکتی ہے ــــ ساتھ ہی یہ بھی معلوم ہو گیا کہ اگر اُمت کسی وقت اپنی اس خصوصیت کو کھو دے تو پھر دنیا میں اس کے باقی رہنے کی کوئی خاص ضرورت نہیں، اور اگر وہ بالفرض دُنیا سے مٹ جائے تو دُنیا کی رونق میں اس سے کوئی کمی نہ آئے گی، اور دنیا کا کوئی کام بھی بند نہ ہوگا۔

اب میں عرض کرتا ہوں کہ ہم اور آپ غور کریں کہ اس لحاظ سے اس وقت اس اُمت کا کیا حال ہے اور وہ اپنے اس مقصد کو کہاں تک پورا کر رہی ہے؟

سب سے پہلے ایمان کو لیجیے، دین کی اور قرآن مجید کی خاص زبان میں ایمان جس حقیقت کا نام ہے، یہ واقعہ ہے کہ اس اُمت کی غالب اکثریت اس سے خالی ہے، اور بجائے ایمان کے بس ایک بےجان عقیدہ ہے جس میں اتنی طاقت بھی نہیں ہے کہ آدمی سے فرائض ادا کرا سکے اور فسق و فجور

اور محرمات سے روک سکے۔ آج مسلمانوں میں نوے فیصد کا حال یہ ہے کہ اللہ رسول پر اور اسلام کے حق ہونے پر ان کا عقیدہ ہے اور زبان سے ان سب باتوں کا اقرار بھی ہے، لیکن وہ فرائض و ارکان کے بھی پابند نہیں ہیں، اور جن گناہوں کو قرآن و حدیث میں ایمان کے بالکل منافی قرار دیا گیا ہے وہ اُن کی زندگی کا جز بنے ہوئے ہیں، اگر ان کے دلوں میں حقیقی ایمان و یقین ہوتا تو ان کی حالت یہ نہ ہوتی۔

اور ایمان و یقین تو خیر دل کے اندر کی چیز ہے جس کو ہم اپنی آنکھوں سے دیکھ بھی نہیں سکتے لیکن ظاہری اعمال اور زندگی کے اسلامی طور طریقے جو ہر شخص دیکھ سکتا ہے، اُن سے بھی ہماری غالب اکثریت خالی ہے۔ آپ میں سے ہر شخص جانتا ہے کہ اہتمام اور پابندی سے فرض نمازیں ادا کرنے والے اور فکر کے ساتھ اور صحیح طریقہ سے زکوٰۃ کا فریضہ ادا کرنے والے آج اس مسلمان قوم میں سو میں پانچ بھی نہیں ہیں۔ اسی طرح اخلاق و معاملات وغیرہ زندگی کے دوسرے شعبوں میں اللہ و رسول کے احکام کی پابندی کرنے والوں کا تناسب نماز اور زکوٰۃ ادا کرنے والوں سے بھی کم ہے، بلکہ حق اور انصاف کی بات یہ ہے کہ اس لحاظ سے مسلمانوں اور غیر مسلموں میں اب کوئی فرق نہیں رہا ہے اخلاقی و اور معاشرت و معاملات وغیرہ میں جتنی گندگیاں اور خرابیاں مختلف غیر مسلم طبقوں میں ہیں آج کی مسلمان قوم میں وہ سب موجود ہیں۔ بلکہ بعض حیثیتوں سے مسلمانوں کا نمبر دوسروں سے کچھ آگے ہی ہے۔

اب مسلمان قوم کی زندگی کے اس نقشہ کو دیکھ کر اس کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا کہ یہ وہی اُمت ہے جو دنیا میں اس لیے آئی تھی کہ اس کے ذریعہ ایمان اور خدا پرستی کا نور پھیلے۔

میرے بھائیو۔ اور بزرگو! میں اس سے ناواقف نہیں ہوں کہ اس گئی گذری حالت میں بھی مسلمانوں میں ایک تعداد اللہ کے ایسے بندوں کی موجود ہے جو اس دور میں ایمان اور خدا پرستی کا نمونہ ہیں اور جنہوں نے اس مقصد کو اور اس سلسلہ کی اپنی خاص ذمہ داری کو نہیں بھلایا ہے، بلکہ الحمد للہ میں نے خود اللہ کے ایسے بندوں کو دیکھا ہے، لیکن ان کا تناسب مسلمان قوم میں اب آٹے میں نمک کے برابر ہے، اور میری گفتگو عام قوم کے بارے میں ہے۔ اور مسلمانوں کی عام حالت وہی ہے جو میں نے ابھی ذکر کی ہے۔ اور جس سے آپ سب حضرات بھی واقف ہیں۔ اگر کسی بستی میں دو چار نیک بندے بھی رہتے ہوں، اور باقی پوری بستی بدمعاشوں کی ہو تو اس بستی کو نیکوں کی بستی نہیں کہا جائے گا بدمعاشوں ہی کی بستی کہا

جائے گا۔ اسی طرح مسلمانوں میں بہت تھوڑی سی تعداد میں اللہ کے جو ایسے بندے ہیں جن کی زندگی اس اُمّت کے مقصد سے آج بھی مطابقت رکھتی ہے ان کی وجہ سے پوری اُمّت کے متعلق یہ نہیں کہا جاسکتا کہ یہ اپنے مقصد کو پورا کر رہی ہے، بلکہ قوم کی عام حالت کے لحاظ سے ہی کہا جائے گا کہ یہ اپنے مقصد و مقام سے بالکل بیگانہ ہوگئی ہے۔ اور اب اس کے وجود سے بجائے خیر اور بھلائی پھیلنے کے خیر کا خاتمہ ہو رہا ہے۔ اور اسی لیے بالکل بجا طور پر اللہ تعالیٰ نے اس کو اپنی خاص نصرت اور حفاظت سے محروم کر دیا ہے، اللہ تعالیٰ کا کسی قوم اور کسی اُمّت سے کوئی رشتہ نہیں، اس کے ہاں قدر و قیمت بس ایمان کی اور ایمان والے اعمال و اخلاق کی ہے۔

بہر حال مسلمان قوم کو اس انحراف اور بگاڑ کی پہلی سزا تو اس دنیا میں یہ مل رہی ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ کی سرپرستی اور حمایت سے محروم ہوگئی ہے اور دنیا میں اس کا کوئی وزن نہیں رہا ہے، یہ بات میں کسی خاص علاقہ اور ملک کے مسلمانوں کے لیے نہیں کہہ رہا ہوں، میری صاف رائے یہ ہے کہ اس معاملہ میں تمام ملکوں کے مسلمان قریب قریب برابر ہیں، بس ۱۹-۲۰ یا ۱۰-۲۰ کا فرق ہوگا، کسی ملک کے مسلمانوں کو بھی اللہ تعالیٰ کی وہ سرپرستی اور حمایت اب حاصل نہیں ہے جس کا وعدہ قرآن مجید میں ایمان اور خدا پرستی کی حامل اور علمبردار اُمّت کے لیے جا بجا کیا گیا ہے، اور جو صحابۂ کرام کو حاصل تھی۔ جس کی وجہ سے پوری دنیا اُن کے لیے مسخر ہوتی چلی جارہی تھی ——— یہ سزا تو اُمّت کو اپنی غفلت اور بداعمالی کی اس دنیا میں مل چکی ہے اور آخرت کی سزا اس سے ہزاروں گنی زیادہ سخت ہوگی، قرآن مجید میں جا بجا فرمایا گیا ہے۔ وَلَعَذَابُ الْآخِرَةِ اَكْبَرُ۔ وَلَعَذَابُ الْآخِرَةِ اَشَدُّ وَاَبْقٰى۔ وَلَعَذَابُ الْآخِرَةِ اَخْزٰى۔ یعنی آخرت کا عذاب بہت تکلیف دہ اور بہت سخت ہے، بہت دیرپا ہے، بہت رسوا کرنے والا ہے ——— میرے بھائیو! قبر کی ایک رات کا عذاب ساری عمر کی تکلیفوں سے زیادہ سخت ہوگا، اور دوزخ کے عذاب کا ایک لمحہ ساری زندگی کے عیش و آرام کو بھلا دے گا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ جہنم میں سب سے ہلکے درجہ کا عذاب یہ ہوگا کہ آدمی کو آگ کی جوتیاں پہنا دی جائیں گی، جس کی وجہ سے سر میں اس کا بھیجا اس طرح پکے گا جس طرح ہمارے گھروں میں چولھے پر ہانڈی پکتی ہے۔

اللہ تعالیٰ اپنی پناہ میں رکھے، ہم میں کون ہے جو ایک لمحہ بھی اس عذاب کو برداشت

کر سکے گا۔

اللّٰھم احفظنا اللّٰھم اجرنا من النار!

بہر حال اس اُمت کی اکثریت میں جو خدا فراموشی اور آخرت کی طرف سے جو غفلت اور بے فکری اور زندگیوں میں جو فسق و فجور ہے، جس کی سزا ہم کو اس دنیا میں بھی مل رہی ہے، اگر مرنے کے بعد قبر میں اور دوزخ میں بھی ان جرائم کا وہ عذاب بھگتنا پڑا جس کی خبریں قرآن و حدیث میں دی گئی ہیں تو وہ اتنا سخت ہوگا جس کا یہاں کوئی تصور بھی نہیں کر سکتا ـــــ ہاں دنیا اور آخرت کی سزا میں اتنا فرق ضرور ہے کہ دنیا میں کسی قوم اور اُمت کی بدکرداری اور بداعمالی کا خمیازہ پوری قوم کو اجتماعی طور سے بھگتنا پڑتا ہے۔ لیکن قیامت اور آخرت میں ہر شخص کو صرف اس کے اپنے ہی عمل کی جزا و سزا ملے گی، اور وہاں معاملہ بالکل انفرادی ہوگا۔ قرآن مجید میں ارشاد ہے۔ وَكُلُّهُمْ آتِيهِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ فَرْدًا ۔

میرے بھائیو! دنیا اور آخرت کی ان سزاؤں کے علاوہ مسلمان قوم کے اس عمومی بگاڑ کا ایک تیسرا نتیجہ جس پر ہمیں خون کے آنسو بہانے چاہئیں یہ ہے کہ ہماری یہ بگڑی ہوئی زندگی، دنیا کے لیے اسلام کی طرف آنے میں سب سے بڑی رکاوٹ بن گئی ہے ـــــ دنیا اس مسلمان قوم ہی کو اسلام کا نمونہ اور نمائندہ سمجھتی ہے اور اسی کا حال دیکھ کر اسلام کے بارہ میں رائے قائم کرتی ہے۔ اسی کا یہ نتیجہ ہے کہ آج بھی جبکہ دنیا کو زندگی کے کسی صحیح نظریہ اور نظام کی تلاش ہے اور غور و فکر کرنے والے غور و فکر کر رہے ہیں اسلام یعنی ایمان اور خدا پرستی کے اصول پر غور کرنے کا سوال ان کے ذہنوں میں نہیں اٹھتا۔ اگر مسلمان دنیا میں ایمان اور خدا پرستی کا صحیح نمونہ ہوتے اور دنیا انھیں دیکھ کر اسلام کو سمجھ سکتی تو یہ ممکن نہ تھا کہ دنیا اس سے دور ہی دور رہتیں اور اس کے بارہ میں غور کرنے کی بھی ضرورت نہ سمجھتیں۔

میرے بھائیو اور بزرگو! بات ہے تو بڑی کڑوی اور میرے اور آپ کے لیے بڑی تکلیف دہ، لیکن ہے بالکل سچی اور اس موقع پر کہنے کی۔ اس لیے دل پر پتھر رکھ کر کہتا ہوں کہ اسلام کا کوئی دشمن دنیا کو اسلام کی طرف اور خدا کی طرف سے آنے سے اتنا نہیں روک سکا۔ جتنا کہ مسلمان قوم کی بگڑی ہوئی اس زندگی نے روکا ہے۔ گویا اب صورت حال یہ ہے کہ ایمان اور خدا پرستی کی جس زندگی کو دنیا میں پھیلانا اس اُمت کے وجود کا خاص مقصد تھا، آج یہی اُمت اس کے راستہ میں دیوار بن کر

کھڑی ہو گئی ہے ـــــ اس دنیا میں بڑے بڑے حادثے ہوئے ہیں، طوفان آئے ہیں، زلزلے آئے ہیں، قحط پڑے ہیں، طاعون اور کالرا جیسی مہلک وبائی بیماریاں آئی ہیں، جنہوں نے لاکھوں کروڑوں انسانوں کو ختم کر دیا ہے، لیکن یہ حادثہ کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی امت کی اکثریت ایمان اور خدا پرستی کی دولت سے خود محروم ہو کر پوری انسانی دنیا کی بھی اس سے محرومی اور نا داری کا ذریعہ بن گئی ہے، ان سب حادثوں سے بڑا حادثہ ہے ـــــ فلیبک علی الاسلام من کان باکیا۔

اس کے بعد میں عرض کرتا ہوں کہ ہماری زندگیوں کا جو حصہ گزر چکا اب اس کو تو واپس نہیں لایا جا سکتا، اس کے لیے تو اللہ تعالیٰ سے بس معافی اور مغفرت ہی مانگی جا سکتی ہے، اور اگر ہم سچے دل سے توبہ واستغفار کریں تو یقیناً اللہ تعالیٰ معاف فرمانے والا اور بخشنے والا ہے ـــــ لیکن زندگی کا جو وقت باقی ہے اس کے بارے میں ہمیں سوچ سمجھ کے فیصلہ کرنا چاہیے کہ اس کو ہم کس طرح گزارنا چاہتے ہیں ـــــ ایک صورت تو یہ ہے کہ خدانخواستہ ہم اس بگاڑ پر راضی اور مطمئن ہو جائیں اور خدا فراموشی اور نفس پرستی کی زندگی کو شعور اور ارادہ کے ساتھ اپنا لیں، اور دنیا کی دوسری قوموں کی طرح دنیا طلبی اور دنیا پرستی ہی کو اپنی زندگی کا مقصد اور مصرف بنا لیں ـــ مجھے یقین ہے کہ آپ میں سے کوئی بھی اپنے لیے یہ فیصلہ نہیں کرے گا، یہ فیصلہ تو دراصل مرتد ہونے کا اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے اور آپ کے دین اور طریقہ سے اپنا تعلق منقطع کرنے کا فیصلہ ہوگا اور کسی ادنیٰ سے ادنیٰ مسلمان کہلانے والے کے متعلق بھی یہ شبہ نہیں کیا جا سکتا کہ وہ اپنے لیے ایسا فیصلہ کر سکے گا، مسلمانوں کا بگاڑ بے شک حد کو پہونچ چکا ہے، لیکن یہ سارا بگاڑ غفلت اور ضعف ایمان کا نتیجہ ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ اللہ و رسول اور اسلام پر ان کا عقیدہ نہ رہا ہو، اور ان کے دلوں میں انکار آ گیا ہو، گرے سے گرے فاسق فاجر مسلمانوں کا حال بھی یہی ہے کہ وہ اللہ و رسول اور اسلام سے تعلق توڑنے کو سوچ بھی نہیں سکتے ـــــ اس لیے یہ مسئلہ طے شدہ ہے کہ ہم اور آپ اور پوری مسلمان قوم اپنی موجودہ بگڑی ہوئی زندگی پر راضی اور مطمئن نہیں ہو سکتے۔ جب بھی فکر اور سنجیدگی کے ساتھ اس سوال کو اٹھایا جائے گا تو سب کے دلوں کی آواز یہی ہوگی کہ ہم نے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی لائی ہوئی ایمان اور خدا پرستی والی زندگی چھوڑ کے اور خدا فراموشی اور نفس پرستی کی زندگی اختیار کر کے خودکشی کی ہے اور اپنے کو برباد کیا ہے، اور

ہمیں اب بھی وہی زندگی پسند ہے جو حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم لے کر آئے تھے۔
بہرحال جہاں تک عام مسلمانوں کے عقیدہ اور دل کے جذبہ کا تعلق ہے مجھے پورا اطمینان اور یقین ہے کہ وہ بالکل یہی ہے اور اس بارہ میں ان سے کوئی نیا فیصلہ کرانے کی اور دلائل سے منوانے کی ضرورت نہیں ہے، بلکہ اللہ تعالیٰ سے دعاؤں کے ساتھ تن من دھن سے اس کوشش میں لگ جانے کی ضرورت ہے کہ ہم میں اور اس پوری امت میں پھر وہ ایمان والی زندگی پیدا ہو جائے جس کے لیے دنیا میں یہ اُمت پیدا کی گئی تھی۔

میرے بھائیو اور بزرگو! ــــ یہ کام جس کا نام "تبلیغ" پڑ گیا ہے اور جس کے کرنے والوں کا نام آپ سے آپ "تبلیغی جماعت" مشہور ہو گیا ہے، اور جس کے سلسلے میں یہ اجتماع ہو رہا ہے، دراصل یہ وہی کوشش اور اسی مقصد کے لیے دوڑ دھوپ ہے ــــ شاید آپ میں سے بہت سے بھائی جو اس کام کی حقیقت سے پوری طرح واقف نہیں ہیں اس طرح کے اجتماعات سے یہ سمجھتے ہوں کہ ان اجتماعوں اور تقریروں کا نام تبلیغ ہے اور یہی وہ کام ہے جس کی تبلیغ کے نام سے ہم کو دعوت دی جاتی ہے، اور ان اجتماعوں میں شرکت ہی تبلیغی کام میں شرکت ہے، تو میں صفائی سے بتا دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ "تبلیغ" کے لفظ کے لغوی اور عرفی معنی کچھ بھی ہوں، لیکن ہم جس تبلیغ کی دعوت دیتے ہیں اور "تبلیغی جماعت" کا جو اصل موضوع ہے وہ جلسہ یا تقریر نہیں ہے بلکہ ایک عمل اور زندگی کا ایک طریقہ ہے، ان اجتماعات میں تقریروں کے ذریعہ اُس کی دعوت دی جاتی ہے اور لوگوں کو اس پر آمادہ کیا جاتا ہے، بہرحال یہ اجتماع اور یہ تقریر خود وہ تبلیغ نہیں ہے، تبلیغ والا عمل تو اُس وقت شروع ہوگا جب اس اجتماع کے ختم ہونے کے بعد آپ اس عمل کے لیے جماعتی شکل میں کہیں کو نکل جائیں گے اور اپنے دن اور اپنی راتیں ان ہدایات کے مطابق گزارنے کی کوشش کریں گے جو یہاں اس سلسلہ میں آپ کو دی جائیں گی ــــ آپ میں سے جو بھائی اصول کی پابندی کے ساتھ کبھی تبلیغی جماعتوں میں پھرے ہیں وہ تو جانتے ہیں کہ جس تبلیغ کی ہم دعوت دیتے ہیں اس کا مطلب کیا ہے اور جنھیں ابھی اس کا موقع نہیں ملا ہے وہ پوری طرح جب ہی سمجھ سکیں گے جب اس کا تجربہ کر لیں گے۔
میں کبھی کبھی کہا کرتا ہوں کہ بہت سے لوگوں کے لیے یہ "تبلیغ" کا لفظ بھی اس کام کے سمجھنے میں حجاب بن جاتا ہے۔ کیونکہ تبلیغ کے معروف معنی کسی بات کے پہونچانے کے ہیں، اور یہ پہونچانا

عام طور سے، یا تقریر سے ہوتا ہے یا تحریر سے لیکن تبلیغی جماعت والے اپنے جس کام کو تبلیغ کہتے ہیں وہ نہ تقریر ہے نہ تحریر، بلکہ جیسا کہ ابھی میں نے عرض کیا تھا وہ ایک زندگی ہے جو کچھ اصولوں کی پابندی کے ساتھ خاص مشاغل میں گزاری جاتی ہے ـــــ اسی طرح ایک غلط فہمی یہ بھی ہو کہ جماعت سازی اور انجمن بازی کے اس دور میں تبلیغی جماعت کے لفظ سے بہت سے بھائی یہ سمجھتے ہیں کہ یہ بھی کوئی اسی طرح کی انجمن یا جماعت ہے جیسی کہ اس زمانے میں بنا کرتی ہیں، جن کے ممبران ہوتے ہیں۔ ارکان ہوتے ہیں اور چند عہدہ دار ہوتے ہیں۔ حالانکہ واقعہ یہ ہو کہ یہ ایسی کوئی جماعت نہیں ہو، بلکہ میں کہا کرتا ہوں کہ یہ بس ایسی جماعت ہے جیسی ہر مسجد میں پانچ وقت نماز کی جماعت ہوتی ہے۔ اللہ کے جو بندے نماز کے لیے وقت پر جمع ہو گئے اور انھوں نے مل کر نماز ادا کر لی، بس وہ ایک جماعت ہو گئی، بالکل یہی معاملہ ہو، یہ تبلیغ ایک دینی عمل ہے۔ اس کے لیے اللہ کے بندوں کو پکارا جاتا ہے، بلایا جاتا ہے۔ جو بندے وقت پر تیار ہو گئے اور ایک جماعت بن کر اس دینی عمل کے لیے چل دیے بس وہی ایک جماعت بن گئی اور جب وہ عمل ختم ہو گیا اور اپنے دوسرے کاموں میں لگ گئے تو وہ جماعتی حیثیت بھی ختم ہو گئی اور بس مسلمان ہی مسلمان رہ گئے۔

خیر یہ تو ایک جملہ معترضہ تھا، تبلیغ کے لفظ اور تبلیغی جماعت کے لفظ سے جو غلط فہمی بہت سے بھائیوں کو ہوتی ہے اس کو دور کرنے کے لیے یہ چند لفظ میں نے درمیان میں کہہ دیے، ورنہ میں یہ عرض کر رہا تھا کہ اُمتِ مسلمہ میں ایمان اور خدا پرستی والی زندگی پیدا کرنے کے لیے وسیع پیمانے پر ایک جدوجہد کی ضرورت ہے، اور تبلیغ کے نام سے یہ جو کام ہو رہا ہے یہ در اصل وہی جدوجہد ہے ـــــ ہمارے جو بزرگ اس کام کے اصل داعی ہیں اور جن سے اللہ تعالیٰ اس زمانہ میں یہ کام لے رہا ہے اور جنھوں نے ہر طرف سے یکسو ہو کر اسی کام کو اپنی زندگی کا اصل کام بنا لیا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ اُمتِ مسلمہ کے ظاہر و باطن میں جس تبدیلی کی ضرورت ہے اس کے لیے ضروری ہے کہ عام مسلمانوں کو اس کی دعوت دی جائے کہ وہ اپنے موجودہ ماحول اور مشغلوں سے نکل کر ایک خاص مدت صرف اُن کاموں اور ان مشغلوں میں مصروف رہ کر گزاریں جن سے ایمان پیدا ہوتا اور بڑھتا ہو۔ اور جن سے ایمان والی زندگی کی تعمیر اور ترقی ہوتی ہے ـــــ وہ چیزیں یہ ہیں۔

(۱) کلمہ شریف سے تعلق بڑھانا، کلمہ شریف کی عظمت دل میں بٹھانا، کلمہ شریف کی حقیقت کو

دل میں اتارنا اور جمانا، اور اس کے تقاضے کے مطابق زندگی گزارنا۔

(۲) نماز میں اہتمام اور فکر سے پڑھنا، صحیح طریقے اور خشوع وخضوع سے پڑھنے کی عادت ڈالنا، نماز سے اپنا تعلق بڑھانا یعنی پانچ وقت کی جن نمازوں کے ہم عادی ہیں اُن کے علاوہ تہجد اور اشراق و چاشت وغیرہ ان نفلی نمازوں کی عادت ڈالنا جن کی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بڑی ترغیبیں دی ہیں اور اُن کی بڑی بڑی تاثیریں اور برکتیں بتلائی ہیں، اسی طرح اس کی عادت ڈالنا کہ جب کوئی پریشانی اور مشکل پیش آئے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم اور آپ کے طریقہ کے مطابق نماز حاجت پڑھ کر اس مشکل کے حل ہونے کے لیے اور پریشانی کے دور ہونے کے لیے اللہ تعالیٰ سے دعا کی جائے — اسی طرح اس کی عادت ڈالنا کہ جب کسی کام کے بارے میں تردد ہو تو نماز استخارہ پڑھ کے اس بارہ میں اللہ تعالیٰ سے رہنمائی طلب کر لی جائے، اگر شیطان یا نفس کے بہکانے سے کوئی گناہ ہو جائے تو صلوٰۃ توبہ پڑھ کے اللہ تعالیٰ سے معافی مانگی جائے اور توبہ کر لی جائے — یہ سب وہ نمازیں ہیں جن کی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تعلیم دی اور صحابہ کرام کے معمولات میں تھیں لیکن اب عام امت کو ان نمازوں سے گویا تعلق ہی نہیں رہا ہے — بہرحال نماز سے تعلق بڑھانے میں یہ سب باتیں شامل ہیں اور ان سب سے ایمان میں اور تعلق باللہ میں وہ ترقی ہوتی ہے جو کسی اور تدبیر سے نہیں ہو سکتی۔

(۳) تیسرا کام اس سلسلہ کا یہ ہے کہ اُن مقدس کلمات کے ذریعہ اللہ کا ذکر کیا جائے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تعلیم فرمائے ہیں (مثلاً کلمۂ تمجید، اور استغفار اور درود شریف اور اسی طرح قرآن مجید کی تلاوت) اور اس کے علاوہ اٹھتے بیٹھتے، اترتے چڑھتے، کھانا شروع کرتے وقت اور کھانے کے ختم پر، رفع حاجت کے لیے جاتے وقت اور اس سے فارغ ہو کے، سونے کے لیے لیٹتے وقت اور بستر سے اٹھتے ہوئے، سواری پر چڑھتے وقت اور سواری سے اترتے ہوئے، مسجد میں داخل ہوتے وقت اور مسجد سے نکلتے ہوئے اور اسی طرح دوسرے احوال و اوقات میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جس طرح اللہ تعالیٰ کا ذکر کرتے تھے اور جس طرح ہر موقع پر اس سے دعائیں کرتے تھے اسی طرح اس ہمہ وقتی ذکر و دعا کی بھی عادت ڈالی جائے۔

(۴) اس کی بھی عادت ڈالی جائے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہماری ہدایت کے لیے جو علم اللہ تعالیٰ کی طرف سے لائے تھے اس کی تحصیل اور اس کے مذاکرہ میں بھی ہمارا کچھ وقت

گزارا کرے، اور علم نبوی میں ہماری یہ مشغولیت صحابہ کرام کے طرز پر ہو، یعنی جو پڑھیں یا سنیں عظمت و احترام اور ادب کے ساتھ پڑھیں اور سنیں، اس پر ایمان لائیں، اس کا یقین دل میں جمائیں، اس پر عمل کریں۔

(۵) پانچواں کام جس کی نکلنے کے اس زمانہ میں خاص طور پر مشق کرنی اور عادت ڈالنی ہوگی اس کا تعلق اخلاق اور حقوق العباد سے ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ ہم اپنے دوسرے بھائیوں کے حقوق ادا کریں، خواہ وہ ہمارے حقوق ادا کریں یا نہ ادا کریں ہم دوسروں کو آرام اور نفع پہنچانے کی کوشش کریں اور نقصان رسانی اور ایذا رسانی سے بچیں خواہ ان کا طرز عمل کچھ بھی ہو —— یہ بات کہنے میں آسان اور ہلکی ہے میں نے بڑی آسانی سے چند سکنڈ میں کہہ دی لیکن اس پر عمل اور اس کو عادت بنانے میں کامیاب ہونا بڑا مشکل ہے۔ خود قرآن مجید میں فرمایا گیا ہے۔ وَمَا يُلَقَّاهَا إِلَّا الَّذِينَ صَبَرُوا وَمَا يُلَقَّاهَا إِلَّا ذُو حَظٍّ عَظِيمٍ ، یعنی اس میں کامیابی بس ان ہی بندوں کو ہوگی جو اپنے میں صبر کا جوہر پیدا کرلیں گے اور جو بڑے نصیبہ ور ہوں گے۔

بہرحال تبلیغ کے نام پر نکلنے کے زمانہ میں ان سب باتوں کی مشق کرنا اور ان کو اپنی زندگی کی علامت بنانا ہوگا۔

(۶) اور ان پانچ کاموں کے علاوہ ایک چھٹا کام یہ کرنا ہوگا کہ ایمان اور ایمان والے ان اعمال کی دعوت کولے کر اللہ کے بندوں کے پاس جانا ہوگا اور ان کو بھی اس طرز زندگی پر آمادہ کرنے کے لیے ہر طرح کی کوششیں اور ان کی خوشامدیں کرنی ہوں گی، اس دعوت کے لیے عمومی اور خصوصی گشت کا طریقہ بھی استعمال کیا جائے گا اور اجتماعات کے ذریعہ بھی یہ دعوت دی جائے گی، اس سلسلہ میں بعض وقت بڑی نامناسب اور تکلیف دہ باتیں بھی سننی پڑیں گی، بعض مقامات پر کسی غلط فہمی سے مسجدوں سے نکالا بھی جائے گا، اس سلسلہ میں مسلسل سفر کرنے ہوں گے جن میں اپنا خرچ کرنا ہوگا، طرح طرح کی زحمتیں اٹھانی پڑیں گی، وقت پر نہ سوسکنے کی، اسی طرح وقت پر کھانا نہ ملنے کی اور عادت و مزاج کے مطابق نہ ملنے کی تکلیفیں خوب پہنچیں گی، ساتھیوں میں ہر طرح کے اور ہر مزاج کے ہوں گے، اور ہر مزاج کے اور ہر طرح کے مسلمانوں سے واسطہ پڑے گا اور ان سب کے ساتھ اکرام کا معاملہ کرنا ہوگا اس طرح یہ ایک مستقل

مجاہدہ ہوگا۔

(۷) ساتویں خاص بات اس سلسلہ میں ہمارے یہ بزرگ بتلاتے ہیں کہ سب کاموں میں، خلاص کی یعنی اللہ کو راضی کرنے کی نیت کی مشق کی جائے یعنی ذکر و عبادت علمی مذاکرہ اور علم میں مشغولیت اللہ کے بندوں کے ساتھ حسن معاملہ اور ان کا اکرام اور اِن باتوں کی دعوت لے کر پھرنا اور اللہ کے بندوں کے پاس جانا اور اجتماعات کرنا اور ان میں کہنا سننا، سب صرف اللہ کی رضا اور ثواب کی نیت سے ہو اور ایک مہم بنا کر اس کی مشق کی جائے کہ یہ بات عادت بن جائے۔ یہ بات بھی کہنے میں آسان ہے اور عمل میں بہت مشکل۔

بہرحال تبلیغ کے نقطے سے جس زندگی کی دعوت دی جاتی ہے وہ در اصل یہ زندگی ہے، چار چار مہینے اور ایک ایک چلّہ کا وقت اسی لیے مانگا جاتا ہے کہ اس مدت کی مسلسل مشق سے ان چیزوں کا کچھ ذوق پیدا ہو جائے اور کچھ رنگ چڑھ جائے، اور پھر اسی راستہ پر چلتے ہوئے آدمی ترقی کرتا رہے اور اُسے حقیقی ایمان اور عبدیت والی زندگی نصیب ہو جائے۔

بھائیو! اب آپ خود ہی فیصلہ کریں کہ چند مہینے لگا کے اور تھوڑی سی تکلیفیں اٹھا کے اگر اس دولت کا کوئی حصہ نصیب ہو جائے تو یہ سودا آپ کے لیے نفع کا ہوگا یا نقصان کا ——— عرفی نے تو کہا تھا

عرفی اگر بگریہ میسر شدے وصال	صد سال می تواں بتمنا گریستن

آخر میں بس ایک بات اور کہتا ہوں ——— امت مسلمہ کے اپنے مقصد و مقام سے ہٹ جانے کا اور اس کے جس بگاڑ کا میں نے ذکر کیا ہے اور جس کو آپ کی آنکھیں بھی دیکھ رہی ہیں یہ واقعہ ہے کہ وہ کوئی آج کا یعنی ہمارے ہی اس دور کا اور ہماری ہی اس صدی کا حادثہ نہیں ہے، بلکہ یہ بگاڑ صدیوں پہلے سے ہم میں آچکا ہے لیکن ابتک زمانہ ایسا رہا ہے کہ اس بگاڑ کی وجہ سے ہماری دینی اور دنیاوی حالت گرتی تو رہی مگر اس کے باوجود اللہ رسول پر اور ان کے دین پر ہمارا عقیدہ اتنا باقی رہا کہ ہم ابتک مسلمان رہے اور مسلمان ہیں۔ لیکن الحاد اور مادہ پرستی کی جو طاقتور تحریکیں ملک اس دور میں آندھی اور سیلاب کی رفتار سے چل رہی ہیں ان کا مقابلہ یہ بے جان عقیدہ اور اس زمانہ کے مسلمانوں کا یہ نیم جان اور سسکتا ہوا ایمان نہیں کر سکتا۔ فضا میں جب سکون ہو، ہوا بھی نہ چل رہی ہو تو پرندہ کا پر اور درخت سے گرا ہوا سوکھا پتا بھی اپنی جگہ پڑا رہتا ہے لیکن جب

جب آندھیاں اور سیلاب آئیں تو کمزور جڑوں والے درخت بھی اکھڑ کر بہہ جاتے ہیں اور صرف مضبوط جڑ والے درخت ہی اپنی جگہ قائم رہتے ہیں ــــــ میرے بھائیو اور بزرگو! میں کوئی صاحب کشف والہام نہیں ہوں، گنہگار قسم کا ایک عامی مسلمان ہوں، اللہ تعالیٰ نے جو عام سمجھ اور بصیرت بخشی ہے اس کی بنا پر کہتا ہوں اور یقین کے ساتھ کہتا ہوں کہ ہمارے اس دور کے مسلمانوں میں حقیقی ایمان اور ایمان والی زندگی پیدا کرنے اور عام کرنے کے لیے اگر کوئی خاص جدوجہد وسیع پیمانہ پر اس دور میں نہ کی گئی اور یہ عام امت اسی حال میں رہی جو اس وقت اس کا بگڑا ہوا حال ہے تو یہ بیجان عقیدہ اور یہ ٹوٹا پھوٹا اسلام بھی اس کے پاس باقی نہ رہ سکے گا ــــــ الحاد و مادہ پرستی اور جاہلیت کے آنے والے طوفانوں کے مقابلہ میں اللہ کے وہی بندے دین وایمان پر قائم رہیں گے جن کے دلوں کو حقیقی ایمان ویقین نصیب ہوگا اور جن کی زندگی اہل ایمان والی ہوگی ــــــ اور اسی کے ساتھ یہ بھی یقین سے کہتا ہوں کہ اگر اللہ تعالیٰ کی توفیق اور مدد سے اس وقت عام مسلمانوں میں ایمان اور ایمانی زندگی پیدا کرنے کے لیے وسیع پیمانہ پر کوئی جدوجہد صحیح طریقہ پر کرلی گئی اور اس کے نتیجہ میں اس امت کی زندگی میں اور اس کے اصل مقصد ومنصب میں مطابقت پیدا ہوگئی تو انشاءاللہ پوری انسانی دنیا کے لیے ہدایت کا دروازہ کھل جائے گا اور قرآن مجید کی بات وَیَکُوْنَ الدِّیْنُ کُلُّہٗ لِلّٰہِ قریبی دور میں پوری ہوجائے گی ــــــ اللہ تعالیٰ ہمیں اور آپ کو وقت کی رفتار اور اس کا تقاضا سمجھنے کی اور اپنا فرض ادا کرنے کی توفیق دے۔

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین

(الفرقان جمادی الاخریٰ ۱۳۸۳ھ)

ٹیلی گرام
FINESUEDE
BOMBAY
ٹیلی فون
دفتر ۳۳۴۷۵۳
مکان ۵۴۲۹۷۲
سی، ایس، ٹریڈرس
ایکسپورٹرس
ہر قسم کا چمڑا • لیدر گڈس
ریڈی میڈ گارمنٹ • آرٹیفیشل جویلری
پلاسٹک گڈس — اور —
اسٹیشنری وغیرہ وغیرہ
پتہ یاد رکھئے
دفتر پوسٹ بکس نمبر ۳۲۵۰، ۱۹/۳ دھرمسی اسٹریٹ بمبئی ۳
کارخانہ
۲۴۲/۲۴۶ دھراوی روڈ، بمبئی ۱۷
(انڈیا)

مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کی ایک تقریر

ایک مقدس وقف اور اُس کا متولّی

دوستو! اسلام نے ہمیں یہ بتلایا ہے کہ انسان دنیا میں خدا کا نائب خلیفۃ اللہ اور دنیا کا ٹرسٹی ہے، دنیا ایک وقف ہے اور انسان اُس کا متولی، اس کے ذمہ یہاں کا انتظام اور ہدایت کا کام ہے۔ دنیا میں چھوٹے بڑے بہت سے وقف ہوتے ہیں، یہ سارا عالم یہ ساری کائنات ایک عظیم الشان وقف و ٹرسٹ ہے، یہ کسی کی ذاتی ملکیت یا کسی کے باپ، دادا کی جائداد نہیں ہے کہ جس طرح چاہے کھائے اڑائے۔ اس وقف میں جانور، چرند، پرند، درخت، دریا، پہاڑ، سونا، چاندی، سامان خوراک اور دنیا کی تمام نعمتیں ہیں۔ یہ سب انسان کے حوالے کی گئی ہیں کیونکہ وہ ان کے مزاج سے بھی واقف ہے اور ان کا ہمدرد بھی۔ انسان خود اسی ٹرسٹ کی مٹی سے بنا ہے اور اسی خاک کا ہے اور منتظم کے لیے واقفیت علم اور ہمدردی و تعلق دونوں شرط ہیں۔ انسان دنیا کے نفع و نقصان سے بھی واقف ہے اور اس کے اندر اسی کی ضروریات بھی رکھی گئی ہیں اس لئے وہ اچھا ٹرسٹی بن سکتا ہے۔

مثال کے طور پر لائبریری (کتب خانہ) کا انتظام وہی اچھا کر سکتا ہے جس کو علم کا شوق ہو اور کتابوں سے لگاؤ اور دلچسپی ہو، اگر کسی کتب خانہ کا انتظام کسی جاہل کے سپرد کر دیا گیا، چاہے وہ کتنا ہی شریف اور اچھا آدمی ہو وہ بہترین لائبریرین نہیں بن سکتا۔ لیکن جس کو علم کا شوق ہوگا اور کتابوں سے مناسبت ہو وہ اس میں کافی وقت صرف کرے گا۔ اس کے ذخیرہ میں معقول اضافہ کرے گا اور اس کو ترقی دے گا۔

اسی طرح انسان چونکہ اسی دنیا کا ہے اُس کو اس سے دلچسپی بھی ہے اور وہ اس کا ضرورت مند بھی ہے اس سے واقف بھی ہے اور اس کا ہمدرد بھی، اس کو اسی میں رہنا بھی ہے اور اسی میں مرنا بھی

لہٰذا وہ اس کی پوری دیکھ بھال کرے گا اور خدا کی دی ہوئی نعمتوں کو ٹھکانے لگائے گا یہ کام اس کے علاوہ اور کوئی اس خوبی سے انجام نہیں دے سکتا۔

جب حضرت آدم کو اللہ تعالیٰ نے پیدا کیا اور زمین میں اپنا نائب بنایا، فرشتے جو پاک اور روحانی مخلوق ہیں جو نہ گناہ کرتے ہیں نہ گناہ کی خواہش رکھتے ہیں۔ بولے کہ اے مالک آپ ایسے کو اپنا نائب بنا رہے ہیں جو دنیا میں خون خرابہ کرے گا۔ ہم تیری پاکی بیان کرتے ہیں اور تیری عبادت میں مشغول رہتے ہیں یہ منصب ہم کو عطا فرما۔ خدا نے جواب دیا، تم اس بات کو نہیں جانتے ہو، خدا نے آدم اور فرشتوں کا امتحان لیا۔ چونکہ آدم اسی خاک کے تھے اُن کو دنیا استعمال کرنی تھی، اُن کی فطرت کو اس سے مناسبت تھی اس لیے وہ اس کی ایک ایک چیز سے واقف تھے، انھوں نے ٹھیک ٹھیک جواب دیا۔ فرشتوں کو ان چیزوں سے واسطہ نہ تھا اس لیے جواب نہ دے سکے، اس طرح خدا نے دکھا دیا کہ دنیا کے انتظام اور اس وقت کی تولیت کے لیے اپنی ساری کمزوریوں کے باوجود انسان ہی موزوں ہے۔ بلکہ یہ کمزوریاں اور ضرورتیں ہی اس کو اس منصب کا اہل ثابت کرتی ہیں۔ اگر اس دنیا میں فرشتے ہوتے تو دنیا کی اکثر نعمتیں بیکار ہی ثابت ہوتیں اور ان کی وہ ترقی ہرگز نہ ہوتی جو انسان نے اپنی ضرورت اور خواہش کی بنا پر دی۔

لیکن یہ بھی آپ کو یاد رکھنا چاہیے کہ نائب اور قائم مقام کا فرض ہے کہ قائم مقام بنانے والے کی پوری پوری پیروی کرے وہ اسکے اخلاق کا نمونہ اور پر تو ہو، اگر میں یہاں کسی کا قائم مقام ہوں تو کامیاب اور وفادار قائم مقام اُسی وقت کہلاؤں گا جب اپنی بساط بھر اس کی نقل کروں اور اپنے اندر اس کے اخلاق پیدا کروں۔ خدا کی نیابت یہ ہے کہ اپنے اندر اس کے اخلاق پیدا کیے جائیں اور اُس کی صفات سے مناسبت ہو۔ ہمیں بتلایا گیا ہے کہ اُس کی صفات و اخلاق میں علم، رحمت، حکم، احسان، انتظام، پاکبازی، عفو و درگذر، بخشش و عطا، عدل و انصاف حفاظت و نگرانی محبت، جلال و جمال، مجرمین سے گرفت و انتقام، جامعیت وسعت ہے، خدا کے پیغمبر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انسان کو تعلیم دی کہ خدا کے اخلاق اختیار کرو (تخلقوا باخلاق اللہ) انسان اپنے محدود انسانی دائرے میں اور اپنی تمام بشری کمزوریوں کے ساتھ ان اخلاق خداوندی اور ان صفات اللہ کا پر تو اپنے اندر پیدا کر سکتا ہے وہ کبھی خدا

نہیں ہوسکتا لیکن دنیا میں خدا کے اخلاق کا مظاہرہ کرسکتا ہے اور یہی ایک سچے نائب کا کام ہے آپ اندازہ کرسکتے ہیں کہ اگر انسان حقیقی طور پر اپنے کو خدا کا نائب سمجھنے لگے اور اخلاق خداوندی کو اپنی زندگی کا معیار بنائے تو خود اس کی ترقی و بلندی اور اس کے دور خلافت و نیابت میں دنیا کی خوش حالی اور سرسبزی کا کیا حال ہوگا؟ مذہب انسان کا بلند ترین اور معتدل ترین تصور بخشتا ہے۔ وہ انسان کو خدا کا نائب اور اس زمین کے انتظام میں اس کا قائم مقام اور اس عظیم الشان وقف کا اس کو متولی قرار دیتا ہے، اس سے بڑھ کر انسان کا اعزاز اور انسانیت کی معراج نہیں ہوسکتی۔

مگر انسانوں نے خود دو متضاد تصور قائم کیے۔ کہیں تو انسان کو خدا بنا لیا گیا اور اس کی عبادت ہونے لگی اور کہیں جانور سے بدتر سمجھ لیا گیا اور اس کو گائے بیل کی طرح ہنکایا جانے لگا۔ بعض انسان خود خدا بن بیٹھے اور بعض اپنے کو جانور سے بدتر سمجھنے لگے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ ہم کو صرف پیٹ سے کام ہے اور صرف قفس دیا گیا ہے، یہ دونوں تصور غلط ہیں بلکہ صریح ظلم ہے، نہ انسان خدا ہے نہ جانور، انسان، انسان ہی ہے لیکن نائب خدا ہماری دنیا اس کے لیے پیدا کی گئی ہے اور وہ خدا کے لیے، ساری دنیا اس کے سامنے جواب دہ ہے اور وہ خدا کے سامنے، یہ زمین یہ دنیا کسی کی ذاتی جائداد نہیں، ایک وقف ہے اور انسان اس کا متولی۔ اس تصور اور اس عقیدے کے بغیر دنیا کی چول ٹھیک نہیں بیٹھ سکتی۔ تاریخ کی شہادت ہے کہ جب انسان اس راہ راست سے ہٹا اور اپنی حد سے بڑھا اور خدا بننے کی کوشش کی اور اپنے کو دنیا کا حقیقی مالک سمجھا یا اپنے مرتبے سے گرا اور اپنے کو جانور سمجھا یا دنیا کے انتظام اور تولیت سے دست بردار ہوا اور زندگی کی ذمہ داریاں اور فرائض سے اس نے گریز کیا تو خود بھی برباد ہوا اور یہ دنیا بھی تباہ ہوئی۔

آج یورپ جس کے ہاتھ میں دنیا کی باگ ڈور ہے اور وہ انسانیت کا لیڈر بنا ہوا ہے، اس نے حیوانیت کے درجہ سے بھی ایک قدم آگے بڑھایا، اس نے انسان کا جمادانی تصور پیش کیا۔ وہ کہتا ہے کہ انسان روپیہ ڈھالنے کی مشین اور ایک کامیاب ٹکسال ہے۔ البتہ اس کے اندر خواہشات ہیں لیکن سراسر حیوانی یہ کوشش کہ وہ انسان کو صرف ایک مشین ہی رہنے دیتا جس کے اندر اپنی کوئی خواہش اور ارادہ نہیں۔ ستم بالائے ستم یہ ہے کہ وہ مشین بھی ہے اور خود غرض بھی اور مردم آزار بھی۔ یورپ کے اس دور قیادت میں سارا عالم ایک بے جان فیکٹری

بنتا جاتا ہے جس میں کبھی کبھی بڑا خطرناک ٹکراؤ ہو جاتا ہے۔ اس مشینی دور میں لطیف انسانی جذبات و احساسات، انسان سے ہمدردی، دل کا گداز ڈھونڈھنے سے نہیں ملتا، اس ٹکسال میں کہیں خدا کا نام نہیں، اس کی سچی طلب، دل سوزی نہیں۔ نہ آنکھوں میں نمی ہے نہ دل میں گرمی، نہ انسانیت کی لطافت ہے نہ قلب و روح کی حرارت۔ حالانکہ جس دل میں محبت اور معرفت نہیں وہ انسان کا دل نہیں پتھر کی سِل ہے، جس آنکھ میں کبھی آنسو نہ آئے وہ انسان کی آنکھ نہیں نرگس کی آنکھ ہے۔

اب سوائے روپیہ، پیٹ اور اغراض کے کچھ نہیں۔ میں اپنے شہر میں صبح ٹہلنے نکلتا ہوں تو مختلف پارٹیوں اور دوستوں کی ٹولیوں کے پاس سے گزرنا ہوتا ہے، ادھر سے دو آدمی گزرے اُدھر سے چار آدمی آئے لیکن برسوں حسرت رہی کہ ان مسلمان اور ہندو بھائیوں سے کچھ اور سنوں لیکن سوائے اس کے اور کچھ سننے میں نہیں آتا کہ آپ کی تنخواہ کتنی ہے؟ آپ کی بالائی آمدنی کیا ہو جاتی ہے؟ آپ کا تبادلہ کہاں ہو رہا ہے، فلاں افسر بد مزاج ہے، فلاں افسر بہت اچھا ہے۔ بیٹے کی شادی میں اتنا خرچ ہوا، بیٹی کو اتنا جہیز دیا، ہمارا فنڈ اتنا جمع ہے۔ فلاں کا بنک میں اتنا حساب ہے اور اب تو کرکٹ کا دور دورہ ہے، ہر جگہ کرکٹ کا تذکرہ۔ ہر جگہ کھیلنے والوں پر تبصرہ! میں کھیل کا مخالف نہیں خود بھی کھیلا ہوں اور اس کا ذوق رکھتا ہوں، ورزشوں اور مردانہ کھیلوں کو مفید اور ضروری سمجھتا ہوں، مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ یہی زندگی کا ایک موضوع بن کر رہ جائے اور صبح سے شام تک اس کے تذکرہ سے فرصت نہ ہو۔ آپ نے سُنا ہوگا کہ پاکستان میں ایک صاحب کا اس خبر سے ہارٹ فیل ہو گیا کہ ایک کھلاڑی ۹۹ رن بنا کر آؤٹ ہو گیا اور سنچری نہ بنا سکا۔ میں نے بعض سفروں میں دیکھا ہے کہ دو دو تین تین گھنٹے مسلسل کرکٹ کی ٹیم اور اس کے کھیل پر تبصرہ ہوتا رہا، ایک منٹ کے لیے بھی موضوع نہ بدلا۔ انسانو! تم نے دنیا کو کب بنایا؛ ٹکسال بنایا، کارخانہ بنایا، جنگ کا میدان بنایا مگر آدمیوں کی بستی نہ بنائی! پہلے ہر گاؤں ہر قصبے میں، اللہ کے ایسے بندے ہوتے تھے جن سے دل کی پیاس بجھتی تھی، جس طرح زبان کی ایک پیاس ہوتی ہے، اسی طرح دل کی بھی پیاس ہوتی ہے، زبان کی پیاس پانی، شربت، سوڈے لیمن سے بجھتی ہے۔ دل کی پیاس سچی اور پاک محبت کی باتوں اور محبوب حقیقی کے تذکرے سے بجھتی ہے۔ وہ روپیہ، دولت اور نفس کی خواہشات کے ذکر سے بھڑکتی ہے، آج ہر چیز کی دوکانیں

ہیں۔ منڈیاں ہیں، بازار ہیں لیکن دل کی دوا اور روح کی غذا نایاب ہوتی جاتی ہے اور کہنے والے عرصہ سے کہہ رہے ہیں ع

وہ جو بیچتے تھے دوائے دل وہ دوکان اپنی بڑھا گئے

آج نہ گھروں میں خدا کا ذکر ہے، نہ دلوں میں، حتیٰ کہ مسجدوں، مندروں میں بھی اس کا ذکر وفکر کم سے کم ہوتا جا رہا ہے۔ آج جگہ جگہ ہوا و ہوس اور نا و نوش کا شور برپا ہے۔ رہی سہی کمی، یہ سنیما پوری کر دیتے ہیں۔ جو حیوانی جذبات بھڑکانے کا خاص کام کرتے ہیں۔ روح بے قرار ہے اللہ کا بندہ کہاں جائے، اگر صرف پیسہ ہی کمانا انسان کا کام ہے اور پیٹ بھر لینا ہی اس کا فرض تھا تو یہ دل انسان کو کیوں دیا گیا۔ دماغ کیوں عطا کیا گیا۔ ایسی بے چین اور بلند پرواز روح کیوں بخشی گئی ایسی گوناگوں اور عجیب وغریب صلاحیتیں کیوں ودیعت کی گئیں ؟

یورپ نے انسان کو ایندھن سمجھ لیا، وہ اپنی عزت وخواہشات کے الاؤ میں انسانوں کو کوئلہ کی طرح ڈالتا جا رہا ہے۔ امریکہ کی خواہش ہے کہ شمالی کوریا اور کمیونسٹ چین کو بھینٹ چڑھا دے روس چاہتا ہے کہ قوم پرست چین کو تباہ کر کے رکھ دے۔ پورا یورپ چاہتا ہے کہ مشرق بعید یا مشرق وسطیٰ جنگ کا میدان بن جائے کسی کو انسانیت کا درد نہیں، کسی کے دل میں انسان کا احترام نہیں۔ سب خدا کی مملکت کے غاصب بننا چاہتے ہیں کوئی خدا کا نائب بننا نہیں چاہتا۔ کوئی اپنے کو اس مقدس وقف کا متولی نہیں سمجھتا۔

ایشیا اور افریقہ میں بھی حکومتوں کی بنیاد ہدایت ورہنمائی کے اصول، انسانوں کی فلاح وبہبود، اخلاقی اصلاح اور انسانیت کی ترقی پر نہیں۔ سب کی بنیاد مالی مسائل اور آمدنی کے وسائل کی ترقی واضافہ پر ہے، اُن کے نزدیک قوم کی اخلاقی حالت اور انسانی مسئلہ کوئی اہمیت نہیں رکھتا، اُس کے لیے کوئی مالی نقصان برداشت کرنے کے لئے تیار نہیں، اگر کسی غلط ادارہ، یا کسی تفریحی صنعت سے اس کو بڑی آمدنی ہوتی ہے اور قوم کے کسی طبقہ یا نئی نسل کو اس سے نقصان پہنچتا ہے تو وہ کبھی اس آمدنی سے دست بردار ہونے کے لیے تیار نہیں چاہے اُس کی نسلیں بالکل تباہ اور اخلاق بالکل برباد ہو جائیں۔

دوستو! اس وقت ایمان واخلاق اور انسانیت کا مسئلہ نہ حکومتوں پر چھوڑا جا سکتا

ہے، مدارس اور تعلیم گاہوں پر، یہ بڑا وسیع اور عالمگیر مسئلہ ہے۔ اس کے لیے ہم سب کو کوشش کرنے کی ضرورت ہے یاد رکھیے جس کام کو افراد اور عوام کرنے کے لیے تیار نہ ہوں اور جس کی اہمیت کا احساس جمہور اور عوام کو نہ ہو وہ کام جتنا بھی آسان ہو عمل میں نہیں آسکتا، اور بڑی سے بڑی حکومت بھی اس کو انجام نہیں دے سکتی۔ اس کے لیے عمومی اور عوامی کوشش کی ضرورت ہے۔ پیغمبروں نے اپنی ذات اور عام افراد کی کوشش سے دنیا میں انقلاب برپا کر دیا۔ ہم کو آپ کو ان کے نقش قدم پر چل کر اس کی کوشش کرنی چاہیے خود اپنی اصلاح کرنی چاہیے اور عام اصلاح کی کوشش کرنی چاہیے، اس کی کوشش کی جائے کہ انسان اس دنیا کو مقدس وقف اور اپنے کو ایک ذمہ دار متولی سمجھنے لگے، وہ اپنے کو اس دنیا میں خدا کی نیابت و خلافت کا اہل ثابت کرے اور اخلاق خداوندی کے ساتھ خدا کی مخلوق کے ساتھ برتاؤ کرے۔ یہی اصلاح کا طریقہ ہے اور اسی میں انسانیت اور دنیا کی نجات ہے۔

(الفرقان شعبان و رمضان ۱۳۶۳ھ)

ڈاکٹر مصطفیٰ السباعی مرحوم
ترجمہ السید محمد الحسنی

اسلامی تاریخ میں اوقاف اور رفاہ عام کے ادارے

کسی قوم کی زندگی کے ثبوت اور قیادت کے استحقاق کا سب سے اچھا پیمانہ یہ ہے کہ یہ دیکھ لیا جائے کہ اس کے افراد میں انسانی ہمدردی اور انسانیت دوستی اپنی اعلیٰ شکل میں اور وسیع پیمانہ پر موجود ہے یا نہیں، انسانیت نوازی اور انسانی ہمدردی کی وہ پاکیزگی اور لطافت جو سوسائٹی کے تمام طبقات پر ابر رحمت بن کر چھا جائے اور اس روئے زمین پر جتنے انسان اور حیوان پائے جاتے ہیں سب اس سے فیضیاب ہوں، یہی وہ جوہر ہے جس پر قوموں کی زندگی اور عروج، اور بقا و ترقی کا انحصار ہے اور جس کی بنیاد پر ایک قوم کو دوسری قوم پر ترجیح دی جا سکتی ہے۔

ہماری قوت اس شعبہ میں جس بلندی اور رفعت تک پہونچی ہے اس رفعت تک دنیا کی کوئی اور قوم نہیں پہونچ سکی، جہاں تک گزشتہ زمانوں کا تعلق ہے اس وقت دنیا کی قومیں اور تہذیبیں رفاہ عام اور فلاحی امور کا ایک بہت محدود تصور رکھتی تھیں جو معابد یا مدارس سے آگے نہیں راہ پا سکا تھا، جہاں تک موجودہ زمانہ کا تعلق ہے تو اس وقت مغربی قومیں باوجودیکہ وہ اجتماعی اداروں اور فلاحی مراکز کے ذریعہ انسانی ضروریات کو اچھے سے اچھے طریقہ پر پورا کرنے کی کوشش کر رہی ہیں، پھر بھی وہ انسانی ہمدردی، جذبۂ اخوت و مساوات، خلوص اور پاکیزگی لطافت حس اور لطافت خیال کے اس مرتبہ تک نہیں پہونچیں جہاں امت اسلامیہ اپنے دور

عروج میں پہونچ چکی تھی۔

حب جاہ، شہرت پسندی، ہر دلعزیزی کی خواہش، یہ وہ چیزیں ہیں جو اکثر اوقات ہم کو مغرب کے رفاہ عام کے کاموں کے نیچے کارفرما نظر آتی ہیں جب کہ ہماری ملت کو ان کاموں پر ابھارنے والی قوت صرف خدا کی رضا جوئی تھی، خواہ لوگوں کو ان کاموں کا علم ہو یا نہو، اس کی دلیل میں ہم سب سے پہلے صلاح الدین کو پیش کرسکتے ہیں، جنھوں نے اپنی ساری دولت رفاہ عامہ پر خرچ کردی۔ اور مصروشام کو ایسے اداروں اور اوقاف سے بھر دیا لیکن انھوں نے کبھی اس کی خواہش نہیں کی کہ کسی عمارت پر ان کا نام نقش ہو، اس کے برخلاف وہ ان پر اپنے وزراء، دوستوں، اور معاونین کا نام نقش کروایا کرتے تھے، اور یہ بے نفسی اور خلوص کی اعلیٰ مثال ہے۔

دوسری چیز یہ ہے کہ مغرب میں جو اجتماعی ادارے ہیں، ان سے اکثر اوقات صرف مغربی ہی فائدہ اٹھا سکتے ہیں، ان کے دروازے اور لوگوں کے لیے عموماً بند ہوتے ہیں، اس کے بالمقابل ہمارے اجتماعی اداروں اور اوقاف کے دروازے ہر انسان کے لیے ہر وقت کھلے رہتے تھے، خواہ اس کا مذہب، زبان اور قومیت کوئی ہو۔

تیسرا فرق یہ ہے کہ ہم نے عام انسانی بھلائی کے ایسے ایسے شعبوں میں ادارے اور اوقاف قائم کیے، جن سے اہل یورپ آج تک نا آشنا ہیں، یہ ایسے لطیف اور نازک شعبے ہیں جن کی تفصیل پڑھ کر حیرت ہوتی ہے، اور صاف نظر آتا ہے کہ امت اسلامیہ میں انسان نوازی اور انسانیت دوستی کا جو شفاف، ستھرا، پاکیزہ، گہرا اور مستحکم تصور ہے وہ دوسری قوموں میں بالکل ناپید ہے۔

قبل اس کے کہ ہم ان چند رفاہی اداروں اور اوقاف پر روشنی ڈالیں، مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ہم ان اصولوں کا بھی ذکر کرتے چلیں جو امت اسلامیہ کو ایسے اداروں کے قیام پر ابھارنے کے ذمہ دار اور محرک رہے تھے۔

اسلام اپنے پیروؤں کو خیر کی اس اندا ز اور اس قوت کے ساتھ دعوت دیتا ہے جس کے بعد بخل، حرص، خوف اور شیطانی وسوسوں کے لیے کوئی گنجائش باقی نہیں رہتی، قرآن مجید کا ارشاد ہے- اَلشَّيْطَانُ يَعِدُكُمُ الْفَقْرَ وَيَأْمُرُكُمْ بِالْفَحْشَاءِ وَاللهُ يَعِدُكُمْ مَغْفِرَةً مِنْهُ وَفَضْلًا ۔ وَاللهُ وَاسِعٌ عَلِيمٌ " شیطان تم کو فقر سے ڈراتا، اور

فحاشی کی ترغیب دیتا ہے، اور اللہ تعالیٰ تم سے مغفرت کا وعدہ فرماتا ہے اور اپنے فضل کا، اور اللہ بڑی وسعت والا اور سب کچھ جاننے والا ہے۔

وہ ہر با اختیار انسان کے لئے امور خیر میں حصہ لینا ضروری قرار دیتا ہے، خواہ وہ دولتمند ہو یا غریب، جو دولتمند ہے وہ اپنے مال اور اثر ورسوخ کے ذریعہ یہ خدمت کرے، جو غریب ہے، وہ اپنے دست وبازو اپنے قلب ودماغ، اور اپنی زبان کے ذریعہ یہ خدمت انجام دینے کی کوشش کرے۔

غریب لوگوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ایک مرتبہ یہی شکایت کی تھی کہ امراء اور دولتمند لوگ صدقہ وخیرات کرکے اجر کے مستحق ہوتے ہیں، اور ہم لوگ اس سے محروم ہیں، اس پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ بھلائی صرف مال پر منحصر نہیں ہے، ہر وہ کام جس سے دوسروں کو فائدہ پہونچے عمل خیر ہے، پھر آپ نے فرمایا، تمہارے لیے تسبیح بھی صدقہ ہے اچھائی کا حکم دینا اور برائی سے روکنا بھی صدقہ ہے، راستہ سے اینٹ پتھر، گندگی اور کانٹیں دور کرنا بھی صدقہ ہے، دو آدمیوں کے درمیان صلح کرانا بھی صدقہ ہے کسی آدمی کو اپنی سواری پر بیٹھتے وقت سہارا دینا بھی صدقہ ہے[1]

غرض اس طرح اسلام نے خیر وفلاح اور صدقہ وخیرات کے دروازے تمام انسانوں کے لیے کھول دیے ہیں، خواہ وہ تاجر ہوں یا مزدور یا کسان، طالب علم ہوں یا استاد، بوڑھے ہوں یا جوان، نابینا ہوں یا لاچار، مرد ہوں یا عورت، سب کے لیے صدقہ کرنا اور بھلائی کا کام کرنا آسان کر دیا گیا ہے۔ بغیر اس کے کہ ان کے اقتصادی حالات ان رفاہ عام کے کاموں میں حصہ لینے اور معاشرہ میں خیر وفلاح کی روشنی پھیلانے میں مانع ہوں، پھر اسلام نے اور بلند ہو کر اس انسانی ہمدردی کی تکمیل کر دی جب اس نے اعلان کیا کہ مذہب اور زبان، قوم ووطن اور رنگ و نسل کے امتیاز کے بغیر ہر شخص کے ساتھ بھلائی کرنا چاہیئے۔

حدیث میں آیا ہے، الخلق کلهم عیال الله فاحبهم الیه انفعهم لعیاله[2]

---

[1] بخاری ومسلم　[2] طبرانی وعبدالرزاق۔

(ساری مخلوق خدا کا کنبہ ہے، اس کو سب سے زیادہ محبوب وہ ہے جو اس کے کنبہ کے لیے سب سے زیادہ مفید ہو) پھر یہ دیکھیے کہ اسلام کن کن طریقوں سے انسان کو ان کاموں پر آمادہ کرنے کی کوشش کرتا ہے اور اس کو یہ یقین دلاتا ہے کہ بھلائی کا جو بھی کام وہ کرے گا اس کا اجر و ثواب سب سے پہلے اسی کو ملے گا "وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ شَيْءٍ فَلِأَنْفُسِكُمْ" "مَنْ عَمِلَ صَالِحًا فَلِنَفْسِهٖ" جو صدقہ اور خیرات تم کرو گے اس کا فائدہ تم ہی کو پہونچے گا، جس نے کوئی اچھا کام کیا اپنے ہی لیے کیا۔

ہر شخص کو اپنی ذات عزیز ہے، ہر انسان میں انانیت کی خو بو کسی نہ کسی درجہ میں ضرور پائی جاتی ہے، ایسے شخص کے لیے یہی اسلوب مناسب ہے، جو ایک بخیل کو سخاوت پر آمادہ کر سکے۔

جب یہ آیت نازل ہوئی "مَنْ ذَا الَّذِيْ يُقْرِضُ اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا فَيُضَاعِفَهٗ لَهٗ أَضْعَافًا كَثِيْرَةً"[1] تو ایک صحابی نے جن کا نام ابو الدحداح تھا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے استفسار کیا کہ کیا اللہ تعالےٰ اپنے بندوں سے قرض بھی لیتا ہے، آپ نے فرمایا، ہاں، انھوں نے کہا یا رسول اللہ دست مبارک بڑھائیے پھر آپ کو گواہ بنا کر انھوں نے اپنا باغ صدقہ کر دیا، ان کے پاس یہی تنہا باغ تھا جس میں سات سو پھلدار کھجور کے درخت تھے پھر وہ اپنی بیوی کے پاس آئے جو بال بچوں کے ساتھ اسی باغ میں مقیم تھیں، اور ان کو اس کارروائی کی خبر دی، انھوں نے سن کر فوراً باغ خالی کر دیا، اور کہا، آپ کا سودا بہت کامیاب رہا، ابا الدحداح!

جب یہ آیت نازل ہوئی "لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰى تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ"[2] (تم نہیں پا سکتے بھلائی یہاں تک کہ خرچ کرو اس میں سے، جس سے تم کو محبت ہے) تو حضرت ابو طلحہ انصاری نے کہا کہ میری املاک میں مجھے سب سے زیادہ محبوب بیرحاء ہے (یہ کنواں تھا جس کا پانی بہت شیریں تھا) اب میں اس کو اللہ کی راہ میں صدقہ کرتا ہوں اور اللہ تعالےٰ سے اس کے اجر کا امیدوار ہوں، آپ منشائے الٰہی کے مطابق اس کا انتظام فرما دیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ایسا نہ کرو، ایسا نہ کرو، یہ بہت فائدہ والی چیز ہے اصل کو باقی رکھو اور اس کے فائدے کو وقف کر دو۔[3]

---

[1] البقرہ ۲۴۵ [2] آل عمران ۹۲ [3] تفسیر ابن کثیر

چنانچہ یہ صدقہ اسلام میں پہلا وقف تھا۔

وقف وہ سنگ بنیاد تھا جس پر ہمارے تمام اجتماعی اور فلاحی اداروں کی بنیاد رکھی گئی، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سب سے پہلے اپنی امت کے لیے اس کا نمونہ پیش فرمایا، آپ نے سات باغ وقف فرمائے تھے جس کا اختیار آپ کو بعض مجاہدین نے دیا تھا کہ ان کی وفات کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان کے ساتھ جیسا چاہیں تصرف فرمائیں، آپ نے ان کو فقرا اور مساکین، مجاہدین اور اہل حاجت کے لیے وقف کر دیا۔ پھر آپ کے بعد عمر بن خطاب نے خیبر میں زمین وقف کی، پھر ان کے بعد حضرت ابوبکر، عثمان، علی، زبیر، معاذ رضی اللہ عنہم اور دوسرے صحابہ کرام نے وقف کیے، شاید ہی کوئی صحابی ایسا رہا ہو جس نے کچھ وقف نہ کیا ہو حضرت عمرؓ کے عہد میں یہ کام پھر تازہ ہو گیا جب آپ نے اپنے عہد خلافت میں کچھ زمین وقف فرمائی، اور مہاجرین و انصار کے کچھ لوگوں کو اس کا گواہ بنایا۔ جابر بن عبداللہ الانصاری کہتے ہیں کہ میں نہیں جانتا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب کرام مہاجرین و انصار میں سے کوئی صاحب ثروت اور صاحب استطاعت ہوا ہو اور اس نے اپنا مال کچھ وقف نہ کیا ہو، جو نہ خریدا جا سکتا ہے، نہ وراثت میں ملتا ہے، نہ ہبہ ہو سکتا ہے۔ پھر ان کے بعد مسلمان آراضی، باغات مکانات وغیرہ برابر وقف کرتے رہے، جس کی وجہ سے اسلامی سوسائٹی ایسے اداروں اور ایسے اوقاف سے بھر گئی اور ان کی اتنی کثرت ہوئی کہ ان کا شمار مشکل ہو گیا۔

یہ اوقاف اور ادارے دو قسم کے تھے،

ایک قسم تو وہ تھی جن کی ذمہ دار حکومت ہوتی تھی اور وہی اس کا انتظام کرتی تھی۔ اور ایک قسم ان اوقاف کی تھی جس کو انفرادی طور پر امراء، رؤسا، بیگمات، اور عام دولت مند لوگ قائم کرتے تھے، اس موقع پر ان اوقاف کی تمام قسموں پر روشنی ڈالنا ہمارے لیے مشکل ہے اس لیے ہم چند پر اکتفا کریں گے۔

ان اوقاف اور اداروں میں سرفہرست مساجد ہوتی تھیں، لوگ رضائے الٰہی اور حصول ثواب کے لیے کثرت سے مساجد تعمیر کرواتے تھے۔ بادشاہ بڑی بڑی عالیشان، پر شکوہ مساجد تعمیر کرواتے، اس سلسلہ میں ولید بن عبدالملک نے جامع اموی کی تعمیر پر جس طرح بے حساب و بے دریغ خرچ کیا، اس کی تفصیلات سن کر آدمی حیرت زدہ رہ جاتا ہے۔

دوسرے نمبر پر مدارس اور ہسپتال تھے جن کے لیے ایک مستقل مضمون درکار ہے۔ اس کے علاوہ سرائے اور ہوٹل جہاں مسافر اور اہل حاجت جب چاہیں ٹھیر سکتے تھے، خانقاہیں بھی قائم کی گئی تھیں، جہاں دلجمعی اور یکسوئی کے ساتھ آدمی خدا کی عبادت کر سکے، ان غرباء کے لیے جو مکان خریدنے یا کرایہ پر لینے کی استطاعت

نہ رکھتے ہوں خصوصی مکانات تھے۔ عام گزرگاہوں پر سبیلیں لگی تھیں تاکہ لوگوں کو پیاس کی تکلیف نہو، عوامی باورچی خانے یا لنگرخانے کا بہت رواج تھا جہاں سے روٹی سالن اور مٹھائی تقسیم کی جاتی تھی، ابھی کچھ عرصہ کی بات ہے دمشق کے تکیہ سلطان سلیم اور تکیہ شیخ محی الدین میں اس کا رواج تھا۔

حجاج کے لیے مکہ میں مکانات وقف کیے جاتے تھے تاکہ ان کو سہولت ہو چنانچہ ان مکانوں کی اتنی کثرت ہوئی کہ پورے مکہ میں صرف اوقاف ہی کے مکانات نظر آنے لگے، بعض فقہاء نے یہ فتویٰ بھی دیا تھا کہ مکہ میں کرایہ پر مکان اٹھانا ناجائز ہے اس لیے کہ وہ سب حجاج کے لیے وقف ہیں۔

غیر آباد راستوں، ویرانوں، صحراؤں میں کنووں کی تعمیر ہوتی تھی تاکہ پانی پینے کے علاوہ وہ لوگوں کی کھیتی باڑی اور مویشیوں کے کام آسکیں، بغداد اور مکہ دمشق اور مدینہ کے درمیان بالخصوص، اور تمام بڑے اسلامی شہروں کے درمیان بالعموم ایسے کنوؤں کی اتنی کثرت تھی کہ مسافروں کو پیاس کا بہت کم سامنا ہوتا تھا۔

لوگ سرحدوں پر فوجی سامان کے ذخیرے بھی وقف کرتے تھے تاکہ غیر ملکی حملہ کا مقابلہ اچھی طرح کیا جا سکے یہاں سے مجاہدین کو ہتھیار، سامانِ حرب اور خوراک وغیرہ ملتی تھی عباسیوں کے عہد میں روم کے حملوں کا مقابلہ کرنے اور صلیبی جنگوں میں مغربیوں کے حملوں کو روکنے میں ان اوقاف کو بڑا دخل تھا۔ لوگ گھوڑے تلواریں، تیر کمان اور دوسرا جنگی سامان بھی مجاہدین کے لیے وقف کرتے تھے جس کی وجہ سے جنگی صنعت اور کارخانوں کے قیام میں بڑی مدد ملی، اور ان کی بہت ہمت افزائی ہوئی اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ خود یورپین (جنگ بندی کے دنوں میں) ہتھیار خریدنے ہمارے یہاں آتے تھے، اور علماء ان کے ہاتھ ہتھیار بیچنا حرام قرار دیتے تھے، افسوس کہ اب معاملہ بالکل برعکس ہو گیا ہے، اب ہم خود اہل یورپ کے سامنے دست سوال دراز کرتے ہیں اور سخت شرطوں کے باوجود جو ہماری آزادی سالمیت اور وقار کو مجروح کرتی ہیں ان سے معاملہ کرنے پر مجبور ہوتے ہیں۔

اس کے علاوہ کچھ اوقاف ایسے تھے جن کا منافع جہاد کے خواہشمند لوگوں کو اور ان فوجیوں کو جن کی پوری کفالت حکومت نہیں کر سکتی تھی، ملتا تھا، ان تمام باتوں کی وجہ سے ہر شخص کے لیے جو اپنی جان راہِ خدا میں دینا چاہتا ہو اور مرتبہ شہادت حاصل کرنا چاہتا ہو بہت سہولتیں اور آسانیاں پیدا ہو گئی تھیں، اس حالت کا ذرا اپنی موجودہ حالت سے مقابلہ کیجیے، آج ہم اسلحہ بندی کا ہفتہ مناتے ہیں، اور فوج کے لیے پبلک سے چندہ وصول کرتے ہیں، اگر ہمارا سیاسی و اجتماعی شعور بیدار، اور ہمارا ایمان پختہ اور سچا ہوتا

تو آج ہر سال میں ایک مرتبہ نہیں روزانہ کارخانے قائم کرتے اور اپنی فوج کو دنیا کی سب سے زیادہ طاقتور اور منظم فوج بنا سکتے۔

بہت سے اجتماعی ادارے ایسے تھے جو شہر پناہوں اور پلوں وغیرہ کی مرمت کے لیے قائم تھے، مقبروں کے لیے بھی وقف ہوتا تھا بعض آدمی زمین کا ایک بڑا حصہ مسلمانوں کے عام قبرستان کے لیے وقف کرتے تھے۔

غرباء کی تجہیز و تکفین کے لیے بھی اوقاف تھے۔

اجتماعی کفالت کے لیے جو اوقاف اور فلاحی ادارے تھے ان کو دیکھ کر ہماری حیرت میں اضافہ ہوتا ہے گمشدہ اور لاوارث بچوں کے لیے یتیموں کے لیے خاص مراکز تھے، جہاں ان کی پرورش و پرداخت و نگہداشت اور تربیت کا پورا انتظام تھا۔ لاچار، نابینا اور معذور و اپاہج لوگوں کے لیے ادارے تھے جہاں ان کو پورے احترام کے ساتھ رکھا جاتا تھا اور ان کے قیام و طعام و لباس اور تعلیم تک کا انتظام ہوتا تھا۔

قیدیوں کے لیے مراکز تھے جہاں ان کے معیار زندگی بلند کرنے اور ان کی صحت کے لیے ضروری اور مناسب غذا کا انتظام تھا۔ لاچار اور نابینا لوگوں کے لیے ایک وقف تھا جس میں ان لوگوں کو ساتھ لے کر چلنے اور ان کی خبرگیری کے لیے آدمی مقرر تھے۔

غیر شادی شدہ نوجوان لڑکے اور لڑکیوں کے لیے جن کے والدین ان کی شادی کے مصارف اور مہر وغیرہ برداشت کرنے کی استطاعت نہ رکھتے ہوں اوقاف تھے جس کے ذریعہ ان کی شادی کا انتظام کیا جاتا تھا، کتنا پاکیزہ تھا یہ جذبہ، اور آج کتنے محتاج ہیں ہم اس جذبہ کے!

کچھ اوقاف ایسے تھے جن سے ماؤں کو دودھ اور شکر ملتی تھی، آج ہمارے یہاں دودھ کا جو پوائنٹ قائم ہے، یہ اس سے بہت عرصہ پہلے کی بات ہے، پھر سب سے بڑی بات یہ ہے کہ یہ سب خلوص کے ساتھ اور طلب اجر کے لیے ہوتا تھا، نام و نمود، شہرت اور مقبولیت کے لیے نہیں!

صلاح الدین کے جہاں اور بہت سے کارنامے ہیں، وہاں اس کا ایک کارنامہ یہ بھی ہے کہ اس نے قلعہ کے ایک دروازہ پر (جو آج بھی دمشق میں دیکھا جا سکتا ہے) دو میزاب (پرنالے) بنائے تھے۔ ایک سے دودھ بہتا تھا، دوسرے سے شربت، ہفتہ میں دو بار ضرورت مند مائیں آتی تھیں اور اپنے بچوں کے لیے جتنا چاہتی تھیں دودھ اور شربت لے جاتی تھیں۔

اس سے زیادہ حیرت انگیز اور لطیف وقف وہ تھا جہاں چینی کے برتن رہتے تھے وہ نوکر جس سے

راستہ میں غلطی سے چینی کا کوئی برتن ٹوٹ جائے وہ اپنے آقا کی ناراضگی سے بچنے کے لیے یہاں سے اسی قسم کا برتن لے لیتا تھا، اور اس کے آقا کو خبر بھی نہیں ہوتی تھی۔[۱]

آخر میں پھر ان اداروں اور اوقاف کی باری آتی ہے جو مریض جانوروں کے علاج معالجہ، ان کی نگہداشت اور پرورش کے لیے تھے، دمشق کا وہ وسیع سبزہ زار جس پر آج اسٹیڈیم قائم ہے ایک زمانہ میں بوڑھے گھوڑوں اور مویشیوں کے لیے وقف تھا جہاں وہ رہتے اور چرتے، یہاں تک کہ ختم ہو جاتے تھے۔

تو یہ کل ۳۰ قسمیں ہوئیں ان رفاہ عام کے اداروں اور اوقاف کی جو ہماری تاریخ کے روشن دور میں بکثرت پائے جاتے تھے، کیا دوسری گزشتہ قوموں میں اس کی نظیر مل سکتی ہے بلکہ اس میں بہت سے ایسے اوقاف ہیں جن کی مثال آج کے "ترقی یافتہ" تمدن میں بھی نہیں مل سکتی، یہ تھا راز ہمارے عروج اور عزت و شوکت کا جب کہ پوری دنیا پر غفلت، جہالت اور پسماندگی کے دبیز اور تاریک پردے پڑے ہوئے تھے۔

یہ تھا راستہ ہمارے عروج اور عزت و شوکت کا جس پر چل کر ہم نے ستم زدہ اور مظلوم انسانیت کے زخموں پر مرہم رکھا تھا، اور اس کو نئی فضاؤں سے آشنا کیا تھا۔

آج ہمارا راستہ کیا ہے اور ہم کس منزل پر ہیں؟

کہاں ہیں وہ مبارک ہاتھ جو یتیم کے آنسو پونچھیں، اور لوگوں کے زخموں پر مرہم رکھیں، اور ہماری سوسائٹی کو پھر ایک متحد اور ہم آہنگ، ہم عقیدہ و ہم خیال سوسائٹی بنا دیں جہاں بھلائی اور سچائی اور امن و سلامتی کا دور دورہ ہو۔ (الفرقان بابت جمادی ۱۳۸۳ھ)

[۱] اس سے ملتا جلتا بلکہ لطافت حسن اور نازک خیالی میں شاید اس سے بھی زیادہ ایک وقف اور تھا جس کا تعلق ہسپتال سے تھا اس کا ذکر مصنف نے کتاب کی دوسری فصل کے تحت کیا ہے، ہسپتال میں ایسے آدمی مقرر تھے جو مریضوں کے وارڈ میں وقتاً فوقتاً جاتے رہیں اور مریض کے پلنگ کے پاس سے گزرتے ہوئے آپس میں یہ سرگوشیاں کریں کہ اب تو اس کی صحت خاصی اچھی معلوم ہوتی ہے، شاید دو ایک روز میں ان لوگوں کو وارڈ چھوڑ دینے کی اجازت مل جائے لیکن اس انداز میں کہ مریض اس کو سن سکے اور اس کی صحت پر اس بات کا نفسیاتی اثر پڑے۔ آج ترقی یافتہ ہسپتالوں میں مریضوں کے لیے ہلکی ریکارڈنگ کا انتظام کیا گیا ہے۔ یورپ و امریکہ میں اس سے کچھ آگے بڑھ کر اس کا انتظام کیا جا رہا ہے کہ ٹیلی فون پر ایسی لڑکیاں مقرر کی جائیں جن سے مریض اپنا دل بہلانے کے لیے وقت ضرورت بات کر سکیں، لیکن جتنی ذہانت، لطافت خیال اور انسانی ہمدردی اور محبت ہمیں اسلامی وقف میں نظر آتی ہے وہ موخر الذکر میں مفقود ہے۔ م م ح

عتیق الرحمٰن سنبھلی

اجتماعی بہبود کی شاہ کلید

زمانے کے اثرات بھی کیا ہوتے ہیں کہ دو اور دو چار کی طرح کھلی ہوئی صداقتیں بھی اچھے اچھے سمجھدار لوگوں کے لیے ناقابل فہم بلکہ قابل اعتراض ہو جاتی ہیں! کس قدر واضح اور حقیقت پسندانہ بات ہے کہ جب تک سوسائٹی میں اخلاقی احساس، ذمہ داری کا پاس اور فرائض کا شعور قوی نہ ہو، اجتماعی خوشحالی کے بڑے سے بڑے نقشے، بڑے منصوبے، عظیم سے عظیم ترقیاتی اسکیمیں اور بہتر سے بہتر قانونی تدبیریں اپنے خاطر خواہ نتائج تک نہیں پہنچ سکتیں، جو کچھ کام ہوگا وہ اصل کے مقابلہ میں بہت تھوڑا ہوگا، اور اس سے بہت زیادہ مصارف میں ہوگا جتنے مصارف میں ایک زندہ اخلاقی احساس اور فرائض کے قوی تر شعور کے ساتھ ہو سکتا تھا — اس بات کو دوسرے انداز میں یوں کہہ لیجیے کہ انسان کے اجتماعی مسائل کی کلید یہ ہے کہ اسے صحیح معنیٰ میں انسان بنایا جائے۔ اس کی اخلاقی حس اس حد تک بیدار کی جائے کہ وہ اپنے ابنائے جنس کے حقوق پہچانے اور اپنے حقوق میں حد سے تجاوز نہ کرے۔ اس میں فرائض کا ایسا شعور پیدا کیا جائے کہ کوئی بڑے سے بڑا لالچ اور اونچے سے اونچا ذاتی فائدہ اُسے فرض سے انحراف اور اجتماعی مفاد سے روگردانی پر آمادہ نہ کر سکے۔ کتنی صاف اور سیدھی اور دو اور دو چار کی طرح کھلی ہوئی بات ہے۔ مگر ذرا حیرت نہ کیجیے کہ بعض اچھے اچھے ارباب فہم کے نزدیک یہ رجعت پسندی اور عوامی مسائل سے روگردانی ہے۔ اس لئے کہ اس میں زور ہے اخلاق اور انسانیت پر، درانحالیکہ آج انسان کو ضرورت ہے روٹی اور کپڑے کی، مکان کی، اور سستی دوا اور تعلیم کی!

جنتا کا غم کھانے والے بزرگو! یہ کون کہتا ہے کہ تم زرعی اور صنعتی منصوبے نہ بناؤ، ترقیاتی

اسکیمیں نہ چلاؤ، دولت کی منصفانہ تقسیم کے لیے مفید قوانین بروئے کار نہ لاؤ، اسپتالوں اور تعلیم گاہوں کا جال نہ بچھاؤ؟ ——— یہ سب کچھ کرو، اور ضرور کرو، مگر کہنے والوں کا کہنا یہ ہے کہ اس کے ساتھ اس حقیقت کو بھی دیکھو کہ یہ سارے کام صرف چند مخلص اور دردمند لوگوں کے کاغذ پر نقشہ بنا دینے سے نہیں ہو جائیں گے، بلکہ ان کو تکمیل تک پہنچانے کے لیے لاکھوں اور کروڑوں آدمیوں کی ضرورت ہو گی۔ پھر ان کے نتائج کو عام آدمیوں تک پہنچانے میں بھی لاکھوں افراد ہمیشہ واسطے کی حیثیت سے درکار رہیں گے۔ لہذا ناگزیر ہے کہ جس سوسائٹی سے یہ افراد مہیا ہوتے ہیں اس میں کیر کٹر کی بلندی اتنی عام ہو کہ وہ بیک وقت لاکھوں فرض شناس اور باضمیر کارکن فراہم کر سکے۔ بلکہ ان منصوبوں اور اسکیموں کے نتائج کی صحیح تقسیم کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ سوسائٹی میں کم از کم بنیادی اخلاقی اور انسانی احساسات اس قدر عام ہوں کہ لوگ اپنے حقوق اور اپنی ضروریات کی طرح دوسروں کے حقوق اور دوسروں کی ضروریات کو سمجھیں اور (الا ماشاء اللہ) کوئی شخص اپنے ذاتی حصہ سے زیادہ حاصل کرنے کے لیے دوسروں کے حقوق کو پامال اور ان کی ضروریات کو نظر انداز نہ کرے۔

ان دونوں باتوں کی ضرورت سمجھنے کے لیے کہیں دور جانے کی ضرورت نہیں ہے۔ ایک نہایت قریب کی مثال لے لیجیے۔ آج کل ہمارے صوبے میں غذائی اجناس کی گرانی اور کمیابی کا مسئلہ وقتی طور پر حل کرنے کے لیے غلہ کی سرکاری دوکانوں کا سسٹم جاری کیا گیا ہے۔ کون نہیں جانتا کہ اس اسکیم سے جتنی سہولت اور جتنا فائدہ عوام کو پہنچنا چاہیے تھا وہ نہیں پہنچ رہا ہے۔ کیوں؟ اس لئے کہ اولاً تو بہت سے سرکاری اہلکار جن کے ہاتھوں میں ان دوکانوں کے پرمٹ اور لائسنس کا اجراء ہوتا ہے۔ وہ فرض شناس نہیں ہوتے کہ پبلک مفاد کے پیش نظر اپنے اندازہ کی حد تک اچھے سے اچھے آدمی منتخب کریں۔ بلکہ اقربا نوازی اور رشوت خوری کا سلسلہ چلتا ہے۔ پھر سرکاری اہلکاروں کا کام ختم ہو کر دوکانداروں کا کام شروع ہوتا ہے تو ان کا بس چلتا ہے تو بلیک کرتے ہیں یا اچھا مال بجائے ناجائز منفعت خوری کے لیے رکھتے ہیں اور گھٹیا مال ملا کر سرکاری نظم کے الٹ فروخت کرتے ہیں۔ اس کے بعد خریدار جنتا کا نمبر آتا ہے تو روزمرہ کی بات ہے کہ بہت سے لوگ عجیب عجیب ہتھکنڈوں سے کئی کئی حصے اڑا لے جاتے ہیں اور بہت سے مستحق اور ضرورت مند محروم رہ جاتے ہیں

پاکر از کم پریشان ہوتے ہیں۔[1] یہ آخر کس چیز کا نتیجہ ہے سوائے اس کے کہ جن لوگوں کے ہاتھوں میں اس اسکیم کا نفاذ ہے وہ فرض شناس اور بے غرض نہیں ہیں، اور عوام جن کی سہولت اور راحت کے لیے یہ اسکیم چلائی گئی ہے ان میں باہمی حقوق شناسی اور انسانیت کے بنیادی تقاضوں کا احساس (یا وقت کی زبان میں کہئے کہ اجتماعی شعور) نہیں ہے۔

جب معمولی منافع اور محض ضروریات کے معاملہ میں ہماری سوسائٹی کا حال یہ ہے تو ذرا قیاس کیجیے ان بڑے بڑے منصوبوں اور ترقیاتی اسکیموں کے بارے میں جہاں قدم قدم پر لاکھوں کے وارے نیارے ہو سکتے ہیں جہاں بستیوں کے لیے انتخابات کیے جا سکتے ہیں، جہاں رشوت خوری اور اقربا نوازی کے تحت کمیٹیاں کی کمیٹیاں کھپائی جا سکتی ہیں۔ جہاں ان منصوبوں اور اسکیموں کے نتائج کو عوام تک پہنچانے والے بڑے اور چھوٹے کارکن مستقل طور سے ناجائز روپیہ کما سکتے ہیں اور پھر جہاں پبلک کے افراد ان نتائج کو حاصل کرنے میں دوسروں کے حقوق پر ڈاکہ ڈال کر وسیع تر منافع کی امید رکھ سکتے ہیں۔

ہمیں حیرت ہے کہ ہر وقت کے دانش مندوں اور عوام کے غم خواروں کو یہ بات کیوں کر بے وقت کی راگنی نظر آتی ہے کہ ہمارے ملک کا بنیادی مسئلہ لوگوں میں اخلاقی اور انسانی حس اور احساس فرض کو بیدار کرنا ہے۔ ہم سمجھتے ہیں کہ واقعات اور نتائج کی منطق میں بڑی طاقت ہے۔ لیکن اگر یہ منطق بھی عوامی مسائل میں سر کھپانے والوں کو اس بنیادی مسئلہ کی طرف متوجہ نہیں کرتی، اور وہ مصر ہیں کہ وہ اس شاہ کلید (MASTER KEY) سے بے نیاز رہ کر ہی عوام کے مسائل اور مصائب کا حل نکالیں گے تو اسے ملک کے عوام کی بدقسمتی کے سوا کیا کہئے؟

(الفرقان محرم ۱۳۸۰ھ)

---

[1] حسن اتفاق کہئے کہ ریاستی کونسل کے موجودہ اجلاس میں ۱۱ر اگست کو ریاستی وزیر غذا نے اور ۱۲ر اگست کو متعدد ممبران کونسل نے اس بات کی بہت کھلے الفاظ میں شکایت کی ہے کہ غلہ کی دوکانوں کا الاٹ منٹ نامناسب آدمیوں کو ہوا ہے۔ اور اس کی وجہ سے کافی بدعنوانیاں ہو رہی ہیں۔

ملاحظہ ہو قومی آواز لکھنؤ ۱۲ر اور ۱۳ر اگست ۱۹۶۰ء

چائے
کے تھوک اور خوردہ بیوپاری
لبرٹی ٹی کمپنی
ہوٹل کی ترقی
اور
خریداروں کی
پسند کی خاطر
ہمیشہ ہماری ارزاں اور بہترین چائے استعمال کیجئے
لبرٹی ٹی کمپنی
حسینی بلڈنگ، دوکان نمبر ۔ ایس، وی، پٹیل روڈ
نل بازار ۔ بمبئی ۳

عتیق الرحمن سنبھلی

زندگی میں اطمینان ومسرت کا راز

انسانی زندگی کی پوری تاریخ پر نظر ڈال جائیے، انسانی زندگی کو مسرور ومطمئن بنانے کے جتنے وسائل اور جتنی فکر جس عمومیت اور ہمہ گیری کے ساتھ آج پائی جاتی ہے کسی بھی پچھلے دور میں نظر نہ آئے گی! انسانی زندگی کا کوئی گوشہ آج ایسا نہیں جس میں راحت وسہولت اور آرام و اطمینان کے سامانوں کی بھرمار سائنس نے نہ کر رکھی ہو۔ اور شاید ہی کوئی خطۂ ارض آج ایسا ہو سکے جس میں زندگی کے ان فلسفوں اور ان نظاموں کی گونج نہ پہنچیں جو انسانی نے جنم دیا ہے! آج تقریباً ہر آزاد ملک کے تمام وسائل اور اس کے شہریوں کی تمام قوتیں حکومت کے نقطہ پر مجتمع ہو کر انسانی مساوات، سماجی انصاف، مصائب سے نجات اور رفاہیت وخوشحالی کے نام پر صرف ہو رہی ہیں۔ اور بین الاقوامی نشستگاہ پر ہر ملک اپنے اس یقین وایمان کا اظہار کر رہا ہے کہ بین الاقوامی انصاف ہی میں سب کی خیر اور سب کا امن واطمینان ہے ——— لیکن بین الاقوامی سطح ہو یا ملکوں کی داخلی زندگی کا میدان، جہاں بھی دیکھئے یہ حقیقت ہے کہ انسانی زندگی جتنی عمومیت کے ساتھ جتنی بےچین، جتنی مضطرب اور جتنی پریشان آج ہے، شاید کبھی نہیں تھی۔

یہ آخر قصہ کیا ہے؟ اور وسائل وفکر کی روز افزونی کے باوجود یہ درد بجائے گھٹنے کے بڑھتا کیوں جا رہا ہے؟

ہو سکتا ہے کسی کو اس قصہ میں پیچیدگی نظر آئے، مگر حقیقت یہ ہے کہ جو کچھ ہو رہا ہے بالکل ٹھیک ہو رہا ہے اور نتائج کے اسباب بالکل واضح ہیں۔

اس کائنات کی ہر شے کی فلاح وبہبود اور تعمیر وترقی کے کچھ فطری اصول وقوانین ہیں۔ ان اصول وقوانین سے انحراف کر کے اگر کوئی چاہے کہ اُسے فلاح وبہبود اور پرسکون زندگی کی منزل

مل جائے تو اس کی فکر میں خواہ وہ زندگی کے شب و روز ایک کر دے اور اس کے ظاہری وسائل سے زندگی کے ایک ایک گوشہ کو معمور کر دے مگر فطرت کی راہ سے ہٹنے کے بعد نہ یہ فکر حسب خواہش نتیجہ تک پہونچا سکتی ہے اور نہ یہ وسائل اپنے مقصد کو پورا کر سکتے ہیں۔

کائنات عالم کی تمام دوسری انواع موجودات اپنی زندگی کے ان فطری اصول و قوانین کی بے چون و چرا پابند ہیں، اور ان کے اندر ان سے انحراف کے اختیار و ارادہ کا کوئی نام و نشان تک نہیں ہے۔ صرف ایک نوعِ انسانی ہے جس کو خالق کائنات نے اپنی خلافت کا منصب عطا کرنے کی بنا پر اپنے ادھارِ ارادہ و اختیار سے متصف کر کے دوسری تمام انواعِ مخلوقات سے ممتاز کر دیا ہے چنانچہ انسان مجبور نہیں ہے کہ وہ اپنے حرکات و سکنات اور افعال و اطوار میں کسی خاص نظام زندگی کی پابندی کرے۔ مگر اس کی فلاح و بہبود کے لیے بہرحال کچھ فطری اصول و قوانین ہیں، اور کائنات کا یہ بے لاگ قانون اس پر بھی نافذ ہے کہ جو چیز بھی اپنی فلاح و بہبود کے فطری اصول و قوانین سے بے نیاز ہو کر چلے گی وہ چاہے سر پٹخ کر مر جائے، حقیقی اور دائمی فلاح و بہبود سے کسی طور پر بھی ہمکنار نہ ہو سکے گی۔

افراد انسانی کی فطرت میں حرص و طلب اور ہوا و ہوس کا جو مادہ ہے وہ نوعِ انسانی کے کسی فرد سے بھی پوشیدہ نہیں ہے۔ اور اس کی بڑی اچھی تعبیر ایک حقائق شناس فطرت نے اس طرح کی ہے کہ

"لو کان لابن آدم وادیان من مالٍ لا تبغی ثالثاً	اگر آدم کے کسی بیٹے کے پاس دو وادیاں بھر کر مال و دولت ہو تو اس کی فطرت طلب اس پر بھی قانع نہیں رہ سکتی بلکہ اس کی خواہش ہوگی کہ اس میں ایک کا اضافہ اور ہو جائے۔
(محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم)	

بلکہ خود انسان کے خالق کا بیان ہے کہ۔

اِنَّهٗ لِحُبِّ الْخَيْرِ لَشَدِيْدٌ	بیشک انسان کے اندر حُبِّ مال و جاہ کا بڑا ہی شدید مادّہ ہے۔
(قرآن)	

انسان کی اس فطری افتاد پر نظر کرنے کے بعد کوئی بھی سوچنے والا انسان اس نتیجہ پر پہونچے بغیر نہیں رہ سکتا کہ اگر نوعِ انسانی کی مجموعی فلاح و بہبود اور اس کی مجموعی زندگی کی مسرت و خوشحالی مقصود ہے، تو ناگزیر ہے کہ افراد کی حرص و طلب کا پیمانہ محدود ہو۔ کیونکہ یہ دنیا اپنی ساری نعمتوں اور ساری دولتوں

کے باوجود نوعِ انسانی کے تمام افراد یا تمام جماعتی یا قومی اکائیوں کی تو کیا ان میں سے ورو کی بھی حرص
اقتدار یا حرصِ مال کے اصل پیمانوں کو پُر کرنے سے قاصر ہے۔
لیکن انسان کا پیمانۂ طلب محدود ہو جائے، یہ تو ممکن نہیں، کیونکہ فطرت بدلا نہیں کرتی۔ البتہ یہ
ہو سکتا ہے کہ انسان اس کی فطری لامحدودیت کے علی الرغم اسے کچھ حدود کا پابند کر دے۔

بحث کے اس نقطہ پر پہنچ کر ہم کہہ سکتے ہیں کہ ہم نے نوعِ انسانی کی مجموعی فلاح اور اس کے
ایک پُرمسرت اور پُرسکون تمدن کی اولین فطری بنیاد یا اس کا بنیادی قانون دریافت کر لیا ہے، اور وہ
یہ ہے کہ نوعِ انسانی کے افراد ہوں یا اس کی قومی و جماعتی اکائیاں وہ اپنی لامحدود فطری حرص و طلب
کو کچھ حدود کا پابند بنالیں!

ہم دیکھ رہے ہیں کہ آج کا انسان، یا کہئے کہ آج کے ناخدایانِ انسانیت اس بنیاد کو وجود میں
لانے سے کُلی انحراف کیے ہوئے ہیں۔ اسی لئے ہمیں اس صورت حال پر ذرا بھی تحیّر نہیں ہوتا کہ عالم انسانیت
کی فلاح اور ایک پُرسکون تمدن کی تعمیر کے وسائل اور اس کی فکر کی روز افزونی کے باوجود انسان کو
سکون و آرام اور نوعی فلاح میسر نہیں ہے۔

انسانی فطرت کا مطالعہ اور تجربہ اس بات کی سب سے بڑی دلیل ہے کہ عمومی طور پر انسان اپنی
حرص و طلب کے تقاضوں پر اسی صورت میں پابندی عائد کر سکتا ہے کہ اُسے ان تقاضوں کی تکمیل میں خود
اپنے کسی بڑے نقصان کا خطرہ یا اس کے ترک میں کسی عظیم تر منفعت اور اعلیٰ درجہ کی تسکین طلب کی امید
نظر آئے۔ انسانی فطرت کی اس ساخت کے پیشِ نظر، اگر ایک صحت مند تمدن کی انسانی خواہش کوئی
غیر فطری خواہش نہیں ہے تو ضروری نظر آتا ہے کہ کوئی ایسا سامان موجود ہو جس کی بنیاد پر انسان کے
اندر یہ امید و بیم پیدا کی جاسکے۔ اور واقعہ یہ ہے کہ اس کا پورا سامان موجود ہے، جس کی تفصیل آگے
... آئے گی۔ مگر اس دور کے ناخدایانِ انسانیت نے اپنے علم و آگہی کے زعم میں اس سامان کے
وجود کو وہم قرار دے دیا ہے۔ اور اس طرح گویا اس بنیاد کو وجود میں لانے کا راستہ ہی سرے سے بند
کر دیا ہے جو ایک صحت مند پُرسکون اور خوشحال اجتماعی زندگی کی پہلی شرط ہے۔ کوشش کی گئی کہ اجتماعی مفاد
کے نام پر افراد کو اپنی خواہشات قربان کرنے کے لیے آمادہ کیا جائے۔ مگر اس کا حشر سامنے ہے۔ اجتماعی

مفاد پر قربانی دینے کا تخیل اچھا تو بہت معلوم ہوتا ہے۔ اور اس کی معنوی بلندی کو محسوس کرنے کے بعد آدمی کا جی چاہنے لگتا ہے کہ اپنے عمل کو اس بلندی سے ہمکنار کرے۔ مگر بلند پروازی کی یہ عقلی خواہش جب فطری تقاضوں سے ٹکرائے تو انسان بیچارہ کیا کرے؟ فطرت کا دباؤ تو وہ چیز ہے کہ عام انسان تو کیا اس بلند پروازی کے جو داعی اور فلسفہ طراز ہوتے ہیں وہ بھی اس کے مقابلہ میں عاجز نظر آتے ہیں، اور عجیب عجیب چور دروازوں سے اس کے مطالبات پورے کرتے ہیں ـــــ انسان کا مستقل طرز عمل در اصل وہی ہو سکتا ہے جو کسی فطری داعیہ سے ہم آہنگ ہو۔ اور اجتماعی مفاد کے لیے قربانی! اس کے لیے انسان کی فطرت میں کوئی داعیہ نہیں ہے!

غرض انسان کے اندر اپنی خواہشات کی قربانی کا جذبہ پیدا کرنے کی یہ غیر فطری تدبیر جس کو ناکام ہونا ہی تھا، ناکام ہوئی، اور اب فکر و نظر کا اصل رخ یہ ہو گیا کہ انفرادی حرص و طلب پر باہر سے پابندیاں عائد کی جائیں۔ بس کی تدبیر تھی قانونی جکڑ بندی۔ چنانچہ قانون کے دائرہ کو وسیع سے وسیع تر کر کے پوری انسانی زندگی کو اس کی گرفت میں لیا جانے لگا۔ اور بعض جگہ لیا جا چکا۔

ہمارے اس وقت کے موضوع سے یہ بات تو خارج ہے کہ قانونی جکڑ بندی سے فطری رجحانات جیتے جی ہار مان بھی سکتے ہیں یا نہیں؟ اور تجربہ اس بارے میں کیا بتاتا ہے؟ البتہ اس جگہ غور کرنے کی بات یہ ہے کہ قانون اگر اپنے مقصد میں سو فیصدی کامیاب بھی ہو جائے اور معاشرے سے انفرادی حرص و طلب کے وہ تمام مفاسد، وہ تمام ناہمواریاں اور ناانصافیاں دور ہو جائیں جو معاشرہ کو مجموعی حیثیت سے خوشحال نہیں ہونے دیتی تھیں تب بھی کیا قانون میں جکڑی ہوئی زندگی کوئی مسرت، سکون، اطمینان اور چین کی زندگی ہو سکتی ہے؟ ـــــ اس زندگی کی پوری حقیقت تو وہی لوگ بتا سکتے ہیں جو اس کا پورا تجربہ رکھتے ہوں مگر ہمارے ملک میں بھی چونکہ اس نظام زندگی کی "ابجد" شروع ہو چکی ہے اس لیے تھوڑا بہت تجربہ تو ہمیں بھی ہونے لگا ہے۔ کیا یہ حقیقت نہیں ہے کہ یہ نظام زندگی آدمی کو زندگی سے بیزار کرتا ہے؟ در اصل یہ ایک سزا ہے جو انسان کو اس کی ناکردنیوں کی پاداش میں خود اس کے ہاتھوں دلائی جا رہی ہے۔ انسان کے خالق نے اس کی ذہنی اور اجتماعی فلاح کے لیے بہترین اصول اور کامیابی کی محکم ترین فطری بنیادیں فراہم کی تھیں مگر اس نے زعم علم و عقل میں خالق کو بھی ماننے سے انکار کر دیا اور ان سب چیزوں کو بھی رد کر دیا، اور اب وہ اس کی سزا بھگت رہا ہے۔

انسان کے خالق نے اس کے لامحدود پیمانہ طلب پر، خود اس کے اندر سے پابندی عائد کرنے کا رجحان پیدا کرنے کا کیا موثر سامان بہم پہونچایا تھا کہ انسان کے لیے حیات جاوید کا فیصلہ فرمایا اور اس عالم زیریں کے ساتھ ایک ایسا عالم بالا تعمیر فرمایا جس میں نوع انسان کے کسی فرد کو یہ شکایت وحسرت نہ رہے کہ

ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پہ دم نکلے
بہت نکلے مرے ارمان لیکن پھر بھی کم نکلے

اور پھر انسان کو اس کا پتہ دیتے ہوئے آگاہ فرمایا کہ:۔

تِلْكَ الدَّارُ الْآخِرَةُ نَجْعَلُهَا لِلَّذِينَ لَا يُرِيدُونَ عُلُوًّا فِي الْأَرْضِ وَلَا فَسَادًا وَالْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِينَ

(قرآن)

یہ دوسرا گھر ہم ان لوگوں کے لیے بناتے ہیں جو عالم ارضی میں اپنی برتری جتانے اور فساد پھیلانے کے کام نہیں کرتے اور اچھا انجام اور آگے ملنے والی نعمتیں ان بندوں کے لیے ہیں جو اس دنیا میں پرہیزگاری کی زندگی گزارنے والے ہیں۔

پروردگار عالم کے اس فیصلہ اور اس اعلان سے لوگوں کو آگاہ کرنا اور اس کی حقانیت کا لازوال یقین انسانوں کے دلوں میں بھرنا، درحقیقت یہی وہ واحد تدبیر ہے جس سے انسان کی نوعی فلاح کی بنیاد اور شرط اول وجود میں آتی ہے —— مجموعی نوعی فلاح اور ایک صحت مند اجتماعی زندگی کی خواہش اگر انسان کی کوئی غیر فطری خواہش نہیں ہے، تو جیسا کہ ہم کہہ آئے ہیں، تقاضائے فطرت ہے کہ اس کی بنیادی شرط کو وجود میں لانے کا کوئی سامان ہونا چاہیے۔ پس اب یا تو اس ذکر کردہ بالا سامان کو حقیقت سامان سمجھیے، اور اس سے کام لیجیے، ورنہ کسی دوسرے سامان کا پتہ دیجیے کہ اس کے بغیر انسانی زندگی کے امن وسکون کا مسئلہ سارے خارجی وسائل اور ساری فکرمندیوں کے باوجود لاینحل ہی رہے گا۔

(الفرقان جمادی الثانی [illegible]ھ)

قوم ترقی کی راہ پر
بے گھروں کے لئے گھر
دیہی علاقوں میں اب ان محنت کشوں کو زمین دی جا رہی ہے جن کے پاس زمین نہیں ہے۔ مکان تعمیر کرنے کی 32,42,406 جگہیں الاٹ کی جا چکی ہیں اور 20 نکاتی پروگرام کے تحت مزید جگہیں الاٹ کی جائیں گی۔
سماج کے پچھڑے طبقوں کے لئے مکانات بنانے کی نو اسکیمیں زیر عمل ہیں ان کے تحت 3.8 لاکھ مکان تعمیر کرنے کی منظوری دی گئی ہے اور ان میں سے 6.43 لاکھ مکانات مکمل ہو چکے ہیں۔
مضبوط ارادہ
اور کڑی محنت
ہمارے ساتھی ہیں

محمد منظور نعمانی

ملک میں دیانت و اخلاق کا مسئلہ

(۱)

ہمارے ملک میں اللہ نے جن لوگوں کو سوچنے والی عقل، سننے والے کان اور دیکھنے والی آنکھیں دی ہیں وہ اس حقیقت سے ناواقف نہیں ہو سکتے کہ دیانت و اخلاق کا مسئلہ ہمارے ملک میں بہت زیادہ بگڑا ہوا ہے اور یہ کہ یہ بگاڑ بجائے خود ایک بڑی برائی اور مہلک بیماری ہونے کے علاوہ ملک کی تعمیر و ترقی کی راہ میں بھی بہت بڑی رکاوٹ ہے۔

لیکن ملک کے بڑے کبھی کبھی اپنے بیانوں میں اور پریس کانفرنسوں میں اس مسئلہ کا ذکر جس انداز میں کرتے ہیں اس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ یہ بگاڑ جس انتہائی خطرناک حد تک پہنچا ہوا ہے اور اس سے ملک کو جتنا عظیم نقصان پہنچ رہا ہے اس کا ان کو صحیح علم و اندازہ نہیں ہے ——— اور اس میں کوئی تعجب کی بات بھی نہیں، کیونکہ ان کا ذریعہ علم عام طور سے محکموں کی رپورٹیں ہوتی ہیں جن کا حال خاص کر اس باب میں معلوم ہے ——— بہر حال ہمارے نزدیک یہی وجہ ہے کہ اس مسئلہ کو ملک کے ان بڑوں کی بھی خاص فکر و توجہ ابھی تک حاصل نہیں ہو سکی ہے جن کا ملک کے ساتھ خلوص اور جن کی فکرمندی شک و شبہ سے بالاتر ہے۔

یہ ناچیز قریباً ۳۰ سال سے چونکہ سیاست کے میدان سے الگ رہ کر زندگی گزار رہا ہے اس لیے سیاسی جماعتوں کی اصطلاح کے مطابق تو وہ "عوامی آدمی" نہیں ہے لیکن اس لحاظ سے وہ بہت سے عوامی لیڈروں سے بڑا عوامی ہے کہ اپنی زندگی کی ایک خاص نوعیت کی وجہ سے عوام سے تعلق و رابطہ اور ان کے احوال و مسائل اور ان کے دکھ درد سے واقف ہونے کا جتنا موقع اس عاجز

کو ملتا ہے غالباً ان لوگوں میں سے بہت کم کو اتنا ملتا ہوگا جن کو آج کل عوامی لیڈر یا عوامی آدمی کہا جاتا ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ میں نے ایک ایسے کام کو کچھ اپنا رکھا ہے جس کی وجہ سے مجھے عوام سے اور ان کو مجھ سے ملنے اور قریب رہنے کا بہت زیادہ موقع رہتا ہے علاوہ اس کے میں کثیر الاسفار ہوں اور مدت سے میرا معمول ہے کہ اگر تھرڈ کلاس میں آرام سے سفر کرنے کا موقع ملے تو میں اسی میں سفر کرتا ہوں اور اگر وہاں تنگی اور تکلیف ہو تو سکنڈ کلاس میں اور اگر وہاں بھی حسبِ ضرورت درجہ کا آرام نہ مل سکے تو پھر (جیب میں پیسے ہونے کی صورت میں) فرسٹ کلاس میں بھی سفر کر لیتا ہوں —— میرا تجربہ یہ ہے کہ عوام کے مختلف طبقوں کے حالات و خیالات اور اُن کی برائی بھلائی کے مطالعہ کا جتنا بے تکلف اور بے پردہ موقع تھرڈ کلاس کے سفر میں ملتا ہے (بشرطیکہ آدمی کو اس مطالعہ سے دلچسپی ہو اور وہ اس کا اہل بھی ہو) اتنا شاید ہی کہیں اور مل سکتا ہو —— اسی طرح ذرا اونچے کلاس کے لوگوں کے حالات و خیالات معلوم کرنے کا موقع بھی سکنڈ کلاس میں خوب ملتا ہے۔ اور اگر آدمی چاہے تو عوامی مسائل پر غور و فکر کے لیے اس ذریعہ سے بڑا مواد حاصل کر سکتا ہے۔ میں کبھی کبھی سوچا کرتا ہوں کہ ہمارے وزرا اور بڑے لیڈر اگر گاہ بگاہ ملک کے ایک عام شہری کی طرح خاموشی سے تھرڈ کلاس اور سکنڈ کلاس میں سفر کر لیا کریں تو ملک اور عوام کی صحیح حالت سے وہ ذاتی طور پر اور براہ راست اتنے واقف ہو سکتے ہیں جتنے واقف ہونے کی ان کو واقعی ضرورت ہے —— اس وقت صورت یہ ہے کہ ان بڑوں کی بعض باتوں سے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ شاید وہ اس دنیا سے بالکل الگ رہ کر یہاں کے مسائل کو سوچتے ہیں۔

خیر! یہ بات تو جملہ معترضہ کے طور پر زبان قلم پر آگئی، حدتہ میں عرض یہ کرنا چاہتا تھا کہ چونکہ میں کثیر الاسفار ہوں اور ذہن فطری طور پر اس طرح کے مطالعہ اور غور و فکر کا عادی ہے، اسی لیے میں اپنے سفروں سے یہ فائدہ بھی اٹھاتا ہوں۔

آج کی صحبت میں، میں اس سلسلہ کے اپنے کچھ ذاتی تجربات و معلومات اور ان کی بنا پر لگائے ہوئے اپنے کچھ اندازے پیش کرتا ہوں جن سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ دیانت و اخلاق کا بگاڑ کس حد تک پہونچ چکا ہے، اور ملک کو یہ کتنی مہلک اور خطرناک بیماری لگی ہوئی ہے۔

یوں تو ملک کا کوئی طبقہ بھی ایسا نہیں ہے جو بددیانتی اور ناجائز ذریعوں سے دولت حاصل کرنے کی بری عادت میں مبتلا نہ ہو، لیکن اس میں سب سے بڑھا ہوا نمبر سرکاری ملازمین کا ہے ــــــ مختلف قابل اعتماد ذریعوں سے میرے جو معلومات ہیں ان کی بنا پر میرا اندازہ ہے کہ اس وقت صورت یہ ہے کہ جن محکموں میں بھی سرکاری ملازمین کو رشوت اور خیانت و بددیانتی کے مواقع حاصل ہیں، اور زیادہ تر محکمے وہی ہیں ان میں قریباً نوے فیصدی ضرور اس گندگی میں مبتلا ہیں۔

میرا ذاتی تجربہ تو صرف ریلوے کے محکمہ کا اور وہ بھی صرف ٹی ٹی صاحبان کا ہے، میں نے ابھی اوپر جیسا کہ عرض کیا ہے میں زیادہ تر سفر تھرڈ کلاس میں کرتا ہوں، لیکن بسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ وہاں جگہ کی تنگی جب میرے لیے باعث تکلیف ہونے لگتی ہے تو میں حسب موقع اوپر کے درجے میں منتقل ہو جاتا ہوں، میرا نوے فیصدی سے کچھ زیادہ ہی کا یہ تجربہ ہے کہ جب میں ٹی آئی صاحب کو تلاش کر کے ٹکٹ کی تبدیلی کے لیے کہتا ہوں تو وہ حساب لگا کے فرما دیتے ہیں کہ "اتنے پیسے ہوئے آپ مجھے یہ پیسے اور اپنا ٹکٹ دیدیجیے، اور منتقل ہو جائیے، میں ٹکٹ بنا کر اگلے اسٹیشن پر آپ کو خود پہنچا دوں گا" ــــــ پھر سفر طے ہوتا رہتا ہے اور میں ان کا انتظار کرتا رہتا ہوں، دو چار اسٹیشن گزرنے کے بعد میں پھر انہیں تلاش کرتا ہوں اور ٹکٹ کے لیے تقاضا کرتا ہوں تو وہ بڑے "اخلاق" سے فرما دیتے ہیں کہ "ابھی تک میں بنا نہیں سکا ہوں، آپ اطمینان سے اپنی جگہ آرام فرمائیں میں بنا کر خود ہی آپ کے پاس پہونچا دوں گا" یہاں تک کہ وہ اسٹیشن آجاتا ہے جہاں مجھے اترنا ہے، تو وہ بابو صاحب میرے پاس تشریف لاتے ہیں اور مجھے میرا صرف تھرڈ کلاس کا ٹکٹ واپس کرنا چاہتے ہیں، اور جب میں ان سے کہتا ہوں کہ پیسوں کی رسید! تو وہ فرماتے ہیں کہ سفر آپ کا آرام سے پورا ہو گیا اب آپ رسید لے کر کیا کریں گے ــــــ

اس کے بعد میں ان سے کہتا ہوں کہ یہ مجرمانہ حرکت ہے اور چوری ہے اور آپ مجھے بھی اس میں شریک کرنا چاہتے ہیں گویا مجھے بھی چور اور بددیانت سمجھتے ہیں، اور میں آگے کارروائی کرنے کی دھمکی دیتا ہوں تو اکثر ایسا ہوتا ہے کہ وہ حواس باختہ ہو کر میرے پیسے واپس کرنا چاہتے ہیں اور میری خوشامد کرنے لگتے ہیں، پھر میں جب ان سے کہتا ہوں کہ بھائی! میں اوپر کے کلاس

میں سفر کر چکا ہوں زائد کرایہ میرے ذمہ واجب ہو چکا اور اس کو ادا نہ کرنا بددیانتی اور چوری ہے اس لیے آپ کو مجھ سے پیسے لے کر رسید کاٹنی ہی ہوگی تاکہ ریلوے کے جو پیسے میرے ذمہ واجب ہو چکے ہیں وہ ریلوے کے خزانے میں پہنچ جائیں، تو وہ مجبور ہو کر رسید بناتے ہیں ـــــــ
میں عرض کر چکا ہوں کہ میرا قریباً نوے فیصدی یہی تجربہ ہے۔ میں نے ایسے موقعوں پر اس پر بھی غور کیا کہ ان لوگوں کو سزا دلوانے کے لیے بات کو آگے چلایا جائے، لیکن اس پر میری طبیعت اولاً تو اس لیے آمادہ نہیں ہوئی کہ جن افسروں کے سامنے ان کا معاملہ جائے گا ان کی دیانت اور پاکدامنی کا بھی کچھ اندازہ ہے اور دوسری بڑی وجہ میرے آمادہ نہ ہونے کی یہ ہے کہ دفاتر اور عدالتوں میں اس طرح کے کاموں میں وقت اتنا برباد ہوتا ہے کہ جس کو اپنا وقت ذرا بھی عزیز ہو وہ سخت مجبوری اور اضطرار کے بغیر اس طرح کی کسی کارروائی میں حصہ لینے کے لیے آمادہ نہیں ہوسکتا۔

ریلوے ہی کے محکمہ کا ایک اور عبرتناک واقعہ بھی یہاں قابل ذکر ہے، پچھلے سال کی بات ہے مجھے ایک لائن پر کئی سفر جلدی جلدی کرنے پڑے، ٹی ٹی صاحبان کو میں نے بڑی بے خوفی اور بڑے اطمینان کے ساتھ پیسے بنانے کا کاروبار کرتے دیکھا۔ پھر مجھے معلوم ہوا کہ ان ٹی ٹی آئی صاحبان کے افسر فلاں صاحب ہیں جن کو میں اپنی ذاتی معلومات کی بنا پر ایک ایماندار اور دیانت دار آدمی جانتا ہوں، میں نے ان سے خود مل کر کہا کہ کیا آپ اس سے واقف نہیں ہیں کہ آپ کی لائن پر یہ کاروبار ویسے دھڑلے سے ہوتا ہے؟ انھوں نے مجھے اپنی کمزوری کے اعتراف کے ساتھ بتایا کہ جب میرا یہاں تبادلہ ہوا۔ تو میں نے اپنے ماتحت ٹی ٹی آئی صاحبان سے اس معاملے میں نجی طور پر صاف صاف بات کی کہ میں چاہتا ہوں کہ کام دیانت داری سے ہو اور رشوت وغیرہ سے ہم آپ اپنے کو بالکل بچائیں، انھوں نے مجھے سوچ سمجھ کے اور سنجیدگی سے جواب دیا کہ آپ تو اپنا طرز عمل جیسا چاہیں رکھیں لیکن ہمارے معاملات میں آپ کے لیے بہتر یہ ہوگا کہ زیادہ مداخلت نہ کریں، ہم آپ کا اور آپ کی بات کا اتنا لحاظ کریں گے کہ جب آپ ساتھ ہوں گے تو ہم کوئی غلط کام نہیں کریں گے، اس سے زیادہ آپ ہمارے پیچھے نہ پڑیں، ورنہ آپ کو نقصان پہنچ جائے گا، ـــــــ انھوں نے کہا کہ یہ میری کمزوری ہے کہ میں نے اسی میں اپنی آبرو کی حفاظت اور

ملازمت اور روزی کی خیر سمجھی اور گویا اسی بہانے سے صلح کرلی۔
انھوں نے میرے دریافت کرنے پر جب تفصیل سے یہ بتایا کہ ان کے ماتحت وہ ٹی ٹی صاحبان ان کو کیا نقصان پہنچا سکتے تھے، تو کسی درجہ میں میں نے بھی اُن بیچارے کو معذور سمجھا۔
اس واقعہ سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ بعض سرکاری محکموں میں بددیانتی اور خیانت اس حد تک بڑھ چکی ہے کہ کسی ایماندار آدمی کے لیے اس محکمہ میں رہنے کی گنجائش نہیں رہی ہے۔ حکومت کے مختلف محکموں میں ملازمت کرنے والے مختلف شہروں کے میرے دوستوں نے اپنی یہ مشکل بارہا مجھ سے بیان کی ہے کہ ان کے محکمہ اور دفتر کے ان کے ساتھی صرف اس لیے ان کے مخالف ہیں کہ وہ رشوت نہیں لیتے ہیں اور اس لیے خواہ مخواہ ان کو اپنے لیے خطرناک سمجھ کر اُن کے خلاف سازشیں کرتے رہتے ہیں۔
کچھ ہی عرصہ ہوا ایک نیک صالح نوجوان مجھ سے ملے اور انھوں نے بتایا کہ میں نے انجینئرنگ پاس کیا ہے اور پی۔ ڈبلو۔ ڈی میں میں نے ملازمت کی کوشش کی تھی اور بفضلہٖ تعالیٰ سے وہ کوشش کامیاب بھی ہوگئی ہے اور امید ہے کہ عنقریب ہی مجھے تقرری کی اطلاع مل جائے گی لیکن اس محکمہ میں کام کرنے والوں سے اب مجھے یہ معلوم ہوا ہے کہ عام حالت محکمہ کی یہ ہے کہ چھوٹے بڑے سب افسران اپنی اپنی حیثیتوں کے مطابق ٹھیکہ داروں سے رشوتیں لے کر ان کی بنائی ہوئی عمارتوں کو پاس کرتے ہیں اور ان رشوتوں کے اعتماد پر ٹھیکہ دار عمارتوں میں سامان بھی شرائط کے مطابق نہیں لگاتے، بلکہ رشوتیں اتنی بڑی بڑی دی جاتی ہیں کہ اگر ان رشوتوں کے ساتھ مال بھی صحیح لگایا جائے تو ٹھیکہ داروں کو بجائے نفع کے بہت بڑا نقصان ہو اس لیے ٹھیکہ دار مال صحیح لگا بھی نہیں سکتے، ایسی صورت میں اگر میں دیانت داری سے اپنا فرض انجام دینا چاہوں گا اور ٹھیکہ داروں کے ساتھ ناجائز رعایت نہ کروں گا تو پورے محکمہ کی اور خود افسروں کی دشمنی مول لوں گا اور وہ اپنے مفاد کی حفاظت کے لیے مجھے نکالنا ضروری سمجھیں گے، اور اس مقصد کے لیے مجھ پر ہر طرح کے الزام لگائیں گے اور مجھے تنگ کریں گے۔ وہ نوجوان کہتے تھے کہ اب میں یہ سوچ رہا ہوں کہ بجائے اس محکمہ کے اب میں کسی اور محکمہ کے لیے کوشش کروں۔
اس واقعہ سے ناظرین کو یہ بھی معلوم ہوگیا ہوگا کہ رشوت خوری کی یہ لعنت سود و سوا ہو اور

کی تنخواہ پانے والے بیچارے صرف تھرڈ کلاس کے بابوؤں ہی میں نہیں ہے بلکہ ہزاروں کے حساب سے تنخواہیں پانے والے بہت سے اونچے درجہ کے افسران بھی اس گندگی میں مبتلا ہیں ۔ خود اس ناچیز کے علم میں اس کی بعض ایسی بھی حیرت انگیز مثالیں ہیں کہ اگر انتہائی قابل اعتماد ذرائع سے ان کا علم نہ ہوا ہوتا تو خود مجھے بھی ان پر یقین نہ آتا۔

ابتک جو کچھ عرض کیا گیا اس کا تعلق صرف سرکاری ملازمین سے تھا، اور ہر واقف حال جانتا ہے کہ دوسرے طبقوں کا حال بھی اس سے کچھ بہت زیادہ مختلف نہیں ہے، ملک کی عام حالت اور ہمارے عوام کا عام مزاج اس وقت یہی ہے کہ جس شخص کے لیے قانون کی گرفت اور ذلت و رسوائی کے خطرہ سے بچ کر کسی ناجائز طریقہ سے دولت حاصل کرنے کا امکان ہے۔ وہ اس سے فائدہ اٹھانا چاہتا ہے، اور جن کا یہ حال نہیں ہے وہ بس مستثنیات میں سے ہیں۔

دیانت و اخلاق کا یہ غیر معمولی بگاڑ، ظاہر ہے کہ ملک کی تعمیر و ترقی کی راہ میں بھی بہت بڑی رکاوٹ ہے، اس لیے خالص ملکی نقطۂ نگاہ سے بھی اس مسئلہ کی اہمیت کسی دوسرے ملکی مسئلہ سے کم نہیں ہے۔

ملک کے سچے خیر خواہوں کا فرض ہے کہ وہ اس مسئلہ کی واقعی نوعیت اور اہمیت کو سمجھیں اور اس کا مداوا سوچیں، ہم نے جہاں تک غور کیا ہے ہماری رائے یہ ہے کہ اس بگاڑ کا سدھار اس وقت تک نہیں ہو سکتا جب تک کہ پورے خلوص اور عزم کے ساتھ اس کو ایک مستقل مہم بنا کر کام نہ کیا جائے۔

بات کافی طویل ہو گئی اس لیے اس کام کے طریقہ اور راستہ سے متعلق جو کچھ ہم کو عرض کرنا ہے وہ انشاءاللہ اب آئندہ صحبت ہی میں عرض کیا جا سکے گا۔

(الفرقان اصفر ۱۳۸۰ھ)

محمد منظور نعمانی

ملک میں دیانت و اخلاق کا مسئلہ

(۲)

[ہمارے ملک میں اخلاق و دیانت کا افلاس و زوال جس خطرناک حد تک پہنچ چکا ہے، پچھلی اشاعت کے ان ہی صفحات میں ہم نے اس کا کچھ تذکرہ کیا تھا ——— آج کی صحبت میں حسب وعدہ یہ عرض کرنا ہے کہ اس بگاڑ کا سدھار اور اس مرض کا علاج کس طریقہ سے کیا جاسکتا ہے]

یہ تو ظاہر ہے کہ اس سلسلہ میں جس طرح کی اور جس درجہ کی رسمی کوششیں ابتک ہوتی رہی ہیں وہ مقصد اور نتیجہ کے لحاظ سے قریب قریب بالکل ناکام رہی ہیں، اس لیے ضروری ہے کہ مسئلہ کو نئے ڈھنگ سے سوچا جائے ——— ہم نے جہانتک غور کیا ہے اس کا صحیح ترین راستہ تو وہ ہے جو انبیاء علیہم السلام کا طریقۂ اصلاح و تزکیہ رہا ہے۔ یعنی یہ کہ پہلے بندوں کے دلوں میں اللہ تعالیٰ کی ذات و صفات کا یقین اور اس کے ساتھ عبدیت کا ایک زندہ تعلق اور آخرت کی جزا سزا کا یقین اور وہاں کی فکر پیدا کی جائے اور اس کو بنیاد بنا کر ان کی زندگی کو صرف بددیانتی اور بدنیتی ہی کی ناپاکی سے نہیں بلکہ ہر قسم کی ناپاکیوں سے پاک کردیا جائے۔ اس طریقہ سے جو ہمہ جہتی پاکیزگی اور پاکبازی آتی ہے وہ کسی دوسرے طریقہ سے نہیں آسکتی۔ علاوہ ازیں اس سے سیرت و اخلاق کی اس اصلاح و درستی کے ساتھ ساتھ جس کی ضرورت ہر خدا ناآشنا اور آخرت کے یقین سے محروم معاشرہ بھی محسوس کرتا ہے، انسان، اللہ تعالیٰ کی ابدی رحمت و عنایت کا مستحق ہوجاتا ہے جو اس کی سب سے بڑی فیروزمندی ہے۔

لیکن اگر مادی اور حیوانی فلسفۂ حیات اور اس طرح کے دوسرے عوامل نے ہمارے ملک

کے "بڑوں" کے دل و دماغ کو ایسا بنا دیا ہے کہ انبیاء علیہم السلام کی بتائی ہوئی سچی حقیقتوں پر اور اُن کے طریقہ پر ایمان و یقین کے لیے خدانخواستہ کوئی گنجائش فی الحال ان میں نہیں رہی ہے اور بدقسمتی سے یہ باتیں اُن کے نزدیک غور و فکر کے لائق ہی نہیں ہیں تو پھر کم از کم اتنا تو وہ کر ہی سکتے ہیں کہ صرف دنیوی اور قومی اخلاق کے محدود تصور اور اُس کے بناؤ بگاڑ کے دنیوی نتائج ہی کو سامنے رکھ کر ملک کے مسائل میں اس کو وہ اہمیت دیں جس کا واقعۃً وہ مستحق ہے اور اپنے کو اور عوام کو صرف فریب دینے والی ڈھرے کی فضول کوششوں پر قناعت کرنے کے بجائے اس کے لیے اس طرح کی وسیع اور موثر جد و جہد کا چند سالہ ہی ایک منصوبہ بنائیں جو ایسے کسی اہم مسئلہ کے لیے ہونی چاہیے، اور پھر اُس منصوبہ کو بروئے کار لانے کے لیے جو کچھ کرنا ضروری ہو اپنی امکانی حد تک اُس میں کمی نہ کریں —— اس کام کے سلسلہ میں چند اصولی باتوں کی طرف ہم یہاں بھی اشارہ کرتے ہیں۔

(۱) چور بازاری اور رشوت ستانی وغیرہ بددیانتی کی مختلف صورتیں، اخلاقی اور قانونی جرائم ہونے کے علاوہ ظاہر ہے کہ ملک کے لیے سخت تباہ کن اور اس وقت اس کی ترقی کے راستہ کی سب سے بڑی رکاوٹ ہیں اس لیے وہ ملک کے حق میں چوروں کی چوری اور ڈاکوؤں کی ڈاکہ زنی سے بھی زیادہ مضر اور مہلک ہیں، لیکن ہمارے عوام میں اس پہلو کا شعور اتنا کم ہے کہ گویا نہیں ہے —— اس لئے اس کام کے سلسلہ کی پہلی ضرورت یہ ہے کہ جس طرح جنگ کے موقع پر ملک کی حفاظت کا داعیہ اور دشمن کے خلاف غصہ اور نفرت کا جذبہ عوام کے دلوں میں پیدا کرنے کے لیے وسیع پیمانہ پر پروپیگنڈا کیا جاتا ہے، لگ بھگ اسی پیمانہ پر بددیانتی کی ان سب صورتوں کی نفرت دلوں میں پیدا کرنے کے لیے پروپیگنڈا کیا جائے اور اس میں عوام کو یہ پہلو سمجھانے کی خاص طور سے کوشش کی جائے کہ یہ سخت ترین ملک دشمنی اور غداری بھی ہے۔

(۲) رشوت وغیرہ ناجائز طریقوں سے دولت کمانے والوں میں بلاشبہ ایک تعداد ایسے لوگوں کی بھی ہے جو اپنی "ضرورت" کے لیے نہیں بلکہ دولت بڑھانے کے لیے ہی یہ پاپ کرتے ہیں، لیکن اسّی نوّے فیصدی وہ ہوں گے جو صرف اس لیے اس راستہ پر چلنا شروع

کرتے ہیں کہ ان کی جائز آمدنی اُن کے بڑھے ہوئے خرچوں کے لیے پوری نہیں ہوتی ـــــ مثلاً ایک بابوجی کی تنخواہ صرف دو سو روپئے ہے لیکن ان کی زندگی کا جو معیار ہے اس کے لیے ضرورت پانچسو روپیہ ماہوار کی ہے۔ اس لیے ابتدا میں تو وہ صرف اس واسطے رشوت قبول کرنا شروع کر دیتے ہیں کہ اپنے معیار کے مطابق زندگی کی ضرورتیں کسی طرح پوری کر سکیں ــــ لیکن خون منھ سے لگ جانے کے بعد پھر بات ضرورت ہی کی حد تک نہیں رہتی ـــــ اس لیے اگر ملک کی خاطر اور اخلاق و شرافت کی خاطر بددیانتی کے اس طوفان کو روکنا ہے تو یہ بھی ضروری ہے کہ معیارِ زندگی کی بلندی کا رجحان جس طرح ملک میں بڑھ رہا ہے (بلکہ دانستہ بڑھایا جا رہا ہے) اُس کی ان مضرتوں اور ہلاکتوں کو سمجھا جائے اور اس کو روکنے کی کوشش کی جائے ـــــ اور اس کی صورت یہی ہے کہ سادہ معاشرت کے اصول کو اپنایا جائے اور اسی کو ملک کا فیشن بنا دیا جائے ـــــ جاننے والے جانتے ہیں کہ کسی طرزِ زندگی کے فیشن بننے اور عوام میں مقبول ہو جانے کا بڑا دار و مدار ملک کے سربرآوردہ اور برسرِ اقتدار طبقہ کے طرزِ عمل پر ہوتا ہے۔ یہ طبقہ جس طرزِ زندگی کو اختیار کر لے وہ آسانی سے عوام کا فیشن بن سکتا ہے۔ پس اگر ہمارے ملک کے "بڑے" معتدل درجہ ہی کی سادہ معاشرت خود اختیار کر لیں اور عوام میں اس کو مقبول بنانے کے لیے سچے دل اور دیانت داری سے کوشش کریں تو دیکھتے دیکھتے ملک کا فیشن بدل سکتا ہے اور بددیانتی اور رشوت خوری کی سب سے بڑی بنیاد ختم ہو سکتی ہے۔

میرے ایک دوست جنھوں نے گزشتہ سال ہی چین کا دورہ کیا ہے بتاتے تھے کہ پورے ملک نے سادہ اور کم خرچ معاشرت کے اصول کو ایسا اپنایا ہے کہ اب وہاں کسی کو اپنی ضرورتیں پوری کرنے کے لیے بڑی آمدنی کی ضرورت نہیں اور وہاں سے رشوت وغیرہ کے ختم ہونے میں اس چیز کو بھی بہت بڑا دخل ہے ـــــ وہی دوست بتاتے تھے کہ وزراء تک کا معیارِ زندگی وہی ہے جو ایک متوسط درجہ کے شہری کا ہے، یہاں تک کہ وزراء اپنی نجی ضرورتوں کے لیے بے تکلف عام شہریوں کی طرح اور اُن کے ساتھ بسوں پر سوار ہوتے ہیں ـــــ لیکن ہمارے اکثر وزراء شیروانی اور پاجامہ یا کرتا اور دھوتی تو بیشک کھدر ہی کی پہنتے ہیں (جس کے لیے کسی حد تک مجبور بھی ہیں) لیکن موٹروں، کوٹھیوں اور زندگی کے

دوسرے ٹھاٹھ باٹھ میں وہ کسی لارڈ اور کسی بڑے سے بڑے دولت مند سے کم نہیں ہیں۔
ظاہر ہے کہ ان بڑوں کی معاشرت جب تک یہ ہے، فیشن اور معیار زندگی کے بارہ میں عوام کا رجحان یہی رہے گا جواب ہے اور اس کے نتیجہ میں عوام کا ایک طبقہ خاص کر سرکاری ملازمین کی بڑی تعداد رشوت خوری اور بددیانتی کو اپنی زندگی کی ضرورت سمجھتی رہے گی اور ملک ان لعنتوں سے کبھی بھی نجات نہ پاسکے گا۔ بات بات میں گاندھی جی کا نام لینے والے اور ملک کے بڑے اگر معاشرت اور معیار زندگی کے بارہ میں گاندھی جی کی منشا کو صرف ۵ فیصدی ہی پورا کرنے کا دیانت دارانہ ارادہ کرلیں تو معیار زندگی کی بلندی کی اس بڑھتے ہوئے بحران کی بہت کچھ اصلاح ہوسکتی ہے۔

(۳) مذکورہ بالا اصلاحی کوششوں کے ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ بددیانتی، خاص کر خیانت و غبن اور رشوت ستانی کے قانون کو کم از کم منصوبہ کی محدود مدت ہی کے لیے سخت سے سخت کیا جائے، جرم ثابت ہوجانے پر مجرموں کو عبرتناک سزائیں دی جائیں، ان کی دولت ضبط کی جائے، اور اُن کے جرم کی عوام میں پوری تشہیر کرکے اُن کی حیثیت عرفی کو بالکل گرادیا جائے۔

(۴) اس سلسلہ کے مقدمات کی سماعت کے لیے اسپشل عدالتیں قائم کی جائیں اور اُن کے لیے ایسے جج منتخب کیے جائیں جن کی دیانت داری اور معاملہ فہمی زیادہ سے زیادہ قابل بھروسہ ہو۔ اُن عدالتوں کا طریق کار ایسا ہو کہ معاملہ کا فیصلہ جلد سے جلد ہو اور ثبوت یا صفائی میں حصہ لینے والے عوام کا وقت برباد نہ ہو۔

(۵) جس طرح کسی خطرہ کے وقت سی، آئی، ڈی سے خاص پیمانہ پر کام لیا جاتا ہے اسی طرح منصوبہ کی مدت تک ہی کے لیے اس سلسلہ میں سی آئی، ڈی کی سرگرمیوں کو وسیع اور تیز کردیا جائے
یہ چند اصولی اشارے ہیں، اگر ملک کے بڑے جن پر ملک اور قوم کی ذمہ داری ہے خلوص اور دیانت کے ساتھ اس بارہ میں اپنا فرض ادا کرنے کا ارادہ کریں تو وہ خود اس سے بھی زیادہ سوچ سکتے ہیں۔ (الفرقان، ربیع الاول ۱۳۸۳ھ)

ٹیلی فون نمبر ۳۲۳۹۷۶
ٹیلیگرام 'NASEEBDAR'
اسَاکو سیلس ڈپو
ایکسپورٹرس
مینوفیکچررس اینڈ ایکسپورٹرس
سنہری اور قوس قزح جیسی رنگ برنگی چوڑیاں
پلاسٹک کا نفیس سامان
مصنوعی زیورات
اور
عطریات
رجوع کیجئے
ASACO SALES
DEPOT
222, Janjikar Street
BOMBAY-3

جناب صوفی نذیر احمد کاشمیری

احیاءِ دین کا جذبہ رکھنے والوں کے لیے ایک لمحۂ فکریہ

چند دقیق اُصولی اشارات

حیات انسانی، اخلاقی و روحانی و طبعی قوتوں کا اس درجہ جامع امتزاج ہے کہ جس کی نظیر سلسلۂ تخلیق میں کہیں نہیں ملتی۔ گزشتہ سالوں میں (غالباً ۵۵ء یا ۵۶ء میں) حیدر آباد میں ہونے والی ایک سائنس کانفرنس میں مسٹر ہیکسلے نے اس حقیقت کا مفصل اقرار کیا تھا۔ اس کے علاوہ بھی تمام وہ دہریے سائنٹسٹ جو بضد ہیں کہ وہ حیات انسانی کے سارے وظائف و اعمال کی تشریح میکنیائی، نباتی یا حیوانی انداز پر کر سکتے ہیں، کسی نہ کسی موقع پر مجبور ہو گئے ہیں کہ وہ انسان کے اشرف و اکرم مخلوقات ہونے کا اقرار کریں لیکن اپنی دہریت کے تعصب میں وہ اس اجمالی اعتراف حق کی تشریح مزید کی طرف نہیں جاتے۔ ان کے نظریوں کی تفصیلی تنقید کو نظر انداز کرتے ہوئے اتنی بات کا اعلان کرنا سلسلۂ تخلیق کی ایک صداقت عظیم ہے کہ انسان کا یہ احساس کہ وہ سب سے پہلے انسان ہے اور بعد میں کچھ اور، ان کی تمام میکنیائی و نباتی و حیوانی تشریح کے کلی بطلان پر مشتمل ہے۔ اور یہ احساس، حیات انسانی کا سب سے اصولی و مرکزی ذاتی انائی احساس ہے۔ اس کا باقی تمام احساس و شعور صرف اسی انسانی احساس انانیت پر مبنی ہے۔ انسان، کائنات اور اس کے اندر کی تمام اشیاء کی جو بھی قدر و قیمت معین کرتا ہے اس کا تعلق اساسی طور پر صرف اسی انسانی احساس انا کے مقام سے وابستہ ہے اگر یہ مقام معین نہیں تو اس کا ہر محاکمہ باطل ہے۔

(۲) انا کا تجزیہ سطور کی چند واضح سطور کے بعد یہ بات ایک بداہت ثابتہ کے طور پر کہی جا سکتی ہے کہ سلسلۂ حیات کی سب کڑیوں کے مقابل حیات انسانی نام ہے انسان کے

اخلاقی وروحانی شعور وکردار کا۔ اس شعور وکردار کے علاوہ باقی محرکات ووظائف واعمال میں انسان کہیں بلاشک حیوان سے کہیں نباتات سے اور کہیں مشین سے مشابہت رکھتا ہے۔ مگر یہ زعم علی الاطلاق باطل ہے کہ ان مشابہتوں سے اس کا نوعی موقف معین کیا جاسکتا ہے یا ان کے ذریعے اس کی نوعی تاریخ کی تشریح کی جاسکتی ہے۔ اس لیے کہ تمام انواع مخلوقات کی تاریخ صرف ان کے نوعی امتیازات سے متعین ہوسکتی ہے۔ تمام انواع کی مابہ الاشتراک باتوں سے کسی بھی نوع کی حقیقت یا تاریخ متعین نہیں کی جاسکتی۔ ان مابہ الاشتراک باتوں پر بنیادی زور دینے اور نوعی خصوصیتوں کو نظر انداز کرنے سے انسان کو بتدریج ہلاکت کی وادی میں پہنچایا جاسکتا ہے اس طریق سے اس کی حفاظت نہیں ہوسکتی گزشتہ دو سو برس سے وہریت انسان کو اسی وادی ہلاکت کی طرف لے جارہی ہے۔ کمیونزم اسی دعوت الی الہلاکت کی سب سے خطرناک صورت ہے۔

(۳) کمیونزم کا خلاصہ

(الف) حیاتِ حیوانی کی طرح حیات انسانی کا نوعی نصب العین بھی صرف روٹی اور صنفی تسکین کا سوال ہے۔ لہٰذا مذہب واخلاق وروحانیت کے نام پر انسانی نصب العین کے متعلق جو کچھ کہا گیا ہے یا کہا جارہا ہے، وہ یا تو مفاد پرست طبقات کی بے ایمانی ہے یا انسانی اوہام پرستی ہے، جسے بیخ وبن سے اکھاڑ پھینکنے کی ضرورت ہے۔

(ب) اس نصب العین کے حصول کا سب سے صحیح، سب سے جامع اور ساتھ ہی سب سے آسان طریقۂ حیوانی تنازع طبقاتی کے انداز پر طبقاتی نفرت کو تیز سے تیز کرتے ہوئے طبقاتی جنگ کی صورت پیدا کرنا ہے۔ یہی طبقاتی نفرت پر مبنی طبقاتی جنگ اس نصب العین کے حصول کا سب سے صحیح ذریعہ ہے۔ لہٰذا اس مقام پر بھی دیعنی ذرائع میں) بھی اخلاقی وغیر اخلاقی، روحانی وغیرہ روحانی اور بالآخر جائز وناجائز کا سوال پیدا کرنا قدیم مفاد پرست طبقات کی بے ایمانی ودغا بازی ہے یا اوہام پرستی ہے جسے بیخ وبن سے اکھاڑ کر پھینک دینے کی ضرورت ہے۔

(ج) نصب العین اور اس کے حصول کے ذرائع کے علاوہ انسان کے تمام تہذیبی وثقافتی مظاہر

کی تشریح بھی بخوبی اسی مادی نصب العین کی روشنی میں ٹھیک حیوانی جبلت کے ماتحت کی جاسکتی ہے۔ یہاں بھی تاریخ انسانی کے لیے کسی مخصوص اخلاقی و روحانی بنیاد کو تسلیم کرانا محض فریب کاری ، دھوکا دہی یا اوہام پرستی ہے۔ جو مفاد پرست طبقات کی شرارت ہے۔

ان سطور میں نہ صرف کیموزم بلکہ موجودہ لادین مغربی تمدن کی پوری پوری تلخیص آگئی ہے۔ چونکہ کیموزم موجودہ مغربی مادیت کی نہایت بدرجہ منطقیانہ شکل ہے ، جو مادی تصورِ تخلیق کو اپنے منطقیانہ نتائج کے آخری حدود تک پوری دلیری سے لے جانا چاہتا ہے۔ لہٰذا میں نے اسی کو اس پیراگراف کا ضمنی عنوان بنایا ہے۔ کیموزم بہر جبر و ظلم سے اس تصور کو عالمگیر کرنے کی نہایت واضح شکل ہے اور لادین مغربی جمہوریت اس کی نہایت اُلجھی ہوئی شکل ہے۔

(۴) احیائے دین کا نقطۂ آغاز

(الف) ، اس لادین مادیت کے مقابل دین کے احیاء کی عالمگیر شکل ہرگز کسی صورت یہ نہیں ہو سکتی کہ مذہب کے معاشرتی و معاشی و سیاسی پہلوؤں کو اصولی اہمیت دے کر انھیں کو ایک عام تنظیم کی بنیاد بنایا جائے۔ موجودہ حالات میں یہ صورت محض خلطِ بحث ، تضیع اوقات اور بالآخر ناکامی پر منتج ہوگی۔ اس لادین مادیت کے مقابل احیائے دین کی صحیح صورت اور تحریک صرف یہ ہو سکتی ہے کہ دین کے اساسی ایمان کو اور اسی کے ذریعہ بنیادی اخلاقِ مذہبی کو غایت الغایات درجے تک بیدار کرتے ہوئے نوعِ انسانی کو اس باطل تعبیرِ تاریخ کے مقابل کھڑا کیا جائے۔

یہ طلب کس درجہ مضر ہوگی کہ دنیا میں تو طاعون کا مرض عالمگیر ہو رہا ہو اور خاندانی طبیبوں کا ایک گروہ کھڑا ہو جائے اور کہا کرے یاتپ دق کے انجکشن مخلوقات کو دینا شروع کردے اور جب کوئی معقول انسان انھیں اس پر ٹوکے تو اپنے عمل کے جواز میں یہ سند پیش کردیں کہ کبھی تمھارے ہمارے مشترک آبا کی کتب طب میں یہ نسخے بھی تو لکھے ہیں۔

(ب) ، بلاشبہ اگر کل تاریخ انسانی میں کوئی ایسا موڑ آجائے کہ حیات انسانی کے تمام مقاصد کے

ساتھ ان کے مظاہر کی بھی باطنی تشریحات شروع کردی جائیں اور اس کائنات کے اندر بحیثیت خلیفۃ اللہ کے نوع انسانی کے جو فرائض ہیں انھیں نظرانداز کیا جانے لگے تو اس باطنیت کی فضا کو درست کرنے کے لیے انسان کے جو معاشی و معاشرتی و سیاسی حقوق و فرائض ہیں، ان پر اصولاً متوجہ ہونا اور دوسروں کو متوجہ کرنا نہایت صحیح صورتِ اصلاح ہوگی لیکن آج جب کہ کائنات کے ساتھ خود تاریخ انسانی کی ساری اخلاقی و روحانی معنویت کا کلی انکار کیا جارہا ہے، ایسے لوگ کہ جو معاشرے کی سیاسی و معاشی تنظیم ہی کو اصل دین اور مرکز دین بنائیں، نہایت درجہ غلط کار، مضر اور گمراہ کن ہوسکتے ہیں۔ اس کے مقابل صحیح طریق کار صرف یہ ہے کہ تعلق باللہ کو اجاگر کرتے ہوئے ایمان مجمل کو ایمان مفصل اور ایمان بالغیب کو شہودی ایمان جیسی پختہ صورت دی جائے۔

(۵) اصولی و فروعی مسائل میں فرق کی ضرورت

(الف) تمام انبیا کی تعلیم اصولاً متحد رہی ہے مگر معاشرتی و معاشی و سیاسی مسائل میں ان میں غیر معمولی اختلاف رہا ہے۔ حقیقت میں انسانیت کے دین واحد کو ادیان مختلفہ بنانے کا سبب ہی اصولی مسائل اور فروعی مسائل میں عدم امتیاز اور اس عدم امتیاز کے باعث فروع کو اصل قرار دے کر انھیں مرکزی اہمیت دینا رہا ہے۔

(ب) اب یہ اصولی مسائل کیا ہیں کہ جن کے اتحاد کی بنا پر تمام انبیا کو دین واحد کا نمائندہ کہا جاسکتا ہے۔ یہ معاشی مسائل ہرگز نہیں، یہ معاشرتی مسائل بھی نہیں نہ یہ سیاسی مسائل و قوانین ہیں۔ اس لیے کہ ان میں سے اکثر انبیاء کی تعلیم میں بہت بڑا فرق ہے۔ لہٰذا یہ مسائل تو صرف ذات و صفات باری پر، مقصودیت آخرت پر اور تمام مسلم النبوت اخلاقی قدروں پر مشتمل ہیں۔ لہٰذا جسے دین کی اصل ثابت کو مضبوط کرنا ہو، اُسے اصولاً انھیں اساسوں کی تقویت و تربیت کرنا ہوتی ہے، جس کے بعد شاخ و برگ کا عمل بھی خود سے خود درست اور بارآور ہوتا جاتا ہے۔

(ج) یہ کس درجہ غیر فطری اور غیر اصولی طریق کار ہے کہ توحید ذات و صفات باری میں سے ایک

صفت رب کو یا ایک صفت حاکمیت کو لے لیا جائے اور اسے بھی ایک طرف نظریہ ربوبیت یا نظریہ توحید کہہ کر محسوس البداہت حق کے بجائے منطقیانہ نظریے کے مقام پر لا چھوڑا جائے، دوسری طرف اس کے تقاضوں کو پوری امکانی تفصیل کی حدود تک منضبط کر لیا جائے اور اس پر دین کی کلی تشریح کا لیبل لگا کر اسے تربیا سائنس کے سامنے رکھ دیا جائے تو ظاہر ہے کہ اگر یہ کل دین ہے تو پھر اس کا کسی پہلو سے بھی انکار کرنے والے کیا ہوں گے۔ وہ زیادہ سے زیادہ اہل کتاب کے حکم میں ہو سکتے ہیں۔ اس سے زائد ہونے کا کوئی بھی منطقیانہ امکان نہیں۔

(د) ایسی سب تشریحات کا ایک بنیادی نقص یہ بھی ہے کہ وہ ماضی کے فقہیانہ اختلافات میں کوئی کمی کرنے کے بجائے بیسیوں قسم کے نئے اختلافات پیدا کر رہی ہیں۔ ادھر یقین کی ساری اساس کو نظر انداز کرتی ہوئی ان کی اہمیت کو گھٹا رہی ہیں۔ لہٰذا اس لحاظ سے بھی یہ تشریحات ہر قسم کی اصولی افادیت سے خالی ہیں۔ ان کا ایک جزوی سا فائدہ یہ ضرور ہے کہ جو لوگ کچھ نہ کچھ دینی احساس رکھتے ہیں مگر موجودہ طوفان انگیز لا مذہب حرکت کے مقابل اُن کے اُکھڑ جانے کا خطرہ ہے، ان کے لیے ایک عارضی حفاظت گاہ پیدا ہو جاتی ہے۔ کچھ نہ کچھ ذہنی تربیت بھی ان تشریحات سے ممکن ہے لیکن وہ موجودہ دور کے دینی و ایمانی انحطاط کا علاج ہرگز ہرگز نہیں ہو سکتیں۔ اس کا علاج کامل روحانی تربیت کے ذریعے تمام مبادیات دین کو اس درجہ یقینی کر دینے سے ہی ہو سکتا ہے کہ جس کے مقابل یہ کفر ایک سراب محسوس ہونے لگے اور یہ عمل ذہن و دماغ کا نہیں بلکہ قلب و روح کا ہے۔ اس کے لیے ضرورت قلبی و روحانی تربیت کی ہے نہ کہ ذہنی تسکین کی۔

(الفرقان محرم ۱۳۷۰ھ)

ڈاکٹر احمد حسین کمال

اشتراکیت کا مقابلہ کیسے؟

(۱)

ابھی حال ہی میں امریکہ کے ایک ذمہ دار شخص نے جو غالباً صدارت کے بھی امیدوار ہیں کمیونزم پر ایک طویل بیان دیتے ہوئے کہا ہے کہ "اشتراکیت کو سائنسی، اقتصادی اور جنگی میدانوں میں شکست دینا ممکن نہیں ہے اسے تو خیالات و نظریات کے میدانوں میں شکست دے کر ہی کامیابی حاصل کی جا سکتی ہے" ——— سوال یہ ہے کہ آپ اسے خیالات و نظریات کے میدانوں میں کس طرح شکست دے سکتے ہیں۔ اشتراکیت نے تو اپنے خیالات و نظریات کو عمل کا جامہ بھی پہنا رکھا ہے۔ پھر کیا آپ اسے بلا کسی عملی اقدام کے مجرد خیالات و نظریات کے بل بوتہ پر شکست دے سکتے ہیں؟

اشتراکیت الحاد و فسق کی ایک کھلی ہوئی شکل ہے جو مجرد خیالات تک ہی محدود نہیں، بلکہ عملاً ایک وسیع انسانی گروہ کی معاشرتی و مجلسی زندگی کی بنیاد بن چکی ہے۔ اشتراکیت صرف خدا اور آخرت کا ہی انکار نہیں بلکہ ہر ایسے نقطۂ نظر کا انکار ہے جو انسانیت کے وسیع تر روحانی و اخلاقی مفادات سے متعلق ہے۔ وہ خاندانی مفادات کا منکر ہے مگر اس لیے نہیں کہ خاندان کا محدود نظریہ قوم و ملت کے وسیع تر نظریہ سے ٹکر اسکتا ہے بلکہ اس لیے کہ اس سے اشتراکیت کے حلقہ بندانہ مفادات پر براہ راست ضرب پڑتی ہے وہ وطن پرستی اور ملت پروری کا مخالف ہے مگر اس لیے نہیں کہ شاید اس سے عالمگیر انسانیت کو ضرر پہنچتا ہو بلکہ اس لیے کہ اس سے کمیونزم کے جماعتی مفادات کو نقصان پہنچنے کا احتمال ہے۔ وہ مذہبی گروہ بندیوں کا مخالف ہے مگر اس لیے نہیں کہ اس قسم کی گروہ بندیاں اکثر و بیشتر انسانی بھائی چارے میں حائل ہوتی رہی ہیں

بلکہ اس لیے کہ اس سے کمیونزم کی اصل بنیاد کے نیست و نابود ہوجانے کا اندیشہ ہے، اشتراکیت آج تک اپنا کوئی اخلاقی ضابطہ مقرر نہیں کرسکی۔ اس کی بقا و ترقی کا تمام راز اس میں پنہاں ہے کہ اس کے مخالف عمل سے عاری اور اس کی بنیادی کمزوریوں سے بیشتر ناواقف ہیں، انھوں نے اس کی مخالفت بغیر اس کے گہرے مطالعہ کے کر رکھی ہے، وہ سیاسی، اقتصادی یا بجز و نظریاتی میدانوں میں تو اس کی مخالفت بڑے زور و شور سے کرتے رہتے ہیں، لیکن عمل کے میدانوں میں اس سے کوسوں پیچھے ہیں۔

غور کیجیے کہ الحاد و فسق پر مبنی خیالات کی ہی نہیں بلکہ پوری ایک عمل کی دنیا اشتراکیت نے تخلیق کر رکھی ہے، روز بروز اس میں اضافہ ہوتا جارہا ہے، دنیا کا کوئی ملک اور کوئی حصہ ایسا نہیں جہاں کا کچھ نہ کچھ عنصر اس کی برادری میں شامل نہ ہو۔ الحاد و فسق کی اس منظم و قائم شکل کا مقابلہ خدا پرستی اور عمل صالح کی منظم صورت سے ہی ممکن تھا، لیکن ان بلند بانگ مخالفین کا طرز عمل اس کے قطعی برعکس ہے اور درپردہ اشتراکیت کی قوت کا باعث بن رہا ہے۔ یہ اشتراکیت کی خدا انکاری پر تو چراغ پا ہوتے ہیں، لیکن اپنی کھوکھلی اور زبانی خدا پرستی کی خبر نہیں لیتے۔ وہ اس کی بے دینی ولادینی کا رونا تو روتے ہیں لیکن اپنی دینداری کی سطحیت کا ہرگز ماتم نہیں کرتے۔ وہ اگر خدا کی منکر ہے تو اس نے انکار کی ایک عملی شکل بھی قائم کر دی ہے اور اس طرح قدرت کے قانون ثمرات عمل سے متمتع ہو رہی ہے، لیکن کیا خدا پرستی کی مدعی طاقتیں ایمان سے کہہ سکتی ہیں کہ اپنے بلند بانگ دعووں کے باوجود انھوں نے زندگی کے کس کس شعبے میں خدا پرستی کی عملی شکل قائم کی ہوئی ہے۔ ایک عام آدمی یہ دیکھ کر حیران رہ جاتا ہے کہ باوجود شدید الفاظی مخالفت کے اشتراکیین و غیر اشتراکیین اپنی سماجی، تہذیبی، ثقافتی، اقتصادی، معاشی اور سیاسی زندگیوں میں ایک سے ہی طور طریقوں پر عامل ہیں۔

ان مسلمانوں کے لیے بھی یہ بات فوری توجہ کی محتاج ہے، جو اپنے آپ کو اور اپنی آئندہ نسلوں کو اشتراکیت سے محفوظ رکھنے کے خواہش مند ہیں کہ آیا وہ صرف زبانی مخالفت تک ہی اپنی اشتراکیت دشمنی کا مظاہرہ کافی سمجھتے ہیں، یا یہ کہ اپنی زندگی کے علمی و عملی تمام پہلوؤں کو اسلامی قالب میں ڈھال کر بروقت اپنے تحفظ و استحکام کا سامان کر لینا ضروری یقین کرتے ہیں۔

گروہ یہ سمجھتے ہیں کہ دنیا کی دوسری غیر اشتراکی اقوام کی طرح محض لفظی مخالفت ہی کافی ہے، اور اپنے فکر و عمل کو تجدد و اباحیت کے آغوش میں دبے رہنے پر راضی و مطمئن ہیں تو پھر انہیں اپنے دینی مستقبل کو خیرباد کہہ دینا چاہئیے، لیکن اگر زمانہ کی روش عام کے خلاف خالص دین کو مضبوطی سے پکڑنے کے لیے وہ تیار ہیں اور اپنی زندگیوں کو اسوۂ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے سانچے میں ڈھالنے کے لیے آمادہ ہیں تو یہ بات پورے یقین کے ساتھ کہی جاسکتی ہے کہ خواہ مستقبل کی دنیا کا نقشہ کچھ بھی ہو، انشاء اللہ ان کو کوئی گزند پہنچنے نہیں پائے گا اور وہ انشاء اللہ اس وعدۂ الٰہی کو پھر پورا ہوتا ہوا دیکھیں گے کہ "انتم الاعلون ان کنتم مومنین"

ان ابتدائی کلمات کے بعد آئیے آج کی صحبت میں ان افکار و نظریات کا مختصر سا جائزہ لیا جائے جن کے بطن سے اشتراکیت نے جنم لیا اور جن کے سہارے پروان چڑھ کر وہ اپنی موجودہ شکل و صورت تک پہنچی۔

اشتراکیت تین سو سال کی اس کشمکش افکار کا نتیجہ ہے جو عقیدۂ تثلیث کے ردعمل کے طور پر یورپ کے ذہنی میدانوں میں برپا رہی۔ فکر و نظر کا وہ فساد جو عیسائیوں میں کہ نظریۂ تثلیث سے پھیلنا شروع ہوگیا تھا، بالآخر انسان کو ذہنی بغاوت کی ان حدود تک لے گیا جہاں ذمہ داری کے تمام احساسات ختم ہوجاتے ہیں، دنیا میں نیکی و بدی کے بقاء و فروغ کا تمام دارومدار، عقیدۂ الوہیت پر ہے جو الٰہ واحد کی حقیقت پر مبنی ہو۔ اس عقیدہ میں پہلی ٹھوکر انسان نے تعدد الٰہ کے نظریہ کی شکل میں کھائی۔ چنانچہ تاریخ انسانی کے تمام فسادات فکر و نظر کا اصل سرچشمہ تعدد الٰہ کا نظریہ ہی رہا ہے۔ انسانی فطرت جو بندگی اور تعبّد کا جوہر اپنے خمیر میں رکھتی ہے، اپنے فطری تقاضے پورے کرنے کے لیے کسی کے آگے جھک جانے پر مجبور ہے، اور جب بھی اسے ایک سے زیادہ کے آگے جھکنا پڑا وہ مقام رفیع سے گر گئی۔ عقیدۂ تثلیث بھی تعدد الٰہ کا ہی ایک روپ تھا، جو بہرصورت انسانی فطرت کے خلاف تھا، پاپائیت کے مستبدانہ نظام نے اس نظریہ کو منظم مذہبی شکل دی، صلیبی جنگوں کے بعد جب یورپ میں علم و فکر کا ایک نیا میدان کھلا تو وہاں کا ذہن اور بالغ نظر گروہ کسی طرح بھی عقیدۂ تثلیث پر مطمئن نہ رہ سکا۔ اس اضطراب کا نتیجہ ہی دہریت وغیرہ کی

مذہبی اصلاحات کا دورِ جدید تھا، جس کے ذریعہ عیسائیت کے نظام پاپائیت میں پہلی بار مستقل رخنہ پڑا۔ لیکن یہ اصلاحات چونکہ حقیقت پسندانہ نہیں تھیں اس لیے مرض کا صحیح علاج ثابت نہیں ہوئیں چنانچہ وہاں کا جدید آزاد خیال گروہ عیسائیت کے رائج الوقت افکار و نظریات سے دربدہ اور گاہے علانیہ بیزاری کا اظہار کرنے لگا، اور اس طرح ایک مستقل باغی اور منکر ذہن پیدا ہوگیا یہ ذہن تثلیثی عقائد و تثلیثی نظام کے تو خلاف ہوگیا لیکن اس کی جگہ کونسا نظام اور کونسا عقیدہ اختیار کرے، یہ سوال نہایت تیزی سے ابھر آیا۔ لیکن اس سوال کے جواب سے پہلے کائنات اور انسان کے بارے میں کبھی کوئی نظریہ قائم کرنا ضروری تھا۔ تثلیثی نظام سے جب بیزاری ہوئی تو اس کے نظریۂ کائنات و نظریۂ انسان پر کیسے یقین باقی رہ سکتا تھا۔ چنانچہ اس پر فکر و آرا کا ایک سلسلہ شروع ہوگیا اور بالآخر یہ گتھی ڈارون کے نظریہ ارتقاء سے سلجھائی گئی اب انسان اور کائنات کے بارے میں عیسائی اور تثلیثی نقطہ نظر کے متوازی ایک اور نظریہ ہاتھ لگ گیا تھا اس طرح صدیوں کی متوارث اعتقادی کش مکش سے بھی نجات مل گئی اور آئندہ کے تمام تغیرات فکری کے لیے ایک اساس ہاتھ آگئی۔

مذہب کا نظریۂ کائنات و نظریۂ انسان، خدا کی قدرت تخلیق، آدم کامل کے اولین ظہور و عرفان حیات بعد الممات اور عقیدۂ یوم الدین پر مبنی ہے۔ انسان کے لیے مذہب کی تمام پابندیاں اسی نظریہ کے تقاضوں کی بنیاد پر ہیں۔ درحقیقت ایک صاحب عقیدہ انسان کے لیے یہ نرا نظریہ ہی نہیں ہے، بلکہ سب سے بڑی حقیقت ہے۔ اس کے برعکس ڈارون کا نظریہ ارتقاء کائنات اور انسان کی تخلیق میں قدرت کی کارفرمائی کے بجائے اندھے عناصر کی ترکیب و امتزاج کا ہاتھ مصروف عمل بتاتا ہے۔ یہ اندھے عناصر بجائے خود ایک ایسے بے شعور مادہ کے اجزاء ترکیبی ہیں جو تنہا کائنات کی اصل حقیقت ہے۔ لیکن صرف اتنی بات ہی مکمل الحاد کے لیے کافی نہیں تھی۔ کائنات سے متعلق بہت سے پیچیدہ مسائل کے علاوہ انسان کے فکر و شعور اور جذبات و عواطف کے منبع و ماخذ کا مسئلہ بھی حل طلب تھا۔ خدا اور مذہب کا انکار اس کی توجیہ کیے بغیر مکمل نہیں ہوسکتا تھا۔ یہ خدمت چند ماہرین نفسیات نے اپنے ذمہ لی۔ انھوں نے انسانی ذہن کی تمام منفی اور پست حیثیتوں کو سامنے رکھ کر ایک ایسا خطرناک نتیجہ نکالا، جس نے نیکی اور اخلاق کے ایک ایک تصور کو ہلا ڈالا۔

مشہور ماہر نفسیات میگڈوگل نے کہا کہ انسان کے تمام عواطف و میلانات حیوانی جبلت کا نتیجہ ہیں۔ یہی حیوانی جبلت انسان کا حقیقی رجحان طبعی ہے۔ آج اس کی کتاب سوشل سائیکالوجی، یورپ و امریکہ کی یونیورسٹیوں میں ہی نہیں، بلکہ ہند و پاک و عرب و ایشیا کی تمام یونیورسٹیوں میں نفسیات کی سب سے اہم کتاب کی حیثیت سے داخل نصاب ہے۔ فرائڈ نے ایک قدم آگے بڑھ کر تمام انسانی احساسات و داعیات کا دامن شہوات و جنسیات کے ساتھ باندھ دیا۔ اس نے نفس انسانی کو تحت الشعور، شعور اور فوق الشعور کے مابین تقسیم کر کے دلوں سے مکافات نیت و عمل کے قانون الٰہی کا خوف نکال دینے کی کوشش کی اور اس طرح سماجی دباؤ بھی انسانیت کے لیے ایک ظلم بے جا بن گیا، جس سے نجات حاصل کرنا ہر فرد کا حق ہو۔ آج فرائڈ کے ان نظریات پر ہمارے کتنے ہی علوم و فنون کی بنیاد رکھی ہوئی ہے۔ علم معالجات کا تو ایک پورا شعبہ اس نظریہ کے ساتھ مخصوص کر دیا گیا ہے۔ ادب و آرٹ میں بھی اس کی نمو کئی مقامات پر دیکھی جا سکتی ہے۔ تفریحات کا تو کوئی شعبہ اس کے اثر سے خالی نہیں ہے۔ ایڈلر نے ایک اور ہی بات کہ کر انسانی انا کو خود پسندی اور خود بینی کی ایک تاریک راہ پر ڈال دیا ہے، جس کے بعد حق کی روشنی کا کوئی سوال ہی باقی نہیں رہ جاتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ ہماری تمام خواہشات و اعمال کا اصل محرک جذبہ حب تفوق ہے۔ انسان کی فطرت کا بنیادی تقاضہ یہ ہے کہ ہر چیز پر غالب آ جائے اس کی بقا و ترقی کا انحصار صرف جبر و تغلب میں ہی ہے۔ گویا اس طرح اگر ڈارون کا انسان جسمانی حیثیت سے ایک ترقی یافتہ حیوان ہے تو میگڈوگل کا انسان ذہنی حیثیت سے حیوانیت کی اعلیٰ سطح پر ہے اور فرائڈ کا انسان حیوانیت کی جبلت شہوات و جنسیات کا مرقع ہے۔ ان سب پر مستزاد ایڈلر کا انسان ہے جو سرتا پا ابلیس ہے اور ہر چیز پر جابر و متغلب رہنا چاہتا ہے۔

انسان کی ان حیثیتوں کی تعلیم جو ایک طرح انسان کا "مثلہ" بنا دینا ہے، بلا امتیاز، علانیہ دنیا بھر کی یونیورسٹیوں میں ہو رہی ہے۔ فن و آرٹ کے کئی شعبے ان سے فیضیاب ہو رہے ہیں، ادب و صحافت میں اس کے گہرے اثرات کام کر رہے ہیں۔ حیاتیات، طبعیات و معالجات میں اس کو بطور رہنما اصول کے استعمال کیا جاتا ہے۔ الغرض انسان کی تخلیق، کائنات کے ابدا، اور افراد و قوم کی انفرادی و اجتماعی نفسیات پر اس کا علی الاعلان بلا تردد اطلاق و انطباق کیا جاتا ہے۔ اب اس حد تک یہ اثرات بڑھ چکے ہیں کہ بعض برخود غلط مذہبی متجددین اسے درجہ الہام اور منشائے قرآنی تک قرار دینے پر آمادہ

ہو گئے ہیں۔

یہی وہ بنیادی افکار و نظریات ہیں جن کی ایک عرصہ تک نشر و اشاعت اور قبول و تسلیم کے بعد تاریخی مادیت کا مارکسی فلسفہ ظہور میں آیا۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ بھی نوع انسانی پر اللہ تعالیٰ کا بڑا ہی فضل و کرم تھا کہ بات مارکسیت پر آ کر رک گئی اور انسان کو اصلاح احوال کے لیے ایک اور مہلت مل گئی ورنہ ان افکار کا تقاضہ تو یہ تھا کہ انسان اپنا جامۂ انسانیت قطعاً چاک کر کے پھینک دے اور ایک بدترین حیوان کی زندگی اختیار کر کے اسفل السافلین کی پستیوں میں ہمیشہ کے لیے جا گرے۔ بہرحال مارکس کی تاریخی مادیت اور فلسفہ اشتراکیت ان باطل نظریات کا قدرتی اور منطقی نتیجہ تھا اور یہ نتیجہ پوری ہلاکت سامانیوں کے ساتھ ظاہر ہو کر رہا۔ آخر ایک ایسا وجود جو مادے کے اتفاقی تغیرات کی بدولت ایک ننھے خلیہ سے ترقی کرتا ہوا انسان بنا، اور جس کا جسمانی و شعوری ارتقاء حیوانی سطح پر ہی ہوتا رہا۔ اس کی تاریخ شکم و معاش کی ہی تاریخ ہو سکتی تھی۔ اور مارکس نے یہ تاریخ مدلل طور پر پیش کر دی ہے۔ اس تاریخ کی روشنی میں جس فلسفۂ اشتراکیت کا ظہور ہوا اس نے دنیا میں عملاً اپنے لیے ایک بہت بڑی جگہ بنا لی ہے۔ اس کی اس گرفت کو ختم کرنے کے لیے جہاں اس کی سیاسی اور اخلاقی شکست ضروری ہے وہاں اس کا تاریخی اور نظریاتی ابطال بھی ضروری ہے۔ اس ابطال کے لیے مذکورہ نظریات کا ابطال ہی کافی نہیں بلکہ اس کے بالمقابل صحیح نظریات کا اثبات اور علوم حاضرہ پر ان کا علمی اور مکمل اطلاق و انطباق بھی ضروری ہے۔ ہمارے یہ علمائے کرام و تعلیم یافتہ حضرات جو سیاسی، ادبی اور فقہی و کلامی نکات آفرینیوں میں بڑی بڑی داد تحقیق دے رہے ہیں کیا ان گوشوں پر بھی توجہ فرمائیں گے۔

عصر حاضر کے بعض مسلمان مصنفین نے ان نظریات کو قرآن کے دامن سے باندھنے کی بھی کوششیں فرمائی ہیں۔ بعض نے تو انھیں من و عن ہی قبول کر لیا ہے اور بعض نے کسی قدر ترمیم و تغیر کے ساتھ اپنایا ہے۔ بالخصوص مسئلہ ارتقاء کو تو ان سب نے ہی قبول کر لینے اور قرآن کی بیان کردہ حقیقت ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ ارتقائے جسمانی کا دور تو ختم ہو چکا ہے۔ اب انسان پر ذہنی ارتقاء کا عمل جاری ہے۔ قطع نظر اس بات کے کہ انکے اس قول کے دونوں جز واقعاتی شہادت سے محروم ہیں۔ ارتقاء کا جو بھی پہلو اور صورت مانی جائے وہ قرآن کے نظریہ کائنات و نظریۂ انسان سے متصادم ہوتی ہے کہ آخر ایک ایسا وجود جس کی تخلیق ایک بے شعور مادہ کے اتفاقی تغیرات و عمل در عمل کے نتیجے میں

بن ہوئی ہو۔ جو وجود انہ مے بہرے عناصر مادی کے آغوش میں اتفاقات کی بدولت ایک خلیہ سے ترقی کرتا ہوا مختلف مدارج حیوانی سے گذر کر انسان بنا ہو۔ جس کا شعور ہنوز حیوانیت کے خمہ طویل کے موروثی اثرات کی پوری پوری گرفت میں ہو۔ جس کی جبلی سرشتوں کا دامن قدرت کے قانون مجرد ونقوش کے بجائے خالص حیوانی دور کی امنگوں کے ساتھ بندھا ہوا ہو۔ آخر ان مصنفین نے کیسے سمجھ لیا کہ وہ دفعتاً خارج سے آئی ہوئی الہامی و اخلاقی ہدایات کا مکلف ہو سکتا ہے۔ اگر ذہنی اور نفسیاتی ارتقا کا عمل جاری ہے اور انسانی فہم و شعور ہنوز ناقص ہے تو وحی و نبوت کی تکمیل و اختتام کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا اور خود اس عمل ارتقاء کی موجودگی میں وحی و نبوت کا بھی کوئی مقام باقی نہیں رہ جاتا۔ الغرض ڈاروِن کے تصور ارتقاء کے کسی جز کو بھی تسلیم کر لینے کے بعد مذہب وعقائد کی وابستگی باقی ہی نہیں رہ سکتی۔ اسے قائم کرنے کی یہ کوشش تکلف یا ریاکاری سے خالی نہیں۔

وہ مسلمان مفکر جو عہد حاضر میں اسلام کی ذہنی و فکری خدمات انجام دینا چاہتے ہیں۔ انھیں اس پیچیدہ اور ناقص طرز فکر سے بلند ہو کر اسلام کے حقیقی نظریۂ کائنات و نظریۂ انسان پر اثباتی واستشہادی دلائل قائم کرنے چاہئیں۔ نظریۂ اضافیت کے علمی اثبات کے بعد فلاسفۂ قدیم وجدید کے مادے کی کوئی حقیقت باقی نہیں رہ گئی ہے اور بات ہر پھر کر پھر کن فیکون تک جا پہنچی ہے۔ ڈاروِن کے نظریہ ارتقاء کی بنیاد فلاسفہ کے محبوب مادے پر ہی تو ہے جسے کائنات کی اصل ٹھہرایا جاتا تھا۔ جب یہ اصل ہی باقی نہیں رہی تو اس سے متفرع نظریات کس طرح قائم رہ سکتے ہیں۔ ان شاء اللہ اس پر کسی اگلی صحبت میں مفصل کلام کروں گا۔

(الفرقان ربیع الثانی سنہ ۱۳ھ)

ڈاکٹر احمد حسین کمال

اشتراکیت کا مقابلہ کیسے؟

(۲)

یہ بات واضح ہو جانے کے بعد کہ اشتراکیت کے خلاف جو محاذ غیر مسلم مخالف اشتراکیت اقوام نے قائم کر رکھا ہے وہ اول تو اتنا ٹھوس اور مضبوط نہیں ہے جس پر مکمل اعتماد کیا جا سکے، دوسرے اگر کسی طرح انھوں نے اشتراکیت پر فتح پا بھی لی تو خود ان اقوام میں لادینیت کا جو عروج و فروغ ہے وہ بجائے خود اشتراکیت سے کم درجہ کا فتنہ نہیں ہے، بلکہ اشتراکی فتنہ کا اصل سرچشمہ ان کے ہی نظریات و افکار ہیں جن سے کم و بیش دنیا بھر کی تمام قومیں متاثر ہیں مستقبل کا جو نقشہ آج تعمیر ہو رہا ہے اور مبہم تغیرات دنیا کو جس منزل کی طرف کشاں کشاں لیے جا رہے ہیں اس کی رو سے اب یہ بات بعید از امکان نہیں رہی کہ مستقبل کا انسان جداگانہ قومیتوں اور ملکوں میں بٹا ہوا انسان نہیں ہوگا بلکہ ایک عالمی وطن کا شہری ہوگا۔ آئندہ کا یہ انسان فکر و نظر اور علم و فن کی جن راہوں سے گذرتا ہوا مستقبل کی جس دنیا کا شہری بنے گا اس دنیا کی تعمیر اس کے افکار و نظریات کے مطابق ہی ہوگی اور وہ افکار و نظریات آج کے دور سے وراثتاً حاصل کرے گا۔ کشمکش افکار کے اس پُر اضطراب اور ہنگامہ خیز دور میں آج کے مسلمان پر یہ ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ وہ مستقبل کے انسان کے لیے کیا کچھ ترکہ چھوڑ کر جاتا ہے اور فکر و عمل کی وہ کونسی راہیں متعین کر دیتا ہے جن پر آنے والا انسان اپنا صحیح سفر جاری رکھ سکے۔ آج کی صحبت میں ان امور پر ہی کچھ غور کرنا ہے۔

مسلمانوں کے سیاسی زوال کے اسباب کے تجزیہ میں پڑے بغیر میں اپنے سلسلۂ سخن کا آغاز ان کے فکری تنزل کے دور سے کروں گا، حملۂ تاتار کے بعد سے ہی مسلمانوں کی فکری توتیں انحطاط کم اور

انحطاط پذیر زیادہ ہونے لگی تھیں۔ اگرچہ ابن تیمیہ اور شاہ ولی اللہ جیسی شخصیتیں بھی پیدا ہوئیں، لیکن ملت مجموعی حیثیت سے فکری تنزل میں ہی گرتی رہی۔ حتیٰ کہ یورپ کے سیاسی تغلب کے آغاز تک یہ تنزل ایک خاص نقطہ تک پہنچ چکا تھا، چنانچہ سیاسی زوال سے زیادہ اس فکری زوال نے مسلمانوں کو شدید نقصان پہنچایا۔ اُن کے جدید حریف یورپ نے اس راز کو جان لیا تھا اور وہ آج تک اس کمزوری سے فائدہ اٹھانے میں مصروف ہے۔ اس دور جدید میں یورپ سیاسی اعتبار سے مسلمانوں کے طاقتور بن جانے میں ایسا کوئی اندیشہ محسوس نہیں کرتا ہے جتنا کہ فکری اعتبار سے اُن کے بیدار اور توانا ہو جانے میں وہ خطرات محسوس کرتا ہے۔ اسی لئے وہ نو آزاد مسلم ممالک میں اپنی "کلچرل" و "ایجوکیشنل" سرگرمیاں جاری رکھے ہوئے ہے اور طرح طرح کی رعایتیں دے کر ان روابط کو مضبوط تر بنا رہا ہے۔ یہ صورت حال یقیناً اسلام اور مسلمانوں کے لیے خوش آئند نہیں کہی جاسکتی۔ اور اس کے ازالہ کی طرف ہی سب سے پہلی توجہ کی ضرورت ہے۔ یورپ کے تغلب نے ہر جگہ کے مسلمانوں کو دو گروہوں میں تقسیم کیا۔ ایک قدیم گروہ اور دوسرا جدید گروہ۔ یہ دونوں گروہ کسی بھی نصب العین کے حصول کے لیے باہم متحد نہ ہو سکے۔ ہر میدان میں ان دونوں کے درمیان حریفانہ کشمکش جاری رہی، حالاں کہ یہ دونوں ایک دوسرے کے تعاون کے ہر وقت ضرورت مند رہے ہیں۔ اب وقت نہیں رہا ہے کہ ان میں سے کسی ایک کو اس افسوسناک صورت حال کا ذمہ دار ٹھیرایا جائے۔ اب تو صورت حال یہ ہے کہ ایک طرف قدیم گروہ ہے جس کے اثرات محدود اور کمتر ہو چکے ہیں، دوسری طرف جدید گروہ ہے جو یورپ کے افکار و نظریات کا پروردہ ہے اور دینی تصورات سے بیگانہ ہو چکا ہے، اس صورت حال نے مسلمانوں کے دینی اور ملی محاذ کو بالکل بے جان بنا کر رکھ دیا ہے۔

بلاشبہ ابھی مسلمانوں کے کسی گروہ میں یہ جرأت پیدا نہیں ہوئی ہے کہ وہ علی الاعلان اسلام سے اپنی علاحدگی کا اعلان کر دے لیکن ملت کی زمام کار جن لوگوں کے ہاتھوں میں پہنچ رہی ہے وہ اسلام کی نظریاتی اور عملی رہنمائی سے محروم ہیں اور وقت کے تقاضوں کا سامنا بہر حال انھیں کو کرنا ہے۔ اگر یہ سلسلہ یونہی جاری رہا تو مستقبل کا مسلمان موجودہ حالت پر قانع نہیں رہ سکے گا۔ اُسے صاف صاف اقرار و انکار کی کوئی راہ اختیار کرنا پڑے گی، اور اس کے لیے ان دونوں راہوں میں سے کسی ایک راہ کا اختیار کرنا ہمارے آج کے طرز عمل پر موقوف ہے۔

اس نصف صدی کے اندر مسلمانوں کی اصلاح و ترقی کے لیے کتنی ہی راہیں تجویز کی گئیں، لیکن اصل اور بنیادی راہ علم و فکر کی ہی راہ تھی اور ہے۔ اب تک مسلمانوں نے جو کچھ پایا اور کھویا وہ اسی راہ

کے نشیب و فراز پر پایا اور کھویا، علم و فکر کی وادیاں کتاب و سنت کی تعلیم کے سایہ میں ہی بے خوف و خطر طے کی جاسکتی ہیں، چنانچہ کتاب و سنت کی بے آمیز تعلیم کا جاری رکھنا نہایت ضروری ہے اور اس کو بنیاد بناکر حال و مستقبل کی تعلیم کا خاکہ بنانا اور اس کو عمل میں لانا اس وقت کی اولین احتیاج ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ نئی تبدیلیوں کے اس دور میں ہم ایک نہایت ہی ٹھوس اور جدید دینی نظام تعلیم کے محتاج ہیں، جس میں اوّل سے آخر تک بنیادی طور پر کتاب و سنت کا پورا پورا علم شامل ہو اور وہ رائج الوقت تمام سائنسی اور نظریاتی علوم و فنون پر حاوی ہو جس میں قدیم و جدید نظریات پر سیر حاصل مطالعہ کا سامان بہم ہو اور باطل نظریات کی علمی تردید کے ساتھ ساتھ اسلامی نظریات و عقائد کے اثبات کا پورا پورا وزن اس میں موجود ہو، بظاہر یہ کام بڑے بڑے وسائل اور حکومتوں کے بغیر سرانجام پاتا مشکل نظر آتا ہے، لیکن مسلمانوں کی علمی تاریخ اس کے برعکس ثبوت پیش کرتی ہے۔ آج ہمارے پاس احادیث، فقہ، حکمت، کلام اور اسی قسم کے دیگر سیکڑوں علوم و فنون کا جو عظیم ذخیرہ موجود ہے وہ سب انفرادی کوششوں کا ہی ثمرہ ہے، حکومتوں نے اگر کچھ سرپرستی کی بھی تھی تو اُن کا کم و بیش تمام حاصل بغداد و اندلس میں سیل تاتار و طوفان صلیب کی نذر ہو گیا تھا، یہ درس نظامی کا قدیم نظام تعلیم ہی ہے جسے ہم آج دقیانوسی اور کہنہ وغیرہ کہہ کہہ کر ناک بھوں چڑھانے لگتے ہیں، کس طرح ایک مدت دراز تک ہماری دینی و دنیاوی علمی ضرورتوں کو پورا کرتا رہا ہے۔ مسجد کی امامت سے لے کر ملکوں کی وزارتوں تک، صدیوں یہی واحد ذریعہ علم بنا رہا ہے، مرتب کرنے والوں نے کس طرح بیک وقت اُس میں دینی علوم کے ساتھ ساتھ ضروری دنیاوی علوم بھی شامل کر دیے تھے اور ساتھ ہی وقت کے تمام افکار و نظریات پر دینی عقائد کی روشنی میں فیصلہ کن مباحث شریک کر لیے تھے پھر یہی نہیں بلکہ یہ نظام تعلیم معمولی سے تغیر کے ساتھ مسلمانوں کے سب ہی ملکوں اور سب ہی فرقوں میں مقبول رہا حتیٰ کہ شیعہ و سنی تک اپنے بُعد عقیدہ و عمل کے باوجود اس کو اپنائے رہے، درحقیقت امام غزالیؒ کے دور سے ہی اس طرز تعلیم کی ابتدا ہو گئی تھی اس وقت سے لے کر عرصۂ دراز تک جتنے بھی جدید افکار و نظریات وقتاً فوقتاً پیدا ہوئے ان پر بحث و نظر اور انھیں دینی عقیدہ و فکر کے تابع کر دینے کا کام ہماری ان درسگاہوں میں برابر جاری رہا اور اس نسبت سے اس نظام تعلیم کے نصاب میں کمی بیشی ہوتی رہی تا آنکہ شاہ ولی اللہؒ نے اس میں عمرانی، سیاسی و معاشی علوم بھی شامل کر دینے کی کوشش فرمائی، یہ تمام

جدو جہد ایک حد تک انفرادی ہی تھی اور سب بڑی حد تک حکومتوں کے تعاون سے تنہا بلکہ بعض حالات میں شدید مخالفتوں کے علی الرغم یہ کام انجام دیا گیا۔ اس طرح صدیوں مسلمانوں کے دینی عقائد و افکار کو ہر زد سے محفوظ رکھنے کا کام ہوا۔ اور مسلمانوں کی علمی برتری برقرار رہی۔ آج بھی ایک ایسے ہی نظام تعلیم کی داغ بیل ڈال دینے کی شدید ضرورت ہے۔ برصغیر ہند و پاک میں بے شمار آزاد تعلیمی ادارے موجود ہیں جو صرف اسلام کے نام پر قائم ہیں۔ ان میں سے بیشتر محض منتظمین و متعلمین کے شخصی ذوق کے حامل ہیں اور نوشت و خواند کا ایک ایسا سطحی انداز ان میں جاری ہے جو کسی بھی اعلیٰ افادیت کا حامل نہیں ہے، پھر ذہنیت و کردار کا جو سانچہ یہاں بن رہا ہے وہ دوسرے ماحول پر بہت ہی کم اثر انداز ہونے کی اہلیت رکھتا ہے، کاش اگر یہ تمام تعلیمی ادارے کسی ایک تعلیمی نظریہ اور نصب العین پر متحد ہو کر چل سکتے، تو ملت اسلامیہ کی بے شمار مشکلات حل ہو سکتی تھیں۔ تاہم ان اداروں کے تعاون سے آج بھی ایک اعلیٰ اسلامی نظام تعلیم کی ابتدا کی جا سکتی ہے اور ان کی انفرادیتوں کو مجروح کیے بغیر ایک مشترکہ پروگرام کے ذریعہ، الحاد و ارتداد کے خلاف ان میں ہم آہنگی پیدا کی جا سکتی ہے۔ یہ ہے پہلا قدم جو ہمیں اشتراکی الحاد کے مقابلہ کے لیے جلد سے جلد اٹھا دینا چاہیے۔

اس سے دوسرے درجہ کا کام تزکیۂ نفوس کا کام ہے بعض حالتوں میں تو یہ پہلے کام سے بھی زیادہ اہم اور ضروری ہے، لیکن آج اس کام کی طرف سے جتنی بے توجہی برتی جا رہی ہے، میں اسے تاریخ انسانیت کی بہت بڑی بد قسمتی سمجھتا ہوں۔ ایک انسان علم کی کیسی ہی بلندی پر پہنچ جائے، اگر اس کا عمل اس کے اثر سے خالی ہے تو وہ شخص نہ صرف اپنے معاشرہ کے لیے غیر مفید ہی ثابت ہوگا، بلکہ بعض صورتوں میں اس کے مضر اثرات بھی پڑ سکتے ہیں۔ خلافت راشدہ کے بعد سے آج تک مسلمانوں کی جتنی کچھ اسلامیت قائم و برقرار رہی ہے وہ زیادہ تر تزکیۂ نفوس کی بدولت ہی قائم و برقرار رہی ہے ——— فتنوں کے اولین دور میں ہی مسلمان اکابرین نے اس کی ضرورت کو سمجھ لیا تھا۔ علمی و فکری، ارتقی و ترددی اور عملی و اخلاقی گمراہیوں کا ایک نہایت ہی نازک دور مسلمانوں پر اور گزر چکا ہے۔ اس دور میں رشد و ہدایت کا چراغ ان بوریہ نشین اہل اللہ کی کوششوں سے ہی روشن رہا ہے جو اس کام کے لیے اپنی پوری زندگیاں وقف کر چکے تھے۔ امت میں اختلافات کے ہنگامے دور اول کے بعد سے ہی شروع ہو گئے کتنی ہی حکومتیں اور امارتیں بدلتی رہیں، انقلاب پر انقلاب آتے رہے۔ نئے نئے فتنے اٹھے اور اٹھائے گئے لیکن صحابہ کے

وقت سے لے کر ہمارے اس دور تک افراد کی ایک جماعت نے ہر چیز سے منہ موڑ کر شہرت و دولت کی تمام خود فریبیوں کو ٹھکرا کر اپنے شب و روز تزکیۂ نفوس کے کاموں کے لیے وقف کر دیے۔ اس کا باقاعدہ ایک نظام قائم کیا۔ ذکر و فکر کی مجلسیں عام کیں۔ انسان کے شعور عقلی میں پیدا ہونے والی شیطانی خرابیوں کے ریاضتی علاج تجویز کیے اور عین اس عہد میں جب کہ حکومت و ثروت اور علوم و فنون کی انتہائی سربلندیوں نے مسلمانوں کو دنیا کی سب سے بڑی قوم بنا دیا تھا۔ ہر طرف بے فکری و لاابالیت کا دور دورہ تھا۔ جگہ جگہ ذہنی و جسمانی عیاشیوں کے سامان فراہم تھے، بزم امروز تھا نہ فکر فردا تھی، مردان حق کے اس گروہ نے اس شدت کے ساتھ دینی اخلاص، سادہ زندگی اور اطاعت پیغمبری کا علم بلند کر کے رکھا کہ ہر اس چیز کو قبول کرنے سے انکار کر دیا جس کا ثبوت پیغمبر علیہ السلام کی زندگی اور رضامندی سے نہ ملتا ہو چاہے وہ شرعاً مباح ہی کیوں نہ ہو۔ اس کا یہ اثر ہوا کہ اسلامی قدروں سے غفلتوں کے دور تو آئے لیکن انحراف و بغاوت کی جرأت بڑوں بڑوں کو نہ ہو سکی ——

فارغ البالی اور جاہ و ثروت کے ایسے ادوار میں ان قدسیوں کا جھونپڑیوں اور چٹائیوں پر پوری زندگی اطمینان کے ساتھ بسر کر دینا، اپنے اوقات کا ایک ایک لمحہ یادِ الٰہی اور حق بیانی کے لیے وقف رکھنا، ایک دنیا کو دعوت حق دیتے رہنا اور دنیاوی خوش حالیوں سے برضا و رغبت دست کش ہو جانا یقیناً زبردست پُرعزیمت اقدام تھا جس نے امت کو امراء اور فرنگیوں کے ذہنی تغلب سے محفوظ رکھا۔ غلط ہے جو لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ تصوف مسلمانوں کے عہد زوال کی پیداوار ہے۔ قطع نظر اس بات کے کہ تصوف انسانی فطرت کا ایک اہم خاصہ اور اسلامی زندگی کا حاصل ہے، یہ مسلمانوں کے عہد عروج کی ایک بہت بڑی دینی ضرورت تھی جسے اللہ تعالیٰ نے ان اہل اللہ کے ہاتھوں پورا کرایا، اور مسلمانوں کی کشتی کو طاؤس و رباب کے دور بدمستی میں ڈوبنے سے بچایا۔ بعد کے لوگوں نے اگر ایک صحیح چیز سے غلط کام لیا تو اس سے اس کی صداقت و افادیت ختم نہیں ہو جاتی ہے۔ آج بھی مادی ساز و سامان کی فراوانیوں اور فکر و عمل کی بے لگام آزادیوں کے اس دور میں جب کہ زبان و عمل میں کوئی ہم آہنگی باقی نہیں رہ گئی ہے اور فساق و فجار کے ہاتھوں میں زمام کار آ گئی ہے، تزکیۂ نفوس کے باقاعدہ نظام کی پہلے سے کہیں زیادہ شدید ضرورت موجود ہے۔ ماضی میں بھی تزکیۂ نفوس کے اس نظام نے ہی مسلمانوں کے ذہن و اخلاق کو مضبوط رکھا، ان کے مذہبی حس و شعور کو مغلوب ہونے سے بچایا اور اعلائے کلمۃ الحق کی کتنی ہی مخلصانہ تحریکوں کے ابھرنے کے مواقع بہم پہنچائے۔ اور آج اذہان و افکار میں جو ٹکراؤ اور ہیجان برپا ہے

اس کے فیصلہ کن انجام پر ہی آئندہ کی کامیابیوں کا دارومدار ہے اس کامیابی کے لیے بھی مسلمانوں میں تزکیۂ نفس کے کاموں کی ایک عظیم مہم چلانی شدید ضروری ہے۔

تیسرا درجہ مسلمانوں کے باہمی روابط کی ہمہ گیر اصلاح کے کام کا ہے، مسلمانوں کے مابین "رحماء بینهم" کی کوئی کیفیت آج باقی نہیں رہ گئی ہے، ان کے معاشی اور معاشرتی روابط میں ایک عظیم تفاوت پیدا ہو چکا ہے جس کی وجہ سے ایک دوسرے کے واسطے ہمدردی کے جذبات ان کے اندر معدوم ہو چکے ہیں۔ کوئی زیادہ نقصان کی بات نہیں تھی اگر مسلمان مختلف جائز فقہی اور سیاسی حلقہ بندیوں میں تقسیم ہو گئے تھے بشرطیکہ ان کے معاشی، معاشرتی روابط درست رہتے۔ مگر یہ بات بڑے ہی رنج کے ساتھ دیکھنے میں آئی ہے کہ فقہی و کلامی حلقہ بندیوں سے کہیں زیادہ شدت کے ساتھ نیم سیاسی و نیم مذہبی گروہ بندیاں ان روابط پر اثر انداز ہوئیں، عقیدہ و عمل کی دنیا جدید نظام تعلیم نے تہ و بالا کی تو اجتماعی زندگی کی ہمواریوں کو ان جدید نیم سیاسی و نیم دینی گروہ بندیوں نے نقصان پہنچایا۔

ہماری ملت اور ہمارے معاشرے کے یہ وہ کمزور گوشے اور رخنے ہیں جن کی طرف پوری پوری توجہ دیے بغیر مسلمانوں کو فتنہ ہائے امروز و فردا سے بچایا نہیں جا سکتا۔ اور وہ اپنے پیچھے مستقبل کے انسان کے لیے کوئی رہنما ترکہ چھوڑ کر نہیں جا سکتے۔

(الفرقان جمادین [illegible])

عتیق الرحمن سنبھلی

جماعت اسلامی کا لٹریچر اور گذشتہ بزرگوں کا فہم دین

(یہ مضمون ربیع الاول ۱۳۸۰ھ کے الفرقان میں "اجمال کی تفصیل" کے عنوان سے شائع ہوا تھا)

جماعت اسلامی کے حلقہ سے شائع ہونے والے ایک مضمون پر، ذیقعدہ ۱۳۷۹ھ کے الفرقان میں تنقید کرتے ہوئے ہم نے اپنا یہ احساس ظاہر کیا تھا کہ سلف صالحین اور امت کے ائمہ و مجددین کے ساتھ ایسی بے تکلفی و بے باکی (جس کا مظاہرہ اس مضمون میں کیا گیا تھا) کی ذمہ داری ایک حد تک اکابر جماعت اسلامی پر بھی عاید ہوتی ہے —— اور کیوں عاید ہوتی ہے؟ اس سلسلہ میں ہم نے کچھ اجمالی اشارات کیے تھے، جن کا حاصل یہ تھا کہ ان حضرات کی تحریروں میں ایک ایسا عنصر موجود ہے جو اسلاف سے بے اعتمادی پیدا کرتا ہے بلکہ بعض تحریریں تو صراحۃً اس نتیجہ تک پہونچاتی ہیں کہ یہ جو ائمہ دین و مجددین کہلاتے ہیں، دین کو سرے سے سمجھے ہی نہیں۔ جماعت اسلامی کے حضرات نے ہمارے اس کہنے کا بہت برا مانا اور نہ صرف برا مانا بلکہ یہاں تک کہہ دیا کہ یہ صرف بہتان تراشی اور افترا پردازی ہے جس کا مقصد محض جماعت اسلامی کو بدنام کرنا اور اس کے خلاف اشتعال پیدا کرنا ہے۔

اکابر جماعت اسلامی کی ایسی تحریریں تو بہت سی ہیں جنھیں کسی خاص طبقہ کے حق میں اس کے مخصوص مزاج کے پیش نظر اسلاف سے بے اعتمادی کا موجب قرار دیا جا سکتا ہے۔ مگر جس طرح ان تحریروں کے بارہ میں ایک رائے یہ ہو سکتی ہے اسی طرح اس کے برخلاف بھی ہو سکتی ہے ورنہ کم از کم اتنا تو کہا ہی جا سکتا ہے کہ یہ تحریریں بذات خود کسی حضرت کی خاص نہیں ان میں اگر حضرت کا کوئی پہلو پیدا

ہوتا ہے تو وہ خارجی اثر سے یعنی کسی خاص طبقہ کے حق میں ان کی مضرت اس کے مخصوص مزاج کی بناء پر پیدا ہوتی ہے اور ہوسکتا ہے کہ لکھنے والے کے پیش نظر وہ خاص طبقہ نہ رہا ہو اس کے مخصوص مزاج کا اندازہ یا اس کی طرف توجہ نہ ہو ـــــ اس لیے ہم ایسی تمام تحریروں کو نظر انداز کرتے ہوئے جن کے بارہ میں دو رائیں ہوسکتی ہیں یا کوئی عذر پیش کیا جاسکتا ہے، اس وقت صرف ایسی چند تحریریں خیال میں پیش کریں گے جو بلا کسی خارجی عامل کے بذات خود اسلام کے اعتماد کو مجروح کرتی ہیں اور منطقی طور پر ان کے بارہ میں دو رائیں نہیں ہوسکتیں ۔

(۱)

اس سلسلہ میں پہلے نمبر پر ہم مولانا سید ابوالاعلیٰ صاحب مودودی کی مشہور کتاب "قرآن کی چار بنیادی اصطلاحیں" کا "مقدمہ" پیش کریں گے ۔ اس کتاب میں مولانا نے قرآن کی چار بنیادی اصطلاحات ـــــ الٰہ، رب، عبادت، دین ـــــ کی تشریح فرمائی ہے ۔ اور مقدمہ میں اس تشریح کی ضرورت یہ بیان فرمائی ہے کہ قرآن کی ان بنیادی اصطلاحات کے صحیح مفہوم پر صدیوں سے پردہ پڑا ہوا ہے اور اس کی بدولت قرآن کی تین چوتھائی سے زیادہ تعلیم، بلکہ اسکی حقیقی روح نگاہوں سے مستور ہوگئی ہے اس لیے ضرورت ہے کہ ان اصطلاحوں کی پوری پوری تشریح کی جائے[۱]

اس سلسلہ میں مولانا لکھتے ہیں کہ :-

"عرب میں جب قرآن پیش کیا گیا تھا اس وقت ہر شخص جانتا تھا کہ الٰہ کے کیا معنی ہیں اور رب کسے کہتے ہیں، کیوں کہ یہ دونوں لفظ ان کی بول چال میں پہلے سے مستعمل تھے ۔ انھیں معلوم تھا کہ ان الفاظ کا اطلاق کس مفہوم پر ہوتا ہے، اس لیے جب ان سے کہا گیا کہ اللہ ہی اکیلا الٰہ اور رب ہے اور الوہیت و ربوبیت میں کسی کا قطعًا کوئی حصہ نہیں، تو وہ پوری بات کو پا گئے ۔ انھیں بلا کسی التباس و اشتباہ کے معلوم ہوگیا کہ دوسروں کے لیے کس چیز کی نفی کی جارہی ہے اور اللہ کے لیے کس چیز کو خاص کیا جارہا ہے ۔ جنھوں نے مخالفت کی یہ جان کر کی کہ غیر اللہ کی الوہیت و ربوبیت کے انکار سے کہاں کہاں ضرب پڑتی ہے اور جو ایمان لائے وہ یہ سمجھ کر ایمان لائے ـــــ کہ اس

[۱] ان دو تین سطروں میں جو الفاظ آئے ہیں وہ قریب قریب سب مولانا ہی کے ہیں جو مقدمہ کے آخری حصے سے ماخوذ ہیں ۔

عقیدہ کو قبول کر کے ہمیں کیا چھوڑنا اور کیا اختیار کرنا ہوگا۔ اسی طرح عبادت اور دین کے الفاظ بھی ان کی بولی میں پہلے سے رائج تھے۔ ان کو معلوم تھا کہ عبد کسے کہتے ہیں عبودیت کس حالت کا نام ہے، عبادت سے کون سا رویہ مراد ہے اور دین کا کیا مفہوم ہے اس لیے جب ان سے کہا گیا کہ سب کی عبادت چھوڑ کر صرف اللہ کی عبادت کرو اور ہر دین سے الگ ہو کر اللہ کے دین میں داخل ہو جاؤ تو انھیں قرآن کی دعوت کو سمجھنے میں کوئی غلط فہمی پیش نہ آئی۔ وہ سنتے ہی سمجھ گئے کہ یہ تعلیم ہماری زندگی کے نظام میں کس نوعیت کے تغیر کی طالب ہے۔

لیکن بعد کی صدیوں میں رفتہ رفتہ ان سب الفاظ کے وہ اصل معنی جو نزول قرآن کے وقت سمجھے جاتے تھے، بدلتے چلے گئے۔ یہاں تک کہ ہر ایک اپنی پوری وسعتوں سے ہٹ کر نہایت محدود بلکہ مبہم مفہومات کے لیے خاص ہو گیا۔ اس کی ایک وجہ تو خالص عربیت کے ذوق کی کمی تھی دوسری وجہ یہ تھی کہ اسلام کی سوسائٹی میں جو لوگ پیدا ہوئے تھے ان کے لیے إلٰہ اور رب اور دین اور عبادت کے وہ معانی باقی نہ رہے تھے جو نزول قرآن کے وقت غیر مسلم سوسائٹی میں رائج تھے۔ انہی دونوں وجوہ سے دور اخیر کی کتب لغت و تفسیر میں اکثر قرآنی الفاظ کی تشریح اصل معانی لغوی کے بجائے ان معانی سے کی جانے لگی جو بعد کے مسلمان سمجھتے تھے۔

(قرآن کی چار بنیادی اصطلاحیں ص۹ مقدمہ)

یہ تعبیر کیسی خیانت، تحریف اور کاٹ چھانٹ کے خود مولانا کی عبارت ہے۔ یہ عبارت اتنی صاف ہے کہ ہمیں اپنی طرف سے اس کا مطلب اور اس کے مضمرات بیان کرنے کی ضرورت نہیں۔ مولانا کا کھلا ہوا دعویٰ یہ ہے کہ قرآن کی الٰہ، رب، عبادت اور دین جیسی بنیادی اصطلاحات کے جو اصلی مفہومات تھے وہ صدر اوّل کے بعد باقی نہیں رہے اور صدر اوّل سے جتنا جتنا بعد بڑھتا گیا اتنے ہی ان الفاظ کے معنی بدلتے، سمٹتے اور مبہم ہوتے چلے گئے۔ پھر مولانا کے اس بیان میں کوئی استثنا نہیں ہے، جس کا صاف مطلب یہ ہے کہ بعد کی صدیوں میں کوئی ایک بھی ایسا قابل ذکر شخص نہیں گزرا جو ان اصطلاحات قرآنی کے اصلی معنی اور ان کی پوری وسعتوں سے آگاہ ہو۔ رہا یہ

پورا سلسلہ جو حاملین علوم دین اور ائمہ و مجددین کا ہمیں صدر اول کے بعد یا بعد کی صدیوں میں نظر آتا ہے، اس کا تو ذکر ہی کیا۔ بہرحال قطع نظر اس کے کہ "یحمل ھذا العلم من کل خلف عدولہ" (الحدیث)، جیسے نصوص کی موجودگی میں مولانا کا یہ بیان صحیح ہو بھی سکتا ہے یا نہیں، کہنا صرف یہ ہے کہ مولانا کے اس بیان سے متاثر ہونے کے بعد، بعد کی صدیوں کی، ان تمام شخصیتوں کے متعلق جنھیں ہم دین کے شارح، مفسر اور متعمد نمائندگان کی حیثیت سے جانتے ہیں یہ خیال قائم ہو جانا ضروری اور لازمی ہے کہ یہ لوگ من اولھم الی آخرھم قرآن کی بنیادی اصطلاحات کے اصلی اور مکمل مفہومات سے نابلد تھے۔ اور اس کے نتیجہ میں لازماً یہ خیال پیدا ہو جانا بھی ضروری ہے کہ ان کی نگاہوں سے قرآن کی حقیقی روح مستور تھی۔ قرآن کی پوری تعلیم ان کے لیے غیر واضح تھی اور قرآن پر ایمان رکھنے کے باوجود ان کا عقیدہ اور عمل دونوں نامکمل تھے۔ اس لیے کہ جو شخص قرآن کی بنیادی اصطلاحات سے پوری طرح واقف نہ ہوگا اس کا یقیناً یہی حال ہوگا۔

آپ خفا نہ ہوں یہ نتیجہ کی بات بھی ہم اپنی طرف سے نہیں کہہ رہے ہیں خود مولانا قرآن فہمی میں ان بنیادی اصطلاحات کی اہمیت بیان کرنے کے بعد لکھتے ہیں کہ:۔

> "اگر کوئی شخص نہ جانتا ہو کہ الٰہ اور رب کا مطلب کیا ہے، عبادت کی تعریف کیا ہے اور دین کسے کہتے ہیں تو در اصل اس کے لیے پورا قرآن بے معنی ہو جائے گا۔ وہ نہ توحید کو جان سکے گا، نہ شرک کو سمجھ سکے گا، نہ عبادت کو اللہ کے لیے مخصوص کر سکے گا اور نہ دین ہی کو اللہ کے لیے خالص کر سکے گا۔ اسی طرح اگر کسی کے ذہن میں ان اصطلاحوں کا مفہوم غیر واضح اور نامکمل ہے تو اس کے لیے قرآن کی پوری تعلیم غیر واضح ہو جائے گی اور قرآن پر ایمان رکھنے کے باوجود اس کا عقیدہ اور عمل دونوں نامکمل رہیں گے۔" الخ (ص مقدمہ)

اب فرمائیے کہ جن لوگوں کے متعلق یہ خیال کر لیا جائے کہ ان کی نگاہوں سے قرآن کی حقیقی روح مستور تھی اور اس کی پوری تعلیم ان کے لیے غیر واضح تھی، ان کے علم و فہم پر کیسے اعتماد کیا جا سکتا ہے اور بحیثیت دین کے شارح، مفسر اور نمائندگان کے انھیں کیا وقعت دی جا سکتی ہے؟ اور پھر اگر طبیعت بے باکی کی خوگر ہو تو ایسے حضرات کی آراء و افکار پر تنقید کرتے ہوئے کیا چیز بے باکی اور بے تکلفی سے مانع ہو سکتی ہے؟

ہم مولانا کی نیت کے بارے میں کوئی بدگمانی نہیں کرتے ممکن ہے مولانا کو اس کا اندازہ بھی نہ ہو کہ ان کے اس بیان کی زد کہاں اور کس طرح پڑے گی۔ مگر منطقی نتائج تو کسی نیت کے پابند نہیں ہوا کرتے۔ قرآن کی چار بنیادی اصطلاحیں کا مقدمہ بذات خود اسلاف سے بے اعتمادی پیدا کرنے کی پوری صلاحیت اپنے اندر رکھتا ہے وہ صلاحیت بروئے کار آ کر رہے گی اور رہی!

(۲)

اس کے بعد ہم جماعت اسلامی ہند کی دوسرے نمبر کی شخصیت مولانا صدر الدین صاحب اصلاحی کا وہ مضمون پیش کریں گے جو "دین کا قرآنی تصور کیا ہے اور کیا نہیں؟" کے عنوان سے ماہنامہ زندگی[1] رام پور کی کئی اشاعتوں میں شائع ہوا ہے۔ اس مضمون میں فاضل مضمون نگار نے، جیسا کہ عنوان سے ظاہر ہے، یہ بتلایا ہے کہ دین اور خدا پرستی کا کون سا تصور خالص قرآنی اور اسلامی ہے اور کون سا تصور غیر قرآنی۔ اس تحقیق کے سلسلہ میں انھوں نے تفصیل کے ساتھ دین کے قرآنی اور غیر قرآنی تصورات کا جائزہ لیا ہے۔ پھر ان میں سے ہر ایک کے اپنے اپنے تقاضے بتلائے ہیں۔ اس کے بعد یہ دکھلایا ہے کہ کتنے غیر قرآنی افکار جو در اصل غیر قرآنی تصور دین کے تقاضے تھے مسلمانوں میں گھس آئے اور اسلامی تعلیمات میں سے سمجھے جانے لگے۔

اس جائزہ میں ہمیں سب سے زیادہ قابل فکر اور حیرت انگیز واقعہ یہ نظر آیا ہے کہ یہ غیر قرآنی افکار صرف عام، دنیادار اور نام نہاد پیروان قرآن ہی تک محدود نہیں رہے ہیں بلکہ بڑے بڑے مخلص دیندار اور اساطین امت تک کسی نہ کسی حد تک ان افکار کو شرف قبول بخشتے ہوئے نظر آتے ہیں مثلاً امام غزالیؒ، شیخ الاسلام ہرویؒ، حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ اور حضرت مجدد الف ثانیؒ۔ اور یہ دو چار نہیں ایسی بے شمار قابل احترام ہستیاں ہیں جو کم و بیش اسی حال میں نظر آتی گئیں۔ اور اس حیرت انگیز واقعہ کا سبب ان کے نزدیک یہ ہے کہ ان حضرات کے بنیادی تصور دین ہی میں بگاڑ پیدا ہو گیا تھا۔ چنانچہ وہ "پیروان قرآن میں غیر قرآنی افکار" کی مثالیں پیش کرنے کے بعد لکھتے ہیں:۔

"یہ ہیں وہ چند بہت ہی نمایاں اور اہم غیر قرآنی افکار، جو پیروان قرآن کے ذہنوں

[1] اگست، ستمبر، اکتوبر، نومبر، دسمبر ۱۹۵۸ء۔ جنوری ۱۹۵۹ء

میں سرایت کر گئے ہیں، اور برسوں سے امت کے اجتماعی کردار پر غیر معمولی اثر ڈال رہے ہیں۔ اگرچہ ان میں سے ہر ایک کا عمل دخل یکساں گہرا نہیں، اور نہ سب کے حلقہ ہائے اثر یکساں وسیع ہیں، لیکن قرآن کی تعلیمات سے، اس کے مزاج سے، اس کے سطح نظر سے اس کے افکار و تصورات سے میل نہ کھانے میں سب برابر کے شریک ہیں اور کاروزار حیات کے اندر قرآنی تصور دین کے کار فرما ہونے کی فطری راہ روکنے میں کوئی پیچھے نہیں ہے۔

آگے چند سطروں کے بعد لکھتے ہیں:۔

سوال یہ ہے کہ ان بیگانے اور زہریلے افکار کو اس دراندازی کا موقع کیسے مل گیا؟ اگر دنیا کے طلب گاروں ہی تک ان کی پذیرائی محدود ہوتی تو یہ سوال کوئی سوال نہ تھا، ہر شخص بیک نگاہ جان سکتا تھا کہ یہ دراصل اغراض پرستی کے کرشمے ہیں جو انسان کو دین کی[عہ] ایسی ہی تعبیرات کی تلاش میں سرگرداں رکھتی ہے، جس کے ذریعے دنیوی اغراض کا حصول آسان تر ہو جائے، دنیا کے پیچھے بھاگنے والا تو کبھی اس امر میں کوئی بک ہی نہیں محسوس کرتا کہ جب ضرورت ہو، نفسانیت کی قینچی اٹھائے اور دین کی قطع و برید کر ڈالے، اپنے مفاد کے موقلم سے اسلام کی جیسی تصویر چاہے بنا ڈالے —— لیکن معاملہ بڑا ہی فکر آزما اور سخت پیچیدار بن جاتا ہے جب ان افکار کو کسی نہ کسی حد تک شرف قبول بخشتے ہوئے کچھ دوسری طرح کے لوگ بھی دکھائی پڑتے ہیں[عہ] جن پر اس طرح کی کسی اغراض پرستی اور زمانہ سازی کا الزام لگانا ممکن ہی نہیں۔ کیونکہ یہ وہ لوگ ہیں جن کے اخلاص کی قسمیں کھائی جاسکتی ہیں، جن کی بلندیوں تک نفسانیت کے زاغ و زغن پرواز کرنے کی ہمت ہی نہیں رکھتے، جن کی تابناک سیرتوں پر نگاہوں کا ٹھہرنا بھی آسان نہیں اور جن کی پوری زندگی اللہ کی تقدیس اور حمد و تسبیح میں تحلیل ہو کر رہ گئی تھی۔ ایسے ارباب خلوص و دیانت کے بارے میں یہ گمان کہ انھوں نے جانتے بوجھتے ان افکار کے لیے اپنے سینے کھول دیے ہوں گے، وہی شخص کر سکتا ہو جو یا تو ماغی فتور میں

عہ کہیں کہیں الفاظ چھوٹے ہوئے معلوم ہوئے انھیں اپنی طرف سے اس طرح قوسین میں لکھ دیا گیا ہے۔ (ع)

عہ انھیں لوگوں میں امام غزالی، مجدد الف ثانی اور شاہ ولی اللہ رحمہم اللہ بھی ہیں۔ (ع)

مبتلا ہو یا قلبی شقاوت میں اس لیے صورت واقعہ اس کے سوا اور کوئی ہو ہی نہیں سکتی کہ
کچھ خاص اسباب کے باعث ان کے یہاں دین کے بنیادی تصور ہی کے اندر کسی ایسے انحراف
نظر نے راہ پائی جو معصوم صورت تھا اور اپنے آب و رنگ سے بمشکل پہچانا جا سکتا تھا جس کے
باعث انہیں ذرا نہ محسوس ہو پایا کہ اس طرح کا کوئی حادثہ پیش آ رہا ہے۔"

(زندگی بابت جنوری ۱۹۷۸ء صفحہ ۲۲-۲۳)

حاصل کلام یہ ہے کہ متعدد غیر قرآنی افکار جو در اصل غیر قرآنی تصور دین کے برگ و بار ہیں نہ صرف یہ کہ عرصہ دراز سے عوام اور نام نہاد پیروان قرآن کے ذہنوں میں سرایت کیے ہوئے ہیں بلکہ بہت سے وہ حضرات بھی جن کے سروں پر امامت و تجدید کے تاج رکھے ہوئے ہیں جو گذشتہ صدیوں میں دین کے کامل و معتمد ترین نمائندے اور کتاب و سنت کے انتہائی مستند شارح مانے گئے ہیں اور جن کی یہ حیثیت اہل حق میں آج بھی مسلم ہے، ان غیر قرآنی افکار کو سینہ سے لگائے رہے ہیں، اور اس کا سبب یہ ہے کہ ان کے یہاں دین کے بنیادی تصور ہی میں کچھ بگاڑ آ گیا تھا۔ یعنی ان حضرات کا تصور دین خالص قرآنی نہیں تھا، بلکہ اس میں غیر قرآنی تصور دین کی کچھ آمیزش ہو گئی تھی۔

جناب مضمون نگار نے کہنے کو تو یہ بات کہدی کہ ائمہ و مجددین کی صف کے ان اہم ترین اشخاص کے بنیادی تصور دین ہی میں بگاڑ پیدا ہو گیا تھا مگر پھر انھوں نے محسوس کیا کہ یہ گولی اتنی کڑوی ہے کہ بعض لوگوں کے حلق سے آسانی سے نہیں اتر سکتی اور اس بات کو تسلیم کرنے میں ذہنوں کو رکاوٹ پیش آئے گی چنانچہ انھوں نے اس بات کی پوری کوشش کی ہے کہ لوگ شرح صدر کے ساتھ ان کے اس نتیجہ فکر کو تسلیم کر لیں۔ خود ہی لکھتے ہیں کہ:-

"اگر چہ پچھلی بحثوں کے ضمن میں اس بات کے متعدد کھلے ہوئے آثار و قرائن معرض تحریر میں آ چکے ہیں کہ مذکورہ بالا انحرافِ نظر یا غلطیٔ افکار کا سبب تصور دین ہی کا بگاڑ ہے، لیکن چونکہ یہ بات بڑی اہم ہے اور اس کا اثر امت کی بے شمار قابل احترام ہستیوں پر کچھ اس طرح کا پڑتا ہے جو ہماری عقیدتوں پر گراں ہو سکتا ہے[1] اس لیے ضرورت ہے کہ اس کی کچھ اور شہادتیں بہم پہنچا لی جائیں تاکہ ذہنوں کو اس کے تسلیم کر لینے میں کوئی رکاوٹ باقی نہ رہ جائے۔" (صفحہ ۲)

---

[1] اس بات کو اچھی طرح ذہن میں رکھیے۔ ہم آگے صرف یہی بتلانا چاہتے ہیں کہ "کچھ اس طرح کا" اثر کیا ہوگا۔ (ع)

ہمیں اس وقت اس سے بحث نہیں کہ فاضل مضمون نگار کی یہ تحقیقات صحیح ہیں یا غلط! اور ہم اس چیز سے بھی صرف نظر کرتے ہیں کہ مضمون نگار کی یہ کوشش کہ امام غزالیؒ، مجدد الف ثانی اور شاہ ولی اللہ جیسے ائمہ دین کے بنیادی تصور دین میں بگاڑ کا وقوع تسلیم کر لینے میں ذہنوں کو کوئی رکاوٹ باقی نہ رہ جائے کس مقصد کی غمازی کرتی ہے۔ اس وقت سوال صرف اتنا ہے کہ کیا ان تحقیقات سے متاثر ہونے کے بعد اور پورے شرح صدر کے ساتھ یہ سمجھ لینے کے بعد کہ امام غزالیؒ مجدد الف ثانی اور شاہ ولی اللہ دہلوی رحمہم اللہ جیسے ائمہ مجددین کا بنیادی تصور دین ہی صحیح نہیں تھا بلکہ وہ کچھ قرآنی اور کچھ غیر قرآنی تصور دین کا معجون مرکب تھا۔ ان حضرات کے فہم دین پر کسی قسم کا اعتماد باقی رہ سکتا ہے؟ اور دین میں ان کے آراء و اقوال کو کوئی وزن دیا جا سکتا ہے۔؟

بالکل سیدھی سی بات ہے کہ دین کا قرآنی تصور جو کچھ بھی ہو وہ بہرحال قرآن کی بنیادی تعلیمات کے صحیح فہم سے پیدا ہوتا ہے۔ پس جن لوگوں کے متعلق یہ خیال کر لیا جائے گا کہ ان کا تصور دین خالص قرآنی نہیں تھا ان کے متعلق لازماً یہ رائے قائم ہوگی کہ ان کو قرآن کی بنیادی تعلیمات کا صحیح فہم حاصل نہیں تھا۔ اور ایسے حضرات جنہیں قرآن کی بنیادی تعلیم کا صحیح فہم حاصل نہ ہو فہم دین کے معاملہ میں یقیناً کسی اعتماد کے مستحق نہیں ہو سکتے اور کتاب و سنت کی شرح و تفسیر میں ان کے اقوال اور ان کی آراء کا بجائے خود کوئی وزن نہیں محسوس کیا جا سکتا! —— اور جب یہ گذشتہ صدیوں کے منتخب اشخاص قابل اعتماد نہ رہیں گے تو —— بدیگراں چہ رسد!

اسی بنا پر اس مضمون کے متعلق ہم قطعی طور پر یہ محسوس کرتے ہیں کہ اس سے متاثر ہونے کے بعد گذشتہ صدہا برس کے سلف صالحین وائمہ و مجددین پر دین کو سمجھنے سمجھانے میں کسی قسم کے اعتماد کا سوال باقی نہیں رہ جاتا —— خواہ انہیں نہایت مخلص و باخدا اور ذاکر و شاغل قسم کے بزرگ سمجھا جاتا رہے۔

سلف صالحین کے اعتماد کو سب سے زیادہ مجروح کرنے والا تو اس مضمون کا یہی پہلو ہے کہ اس میں ان کے تصور دین کو غلط تسلیم کرانے کی کوشش کی گئی ہے اور اس حد تک کی گئی ہے کہ "ذہنوں کو اس کے تسلیم کر لینے میں کوئی رکاوٹ باقی نہ رہ جائے" اس کے علاوہ ایک دوسرا پہلو بھی ہے اور وہ وہی ہے جس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے زیتبصرہ کے "نگاہ اولین" میں ہم نے لکھا تھا کہ مودودی صاحب

کی اصولی نشان دہی کے بعد جماعت اسلامی کے بعض اہل قلم نے اکابر امت و ائمہ دین کی غلطیوں کی تفصیلات اور جزئیات مہیا کرنے کا کام شروع کیا۔ اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ اس مضمون کی تیسری قسط میں مضمون نگار نے ان افکار و مقتضیات کو گنایا ہے جو دین کے غیر قرآنی تصور سے پیدا ہو سکتے ہیں (اور وہ یہ ہیں۔ ترکِ دنیا، وحی و رسالت سے بیگانگی، دین کی محدودیت، اور وحدت ادیان) پھر چوتھی قسط میں یہ دکھایا ہے کہ یہ غیر قرآنی افکار، پیروانِ قرآن کے ذہنوں میں بھی سرایت کیے ہوئے ہیں اور اس کے ثبوت کے طور پر انھوں نے گزشتہ دور کے دینی لٹریچر سے نکال کر ایک طویل فہرست ان عبارات و اقوال کی پیش کی ہو انھیں ان غیر قرآنی افکار کے حامل نظر آئے۔ یہ عبارات اور یہ اقوال جہاں کچھ مجذوبین کے ہیں وہیں کچھ صوفیائے محققین اور غزالیؒ و شاہ ولی اللہ جیسے ائمہ و مجددین کے بھی ہیں۔ اس کے بعد پانچویں قسط میں انھوں نے اپنے قارئین کو یہ بتلایا کہ ایسی عظیم ترین شخصیتوں کے ان غیر قرآنی اور زہریلے افکار کے لیے اپنے سینے کھول دینے کا سبب اس کے سوا کچھ نہیں ہو سکتا کہ ان کے بنیادی تصور دین ہی میں کچھ فتور پیدا ہو گیا تھا۔ اس کے بعد ——— جیسا کہ ہم سابق میں بتلا چکے ہیں ——— انھوں نے یہ محسوس کر کے کہ یہ بات بہت گھٹ اور دور رس ہے اور آسانی سے تسلیم نہیں کی جا سکتی، اس بات کی ضرورت محسوس کی کہ اپنے دعوے کے حق میں کچھ اور شہادتیں بہم پہنچائی جائیں تاکہ ناظرین پورے شرح صدر کے ساتھ یہ بات مان لیں کہ ہاں واقعی ان مخلص و باخدا بزرگانِ دین اور ائمہ و مجددین کے بنیادی تصور دین ہی میں کچھ بگاڑ پیدا ہو گیا تھا۔ چنانچہ انھوں نے ایک بار پھر گزشتہ دور کے دینی لٹریچر کا جائزہ لیا اور پھر ایک طویل فہرست ان بزرگانِ دین اور ائمہ و مجددین کی ان عبارتوں کی پیش کی جو انھیں غیر قرآنی افکار کی حامل نظر آئیں یا یوں کہیے کہ جو ان بزرگوں کی غلط افکار کی مثالیں ہیں۔ چنانچہ وہ مزید شہادتوں کی ضرورت کا اظہار ان الفاظ میں کرنے کے بعد جو سابق میں نقل کیے جا چکے ہیں۔ لکھتے ہیں:۔

> ظاہر ہے کہ اس غرض کے لیے ہمیں پھر اسی دینی لٹریچر کا جائزہ لینا پڑے گا جو گزشتہ زمانوں میں عبادات اور خدا پرستی کے موضوع پر فراہم ہو چکا ہے ...... اس ذخیرے سے منتخب کی ہوئی حسب ذیل چند باتوں پر غور کیجیے :۔ (زندگی بابتہ جنوری ۱۹۶۲ء صفحہ ۱)

اس کے بعد مسلسل چھ سات صفحوں میں وہ عبارتیں نقل ہوتی چلی گئی ہیں اور یہ عبارتیں جن حضرات

گئی ہیں ان میں حضرت شاہ ولی اللہ کی اہم شخصیت کے علاوہ دو اور اہم شخصیتیں شیخ الاسلام ہروی اور حضرت مجدد الف ثانی کی بھی ہیں۔ رحمۃ اللہ علیہم۔

بہرحال ہمیں کہنا یہ تھا کہ سلف صالحین کے اعتماد کو مجروح کرنے والا، اس مضمون کا ایک دوسرا پہلو یہ بھی ہے کہ اس میں ان حضرات کی غلطی افکار کی مثالوں کی ایک پوری فہرست مرتب کر کے رکھ دی گئی ہے جسے دیکھ کر وہ لوگ جو ان حضرات کے مقام سے واقف نہیں ہیں یقیناً یہی کہیں گے کہ انھوں نے تو دین کا ستیاناس کر کے رکھ دیا ہے کہ رہبانیت اور وحی و رسالت سے بیگانگی، جیسے صریح غیر قرآنی افکار تک کو دین میں گھسا دیا!

ہم سمجھتے ہیں کہ اکابر جماعت اسلامی کی تحریروں میں اگر اس طرح کی کوئی اور چیز نہ بھی ہو تو یہی دو تحریریں صدر اوّل کے بعد کے سلف صالحین اور مسلم ائمہ و مجددین سے بے اعتماد کر دینے کے لیے بالکل کافی ہیں اور ان سے متاثر ہونے کے بعد ناواقفوں کو یہی سمجھنا چاہیے کہ شروع کی ایک آدھ صدی کو چھوڑ کر دین کی حقیقی روح اور اس کا کامل صحیح تصور مستور ہی رہا حتیٰ کہ اب چودھویں صدی میں مولانا مودودی اور ان کے رفقاء نے آکر اس حقیقی روح پر سے پردہ اٹھایا اور اس کامل صحیح تصور کو اجاگر کیا جو صدر اوّل میں پایا جاتا تھا۔

اس خیال کے قائم ہو جانے کا ایک قدرتی نتیجہ تو یہ ہے جس کی طرف ہم نے پہلے توجہ دلائی تھی کہ سلف صالحین کے علم و فہم کی وقعت دلوں سے نکل گئی اور ہر ایرے غیرے کو جرأت ہو گئی کہ اُن کے آراء و افکار کو نشانۂ تنقید بنا لے اور اگر طبیعت میں بے باکی کے جراثیم ہیں تو پھر وہ تنقید اس نمونہ کی ہو جس کا ایک نمونہ ذی قعدہ کے الفرقان میں پیش کیا جا چکا ہے۔

یہ نتیجہ جو ظہور میں آچکا ہے صورتاً شنیع تو بہت ہے مگر دین کے لیے اتنا مضر حقیقتاً نہیں ہے جتنا ایک دوسرا نتیجہ جو ظہور میں آسکتا ہے اور وہ یہ کہ دین ایک بازیچۂ اطفال بن جائے۔ اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ دس پانچ صدیاں تو درکنار، بیچ کے کسی ایک دور کے متعلق بھی یہ کہنا کہ اس دور میں دین کی بنیادی حقیقتوں کا وہ مفہوم محفوظ نہیں رہا جو صدر اول میں سمجھا گیا تھا، اس بات کا اعلان ہے کہ صدر اول کا مفہوم ہم تک متواتر نقل کے ذریعہ نہیں پہونچ سکا ہے —— پھر وہ کون سا

ذریعہ ہے جس سے ہمیں قطعیت کے ساتھ معلوم ہوسکے کہ صدر اول میں ان حقیقتوں کا کیا مفہوم تھا؟ ظاہر ہے کہ ایسا کوئی ذریعہ ہمارے پاس نہیں قطعیت اور یقین کا فائدہ دینے والا ذریعہ صرف نقل متواتر ہوسکتی تھی اور اس کا ہم انکار کر چکے ہیں۔ اب معاملہ ہمارے فہم پر آکر ٹھہر جاتا ہے کہ ہم کتاب وسنت کے الفاظ پر عربی لغت، اہل زبان کے استعمالات اور دیگر قرائن کی روشنی میں غور کرکے ان حقیقتوں کا کوئی مفہوم متعین کریں۔ مگر ظاہر ہے کہ کیسے ہی روشن دلائل ہم اپنے متعین کردہ مفہوم کے حق میں لے آئیں مگر وہ دلائل مفید یقین ہرگز نہیں ہوسکتے۔ ہمیں زیادہ سے زیادہ ظن غالب اس امر کا حاصل ہوسکتا ہے کہ صدر اول میں ان حقیقتوں کا یہی مفہوم رہا ہوگا۔ اور ہوسکتا ہے کہ واقعہ بھی یوں ہی ہو مگر ہم قطعیت کے ساتھ ہرگز نہیں کہہ سکتے کہ یہی مفہوم صدر اول میں ان حقیقتوں کا تھا۔ پس پہلی قباحت تو اس خیال میں بذات خود یہی ہے کہ دین کی بنیادی حقیقتوں کا مفہوم بھی قطعی الثبوت نہ رہا، اور دوسری بڑی قباحت بلکہ فتنہ عظیم جو اس کے بطن سے پیدا ہوگا (اور جس کی طرف توجہ دلانا یہاں مقصود ہے) وہ یہ ہے کہ جب ان بنیادی حقائق کا کوئی مفہوم قطعی الثبوت نہ ہوگا تو ہر شخص کو حق ہوگا کہ وہ اپنے فہم کے مطابق ان کا کوئی مفہوم متعین کرلے اور اس کی بنیاد پر دین کا ایک جداگانہ تصور اپنے ذہن میں قائم کرلے — یہی مطلب ہے دین کے بازیچۂ اطفال بن جانے کا۔

(الفرقان ربیع الاول ۱۳۷۰ھ)

قوم ترقی کی راہ پر
زیادہ سے زیادہ لوگوں کے لئے مزید کپڑا
دھوتیوں اور ساڑھیوں کی پیداوار 16 کروڑ مربع میٹر تک پہنچ گئی ہے آج سے ایک سال پہلے یہ مقدار صرف 10 کروڑ مربع میٹر تھی۔
کنٹرول شدہ کپڑے کی 90 فیصد مقدار کو آرڈینیٹ کی 28,000 پرچون دوکانوں کے ذریعہ فروخت کی جاتی ہے اور ان میں سے زیادہ تر دوکانیں دیہات میں واقع ہیں۔
مضبوط ارادہ
اور کڑی محنت
ہمارے ساتھی ہیں
davp 75/484

عتیق الرحمٰن سنبھلی

دینی اختلاف رائے میں رواداری کے حدود

"اصل دین ہی خطرے میں اور عصری طوفانوں کی زد میں ہے۔ ایسے میں اختلافی بحثیں چھیڑنا اور باہمی مباحثوں پر وقت صرف کرنا انتہائی نا عاقبت اندیشی اور دینی محاذ کو کمزور کرنے کے مترادف ہے۔"

اس قسم کی نصیحتیں ہیں جو آجکل بہت سننے میں آرہی ہیں۔ اور یہ فی الاصل ہے بھی صحیح بات! مگر صحیح باتیں اگر غلط محل میں استعمال کی جانے لگیں تو وہ انتہائی خطرناک اور گمراہ کن بھی ہوجاتی ہیں۔ "اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ" بالکل صحیح بات اور قرآن کی بیان کردہ حقیقت تھی، مگر اسی کو خوارج نے جب غلط محل میں استعمال کیا تو وہ اسلام میں ایک شدید فتنہ بن گیا اور سیدنا علی بن ابی طالبؓ کو کہنا پڑا کہ "کلمةُ حقٍ اُريد بها الباطل" یہ فی الاصل کلمۂ حق ہے مگر اس کا استعمال جس مقصد کے لیے کیا جا رہا ہے وہ باطل ہے۔

اسی طرح وہ کلمہ جو اوپر نقل کیا گیا، اصلاً حق ہے، مگر اس کے استعمال میں بہت سے لوگ غلطی اور ناعاقبت اندیشی کا ثبوت دیتے نظر آرہے ہیں۔

مسائل کی ایک نوع وہ ہے جن پر آدمی کی ایک رائے ہونی چاہیے۔ مگر دوسری رائے کی بھی وہاں گنجائش ہوتی ہے۔ اس لیے اپنی رائے پر اعتماد کے باوجود کسی دوسری رائے کی بھی گنجائش تسلیم کی جانی چاہیے۔ اور تبادلۂ خیالات ہو تو ہو مگر کشمکش و نزاع کی صورت ہرگز نہ اختیار کی جائے۔

اس کی مثال فقہ کے وہ مسائل ہیں جن میں دونوں طرف کے دلائل موجود ہیں، معاملہ کسی دلیل کی ترجیح وغیرہ کا ہوتا ہے، یا جیسے آج کل دین کی خدمت ونصرت میں بہتر طریق کار کا مسئلہ ہے کہ اس میں مختلف رائیں ہوسکتی ہیں۔

ایک نوع وہ ہے جہاں ایک رائے کے سوا دوسری رائے کتاب وسنت کے خلاف اور دوسرا مسلک از قبیل منکرات وبدعات ہوتا ہے، اور تبادلۂ خیالات سے کام نہ چلتا ہو تو فی نفسہ لازم ہے کہ اس کی تردید کی جائے۔ لیکن اگر وقت ایسا ہے کہ ان مسائل سے اہم تر مسائل در پیش ہیں اور ان سے عہدہ برآ ہونے کے لیے امت کے تمام دینی رجحان رکھنے والے عناصر کے اتفاق اور تعاون وتناصر کی اور اس بات کی ضرورت ہے کہ امت کی عام توجہ انھیں اہم تر مسائل کی طرف رہے تو ان غلط خیالات واعمال کی اصلاح کی حکیمانہ کوشش تو بہر حال جاری رہنی چاہیے لیکن برملا تردید اور نزاع کی نوبت بیشک نہیں آنی چاہیے۔

مسائل کی یہ دونوں انواع فروع سے تعلق رکھتی ہیں، اور ان میں واقعی یا اضافی (یعنی دوسرے کے نقطۂ نظر سے) غلطی کا اثر محض کسی ایک جزئیے تک محدود رہتا ہے، لیکن بعض مسائل ایسے ہوتے ہیں کہ ان کا اثر پورے دین کی یا دین کے بڑے حصہ کی سلامتی پر پڑتا ہے۔ اور ان میں اگر کوئی غلط اصول قائم ہونے دیا جائے تو بجائے دشمنوں کے خود اپنوں ہی کے ہاتھوں اور بجائے بدنیتوں کے خود مخلصین ہی کے ہاتھوں دین کا حلیہ بگڑ کر رہ سکتا ہے۔ مثلاً ایک شخص الحاد اور دہریت کے عصری طوفان کے مقابلہ میں اسلام کا علمبردار ہے اور اسلامی نظام فکر وعمل ہی میں انسانیت کی نجات سمجھتا ہے۔ مگر وہ یہ اصول ساتھ لیکر چلتا ہے کہ خلیفۂ وقت مقتضیات زمانہ کے تحت دینی احکام کی ان تمام شکلوں میں ترمیم کرسکتا ہے جو قرآن میں منصوص نہیں ہیں، ظاہر ہے کہ اس شخص کے ہر خیال کو فروعی اختلافات پر قیاس کرکے اور یہ سوچ کر کہ یہ وقت آپس میں لڑنے کا نہیں ہے، نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ اس لیے کہ یہ اصول دین کے ایک بڑے حصہ کو تلپٹ کرکے رکھ دے گا۔ علیٰ ہذا جو بھی شخص اور جو بھی دینی گروہ اس طرح کا کوئی غلط اصول قائم کرتا ہے۔ وہ خواہ عصری طوفانوں کے مقابلہ میں "اصل دین" کے لیے کتنا ہی قیمتی کیوں نہو، اس کی اس غلطی اور زیغ سے

چشم پوشی نہیں کی جاسکتی۔

اگر آپ کے گھر پر، محلہ پر، یا شہر پر باہر سے کوئی حملہ ہو رہا ہو۔ اور اندر آپ ہی میں کا کوئی شخص بے وقوفی سے یا بھول چوک سے کسی حصہ میں آگ لگا دے، تو کون عقل مند ہوگا جو کہے کہ پہلے بیرونی حملہ پسپا کر دو آگ بعد میں بجھانا؟ ظاہر ہے کہ اہل خانہ، اہل محلہ یا اہل شہر کو دونوں کام ساتھ ساتھ کرنا پڑیں گے اور یہی دانشمندی اور عاقبت اندیشی ہوگی۔ اگر کوئی کہنے لگے کہ بیرونی حملہ پسپا ہوا اور دوسری طرف توجہ کی وجہ سے قوت مدافعت کمزور پڑ گئی تو آگ سے جو کچھ تم بچاؤ گے اس سے بھی محروم ہو جاؤ گے، اس لیے کہ وہ دشمن لے اڑے گا۔ لہٰذا اب یکسو ہو کر بیرونی مورچے ہی پر ڈٹے رہو تاکہ آگ سے جو کچھ خود بچ رہے وہ جیسے سکے اور معدنیات وغیرہ، بلکہ خود وہ زمین جس پر از سر نو تعمیر کی جاسکتی ہے) وہ تو تمھارا رہے، بتائیے کون ہے جو اس منطق کو قبول کرے گا؟

اسی طرح یہ منطق بھی سخت تباہ کن ہے کہ فلاں اصول سے زیادہ سے زیادہ نظام عمل میں کچھ فتور پیدا ہو جائے گا، مگر یہ جو الحاد و بے دینی کا سیلاب ہے، اس میں تو ایمانیات اور اساسات دین تک کی خیر نہیں۔ بس، پہلے اس کو روکو۔ اندر کے فتنوں کی بعد میں خبر لینا۔

یہاں ایک بات اور بھی قابل لحاظ ہے کہ اس قسم کا خطرناک اصول اگر کوئی ایسا شخص پیش کرتا ہے جس کا اہل دین میں کوئی خاص وقار اور کوئی خاص وزن نہیں ہے تو وہ اپنی حیثیت کے مطابق اہمیت کے باوجود اتنی توجہ اور اتنی فکر کا مستحق نہیں ہے، جتنی توجہ اور جتنی فکر کا مستحق ایسا کوئی وہ اصول ہے جو کسی ایسی شخصیت کی طرف سے پیش کیا جائے جسے اہل دین کی نظر میں کوئی خاص وزن اور کسی دینی طبقہ کی نظر میں دینی سند کی حیثیت حاصل ہو۔ ایسے کسی شخص سے اگر ایسی کوئی بات سرزد ہوتی ہے تو اس پر ٹوکنا خصوصیت کے ساتھ زیادہ ضروری ہے۔ اس لیے کہ ایسی صورت میں ایک فرد کی نہیں بلکہ ایک بڑی جماعت کی گمراہی کا خطرہ یقینی ہے۔

ہاں اب یہ اس شخص کا اور اس کے حامیوں کا فرض ہے، اگر وہ مخلص ہیں، کہ انھیں اگر کسی بات پر ٹوکا جاتا ہے تو وہ اس کو نزاع کی صورت نہ دیں۔ تاکہ حتی الامکان اور کسی بھی حد تک اتحاد و تعاون

کی گنجائش باقی رہ سکے لیکن اگر وہ اَخَذَتْہُ الْعِزَّۃُ بِالْاِثْمِ کا مظاہرہ کرنے لگ جائیں، اور ایک اصولی اختلاف کو زبردستی ذاتی عناد کا نتیجہ قرار دے کر تنابز بالالقاب کی مہم شروع کر دیں ۔ تو ظاہر ہے کہ ایسی صورت میں اتحاد و تعاون کی گنجائش برقرار رکھنا کسی بھی شخص کے بس کی بات نہیں۔ اور اس کی تمام تر ذمہ داری اسی شخص پر ہے جو بحث کو یہ غلط رنگ دے ۔۔۔ تاہم یہ ممکن ہے کہ دوسرا شخص ضبط و تحمل سے کام لے کر اپنی حد تک فضا کو زیادہ خراب ہونے سے بچانے کی کوشش کرے۔

لیکن اس کے بعد اگر یہ رجہ آجائے کہ حق واضح ہو جانے پر اور اس کی شہادتیں چاروں طرف سے ہویدا ہو جانے پر بھی آدمی اپنی بات کی پچ میں بیتیرہ بازی دکھائے اور اپنی ساری ذہانت، سازی استدلالی قوت اور تقریر و تحریر کی تمام تر مہارت ایک باطل کو حق بنا دینے میں صرف کرنے لگے۔ کتاب و سنت کا غلط استعمال کرے اور فقہاء و محدثین کے بیانات کو بے محل استعمال میں لائے۔ اور اس طرح ایک اصولی گمراہی کے ساتھ ساتھ دس جزئی علمی و دینی غلط فہمیاں لوگوں میں پیدا کرے تو ہرگز روا نہیں ہے کہ اس کے ساتھ ادنیٰ رعایت کی جائے، وہ اگر عصری طوفانوں کے مقابلہ میں اصل دین کی حفاظت کی کوئی بڑی خدمت بھی انجام دے رہا ہے اور ان طوفانی لہروں کی تخریب کے مقابلہ میں تعمیر نو کا علمبردار ہے۔ تو لوگ ایسی تعمیر کو لیکر کیا کریں گے جس میں کتنی ہی خرابیوں کی صورتیں ہمیشگی مضمر ہوں؟ اور جس کا معمار اس بات کا روادار ہو کہ محض اپنے وقار کی خاطر دین کے کتنے ہی حصہ کو کسی وقت خود اپنے ہی ہاتھوں مسخ کر دے۔

تَحْسَبُوْنَہٗ هَیِّنًا وَّ هُوَ عِنْدَ اللّٰهِ عَظِیْمٌ۔

(الفرقان صفر ۱۳۷۹ھ)

محمد منظور نعمانی

داعیانِ حق

اپنی طرف نہیں بلکہ خدا کی طرف بلاتے ہیں

مَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّؤْتِيَهُ اللّٰهُ الْكِتٰبَ وَالْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ ثُمَّ يَقُوْلَ لِلنَّاسِ كُوْنُوْا عِبَادًا لِّيْ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلٰكِنْ كُوْنُوْا رَبّٰنِيّٖنَ بِمَا كُنْتُمْ تُعَلِّمُوْنَ الْكِتٰبَ وَبِمَا كُنْتُمْ تَدْرُسُوْنَ ۝ وَلَا يَاْمُرَكُمْ اَنْ تَتَّخِذُوا الْمَلٰٓئِكَةَ وَالنَّبِيّٖنَ اَرْبَابًا اَيَاْمُرُكُمْ بِالْكُفْرِ بَعْدَ اِذْ اَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ ۝

(آل عمران)

کسی (خدا کے فرستادہ) بشر سے یہ نہیں ہو سکتا کہ اللہ اس کو کتاب اور قانون شریعت اور نبوت دے پھر وہ لوگوں سے کہنے لگے کہ تم خدا کے سوا میرے بندے بن جاؤ لیکن (اس کی ہدایت یہی ہوگی کہ) تم سب اللہ والے بن جاؤ (کتاب پڑھ پڑھا کر یعنی اللہ کا فرستادہ رسول ہمیشہ کتاب الٰہی کی روشنی میں خدا کی طرف دعوت دیگا) اور وہ یہ بھی نہیں کہے گا کہ تم فرشتوں اور نبیوں کو رب بنا لو کیا (معاذ اللہ) وہ تم کو کفر کا حکم دے سکتا ہے، بعد اس کے کہ تم مسلمان ہو چکے ہو (جاؤ کسی رسول سے ایسا نہیں ہو سکتا۔)

اس آیت کریمہ میں داعیان حق بالخصوص پیغمبران الٰہی کا ایک عام اصول یہ بتلایا گیا ہے کہ وہ دنیا کو اپنی بندگی کی طرف نہیں بلاتے۔ بلکہ ان کی دعوت اور ان کی پکار صرف یہ ہوتی ہے کہ اے لوگو صرف اللہ کے بندے بن جاؤ۔

آپ حضرت آدم علیہ السلام سے لیکر حضور خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم تک سارے انبیاء علیہم السلام

کے سوانح کا مطالعہ کر جائیے کہیں کسی ایک جگہ بھی آپ کو یہ نہ ملے گا کہ خدا کے کسی پیغمبر نے دنیا کو اپنی طرف دعوت دی ہو، اپنی بندگی کرائی ہو، اپنے کو سجدہ کرنے کا حکم دیا ہو، اپنی نذر و نیاز کا سبق دیا ہو، اپنے گھر کا طواف کرایا ہو۔

ہادیانِ حق میں صرف ایک حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ذات ایسی ہے جن کے متعلق ان کی گمراہ قوم کا بیان ہے کہ انھوں نے دنیا کو خدا کے سوا اپنی بھی تعلیم دی۔ اور بقول بعض (معاذ اللہ) اپنی والدہ ماجدہ مریم صدیقہ کو بھی شریک الوہیت بتایا۔ لیکن خدا اور خدا کی آخری کتاب خاہد ہے کہ یہ سب مفتریوں کا افترا ہے جس میں صداقت کا کوئی شائبہ نہیں۔ عیسیٰ علیہ السلام کی کیا مجال تھی کہ وہ بندگی چھوڑ کر خدا بن بیٹھتے۔ جو لوگ ایسا کہتے ہیں اور بندگی کو حضرت عیسیٰؑ کے لیے باعثِ عار سمجھتے ہیں وہ احمق ہیں اور عبد و معبود کی خصوصیت سے جاہل۔

لَنْ يَسْتَنْكِفَ الْمَسِيحُ أَنْ يَكُونَ	مسیح کو اللہ کا بندہ بننے سے ہرگز عار نہیں ہو سکتی
عَبْدًا لِلّٰهِ وَلَا الْمَلٰٓئِكَةُ	(اور انہی پر کیا موقوف) ملائکہ مقربین کو بھی
الْمُقَرَّبُوْنَ (نساء)	اس کی بندگی سے عار نہیں۔

اور جب قیامت کے دن اس گمراہ اور مفتری قوم کی افترا پردازی کا پردہ چاک کرنے کے لیے سرِ محشر حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے سوال کیا جائے گا۔ کہ

أَأَنْتَ قُلْتَ لِلنَّاسِ اتَّخِذُوْنِيْ	کیا تم نے ان لوگوں سے کہا تھا کہ خدا کے سوا
وَأُمِّيَ إِلٰهَيْنِ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ	مجھ کو اور میری ماں کو بھی معبود بنا لینا۔

تو آپ صاف عرض کریں گے کہ حاشا وکلا میری کیا مجال تھی کہ ایسی باغیانہ بات منہ سے نکالتا

مَا قُلْتُ لَهُمْ إِلَّا مَا أَمَرْتَنِيْ	میں نے تو ان سے اس کے سوا کچھ بھی نہیں کہا کہ
بِهٖٓ أَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ رَبِّيْ وَ	تم بس اس خدا کی بندگی کرو جو میرا اور تمہارا
رَبَّكُمْ (مائدہ، رکوع آخر)	رب ہے (اور ہم سب اس کے بندے ہیں)

ہمارا ایمان ہے کہ بیشک حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے توحید ہی کی تعلیم دی اور دنیا کو یہی بتلایا کہ اُسی ایک خدا کے بندے بن جاؤ جو آسمان و زمین اور کُل کائنات کا رب ہے۔ جو اس کے خلاف کہتا ہے اور اس معصوم نبی پر تعلیم شرک کی تہمت دھرتا ہے وہ مفتری ہے، کذاب ہے اور اس کے لیے

آخرت میں جہنم کا شدید عذاب ہے۔

علیٰ ہذا خدا کے آخری پیغمبر (فداہ امی وابی وروحی وقلبی) صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اپنی امت کو اس اکیلے خدا کی بندگی کی تعلیم دی اور نہایت صفائی کے ساتھ دنیا کو بتلا دیا کہ میری دعوت و پکار صرف خدا کے لیے ہے۔ اور میں تم کو اپنی طرف نہیں بلاتا بلکہ اللہ کے حکم سے اللہ ہی کی طرف بلاتا ہوں۔

...... هٰذِهٖ سَبِيْلِىْٓ اَدْعُوْٓا اِلَى اللّٰهِ عَلٰى بَصِيْرَةٍ اَنَا وَمَنِ اتَّبَعَنِىْ وَسُبْحٰنَ اللّٰهِ وَمَآ اَنَا مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ۝ (یوسف رکوع آخر)	...... یہ میرا طریقہ ہے، میں (لوگوں کو) خدا کی طرف بلاتا ہوں (اور میری یہ دعوت و تبلیغ) انحصار محض نہیں ہے۔ (بلکہ اس طور پر ہے کہ) میں اور میرے متبعین سب دلائل کی روشنی میں ہیں اور اللہ تعالیٰ کے لیے (ہر قسم کے عیب اور شرک سے) پاکی ہے اور میں شرک والوں میں سے نہیں ہوں۔

آپ نے اپنی دعوت میں یہ بھی ظاہر فرمایا کہ جس خدا کی عبادت کا میں تم کو حکم دیتا ہوں میں خود بھی اسی کی عبادت کرتا ہوں اور جس خدا کی بندگی کا سبق میں تم کو دے رہا ہوں میں بھی اس کا ایک بندہ ہوں۔

اِنَّمَآ اُمِرْتُ اَنْ اَعْبُدَ اللّٰهَ وَلَآ اُشْرِكَ بِهٖ ۭ اِلَيْهِ اَدْعُوْا وَاِلَيْهِ مَاٰبِ ۝ (رعد رکوع ۵)	مجھ کو حکم ملا ہے کہ میں صرف ایک خدا کی عبادت کروں اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ کروں، میں اسی کی طرف (تم کو بھی) بلاتا ہوں اور اسی کی طرف مجھ کو (اور سب کو) لوٹ کر جانا ہے۔

الغرض آدم علیہ السلام سے لیکر خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم تک جتنے خدا کے ہادی آئے ان میں سے ہر ایک نے دنیا کو صرف خدا ہی کی طرف بلایا اور اپنی اپنی قوموں کو صاف بتا دیا کہ ہماری دعوت صرف اللہ ہی کی طرف ہے۔ اور ہم محض یہ چاہتے ہیں کہ تمہاری عبدیت کا تعلق صرف

اسی واحد قہار سے رہے۔

لیکن یہ ایک عجیب اتفاق ہے کہ انبیاء علیہم السلام کی یہی متحدہ اور متفقہ تعلیم انکے مخاطبین کیلیے زیادہ گرانبار خاطر رہی اور اسی سے لوگوں نے زیادہ روگردانی کی آج بھی اگر آپ امت مرحومہ کا جائزہ لیں تو اپنے کو مومن اور مسلم کہنے والوں میں بھی ایک بڑی تعداد ایسے افراد کی نکلے گی جنھوں نے خدا کے سوا اور بھی بہت سوں سے رشتہ عبدیت جوڑ رکھا ہے۔ کوئی اپنے پیر کے سامنے جھک رہا ہے کوئی کسی بزرگ کے مزار کو سجدہ کر رہا ہے، کوئی امام حسین کے تعزیے یا کسی ولی کے روضہ کے طواف میں مشغول ہے۔

لیکن کیا معاذ اللہ ان بزرگان دین اولیائے کرام یا شہداء عظام نے ان کو ان افعال شنیعہ کی تعلیم دی ہے؟ .... حاشا للہ کہ ان کے پاک دلوں میں کبھی ایسا وسوسہ بھی گذرا ہو۔ ان کا دامن تقدس ان تمام شیطانی حرکات سے پاک ہے۔ اور ان کی مقدس روحیں ان تمام اعمال سے بری اور بیزار ہیں۔

حضرات اولیائے کرام کے مقدس گروہ میں سیدنا شیخ عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ کو جو تفوق اور امتیاز حاصل ہے وہ محتاج بیان نہیں اور غالباً یہی دیکھ کر ارباب ضلالت نے اپنے ان مشرکانہ اعمال کا زیادہ نشانہ آپ ہی کی ذات اقدس کو بنایا ہے اور انہی کے نام پر آجکل یہ حرکتیں زیادہ کی جاتی ہیں۔ لیکن اس بارے میں آپ کی جو تعلیمات ہیں وہ وہی ہیں جو ایک سچے مسلم اور سچے توحید پرست کی ہو سکتی ہیں چنانچہ آپ کی ان موحدانہ تعلیمات کا ایک معتدبہ حصہ آپ کی تصنیفات "فتوح الغیب" اور "غنیۃ الطالبین" سے اقتباس کر کے ہم ربیع الثانی کے نمبر میں ہدیۂ ناظرین کر چکے ہیں۔ آج کی صحبت میں آپ کے ایک ملفوظ گرامی کا ترجمہ پیش کرتے ہیں، شاید کسی کے لیے ہدایت کا باعث ہو۔

فیوض یزدانی کی آٹھویں مجلس میں ہے کہ حضرت شیخ علیہ الرحمہ نے ۱۷ شوال ۵۴۵ھ کو سہ شنبہ کے دن مدرسہ معمورہ میں لوگوں کو کچھ نصیحتیں فرمائیں۔ اسی ذیل میں ارشاد فرمایا۔

• صاحبو! میرا کہنا مانو کہ میں اللہ جل جلالہ کا داعی ہوں کہ تم کو بلاتا ہوں اس کے دروازے اور اس کی اطاعت کی طرف میں تم کو اپنی ذات کی طرف نہیں بلاتا کیونکہ یہ نیابت ہے پیغمبر کی

اور غالب رسول کا مقصود دعوت و پکار سے یہ ہوتا ہے کہ اللہ والے بن جاؤ دیکہ میری عزت

کرو اور نذرانے دو۔ ہاں جو منافق اور دین فروش ہوتا ہے وہ مخلوق کو اللہ کی طرف نہیں بلاتا

بلکہ اپنے نفس کی طرف بلایا کرتا ہے۔"　　　(فیوض یزدانی صفحہ ۴۹)

حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ کے نام کا وظیفہ پڑھنے والو اور خدا کے بجائے شیخ ممدوح سے لو لگانے والو بللہ ذرا سوچو کیا تم اُس راستے پر ہو جس کی طرف حضرت شیخؒ نے بلایا تھا؟ اگر نہیں ہو اور یقیناً نہیں ہو تو کیا اب اس شاہراہ ہدایت پر آنے کو تیار ہو؟ دیکھو حضرت شیخ کی مقدس روح اب بھی تم کو پکار رہی ہے اور توحید کے سچے راستے کی طرف بلا رہی ہے۔ کیا ہے کوئی نیک بخت جو شیخ کی آواز پر لبیک کہے؟

(الفرقان رمضان و شوال ۱۳۵۲ھ)

(صفحہ ۱۹۲ کا بقیہ)

۱۔ قلتِ خوراک و وسائل معاش کے خیال سے تحدید نسل کا رجحان کتاب و سنت کی رو سے کوئی پسندیدہ رجحان نہیں ثابت کیا جاسکتا۔

۲۔ عزل کی وہ روایات جو یہ دکھانے کے لیے پیش کی گئی ہیں کہ حضور نے ممانعت نہیں فرمائی، ان میں سے کوئی بھی نہیں بتاتی کہ عزل کی بنا خشیۂ املاق و تنگدستی کا خوف تھی ـــــ واضح رہے کہ اسامہ بن زیدؓ کی جو روایت احمد و مسلم کے حوالہ سے ان مضامین میں نقل کی گئی ہے اس میں "اشفق علی ولدہا" کا مطلب غلط سمجھا گیا ہے۔ اس میں کثرت اولاد کا خوف نہیں، بلکہ دودھ پیتے بچے کو کوئی نقصان پہنچ جانے کا خطرہ بیان ہوا ہے، چنانچہ مسلم میں یہ روایت "باب الغیلة" کے تحت آئی ہے۔ اسی سے اس کا مطلب سمجھا جاسکتا ہے۔

۳۔ انفرادی واقعات اور قومی پیمانے کے رجحانات کا حکم یکساں ہونا ضروری نہیں۔ روایات میں انفرادی انداز کے واقعات سامنے آتے ہیں، نہ کہ قومی اور اجتماعی پیمانے کا کوئی رجحان۔ بس ان واقعات میں آنحضرتؐ کی عدم ممانعت کو قومی پیمانہ پر تحدید نسل کا رواج ڈالنے کے لیے وجہ جواز نہیں بنایا جاسکتا۔

۴۔ اولاد کو بیماریوں اور وباؤں پر قیاس کر کے اس کے انسداد یا مدافعت کی تدبیروں کو جائز ٹھہرانا کوئی صحیح طرز فکر نہیں، اولاد اللہ کا ایک عطیہ اور نسل انسانی کی بقاء کے لیے اس کا ایک ازلی فیصلہ ہے جس کے لیے اللہ نے مرد و زن کو ایک ذریعہ بنایا ہے۔ اس کے برعکس ہم پر بیماریاں اور وبائیں مسلط کرنے سے اللہ کو از خود کوئی دلچسپی نہیں، یہ چیزیں در اصل خود ہماری کسی غلطی کے نتیجہ میں ہم پر مسلط ہوتی ہیں۔ بس ان غلطیوں سے احتیاط و اجتناب یا ان کے نتائج کے ازالہ کی تدبیروں پر قیاس کر کے اولاد کے انسداد کے لیے بھی یہی سب روا رکھنا ظاہر ہے کہ کس قدر غلط قیاس ہے۔

۵۔ بے روزگاری اور افلاس کا مسئلہ ہماری آبادی کے خاص طور پر جس حصہ کا مسئلہ ہے تجربہ بتاتا ہے کہ اس میں ضبط تولید کو رواج پانے کے لیے جتنا عرصہ درکار ہوگا، ارباب اقتدار اور درد مندان ملت اگر ایمانداری اور فرض شناسی کے ساتھ جد و جہد کریں تو بلاشبہ اتنے عرصہ میں وسائل معاش کی افزائش اور ان کی صحیح تقسیم کا بندوبست ہوسکتا ہے۔ پس کیوں اس مسئلہ کو سیدھے سیدھے حل کرنے کے بجائے قوم کو تحدید نسل کا سبق پڑھایا جائے۔ اور اس سبق کے خطرات کو انگیز کیا جائے؟ (الفرقان بابت محرم ۱۳۸۵ھ)

انتخاب

مسلمانوں میں قبر پرستی

سن تو سہی جہاں میں ہے تیرا فسانہ کیا

آسام کے ایک وزیر جناب معین الحق چودھری نے پچھلے دنوں ایک سرکاری تقریب کے موقع پر گاندھی جی کی مورتی پر پھول چڑھانے سے انکار کر دیا تھا[1] معاصر "دعوت" دہلی نے اس پر تبصرہ کرتے ہوئے روزنامہ "پرتاپ" کا تبصرہ بھی نقل کیا ہے۔ اس تبصرہ میں جہاں معاصر "پرتاپ" نے معین الحق صاحب کے رویہ کی تعریف کی ہے۔ وہاں مسلمانوں کے ایک ایسی چٹکی بھی لی ہے جسے پڑھ کر غیرت ایمانی کو پسینہ پسینہ ہو جانا چاہیے: — معاصر "دعوت" رقمطراز ہے:-

ایک تیسری بات جو اسی واقعہ سے سامنے آئی ہے یہ ہے کہ ہندوؤں کا وہ طبقہ جو کٹر فرقہ پرست کہلاتا ہے اس طرح کے اصولی اقدامات کو سراہنے پر آمادہ ہے۔ چنانچہ معاصر "پرتاپ" نے اس واقعہ کی تعریف کرتے ہوئے لکھا تھا کہ "آسام کے وزیر مسٹر معین الحق نے اچھا کیا جو رواج پر اپنے ضمیر کی آواز کو ترجیح دیتے ہوئے گاندھی جی کی مورتی پر پھول چڑھانے سے انکار کر دیا۔ ان کے نزدیک یہ بُت پرستی ہے اور اسلام کی رو سے بت پرستی شرک میں داخل ہے۔" یہ تعریف ثابت کرتی ہے کہ اصول پرستی پر جم جانا بجائے خود ایسا عمل ہے جو اپنی تاثیر پیدا کرتا ہے۔

وزیر مذکور کے اس اقدام کی تعریف کرتے ہوئے معاصر "پرتاپ" نے ایک اور مسئلہ کی طرف توجہ دلائی ہے اور وہ یہ ہے کہ مسلمان خود بھی قبر پرستی میں مبتلا ہو چکے ہیں۔ معاصر لکھتا ہے۔

"حضرت محمدؐ کو اس بات پر بجا فخر حاصل ہے کہ انھوں نے عرب جیسے شرک پسند ملک میں بت پرستی کے خلاف آواز اٹھائی اور اس بات پر نہایت سختی سے قائم رہے کہ بُت پرستی کفر ہے خدا ایک ہے دوسرا انہیں

[1] خبر تازہ کا یہ واقعہ ہے اس زمانہ میں معین الحق چودھری صاحب آسام کی وزارت میں تھے بعد میں وہ مرکز کے وزیر بھی رہے۔ ابھی چند مہینے پہلے مرحوم کا انتقال ہوا ہے۔ رحمہ اللہ تعالیٰ (الفرقان)

مسلمان بھی حضرت کی اس تعلیم پر قائم رہے ہیں یہاں تک کہ انھوں نے آنحضرت کی کوئی شبیہ نہیں بننے دی انکی اصل تصویر تو کیا ہو سکتی ہے لیکن جو نقلی تصویر شائع ہوئی اس کے خلاف انھوں نے پروٹسٹ کیا۔ نہ صرف ؛ یہاں بلکہ ہاتھ سے بھی یسوع کی بھی کوئی اصل تصویر نہیں ہوگی لیکن چونکہ عیسائیوں کو اپنے پیامبر کی تصویر بنائے جانے پر اعتراض نہیں اس لیے ان کی تصویر دنیا کے سامنے ہے۔ جہاں مسلمانوں نے بت پرستی کے لحاظ سے اپنے رسول کے حکم کی تعمیل کی ہے وہاں...... افسوس کے ساتھ یہ کہنا پڑتا ہے کہ انھوں نے قبر پرستی جیسی بدعت کی پیروی کرکے انکی حکم عدولی کی ہے۔ یہ کہنا مبالغہ میں داخل نہ ہوگا کہ جتنی قبر پرستی مسلمانوں میں پائی جاتی ہے شاید ہی کسی اور قوم میں پائی جاتی ہو، ہندوؤں میں چونکہ مردوں کو دفن کرنے اور ان کی قبر بنانے کا رواج نہیں ہے۔ اس لیے ان میں سمادھ کی پوجا بہت کم ہے پھر بھی ان کے ہاں سمادھیں بن رہی ہیں اور لوگ ان پر پھول چڑھاتے ہیں۔ مسلمانوں کی دیکھا دیکھی ہندو عورتیں بھی دعا مانگنے اور بچے لینے کے لیے مسلمان پیروں کی قبروں پر جاتی ہیں۔ پیروں کی پرستش کرنیوالے مسلمان مردوں اور عورتوں کا تو کوئی شمار نہیں۔ اگر کسی کو یہ دیکھنا ہو کہ مسلمان کیسی بری طرح اس بدعت...... کا شکار ہو چکے ہیں تو وہ لاہور میں داتا گنج بخش کے دربار میں چلا جائے اسے معلوم ہو جائے گا کہ مسلمان کس قدر اپنے رسول کی حکم عدولی اور اپنے مذہب کی توہین کرتے ہیں۔ داتا گنج بخش تو پاکستان میں چلا گیا ہندوستان میں قبر پرستی یا مزار پرستی کا درشن دیکھنا چاہتے ہو تو خواجہ معین الدین چشتی کی درگاہ واقع اجمیر میں چلے جاؤ۔ میں نے اپنی آنکھوں سے مسلمانوں کو ان کی قبر کے سوراخ میں منہ دئے کر روتے دیکھا ہے۔ خواجہ کی درگاہ کا ہندوستان کے مسلم مقامات مقدسہ میں نمایاں مقام ہے اور ہر سال خواجہ کے عرس پر ہزاروں کی تعداد میں مسلمان وہاں جاتے ہیں۔ وہاں دو بڑے کڑھاؤ ہیں جن میں عرس کے دن چاول پکائے جاتے ہیں۔ یہ چاول بھکتوں میں بانٹے جاتے ہیں۔ چاول کم ہوتے ہیں اور بھگت زیادہ اس لیے ایک طرح کی لوٹ مچ جاتی ہے اور ہر ایک مسلمان بطور تبرک دیگ کے چاول حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ اس درگاہ میں مغل بادشاہوں کی بنوائی ہوئی مسجدیں ہیں۔ اکبر بادشاہ نے بھی یہاں ایک مسجد بنوائی تھی۔ حالانکہ مسلم علماء اس کے خلاف کفر کا فتویٰ صادر کر چکے ہیں لطف یہ ہے کہ یہ قبر پرستی کھلے بندوں ہوتی ہے اور اس کے خلاف کوئی ــــــــ پروٹسٹ نہیں ہوتا۔

(الفرقان ربیع الاول ۱۳۷۰ھ)

عتیق الرحمٰن سنبھلی

دینی پختگی کی ایک اعلیٰ مثال

اسلام کی بنیاد جس ٹھیٹ اور ہمہ گیر توحید پر ہے اس کی رو سے خدا پرستی کے علاوہ کوئی بھی اور "پرستی" حراماً اور قطعاً حرام ہیں۔ ازانجملہ قبر پرستی کی بھی اسلام میں کوئی گنجائش نہیں، اور اس کی توحید خالص کے ساتھ، اس پرستی کا بھی کوئی جوڑ نہیں بیٹھتا۔

اور پھر بانسبت قبر پرستی کے صرف انتہائی مظاہر (سجدہ ریزی اور جبہ سائی) ہی کی نہیں بلکہ ان سے ہلکے درجے کے مظاہر (دست بستہ کھڑا ہونا اور ہار پھول چڑھانا وغیرہ) بھی سب اسی زمرہ میں آتے ہیں اور روح توحید کے ساتھ جوڑ نہ کھانے میں (کم وبیش کے فرق کے ساتھ) سب برابر کے شریک ہیں۔

جدید دور کا "روشن خیال" اور مذہبیت بیزار انسان، قبر پرستی کیا، خدا پرستی کو بھی اوہام پرستی سمجھتا ہے مگر اس کے باوجود قبر پرستی کی روح سے وہ بھی خالی نہیں ہے، فرق صرف اتنا ہے کہ وہ مذہبی عقیدت کی بنا پر قبر پرستی نہیں کرتا اور پرستش کے انتہائی مظاہر (سجدہ ریزی اور جبہ سائی وغیرہ) کو اختیار نہیں کرتا باقی قومی اور وطنی نقطۂ نظر سے جن شخصیتوں کو وہ ہیرو سمجھتا ہے ان کی قبروں اور سمادھیوں پر جاکر، ان کی عظمت کا اعتراف اور اپنی عقیدت کا اظہار کرنے کے لیے وہ تمام دوسرے آداب پرستش بجالانے میں نہ صرف یہ کہ کوئی شرم محسوس نہیں کرتا بلکہ اسے اپنا مقدس فریضہ خیال کرتا ہے۔

حتیٰ کہ ایک مستقل دستور اس زمانہ کا یہ ہو گیا ہے کہ کسی دوسرے ملک میں سرکاری مہمان کی حیثیت سے جانے والا انسان اس ملک کی اہم قومی شخصیت یا وطنی ہیرو کے مقبرہ یا اس کی سمادھی پر جاکر پورے قبر پرستانہ انداز کے ساتھ عملی اظہار عقیدت اور اعتراف عظمت کرنا اپنے پروگرام کا ضروری جزو خیال کرتا ہے۔

اس مشرکانہ دستور کی پابندی آئے دن ہم دیکھ رہے ہیں کہ اپنے آپ کو مسلمان کہلانے والے بھی اسی طرح کر رہے ہیں جس طرح غیر مسلم —— اس ابتلائے عام میں ایک استثنائی مثال حسب ذیل

شاہ سعود (والی نجد و حجاز) نے قائم کی ہے سلاد اس طرح کہ (ابھی عنقریب) ہندوستان آمد کے سلسلہ میں حکومت ہند کو صاف صاف مطلع کر دیا ہے کہ وہ اپنے اسلامی عقائد کی بنا پر اس رسم کی ادائیگی سے معذور ہیں۔

یقیناً یہ ایک قابل تقلید مثال ہے! اللہ تعالیٰ سلطان کو اس جاہلیت جدیدہ کے دور میں اس طرح کی مزید مثالیں قائم کرنے کی توفیق دے۔

ہندوستان میں قومی حکومت کے قیام کے بعد مسلمانوں کے لیے اس "جدید قبر پرستی" جیسے بہت سے مسائل پیدا ہوگئے ہیں۔ کتنی ہی سرکاری اور قومی تقریبات ایسی ہیں کہ جن کے بعض اجزاء اسلام کی تعلیمات سے ٹکرانے والے اور اس کے مزاج کے منافی ہیں۔ ان تقریبات و رسوم کا پروگرام بنانے اور متعین کرنے والے وہ لوگ ہیں جو اسلام کی تعلیمات اور اس کے مزاج سے آشنا ہیں اس لیے وہ پروگرام بنانے میں مسلمانوں کا کتنا ہی لحاظ کریں پھر بھی ان کے لیے مشکل ہے کہ وہ پروگرام میں کوئی جزو ایسا نہ رکھیں جو اسلام کی تعلیمات اور اس کے مزاج سے ٹکراتا ہو، اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ جب کوئی مسلمان ان تقریبات کے ایسے اجزاء میں شرکت سے گریز کرتا ہے تو اس کی ملکی وفاداری پر شبہہ کیا جاتا ہے۔ سیکڑوں صحیح الخیال مسلمانوں کو آئے دن اس کش مکش سے سابقہ پڑتا ہے اس لیے ضروری ہے کہ علمائے اسلام میں سے ایسے حضرات جن کی حب الوطنی پورے ملک پر آشکارا ہے اور کم از کم ملک کے سربراہ اس معاملہ میں ان پر پورا اعتماد رکھتے ہیں وہ ایسی تمام چیزوں کے بارے میں ——— اسی جرأت اور صاف گوئی کے ساتھ جس کی مثال سلطان سعود نے قائم کی ہے ——— سربراہان حکومت پر اسلامی نقطۂ نظر واضح کر دیں اور پھر ان سے درخواست کی جائے کہ اولاً تو کسی قومی تقریب کے پروگرام میں ایسے اجزاء شامل ہی نہ ہونے چاہئیں ورنہ کم از کم مسلمانوں کو ان کی شرکت سے واضح طور پر مستثنیٰ کر دیا جائے۔

یہ اس وقت کی ایک بہت بڑی ضرورت ہے۔ اور ہم سمجھتے ہیں کہ سلطان سعود کے اس اقدام نے اس کام کے لیے زمین ہموار کر دی ہے۔ اللہ ان کو جزائے خیر دے۔

(الفرقان، ربیع الاول ۱۳۷۵ھ)

محمد منظور نعمانی

ہمارے جاہلوں کی گمراہی کی ایک مثال

ابھی حال ہی میں میں مراد آباد سے بریلی جانے کے لیے ٹرین پر سوار ہوا۔ ٹرین جب ریاست رامپور پہونچی تو ہمارے ہی والے درجہ میں چند آدمی سوار ہوئے جنکی صورتیں مسلمانوں کی سی تھیں، ساتھ میں چند عورتیں اور دو چار بچے بھی تھے۔ ان میں ایک بچہ کوئی ۸۔۱۰ برس کی عمر کا تھا جو کچھ ہلکے گلابی رنگ کے کپڑے پہنے ہوئے تھا اور سر پر سہرا ابھی بندھا ہوا تھا۔ عام طور سے سمجھا یہ گیا کہ یہ کوئی مختصر سی بارات ہے جو کہیں جا رہی ہے۔ جب گاڑی چل دی تو میرے قریب میں بیٹھنے والے ایک ہندو مسافر نے ان لوگوں سے دریافت کیا: "آپ لوگ اس بچہ کی شادی کرنے کے لیے جا رہے ہو؟" ان میں سے ایک بڑے میاں نے کہا: "نہیں، شادی تو نہیں ہے۔ اس لڑکے کو ہم سلامی کے لیے مکن پور لیے جا رہے ہیں۔" ـــــ وہ ہندو بابو بولے "سلامی کیا بات؟" ـــــ انہی بڑے میاں نے جواب دیا "مکن پور میں شاہ مدار جی کا مزار ہے، جب کسی کے بچے جیتے نہیں ہیں تو ان کے مزار پر جا کر وہ انکی نذر نیاز مان لیتا ہے کہ میرا بچہ جی جاوے گا تو میں یہ نذر چڑھاؤں گا اور بچہ بھی سلامی کے لیے حاضر ہوا کرے گا۔ تو اس کے بچے جینے لگتے ہیں۔ اس لڑکے پر بھی ان کی نذر مانی گئی تھی تو اب ہم ہر سال اس کو سلامی کے لیے لے جاتے ہیں۔ اور وہاں نذر نیاز چڑھاتے ہیں اور بھی لاکھوں آدمی آتے ہیں۔" ـــــ بیچارہ ہندو بابو معلوم نہیں کس علاقہ کا تھا، وہ شاید ان چیزوں کو کچھ جانتا نہیں اور اس نے سادگی سے کہا "وہاں کوئی ٹھاکر جی ہیں، کوئی دیوتا ہیں؟" ان بڑے میاں نے کہا "نہیں شاہ مدار جی کا مزار ہے" ـــــ وہ بولا "قبر ہے قبر؟" یہ بڑے میاں بولے "ہاں ہاں۔"

میں یہ ساری گفتگو سن رہا تھا اور دل کی آنکھیں خون رو رہی تھیں۔ ان مسلمانوں کی گرفتاری

خرک سے زیادہ اس بات پر کہ جو ہندو مسافر اس گفتگو کو غور سے سن رہے ہیں وہ بھلا کیا رائے قائم کریں گے اسلام کے متعلق، اور کیا فرق سمجھ سکیں گے اللہ کے مقدس دین اسلام اور اپنے دھرم میں؟

امانتِ توحید کے حامل اور اسلام کے محافظ سوچیں کہ ان حالات میں ان کی ذمہ داریاں کیا ہیں؟ پہلے جب سلسلۂ نبوت جاری تھا انھیں گمراہیوں کی اصلاح کے لیے پیغمبر آیا کرتے تھے اب نبوت کا دروازہ بند ہو گیا تو اس پیغمبرانہ کام کی ساری ذمہ داری امت محمدیہ پر ڈال دی گئی ہے "كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ" یقیناً قیامت میں ہم سے سوال ہوگا کہ خود مسلمان کہلانے والوں ہی میں جب یہ صریح شرک پھیل رہا تھا تو ان کی ہدایت و اصلاح کے لیے تم نے کیا کوشش کی؟ خوش نصیب ہیں وہ جو اس دن کے جواب کے لیے اس دنیا میں کچھ کر جائیں۔ اللّٰھم اجعلنا منھم۔

عتیق الرحمٰن سنبھلی

چند متفرقات ایک نگاہ میں

سب سے بڑا سانحہ

گورنر یو۔ پی شری وی وی گری نے روٹری کلب (میرٹھ) کے ایک جلسے کو خطاب کرتے ہوئے کہا ہے کہ

"آخری جنگ عظیم کے بعد ایک سب سے بڑا سانحہ یہ ہوا کہ سچائی اور دیانت داری کا جذبہ ختم ہو گیا ہے ——— لوگوں میں ان اوصاف کو پیدا کرنے کی کوشش کرنی چاہیے ورنہ مجھے نہیں معلوم کہ ہندستان کا حشر کیا ہو گا۔" (قومی آواز ۲۲ر جولائی ۱۹۵۹ء)

(اے عشق مرحبا، وہ یہاں تک تو آگئے!)

بات یہی ہے کہ سب کچھ کیے جائیے۔ پنج سالہ منصوبوں پر منصوبے بنائیے، اربوں روپیہ ان منصوبوں پر خرچ کیے جائیے۔ نئے نئے اور بڑے بڑے کارخانے کھولیے۔ کوآپریٹو کھیتی کی اسکیمیں لائیے۔ "پل بنا، چاہ بنا" کے وظائف پڑھیے۔ جمہوریت کا راگ الاپئے۔ عوامی معیار زندگی کو بلند تر بنانے کے لیے زمین سے آسمان تک اُڑ لیے! لیکن اگر ہندوستان کے عوام و خواص میں سچائی اور دیانت داری کے اوصاف نہیں پیدا ہوتے تو ہر دُور اندیش اور حقیقت شناس ان "ترقی کے اسباب" کے باوجود یہی کہنے پر مجبور ہو گا کہ

"نہیں معلوم ہندوستان کا حشر کیا ہو گا!"

کس قدر تشویش انگیز صورتِ حال ہے کہ ہندوستان کا معیارِ اخلاق روز بروز گرتا جا رہا ہے، مگر باتیں ہیں تو ہر دم بس "معیارِ زندگی" کو بلند کرنے کی! اخلاقی معیار کو بلند کرنے کی ،

ملک کے دروبست پر قابض ہونے والوں میں سے خال ہی خال کوئی آواز اٹھتی ہے، اور وہ بھی ایسی جیسے "نقار خانے میں طوطی کی صدا"۔

دوسری طرف یہ بھی بڑا سانحہ ہے کہ جن مشرقی ملکوں میں سچائی اور دیانت داری کا قابل رشک سرمایہ پایا جاتا ہے، وہاں اس سرمائے سے کوئی بڑا کام نہیں لیا جا رہا ہے، اور صرف روزمرہ کی محدود سی زندگی میں یہ سرمایہ کام آرہا ہے۔ سرزمین پاک (حجاز) سے ہر سال حجاج کے ذریعہ کچھ خوش کن خبریں مل جاتی ہیں۔ امسال بھی نہایت معتبر حجاج سے یہ ایک واقعہ سننے میں آیا ہے کہ ایک عرب تاجر کی دوکان سے دس لاکھ ریال کی چوری ہوئی۔ ملزم عین حجاز کی سرحد پر گرفتار کیا گیا۔ گرفتار کرنے والا صرف ایک کانسٹبل تھا۔ تیسرا ان دونوں کے درمیان کوئی نہ تھا، ملزم نے رشوت کی پیش کش کرنی شروع کی، اور آخر میں بات پورے کے پورے دس لاکھ تک پہنچ گئی۔ مگر اُس عرب سپاہی کی دیانت کو یہ دس لاکھ کی مار سوت بھر بھی اِدھر سے اُدھر نہ کرسکی۔ اور اس نے ملزم کو لے جاکر قاضی کے سامنے پیش کر دیا ——— یہ واقعہ اتنا مصدّقہ ہے کہ ملزم چونکہ (ہماری بدقسمتی سے) ہندوستانی تھا اس لیے اس کی رپورٹ حکومت ہند کو بھی مل چکی ہے۔

اہل حجاز کی دیانت داری صرف پولس ہی تک محدود نہیں ہے کہ ڈسپلن کا نتیجہ سمجھ لیا جائے۔ وہاں باہمی، بلکہ آفاقیوں کے ساتھ بھی، اعتماد کی جو فضا ہر دیکھنے والے کو نظر آتی ہے اور ہم ہندوستان و پاکستان والوں کو تو خصوصًا محوِ حیرت کر دیتی ہے۔ وہ صرف اسی سچائی اور دیانت داری کا نتیجہ ہے جس کی بنا پر کسی کو ایک دوسرے کے متعلق دغدغہ نہیں ہوتا۔ مگر افسوس ہے کہ یہ عظیم و نایاب سرمایہ بھی ہے اور قومی دولت کے وسائل و ذخائر کی بھی کوئی انتہا سرزمین پاک میں نہیں لیکن ان دو سرمایوں کے ملنے سے جو ترقیاتی کام مملکت میں ہو سکتے تھے اُن کے خانے میں اب تک صفر ہی صفر نظر آتا ہے۔

پہلی سالگرہ کا تحفہ

بغداد کی خبر ہے کہ

• اس ہفتہ یہاں مسلمان لڑکیوں نے پردہ ترک کر کے مردوں کی برابری کا اعلان

کردیا ہے ــــــ عراق پانچ روز سے ۱۴ر جولائی کے انقلاب کی سالگرہ پر خوشیاں منا رہا ہے اس دوران لڑکیوں نے انقلاب کی خوشی میں بغیر کسی جھجک کے رقص کیا۔"

(قومی آواز ۲۰ر جولائی)

اس کے مقابلے میں ایک خبر یہ ہے کہ

"نیویارک (امریکہ) میں ــــــ طلبا کی طرف سے دیے گئے ایک خیر مقدمی جلسے میں ڈاکٹر رادھا کرشنن (نائب صدر جمہوریہ ہند) نے تمام ہندوستانی لڑکیوں کو ناچنے اور گانے کی دعوت دی۔ ہندوستان کے مستقل مندوب مسٹر سی، ایس، جھا اور قونصل جنرل مسٹر گوپالا سینن نے لڑکیوں کو بڑھاوا دیا۔ لیکن کسی لڑکی نے جرأت نہیں دکھلائی۔ اس کے بعد نائب صدر نے لڑکیوں کی ہمت بندھائی اور کہا کہ ناچنا گانا ہندوستان کی روایات کا جزو ہے۔ آپ لوگوں کو اپنی میراث نہ چھوڑنا چاہیے۔ بڑی مشکل سے کچھ لڑکیاں گانے پر آمادہ ہوئیں، لیکن ناچنے کے لیے کوئی بھی تیار نہیں ہوئی۔"

(ایضاً ۱۹ر جولائی)

کیسے اس پر کیا تبصرہ کیا جائے ــــــ ایک قوم کے یہاں ناچنے گانے کی کوئی جگہ نہیں اور پردہ اس کی روایات کا عظیم جزو ہے۔ مگر وہاں انقلاب کی سالگرہ کی خوشی کا حق اُس وقت تک ادا نہیں ہوتا جب تک رقص نہ فرمایا جائے اور پردے کی روایات کو تار تار نہ کر دیا جائے۔ دوسری طرف ناچنا گانا ایک قوم کی عظیم میراث ہے، مگر اس کی لڑکیاں بلاد رقص و سرود میں رہتے ہوئے اس روایت سے شرما رہی ہیں۔ اُن کے ملک کا نائب صدر فرمائش کرتا ہے، قونصل جنرل بڑھاوا دیتا ہے مگر وہ بصد شرم گانے سے آگے جانے کو تیار نہیں ہوتیں ــــــ یا مظہر العجائب!!

سچ ہے کہ اسلام کو اب ایک نئی قوم کی ضرورت ہے! ــــــ دیکھیے یہ سعادت کس کی طرف جاتی ہے! لیکن یہ ہونا بہرحال ہے۔ قرآن کا واشگاف اعلان ہے:

وَإِنْ تَتَوَلَّوْا يَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَيْرَكُمْ ثُمَّ لَا يَكُونُوا أَمْثَالَكُمْ (محمد۔ ع ۴)	اگر تم پھر گئے تو خدا (اپنے دین کے لیے) تم سے کسی اور قوم کو بدل دے گا اور پھر وہ تم جیسے نہ ہوں گے۔

اور کہیں کہیں کچھ ظاہری آثار بھی نظر آ رہے ہیں ــــــ مگر یہ ہو گا بڑا حسرتناک واقعہ کہ اسلام کی گود میں پلے ہوئے الحاد کو گلے لگائیں، اور کوئی پروردۂ کفر اٹھ کر اسلام کی آنکھ کا تارا بنے۔

وسیع نقطۂ نظر

یوپی کے وزیر اعلیٰ شری سمپورنانند نے ریاست کی سماجی فلاح تخمینہ کمیٹی کی افتتاحی تقریر میں ناجائز بچوں کے مسئلہ پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے فرمایا ہے کہ

"ناجائز اولاد کا ایسا کوئی مسئلہ پرانے ہندو سماج میں نہیں تھا۔ اس لیے کہ قدیم سماج میں آٹھ قسم کی شادیاں تسلیم کی جاتی تھیں ــــــ قدیم ہندو سماج کے اس وسیع نقطۂ نظر کے نتیجے میں ہر بچہ جائز اولاد قرار دیا جاتا تھا، کیونکہ وہ اپنے والدین کی خطاؤں کے لیے مورد الزام نہیں ٹھہرایا جا سکتا۔"

موصوف نے یہ بھی خیال ظاہر فرمایا کہ

"سماجی نقطۂ نظر میں انقلاب لانا، سماجی فلاح کا اتنا ہی اہم جزو ہے جتنا کہ معذور اور بدنصیب اشخاص کی امداد کرنا۔"

(قومی آواز۔ ۳ جولائی)

جہاں تک بچے کے بے گناہ اور معصوم ہونے کا تعلق ہے، صحیح بات ہے۔ اور اس سماجی نقطہ نظر میں بے شک تبدیلی ہونا چاہیے جس کے تحت ناجائز بچوں کے ساتھ بھی خطاوار کا سا رویہ اختیار کیا جاتا ہے۔ مگر نقطۂ نظر کی یہ وسعت اگر مطلوب ہے کہ اس طرح کی ولادتوں کو سندِ جواز بھی دے دی جائے تو یہ نقطۂ نظر سماج کی بہبودی کا نہیں "خرابی بسیار" کا حامل ہو گا۔ ناجائز طور پر جو بچے وجود میں آ جاتے ہیں اُن کی زندگی کا حل ضرور نکالنا چاہیے۔ اور سماجی نقطۂ نظر میں ایسی اصلاح کرنی چاہیے کہ ان بے گناہوں کی زندگی اجیرن نہ ہو۔ لیکن ایسا حل کہ جس سے ان بچوں کے "ماں باپ" کی خطاکاری بھی جائز ہو جائے کسی سماج کی طرف سے اس بات کا اعلان ہے کہ وہ ان خطاکاریوں کو روکنے سے قاصر ہے! ــــــ اسلام نے بھی اس طرح کے بچوں کو پوری انسانی عزت

کے ساتھ سماج میں جگہ دینے کی تلقین کی ہے۔ مگر اس میں یہ قوت تھی کہ وہ ناجائز تعلقات کو روک سکے، اس لیے اس نے بلا تامل ان چاروں قسم کی "شادیوں" کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا جو اسلام سے پہلے عرب میں رائج تھیں، اور جن کے خوبصورت نام کے ذریعہ قبل اسلام کا عرب سماج "ناجائز تعلقات کے بارے میں اپنی بے بسی کو چھپانے کی کوشش کرتا تھا۔ اور صرف ایک طریقہ مقرر کیا۔ اسلام نے مؤثر عقائد و اعمال اور معاشرتی ضابطوں کا ایسا حصار انسان کے گرد کھینچا کہ اگر کسی سے بھولے بھٹکے یہ جرم سرزد ہو بھی گیا تو اس نے خود کو باصرار سزا دلوانے کا وہ رویہ اختیار کیا جو بجائے خود معاشرے میں زنا سے نفرت کا ایک عظیم نفسیاتی محرک اور ایسا خاموش مبلغ کہلانے کا مستحق ہے جس کے سامنے سیکڑوں تدبیریں اور تقریریں ہیچ ہوں۔

افسوس! تاریخ کا ایسا کھلا تجربہ سامنے ہوتے ہوئے بھی لوگ یہ سوچنا نہیں چاہتے کہ یہ بھی ہوسکتا ہے، وہ جو کچھ سوچ سکتے ہیں بس یہ کہ آج جو جنسی انارکی اور آوارگی ان کے ارد گرد پھیل رہی ہے کسی فلسفے کی رو سے اسے جائز کرکے اپنے ذہن کو اس خلجان سے نکال لیں ـــــ مگر اس میں ذمہ داری حال کے مسلمان معاشرہ کی بھی کم نہیں ہے۔ کاش اس چیز کو ایک گزشتہ تجربہ کہہ کر ماضی کی طرف اشارہ نہ کرنا پڑتا، بلکہ حال میں بچشم خود مشاہدے کی دعوت دی جاسکتی تو شاید آج کے انسان کو اپنے مسائل کی تلاش میں اس طرح بھٹکنا نہ پڑتا۔

تنگیٔ نظر!!

ایک طرف ہمارے وزیر اعلیٰ کی وسعت نظر کا یہ عالم ہے کہ وہ ناجائز بچوں کے ساتھ حسن سلوک ہی پر راضی نہیں بلکہ ناجائز اولادوں کو بھی جائز تسلیم کرانے کی خواہش رکھتے ہیں۔ دوسری طرف یہ تنگیٔ نظر کہ اردو جو ادبی ہند کی مصدقہ طور پر جائز اولاد ہے اس کے دو چار حرف بھی ان کے اقتدار میں اس طرح دھکے کھاتے ہیں کہ سماج میں ناجائز بچے کیا دھکے کھاتے ہوں گے۔

اس سے اشارہ اس کشاکش کی طرف ہے جو یو، پی کے ایوان بالا کے اپوزیشن لیڈر اور ایوان کے سرکاری افسران کے درمیان، حال ہی میں بڑی شدت کے ساتھ اس مسئلے پر برپا رہی

ہے کہ کوئی مخالف لیڈر اپنے نام کا اُردو سائن بورڈ بھی اُس کمرے پر لگا سکتا ہے جو اُسے کونسل ہاؤس میں سرکار کی طرف سے ملا ہوا ہے! اخبارات نے انکشاف کیا ہے کہ مخالف لیڈر نے یو پی لیجسلیٹو کونسل کے افسران سے اس کی خواہش کی کہ اُن کے سائن بورڈ پر ہندی اور انگریزی کے ساتھ ایک طرف اُردو بھی لکھوا دی جائے۔ جس کی تعمیل نہ ہونے پر لیڈر مذکور نے اپنی طرف سے اُردو سائن بورڈ تیار کرا کر آویزاں کر لیا۔ لیکن افسران مذکور نے اُسے دیکھتے ہی ہٹا دیا۔ اس پر ذمہ داروں سے رجوع کرنے پر مخالف لیڈر کو یہ جواب ملا کہ

"حکومت یو پی کا حکم ہے کہ سرکاری دفتروں اور سرکاری عمارتوں پر سوائے ہندی کے کسی اور زبان میں سائن بورڈ نہ لگایا جائے!"

اس کے بعد کشاکش بایں جا رسید کہ مخالف لیڈر نے ایک تاریخ مقرر کر کے نوٹس دیا کہ اگر اس تاریخ تک اُن کی خواہش کی تعمیل نہ ہوئی تو وہ خود اپنی مرضی کا سائن بورڈ لگائیں گے، اور اُس کو قائم رکھنے کی ذمہ داری لیں گے۔ تب کہیں جا کر ہمارے وسیع النظر وزیر اعلیٰ کی حکومت میں یہ "وسعتِ نظر" پیدا ہوئی ہے کہ اُردو کا سائن بورڈ جو ہٹا لیا گیا تھا وہ لا کر مخالف لیڈر کے کمرے پر آویزاں کر دیا گیا۔

ہائے اُردو! جو ناجائز اولاد سے بھی گئی گزری ہو گئی اور اُس کے چار لفظ بھی اُس وقت تک ناقابلِ برداشت ہیں جب تک کوئی سخت قسم کا والی وارث دھمکی سے نہ بات کرے۔

(الفرقان محرم ۱۳۹۰ھ)

(انتخاب)

تعدد ازدواج ___ یا جنسی انارکی!

" باہر سے زیادہ اندر سے کم " یہ عنوان ہے انگریزی معاصر ہندوستان ٹائمز کے ایک اداریہ کا، متحدہ اقوام کی طرف سے ڈیموگرافک سالنامہ بابت ۱۹۷۵ء حال ہی میں شائع کیا گیا ہو جس کے چند ابواب میں بچوں کی جائز اور ناجائز پیدائش سے بحث کی گئی ہو اور اعداد و شمار کے ذریعہ ثابت کیا گیا ہو کہ دنیا سے شادی کی تقدیس ختم ہو رہی ہو اور بچے اندر سے کم اور باہر سے زیادہ پیدا ہو رہے ہیں۔ یہ اعداد و شمار بڑے ہی حیرتناک اور دہشت انگیز ہیں اور وہ بھی صرف ان قوموں کے لیے جن کے ہاں شادی بیاہ کی تقدیس موجود ہو اور نکاح کی رسم میں گھن نہیں لگا ہو۔ ورنہ وہ ممالک جو حلالی اور حرامی بچوں میں کوئی تمیز نہیں کرتے انھیں اس پر کوئی تشویش اور حیرانی نہیں۔

متحدہ اقوام کے سالنامہ میں بتایا گیا ہو کہ السلویڈور، ڈومینکن ری پبلک، ہنڈراس گوئٹے مالا اور پناما میں حرامی بچوں کا تناسب ساٹھ فیصدی ہو۔ پناما میں تو چار میں تین بچے پادریوں کی مداخلت یا سول میرج رجسٹری کے بغیر ہی پیدا ہو رہے ہیں یعنی ۷۵ فی صدی حرامی بچے۔ لاطینی امریکہ میں حرامی بچوں کی تعداد سب سے زیادہ ہو یہی حال ویسٹ انڈیز کا ہو، دنیا میں کبھی ایسا نہیں ہوا کہ شادی بیاہ کی تقدیس سے انحراف کیا گیا ہو۔ ہر قوم نے خواہ وہ کتنی ہی پس ماندہ ہو اس بات کو ضروری کہا ہے کہ چند قواعد و ضوابط کے تحت رشتہ داروں کے درمیان ازدواجی رشتے قائم ہوں اور انھیں اپنے اپنے رواج کے مطابق انجام دیا جائے، تاکہ خاندان اور سوسائٹی کو معلوم ہو کہ فلاں عورت فلاں مرد کے نکاح میں دے دی گئی ہو اور اس سے جو اولاد پیدا ہوئی ہو وہ قانون کی نظر میں جائز ہے لیکن اگر ازدواجی رشتوں کا سلسلہ ختم ہو جائے تو معاشرہ کے لیے بے شمار مسائل پیدا ہو جائیں گے اور رشتے سے تقدس و احترام کا جو تصور پیدا ہوتا ہے وہ بالکل ختم ہو جائے گا۔

اس سلسلہ میں متحدہ اقوام کے سالنامے میں مسلم ممالک کا ذکر بھی کیا گیا ہو۔ یہ جاننا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ موجودہ ترقی یافتہ دنیا میں شادی بیاہ کے نقطۂ نظر سے مسلم ممالک کا رجحان کیا ہے اور ان میں بشتنامہ دو؟

کی تقدیس کس حد تک باقی ہے۔ اگر باقی ہے تو اس کے اسباب کیا ہیں؟ اور خود متحدہ اقوام نے کیا نتیجہ نکالا ہے۔ ہمارا خیال ہے کہ ڈیموگرافک سالنامہ کے ایڈیٹروں نے جب مسلم ممالک اور غیر مسلم ممالک کا موازنہ کیا ہوگا تو وہ خود حیرت میں پڑ گئے ہوں گے۔ انھوں نے مسلم ممالک کے جو اعداد و شمار فراہم کیے ہیں ان میں متحدہ عرب جمہوریہ کو سر فہرست رکھا ہے اور دیگر مسلم ممالک کا اندازہ بھی اسی سے لگایا ہے۔ وجہ یہ ہے کہ عرب ممالک میں متحدہ عرب جمہوریہ سب سے زیادہ ترقی یافتہ اور تجدد پسند MODERNIST ہے۔ اگر وہاں کی سماج میں رشتہ ازدواج کی تقدیس باقی ہے تو وہ مسلم ممالک جو مذہبی احکام کا زیادہ پاس اور لحاظ رکھتے ہیں اس رشتہ کو اور بھی زیادہ مقدس اور قابل احترام سمجھتے ہوں گے متحدہ اقوام کے سالنامہ سے پتہ چلا کہ مسلم ممالک میں حرامی بچوں کی پیدائش کا تناسب ایک فی صدی سے بھی کم ہے۔!

لیکن ان اعداد و شمار سے ہماری تسلی نہیں ہوسکتی۔ جب تک کہ یہ پتہ نہ چلے کہ اس کمی کے اسباب کیا ہیں۔ کیا وجہ ہے کہ متحدہ عرب جمہوریہ مغربی تہذیب کو اپناتے ہوئے بھی اپنی "دقیانوسیت اور قدامت پرستی" پر قائم رہا؟ ایسا تو نہیں کہ حرامی بچوں کی پیدائش میں اسلام کی دور اندیشی نے کوئی روک لگائی ہو؟ اور ازدواجی رشتہ میں کوئی ایسا نکتہ رکھ دیا ہو جس نے ناجائز ولادت کی راہیں بڑی حد تک مسدود کر دی ہیں! اس کا جواب ہمیں متحدہ اقوام کے سالنامے سے لینا چاہیے۔ چنانچہ اس میں بتایا گیا ہے کہ چونکہ مسلم ممالک میں چند زوجیت POLYGAMY کا رواج ہے اس لیے وہاں ناجائز ولادتوں کا بازار گرم نہیں ہے اس چند زوجیت کے مسئلہ نے مسلم ممالک کو جنسی انارکی کے ایک بہت بڑے بحران سے بچا لیا ہے اور وہاں اس کی وجہ سے ناجائز بچوں کی شرح پیدائش کا تناسب نفی کے برابر رہ گیا ہے۔ اگر اسلام کی اس اجازت کو عملاً ترک کر دیا جائے تو چند سالوں میں وہ بھی پیدائش کے سلسلہ میں مغربی ممالک کی سطح پر آجائیں گے اور وہاں بھی ناجائز بچوں کا تناسب افسوسناک حد تک بڑھ جائے گا

جو لوگ چند زوجیت پر ناک بھوں چڑھاتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ تہذیب کے اس دور میں یہ چیز دل کو نہیں لگتی سو وہ غالباً اس بات سے خوش ہوں گے کہ یک زوجیت کے نتیجہ میں حرامی تہذیب خوب فروغ پا رہی ہے۔ اگر چند زوجیت کی بدولت ناجائز بچوں کی شرح پیدائش نفی کے برابر رہ جائے تو وہ بد تہذیبی ہے لیکن اگر چند زوجیت پر قدغن لگانے کے بعد ناجائز بچوں کی فوج کھڑی نظر آئے تو یہ عین تہذیب ہے۔ (سہ روزہ دعوت۔ بحوالہ الجمعیۃ۔ دہلی)

(الفرقان ربیع الثانی ۱۳۸۳ھ)

چند کتابوں کا تعارف

نزولِ عیسیٰ علیہ السلام | از حضرت مولانا سید بدر عالم صاحب مؤلف "ترجمان السنۃ" ناشر۔ حاجی مولوی غلام محمد نزرگت صاحب مالک انور پریس صوفی باغ متصل اسٹیشن۔ سورت ۔ قیمت نامعلوم

مرزا صاحب قادیانی نے نزولِ عیسیٰ علیہ السلام ہی کی خبروں پر اپنی نبوت کا تخت بچھایا تھا، ایک طور کہ نزول کی جو خبر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے دی ہے وہ تو قطعی ہے۔ مگر اس میں عیسیٰ بن مریم سے مراد مثیل عیسیٰ ہے خود حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا نزول مراد نہیں ہے۔ اس دعوے کی قبولیت کے لیے مرزا صاحب کو اور بہت سے جتن کرنے پڑے مثلاً یہ کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام زندہ آسمان پر اٹھائے نہیں گئے، جیسا کہ سلف سے خلف تک اہل اسلام کا عقیدہ ہے بلکہ انھوں نے اسی زمین پر وفات پائی۔ اسی سلسلہ میں مرزا صاحب نے ایک داستان اختراع کی کہ حضرت مسیح علیہ السلام اپنے ملک سے ہجرت کر کے کشمیر پہونچے اور وہ میں ان کی وفات ہوئی اور ان سب مخترعات کی مدد سے نزولِ عیسیٰ علیہ السلام کا راستہ بند کر کے اپنی نبوت کا راستہ ہموار کر لیا۔

حضرت مولانا بدر عالم صاحب نے ترجمان السنۃ جلد سوم میں ....

..... اس مسئلہ پر جمہورِ امت کے عقائد کے مطابق نہ صرف تشفی بخش بلکہ بے نظیر کلام کیا ہے اور جیسا کہ اس کتاب میں ان کا طریقہ ہے ایک مستقل رسالہ اس بحث پر رقم فرمایا ہے۔ اس مقالہ کو مولوی غلام محمد صاحب (سورت) نے علاحدہ کتاب کی شکل میں شائع کر دیا ہے جو اس وقت زیرِ تبصرہ ہے۔ اللہ تعالیٰ مصنف اور ناشر دونوں کو جزائے خیر دے کہ ایک نے اپنے قلم سے قادیانی علم کلام کے ایک بنیادی حصہ کا تار و پود بکھیر دیا ہے اور دوسرے نے اپنے مال سے اس کی وسیع تر اشاعت کا انتظام کر دیا۔ ہم اپنی سعادت سمجھتے ہیں کہ اس مقالے کی اشاعت میں حصہ دار بنیں، اور اس کی آسان تر صورت یہی ہے کہ اس کی کچھ جھلکیاں

الفرقان کے صفحات میں پیش کردیں تاکہ ناظرین کو اس کی قدروقیمت کا پورا اندازہ ہوسکے۔ ہمارا حال یہ ہے مقالہ کی افتتاحیہ سطریں ہی پڑھ کر ایسا محسوس ہوا جیسے مسئلہ اپنی آخری حدوں تک صاف ہوگیا۔ آپ بھی یہی سطریں سب سے پہلے پڑھیے اور اندازہ کیجیے کہ چند ہی لفظوں میں مسئلہ کس حد تک پانی ہوگیا ہے۔

"حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی حیات طیبہ میں ان کے آسمان پر تشریف لے جانے اور آسمان سے اترنے کی سرگذشت بیشک ایک عجیب وغریب واقعہ ہے لیکن اس پر غور کرنے سے پہلے یہ سوال ضرور سامنے رکھنا چاہیے کہ یہ مسئلہ کس دور اور کس شخصیت سے متعلق ہے کیونکہ روزمرہ کے معمولی سے معمولی واقعات میں بھی زمانہ اور شخصیتوں کے اختلاف سے ان کی تصدیق وتکذیب کرنے میں بڑا فرق پیدا ہوجاتا ہے۔"

غور کیجیے! کیا مسئلے کی ساری الجھن یہی نہیں ہے کہ ہم مسیحؑ کی شخصیت کو ایک عام انسانی شخصیت سمجھ کر اور اس کے نزول کے واقعہ کو اپنی اس دنیا کے ایک عام دور میں رکھ کر سوچنا شروع کرتے ہیں اور پھر اس کو اس دنیا کے ممکنات کے چوکھٹے میں فٹ کرنے سے عاجز آکر انکار یا تاویل یا دامن بچاکر نکل جانے کی راہ پر پڑجاتے ہیں۔ قلم چوم لیجیے مولانا کا، ایک ذرا سا سوالیہ اشارہ دے کر کس طرح مسئلہ کی ساری الجھن دور کردی۔ مولانا نے پوری تفصیل سے اس اشارہ کی وضاحت کی ہے کہ مسیحؑ کی شخصیت میں عام انسانوں سے اور ان کے زمانۂ نزول میں ہماری اس دنیا کے عام زمانوں سے کیا فرق واختلاف ہے مگر ہمیں یقین ہے کہ بہت سوں کے لیے صرف یہ اشارہ ہی کافی ہوگا، اور جن کے لیے صرف یہ اشارہ کافی نہ ہوگا ان کے لیے تفصیل کے یہ چند ٹکڑے ضرور ایک حد تک کافی ہوجائیں گے۔

نمبر(۱) "جب آپ ان دو سوالوں پر محققانہ نظر ڈالیں گے تو پوری وضاحت سے ثابت ہوگا کہ یہ واقعہ (واقعہ نزول مسیح) تخریب عالم یعنی قیامت کے واقعات کی ایک کڑی ہے۔ اور تخریب عالم کا ایک واقعہ بھی ایسا نہیں جو عالم کے تعمیری دور (یعنی تخلیق وتخریب کے درمیانی دور ــ ع) کے واقعات سے ملتا جلتا ہو" ص۶

(۲) "اس کے بعد جب آپ اس پر غور کریں گے کہ یہ پیش گوئی ہے کس شخصیت سے متعلق، وہ شخصیت کسی عام بشری سنت کے تحت کوئی بشر ہے یا ان سے کچھ الگ؟ تو آپ کو یہی ثابت ہوگا کہ وہ صرف عام انسانوں سے ہی نہیں بلکہ انبیاء علیہم السلام کی جماعت میں بھی سب سے

ممتاز خلقت کا بشر ہے۔ جتنے انسان ہیں وہ سب ذکر و مؤنث کی دو صنفوں سے پیدا ہوئے ہیں مگر حضرت عیسیٰ علیہ السلام" الخ ص۶

(۳) "اس میں بھی کوئی شبہ نہیں کہ ایک انسان کا آسمانوں پر زندہ جانا اور زندہ رہنا اور آخر زمانہ میں پھر اسی جسم عنصری کے ساتھ اتر آنا نہ عام انسانوں کی سنت ہے اور نہ (دنیا کے۔ ع) عام واقعات کے موافق ہے لیکن اگر آپ یہ دو باتیں ملحوظ رکھیں کہ یہ مسئلہ تخریب عالم کا ایک مقدمہ ہے، اور یہ بھی اس شخصیت سے متعلق جس کے دیگر حالات زندگی بھی عالم کے عام دستور کے موافق نہیں ہیں۔ تو پھر بہ نظر انصاف آپ کو اس میں کوئی تردد نہیں ہونا چاہیے۔" ص۱۰

اس سلسلۂ تفصیل میں ایک مقام کے یہ جملے کیسے آب زر سے لکھنے کے قابل ہیں۔

"جب چونکہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے نزول کا مسئلہ بھی عالم کے درمیانی واقعات کا مسئلہ نہیں بلکہ تخریب عالم کے واقعات کی ایک اہم کڑی ہے۔ اس لیے اپنی جگہ وہ بھی معقول ہے ظاہر ہے کہ جب تمام مُردوں کے زندہ ہو ہو کر ایک میدان میں جمع ہونے کا زمانہ قریب آ رہا ہو تو اس سے ذرا قبل صرف ایک زندہ انسان کا آسمانوں سے زمین پر آنا کونسی بڑی بات ہے بلکہ اس طویل گمشدگی کے بعد یہ جسمانی نزول مجموعہ عالم انسانی کی جسمانی نشأۃ ثانیہ کے لیے ایک بدیہی اور محکم برہان ہے۔ اس لیے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی شان میں ارشاد ہے "وَاِنَّهٗ لَعِلْمٌ لِّلسَّاعَةِ" یعنی حضرت عیسیٰ علیہ السلام قیامت کی ایک مجسم نشانی ہیں۔" ص۳۰

مرزا صاحب قادیانی نے نزول مسیح سے انکار کرنے کے لیے، رفع مسیحؑ سے انکار کیا اور اس کی جگہ آپ کی موت کا دعویٰ کیا اور اس کے لیے وادی کشمیر میں ایک قبر تک گڑھ ڈالی۔ مولانا بغیر نام لیئے رُخِ سخن اس طرف کر کے فرماتے ہیں۔

"یہ بات کتنی عجیب ہے کہ عیسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام خود نبی اولوالعزم ہیں ان کی امت بھی تسلسل کے ساتھ کسی انقطاع کے بغیر اب تک چلی آ رہی ہے، پھر ان کی موت اور ان کی قبر کا صحیح صحیح حال آج تک ان سب پر کیسے مخفی رہ گیا[1] .... اس سے زیادہ حیرت اس پر ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے تشریف لاکر ان کے حق میں کبھی موت کا ایک حرف نہیں فرمایا۔ دراں حالیکہ یہ مسائل آپ کی آنکھوں کے سامنے چل رہے تھے ...... اس سے زیادہ عجیب تغیرات یہ ہوں

[1] خصوصاً جبکہ ان کی موجودہ امت کے ذوق جستجو نے سفینۂ نوح تک کے نشانات پالیے اور فرعون کی لاش تک دستیاب کرلی۔

کہ قرآن کریم نے تردید الوہیت کے موقع پر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے معمولی سے معمولی حالات کا تذکرہ فرمایا، مثلاً ان کا کھانا کھانا: "کانا یاکلان الطعام" مگر ان کی الوہیت کے خلاف جو سب سے واضح ثبوت تھا یعنی یہ کہ وہ مرچکے ہیں اس کو ایک جگہ بھی عیسائیوں کے مقابلہ میں ذکر نہیں فرمایا۔" ص۱۹-۲۰

غرض مسئلہ پر جس جس پہلو سے بحث کی جاتی ہے تقریباً ہر ہی پہلو کے ضمن میں مولانا نے ایسے نکات و سوالات اُٹھا کر فکر و نظر کے سامنے کر دیے ہیں جو کسی غیر حقیقت پسندانہ بات کو دراندازی کا موقع نہیں دیتے گویا مسئلہ کے ہر موڑ پر ایک قندیل روشن ہے جو کسی مغالطہ کا چراغ نہیں جلنے دیتی۔ ہاں یہ بات جان لینے کی ہے کہ مسئلہ کے بعض پہلوؤں پر مولانا موصوف کی بحث اجمال اور اختصار پسندی کی وجہ سے ذرا اونچی اور عام ذہنوں کی گرفت سے باہر ہوگئی ہے۔ اس لیے ہوسکتا ہے کہ کسی کو کسی موقع پر عدم تشفی کا احساس ہو۔

ہم نہیں جانتے کہ ناشر کتاب اس کوچہ میں نو وارد ہیں یا اس کے آداب و رسوم سے کچھ واقفیت رکھتے ہیں۔ اگر پہلی صورت ہے تب تو شکایت کی بات نہیں ورنہ ہم ان کے جذبۂ دینی کی قدر کے ساتھ اس کوتاہی کو قابل گرفت سمجھتے ہیں کہ کتاب میں مقدمہ و پیش لفظ کے نام سے چار سطریں تک نہیں حتیٰ کہ اتنا سا تعارف بھی نہیں کہ یہ مقالہ فلاں کتاب کا ایک حصہ ہے حالانکہ متعدد جگہ "ترجمان السنۃ" کے دوسرے مباحث کے حوالوں کی موجودگی میں یہ ایک لازمی چیز تھی۔ ایک ناواقف ناظر پڑھے گا اور پریشان ہوگا کہ یہ (مثلاً) "معجزات کی بحث" کہاں ہے۔

ایک ایسے وقیع مقالہ کے ساتھ یہ سلوک انتہائی ناروا ہے اور اگر دہلی میں اس کی کتابت و طباعت "ندوۃ المصنفین" کے زیر اہتمام ہوئی ہے تب تو خصوصیت کے ساتھ یہ فروگذاشت ایک افسوسناک تساہل کا حکم رکھتی ہے۔ تصحیح کا بھی کوئی خاص اہتمام نہیں کیا گیا، معلوم ہوتا ہے جو اغلاط ترجمان السنۃ میں رہ گئی تھیں وہ شاید اس میں بعینہٖ ہیں۔ مثال کے طور پر ملاحظہ ہو ص۳۰ سطر ۱۰ و ۱۱۔ محولہ جملہ جس طرح "ترجمان السنۃ" میں مہمل چھپا ہے ٹھیک اسی طرح اس میں موجود ہے۔

آخر میں ہم حضرت مصنف مدظلہ کی خدمت میں گذارش کرنا چاہتے ہیں کہ وہ اس پر نظر ثانی فرما کر عام اذہان کی رعایت سے کچھ تسہیل فرمادیں اور جیسا کہ ہم اشارہ کرچکے ہیں بس ضرورت بعض مقامات پر کچھ تفصیل کی ہے۔ مثلاً بعض مقامات پر مصنف بعض قرآنی آیات و بیانات کی طرف اشارہ کر جاتے ہیں،

الفاظ ذکر نہیں کرتے اس سے بات کی وضاحت میں خلل پڑتا ہے۔ (الفرقان بابت رمضان ۱۳۸۵ھ)

کمرشل انٹرسٹ کی فقہی حیثیت | مرتبہ مولانا شاہ محمد جعفر صاحب۔ پتہ :۔ ادارۂ ثقافت اسلامیہ صفحات ۳۴۴، سائز خورد، مجلد ۲/۱۰

"کمرشل انٹرسٹ" تجارتی سود کو کہتے ہیں، جو آجکل بینکنگ سسٹم کے ذریعہ رائج ہے۔ یہ کتاب اس کے شرعی حکم پر چار مضامین کا مجموعہ ہے۔ پہلا مضمون سابق آڈیٹر جنرل پاکستان سید محمد یعقوب شاہ صاحب کا ہے، جس کی حیثیت دراصل ایک ایسے مفصل استفتاء کی ہے، جس میں مستفتی نے اپنے رجحان کو بھی مدلّل انداز میں پیش کردیا ہے۔ یہ مضمون اس مجموعہ کا سب سے اچھا اور اس قابل ہے کہ اہل علم دین سنجیدگی کے ساتھ اس سے اعتناء فرمائیں ـــــ باقی تین میں سے دو مضمون مرتّب کتاب مولانا جعفر صاحب کے ہیں اور ایک عطاء اللہ صاحب بالوی کا۔

مولانا جعفر صاحب کا ایک مضمون "سود خواری کی قسمیں" پر ہے، جس کا مذکورۂ بالا استفتاء سے تعلق نہیں، اس مضمون پر ہمارا تبصرہ یہ ہے کہ یہ "کچھ نہ سمجھے خدا کرے کوئی" کا مصداق ہے۔ ان کا دوسرا مضمون اور بالوی صاحب کا مضمون سید یعقوب شاہ صاحب کے استفتاء کے جواب کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس میں ہر دو صاحبان نے کمرشل انٹرسٹ کو جائز ٹھہرایا ہے۔

ہمیں افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ یہ دونوں مضامین بالکل تلاعب بالدّین کا منظر پیش کرتے ہیں۔ مولانا جعفر شاہ صاحب کمرشل انٹرسٹ پر فقہی حیثیت سے کلام فرماتے ہیں لیکن طے شدہ اصول فقہ کے ساتھ انھوں نے کھلا ہوا مذاق کیا ہے، اس طرح کوئی مسئلہ علمی سطح پر منقح ہونے سے تو رہا البتہ بے پڑھے لکھوں کی گمراہی کا ذریعہ ایسے مضامین ضرور بن سکتے ہیں ـــــ عطاء اللہ صاحب بالوی کو ہم نہیں جانتے کہ کتنے پڑھے لکھے ہیں۔ البتہ ان کی بعض تصانیف دیکھنے کا ہمیں اتفاق ہوا ہے، جن میں ہم نے ایسے ایسے لطائف بھی پائے ہیں ـــــ اعاذنا اللہ منہا ـــــ کہ قرآن فہمی میں ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی کسی تشریح کے پابند تھوڑے ہی ہیں۔ آپ تو قرآن میں تدبّر کی دعوت دیتے تھے، تو اس کا مطلب ہی یہ ہے کہ بعد والے فہم مراد میں آپ سے آگے جاسکتے تھے۔ اور بعض قرآنی حقائق ایسے ہوسکتے تھے کہ بعد والے لوگ ان کو زیادہ صحیح طور پر سمجھ سکتے تھے[1] جن لوگوں کا انداز فکر یہ ہو وہ امت کو جس کھڈ میں لیجا کر نہ گرادیں تھوڑا ہے۔ چنانچہ وہ اپنے زیر تبصرہ مضمون میں مستفتی کے ذاتی مسئلہ

[1] اصل الفاظ تو اس وقت ہمارے سامنے نہیں ہیں لیکن مفہوم یہی ہے، کتاب کا نام غالباً "شمع فروزاں" ہے۔

کے بارہ میں فرماتے ہیں کہ ان کی جو انٹرسٹ کی رقم ہے۔

"وہ ملکی مروجہ قانون کے مطابق ہے۔ اور ملکی قانون کا احترام اور اس پر عملدرآمد خود از روئے قرآن از بس ضروری ہے۔" (یعنی انٹرسٹ کی اس رقم کو لینے میں تامل روا نہیں۔)

یہ "از بس ضروری" ہونے کا حکم قرآن کی کس آیت سے معلوم ہوتا ہے؟

فرماتے ہیں:۔

"قرآن نے مسلمانوں کے بارے میں فرمایا ہے کہ

الَّذِيْنَ اِنْ مَّكَّنّٰهُمْ فِي الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ وَاَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ وَلِلّٰهِ عَاقِبَةُ الْاُمُوْرِ	وہ لوگ کہ جب انھیں ملک میں اقتدار حاصل ہوگا۔ تو وہ نظام صلوٰۃ قائم کریں گے زکوٰۃ وصول کریں گے۔ لوگوں کو معروفات پر عمل کرنے کا حکم دیں گے اور وہ تمام امور کا فیصلہ اللہ کے حکم کے مطابق کریں گے۔

یعنی اگر اسلامی نظام قائم ہوگا تو اُس وقت قوانین بھی ایسے بنائے جائیں گے جس میں معروفات پر عملدرآمد اور منکرات سے بچنے کی گنجائش ہو۔ ...... اور جب تک یہ نہو مروجہ قانون کا احترام اور ان ہی پر عملدرآمد کرنا ہوگا۔"

یہ ہے رسول اکرمؐ کے قرآنی تشریحات پر بعد والوں کی ترقی کا نمونہ! کتنے ناخدا ترس ہیں وہ لوگ جو ان بوالفضولی نکات کو اشاعت دیتے اور اپنی سفارشات کے ساتھ لوگوں کے غور و فکر کے لیے پیش کرتے ہیں! ـــــ قرآن تو اس وصف پر مسلمانوں کی ستائش کر رہا ہے کہ اگر انھیں اقتدار حاصل ہوگا تو وہ منکرات کو مٹائیں گے۔ اور یہاں اُس سے یہ نکتہ پیدا کیا جا رہا ہے کہ جب تک اقتدار حاصل نہ ہوگا وہ پورے "احترام" اور "اطمینان" کے ساتھ مروجہ منکرات پر عمل پیرا رہیں گے۔

غلطیہائے مضامیں مت پوچھ   لوگ نالے کو "رسا" باندھتے ہیں

صاحب مضمون یا صاحب کتاب کو یہ شکایت نہو کہ ہم بس ایک ٹکڑے کو لے اڑے اور اصل بحث پر کوئی نقد نہ کیا۔ دراصل ایک تو ہماری سمجھ میں یہ نہیں آیا کہ جب مستفتی ایک ایسا شخص ہے جو قرآن کے ساتھ حدیث اور کبھی نصوص قرآن و حدیث پر متفرع اصولِ فقہ کو بھی قابل اعتنا سمجھتا ہے تو بالوی صاحب کو

جو آیات قرآنی کے سوا کسی چیز کو کچھ نہیں گردانتے، اس نقل در معقولات کی ضرورت کیا تھی؟ ـــ اور کیوں کوئی اس بحث میں اُن کی اس بے محل مداخلت کو لائق اعتنا گردانے؟

ثانیاً۔ ہمارے نزدیک یہ نقطۂ نظر قطعاً لغو ہے کہ ارشادات رسول کو چھوڑ دو، ائمہ مجتہدین اور علمائے اصول و فقہ کی کاوشوں کو چھوڑ دو اور ہر مسئلہ کا فیصلہ قرآن کے الفاظ سے کر لو۔ اس اصولی اختلاف کی موجودگی میں کیا سوال ہے کہ پالوی صاحب کی گفتگو سے اعتنا کیا جائے۔

ثالثاً۔ پالوی صاحب فرماتے ہیں کہ:-

"ربوا کے سلسلے میں، انسانی راؤں پر اعتبار نہیں کیا جا سکتا۔ کیونکہ ہمارے یہاں صرف الفاظ سے کھیلا جاتا ہے"

اُدھر دوسری ہی سانس میں، "خود قرآن میں غور کرنے" کی دعوت دے کر اپنی رائے سے قرآنی الفاظ کے مقاصد و مطالب بیان کرنا شروع کر دیے جاتے ہیں ـــ جب انسانی رائیں ناقابل اعتبار ہیں تو خود پالوی صاحب کی رائے کیونکر لائق اعتنا ہوگی؟ اس میں کون ایسے سرخاب کے پر لگے ہیں۔؟

تحدید نسل | مرتبہ مولانا محمد جعفر صاحب، ناشر:- ادارۂ ثقافت اسلامیہ، لاہور صفحات ۵، قیمت ۱۲ آنے۔

یہ کتاب بھی "برتھ کنٹرول" کی طرح چند مضامین کا مجموعہ ہے۔ جن میں ضبط ولادت (برتھ کنٹرول) کو حالات کا شدید تقاضا قرار دیتے ہوئے، اس کے شرعی حکم سے بحث کی گئی ہے۔ اور اسے جائز بتایا گیا ہے۔ مضامین میں اس درجہ تکرار اور یکسانیت ہے کہ مرتب کے "پیش لفظ" میں اس پر دو ڈھائی صفحے کی توجیہی تقریر پڑھنے کے بعد بھی طبیعت اُکتائے بغیر نہیں رہتی۔ اور کوئی معقولیت ان مضامین کی یکجائی اشاعت میں، سمجھ میں نہیں آتی۔

ضبط ولادت کا موضوع آج کوئی نیا نہیں ہے۔ اس کی حمایت میں لکھنے والے عام طور پر جو لکھتے آئے ہیں وہی باتیں ان مضامین میں بھی دہرائی گئی ہیں۔ البتہ مولانا جعفر شاہ صاحب نے ایک نکتہ حدیث غالباً بالکل نیا نکالا ہے۔ ایک حدیث میں اُس صاحب اولاد بیوہ کو جنت میں قرب نبوی کی بشارت دی گئی ہے جو اپنے یتیم بچوں کی خاطر باوجود اعلیٰ مواقع کے نفس کشی کرے اور عقد ثانی سے باز رہے۔ مولانا جعفر شاہ صاحب اس سے یہ نکتہ برآمد فرماتے ہیں کہ:-

"آج اگر زندوں کو زندہ رکھنے کی خاطر مزید حمول کو آنے سے روک دیا جائے تو یہ کوئی گناہ نہیں، بلکہ قرب نبویؐ کا ذریعہ ہے۔"

کیوں؟

(اس لیے کہ عقد ثانی سے باز رہنا مزید اولاد کو وجود میں آنے سے روکتا رہی تو ہے۔ شرف ۹۰-۹۱)

کہئے ہم اس پر کیا تبصرہ کریں؟

حدیث میں بشارت صرف اس بات پر ہے کہ ایک عورت اپنے یتامی کی پرورش کی خاطر لذت نفس کے بھرپور مواقع قربان کرتی ہے۔ (جیسا کہ حدیث کے الفاظ "حبس نفس" سے صاف ظاہر ہے) لیکن شاہ صاحب کی نظر اس صاف اور سامنے کی بات پر رکنے کے بجائے اس گہرائی میں پہنچتی ہے کہ عقد ثانی سے باز رہنے میں مزید اولاد پیدا کرنے سے باز رہنا بھی تو لازم آتا ہے۔ اسو در اصل بشارت اسی پر ہے کہ موجودہ اولاد کی خاطر مزید اولاد کو وجود میں آنے سے روکا جائے۔ بس آج ضبط ولادت کا عمل نہ صرف جائز بلکہ قرب نبویؐ کا ذریعہ ہوا۔

کیا کہنے ہیں ان نکتہ سنجیوں کے!

گر ہمیں مکتب و ہمیں ملّاں　　　کار طفلاں تمام خواہد شد

"اسی کو کہتے ہیں پاپوش میں آفتاب کی کرن لا کے لگانا"

اگر اتنی بات بھی شاہ صاحب فرماتے کہ اس حدیث سے ضبط ولادت کا جواز نکلتا ہے۔ تب بھی یہ کچھ کم سرمایۂ حیرانی نہ تھا۔ چہ جائیکہ اس پر قرب نبوی کی بشارت کا اعلان فرمانا ــــــ جبکہ اسی مضمون میں، بلکہ کتاب کے ہر مضمون میں، وہ روایتیں بھی درج ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ ضبط ولادت (بذریعہ عزل) کی اجازت چاہنے والوں کو حضورؐ نے ہمیشہ ایسا جواب دیا جس سے اس رجحان کی حوصلہ شکنی ہی مفہوم ہوتی ہے۔ کہیں ایسا نہیں ہوا کہ حضورؐ فرماتے، یہ کام خوب کرو یہ تو جنّت میں میرے قرب کا ذریعہ ہے۔

خیر، یہ تو شاہ صاحب کے ایک لطیف نکتہ کے طفیل گفتگو طویل ہوگئی[۵] ورنہ کہنے کی بات صرف یہ تھی کہ کتاب اپنے مدعا میں کامیاب نہیں ہے ــــــ اور اس کے چند وجوہ ہیں۔ (باقی صفحہ ۲۰۰ پر)

[۵] اس لطیفہ کے علاوہ شاہ صاحب کی یہ عبارت بھی نظر انداز کرنے کے قابل نہیں ہے کہ حضورؐ کے اس ارشاد پر کہ "آنے والی روح تو آکر ہی رہے گی" ایک موقع پر بالواسطہ یہ اعتراض بھی جڑا ہے کہ "وہ تو ناجائز روح بھی آکر رہتی ہے تو کیا اُسے بھی آنے دینا چاہئے؟" (ص ۵۰)

حضرت مولانا محمد منظور نعمانی کی گرانقدر تالیفات

اسلام کیا ہے؟

نہایت آسان زبان اور بہت دلنشین اور پراثر انداز میں اسلامی تعلیمات کا جامع اور مکمل خلاصہ ــــ دین کی ضروری واقفیت حاصل کرنے ہی کے لیے نہیں بلکہ کامل مسلمان اور اچھا آدمی بننے کے لیے بھی اس کا مطالعہ اور اس پر عمل انشاء اللہ کافی ہے۔ مولانا موصوف کی سب سے زیادہ مقبول کتاب۔ قیمت مجلد صرف ۴/۵۰

دین و شریعت

اس کتاب میں توحید، آخرت، رسالت، نماز، روزہ، زکوٰۃ و حج، اخلاق و معاملات، دعوت و جہاد، سیاست و حکومت اور احسان و تصوف کے مباحث پر ایسی محققانہ روشنی ڈالی گئی ہے کہ دل و دماغ اور عقل و وجدان ایمان و اطمینان سے معمور ہو جاتے ہیں۔ قیمت ۵/۵۰

قرآن آپ سے کیا کہتا ہے؟

قرآنی ہدایات اور اس کی اہم تعلیمات کا ایک جامع مرقع جس میں سیکڑوں عنوانات کے تحت متعلقہ قرآنی آیات کو نہایت موثر اور واضح مختصر تشریح کے ساتھ جمع کیا گیا ہے قیمت مجلد ۸/- انگریزی ۱۵/-

تذکرہ مجدد الف ثانیؒ

امام ربانی شیخ احمد سرہندی مجدد الف ثانیؒ کی سوانح حیات ــــ آپ کی عرفانی اور ارشادی خصوصیات اور اس عظیم تجدیدی کارنامہ کی تفصیل جس کے نتیجہ میں اکبر اور اس کے حواریوں کی چلائی ہوئی دین الٰہی تحریک ختم ہو کر رہ گیا اور سلطنت مغلیہ کا رخ الحاد سے صحیح اسلام کی طرف مڑ گیا۔ قیمت مجلد ۱۲/۰

معارف الحدیث

(احادیث نبوی کا ایک بڑا اور جامع انتخاب اردو ترجمہ اور تشریح کے ساتھ)

مولانا نے احادیث کے مستند مجموعوں سے گہرے غور و فکر کے بعد وہ حدیثیں منتخب کیں جن کا انسانوں کی فکری، اعتقادی اور عملی زندگی سے خاص تعلق ہے اور جن میں امت کے لیے ہدایت کا خاص سامان ہے۔ اس سلسلے کی سات جلدیں الحمد للہ مکمل ہو چکی ہیں۔ جلد اول ۹/۵۰ جلد دوم ۱۱/۵۰ جلد سوم ۱۳/۵۰ جلد چہارم ۱۰/- جلد پنجم ۱۲/۵۰ جلد ششم ۱۳/۵۰ (مجلد کے لیے جلد کی قیمت علاحدہ لگائی جاتی ہے۔)

(انگریزی ایڈیشن۔ معارف الحدیث کی پہلی جلد اور نصف دوم کا انگریزی ترجمہ ایک جلد میں شائع ہو گیا ہے۔ قیمت ۳۲/-

تصوف کیا ہے؟

یہ کتاب اپنے اختصار کے باوجود انصاف تحقیق اور مباحث کے سلجھاؤ کے لحاظ سے اپنے موضوع میں بہت ممتاز سمجھی گئی ہے قیمت صرف ۵/-

منتخب تقریریں

مولانا موصوف کی ایمان افروز اصلاحی و تبلیغی تقاریر کا مجموعہ جو اپنے اندر افادیت اور جامعیت کے ہزاروں پہلوؤں کو سمیٹے ہوئے ہے۔ قیمت مجلد صرف ۶/-

ملفوظات حضرت مولانا الیاسؒ

جن لوگوں نے حضرتؒ کو نہیں پایا وہ ان کے ملفوظات کے مطالعہ سے آپؒ کو پوری طرح سے جان اور سمجھ سکتے ہیں۔ دین کی حقیقت سمجھنے اور اس کے لیے دل میں سوز و تڑپ پیدا کرنے میں یہ کتاب بڑی بڑی کتابوں پر بھاری ہے۔

ــــ قیمت ۳/۵۰

کلمہ طیبہ کی حقیقت

اسلام کا بنیادی کلمہ لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ ایک عہد و میثاق ہے جو اپنے اندر وسیع معنی رکھتا ہے۔ ہر مسلمان کا فرض ہے کہ وہ اس عہد کی حقیقت کو سمجھے اور اس کو زندگی بھر نباہنے کی کوشش کرے۔ قیمت صرف ۵۰/۰

برکات رمضان

ماہ رمضان اور اس کے خاص اعمال و وظائف تراویح و اعتکاف وغیرہ کے فضائل و برکات اور ان کی روحانی تاثیرات کا نہایت موثر و شوق انگیز بیان ــــ قیمت صرف ۱/۵۰

آپ حج کیسے کریں؟

حج کے موضوع پر اردو میں بے شمار کتابیں لکھی جا چکی ہیں لیکن یہ کتاب ــــ اپنی اس خصوصیت میں اب بھی منفرد و ممتاز ہے کہ یہ بہت آسان اور دلنشین انداز میں حج کا طریقہ اور احکام و مناسک بھی بتاتی ہے اور وہ ذوق و شوق بھی پیدا کرتی ہے جو حج و زیارت کی جان ہے۔ قیمت ۴/=

آسان حج

یہ آسان زبان میں "آپ حج کیسے کریں؟" کا خلاصہ ہے۔ قیمت ۱/۲۵

فیصلہ کن مناظرہ ــــ اکابر علماء دیوبند پر مولوی احمد رضا خاں بریلوی کے سنگین تکفیری الزامات کا تحقیقی جواب ــــ کتاب کے مقدمہ میں بریلی کے اس تکفیری فتنہ کی حقیقت اور اس کی تاریخ بیان کی گئی ہے نیز یہ بتایا گیا ہے کہ اب اہل حق کو اس سے کیسے نمٹنا چاہیے۔ قیمت ۲/۵۰

نماز کی حقیقت

اسلام میں ایمان کے بعد نماز ہی کا درجہ ہے۔ مگر کیا ہم نماز کو ایسی ہی اہمیت کے ساتھ ادا بھی کرتے ہیں؟ کیوں اس لیے کہ ہم عام طور پر اس کی پوری حقیقت کو نہیں سمجھتے۔ یہی مفید کتاب ہے۔ قیمت ۲/

انسانیت زندہ ہے

یہ کتابچہ مولانا موصوف کے چار مضامین کا مجموعہ ہے جن میں سے ہر مضمون میں مولانا نے اپنی زندگی کا کوئی خاص سبق آموز اور پراثر واقعہ بیان کیا ہے جسے جذبۂ انسانیت و اتحاد کی افزائش کے لیے بے حد مفید کتاب ہے قیمت صرف ۰/۶۰

قادیانی کیوں مسلمان نہیں؟
اور مسئلہ حیات مسیح و نزول مسیح

مولانا موصوف کے چار مضامین کا مجموعہ ــــ رد قادیانیت پر دلکش کتاب ــــ اس میں قرآن و حدیث اور عقل کی روشنی میں جو کچھ لکھا گیا ہے وہ بالکل عام فہم پیرائے میں لکھا گیا ہے جو عوام و خواص کے لیے یکساں تسلی بخش ہے۔ قیمت مجلد صرف ۳/-

قادیانیت پر غور کرنے کا سیدھا راستہ

قادیانیت پر مولانا کا یہ مختصر رسالہ دریا بہ کوزہ کا مصداق ہے۔ قیمت ۰/۶۰

شاہ اسمٰعیل شہیدؒ اور معاندین اہل بدعت کے الزامات

حضرت شاہ شہیدؒ جیسی مقدس ہستی پر جس نے اعلاء کلمۃ اللہ کے لیے خون کا کفن پہنا۔ معاندین اہل بدعت نے خوف خدا سے بے نیاز ہو کر جو مکروہ الزامات لگائے ہیں۔ ان کا تسلی بخش اور مدلل جواب۔ قیمت ۲/۵۰

کتب خانہ الفرقان کی چند دیگر مایہ ناز مطبوعات

تجلیات ربانی (حصہ اول)

(تلخیص و ترجمہ از مولانا نسیم احمد فریدی) پورے اسلامی ادب میں حضرت مجدد الف ثانی کے مکاتیب کو ایک خاص امتیاز حاصل ہے ان مکاتیب میں احسان و تصوف، تمیز باطن، حق و باطل میں امتیاز، جہاد فی سبیل اللہ اور اقامت دین و ترویج شریعت کی ترغیب اور امت مسلمہ کی عام رہنمائی کا وہ سامان موجود ہے جس کی صدائے بازگشت نے گذشتہ تین چار صدیوں میں امت مصطفویہ کے حق میں مسیحائی کا کام انجام دیا ہے۔ ساتھ ہی مولانا موصوف نے حاشیہ پر مکتوب علیہم کے حالات بھی کسی قدر تفصیل سے بیان کیے ہیں۔ جس نے اس کتاب کی اہمیت اور منفعت کو دوبالا کر دیا ہے۔ قیمت ۱۳/۵۰

مکتوبات خواجہ محمد معصومؒ

حضرت مجدد الف ثانی کے صاحبزادہ اور خلیفہ حضرت خواجہ محمد معصومؒ کے مکتوبات کا ذخیرہ حضرت خواجہ کے ارشاد و ہدایت کے بڑے ہی کامیاب آئینہ دار ہے۔ آپ کے گرانقدر مکتوبات کو اردو زبان میں مولانا نسیم احمد فریدی امروہی نے تلخیص کے ساتھ منتقل کیا ہے۔ قیمت ۸/-

وصایا شیخ شہاب الدین سہروردیؒ

حضرت شیخ شہاب الدین سہروردیؒ کے وصایا جو اپنے اندر بڑی کشش اور دلآویزی رکھتے ہیں اب تک مخطوطکی شکل میں عربی زبان میں تھے مولانا نسیم احمد فریدی امروہی نے ان کا انتخاب کر کے اپنے خاص انداز میں اردو زبان میں منتقل کیا ہے۔ قیمت ۱/۷۵

حضرت مولانا الیاسؒ اور ان کی دینی دعوت

تالیف مولانا سید ابو الحسن علی ندوی تبلیغی تحریک کے بانی حضرت مولانا الیاسؒ کی مکمل سوانح حیات، مولانا کی شخصیت، ان کے اخلاق و عادات، ان کے امتیازی اوصاف، ان کے خاص افکار و نظریات ان کی دینی دعوت کا پس منظر، اس کا ارتقاء اور اس کے اصول و طریق کار کو سمجھنے کے لیے یہ واحد کتاب ہے۔ قیمت ۲/۵۰

صحبتے با اہل دل

مرتبہ مولانا ابو الحسن علی ندوی تذکیر کنندہ عارف باللہ حضرت شاہ محمد یعقوب مجددی بھوپالی۔ عرفت پیر تعبے بیاں) کی عرفانی و اصلاحی مجالس کا مرقع اور ان ارشادات و ملفوظات کا مجموعہ جن میں عصر حاضر کے ذوق اور مزاج کے مطابق زندگیوں کی اصلاح کا پیغام، ایمان و یقین و کیفیت احسانی پیدا کرنے کا وافر سامان، دحکایات و تمثیلات کے پیرائے میں تصوف اسلامی کا عطر آگیا ہے۔ قیمت ۸/-

تذکرہ حضرت صوفی عبدالربؒ

حضرت صوفی سید عبدالرب علیہ الرحمہ کے حالات زندگی، انکی اشاعت اسلام کی کامل اور انکی با مقصد اور اصلاحی شاعری پر روشنی ڈالی گئی ہے نیز اس تذکرہ میں ان کی چند منتخب اصلاحی نظمیں بھی شامل کی گئی ہیں۔ قیمت ۲/-

بریلوی فتنہ کا نیا روپ

از مولانا محمد عارف سنبھلی۔ ارشد القادری صاحب کی تصنیف زلزلہ کا تنقیدی جائزہ اور تحقیقی جواب (جدید ایڈیشن قیمتی اضافہ کے ساتھ زیر کتابت ہے) قیمت ۶/-

مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کی اہم اردو تصنیفات

تاریخ دعوت وعزیمت

عالم اسلام کی اصلاحی وتجدیدی کوششوں کا تاریخی جائزہ ، اور مصلحین اور ممتاز اصحاب دعوت وعزیمت" کا مفصل تعارف، تین جلدوں میں مکمل حصہ اول ۴۹۶ صفحات ۱۲/۰
حصہ دوم ۴۰۰ صفحات ۱۲/- حصہ سوم ۴۱۲ صفحات ۱۰/۰

انسانی دنیا پر مسلمانوں کے عروج وزوال کا اثر

وہ شہرۂ آفاق اور انقلاب انگیز کتاب جس کے اردو ، انگریزی ، ترکی ، فارسی وغیرہ تراجم کے علاوہ صرف عربی میں ۱۲ ایڈیشن عرب ممالک میں شائع ہوچکے ہیں
صفحات ۴۵۰ ، قیمت مجلد ۱۲/-

پرانے چراغ

مولانا موصوف کی تازہ ترین تصنیف
: معاصر شخصیتوں، بزرگوں، استادوں، اور دوستوں سے متعلق تعارفی مضامین، مشاہدات و واقعات اور تأثرات ومعلومات کا دلچسپ مجموعہ ہے۔ جس میں مولانا سید سلیمان ندوی، مولانا مناظر احسن گیلانی، مولانا مدنی، مولانا تھانوی، شاہ وصی اللہ رحمہم اللہ جیسے بلند پایہ حضرات کے علاوہ مصنف کے کچھ اساتذہ ، رفیقوں اور چند گمنام ہستیوں کا تذکرہ آگیا ہے۔ صفحات ۴۲۴
قیمت مجلد مع گردپوش ۱۶/-

ارکان اربعہ

اسلامی عبادات کتاب وسنت کی روشنی میں اور مسیحیت ، یہودیت نیز ہندو مذہب کے ساتھ اس کا تقابلی مطالعہ تقریباً ۴۰۰ صفحات سائز ۲۰×۲۶/۸ قیمت صرف ۱۲/-

جب ایمان کی بہار آئی

مجاہد کبیر حضرت سید احمد شہیدؒ (م ۱۲۴۶ھ) اور آپ کے عالی ہمت رفقاء کے ایمان افروز واقعات جن کی کوششوں سے ہندوستان میں ایمان کی بہار آئی اور اسلام کی ابتدائی صدیوں کی یاد تازہ ہوگئی۔
۲۰۲ صفحات ۔ قیمت مجلد ۱۲/-

دریائے کابل سے یرموک تک

مغربی ایشیا کے مسلم اور عرب ممالک افغانستان ایران، لبنان ، شام ، عراق اور مشرق اردن کے ایک طولانی دورہ کی مفصل روداد و ڈائری۔ جس میں ان ممالک کی دینی، فکری اور اقتصادی صورت حال کی سچی تصویر اور وہاں کی دینی واصلاحی تحریکات متضاد عوامل واثرات اور ذہنی وروحانی کشمکش کا بالتفصیل جائزہ لیا گیا ہے۔ صفحات ۳۰۴ ۔ خوبصورت گردپوش سے مزین بہترین کتابت وطباعت قیمت ۱۴/-

ہندوستانی مسلمان ایک نظر میں

یعنی موجودہ ہندوستانی مسلمانوں کا مذہبی، تمدنی اور معاشرتی تعارف، ان کے عقائد، عبادات، مذہبی تہوار، رسم و رواج، عادات و اخلاق اور ان کی ملی خصوصیات کا بیان۔ ایک غیر جانبدارانہ جائزہ۔ ایک واقعی تصویر۔ قیمت ۵/=

معرکۂ ایمان و مادیت

سورۂ کہف کا مطالعہ تفسیر قرآن، حدیث، قدیم تاریخ، جدید علوم اور حالات حاضرہ کی روشنی میں۔ اور اصحاب کہف کا عجیب سبق آموز قصہ۔ قیمت ۵/=

مولانا کے دیگر خطبات و مقالات

پیام انسانیت	۲/۵۰
ایک بہتر ہندوستانی سماج	۱/-
عصر جدید کا چیلنج اور اس کا جواب	-/۰۵
خواص ـ ملت میں ان کا مقام	-/۵۰
محبت فاتح عالم	-/۲۵
طالبان علم نبوت	-/۶۰
مسلمانان ہند سے صاف صاف باتیں	-/۷۵
سیرت محمدی دعاؤں کے آئینہ میں	۱/-
اسلام مکمل دین مستقل تہذیب	-/۰۵
مسائل و تہذیبی جاہلیت کا المیہ	-/۷۵
دو انسانی چہرے قرآنی مرقع میں	-/۷۵
نشان راہ	-/۷۵
نیا طوفان اور اس کا مقابلہ	۱/-
مرد خدا کا یقین	-/۵۰
محسن عالم	-/۵۰

تذکرہ مولانا فضل رحمٰن گنج مرادآبادیؒ

تیرھویں صدی ہجری کے مشہور و مقبول بزرگ اور عالم ربانی اولیس زمانہ حضرت مولانا فضل رحمٰن گنج مرادآبادی رحمۃ اللہ علیہ کے سوانح حیات، کمالات، ارشادات و ملفوظات۔ قیمت ۴/=

پاجا سراغ زندگی

مولانا کے ظلک چند اہم تقاریر کا مجموعہ جن میں درد و سوز اور ایمان و یقین کی کیفیات کے ساتھ ساتھ موصوف کے طویل علم و مطالعہ اور تجربہ و مشاہدہ کا نچوڑ۔ کتاب کی سطر سطر سے نمایاں ہے قیمت ۶/=

مولانا کی تصانیف انگریزی میں

فور پلرس آف اسلام		۳۰/-
ٹیلس آف دی پرافٹ		۵/-
سیویرس آف اسلامک اسپرٹ	اول	۴۰/-
" " " "	دوم	۳۵/-
سیرت سید احمد شہید		۴۰/-
اسلام اینڈ دی ورلڈ		۱۸/-
ویسٹرن سویلائیزیشن		۲۲/-
فیتھ ورسز میٹیریلزم		۱۰/-
اسپیکنگ پلینلی ٹو دی ویسٹ		۵/-
دی ورلڈ آف اسلام ٹوڈے		-/۶۰
ریلیجن اینڈ سویلائیزیشن		۳/-
قادیانزم اے کریٹکل اسٹڈی		۱/-
اسلام اینڈ احمدزم		۲/-
گلوری آف اقبال		۱۸/-
دی مسلمان		۱۰/-

مستند تفاسیر قرآن اور علوم قرآنی پر منتخب کتابیں

کتاب	قیمت	کتاب	قیمت
تفسیر ماجدی اول دوم	۳۵/-	قرآن اور تصوف	۵/-
تفسیر ابن کثیر مکمل مجلد	۱۳۰/-	فہم قرآن	۴/۷۵
تفسیر حقانی مکمل	۱۱۰/-	قرآن تعلیم اور جبریہ تعلیم	۱/-
تفسیر بیان القرآن مکمل چرمی جلد	۱۶۰/-	رہنمائے قرآن	۱/۲۵
تفسیر موضح القرآن مکمل	۴۰/-	وحی الٰہی	۵/-
تفسیر حل القرآن مجلد	۱۰۰/-	بشریت انبیاء	۲/۵۰
" " غیر مجلد	۹۰/-	اعلام القرآن	۲/۵۰
تفسیر مظہری	۲۱۵/-	فضائل قرآن	۱/-
تفسیر الفوز الکبیر اردو	۲/۵۰	قصص و مسائل	۲/-
لغات القرآن غیر مجلد مکمل	۵۱/۵۰	تعلیم القرآن	۲/۷۵
قصص القرآن " "	۲۲/۲۵	جمع و تدوین قرآن	۳/-
ارض القرآن مکمل	۱۲/-	اعجاز القرآن	۱/۷۵
قاموس القرآن مجلد	۱۵/-	قرآن کا تعارف	۲/۷۵
قرآن اور تعمیر سیرت	۷/۵۰	قرآن کی باتیں	۲/-

تراجم احادیث اور متعلقات حدیث

کتاب	قیمت	کتاب	قیمت
ایضاح البخاری ۱ تا ۳	۳۹/-	انتخاب صحاح ستہ	۸/-
مسلم شریف مترجم	۱۰۰/-	ترجمان السنہ مکمل غیر مجلد	۷۲/۵۰
تقریر بخاری	۱۰/-	کتابت حدیث	۲/-
انوار الباری شرح بخاری	۱۱۵/-	نصرۃ الحدیث	۳/-
خصائل نبوی شرح شمائل ترمذی اردو	۱۵/-	آثار و سعادت	۱۱/۵۰
		معارف الحدیث مکمل مجلد	۸۲/۵۰
ترمذی شریف مکمل اردو	۲۵/-	محدثین عظام اور ان کے علمی کارنامے	۱۰/-

سیرت نبوی صحابۂ کرام اور مشائخ پر بہترین کتب

کتاب	قیمت	کتاب	قیمت
سیرت النبی مکمل	۱۳۳/-	الفاروق	۱۶/۲۵
رحمۃ للعالمین	۳۶/-	مشکل کشا	۲/۵۰
پیغمبر عالم	۱۰/-	فاطمہ کا چاند	۳/۲۵
رسول اللہ	۱/۸۰	اسوۂ صحابیات	۳/-
اصح السیر	۲۴/-	رسول اللہ کی صاحبزادیاں	۳/-
خطبات مدراس	۲/۲۵	امت مسلمہ کی مائیں	۲/۵۰
رحمت عالم	۳/۲۵	سیر الصحابیات	۳/۷۵
اسوۂ حسنہ	۳/۷۵	سیر الصحابہ ششم	۹/۴۰
رسول اکرم کی سیاسی زندگی	۱۲/-	" " ہفتم	۹/۷۰
ہمارے حضور	۲/-	حیات الصحابہ مکمل مجلد چرمی	۴۴/-
پہلی تقریر سیرت	۳/-	چار ستارے	۴/-
دوسری تقریر سیرت	۳/۷۵	اسوۂ صحابہ اول	۹/۷۰
نشر الطیب فی ذکر النبی الحبیب	۲/۵	" " دوم	۹/۴۰
" " " کلاں	۹/۷۵	صحابہ کی انقلابی جماعت	۲/-
سیرت خاتم الانبیاء	۲/-	[illegible] کی صاحبزادیاں	۱/۲۰
سیرت خیر العباد	۱۲/-	تابعین	۱۴/-
خلفائے راشدین	۱۱/۹۰	اہل کتاب صحابہ و تابعین	۳/-
سیرت عمر بن عبد العزیز	۳/۲۵	سو بڑے آدمی	۴/۲۵
سیرت النعمان	۵/-	حیات وحید الزماں	۵/-
امام رازی	۱۲/۵۰	حیات سلیمان	۲۲/۵۰
مہاجرین اول	۱۲/۵۰	حیات شبلی	۲۶/۵۰
" دوم	۱۱/-	علمائے حق اور انکی [illegible]	۷/-
سیر انصار اول	۱۲/۵۰	غدر کے چند علماء	۲/۵۰
" دوم	۷/۸۰	علمائے ہند کا شاندار ماضی مکمل	۳۲/۵۰
المامون	۷/۸۰	صدیار جنگ	۱۲/-
ولی کامل	۷/-	خوان خلیل	۳/۵۰
الغزالی	۷/۸۰	سیرت طیبہ	۶/-
سوانح مولانا یوسف کاندھلوی	۱۵/-	ارواح ثلاثہ	۱۱/۵۰

حج بیت اللہ اور نماز سے متعلق کتابیں

کتاب	قیمت
آپ حج کیسے کریں	۲/-
آسان حج	۱/۲۵
فضائل حج	۵/۵۰
رفیق حج	۳/-
معلم الحجاج	۱۲/-
حجۃ الوداع	۱/۷۵
حج کا مسنون طریقہ	۲/۵۰
حج کی باتیں	۲/-
تجلیات کعبہ	۵/-
تجلیات مدینہ	۲/۵۰
سفر حجاز	۵/-
اعیان الحجاج	۵/۵۰
سب سے پہلا سفرنامہ حج	۳/-
حج و مقامات حج	۵/-

نماز

کتاب	قیمت
کتاب الصلوٰۃ مجلد	۲/-
نماز کی حقیقت	۱/۷۵
فضائل نماز	۱/۷۵
میری نماز	۲/۵۰
نماز مترجم	-/۴۰
نماز کی باتیں	۲/-
آئینہ نماز	۲/۷۵
آسان نماز	۱/۷۵
عورتوں کی نماز	۱/-
نماز کیا ہے؟	-/۴۰

تبلیغی کتابیں

کتاب	قیمت
تبلیغی نصاب اول سادہ	۱۳/۵۰
〃 〃 چرمی	۱۶/۵۰
تبلیغ دین	۴/۵۰
تبلیغی جماعت پر اعتراضات کا جواب	-/۵
تبلیغی تقریریں	۱/۲۵
تبلیغ کیا ہے؟	۳/۵۰
تبلیغی سالانہ نمبر	۲/-
چھ باتیں	۱/۲۵
تبلیغی تحریک کے بنیادی اصول	۳/۵۰
مفتاح التبلیغ	۴/-
تبلیغی سرگرمیاں عہد سلف میں	۱/۵۰

کچھ ادبی کتابیں

کتاب	قیمت
شعر العجم مکمل	۴۳/۲۵
شعر الہند مکمل	۲۹/-
شعلۂ رقصاں	۴/۵۰
غزل انسائیکلوپیڈیا	۲۵/-
فن شاعری	۳/-
فریب تمدن	۱۲/-
گل رعنا	۱۶/۲۵
اقبال کامل	۱۲/۵۰
مکاتیب شبلی مکمل	۱۶/۷۵

فضائل و حقوق

کتاب	قیمت	کتاب	قیمت
فضائل اسلام	۱/۲۵	فضائل درود	۲/۲۵
فضائل قرآن	۱/۵۰	فضائل استغفار	-/۵۰
فضائل نماز	۱/۵۰	فضائل اذان و اقامت	-/۴۰
فضائل رمضان	۱/-	میاں بیوی کے حقوق	-/۷۵
فضائل حج	۲/۵۰	حقوق الزوجین	۳/۲۵
فضائل صدقات	۱۲/-	والدین کے حقوق	۱/۲۵
فضائل ذکر	۲/۲۵	حقوق البیت	۱/۲۵
فضائل تبلیغ	-/۶۰	حقوق الاسلام	-/۵۰

دین کی تعلیم دینے نیز اردو سکھانے کے لئے بہترین کتابیں

کتاب	قیمت	کتاب	قیمت
اچھا قاعدہ	-/۲۰	اچھی باتیں اول	-/۴۰
اللہ کے رسولؐ	-/۷۵	〃 〃 دوم	۱/-
حضرت ابو بکرؓ	-/۷۵	〃 〃 سوم	-/۸۵
حضرت عمرؓ	-/۷۵	〃 〃 چہارم	۱/-
حضرت عثمانؓ	-/۷۵	〃 〃 پنجم	۱/-
حضرت علیؓ	-/۷۵	〃 〃 ششم	۱/۲۵
ہمارا ایمان	-/۷۵	حضرت خدیجہؓ	۱/-
اچھے قصے	۱/۵۰	حضرت سودہؓ	-/۵۰
آسان فقہ	-/۷۵	حضرت عائشہؓ	۲/۷۵

دارالعلوم ندوۃ العلماء کا جدید عربی نصاب

کتاب	قیمت	کتاب	قیمت
قصص النبیین مکمل	۹/۵	تمرین الصرف	۲/۲۵
القراءۃ الراشدہ مکمل	۹/۷۵	تمرین النحو	۲/۵۰
مختو دات	۹/-	الادب العربی	۶/-
مختارات مکمل	۱۲/-	النبوۃ والانبیاء	۱۵/-
معلم الانشاء مکمل	۱۲/-	علم التعریب	۳/-

ہمارا پتہ: کتب خانہ الفرقان ۳۱- نیا گاؤں مغربی - لکھنؤ